
Meyar
Monthly

[illegible] صحت مند و تعمیری ادب کا علمبردار

جلد ۵، شمارہ ۱ — ماہنامہ — جنوری ۱۹۵۵ء

معیار

مدیر

نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ جرائد کیلئے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

زرِ تعاون

سالانہ — پانچ روپے
ششماہی — تین روپے
فی پرچہ — آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

ترتیب

نقش اوّل ———— نجم الاسلام

نظمیں

مقالے

غزلیں

مضمون

افسانے، خاکے اور ڈرامے

نقشِ اوّل

سال نو کا پہلا شمارہ تین ماہ کے تعطل کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ اس تعطل کے اسباب پر روشنی ڈال کر مالی دشواریوں کا رونا رویا جائے۔ عام لوگوں کو اس سے کیا مطلب کہ ادبی رسالہ نکالنے میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں یہی بہت ہے کہ ان میں سے کوئی آٹھ آنے خرچ کر کے پڑھنے کی تکلیف گوارا کر لے۔ رہے وہ لوگ جنکو معیار سے خاص اور قریبی تعلق ہے تو ان پر سب حال عیاں ہے۔ ان سے کہا جائے تو آخر کیا کہا جائے۔ جو لوگ سب کچھ جانتے ہیں وہ عملی تعاون کرنا چاہیں تو انکے تعاون میں کونسی چیز مانع ہے۔ چار سال کی مدت میں اس سے پہلے بھی بہت سی پہاڑ جیسی مشکلات سے معیار کو دوچار ہونا پڑا۔ انکا ذکر صفحات میں شاید ہی کبھی آیا ہو۔ لیکن کبھی کبھی دوستوں کا تغافل حد سے بڑھ جاتا ہے تو مشکلات کا احساس دلا کر چونکانا ضروری ہے۔

تعطل کے یہ تین ماہ اسی قسم کے ہیں۔ ممکن ہے کہ انکی روئیداد آپ کو چونکا سکے۔ ان تین ماہ میں ہمیں کئی قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آیا۔ کچھ لوگ وہ تھے جنھوں نے اس تعطل پر دلی بے چینی محسوس کی اور آگے بڑھ کر مشکلات و موانع کو دور کرنے کیلئے عملاً امداد کی۔ کچھ لوگ وہ تھے جو بے چین تو ضرور ہوئے لیکن انکی بے چینی مزاج پرسی اور خالی خولی مشوروں تک رہی۔ اور چند لوگ ان دونوں قسم کے احباب سے بالکل مختلف بھی تھے۔ یہ لوگ قنوطیت پسند قسم کے تھے جو معیار کی زندگی سے مایوس ہونے لگے تھے۔ ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ عملی امداد کو تو دوسروں کیلئے چھوڑ چکے تھے اور اپنے لئے اُمید کی کرن دیکھ کر ہنس پڑنے اور مایوسی کی جھلک پر رو دینے کو کافی سمجھ رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے جب ایک بزرگ نے معیار کو بند کرنے کا مشورہ دیا تو مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک تے نئے قائم شدہ پبلک ہائی اسکول پر جو اب ترقی کر چکا ہے، ایسی مشکلات آ پڑیں کہ کچھ لوگوں کی طرف سے اسکے ٹوٹ جانے کی افواہیں پھیلائی جانے لگیں۔ اسوقت اسکے ایک پر جوش بانی نے جلسہ میں کہا تھا "جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسکول ٹوٹ جائے گا، میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا منہ نوچ لوں۔"

برنارڈ شا نے کتنے رجائیت سے بھرپور لہجہ میں کہا ہے "واقعات و مصائب مجھ پر نہیں گزر رہے ہیں۔ بلکہ میں ہوں جو ان پر سے گذر رہا ہوں۔" اسوقت ہمیں اسی قسم کے لہجے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مشکلات کے ذکر سے دل شکستہ ہونے کے بجائے غفلت کے پردے کو چاک کر سکیں تو آئیے ہمیں آپکو معیار کا کچھ حال سنائیں۔

ستمبر ۱۹۸۸ء کا معیار شائع ہونے کے بعد اکتوبر کے شمارے کی کتابت تکمیل کو پہنچ گئی تھی مگر دیر سے۔ سوچا گیا کہ اکتوبر کا شمارہ روک لیا جائے۔ اور نومبر کا شمارہ نومبر کے ابتدائی تاریخوں میں روانہ کر دیا جائے۔ اسطرح اشاعت کی تاخیر کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ بات مناسب تھی۔ لیکن جب نومبر کے شمارے کی چھپائی کا مرحلہ آیا تو منتظمین کو اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ مجبوراً "ہنوز دلی دور است" کہہ کر کتابت شدہ کاپیاں دلی جانے سے روک دی گئیں۔ اب ہمارے سامنے روپیے کی فراہمی کا سوال آیا۔ اور ان سب دوستوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ جو اپنی ضروریات زندگی پر معیار اور اسکے مقاصد کو ترجیح دیکر چار سال سے برابر مالی مشکلات کے ہجوم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحلہ ہماری پچھلی تمام مشکلوں سے زیادہ سخت تھا۔ چار سال کے مسلسل مقابلے نے قوت برداشت کو تھکا سا دیا تھا۔ مگر دوسری طرف نظر جاتی تھی تو معیار کی افادیت اور اسکی چار سالہ کوششیں سامنے آتی تھیں۔ جو لوگ قنوطی رجحان کے [illegible]

ان سے بھی جب کبھی پوچھا گیا کہ کیا معیار کی افادیت سے کسی کو اختلاف ہے تو یہ صرف مقامی احباب ہی نہیں بلکہ ملک گیر حلقہ تعا
بارے میں دو رائیں نہیں پائی گئیں۔ سب کو اسکی افادیت تسلیم تھی بس اتنا تھا کہ کچھ لوگ مالی مشکلات کی طرف سے اپنے دلمیر
دسمبر ۵۳ء تک معیار کی مالی حالت کسی حد تک اطمینان بخش ہو گئی تھی۔ ایک ادبی رسالہ کی آمد اور اسکا خرچ حد
حالت اطمینان بخش کہی جا سکتی ہے۔ لیکن ۵۴ء میں دشوار ترین حالات پیدا ہو گئے۔ ان حالات میں تنقید نمبر کی تیاری کو بہ
تیسے سرمایہ لگا کر نمبر تو نکال لیا گیا۔ لوگوں نے زمین آسمان کے قلابے بھی ملا دیئے لیکن اسے پھیلانے کی
پیمانے پر نہ کی جا سکی کہ بجٹ کا توازن برقرار رہتا ۵۴ء کو چھوڑ کر پچھلے سال کے جائزہ کو سامنے رکھنے کے بعد مستقبل سے ناامید ہونے کی
کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ رجائیت نے پکارا کہ اگر ہم کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مشکلات پر قابو نہ پا سکیں۔ اور اگلا سال ہمارے لئے
بہتری کا سالی نہ ہو۔

ان حالات میں ہم نے پھر ایک حل سوچ نکالا اگر ایسا نہ ہوتا تو درحقیقت ہم اپنی ہمتوں کے امتحان میں ناکام ہو گئے ہوتے یہ کتنی بڑی
بدنصیبی ہوتی کہ ایک ایسے اہم فرض کے سلسلہ میں جیسے تعمیر تاریخ جیسی عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے ہم صرف اسلئے بیچ چھوڑ دیتے
کہ اس کے لئے حالات سازگار نہیں تھے۔ افادیت کو تسلیم کرنے کے بعد مشکلات سے ڈرنا بڑی بزدلی کی بات ہوتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ
اس کشمکش و پیچ سے بھی نکل آئے اور معیار کو بہر طور چلانے کا عزم کر لیا۔
بجٹ پیپر پر منتظمین قلم لے لے کر جھک گئے۔ اور مالی توازن کی پوری کوشش کی جانے لگی بالآخر ایک حل نکل آیا جو اخراجات اور آمد
کے لحاظ سے ناگزیر ضرورتوں کو پورا کر سکتا جو کچھ خسارہ تھا اُسے معیار کی مستقل ماہانہ اعانت سے پورا کیا گیا چند مخلص ترین احباب کی توجہات سے
اعانتوں کی دشوار وادی بھی طے ہو گئی اور اب اگر ہمارے بجٹ کا کوئی پہلو توقع سے بہت زیادہ کمزور ثابت نہ ہوا تو ہمیں اللہ تعالےٰ کی ذات سے امید
ہے کہ آئندہ اشاعتیں پابندگی اور باقاعدگی کے ساتھ عمل میں آتی رہیں گی۔ بجٹ میں مستقل اعانت کے علاوہ دو چیزیں خاص طور سے آپکی توجہ کی مستحق
ہیں۔ ایک نئے خریداروں کا مسئلہ اور دوسرے نئی ایجنسیوں کا قیام۔ ظاہر ہے کہ دونوں چیزوں کی طرف جن احباب کی توجہ منعطف کرائی جا سکتی
ہے وہ وہی ہو سکتے ہیں جو عام لوگوں کی بہ نسبت معیار کی افادیت اور اسکے احوال واقعی کو کہیں زیادہ سمجھ چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو لوگ اس
اس پوزیشن میں ہیں انھوں نے ابھی تک اپنے فرائض پر شاید اچھی طرح غور نہیں کیا ہے۔ لیکن اب غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت
حالات نے ہماری ذمہ داری بڑھا دی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ طبقہ جسکا میں ذکر کر رہا ہوں معیار کی جانب سے یکسر غافل نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایسے خطوط کی آمد کا ایک سلسلہ
جاری ہے جو مزاج پرسی اور پند و نصیحت سے پُر ہوتے ہیں۔ یہ چیز بُری نہیں بشرطیکہ اسکے ساتھ عملی امداد بھی ہو۔ لیکن جو لوگ صرف مشورے
دے رہے ہیں اور استطاعت کے باوجود عملی امداد کو دوسروں کے لئے چھوڑ رہے ہیں ان سے شکایت ہو سکتی ہے۔ خالی مشورے تو وہ لوگ
بھی دے سکتے ہیں جو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن جو لوگ کچھ کام کر سکتے ہیں انھیں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ معیار کے لئے صرف ڈرامے
اور غزلیں لکھنا ہی کافی نہیں ہے اسکی بقا کا سامان کرنے کے لئے کچھ عملی جد و جہد بھی لازم ہے۔ اور اس جد و جہد کا ذمہ سب سے
اور فنکاروں کو لینا چاہیئے۔ یہ جد و جہد انکی تخلیقی کوششوں کے اثرات کو سماج کے رگ و پے میں ہی داخل نہیں کرے گی انکے اپنے دست
بھی توانائی اور حرارت پیدا کرے گی۔ وہ ادیب جو قلم کے ساتھ قدم سے بھی کام لے رہا ہے۔ سماج کے مزاج کو زیادہ کامیابی کے ساتھ
اور اسلامی ادب کو حقیقت میں ایسے ہی ادیب کی ضرورت ہے جو اسلامی ادب کی خدمت کیلئے قلمے اور سخنے ہی تیار نہ ہو بلکہ دامے، درمے اور قدمے
[illegible] وابستہ و آمادہ کار رہے۔

م الدین رام نگری

روداد چمن

نہ کلیوں کے سینے میں جوشِ بہاراں، نہ پھولوں کے چہرے پہ کیفِ بہاراں
غم آگیں ہیں نرگس کی آنکھیں، ہیں سنبل کی زلفیں پریشاں پریشاں
گرجتے ہیں بادل، کڑکتی ہے بجلی، لپکتے ہیں کوندے، بھڑکتے ہیں شعلے
ہے سرو و صنوبر پہ سکتہ سا طاری، گل و یاسمن ہیں ہراساں ہراساں
گلستاں کے ماحول میں زندگی جس طرح پہلے خفتہ تھی خفتہ ہے اب بھی
نہ آموں کی ڈالوں پہ کوئل کی کوکو، نہ پھولوں کی شاخوں پہ بلبل غزلخواں
مناتے ہیں تقریبِ جشنِ بہاراں، مگر ہے فضائے چمن کا یہ عالم
کہ رنگِ بہاراں، نہ حسنِ بہاراں، نہ کیفِ بہاراں، نہ جوشِ بہاراں
یہ سُن سُن کے خوش ہو رہے تھے عنادل، کہ اب ختم ہونے کو ہے دورِ گلچیں
یہ کس کو خبر تھی کہ خود باغبانوں کے ہاتھوں سے تاراج ہوگا گلستاں
جسے سب سمجھتے ہیں پھولوں کا موسم، وہ دراصل پھولوں کا موسم نہیں ہے
بہارِ چمن سب سمجھتے ہیں جس کو حقیقت میں ہے وہ فریبِ بہاراں
ہمارے چمن کے مقدر میں پہلے نہ امن و سکوں تھا، نہ اب عافیت ہے
خزاں تو خزاں تھی بہاروں میں بھی ہے کبھی برق و باراں کبھی زورِ طوفاں
جو ہے بلبلوں کی نواؤں پہ بندش، تو رودادِ گلشن بیاں کیا نہ ہوگی
گزرتی ہے جو لالہ و گل پہ وہ ان کے پژمردہ چہروں سے خود ہے نمایاں
وہ بادل ہی برسا نہیں اس چمن پر جو گلشن کو دراصل گلشن بنادے
چلی وہ ہوا ہی نہیں اس چمن میں جو خوشبو سے دشت و دمن کو بسادے

ستمبر
کا شمارہ نومبر
کا مرحلہ آیا تو
سامنے

(پروفیسر) ظفر احمد صدیقی

مذہب و ارتقا

اے قتیلِ مادیت اے شہیدِ ارتقا
ہے نگاہوں میں تری مذہب بس اک ذہنی لباس
گو یہ استدلال ہے چشمۂ خرد میں ناصواب
میں نے مانا جسم کی ہوتی ہے جب نشو و نما
پیکرِ انساں مگر بڑھتا چلا جاتا ہے کیا
آخر اس نشو و نما کی کوئی حد ہے یا نہیں
جسم کا ہوتا ہے اس حد پر پہنچ کر جو لباس
جس کو ایام جوانی میں کیا تھا زیبِ تن
یونہی کیا ممکن نہیں انسانیت کی ارتقا
کارواں جیسے رواں ہو اک میانِ کوہسار
یا اب اک ہموار میداں میں ہو داخل ناگہاں
ہے حقیقت بھی یہی شاہد ہے تاریخِ جہاں
ہر گھڑی تجدیدِ آئینِ کہن ہوتی رہی
لیکن آخر آگیا اک حد پہ ہستی کا شباب
پیکرِ ہستی کمال اوج اپنا پاگیا
اب جوانی میں جو پایا زندگی نے پیرہن
پیرہن یہ صحتِ پیکر کا اب معیار ہے

چند تمثیلوں پہ ہے تیرے تخیل کی بنا
جو نہیں اب زندگی کے قامتِ موزوں پہ راس
خیر اس تمثیل کا دیتا ہوں تمثیل جواب
تنگ ہو جاتی ہے اک دن اسپہ طفلی کی قبا
ارتقا کے زینہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے کیا
ارتقائے جسم کی منزل بھی آتی ہے کہیں
وہ بھی اگلے دور میں آتا نہیں کیا اس پہ راس
تنگ ہو جاتا ہے پیری میں بھی کیا وہ پیرہن
ایک حد خاص پر آکر بدل دے راستا
اک بلندی پر پہنچکر ڈھال سے پھر ہو دوچار
آنکھ سے اوجھل ہوں پستی اور بلندی کے نشاں
راہِ طفلی میں تھا جبتک زندگی کا کارواں
حسب قامت اختراعِ پیرہن ہوتی رہی
بن گیا اک غنچۂ نو کھل کے جاں پرور گلاب
عقل کی سرشاریوں کو یک بیک ہوش آگیا
غیر ممکن ہے کہ کم ہو حشر تک اس کی پھبن
ہو اگر ڈھیلا تو سمجھو جسم ہی بیمار ہے

ہے فریبِ ارتقا بد زیب پیکر کا حجاب
کیوں نہ کڑوی ہو شکر جب ہے مزہ منہ کا خراب

ارتقا ہے تیری نظر میں محض بڑھنے کا نام
نت نئی تبدیلیاں جن میں نہ ہو کوئی نظام

تو سمجھتا ہے اسی کو ارتقائے کائنات
ہو نہ دنیا میں کسی قانون و دستور کو ثبات

کل وہی ہو جائے جائز آج تک جو ہے حرام
زندگی رہ جائے یکسر بے اساس و بے نظام

مغربی سائنس کے اے پیروِ خیرہ نظر
غور کر اپنے ہی ان پیروں کے ارشادات پر

انکے نزدیک ایک عالم ہے اسیر ارتقا
ذرہ ذرہ ہے اسی قانون میں جکڑا ہوا

مانتے ہیں پھر بھی وہ قانونِ فطرت ہے اٹل
گردشِ شمس و قمر میں آ نہیں سکتا خلل

زہر میں تریاق کی تاثیر ہو سکتی نہیں
آگ اپنی تابش و حدت کو کھو سکتی نہیں

آم کا پھل نیم کی ڈالی میں آ سکتا نہیں
باہر اپنے دائرہ سے کوئی جا سکتا نہیں

بے نسیمِ صبح کے غنچے چٹک سکتے نہیں
جانور اپنی جبلت سے بھٹک سکتے نہیں

ارتقا کو جب نہیں ان ضابطوں سے کوئی کد
بندشوں پر فطرتِ انساں ہی کی پھر کیوں ہو زد

ارتقا سے اصلِ انسانی بدل سکتی نہیں
اپنی حد سے آگے کوئی شے نکل سکتی نہیں

ہے وہی فطرت بھی اسکی اور انساں بھی وہی
رنج کے اسباب اور راحت کے ساماں بھی وہی

ہے وہی فرد و جماعت کی کشاکش کا رنگ
اب بھی خود غرضی میں اور ایثار میں باہم ہے جنگ

ہیں فریب اب بھی وہی تلبیس کی راہیں وہی
قہقہے ظالم کے اور مظلوم کی آہیں وہی

ارتقا سے آدمی بدلا نہیں زیرِ فلک
زر، زمیں اور زن کے جھگڑے بھی وہی ہیں آج تک

اب بھی لیتا ہے انھیں آلات سے ابلیس کام
شعر و شاہد نغمہ و مطرب مے و مینا و جام

جسم میں اور روح میں اب بھی وہی ہیں رابطے
زندگی اور موت کے اب بھی وہی ہیں ضابطے

جانے پھر تیرا اٹل قانون سے مطلب ہے کیا
جسکا دشمن ہے تیرے نزدیک دینِ ارتقا

زندگی اپنا توازن آج کھو بیٹھی ہے پھر
امن اور آسودگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے پھر

نشہ میں ہو کیفیت جیسے کسی مجنون کی
اور بھی محتاج ہے آج اک اٹل قانون کی

زندگی ان ضابطوں سے جب چراتی ہے نظر
بند ہو جاتا ہے اس پر امن و آسائش کا در

ہوتی ہے جب بے نیاز اس سرمدی قانون سے
کھیلنے لگتی ہے ہولی آپ اپنے خون سے

کیا بتاؤں تجھ کو پائندہ ضوابط کا میں راز
تجھ کو اصل و فرع میں کبھی تو نہیں ہے امتیاز

دین مجموعہ ہے دو اقسام کے قانون کا
اک وہ جنکی ہے بنیادی حقائق پہ بنا

جیسے بنیادی حقائق میں نہیں رد و بدل
یونہی یہ قانون بھی اپنی جگہ پر ہیں اٹل

دوسرے احکام جزوی یا فروعی مسئلے
ہے تعلق جنکا ہر لحظہ نئے حالات سے

ان اصولوں میں ہے لازم ہر گھڑی ترمیم بھی
روشنی [illegible] قوانین کی

ہے اصول اجتہاد اس امر کی روشن دلیل
ہر گھڑی ہوتی رہے تجدید ہستی کی سبیل

سچ تو یہ ہے ایک سطحی واقفیت کے سوا
ارتقا کے راز سے ہے تیرا دل ناآشنا

ارتقاء ہر اعمل ہے وحدت و تفریق کا
یعنی طول و عرض میں ہو زیست کی نشو و نما

کونپلیں پھوٹیں نہالِ زندگی سے بیشمار
ربط باہم ہو مگر پہلے سے بڑھ کر استوار

شاخ اپنی حد میں چاہے جسقدر پھولے پھلے
اصل سے لیکن تعلق اور رشتہ بھی رہے

دین ہے وہ اصلِ تازہ جس سے شاخِ زندگی
دین سے ابنائے ہستی میں ہے ربطِ باہمی

شاخ کٹ کر اصل سے پھل پھول لا سکتی نہیں
اور کبھی نشو و نما کا اوج پا سکتی نہیں

ارتقا کی مختصر لفظوں میں یہ تفسیر ہے
یہ نہیں تو ارتقا اک خوابِ بے تعبیر ہے

اس حقیقت سے ابھی واقف نہیں تیری نظر
میں بتا دوں ارتقا کا کیا ہے مذہب پر اثر

پہلے نسل و رنگ کے زنداں میں انساں تھا اسیر
ارتقائے ذہن میں یہ دور بھی تھا ناگزیر

پہلے مصنوعی حدوں میں آدمی محصور تھا
سچ یہ ہے ناپختگی سے عقل کی مجبور تھا

تھا قبیلہ قوم یا اپنے وطن ہی پر فدا
تھی تگ و دو اسکی بس اس دائرہ ہی میں سدا

جسطرح محدود دائرہ کم بیں تھی انساں کی نظر
تھے فرائض بھی اسی نسبت سے اسکے مختصر

بس کہ ہر عہد اور ہر ملت کی حالت تھی جدا
یوں ہی تھے ہر عہد ہر ملت کے رہبر بھی جدا

تھی طفولیت کی منزل میں ابھی تک زندگی
اپنے پاؤں چلنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی

ہر قدم پر غیر کی امداد پر تھا انحصار — خام تھی فطرت ابھی اور عقل تھی ناپختہ کار
رفتہ رفتہ ذہن کی بستہ گرہ کھلنے لگی — ہر حقیقت عقل کی میزان پر تلنے لگی
چشم انساں اب حجابوں کو رمے جانے لگی — اب اشاروں اور کنایوں کو نظر پانے لگی
آگیا وہ دور جب عقل و خرد کی پختگی — ہو سکے حامل خدا کے آخری پیغام کی
ماورائے رنگ و بو جب عقل انساں جاسکے — راز عالمگیر اخوت کا سمجھ میں آسکے
معجزوں پر جبکہ ہو دینی عقائد کا مدار — دین کے پنہاں محاسن ہوں نظر پر آشکار
غیر کی مرضی سمجھ کر جنکو کرتے تھے قبول — وہ نظر آنے لگیں اب اپنی فطرت کے اصول
آچکی تھی الغرض جو پختگی درکار تھی — عقل اب اتمام نعمت کے لئے تیار تھی
ہوگیا اس نعمت حق کا غرض اتمام بھی — آگیا انسانیت کو آخری پیغام بھی
عقل اب جتنا بھی راہ ارتقا میں جائیگی — دین اور فطرت میں ہم آہنگیاں ہی پائیگی
ہوگا اب انسانیت کا جسقدر بھی ارتقا — اتنی ہی ہوگی حقیقت دین کی جلوہ نما

جائیگی اب بحر کی تہ میں جہاں تک بھی نظر
پائیگی اتنے ہی نایاب و درخشندہ گہر

روشنی کا ایک بے حرکت ستوں ہے تجھکو دیں — زندگی کی ریل کا جو ساتھ دے سکتا نہیں
دین تو انسانی فطرت کے اصولوں کا ہی نام — ہے زبان غیر سے اپنی ہی فطرت کا پیام
ہے وہ بجلی جس سے جل اٹھتا ہے اندر کا چراغ — جگمگا اٹھتے ہیں پھر تابش سے اسکی باغ و راغ
یہ وہ سرمہ ہے جو دیتا ہے نگاہوں کو ضیا — روشنی میں اسکی پھر ہوتی ہے ہر شے جلوہ زا
صورت خورشید عالمتاب اسکا نور ہے — زیست کا ہر گوشہ اسکے نور سے معمور ہے
زندگی کا کارواں جس سمت بھی ہو گامزن — پائیگا اس نور کو ہر راہ میں پرتو فگن

لیے بصر پھر کبھی گلہ سنج شب دیجور ہے
روشنی کس کام کی جب آنکھ ہی بے نور ہے

توحید میکش

یقینِ محکم

ابھی خامشی ہے جمود ہے، ابھی زندگی پہ زوال ہے
ابھی راستے بھی طویل ہیں، ابھی منزلوں کے نشاں نہیں
ابھی ظلمتیں ہی محیط ہیں ابھی روشنی کا گماں نہیں
ابھی اضطراب ہے کرب ہے، ابھی حسرتیں ہیں ملال ہے

مگر آہنی مرا عزم ہے، مرا حوصلہ بھی جوان ہے
بڑی پختہ ہیں مری قوتیں، مجھے غم نہیں مجھے ڈر نہیں
مرے دل کے گوشوں میں ہمنشیں کوئی خوف کوئی خطر نہیں
مرے ولولوں میں ہے تازگی مری آرزوؤں میں جان ہے

میں اسیرِ دامِ ہوس نہیں، میں شکارِ حسن و ادا نہیں
میں فدائے جام و سبو نہیں میں نثارِ تابشِ زر نہیں
مجھے رفعتوں کی تلاش ہے، مجھے آپ اپنی خبر نہیں
نہیں خواہشوں کا غلام میں مجھے فخر ہے میں گدا نہیں

مرا فکر میرا عمل ہی بس مرے ارتقاء کی کلید ہے
مرے ولولوں کی حیات بھی، مری کھیتوں کا اناج بھی
مری سسکیوں کی دوا بھی ہے، مری ہچکیوں کا علاج بھی
نہیں سرنگوں مری ہمتیں، مری چوٹ گرچہ شدید ہے

مجھے ہے یقیں مری کاوشیں کبھی رائیگاں نہیں جائینگی
مرے سامنے آپ ہی ایک دن مری منزلیں چلی آئینگی
نہ فضائیں ہوں گی غم آشنا نہ فریب کھائے گی زندگی
نہ گریزاں ہوں گی مسرتیں نہ رہے گی ظلمت و خامشی

مطیع الرحمٰن اختر ایم۔ اے

سحر

ساتھیو! رات کی تاریک فضا لرزاں ہے

دامنِ نور پسارے چلی آتی ہے سحر
کیا اِسے روک سکے گی کسی منکر کی نظر
زرد پڑنے لگے آکاش پہ تاروں کے کنول
اب ڈھلکنے ہی کو ہے خوابِ گراں کا آنچل
جاگ اُٹھے گا ابھی دہر کا خوابیدہ شعور
سینۂ شب سے اُبلنے ہی کو ہے چشمۂ نور
سو چکے تم بھی بہت بسترِ راحت چھوڑ دو
اپنے خالق سے بغاوت کی یہ عادت چھوڑ دو
جاگ اُٹھو جذبۂ آگاہی و عرفاں لے کر
عزمِ نو۔ فکرِ جواں شوقِ فراواں لے کر
تم پہ مائل بہ کرم ہونے لگے ربِّ جمال
صبحِ پُر نور کا اِس طرح کرو استقبال

ساتھیو! رات کی تاریک فضا لرزاں ہے

محترمہ نور زبیری میرٹھی

راہِ نو

رنگ اور نور لئے صبح بہار آئے گی
وہ ابھرتے ہوئے آثارِ تجلی دیکھو

بزمِ غمناک اندھیروں کی اُجڑ جائے گی
کرمِ گرمیِ رفتارِ تجلی دیکھو

مُنہ چھپانے کو ہیں تاریک خزاں کے سائے
مُسکرائے گی تمنا کی سکوں بیزِ بہار

جگمگائیں گے اُمیدوں کے ہزاروں سورج
اُفقِ قلب میں چمکے گی شعاعوں کی قطار

جب اندھیروں کے بھنور سے نکل آئیگی حیات
گیت گاتی ہوئی ہر سانس میں خوشیاں ہونگی

غم کی پرچھائیاں تھرّائیں گی لرزنے گی جل
کتنی نوخیز اُمیدیں سرِ داماں ہونگی

زندگی راہ بدل کر جو نکل آئے گی
ظلمتِ خواب کی تعبیر بدل جائے گی

یوسف شمیم (نیلور)

اقبالؒ

عالمِ خفتہ تری بانگِ درا سے جاگا
تیری ہی شعلہ درا آغوشِ نوا سے جاگا

روحِ تجدید و ترقی تری تحریر میں ہے
کلکِ تقدیر ترے حیطۂ تدبیر میں ہے

تجھ میں تھی برگِ گلِ تر کی نزاکت تحلیل
تیری آتش نفسی بن گئی گلزارِ خلیلؑ

اک نئے ڈھنگ سے تعلیمِ خودی دی تو نے
دل میں تنویر فشاں شمعِ یقیں کی تو نے

تو نے شاہیں کے ممولوں کو سکھائے انداز
دی انہیں جنسِ گرانِ پر و بالِ پرواز

تو نے کی یوں تو بہت سیرِ فضائے مغرب
تجھ کو کچھ بھی نہ پسند آئی ادائے مغرب

نورِ خدا سے ترا فکر منور ہی رہا
مشرقیت کے تقدس کا شناگر ہی رہا

کس کو پھر ہوگا تری دانش و حکمت میں کلام؟
تو نے عرفان کا دنیا کو بتایا ہے مقام

نجم الاسلام

حفیظ میرٹھی —— ایک تعمیر پسند غزل گو

تقسیم ہند سے پہلے میرٹھ میں ایک ادبی انجمن دائرہ ادبیہ کے نام سے تھی جو اب مرحوم ہو چکی ہے۔ اس انجمن نے نئے اردو ادب کو کئی ابھرنے والے فنکار دیئے ہیں۔ انہی میں حفیظ صاحب بھی آتے ہیں۔

اس وقت حفیظ صاحب غزل میں تعمیر پسند رجحانات پیش کر رہے ہیں اور تعمیر پسند ادبی تحریک کے شاعروں میں بحیثیت غزل گو سر فہرست ہیں۔ شروع میں جب تعمیر پسند تحریک وجود میں نہیں آئی تھی حفیظ صاحب کے خیالات اور انکے طریق اظہار میں قدیم و جدید رنگوں کا امتزاج تھا۔ مگر تعمیر پسند نظریہ کو اپنانے کے بعد انھوں نے اپنی غزلوں میں چند ایسی حقیقتوں کو پیش کیا ہے جنکی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج ان کا شعور واضح اور روشن ہے۔ اور اسکی مناسبت سے لہجہ میں بھی تبدیلی ملتی ہے۔ یہ تبدیلی آج کے دور میں اجنبیت آمیز نہیں رہی ہے اس لئے مجھے اُمید ہے کہ حفیظ صاحب کی غزلیں اور انکے خیالات و افکار صحیح اسپرٹ میں اپنے مخاطبوں تک پہنچیں گے۔ اور صحیح اسپرٹ میں ہم ان پر اچھائی برائی کا حکم لگا سکیں گے۔

حفیظ صاحب اپنے مخلص احباب کے حلقے میں صرف "حفیظ صاحب" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں یہ "صاحب" نام ہی نہیں کبھی کبھی تخلص کا جزو بنجاتا ہے اسوقت مقطع اپنے فنکار کی شخصیت کو زیادہ جامعیت سے پیش کرنے لگتا ہے۔ بہرکیف حفیظ صاحب کا نام انکے دوستوں کے لئے اب کوئی ابہام نہیں رکھتا۔ جب ہم یہ نام سنتے ہیں تو ذہن حفیظ جالندھری یا حفیظ ہوشیارپوری کی طرف نہیں جاتا، حفیظ میرٹھی کی طرف جاتا ہے

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اگرچہ ابھی میدانِ سخن میں نووارد ہوتا ہے مگر سننے والوں کے دل کو اسکا کوئی شعر ایسا بھا جاتا ہے کہ مدتوں یاد رہتا ہے۔ اسکی یاد شاعر کی یاد دلاتی رہتی ہے یہیں سے اسکی شاعری توجہ طلب بنتی ہے ایسے شعر اپنے مضامین کے اعتبار سے کچھ زیادہ انوکھے نرالے نہیں ہوتے مگر طرزِ ادا میں ایسی دلکشی ہوتی ہے کہ سننے والا توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسکی یہ توجہ دیر تک قائم رہتی ہے۔

حفیظ صاحب کے جس شعر نے لوگوں کی توجہ پہلے پہل اپنی طرف کھینچی وہ اب بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ یہ شعر کسی طرحی مشاعرہ میں پڑھا گیا تھا ؎

کرم تیرا کہ ان آنکھوں کو تو نے ندیاں بخشیں
الٰہی ایک آنسو حُسن کے دامن کے قابل بھی

بقول محمد حسن عسکری شاعر کو عشق کی اُلجھنوں کے علاوہ کچھ ایسے تجربے کرنے ضروری ہیں جو اسکے فن کو "علاج الغرباء" کی صف سے اونچا کرتے ہیں اور ایک عظیم تر تخلیقی عمل میں معاون بنتے ہیں چنانچہ انھوں نے میر کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے جس نے صرف ایک عشق کا غم ہی اپنے شعروں میں جمع نہیں کیا تھا بلکہ معلوم نہیں ایسے کتنے اور درد و غم بھی تھے خالص عشق کے تجربات و عمل کا میدان محدود ہے اور یہاں متعین قسم کے تجربوں کے سوا کچھ نہیں۔ تجم اور حسرت میں فرق جو کچھ ہے وہ سوسائٹی اور اپنے اپنے طریق اظہار کا ہے۔ تجربہ مختلف نہیں۔ طریق اظہار کے اس فرق کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا مگر وہ مناسبت کبھی تنقیدی نظر کی کچھ کم محتاج نہیں جو ہمیں تجربہ کی یکسانی میں ملتی ہے

حفیظ صاحب نے زندگی کی اس تیز رفتاری کو سمجھنے کی کوشش کی چنانچہ اب ہمیں انکے کلام میں بدلتے ہوئے حالات کے اثرات نئے نئے مسائل اور نئے نئے تقاضے جھلکتے نظر آتے ہیں۔ حفیظ صاحب ہی کا ایک شعر ہے ؎

ایک انداز پر رہے قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں

شاعر کو تنگیٔ داماں کا شکوہ ہوتا ہے تو اسی نکتہ کو نظر انداز کر دینے سے ہوتا ہے کبھی کبھی وہ چند کلیوں پر قانع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قدرت کی نیرنگیاں چمن کے دامن کو کتنی رنگا رنگ کلیوں کتنے طرح طرح کے پھولوں سے بھر دیتی ہیں۔ ملاسنہ وضعداری کو ایک حد تک نباہنا برا نہیں مگر اس پر نئے تقاضوں اور نئی ذمہ داریوں کو قربان کر دینا غلط ہے۔ جو لوگ شعر کی تجارت کرتے ہیں ان سے تو خیر کوئی بحث نہیں مگر جنھوں نے ادب اور شعر کے بلند مقاصد پر علم و فن کی چند مخصوص روایات کو مقدم رکھا ہے ان سے ظرف اور

ذوق کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا جاسکتا ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ حفیظ صاحب کی پچھلی شاعری کیسی تھی اور اب انھوں نے غزل میں تعمیری رجحانات کو داخل کرنے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سے پہلے کہ جدید کلام پر کچھ کہا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے ابتدائی دور کے کلام کا انتخاب کسی قدر تفصیل سے پیش کردیا جائے۔ اس سے دو باتیں واضح ہوجائیں گی۔ ایک تو حفیظ صاحب کی ذہنی تعمیر اور انکے نفسی ارتقا پر روشنی پڑے گی اور دوسرے بعض لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ غزل میں اجتماعی رجحان کو بگڑے ہوئے یا ناکام شاعروں نے اپنایا ہے اسکی تردید بھی ہوجائے گی۔ حفیظ صاحب پہلے بھی ناکام نہیں تھے اور اب بھی نہیں ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:۔

وہ بھی آزردہ نہ ہوں دل کی خلش بھی کم کریں
یعنی شکوہ تو کریں اُن سے مگر مبہم کریں
پھر کریں تعریف اُن کے مُنہ پر اُنکے حُسن کی
بے وفا کہہ کر یکایک پھر انھیں برہم کریں
چاندنی کے ساتھ ہی تارے بھی رخصت ہو چلے
اس مناسب وقت پیمانِ وفا محکم کریں

ڈوب جائے گی یہ کشتی گر اسے ساحل ملا
زندگی کو ہر قدم پر ایک طوفاں چاہیئے
یہ فریب آب و گل ہے اس پہ کیا اُٹھے گی آنکھ
روحِ گلشن چاہیئے، جانِ گلستاں چاہیئے

کیا جانئے دل کو توبہ کی یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی
اُسکے بھی کرم پر حرف آیا اپنی بھی خطا بدنام ہوئی
بھڑکی ہوئی آگ دبائی بھی تو اُٹھنا دھواں کب رُکتا ہے
ہم ضبطِ فغاں کرتے ہی رہے اللہ دل کی حکایت عام ہوئی

کہاں وہ بزمِ ازل کے جلوے کہاں یہ دیر و حرم کے پردے
جمالِ رُخ پر مچلنے والے نقاب رُخ سے بہل رہے ہیں
زہے گدازِ غمِ محبت خوشا یہ آدابِ سوزِ الفت
نہ کچھ دھواں ہے نہ کوئی شعلہ بڑے سلیقہ سے جل رہے ہیں

کیا جانئے کیا سبب ہے کہ جی چاہتا ہے آج
رولیں ہی جا ئیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم
اب انتہائے ضبط نے دل میں لگائی آگ
بیٹھے تھے آنسوؤں کی بغاوت دبا کے ہم
کیسا خیال کس کی محبت، کہاں کا عشق
یونہی جھجک گئے تھے ترے پاس آکے ہم

ہائے وہ سادگی رنگا رنگ
ایک عالم میں سینکڑوں عالم
اُن کی دزدیدہ پڑرہی ہے نظر
اپنے لغزیدہ اُٹھ رہے ہیں قدم

بے تابیاں ہیں اور نہ غم انتظار ہے
یہ اعتبار ہے کہ عدم اعتبار ہے
کیا عہد تھا کہ آپکی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپکی اُلفت بھی بار ہے
سچ جان میں نے تیری تمنا کبھی نہ کی
اور یوں ترے کرم کا مجھے اختیار رہے

نیم باز آنکھوں سے یہ کیا اگر پیار کیا
نہ تو معصوم ہی چھوڑا نہ گنہگار کیا
میں تو اس درد کے انجام سے تھراتا ہوں
جس کے آغاز نے تم کو مرا غمخوار کیا
رکھ لیا ہاتھ مرا اپنے دھڑکتے دل پر
میں نے جب عہدِ وفا کے لئے اصرار کیا
ہائے مجبوریٔ الفت کی یہ باتیں سوز و گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

شروعِ عشق کی ناکامیاں ارے توبہ
خود اپنے دل سے مجھے مدتوں حجاب رہا
دھڑکتے دل کی قسم آپ کے نہ آنے سے
تمام رات ستاروں کو اضطراب رہا

انھیں بھلا کے تو کچھ اور ہو گئے برباد
ہو اسکوں ہی میسر نہ اضطراب رہا
زباں تو پھر بھی زباں ہے نگاہ تک نہ اٹھی
مگر وہ شکوہ کہ اس پر بھی کامیاب رہا

نہ شوخیوں سے نہ سنجیدگی سے ملتی ہیں
وہ لذتیں جو تری برہمی سے ملتی ہیں
جب اس کے غم کے سوا زیست کچھ نہیں ہوتی
وہ ساعتیں بڑی خوش قسمتی سے ملتی ہیں
نہیں ضرور کہ قربت ہو وصل کا حاصل
کہ دوریاں بھی تو وابستگی سے ملتی ہیں
اگرچہ ترکِ تعلق کو ایک عمر ہوئی
وہ نظریں اب بھی اسی دلکشی سے ملتی ہیں
دلِ تباہ مری بات کا خیال نہ کر
ملامتیں بھی تو ہمدردی سے ملتی ہیں

اُف رے شکایتِ جفا واہ رے شکوۂ ستم
ہنستے رہے حضور میں رو دئے دور جا کے ہم
ہائے یہ کیا مقام ہے ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم حسن کی آستیں بھی نم
شاید اُسی طرف سے کچھ لطف میں ہو گئی کمی
حجاب کوئے دوست جو آج نہ اٹھ سکے قدم

اس میں شک نہیں کہ یہ اشعار فنی دلکشی کے لحاظ سے اچھے سے اچھے شاعر کے لئے سرمایۂ افتخار کہے جا سکتے ہیں۔ ان کو پڑھنے سے وجدانِ شعری میں تحریک بھی پاتا ہے لیکن یہ تحریک اُسے کسی بہتر راہ کی طرف نہیں لے جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع شروع میں حفیظ صاحب کی تخلیقی کوششوں کا پوری طرح سوچا سمجھا مقصد نہیں تھا۔ پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہیں جو حفیظ صاحب کے اس پچھلے کلام کے رنگ کو مذاقِ عام کی سطح سے اونچا کرتی ہیں۔ انکی لغزشوں کی زندگی میں بے راہ روی نہیں ہے وہ عشق کی روایات کو پیش کرتے ہیں مگر انکا ایک خاص اصول بھی ہے جو انھیں ایک حدِ خاص سے آگے نہیں بڑھنے دیتا نہ وہ گنہگار بننے پاتے ہیں نہ اپنی معصومیت جتاتے ہیں۔ جدید نفسیات اس سلسلے میں کیا کہتی ہے یہ ذرا جداگانہ بحث ہے شاید اُسے جھجک سے تعبیر کیا جاتے مگر اس پر بھی غور کر لینا ہوگا کہ "پیش دستی" میں نفسیاتی و ذہنی الجھنیں جھجک سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ کچھ کم نہیں کہ حفیظ کا سوز و گداز مجبوریوں کے سانچے میں ڈھل کر تبسم آمیز نشاط تو بنجاتا ہے مگر وہ نالہ و فغاں یا بصورتِ دیگر "طاقتِ نالہ اور یارائے فغاں" کے گلے شکوے نہیں کرتے۔ اپنے آپکو اتنا سنبھالے رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کہیں کہیں اس ابتدائی دور کے کلام میں حفیظ صاحب نے نفسیاتِ انسانی کو ایسے زاویہ سے بھی دیکھا ہے جو انکے رجحاناتِ ذہنی کی صحت مندی پر دلالت کرتا ہے۔ ایسے اشعار یقیناً تعمیری کہے جا سکتے ہیں یوں تو ہر شاعر کے کلام میں ایسے اشعار ڈھونڈیئے تو دو چار مل ہی جائینگے۔ استاد طالب علم سے کوئی مشکل سوال کرتا ہے۔ طالب علم کبھی گھبرا کر "ہاں" میں جواب دیتا ہے کبھی "نہیں" کہہ دیتا ہے، دونوں میں سے کوئی نہ کوئی جواب صحیح نکل ہی آتا ہے۔ مگر ایسے تک بندی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اس سے کلام کی عظمت گھٹتی ہے۔ کلام کی عظمت ہمیشہ مربوط سوچ بچار، فکر انگیزی اور صحت مند قسم کے نفسی ارتقا سے بڑھتی ہے۔ اس نظر سے جب کبھی میں نے حفیظ صاحب کے کلام کا جائزہ لیا مجھے انکی شاعری میں کامیابی کے بہت سے عناصر نظر آئے

فانی کے مقطعے عموماً بڑے زوردار ہوتے ہیں۔ فانی کے بہترین اشعار زیادہ تر انکے مقطعے ہیں جن میں انھوں نے اپنے تخلص کی رعایت سے غمِ ہستی کے اسرارِ فنا و بقا پر قابلِ قدر نکتے پیش کئے ہیں حفیظ صاحب نے اپنے تخلص سے تو فائدہ نہیں اُٹھایا مگر انکی غزلوں کے مقطعوں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنے کے بعد یہ احساس قوی ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شعر کافی سوچ کر کہا ہے اور کافی سنبھل کر ادا کیا ہے جس سے نہ علم کا وقار گھٹنے پاتا ہے نہ جذبے میں تصنع پیدا ہوتا ہے انکے یہاں نہ علم کی خشونت ہے نہ فن کی بیترہ بازی جو آرٹ کو بقولِ آل احمد سرور "Miniature Painting" کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ انکے مقطعوں میں ذہنی ارتقا کی جھلک نظر آتی ہے اور سوچ بچار کے بہت سے گوشے ترتیب کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اسی بنا پر میں نے اوپر انکی شاعری میں کامیابی کے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ شروع شروع میں جب زندگی غیر مقصدی اور دنیا سے بیزار سے دور تھی تو اشعار میں اسی قسم کا رنگ ملتا ہے۔ اگرچہ اس طرزِ زندگی کی محدودیت کو انھوں نے کبھی دل سے نہیں بھلایا۔ انھیں اس بات کا

خیال ہمیشہ رہا کہ دُنیائے جد وجہد سے کنارہ کشی نے انکی زندگی کو محدود کر رکھا ہے۔

دُنیائے جدوجہد کہاں میں کہاں حفیظ
اپنی تو کائنات بس اشعار ہی رہے

پھر جب حالات کے زیر اثر اور ارتقائے فکری کے تحت مسائل زندگی پر گرفت بڑھتی گئی تو انھوں نے ایک نئے طرز زندگی کی طرف اثباتی طور سے پیشقدمی شروع کر دی اور زندگی کو اتنا بدل ڈالا کہ "تخلیق شعر رنگیں" اور "بادہ خواری" کے اس مقوی شباب عمل سے جب دوزخ نگلے جاتے ہیں اور جنتیں اُگلی جاتی ہیں (چاہے وہ روائتی ہی کیوں نہ ہو) —— نئے دور کے تقاضوں کو درد کا تعلق بھی نہ رہا اور وہی حفیظ صاحب جو کبھی "فخر میکدہ" تھے سر بزم "درس پاکبازی" دیتے نظر آنے لگے۔ اب وہ زندگی کو موت سے ٹکرا کر عشق و مستی کے چند عظیم اور انوکھے تجربوں کو اپنے اشعار کی زینت بنا رہے ہیں ؎

حُسن جنوں نواز کا دیکھا جو التفات
مستی میں آکے موت سے ٹکرا گئی حیات

بہر کیف اب کچھ مقطعے ملاحظہ فرمایئے جنھیں ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

ایسا بھی کیا حفیظ طبعیت کا انقلاب
اس بے وفا کے غم سے مسرت ہوئی مجھے

اس غم میں حفیظ آخر کب تک چپ چپ سے کھوئے کھوئے سے
سودائے محبت چھوڑ دیجی، اب اُٹھو دیکھو ! شام ہوئی

حفیظ اپنی یہ بادہ خواری اور اُس پہ تخلیق شعر رنگیں
ہزار دوزخ نگل رہے ہیں ہزار جنت اُگل رہے ہیں

فریب دیر و حرم میں نہ کھا سکوں گا حفیظ
بہت قریب سے دیکھے ہیں کُفر و دیں میں نے

چل دیا جانے کدھر ہستی کی سرحد سے حفیظ
ایسے آوارہ کا ناحق آپ اتنا غم کریں

وہی دیوانہ سا، بربادسا، شاعر سا حفیظ
تم نے بھی کس کے لئے دل کو گرانبار کیا

جو اُٹھ گئیں وہ نگاہیں تو کیا کرو گے حفیظ
پناہِ زہد میں اب تک تو یہ شباب رہا

کافر سرورِ عشق تو تھا ہی مگر حفیظ
اُس سے بھی کچھ لذیذ یہ ظالم خمار ہے

ان اشعار کا حفیظ وہ حفیظ نہیں جو آج غزل میں تعمیری رجحانات کا تجربہ کر رہا ہے۔ ان میں ایک ایسا کردار ملتا ہے جو بے نیاز و بے پروا اور سرورِ عشق کا شیدا ہے مگر یہاں بھی حفیظ صاحب نے روایت کی اندھا دھند پیروی نہیں کی ہے۔ جسکے ثبوت میں اوپر کے کئی اشعار کی طرف نشان دہی کی جا سکتی ہے

اسکے بعد ایسے مقطعے بھی ملاحظہ کیجئے جن میں عشق کی محدود دُنیا سے نکلنے کا احساس پایا جاتا ہے یہی احساس ہے جو آگے چل کر ایک عظیم مقصد زندگی کے عشق کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور درحقیقت اُسی وقت سے تعمیری رجحانات کی ابتدا ہوتی ہے۔

دُنیائے جدوجہد کہاں میں کہاں حفیظ
اپنی تو کائنات بس اشعار ہی رہے

اب بھی وہ اپنا سمجھ کر مجھ کو اپنا لیں حفیظ
کون جانے ورنہ پھر یہ سر کہاں رکھتا ہوں میں

اسی لئے تو یہ مضراب و ساز رو رہے ہیں
حفیظ تارک چنگ و رباب ہو بھی چکا

اور اب یہ رنگِ کلام دیکھئے۔

حفیظ اپنی زباں تو وقفِ اظہار حقیقت ہے
برائے غیر سو مجھ سے غزل خوانی نہیں ہوتی
حفیظ اس میں شامل خلوص عمل ہے
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

کبھی فخرِ میکدہ تھے جو یہی حفیظ صاحب
سرِ بزم دینے آئے ہمیں درسِ پاکبازی
بہ وقتِ عمل اور یہ حفیظ آپ کی مستی
ابھی نہیں وہ نیند جو ہنگامِ سحر آئے
حفیظ ہم تو روانہ ہوئے خدا حافظ
قدم اٹھائیے گا کب کارواں نہیں معلوم
طے کیجئے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظ
اک بزدلی کی بات ہے اک مردمی کی بات

اُس دور کے کلام میں جب کہ وہ ایک بہتر طرزِ فکر کی جستجو کر رہے تھے ابھی اُس تک پہنچے نہیں تھے کئی باتیں بیک نظر سامنے آتی ہیں ایک کا تذکرہ تو میں ضمناً پہلے ہی کر چکا ہوں یعنی غیر محتاط سپردگی کے بجائے ان کے یہاں احتیاط اور اصول پسندی ملتی ہے۔ اب اسے چاہے اصول پسندی کا اثر کہہ لیجئے یا حفیظ صاحب کی افتادِ طبع کی صالحیت کہ ہمیں اس کلام میں عشق کا جو تصور ملتا ہے اور عشقیہ شاعری کے جو عناصر جستہ جستہ نظر آتے ہیں وہ اپنے فنکار کو ایک جُدا رنگ میں پیش کرتے ہیں جسے اپنے جدید کلام میں انھوں نے ایک بلند تر اخلاقی مقصد کی جلا دیکر نکھارا ہے" فراز" میں حفیظ صاحب نے کہا تھا:-

ہوا و حرص کے مارے ہمیں نہ دیکھ سکیں — حریمِ غم کے منارے ہمیں نہ دیکھ سکیں
جہانِ نیں کے کنارے ہمیں نہ دیکھ سکیں — جہاں فلک کے ستارے ہمیں نہ دیکھ سکیں
مرے حبیب خطِ کہکشاں سے دور کہیں

ہمارے عہدِ وفا پر کلی بھی منہ نہ چڑھائے — گلابِ شوخ اتر کے نہ سمجھ کے نہ ہوجائے
قدم سنبھل کے اٹھاؤ نسیم جاگ نہ جائے — سحر کو نہ دہ گل کہیں کہیں نہ اڑائے
سکوتِ شب میں ہر اک راز داں سے دور کہیں

اسی دور کی ایک دوسری نظم "وعدہ" کا موضوع بھی عشقیہ ہے۔

اب نہ دیکھو گی مجھے چمنِ رنگیں کے قریب — اب نہ پاؤ گی مجھے پردۂ زریں کے قریب
اپنے گلزاروں کے ان سنبل و نسریں کے قریب — زلفِ مشکیں کے قریب عارضِ سیمیں کے قریب
اب نہیں آؤں گا اے جان نہیں آؤں گا
حرمِ حسن کے قربان نہیں آؤں گا۔

مگر تعمیری ادب کی تحریک اس طرزِ فکر کی اصلاح کر چکی ہے اب بھی وہ دل کی دھڑکنیں سن رہے ہیں مگر ایک بلند اور وسیع تر مقصد نے زندگی کے دوسرے مقاصد کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے

میں سُن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں

دیکھئے، حفیظ صاحب نے یہ نہیں کہا کہ پہلے ذرا غمِ جہاں سے نپٹ لیں پھر حیات کا ماحول خوشگوار ہونے پر عیش ہی عیش منائیں گے نہیں! وہ اس ہیجان انگیز اور جذباتی استدلال کے بجائے محبت کا ایک مستقل نظریہ پیش کر رہے ہیں یہ نظریہ انھوں نے اسلام کے ہمہ گیر تصور سے اخذ کیا ہے۔ اس میں تعمیری عناصر کی فراوانی اور توافق کارفرما ہے۔

شعر و شاعری کے سلسلے میں داخلیت اور خارجیت کی بحثیں عموماً فنکار اور نقاد کے لئے وبال بن جاتی ہیں کبھی کبھی اصل مدعا تک ان بحثوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ داخلیت کو نظر انداز کیجئے تو تخلیقات "لفظ بے معنی" ہو کر رہ جاتی ہیں، خارجی آب و رنگ سے آنکھیں پھیریئے تو انکی حیثیت "معنی بے لفظ" کی سی ہو جاتی ہے۔ اچھی شاعری وہی ہے جو "لفظ بامعنی" کی تعریف میں آ سکے اور اسکے لئے فن اور فکر کا جمالیاتی اور اخلاقی معیار پر پورا اترنا ضروری ہے سادہ سی بات ہے جیسے خیالِ حسن اور حسنِ عمل کی گورکھ دھندے والی بحث کے بغیر بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے خارجی آب و رنگ بھی ایک چیز ہے مگر حسنِ داخلی کے بغیر تو ادب اور شعر میں جان اور توانائی ہی نہیں آتی۔ اور داخلی حس کے لئے چاہئے ایک صحت مند قسم کا طرزِ فکر اور توانائی سے بھرپور شعور۔ اس خیال کی اصل وہی ہے جسے اقبال نے نغمۂ نے کی روح کہا ہے

آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرورِ مے
اصل اسکی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے

اور نے نواز کا دل حقیقت میں دل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ دلِ آگاہ ہوتا ہے حفیظ صاحب نے اسکو زندگی کا جزوِ لازم کہا ہے

اے دلِ آگاہ غم کیسا خوشی ہوتی ہے کیا
زندگی ہوتی ہے لیکن زندگی ہوتی ہے کب

حفیظ صاحب نے شعور و آگہی کے اس رمز کو اپنے لئے سمیع راہ بنایا ہے وہ تخلیقی عمل کے لئے اس شعور کو ضروری سمجھتے ہیں جو فنونِ لطیفہ کو زندگی کی آواز بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں سپردگی پر فکر غالب ہے مگر جب وہ فلسفہ کی بات کرتے ہیں تو اسمیں مصلحت بینی نہیں ہوتی اسمیں سوز ہوتا ہے جو خونِ جگر سے آتا ہے

یہ تو رہا داخلی پہلو۔ فن اور خارجی پہلو کے بارے میں حفیظ صاحب کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے لئے میں حفیظ ہی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں

جوہر فن بھی نمائش کی کوئی شے تھی حفیظ
تم عیاں کرتے نہ کرتے یہ عیاں ہوجاتا

تقسیم سے پہلے انکے یہاں اجتماعی رجحانات کا اظہار نہیں ملتا مگر اسکے بعد انھوں نے مطالعہ سے اپنے اجتماعی شعور کو بہت نکھارا ہے۔ انھوں نے اسلام کے نظام اجتماعی کو بڑی سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ غزل میں ان رجحانات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے غواصی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہاں رموز و علائم کے ذریعہ تفصیل کو اجمال کا جامہ پہنانا پڑتا ہے۔ زندگی کی وسیع و عظیم اور بحر ذخار کی سی پہنائیاں رکھنے والے تجربوں کو الفاظ کے کوزوں میں بند کرنا ہوتا ہے۔ زندگی اور اسکے تجربوں کا گہرا شعور رکھے بغیر یہاں کوئی تخلیقی قسم کا کام کرنا مشکل ہے۔ ویسے روایتی شاعری تو سبھی کر لیتے ہیں مگر سب کو صحیح معنوں میں اسکا کریڈٹ نہیں ملتا۔ کریڈٹ اسی کو ملتا ہے جسکے یہاں کچھ مستقل نئے اضافے بھی ہوتے ہیں

حفیظ صاحب نے غزل میں تعمیری رجحانات کو پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے اُسے اسی نظریے سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی پہلی باضابطہ کوشش انھوں نے ایک طرحی مشاعرے میں کی تھی۔ باضابطہ میں نے اسلئے کہا کہ اس سے پہلے بھی اگرچہ انکی غزلوں میں جستہ جستہ تعمیری قسم کے اشعار ملنے لگے تھے مثلاً

انسان کو بزم ہستی میں اصداد کا پیکر پایا ہے
گہ تخت پہ ٹھوکر دیکھی ہے گہ کھٹ پہ کبھی سر پایا ہے
تہذیب نو سے رشک جناں بن گئی زمیں
یہ اور بات ہے یہاں انسان نہیں رہا

مگر ابتک کوئی غزل پوری کی پوری اسی رنگ میں نہیں کہی تھی۔ یہ بات عجیب تھی کہ باوجود اسکے مشاعروں کی فضا سے یہ رنگ بالکل مختلف تھا۔ مشاعروں میں بہت سراہا گیا۔ یہ میں ۱۹۴۸ء کی بات کہہ رہا ہوں جب غزل کہنا سننا اور مشاعرے کرنا بڑی جی داری کا کام تھا حفیظ صاحب نے اپنی غزل کو یکسر بدل ڈالا۔ غزلیں تغزل کے بجائے اب اجتماعی شعور کی آئینہ داری کر رہی تھیں۔ انکی یہ پہلی تعمیر پسند غزل جسے دیر میں نے باضابطہ کوشش کہا ہے، انکے اس ذہنی انقلاب کی مظہر ہے

ہر شکوے کی تہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

اے پرستاران نغمہ! چھوڑ کر تار رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں
بائے رے نیرنگیاں ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں
ہیچ ہیں میری نظر میں آشیان و گلستاں
آدمی ہوں عزم تعمیر جہاں رکھتا ہوں میں
آج تک گذری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

یہاں سے حفیظ صاحب کی شاعری کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے ہم تعمیری دور کہہ سکتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انکے اس دور کے چمنستان غزل سے مفصل خوشہ چینی کی جائے تاکہ قارئین کلام کے بارے میں پوری طرح رائے قائم کر سکیں۔

ہر عشق کے تقاضے کیسے جائے تولے — کہیں تجوں کے حیلے کہیں ہوش کے بہانے
بھلی رہنمائیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں — وہی رخ قرار پایا جو ہواد با ہوا نے
اعیں بیت چمن میں کوئی کیوں تمام کرے — ہمیں برق کے بھی قابل نہ سمجھے جو آشیانے

کئی منزلیں تراشیں کئی کارواں بنائے
جو سفر کا نام آیا مرے پاؤں لڑکھڑائے
وہ طلب بھی کیا طلب تھی وہ کشش بھی کیا کشش تھی
مری سمت یوں بڑھے ہم نہ خود اپنے ہاتھ آئے
کہیں کلفتوں کا رونا کہیں غفلتوں کا رونا
کسی راستے میں کانٹے کسی راستے میں سائے
وہی میری بیکسی پر لگے ہنسنے دور ہٹ کر
جو وفا کا عہد کرتے مرے ساتھ ساتھ آئے

کسی حد پہ تیکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بنور میرا پیام شاید ابھی جہاں نے سنا نہیں ہے
ہر ایک میکش کے ظرف سے باخبر ہے کتنی نگاہ ساقی
کسی کو ہے حکم جاں نثاری کسی کو اذن وفا نہیں ہے

ہوا قدرداں اس قدر تو زمانہ   کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ
مجھے دوستی کی قسم دینے والے   مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ
نہ پہ ماضی و حال کی الجھنوں میں   صداقت نہیں ہے اسیرِ زمانہ

اک عشق سبک سر ہی سر دار ہے تنہا   اربابِ خرد آئے نہ اصحاب نظر آئے
ہٹتی ہی نہیں اب ترے جلووں سے نگاہیں   آنکھوں کو بڑی دیر میں آداب نظر آئے
خاک بھی نہ بن پائے ابھی اہلِ گماں سے   کچھ اہلِ یقیں خون سے ادھر تک بھی ابھر آئے

اتنا ہی جانئے اس دور میں مفہوم سکوں   جان سی آگئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا
یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں   ہائے کیا ہوگا جو ساقی نے ادھر دیکھ لیا
جگمگانے لگے ذرے تو ستارے نہ رہے   ترا ادھیرا بھی اے نورِ سحر دیکھ لیا

خرد کی بات پہ نہیں کہ گذر بھی جائے دل   خرد کو فرقِ یقین و گماں نہیں معلوم
خلوصِ عشق ذرا تو بھی دیکھنا بڑھ کر   حجاب ہے کہ نظر درمیاں نہیں معلوم

کھلیں کہ بند رہیں راحتوں کے دروازے   حریمِ صبر میں دل بار بار ہو بھی چکا
قصور وار سزاؤں سے جب رہے محروم   شکستِ دل نے خبر دی عتاب ہو بھی چکا

ہائے اس دوریٔ منزل پہ یہ اندازِ خرام   کارواں موج، واں سیل رواں ہو جاتا
یہ بھی اچھا ہوا تجھ پہ نہ کھلا رازِ حیات   سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہو جاتا
اک طرف موت ہے اک سمت ہے توہینِ حیات   ہاں تو پھر فیصلۂ سود و زیاں ہو جاتا

ہر انقلاب تماشہ ہے بدلیوں کے لئے   نہ ہوا نہ وفا دار ہم پر کچھ بھی نہیں
کہاں وہ گرمیٔ گفتار ہم ہی سب کچھ ہیں   کہاں یہ سردیٔ کردار ہم تو کچھ بھی نہیں
ادھر جو چھاؤں سی دیکھی تو آکے بیٹھ گئے   لرز نہ سایۂ دیوار ہم تو کچھ بھی نہیں

یہ کمالِ سادگی ہے کہ مقام بے نیازی   مرا کھیل سنگ باری مرا کام شیشہ سازی
وہ تباہ زورِ بازو، یہ خرابِ رسمِ تقویٰ   کہ حجم نیا سپاہی تو عرب نیا نمازی
تری تیغ خوں سے رنگیں تری لاش خوں سے رنگیں   یہ ہیں واقعاتِ خونیں نہ شہید تو نہ غازی
یہ غلامیٔ کی لعنت ہے شرافتوں کی عصمت   جو یہ ہو تو دینداری یہ نہ ہو تو دین بازی
میں تو اصولوں سے توبہ تو ہزار بار کر لوں   مگر اس جدیدیت کا کوئی وصفِ امتیازی

ابھی کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں   لُٹ گئی عصمتِ بہار کہاں
درد ہی چین سے نہیں رہتا   دل میں گنجائشِ قرار کہاں
سہہ سکے بار آشیانے کا   شاخِ گل اتنی پائیدار کہاں

چاہے تن من سب جل جائے   سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے   دل ٹوٹے آواز نہ آئے
دُنیا کا اپنا ناہی کیا   کانٹے اپنے پھول پرائے
کاش ہمارا فرضِ محبت   عیشِ محبت پر چھا جائے

تعمیر پسند تحریک غزل کو کس رخ پر لے جا رہی ہے اسکا اندازہ ادب کے انتخاب سے بخوبی کیا جا سکتا ہے غزل کو جس خلوص اور دل سوزی سے حفیظ صاحب نے اپنایا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ تعمیر پسند غزل گو شعراء میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ تعمیر پسند غزلوں کا جو انتخاب ادب پیش کیا گیا ہے اُسے سامنے رکھ کر کئی ایسے گوشے اجاگر کئے جا سکتے ہیں جہاں نئے نظریہ کو سامنے رکھ کر نئے نئے تجربے کئے گئے ہیں مگر اسطرح بات خاصی طویل ہو جائیگی اسلئے انکی جانچ پرکھ کو قارئین پر چھوڑ کر حفیظ صاحب کے ایک تنقیدی مقالے سے میں وہ حصہ نقل کرتا ہوں جہاں انھوں نے غزل اور اسکے فن کے بارے میں اپنا نظریہ واضح کیا ہے۔

"اس میدان میں قدم رکھنے سے پہلے غزل اور نظم کا یہ فرق ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ غزل کلیات سے بحث کرتی ہے جبکہ نظم کا زیادہ تعلق جزئیات سے ہے غزل کا دار و مدار بھرپور ہوتا ہے کسی جذبہ، احساس، یا خیال کو ٹھہر ٹھہر کر بیان کرنا نظم کے لئے جتنا صحیح ہے غزل کے لئے اتنا ہی غلط ہے غزل کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اشاروں کنایوں سے گذر کر ان اشارکا . . صاف صاف نام لینے سے حتی الامکان گریز کرتی ہے جو واقعی زیرِ بحث ہیں اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی لطافت اور آفاقیت کھو دے گی اس کی تمثیلی انداز میں گفتگو کرنے کی ادا اسے زمان و مکان کی حدود سے بالاتر کر دیتی ہے۔"

اسی مقالے میں حفیظ صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"غزل کے ذریعہ ہم اپنا مخصوص پیغام تشریحات اور توضیحات کے بغیر محض اشاروں کنایوں میں دوسروں

تک پہنچا سکتے ہیں اور ان اشاروں کنایوں کے صحیح مفہومات متعین کرنا خود غزل کا کام نہیں بلکہ دوسری اصناف ادب اور اس سوسائٹی کا کام ہے جو ادب کو حقیقی اقدار حیات کا علمبردار دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر آیاتِ الہٰی کے غلط مطالب نکالے جائیں تو حق شناس گروہ اصل عبارت میں اضافہ کرنے کے بجائے ان آیات کا صحیح مفہوم اپنے لٹریچر اور عمل کے ذریعہ پیش کرے گا تاکہ حقیقت سب کے سامنے آجائے۔"

غزل کے رموز و علائم کا صحیح پس منظر کیونکر اجاگر کیا جاسکتا ہے؟ اس پر بھی حفیظ صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کچھ مشورے بھی دیئے ہیں جو آج بھی تعمیر پسند نقادوں کے لئے قابل غور ہیں مناسب ہوگا اگر مقالہ کے اس حصّہ کو یہاں بجنسہٖ پیش کر دیا جائے۔

"اس موقع پر آپ سوال کریں گے کہ اگر ہم غزل میں حقائق کو کھول کھول کر بیان کرنے اور خرابیوں پر تنقید کرنے سے باز رہیں تو لوگ ہماری غزلوں کے اشعار کا وہ مفہوم سمجھیں گے جو ہم سمجھانا چاہتے ہیں یہ اندیشہ اپنی جگہ درست ہے مگر اسکا دفعیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے مقررین، صحافی، ناولسٹ ڈرامہ نگار اور دوسرے نثر لکھنے والے غزل کے اشعار کو اپنی تخلیقات میں اس سلیقہ کے ساتھ اور برموقع استعمال کریں کہ پڑھنے والوں کے ذہن نشین وہی مطالب ہو جائیں جو تعمیر پسند شاعروں نے ان میں جان بوجھ کر رکھے ہیں۔ تنقیدی مقالوں میں بھی اس مقصد کو پیش نظر رکھا جائے تو تغزل پسند حلقہ کا انداز تطبیق رفتہ رفتہ بدل جائے گا تیسرے یہ کہ اسلامی تحریک عملاً جسقدر وسعت اختیار کرے گی عوام کے دل و دماغ پرانے تصورات سے ہٹکر ان مسائل کی طرف رجوع ہونگے جو ہمارے نزدیک زیادہ اہم ہیں اور اسطرح بھی اسلامی غزل کے لئے بالآخر ایک سازگار فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس اندازہ کی تائید میں یہ حقیقت پیش کی جاسکتی ہے کہ آشیاں، صیاد، قفس، ساقی، محفل وغیرہ کے معنی آج پہلے سے بہت کچھ بدل گئے ہیں واقعات کے خاموش مفسر نے ان الفاظ کی اتنی واضح تفسیر کی ہے کہ ابہام کی گنجائش نہیں رہی۔"

("ادبیات میں کی نظمیں؟ ایک جائزہ معیار اپریل ۱۹۵۳ء")

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ صاحب غزل کے فنی اور موضوعی مسائل پر کیسی گرفت رکھتے ہیں۔ جمیل احمد فاروقی نے اپنے ایک مقالے "ہمارے اسلام پسند شاعر" میں حفیظ صاحب کے بارے میں جچی تلی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

صنف ادب کے اس تنگ دائرے میں کلاسکل اور روایتی میراث کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ہمیں حفیظ کے رنگ تغزل میں جیسے شاہ شعریت، لطافت و پاکیزگی، سادگی و پرکاری، گہرائی اور مقصدیت نظر آتی ہے وہ بہت کم غزل گو شاعروں کے یہاں ملتی ہے اسکی غزلوں میں داخلی اور خارجی کیفیات کا ایک ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے جو ذہن پر ایک گہرا نقش اور دائمی تاثر چھوڑ جاتا ہے اور یہ تمام خصوصیات حسن دلکش اسلوب و طرز ادا کے ساتھ تنگنائے غزل میں اشعار کا جامہ پہنتی ہیں اسکا اگر ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ حفیظ کا فن ایک مخصوص انفرادیت کا حامل ہے۔"

(منقد نمبر ماہنامہ معیار ۱۹۵۲ء)

اسکے ساتھ ساتھ جمیل احمد فاروقی نے حفیظ صاحب کے کلام میں خستگی کے عناصر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو قابل غور ہے۔

"کبھی کبھی حفیظ کی غزلوں میں زندگی کی تلخ کاموں کا احساس اور خستگی کا عنصر غالب ہو جاتا ہے نہیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز شدید مایوسی اور قنوطیت کی شکل نہ اختیار کرے۔ اس پہلو پر اسے ہر وقت گہری نظر رکھنی چاہیئے تاکہ مایوسی مزاج کی مثال آنکھوں کے سامنے ہے۔"

اسمیں شک نہیں کہ کہیں کہیں حفیظ صاحب کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے غم انگیزی ٹپکتی ہے۔

اللہ رے اس غریب تمنا کی بیکسی — دل بھی کبھی کبھی جسے پہچانتا نہیں
کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظ — گدگدا کر رلا گئی دنیا
ہائے وہ نغمہ جس کے معنی — گاتا جائے روتا جائے
بزم طرب میں آج ذرا ہم بھی ہو چکے نغمہ سرا — لیکن ایسی چیخوں کی ساز سے کیا لی آواز

مگر غم کا اظہار شعر کو بلند ترین جذبات کا حامل بھی بنا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ غم ہمیشہ مایوسی اور قنوطیت ہی کا پیش خیمہ ہو اور فراری ذہنیت پیدا کرے۔ وہ سوز و گداز کا قالب بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے :-

Our sweetest songs are those
that tell the saddest thought.

سوز و گداز اچھی شاعری کا جزو اعظم ہوتا ہے اسکو قنوطیت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اسمیں دوسرے کے دکھ کا احساس شامل ہوتا ہے۔ قنوطیت اور فراری ذہنیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی اپنی مشکلات کو سمجھ نہیں پاتا اور اسکے سامنے مستقبل کی روشنی غائب ہو جاتی ہے لیکن اگر بلند مقصدیت کی آغوش میں پرورش پاتا ہے تو اس سے حیات میں لطف اور زندگی میں گرمی آتی ہے اس سلسلہ میں 'فرار' اور 'ہجرت' کی وہ اخلاقی توجیہات قابل مطالعہ ہیں جو ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (مقالہ "ادب کا مقصد" (انتقاد نمبر حصہ اول نگار "لکھنؤ") میں ملتی ہیں وہ کہتے ہیں :-

"تو گویا گریز کی دو قسمیں ہوئیں ایک گریز وہ جو محض برائے گریز ہو ایک گریز وہ جو قوت حاصل کرنے کے لئے کیا جائے جسے ہم 'ہجرت' کہتے ہیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے 'ہجرت' کا درجہ گریز سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ یہ قوت دیا حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ آدمی پھر تازہ اور طاقتور ہو کر پھر زندگی کی کشمکش کو سر کرنے کے قابل ہو جائے۔"

دراصل یہ فنکار کا نظریہ حیات ہوتا ہے جو اسکی ذہنیت کو بناتا ہے حفیظ صاحب نے جس نظریہ کو اپنایا ہے اسمیں یقیناً فرار اور قنوطیت کی گنجائش نہیں ہے۔ ویسے اس جہاں سے صحیح نظریہ اور پیش کئے گئے ہیں اور سوز و گداز کے حامل ہیں حفیظ صاحب کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت نظر آتے ہیں جن میں عزم و امید اور غم میں مسکرانے کی ہمت ہے جس غزل کی زمین ہم نے کچھ بھی نہیں پایا ہے اگر کوئی قنوطی شاعر کہتا تو تمام کے تمام اشعار اسی رنگ میں ہوتے مگر حفیظ صاحب نے طنز سے ان اشعار میں قنوطیت کے بجائے تحریکیت کے امید افزا عناصر شامل کر دیئے ہیں۔ اسی طرح ایک نظم "داغ" میں جو رفیقۂ حیات کی موت سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے غم کا جو تصور ملتا ہے وہ تعمیری کہا جا سکتا ہے یہ تجربہ مرثیہ و مقصد میں تعمیر پسند نقطۂ نظر سے مستقل اہمیت رکھتا ہے

میرے کاشانے کے ہر ہر گوشۂ تاریک میں
جیسے تم موجود ہوتے ہو نظر آتے نہیں
آج کیوں راہِ صداقت میں بصد عزم و ثبات
ہر قدم پر حوصلہ افزائی فرماتے نہیں
پھر محبت میں تماشہ بن گیا میرا وجود
پھر اُسی انداز سے کیوں آ کے سمجھاتے نہیں
پھر ملامت کا نشانہ بن گئیں قربانیاں
تم کہاں ہو؟ "آفریں" کے پھول برساتے نہیں

ایک شعر میں البتہ شدید فرسٹریشن کے اثرات ملتے ہیں ؎

یہ زندگی بھی حفیظ آہ کتنی ظالم ہے — یہاں خیال کی دنیا میں بھی بنا نہیں

مگر یہ شعر اسوقت کا ہے جب تعمیری ادب کی تحریک وجود میں بھی نہیں آئی تھی رہی سوز و گداز کی بات تو واقعی جب حفیظ صاحب کہتے ہیں کہ

بزم طرب میں آج ذرا نم کئی ہوئے تھے نغمہ سرا
لیکن ایسی چیخوں کی ساز سے کیا ملی آواز

تو عام طور سے وہی تاثرات ہو سکتے ہیں جن کا اظہار رسل احمد فاروقی نے کیا ہے لیکن حفیظ صاحب اپنی چیخوں کا بھی ایک سوچا سمجھا مقصد رکھتے ہیں چیخیں بے معنی نہیں ہیں اس ہلاکت خیز دور میں جبکہ دل پتھر بن گئے ہیں چیخوں ہی کی ضرورت ہے۔ شاید آدمی کی بے حسی کو غم کے نالے بھی چونکا سکیں ؎

مغنّی میرے نغموں نے تو مدہوشی بڑھا دی ہے
مری چیخوں سے شاید آدمی بیدار ہو جائے

(حفیظ)

اصغر علی عابدی

مغربی ادب کے تین دَور

تمام دُنیا کا موجودہ ادب مغربی ادب کے زیر اثر ہے اس لئے جبتک ہم مغربی ادب کا جائزہ نہ لیں اور یہ نہ دیکھیں کہ وہ کس ماحول، میں پروان چڑھا، وقت کی کونسی ذہنی اور فکری تحریکوں نے اسکو غذا بہم پہنچائی اور سماج کے کس ڈھانچے سے وہ متاثر ہوا، اسوقت تک ہم موجودہ ادب کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اور نہ کسی ادیب اور فنکار کو جانچ سکتے ہیں

مغربی ادب کو بآسانی تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ قدیم ضابطہ بندی کا عہد (Classicalism)
۲۔ رومانیت کا عہد (Romanticism)
۳۔ جدیدیت کا عہد (Modernism)

اگرچہ ان تین مختلف عہدوں کو بھی بعض لوگ الگ شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں لیکن مغربی فکر کے راستے کی مجموعی نشان دہی کے لئے یہی تین اصطلاحات کافی ہیں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی تقسیم کی جاسکتی ہے تو وہ جدیدیت اور کلاسکیت میں ورنہ رومانیت کی تقسیم محض سطح بینی کا نتیجہ ہوگی سطح بینی جذبات اور لذتیت ہر زمانے کی رومانیت کا ورثہ ہے کلاسکیت میں دراصل کھلے کھلے دو عہد پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جسکا تعلق براہ راست الہامی کتابوں سے ہے، دوسرے وہ جو ان الہامی کتابوں سے اخذ کردہ بلکہ مسخ شدہ خیالات پر مبنی ہے۔ لیکن جس کلاسکیت کا تعلق الہامی کتابوں سے ہے۔ اس کو کسی طرح بھی مسخ شدہ افکار کی کلاسکیت سے نہیں ملایا جاسکتا اسی لئے زیادہ بہتر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلاسکیت کے پہلے عہد کو اس عہد کا جز ہی نہ بنایا جائے۔ یہ عہد نوع انسانیت کا ابدی ورثہ ہے اور جو لٹریچر اپنی اصل حالت میں اسکے ساتھ وابستہ ہے اسکے اندر ایسی ابدیت۔ دوام اور تازگی ہے کہ اسکی مثال انسانوں کے تخلیق کردہ کسی ادب میں نہیں ملتی اس لئے ادب میں کلاسکیت قدامت۔ اور پرانا کے الفاظ کو مسخ شدہ الہامی خیالات کے عہد تک محدود کردینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ ان کا اچھی طرح سے پوسٹ مارٹم کیا جاسکے۔

جدیدیت میں بھی واضح طور پر دو رجحان ملتے ہیں۔ دو دور شامل ہیں۔ ایک وہ جو مسخ شدہ مذہبیت اور رومانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے یا اسکے بطن سے پیدا ہوا ہے دوسرا وہ جو اس پورے دور کی نفی کرتا ہے یعنی مسخ شدہ مذہبیت (کلاسکیت)، رومانیت اور ان کے توسل سے پیدا شدہ "مادیت" تینوں کو رد کرتا ہے اور انسانیت کی ابدی قدروں اور حیات کے دائمی ورثہ پر اپنے آپ کو پروان چڑھاتا ہے۔ لیکن جدیدیت کی اصطلاح چونکہ شروع ہی سے مادیت پسندوں بالادنیت پسندوں کے لئے بولی جاتی ہے۔ اور یہ انھیں کی ایجاد ہے اسلئے اسکو انھیں کیلئے استعمال کرنا بہتر ہے۔ لیکن جدیدیت کے اس دور کی پیدائش سے قبل جب کلاسکیت۔ اور رومانیت سے بغاوت کا احساس پیدا ہو تو ضرور کچھ ایسی قدریں اُبھر گئیں جن کو جداگانہ مقام دیا جاسکتا ہے۔ اور انکے عہد کو ایک الگ عہد کہا جاسکتا ہے یورپ میں حقیقت پسندی (REALISM) کا چرچا انھیں دنوں ہوا۔ لیکن بعد میں یہ حقیقت پسندی لادینیت اور مادیت میں کھوگئی اور اسکی تعبیر ہی بدل گئی جیسے قدیم بھارت کا بدھ انقلاب آگے چلکر برہمنی مت میں کھوگیا اور اسکا مقصد ہی بدل گیا۔

اسطرح ہم ان مختلف اصطلاحات کو یوں دیکھ سکتے ہیں:۔

۱۔ کلاسکیت۔ مسخ شدہ الہامی خیالات کی عکاسی۔
۲۔ رومانیت: جذبانیت لذتیت اور سطح بینی۔
۳۔ حقیقت پسندی۔ کلاسکیت اور رومانیت کے خلاف بغاوت۔
(مگر منفی بنیادوں پر)
۴۔ جدیدیت: لادینیت اور مادیت۔

ان میں کلاسکیت کا آج کے ادب پر کوئی خاص اثر نہیں موجودہ ادب کی اوپری ساخت (SUPER STRUCTURE)

تھا بالکل ہی بدل گئی۔ البتہ اندرونی مغز (INNER KERNEL) اسی جیسا ہے اسلئے اسکی اہمیت ہے لیکن آپ ہم رومانیت، حقیقت پسندی اور جدیدیت کا تجزیہ کریں تو آپ سے آپ اِس اندرون کی کارفرمائی سامنے آجاتی ہے اسی لئے اِس جگہ کلاسکت سے براہ راست کوئی بحث نہیں۔ اب رہا وہ عہد جو براہ راست اصل الہامی لٹریچر سے تعلق رکھتا ہے یا جدید زمانے کے ابدی حقائق پر مشتمل ادب کا عہد ہے۔ تو وہ خود ایک مستقل موضوع ہے۔ لیکن اِس عظیم ادب کی طرف اقدام سے قبل ہمیں اُسکے مقابل کے ادب کو سمجھ لینا چاہئے۔ اسی لئے ہماری بحث مغرب کے صرف انھیں تین ادوار پر مشتمل ہے۔

۱۔ رومانیت۔

۲۔ حقیقت پسندی

۳۔ جدیدیت۔

رومانیت:۔ نئے ادب میں اگرچہ مستقبل پسندی (FUTURISM) اور حقیقت پسندی (REALISM) کا سعودا حاکم ہے، زمانے کے بدلتے ہوئے تمدنی اور سیاسی حالات، اور نئی تحریکوں نے ادب کو اسطرف نہایت شدت سے دھکیل دیا ہے، لیکن اس عام رنگ و روپ کے باوجود رومانیت (ROMANTICISM) بھی پوری شان اور سطوت کے ساتھ جلوہ گر ہے ہرچند کہ آج کا ادیب اپنی زبان سے یہی کہتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ مقصدی، اور واقعیت پسندانہ ادب پیش کر رہا ہے لیکن اسکا قلب اور اسکی روح جیسے چپکے اس کے ادب میں رومانیت اور جذباتیت کی رنگ آمیزی کرتے چلے جارہے ہیں، حتیٰ کہ اسکی تمام تر آزاد روی اور باغیانہ (REBELLIOUS) طرز نگارش جذباتی اور رومانی سموں میں کھو گئی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ گزشتہ دور میں رومانیت کی شکل و صورت کچھ اور تھی اور آج کچھ اور ہے، پہلے وہ بلبل کے نغموں، آبشاروں کے شور، پھول کی پتیوں، اور محبوب کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی تھی، تو آج وہ، مزدور کی پسلیوں، سڑکوں کے گرد و غبار، روٹی کے انبار اور معیشت کے مسائل کے ہمراہ ناچتی ہے۔ آج بھی رومانیت نئے مقاصد اور بدلے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ اور نغمہ سرا ہے لیکن اسکی سرشت اور خصوصیات میں کوئی فرق نہیں آیا، جو حسن اسکی رگوں میں سمٹے ہوئے تقاضوں اب بھی دوڑتا ہے، دیوانگی، جنون، اور مجذوبانہ انداز گفتار کی جو کیفیات اسمیں پہلے ہوا کرتی تھیں وہی اب بھی پائی جاتی ہیں۔

اصل رومانیت کے ادب کے ساتھ اسطرح چمٹے رہنے کے

مخصوص اسباب ہیں اور جبتک بنیادی طور پر وہ اسباب برقرار رہینگے اسکے "چمٹاؤ" میں کوئی فرق نہیں آئیگا، چاہے نئے زمانے کا ادیب اپنے تمام شعور اور ادراک سے کام لے کر اسکو ادب سے خارج کر دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادے، وہ اسکی تمام کوششوں کے علی الرغم کسی طرح جدا نہیں ہوسکتی۔ ہمیں سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کرنا ہے۔

موجودہ ادب کی سرزمین پر رومانیت کا نزول حقیقت میں یورپ کے آسمان سے ہوا ہے، اگرچہ عہد وسطیٰ کے عرب، ایران، ہندوستان، مصر اور چین و جاپان کو بھی اس میں دخل ہے، لیکن یورپ نے اس کام میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، یورپ کے سیاسی اور مادی تفوق، کے ساتھ ساتھ جہاں اسکے دوسرے نظریات اور افکار نے زندگی کے مختلف شعبوں پر قبضہ کرلیا وہیں ادب بھی انکی دستبرد سے نہ بچ سکا اور خصوصاً ان علاقوں کا

جن کو براہ راست یو۔پی اقوام کی غلامی کا شرف حاصل رہا ان ممالک کے ادیب اور شاعر یورپ کی مادی اور سیاسی غلامی کے علاوہ انکی ذہنی اور فکری غلامی میں بھی مبتلا ہوگئے

۱۸۳۰ء سے ۱۸۷۸ء تک کا زمانہ یورپ میں اس رومانیت کے عروج کا دور ہے یہ رومانیت یورپ کی اٹھارہویں صدی کی رومانیت سے بہت کچھ مختلف تھی۔ اٹھارویں صدی میں اگر محض مناظر قدرت، گل و بلبل اور مذہبی عقائد اور جذبات سے گلستان ادب کی آبیاری کی جاتی تھی تو اس دور میں ابھرے ہوئے عقلی نظریات نے گرجاؤں اور کلیساؤں میں بجنے والی گھنٹیوں، مذہبی رسومات اور عبادات کے خلاف ذہنوں میں ہلچل مچادی تھی جسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ادیبوں اور لکھنے والوں کے وہ فطری جذبات عبودیت جن کو وہ نمازوں اور دعاؤں کے واسطے سے صرف کیا کرتے تھے، سحر پرستی، عیش پرستی، حسن پرستی، اور مختصر طور پر ——— وجدان پرستی کی شکل میں لگنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ عیسائی مذہب کے افکار غیر عقلی تھے، انسانیت کے لئے مضر تھے، اسکی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکاتے تھے قدم قدم پر اسکے آگے کانٹے بچھاتے تھے لیکن انکے بدلے میں جو خیالات و نظریات "میدان" میں آئے وہ کون سے عقلی اور اصلاحی تھے؟ زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر انھوں نے کونسا تیر مارا؟ انھوں نے کس وقت اعلیٰ مقصدی ادب کے لئے راستہ صاف کیا؟ اور یہ نسے صحت مند طریقے پر انسانی مزاج کے جذباتی عناصر اسکی عبودیت پسندی

اور حق پسندی کی تسکین کا ان افکار کے عمل اور آمد کا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ لوگ جو کچھ دن بیشتر عیسائی پادریوں کے دام میں گرفتار تھے، بادشاہوں کو خدا کا فرستادہ سمجھ کر انکے آگے رکوع و سجود کرتے تھے، ـــ ان کو چھوڑ کر، ـــ حسن اور دلفریبی، وقتی لذت اور ذہنی حظ کے "بتوں" کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ پارلیمنٹوں، جمہوری اداروں، دفتروں، کارخانوں، کے لوگ اپنے خالی اوقات میں کسی رومان کی تلاش میں سرگرداں اور حیران رہنے لگے۔

سب نے ان دو باتوں کو بالکلیہ تسلیم کر لیا تھا کہ:۔

(۱) 'جذبات' اور 'احساسات' انسان کی رہنمائی ہمیشہ 'حق' اور 'صداقت' کی طرف کرتے ہیں۔

(۲) قدیم 'اصول' اور 'ضابطہ' کی باریک بینی سے کام لینے کی ضرورت نہیں مختصر طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر 'حسین' اور 'خوبصورت' شے ـــ قیمتی اور مفید بھی ہوتی ہے۔

یہ تھا نیا 'ادبی ذہن' اور یہ تھے اس کے کلمات جامعہ۔ 'جذبات' احساسات اور وجدان کو جب یہ بلند مقام حاصل ہوگیا اور ہر بوالہوس نے حسن پرستی کو شعار بنا لیا۔ یسوع مسیحؑ کے ماننے والوں اور معصوم مریم کے شیدائیوں نے اپنے قدیم گرجاؤں اور کلیساؤں کے بالمقابل آزادانہ جنسی تعلقات، جذبات پرستانہ سیاست اور دنیاویت کی تلقین کرنے والے ادیبوں کے نئے 'کلیسا' اور نئی عبادت گاہیں بھی تعمیر کرنا شروع کر دیں، انگلستان میں یہی دور تھا جبکہ اسکی شاعری نے ایک کروٹ بدلی، اور شیلے، ورڈزورتھ، کیٹس، اور بائرن کی قدیم طرز کی نظموں کی بجائے الفریڈ ٹینی سن (ALFREDTENNYSON) اور رابرٹ براؤننگ۔ (ROBERT BROWNING) کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ براؤننگ نے اگرچہ ورڈزورتھ کی قائم کردہ روایات کی پیروی کی، لیکن اس نے قدیم "فطرت پرستی" کو اپنے زمانے کے اصول و نظریات سے ہم آہنگ کر دیا۔ وہ اپنی پرانی "قدروں" کو لے کر زندگی کے نئے اور گنجان راستوں پر دوڑ پڑا۔

اسی طرح ٹینسن نے انگریزوں کی حب الوطنی ایثار اور قربانی کے گذشتہ زمانے کے واقعات کو تمثیلوں کے ذریعہ مسحور کن اور طلسماتی زبان میں پیش کیا۔ اور ایک جذباتی طرز اصلاح کا تعارف کرایا افسانے (FICTION) اور ناول میں بھی عظیم تغیرات ہوئے، تھیکرے - (WILLIAM - MAKEACE THACKFRAY) - کے معاشرتی رومان "نیوکمز" (THE NEWCOMES) چارلس ڈکنس (CHARLES DICKENS) کی "TALE OF TWO CITIES" "DAVID COPPER FIELD" "PICWICK PAPERS" ـــــ اور دوسری کتابوں میں لطیف رومانی قصے اور انداز فکر کے ذریعہ اپنے زمانے کے معاشرتی حالات کی عکاسی کی گئی۔ پھر یہی حال ریڈ (READE) اور جارج ایلیٹ (GEORGE ELIOT) جیسے ادیبوں کا ہے، جو اسی دور کی پیداوار ہیں ان ناول نویسوں کے علاوہ میکالے (MACAULAY) نیومین (NEW MAN) اور رسکن (RUSKIN) جیسے "علمی چیزیں" لکھنے والوں نے بھی اپنی تحریرات کو رومانیت اور ادبی مٹھاس کی چاشنی سے شیریں بنایا۔ اور خالص ٹھوس باتوں کو بھی جذباتی انداز میں پیش کیا۔

انگلستان کی طرح فرانس میں بھی وکٹر ہیوگو (VICTOR HUGO) کے ڈراموں، ناولوں، اور نظموں، الکسانڈر ڈوما (ALEXANDRE DUMAS) کی کہانیوں، ناولوں اور جذباتی تحریروں، بلزاک (HONORDE BALZAC) کی پرجوش اور اونچے طبقوں کی مخالفت اور ان پر نکتہ چینی کرنے والی کتابوں اور مشہور ناول نویس عورت ژرژ ساں (GEAGE SAND) کی غیر معمولی ادبی کاوشوں نے جن میں زیادہ تر وقت کے اخلاق، اور سماج کے خلاف محض جذباتی اور سطحی طور پر تنقید کی گئی تھی، اپنی متحدہ قوت سے تمام یورپ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اسی دور میں جرمنی، روس اور اٹلی میں بھی یہ نیا ادبی رجحان ترقی پذیر تھا لیکن انگلستان اور فرانس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا تھا انگلستان اپنی دستوری تبدیلیوں، سیاسی برتری، اور مذہبی تغیرات کے باعث ابھرتا اور پھیلتا جا رہا تھا اور فرانس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد سے لوگوں کے ذہنوں پر اسطرح قبضہ کر لیا تھا کہ جو چیز دلوں سے نکلتی اسے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا جاتا۔ انیسویں صدی کے اس دور میں ان ممالک میں جتنے زبردست لکھنے والے پیدا ہوئے اعتقادی طور پر اپنے دور کے بدلتے ہوئے سیاسی معاشی اور مذہبی، حالات کے تحت عملی پیرایہ میں زمانے کا فکر ارادی یا غیر ارادی طور پر ان کی تحریرات کا THEME یا مقصد بن کر رہ گیا تھا۔

قدیم مذہبی نظام کا زوال جسکا آغاز شرک، توحید خالص سے گریز، خدا پرستی کے بجائے خدا سے عام انسانوں کی طرح عشق، اور وحدت الوجود کے خود ساختہ دینی تصورات کی وجہ سے شروع ہوچکا تھا ادب میں رومانیت پسندی کا اصلی محرک تھا۔ پھر اس گرتے ہوئے نظام پر سائنس سے آتے ہوئے عقلی علوم نے بھی ایک ضرب لگائی تھی۔

لیکن یہ محض ادھوا درتھا اور اسے ہنیترا بدل کر قبول کیا گیا تھا اس لئے غیر عقلی مذہبی قدریں مجروح ہو کر بلبلا تو اٹھیں مگر انکے مقابلہ میں عقلی مذہبی قدروں پہ نئے سماج کا کوئی نقشہ سامنے نہ آیا۔ اس لئے ایک عام ذہنی مزاج اور افرا تفری پھیل گئی۔ اور رومانیت نے جنم لیا۔

یہ ہے یورپ میں رومانیت یا ادبی جذباتیت، کی مختصر داستان، اس بحث کی منتشر کڑیوں کو ایک بار پھر جوڑ لیجئے:۔

(۱) انیسویں صدی کی رومانیت دراصل اس دور کی مذہبیت اور عقلیت پسندی کے درمیان کشمکش کی مظہر تھی۔

(۲) عیسائیت کے وہ معتقدات جو انسانی فطرت کی جذبات پسندی عبودیت پسندی اور عافیت پسندی کی تسکین کرتے تھے، جب عقلیت کی ضرب سے پاش پاش ہونے لگے تو لامحالہ یہی جذبات حُسن پرستانہ نغموں، افسانوں اور روزمرہ کے واقعات کی پرستش، اور ”عبادت“ کی شکل میں ظاہر ہو گئے اور انھوں نے ایک نئی ادبی تحریک رومانیت (ROMANTICISM) کو جنم دیا۔

(۳) مذہبیت کے ساتھ ساتھ جب مذہبی پیشواؤں اور علماء کی اہمیت گھٹ گئی تو شخصیت پرستی کے پچھلے جذبات دوسری طرف منتقل ہو گئے اور زندگی کے ہر موڑ پہ ایک محبوب کی تلاش ہونے لگی۔

(۴) یورپ والوں اور خصوصاً انگلستان اور فرانس کی بڑھتی ہوئی عالمی سیادت کی بنا پر تمام دنیا اور انکی نوآبادیات مقبوضات میں ان کے خیالات اور افکار بغیر کسی معمولی تنقید کے قبول کر لئے گئے۔

ہندوستان کے ادیب اور لکھنے والے جنکی ذہنیت انگریزوں کی آمد سے قبل ہی زخم خوردہ اور ملیلی ہو گئی تھی انکی آمد کے بعد اپنی رہی سہی سکت بھی کھو بیٹھے۔ انگریز جب یورپ سے آئے تو اپنے ساتھ ٹینی سن۔ براؤننگ، تھیکرے ڈکنس، جارج ایلیٹ میکالے، نیومن۔ رسکن ہیوگو، دوما بلزاک، ژدرژ ساں، اور اسی طرح کے دوسرے ادیبوں اور فلسفیوں کو بھی لیتے آئے اور ہندوستانیوں نے جس طرح انگریز کی تلوار کے آگے اپنی گردنیں ڈال دیں اسی طرح اپنے کمزور اور بوسیدہ کردار کی بنا پر ان لوگوں نے اپنے دماغ، زبان، اور قلم کو بھی انگریز پر نچھاور کر دیا۔ اور اس کے بعد اگر انھوں نے لکھا تو انگریز کے ”مصنوعی“ قلم سے سوچا تو انگریز کے کرایہ کے ذہن سے، اور کہا تو انگریز سے مستعار لی ہوئی زبان سے یہ ہیں انگریزی دور کے ہندوستانی ادیب جنکی ایک

کھیپ ابھی تک چلی جا رہی ہے۔ انگریزوں کی غلامی میں رہ کر انھوں نے بھی اپنے ملک کے مذہب اور ادیان کے خلاف اسی طرح علم بغاوت بلند کیا جسطرح انیسویں صدی کے ادیبوں، اور فلسفیوں نے یورپ میں کیا تھا لیکن یورپ میں اگر اس بغاوت کا سبب یہ تھا کہ عیسائیت کے عقائد و خیالات اپنے اندر کچھ بھی مذہبیت اور عقلیت نہیں رکھتے تھے تو ہندوستان میں اس بغاوت کا سبب محض انگریز کی ذہنی غلامی اسکی غیر ارادی پرستش، اسکی نوکری کا خیال، اور اسکے پیدا کردہ ماحول میں رد سیہ کما۔ نر اور سرمایہ دار بننے کی امنگیں تھیں۔ صحیح ہے کہ ہندوستان کے ادیان و مذاہب میں بھی عیسائیت کی طرح جاہلی تصورات اور اعمال گھس گئے تھے اور انکے پیروؤں کا عمل بھی محض برائے نام رہ گیا تھا، مگر ان وقت پرست انگریز کے پٹھوں نے مذہبی اصول اور افکار کے علی الرغم کسی حقیقی عقل پرستی (RATIONALISM) کی اساس پہ مخالفت کا آغاز نہیں کیا تھا بلکہ انکی حالت تو یہ تھی کہ غلامی اور نکبت کے مارے ہوئے دریوزہ گر ہاتھ میں کاسہ گدائی لئے گلی گلی انگریز کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے پھرتے تھے جہاں کسی گھر سے ڈبل روٹی یا کیک کا کوئی سوکھا ٹکڑا مل جاتا جھٹ سے اپنے ہموطنوں میں دوڑے ہوئے آتے اور انھیں وہ ٹکڑا دکھا دکھا کر مرعوب کرتے کہ دیکھو ہمیں انگریز نے کیا دیا ہے؟ پھر چاہے اس ٹکڑے سے ان کا پیٹ بھرتا ہو یا نہ بھرتا ہو، یہ لوگ اپنی غلامانہ ذہنیت اور مفلوج تخیل کی بنا پر خالی پیٹ پہ ہاتھ پھیر کے اور مصنوعی طریق پہ ڈکار لے کر یہی کہتے کہ چیز جو ہم نے کھائی ہے بڑی لذیذ ہے اور پیٹ تو بالکل ہی بھر گیا ہے۔

موجودہ دور کے ترقی پسند اشتراکی ادیب تو اپنی فکری اور ذہنی فلاکت کے سبب انتہائی پستی اور تنزل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ انکی زبان پر اگرچہ ”واقعیت پسندی“ اور مقصدیت کا کلمہ جاری ہے اور وہ خود کو ”مستقبل“ (FUTURE) کا پیرو قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ——— ان کے اتنک کے سارے کارنامے محض جذباتی، سطحی اور وقتی بلکہ ہنگامی ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی انقلابی اور اصلاحی نہیں، ان کا ہر اصول اور نظریہ وقت کے گندے اخلاق میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان فطرتاً جذباتیت کا حامل ہے، اس کی طبیعت اکثر اوقات غیر ارادی طور پر محبت، پرستش اور بے خودی کی طلبگار ہوتی ہے، اب اگر ان اجزاء کا کوئی اچھا مصرف متعین کر لیا گیا۔ اور انسان کی فطری جذباتیت کو کسی سیدھے راستے پر ڈال دیا گیا تو خیر! ورنہ اسکا ذہن

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر دیکھئے)

اختر لکھنوی

○

وہ دورِ ہستی نہیں رہا اب جو دورِ ہستی تھا ہم سے پہلے
رہیگا اب نقشِ پا ہمارا تمہارے نقشِ قدم سے پہلے

وہ کیا زمانے کا ساتھ دے گا وہ کیا زمانہ بدل سکے گا
شکست جو کھا گیا ہو خود ہی شکستِ جور و ستم سے پہلے

میں مانتا ہوں کہ تیرے غم میں بڑی ہی رنگینیاں ہیں لیکن
مجھے غمِ زیست مل چکا ہے تیری محبت کے غم سے پہلے

فریب مجھ کو نہ دے سکے گی تری نوازش تری عنایت
کہ یوں ہی ہوتا ہے لطف تیرا ہر اک پہ جور و ستم سے پہلے

سمجھ رہے تھے کہ راہِ پُر خار سے بس اک ہم گذر رہے ہیں
مگر نشانِ قدم بتاتے ہیں لوگ گذرے ہیں ہم سے پہلے

اُنہی کے قدموں میں ہے مسرت اُنہی کو حاصل ہے عیش و عشرت
جنابِ اختر گذر گئے جو حدودِ رنج و الم سے پہلے

ثروت میرٹھی

○

غم کی دُنیا میں کچھ خوشی پائی
جان دینے سے زندگی پائی

بیوفائی کا اُن سے کر کے گلہ
اپنے ہی عشق میں کمی پائی

شمع کی عمر کم سہی لیکن
کتنی نورانی زندگی پائی

ہم سے کیا زندگی کا بوجھ اُٹھتا
مہربانی کچھ آپ کی پائی

غمِ اُلفت کے بعد دُنیا میں
جو خوشی پائی عارضی پائی

اس سے ذکرِ سکونِ ساحل کیا
جس نے طوفان میں زندگی پائی

وہ تو اتنے بُرے نہ تھے ثروت
ہم نے قسمت ہی کچھ بُری پائی

شاکر تسلیم

○

کوئی اِن قافلوں کو پکارے
چل دیئے ظلمتوں کے سہارے

ہوگئی یوں تو دُنیا تمہاری
کاش ہو جائیں ہم بھی تمہارے

خیر گذری ابھی چھین لیتے
مُجھ سے ذوقِ نظر یہ نظارے

رہ گئی ساری دُنیا اُلجھ کر
اب کوئی زُلفِ ہستی سنوارے

بن گئے مُستقل اک سہارا
ٹوٹ کر زندگی کے سہارے

صبح تک شب کی تاریکیوں پر
مُسکراتے رہے چاند تارے

گر یہی ہے کرم اُن کا شاکر
جی چکے بس مُحبت کے مارے

عنوان چشتی منگلوری

پیغامِ امن اور یہ دار و رسن کی بات
اہلِ خرد بھی کرتے ہیں دیوانہ پن کی بات

'ناکامیٔ حیات' گوارا نہیں مجھے
رہ جائے کاش عزمِ حوادث شکن کی بات

محفل میں جب ہوا حق و باطل کا تذکرہ
میری زباں پہ آگئی دار و رسن کی بات

صیاد و باغباں نے کیا ہے یہ التزام
باہر چمن سے چھوٹ نہ نکلے چمن کی بات

ہوتا نہیں ہے کوئی سپردِ جنوں مگر
ہر شخص کی زباں پہ ہے دار و رسن کی بات

معمارِ دورِ نو کی بصیرت تو دیکھئے
اعلانِ حق کو کہتا ہے عہدِ کہن کی بات

عنواں مرے خلوصِ مسلسل کے باوجود
احباب کے لبوں پہ ہے بیگانہ پن کی بات

متین طارق

تنقید پر تنقید

سب سے پہلے تو میں یہ سمجھا دوں کہ تنقید کا لفظ نقد سے نکلا ہے نقد میں ادھار کا کام نہیں ہوتا اس لئے اس کے صاف صاف معنی ہوئے کھری کھری کہنا چاہئے کسی کو برا لگے یا اچھا لگے۔ لوگوں کے خیال میں تنقید کا صحیح مفہوم نشتر زنی سے ادا ہوتا ہے اور نشتر زنی بنا ہمت کے ہوتی نہیں جو اہل قلم کی قوت سے باہر ہے۔

لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بہترین مفکر اور ادیب وہ لوگ ہیں جو سوائے تنقید کے اور کوئی کام نہیں کرتے۔ بس اس کے بل بوتے پر بزرگی قائم ہے اور اگر کہیں وہ تنقید لکھنا ترک کر دیں تو کوئی انہیں دو کوڑی کو بھی نہ پوچھے گا۔ آپ ایسے ویسے ڈبل پیسے بھی کچھ ہوں مگر بے سود۔ وہاں دو چار معمولی سی تنقید لکھ دیں بس پھر کیا کہنے دیکھئے ادب میں آفتاب بنکر چمکیں گے۔ لوگ آپ کی ایسی عزت کریں گے جیسے کسی داروغہ جی کی۔ غرض ایک تنقید کی بدولت شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ گھر بیٹھے کتابیں مفت پڑھنے کے لئے ملتی ہیں۔ اور اخباروں میں نام چھپتا ہے۔

مزید یہ کہ اپنی تنقید میں آپ جتنے ادق الفاظ استعمال کریں گے اتنی ہی وہ مقبول ہوگی۔ جتنی بے تکی باتیں ہوں گی اتنا ہی لوگ سر دھنیں گے۔ اور آپ کو ارسطو کا استاد سمجھیں گے۔ چنانچہ تجربہ کار نقاد کبھی اصل موضوع پر بات نہیں کرتے وہ ہمیشہ مرغ باد نما کی طرح یونان سے ایران اور ایران سے توران کی سناتے ہیں۔ جنکو بعض اوقات پڑھنے والے تو کیا خود وہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے مگر ایسی تنقید کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ یہ بات بڑے دن کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

آج کل نئے اور پرانے فن کی رسہ کشی ہو رہی ہے اس کھینچا تانی میں تنقید کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے ہیں جنکو لمبی تنقید اور چھوٹی تنقید کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لمبی تنقید اب نہیں ہوتی یہ حالی مرحوم کے وقتوں میں ہوتی تھی اب تو نہ وقت نہ ایسی قابلیت جو مقدمہ شعر و شاعری جیسی کتابیں لکھیں یا پڑھیں یہ ترقی کا دور ہے ترقی کی سب سے بڑی خصوصیت لمبائیوں کو سمیٹنا ہی تو ہے۔ آج کل ہر گویا شاعر اور ہر شاعر ملک الشعرا ہوتا ہے اس کلیہ سے نفع یہ ہوا کہ پچھلے دس برس میں برساتی مینڈکوں کی طرح فنکار خوب پیدا ہوئے اور پیاز کے چھلکوں کی طرح کتابیں بھی پے در پے چھپیں اب حالت یہ ہے کہ مسائل کم ہیں اور لکھنے والے بہت ہیں پڑھنے والے تھوڑے ہیں اور کتابیں زیادہ ہیں۔

پہلے لوگوں کو اندیشہ لگا رہتا تھا کہ جو کچھ لکھیں گے وہ کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے لکھتے تھے اور اکثر تو لکھتے لکھتے مر جاتے تھے۔ لیکن اب چونکہ تنقید کا مفہوم بدل چکا ہے اس لئے یار لوگوں کے دل سے تنقیدی رندوں کا ڈر قطعی جاتا رہا ہے۔ نیز یہ بات کسی سے چھپی نہیں رہی ہے کہ فی زمانہ تنقید نام ہے کسی صاحب کتاب کی منہ دیکھی تعریف کا۔ اگر خدانخواستہ اس کے خلاف کوئی بات ہوئی تو ایسی تنقید چھپنے سے پہلے ہی نذر آتش ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ مصنف اپنے منہ میاں مٹھو کے مصداق خود ہی ایک تنقید نامہ لکھ کر کسی مشہور نقاد کا نام ڈال دیتا ہے۔ جس سے تنقید کا مفہوم بھی پورا ہو جاتا ہے اور کسی کی خوشامد بھی نہیں کرنی پڑتی۔

ایسی باتوں سے نقصان کچھ نہیں ہوتا کیونکہ عام طور سے سب جانتے ہیں کہ تنقیدی مضامین پڑھنے کے لئے نہیں لکھے جاتے بلکہ صرف کتابوں یا رسالوں کا حجم بڑھانے کے لئے چھاپے جاتے ہیں۔ تاکہ کتاب کا پروپیگنڈا بھی ہو اور ردی بیچتے وقت قیمت زیادہ اٹھے۔

جہاں تک فن اور مقصد کا تعلق ہے وہ سرے سے ختم ہو چکا ہے قلم کی زیادہ تر قوتیں بیکار کے کاغذ کالے کرنے میں لگی ہوئی ہیں اور

اگر کہیں اسکے لئے کوئی مصرف ہے تو وہ صرف اتنا کہ کچھ اُدھار مانگے ہوئے خیالات کو دہرادے یا پھر اپنی پارٹی اور طبقے کی ہمدردی میں انصاف کی دیوار پھلانگ جائے۔ اس یک طرفہ تماشے کو دیکھنے کے لئے کسی خاص قسم کی عینک کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی تنقیدی کتاب کو اُٹھا کر دیکھئے اُس میں تنقید کم اور طبقاتی جنگ زیادہ ہوگی کیونکہ

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس طرح اپنے کچھ ہمنوا تو پیدا ہو جاتے ہیں۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے بھی یہ نسخہ سب سے سستا ہے ترکیب استعمال کیلئے کسی کتاب یا رسالے سے ایک شعر یا کوئی عبارت انتخاب کر لیجئے پھر یہ دیکھئے کہ مصنف سماج کے کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے سرمایہ دار گروہ سے یا محنت کش مزدوروں سے۔ سجادہ نشینوں میں سے ہے یا لیڈروں میں سے یا نوں میں سے اور بس پھر اپنے قلم کا سارا زور اُس کی تعریف میں صرف کر دیجئے گا۔ اُس کی بُرائی اچھائی کر کے دکھایئے۔ دو چار یوروپین مصنفین کے حوالے دیجئے الفاظ زوردار ہوں کوئی چیستان کی قسم کا فقرہ ہو تو کیا کہنے اس دردسری کے بعد تنقید کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ نیز آپ ملہم غیب بن جائینگے مصنف سے زیادہ آپ کو مبارکبادی نصیب ہوگی مشاعروں کا موسم ہوا تو صدارت کے دعوت نامے بھی آنے شروع ہو جائیں گے جنمیں فیصلہ آپ کی مرضی پر ہو گا خواہ ان بیچاروں کی تمناؤں کو ٹھکرا دیجئے یا اپنی عنبدی کا ایک اور زینہ طے کر لیجئے۔

سو فیصدی تنقیدیں آج کل اسی طرح لکھی جاتی ہیں۔ اگر ان آسانیوں کے بعد بھی کوئی شعر گمنامی میں پڑا رہے تو قسمت کا کچھ قصور نہیں۔

من کہ یکے از شما

م۔ نسیم

سوکھا ہوا سا جسم، جس پر جوانی کے زمانہ کا لباس۔ تھیلے کی طرح لٹکتا ہوا، ہاتھ کی انگلیوں اور کوٹ کی آستینوں پر چاک کے سفید نشان کہنیوں کے پاس کہیں کہیں سُرخ سیاہی کے دھبے، مضمحل اور بیزار سا انداز گویا ابھی کسی سے لڑائی ہوئی ہو۔ یا جھگڑے کا ارادہ ہے۔ اپنی حالت سے ملتی جلتی سائیکل پر سوار یا پیدل۔ رجسٹر اور کچھ کتابیں یا ہاتھ میں سینے سے لگی ہوئی یا سائیکل کے کیریر پر بندھی ہوئی۔ سفید کالی کھچڑی یا پھر میل کے رنگ سے رنگی ہوئی کوئی ٹوپی ورنہ خالی سر، جس پر اُڑتے ہوئے بال کنپٹیوں کے پاس سے خضاب کی الوداعی جھنڈیاں دکھلاتے ہوئے چہرہ پر زمانے کے ہاتھوں ڈالے ہوئے گہرے گھاؤ جن میں سے خون کے بجائے پسینہ رِستا ہوا ناک پر جو زمانہ کی اس دست بُرد سے بچ گئی تھی۔ عینک کے اڈے کا مستقل نشان اور عینک کبھی اُس اڈہ پر موجود اور کبھی کوٹ کی اُوپر کی جیب سے جھانکتی ہوئی داڑھی کے بال یا خشخشی یا کبھی کبھار گھٹے ہوئے ورنہ رخساروں پر بالوں کی کیلیں نکلے ہوئے۔

آپ پہچانتے ہیں یہ کس کا خاکہ ہے؟

آپ میں سے شائد ہی کوئی ایسا ہو جسے اس قسم کے حلیہ کی ایک شخصیت سے برسوں سابقہ پیش نہ آچکا ہو ——————

—————— یہ آپکے اسکول ماسٹر کی تصویر ہے —!

یہی حلیہ کم و بیش اسی زمانہ سے آپ کو روز اسکول کے اوقات میں سڑکوں پر آتے اور جاتے ہوئے نظر آئے گا۔ یہی حلیہ دو تین کے جھنڈوں میں اسکول کے آس پاس کھڑا، دوسروں پر اپنی کوتاہیوں کا بخار نکالتا ہو ملے گا۔ یہی حلیہ ہر آتے جاتے کی طرف اس انداز سے دیکھے گا گویا۔ مجھے پہچانتے ہو؟ میں تمہارا ماسٹر ہوں ورنہ تمہارے لڑکے کا ماسٹر ہوں۔ میں تمہارے کسی بھی عزیز کا ضرور ماسٹر ہوں۔ مجھے سلام کرو۔ میں عزت کرنے کے قابل ہوں " اور سچ مچ یہی حلیہ اپنی تنخواہ سے زیادہ سلام وصول کرتا ہے اور آپ سب، ایسے سلاموں کی بخشش کرتے ہوئے اسی طرح کے سامنے پاتے ہیں۔

اسی لئے آپ کو غالباً اس تصویر کے پہچاننے میں اپنے تصور کے کسی خاکہ سے ضرور مدد ملے گی —— اب رہا میں۔ تو آپ کے برعکس میں اس حلیہ کو اسلئے اپنی تفصیل سے بیان کر سکا ہوں کہ یہی حلیہ میرا بھی ہے —— میں بھی ایک اسکول ماسٹر ہوں!

اس بیان میں مجھے اپنے لہجہ میں طنز کا خود احساس ہے (شائد آپ کو بھی ہو) لیکن میرا خیال ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے جو پیمانہ قطرہ قطرہ کے بھرا جا رہا ہو وہ کبھی نہ کبھی چھلکے گا ضرور چاہے اُسے کتنی ہی دیر لگے۔ پھر میں تو اپنی سوسائٹی کا شاید سب سے مظلوم سب سے مفلوک سب سے معزز فرد ہوں۔ اور میری تلخی کی تیزی میرے پیمانے کی وسعت کے مطابق ہی ہے۔ لوگ سلام کرنے سے زیادہ میری طرف توجہ کرنا یا تو کسرِ شان سمجھتے ہیں یا بے کار اور میری حالت یہ ہے کہ میں اسے زندگی کا بہترین لمحہ سمجھنے کو تیار ہوں۔ جب کوئی مجھ سے کچھ میرے متعلق بھی پوچھے۔ یوں دوسرے ماسٹروں کی بات دوسری ہے۔ وہ میرا حال پوچھتے ہیں تو اس لئے کہ جب وہ خود اپنا حال کہیں تو مجھ میں سننے کی ہمت موجود رہے اور پھر یہ تذکرہ بھی غمِ جاناں کا نہیں غمِ دوراں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ غمِ جاناں میں تو ہر ایک مبتلا ہے کسی کے لئے وہ نئی بات نہیں ہوتی۔ یوں اگر کوئی شہ یکہ غم ہونے کی غلطی کبھی کر بیٹھے تو پھر میں اسے وہ کچھ بتاؤں —— جو میں یہاں آپ سے کہہ رہا ہوں۔

میری گھریلو زندگی دوسروں سے کچھ انوکھی نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالم بدقسمتی میں ہم آپ شائد برابر کے شریک ہیں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح جب صبح آنکھ کھولتا ہوں تو سب سے پہلے بعض دفعہ خدا کی یاد سے بھی پہلے دن بھر کے خرچ کی رقم سامنوں پر

کھنکنے لگتی ہے اور میں کل کی بچی ہوئی رقم جوڑتے ہوئے دعا مانگتا ہوں کہ وہ دن آج ہی کا نہ ہو جب آمدنی، قرض یا پیشگی لینے کا مشورہ دیتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جب قسمت اس بری طرح میرے حال پر مہربان نہیں ہوتی تو میں نسبتاً خاموشی سے گھر کی ضروریات کو جل کر، پھر کر، بازار جاکر اور بعض دفعہ بہت سے، بالکل ہی چاکری والے کام کرکے پورا کرتا ہوں۔

ایسے موقعوں پر میری اس آرزو میں طوفان کی سی تندی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ کاش میرے ہاں بھی کچھ نوکر ہوتے۔ اچھا ایک ہی نوکر ہوتا کہ میں کسی پر تو حکم چلا سکتا۔ یوں اسکول میں تو حکم چلاتے ہی گزرتی ہے۔ لیکن گڑیا کا حکم چلانا بھی کوئی حکم چلانا ہے۔ گھر میں چاہے کوئی ٹوٹا پھوٹا سا ہی نوکر ہو مگر حکم صرف اسی پر چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کام صرف اسی سے کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن میری طرح آپ پر بھی یہ بات خوب روشن ہے کہ نوکر گلی میں پڑا ہوا کوئی خالی ٹین کا ڈبہ نہیں جسے جو جی چاہے، یوں ہی اٹھا لائے (حالانکہ اب ٹین کا ڈبہ بھی گلی میں مفت پڑا نہیں ملتا بلکہ کباڑیے کے ہاں میں بکتا ہے) نوکر رکھنے کے لئے اسے تنخواہ دینا پڑتی ہے اور تنخواہ ایک ایسی شئے کا نام ہے جو روپوں بغیر بن ہی نہیں سکتی ـــ وہی جنس نایاب جو جیب سے نکلتی زیادہ ہے اور آتی کم ہے ـــ چنانچہ یہ آرزو ہمیشہ شرمندہ تکمیل رہتی ہے۔ اور میں بجائے دل کے جیب پر ہاتھ رکھ کر اک آہ سرد بھرتا ہوں

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آرزو بس یہی ایک ہے آرزوئیں تو ہزاروں ہیں اور وہ بھی ایسی کہ ایک ایک پہ دم نکلے۔ لیکن جب پوری ایک بھی ہونے میں نہ آئے تو ان کا ذکر کرنے سے آتش شوق کے بھڑکنے کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ میں ان کو لئے تو بیٹھا ہوں۔

میں نے اپنے آپ کو عقلمند سمجھنے کا ارتکاب کبھی نہیں کیا لیکن مجھے اپنی بے وقوفی کے بارے میں بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اسکول کے بہت سے لڑکے اگر میرے متعلق کچھ ایسی رائے رکھتے ہیں جسے آپ کم از کم مجھ سے سننے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ تو کچھ ایسے بھی ہیں جن کی نظروں میں میں کچھ اور ہوں۔ ـ اور کیا ہے؟ یہ بھی نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ بھی خودستائی ہی ہوگی۔ مگر اس کا نتیجہ ہے کہ مجھے ایسے لڑکوں کا خیال کرکے اپنے آپ کو اس سے بہت زیادہ شفیق اور نرم دل ظاہر کرنا پڑتا ہے جتنا کہ ہوں ـــ (کمزوری کس انسان میں نہیں ہوتی۔ ہم معلمین اخلاق بھی اس سے خالی نہیں ہیں) لیکن میری اس عظمت کا طلسم اس وقت دھواں بنکر اٹھنے لگتا ہے جب گھر میں کسی بات پر ناچاقی ہو جاتی ہے اور عین برہمی کی حالت میں اسکول کا وقت ہو جانے کی وجہ سے روانہ ہونا پڑتا ہے۔ اس وقت اسکول کے طلبا اور ماسٹر تو کجا گلی میں ملنے والے تک جان لیتے ہیں کہ ماسٹر صاحب آج اپنے اصلی رنگ میں ہیں۔ اس دن لڑکوں کی غلطیوں پر میرا غصہ سچا ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں بہت دنوں تک نہیں کر پاتا ـــ اور گھر کی لڑائی کا سبب اکثر یہی ہوتا ہے کہ میں اپنی جلدی میں بازار سے کچھ لانا بھول جاتا ہوں۔ یا پھر کوئی چیز کہیں بھول کر چلا آتا ہوں۔ چیز زیادہ قیمت کی نہ ہو تو بھی میرے لئے جیب سے دوبارہ پیسوں کی ادائیگی۔ ضرور سوہان روح ہے۔ اکثر اس غلطی کا غصہ گھر کے کسی معاملہ پر بیوی سے لڑ کر اترتا ہے۔ اور میں بعد میں پھر دل کو سمجھا لیتا ہوں (کمزوری کس انسان میں نہیں ہوتی اور ہم معلمین اخلاق بھی انسان ہی ہیں)

لیکن نہ معلوم وہ کیا کھٹک ہوتی ہے۔ جو اس دن مجھے کلاس میں پڑھانے کے بجائے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر میں اس سوچ کو آخر میں یوں جھٹکنے لگتا ہوں جیسے کوئی گرد آلود راستے میں دامن جھاڑ کر غبار سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم مجھے معلوم ہے یہ سوچ میرے اندر کچھ جگانے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ ایسی چیزیں دکھانا چاہتی ہے جو میں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر اس سوچ کے آگے میں سپر ڈال دوں تو یہ مجھ سے میری ماسٹری چھڑا دے گی۔ یہ مجھ سے خود فریبی چھڑا دے گی۔ یہ میری آرزوؤں کا طلسم توڑ کر کچھ اور کوئی اور بستی بسانے کو کہے گی۔ اور میں! مجھ میں اب یہ ہمت نہیں ہے کہ اس عمر میں یہ سب کرنے کا خیال کر سکوں۔ میں اس سوچ کو ٹھیک مان کر بھی اسے گرد کی طرح دامن سے جھاڑ دینے پر مجبور ہوں۔ میں اس میں اپنے آپ کو قابل معافی سمجھتا ہوں۔

لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی یہ سوچ بڑے لمبے عرصہ کے لئے مجھ پر سوار ہو جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب گھر کی خفگی اور دن بھر کی بدمزگی کے بعد کچھ دن چھٹی کی اطلاع پاکر میں گھر لوٹتا ہوں اور آکر کوٹ اس طرح اتارتا ہوں جیسے تکیہ پر سے

میلا غلاف اُتار رہا ہوں ہر شام کو سب سے الگ بیٹھک میں اکیلا حقہ سامنے رکھے چپ چاپ بیٹھا جب میں کش لگاتا ہوں تو یہ سوچ تب چپکے چپکے آکر لاڈلی بیٹی کی طرح میری ہر چیز کو قابو میں کر لیتی ہے میرا تخیل، میرے تصورات، میری آرزوؤں کے طلسم سب اس کے بن داموں غلام بنکر اشاروں پر ناچتے ہیں۔ حقے کے کش کے ساتھ ساتھ دھوئیں کے دل بادل آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دماغ کے پردے بھی یہاں تک کہ یہ سوچ اپنی اصلی شکل میں دانتوں میں اُنگلی دبائے میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے "سوچ تو۔ کیا تو ماسٹر ہے؟ کیا تو معلم اخلاق ہے؟ کیا تو نے صرف تنخواہ کی رقموں کے لئے یہ مستقل ڈھونگ نہیں رچا رکھا۔ کیا تیری زندگی واقعی نسل کو بنانے، سنوارنے میں بیتی ہے۔ یا فکر روزگار میں؟ کیا تیری تربیت سے تیار کئے ہوئے سپوت یہی ہیں جو نوکر ہوتے ہیں تو بے ایمان اور آقا ہوتے ہیں تو ظالم۔ اگر قانون کے محافظ ہوتے ہیں تو قانون توڑنے کا فخر سب سے پہلے خود حاصل کرتے ہیں اور قانون بنانے والے ہوتے ہیں تو اپنی نااہلی ماننے کے بجائے اور نظام بنانے کی ڈھٹائی سے کوشش کرتے ہیں۔ یہ بے انصاف جج۔ یہ رشوت خور حاکم یہ بے خوف اہلکار، یہ امیروں کے خوشامدی پڑھے لکھے اور یہ غریبوں کی ہمدردی کی دلالی کرنے والے لیڈر! کیا یہی ہیں میرے "قابل فخر شاگرد؟"

اس کی ان باتوں کو سنتے سنتے میرا دماغی سکون ختم ہو جاتا ہے میرے حلق میں دھوئیں کا پھندا پڑ جاتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے میرا نظام تعلیم خود میرا ہی گلا گھونٹ رہا ہے۔ میں بڑے زور سے کھانستا ہوں اور آواز بیٹھک میں گونج جاتی ہے۔ مجھے اس آواز میں کچھ اور کھانسیوں کی آوازیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔ پھر جوں جوں کھانسی بڑھتی ہے ان آوازوں کی صدائے بازگشت بڑھتی جاتی ہے۔ [illegible] پچاسوں، سیکڑوں، ہزاروں ان گنت ـــ میری آواز [illegible] صدی بھر کے معلموں کی کھانسیاں گونجتی ہیں جن کی تعلیم نے پہلے انگریز کے غلام ڈھالے۔ پھر وطن کے بے شعور غلام اور اب آزاد غلام ڈھال رہی ہے ان اُستادوں کے شور کے پیچھے مجھے تعلیم بھی کراہتی سنائی دیتی ہے اسکی کراہیں کبھی چیخوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ چلاتی ہے یہ میرا قصور نہیں۔ میرا گلا نہ گھونٹو۔ میرے بس میں انسان بنانا کہاں میں خود انسان کی بنائی ہوئی ہوں۔ مجھے مت مارو مجھے بدل دو۔

آہستہ آہستہ یہ چیخیں ہلکی پڑ جاتی ہیں اور مجھے سکون ہوتا ہے اُس وقت ـــ ہاں صرف اُسی وقت مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے انسان کی بے بسی کا علم ہوتا ہے۔ اور میرے دل کی سب سے بڑی آرزو (جو صرف اسی وقت ظاہر ہوتی ہے) پوری شدت سے اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ میرا ہاتھ حقے کی نے کو مضبوطی سے بھینچ لیتا ہے جیسے میں دامن اُمید تھامے ہوئے ہوں۔ اور پھر اس آرزو کو مجسم دیکھنے کے لئے میری آنکھیں شدت جوش سے پتھرانے لگتی ہیں۔ میرے کان کی لویں اشتیاق کی تیزی سے گرم لوہے کی سی سُرخ ہو جاتی ہیں۔ اور میرے دل میں ہوک اُٹھتی ہے۔ "کاش میں نے یہ انسان نما حیوان نہ بنائے ہوتے۔ کاش میرے ہاتھوں نے یہ بس بھرے بیج بو کر دنیا میں اور زہر پھیلانے میں اپنے سے پہلے اُستادوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس طرح اچھے لوگ نہیں ڈھال سکتا۔ پھر بھی میں نے روٹی کے لئے ـــ مٹھی بھر اناج کے لئے ـــ اپنی سوچ کو پاؤں تلے روند کر سیکڑوں معصوموں کو بگاڑ ڈالا۔ کاش میں مزدوری کر لیتا۔ کاش میں بھیک مانگ لیتا!! تو آج میرے ہاتھ لتنے خونوں سے رنگے ہوئے نہ ہوتے" اچانک میں حقے کی نے کو چھوڑ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہوں اور میرا دل پکار رہا ہے "دھو دو۔ کوئی میرے ہاتھوں سے اس خون کو دھو دو۔ کوئی میری پیشانی سے یہ کلنک مٹا دو۔ کوئی اور تعلیم لاؤ میرے مرنے سے پہلے کوئی ایسا نظام لا دو۔ جہاں انسان بنتے ہوں۔ جہاں ہر اُستاد کو صبح اُٹھ کر بجائے خرچ کا حساب کرنے کے خدا کو یاد کرنے کا وقت مل سکے۔ جہاں اکیلے میں دھوئیں کی پھانسیاں اُس کا گلا نہ گھونٹ سکیں۔ لا دو! خدا کے لئے ایسا نظام لا دو!"

[illegible] پیشانی سے پسینے کے ٹھنڈے قطرے [illegible] ٹھنڈی سانس نکل جاتی ہے۔ [illegible] اس وقت یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آرزو اُن ساری آرزوؤں سے بہتر ہے جن کے پورا ہونے کی حسرت ہے۔ اور یہی ایک آرزو اس قابل ہے کہ اس پہ دم نکلے۔

علمی تحقیقی اور ادبی کتابیں

کتاب		مصنف	قیمت مجلد
بیان اللسان	عربی اردو ڈکشنری	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	دس روپے
تدبر قرآن		مولانا امین احسن اصلاحی	ڈھائی روپے
خطبات		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	سوا دو روپے
پردہ		"	تین روپے آٹھ آنے
حقیقت نفاق		مولانا صدر الدین اصلاحی	ایکروپیہ آٹھ آنے
اساس دین کی تعمیر		"	دو روپے آٹھ آنے
مسلمانان ہند کا لائحہ عمل		مولانا ابواللیث اصلاحی	تین روپے آٹھ آنے
کلام عربی	(حصہ اول)	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	ایک روپیہ
کلام عربی	(حصہ دوئم)	"	ایک روپیہ چار آنے
تجدید تصوف و سلوک		مولانا عبد الباری	پانچ روپے
حقوق الزوجین		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	ایکروپیہ آٹھ آنے
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں		سید اصغر علی عابدی	تین روپے
اشتراکیت اور اسلام		مظہر الدین صدیقی	چار روپے آٹھ آنے
سود		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	دو روپے بارہ آنے
گلگونہ		محمد یسین تسکین قریشی	دو روپے آٹھ آنے
ابھرتی کرنیں	(افسانے)	مرتبہ نجم الاسلام	"
عالمی امن	(نظمیں)	ادارہ معیار	آٹھ آنے
شوہر کا روگ	(ناول)	"	ایک روپیہ چار آنے
شگفتہ	(ناول)	"	تین روپے
کوثر و تسنیم	(مجموعہ کلام)	آلم مظفر نگری	چار روپے
صحیفۂ ندرت	(")	ندرت میرٹھی	چار روپے آٹھ آنے
لوح و قلم	(")	"	پانچ روپے
مکمل فائیل معیار ۱۹۵۲ء	(مجلد)		تین روپے ۸ آنے
" ۱۹۵۳ء	(مجلد)		تین روپے ۸ آنے

ان کتابوں کے علاوہ دیگر علمی و ادبی کتابیں اور دینی کتب۔ قرآن شریف اور سیپارے وغیرہ بھی مل سکتے ہیں۔

ماہنامہ معیار کا

تنقید نمبر

جو

ادب اور تنقید کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ

صالح اور صحت مند رجحانات کی منہ بولتی تصویر

تعمیری ادب کی منزل کا واضح نشان

اسلامی ادب کی آفاقی قدروں کا حسین مرقع

دنیائے ادب کے جاہلی نظریات کیلئے ایک مستقل چیلنج

مرعوب کن باطل افکار پر ایک کاری ضرب ہے

تمام حق پسند اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق

تعمیری اور اسلامی ادب پر سیر حاصل مواد رکھنے والی

یہ عظیم پیش کش

صرف ڈیڑھ روپے میں مل سکتی ہے۔

وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

ان دنوں شاہراہ کے افسانہ نمبر ۱۹۵۲ء میں بلونت گارگی کا افسانہ "شتابدی ملٹ" پڑھ رہا تھا۔ بلونت گارگی مشہور ترقی پسند افسانہ نگار ہے جس کی انگریزی نظموں کے مداح ٹیگور تھے۔ میں اُسکے یہ حالات پڑھکر بے حد مرعوب ہوا۔ اور افسانہ کو بڑی مرعوبیت کے ساتھ رات کے گیارہ بجے تک پڑھتا رہا۔

"گاڑی اگت پوری کے اسٹیشن پر رُکی اور کافی دیر تک رکی رہی۔ یہاں انجن بدلنے والا تھا اور بجلی کا انجن اس کی جگہ لینے والا تھا"

میں چونکا ——— وہ تو شاید اگت گری ہے۔ لیکن گارگی پایہ کا ادیب ہے۔ اُس کی معلومات بے پناہ ہوں گی۔ پھر آگے چل کر وہ اسی بجلی کے انجن کے بارے میں لکھتا ہے۔

"گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ انجن نے بھاپ چھوڑی اور رک گیا"

بجلی کا انجن اور بھاپ؟ ——— کوئی بتاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ —

(ابن فرید)

مصنف :- منشی دھرودیالنکار ---------- مترجم :- امام خاں گلبرگوی

چنتا

کردار :-

(۱) راجہ
(۲) رانی
(۳) سوامی جی
(۴) دربان

پہلا منظر

راجہ :- (بھرائی ہوئی آواز میں) رانی ..... رانی ..... اب ..... اب

رانی :- کیوں، کیوں مہاراج! آپ اتنے زیادہ اُداس کیوں ہیں؟

راجہ :- دیکھو رانی! مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے کسی قسم کی چنتا نہیں ہے (اٹک کر) لیکن پھر بھی یہ زندگی ....

رانی :- ہاں یہ زندگی ......

راجہ :- جیسے میں پہاڑ جیسا موٹا اور بھاری ہوں ویسے ہی یہ زندگی پہاڑ جیسی موٹی اور بھاری معلوم ہوتی ہے۔

رانی :- مہاراج، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

راجہ :- میں نے اس موٹاپے کو گھٹانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا لیکن میرا یہ موٹاپا گنا ہوں کے بوجھ کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے سچ (اٹک کر) بڑی حیرانی ہوتی ہے۔

رانی :- آپ کو کیسی حیرانی ہوتی ہے مہاراج!

راجہ :- یہی کہ..... یہی کہ میرے چھوٹے پیر اتنا بڑا بوجھ کس طرح اُٹھاتے ہیں۔ پیٹ جتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اتنی ہی ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میری ٹانگیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں

رانی :- مہاراج! آپ آج اس طرح کیوں ———

راجہ :- اس لئے ..... ہاں اسی لئے میرے پیروں میں اتنا درد ہوتا ہے چاہے میں کتنی ہی مالش کراؤں ..... لیکن وہ درد جاتا نہیں۔ اگر کبھی ایسا .....

رانی :- آپ ...... مہاراج ..... اس طرح کا ......

راجہ :- سنو رانی ...... اگر کبھی ایسا ہو گیا کہ میرے چھوٹے سے پیروں نے اس بھاری بوجھ کو اُٹھانے سے انکار کر دیا تو پھر جانتی ہو کیا ہوگا (بھرائی ہوئی آواز میں) کیا ہوگا رانی؟ ....

رانی :- کیا ہوگا مہاراج! ایسا کبھی نہیں ہوگا مہاراج۔

راجہ :- رانی، ہوگا یہ کہ مجھے دن رات ایک ہی جگہ چت ہو کر بیٹھے کے بل صرف ...... ہاں ..... صرف لیٹے رہنا پڑے گا۔ نہ ادھر کروٹ بدل سکوں گا نہ اُدھر۔ پھر بچاری پیٹھ بھی اس بوجھ کو کب تک اُٹھا سکے گی۔

رانی :- اس طرح گھبرانے سے تو کام نہیں چلے گا۔ مہاراج

راجہ :- اس موٹاپے میں گھبرانے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے۔ مہارانی۔ جب میں دیکھتا ہوں

رانی :- کیا دیکھتے ہیں مہاراج؟

راجہ :- لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کوی اس تپلی کمر پر یوں ہی لٹو ہوئے تھے؟ واقعی میری نظر

اگر کہیں جلا کٹی ہے تو اس پتلی کمر پہ۔ گھنٹوں اس پتلی کمر کو غور سے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ پتلی کمر ..... جانتی ہو۔ شاعر کہاں غلطی کر گئے۔

رانی :- مہاراج! میں ان باتوں کو کیا جانوں! ہاں تو بتائیے شاعر کہاں غلطی کر گئے؟ -

راجہ :- شاعروں نے کمر کو اتنا پتلا کر دیا کہ اُسے بالکل غائب کر دیا۔ لیکن کمر کتنی خوبصورت ہوتی ہے کمر کی قدر ایک شاعر ..... ہاں ..... راج کوی بھی نہیں جان سکتا۔ اُسے تو ایک موٹا توند والا آدمی ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے (میں کہتا ہوں) شاعروں نے یہ ٹھیک طرح نہیں سمجھا کہ کمر پتلے پن کی وجہ سے غائب نہیں ہوتی ہے۔ آج کتنے برس گزر گئے ..... ہائے ..... ہماری کمر غائب ہو گئی۔

رانی :- مہاراج آپ اپنا علاج ماہر فن حکیموں سے کروا رہے ہیں۔ یہ مرض کوئی ایسا تو ہے نہیں کہ لاعلاج ہو۔ کچھ وقت ضرور چاہیئے۔

راجہ :- علاج ..... رانی ..... علاج۔ میں نے (اب تک) کتنے علاج کئے ہیں اور کر رہا ہوں روز نسخے بدلے جاتے ہیں اور میں نے دوا کے نام پر کیا کچھ نہیں پیا اور کھایا ہے۔ آدمی کو دوا کے نام سے کچھ بھی کھلایا اور پلایا جا سکتا ہے۔ شام سویرے گھوڑے پر سیر کو جاتا ہوں لیکن کچھ نہیں ہوتا ..... کسی چیز سے کچھ نہیں ہوتا۔

رانی :- آپ اپنی پوری ریاست میں یہ اعلان کروا دیجئے کہ جو کوئی مجھے اس موٹاپے کی بیماری سے اچھا کر دے گا۔ اُسے میں آدھی ریاست اور ایک کروڑ روپیہ دوں گا۔ اور اگر وہ اچھا نہ کر سکے گا تو .....

راجہ :- ہاں کہو! اگر اچھا نہیں کر سکے گا تو .....

رانی :- تو اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اس سے یہ ہوگا کہ کوئی بھی ایسا حکیم آپ کے علاج کے لئے نہیں آئے گا۔ جو روزانہ نسخے بدلتا ہو۔ اس طرح آپ کی خدمت میں کوئی ایسا۔ بڑا حکیم ہی حاضر ہوگا جو آپ کو اس تکلیف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا دلا دے گا۔

راجہ :- رانی ..... رانی ..... مجھے تمہاری بات بہت پسند آئی ہے۔ مجھے پکا یقین تو نہیں ہے۔ لیکن کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں ہے۔ کل ہی رانی ایسا اعلان ساری ریاست میں کروا دیا جائے گا۔ آدھی سلطنت تو کیا اگر ساری سلطنت بھی چلی جائے اور مجھے اپنی ہلکی پھلکی زندگی مل جائے تو بھی وہ مہنگی نہیں ہے۔

دوسرا منظر

دربان :- مہاراج آپ کا علاج کرنے کیلئے ایک سوامی جی آئے ہیں۔ بڑی دور کی پہاڑیوں سے آئے ہیں

راجہ :- کیا اُن کے پاس کچھ جڑی بوٹیاں ہیں یا اُن کے پاس کوئی دوائیوں کا بکس ہے۔

دربان :- اُن کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بالکل خالی ہاتھ ہیں۔

راجہ :- وہ کہتے کیا ہیں؟ -

دربان :- وہ کہتے ہیں کہ مہاراج کو ایک ہی مہینے میں اچھا کر دیں گے۔

راجہ :- (حیرانی کی ہنسی کی ہلکی سی آواز) ایک مہینے میں؟

دربان :- جی حضور! وہ تو یہی کہتے ہیں۔

راجہ :- میں برسوں علاج کر کے ہار گیا۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہیں۔؟ یا اُن کو اپنی جان پیاری نہیں ہے؟

دربان:- میں نے ان کو بہت سمجھایا مگر وہ تو اپنی بات پر بالکل اٹل ہیں۔

راجہ:- تو اچھی بات ہے۔ انہیں ہمارے پاس حاضر کرو۔

(دربان جاتا ہے سوامی جی آتے ہیں۔ ان کے آنے کی آواز)

سوامی:- مہاراج کی جے ہو۔ مہاراج کا کلیان ہو۔

راجہ:- آئیے سوامی جی۔ پدھاریئے۔

سوامی:- میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مہاراج۔

راجہ:- آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میرا علاج کر سکیں گے؟

سوامی:- پربھو کی کرپا سے اس سنسار میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ کوئی شے تب ہی ناممکن ہو جاتی ہے جب ہم اُسے ناممکن سمجھ لیتے ہیں۔

راجہ:- تو آپ میرا علاج کر سکتے ہیں۔

سوامی:- آپ اچھے ہو سکتے ہیں اور اچھے ہو جائیں گے۔ وہ بھی ایک مہینہ میں اور صرف ایک مہینہ میں۔

راجہ:- میں .... میں .... ایک ہی مہینہ میں اچھا ہو جاؤں گا؟! میں تو برسوں سے علاج کروا رہا ہوں پھر بھی اچھا نہ ہوا۔ اور آپ کہتے ہیں ....

سوامی:- میں صرف کہتا ہی نہیں ہوں کر کے دکھاتا ہوں۔

راجہ:- آپ تو اپنے ساتھ شاید ایک بھی دوا نہیں لائے ہیں نہ تو آپ کے پاس دوا کا کوئی بکس ہے اور نہ جڑی بوٹیاں؟

سوامی:- علاج صرف بنی ہوئی یا گھٹی ہوئی دوائیوں سے یا جڑی بوٹیوں سے ہی نہیں ہوتا۔ اصلی علاج ہوتا ہے من سے اور خیالوں سے۔

راجہ:- سوامی جی! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

سوامی:- حضور یہ بات تب تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ اس کا احساس نہیں ہو جاتا۔ من کی اور وچار کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہمیں ایک تو اس کا پتہ نہیں ہے اور دوسرے ہم اس کو استعمال بھی کرنا نہیں جانتے۔

راجہ:- سوامی جی آپ میرا علاج کر سکتے ہیں۔ آپ میری شرطوں

سے واقف ہی ہیں نا!

سوامی:- مہاراج۔ میں آپ کی شرطوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور وہ مجھے منظور ہیں۔ مہاراج میری بھی ایک شرط ہے اور میں ایک شرط پر علاج کرتا ہوں۔

راجہ:- کیا شرط ہے۔ سوامی جی!

سوامی:- میری شرط یہ ہے کہ میں علاج کرنے سے پہلے جنم پتری یا جنم کنڈلی کو دیکھ لیتا ہوں۔ اگر مجھے جنم پتری سے یہ معلوم ہو کہ جس کا میں علاج کرنا چاہتا ہوں وہ جلد ہی یا عنقریب ہی مرنے والا ہے تو میں اس کا علاج نہیں کرتا۔

راجہ:- تو مجھے اپنے علاج سے پہلے اپنی جنم پتری آپ کو دکھانی ہوگی۔ اگر اس میں یہ معلوم ہو کہ میں .... جلد ہی یا عنقریب ....

سوامی:- تو مجھے دکھ ہے کہ میں آپ کا علاج نہیں کر سکوں گا مہاراج! کیونکہ آپ بتلایئے اس حالت میں علاج کرنے سے فائدہ ہی کیا؟

راجہ:- ٹھیک ہے۔ میں اپنی جنم پتری ابھی منگوا لیتا ہوں۔

سوامی:- اچھی بات ہے۔

راجہ:- لیجئے یہ میری جنم پتری ہے اس کو دیکھ لیجئے۔

سوامی:- (کاغذ کو ہاتھ میں لینے اور اُلٹ پلٹ کرنے کی آواز) میں نے آپ کی جنم پتری کو دیکھ لیا ہے۔ اس میں سب گرہ ٹھیک ہیں لیکن ایک گرہ ایسی جگہ ہے کہ جس سے ......

راجہ:- ہاں اُس سے کیا معلوم ہوتا ہے؟

سوامی:- مہاراج معاف فرمایئے میں آپ کا علاج نہیں کر سکوں گا۔

راجہ:- (گھبرا کر) کیوں کیوں، سوامی جی بات کیا ہے؟ آپ میرا علاج کیوں نہ کر سکیں گے؟

سوامی:- مجھے افسوس ہے ...... نہایت ہی افسوس ہے کہ آپ کی موت آج سے ایک مہینے کے بعد ہو جائیگی

اس لئے اب آپ ہی بتلائیے مہاراج! آپ کا
علاج کرنے سے کیا فائدہ ہ؟
راجہ:۔ سچ! سچ! مگر..... اگر آپ کی بات صحیح نہ نکلی تو؟
سوامی:۔ مہاراج آپ مجھے ایک مہینہ تک جیل میں رکھئے۔
اگر میری بات جھوٹ نکلے تو آپ مجھے جو چاہیں سزا
دے سکتے ہیں۔
راجہ:۔ تو کیا آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ سچ! سچ!
کیا میری موت ایک مہینہ میں ہونے والی ہے
پھر علاج..... سب..... علاج ..... یہ
سب .... علاج۔ اچھا آپ کو جیل میں رکھا
جائے گا اور اگر آپ کی بات صحیح نہ نکلی تو پھر ایک
مہینے کے بعد...... آپ کو زندگی سے ہاتھ
دھونا پڑے گا۔
سوامی:۔ مجھے منظور ہے۔

ستار کی آواز

(تیسرا منظر)

رانی:۔ مہاراج بڑا غضب ہے۔ آپ نے تو سوامی جی کے
کہے کو بالکل سچ سمجھ لیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ
دے جو کچھ.......
راجہ:۔ اگر وہ سچ نہیں کہتے تو کیوں اس طرح جیل میں
اپنی خواہش سے ہی قید ہو جاتے۔ پھر موت کوئی
ایسی چیز تو نہیں ہے جو نہیں ہوگی ....
رانی:۔ مہاراج .... مہاراج .... آپ تو سوامی
جی کے کہنے کو خود ہی سچ بنا دینے کی کوشش کر رہے
ہیں۔ آپ کو تو ....
راجہ:۔ رانی انہوں نے کتنے غور سے، کتنی دفعہ میری جنم
پتری کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن جب زندگی
ہی نہ رہے گی تو پھر علاج سے کیا فائدہ۔ ....
رانی:۔ مہاراج ...... آپ اس سوامی کی باتوں میں

نہ آئیے۔ آج کل بہت سے لوگ گیروے کپڑے
پہن کر فقیر بن جاتے ہیں۔
راجہ:۔ جس دن سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ میری زندگی
اب بہت ہی تھوڑے دنوں کی ہے ...... مجھے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک منٹ ....
..... ایک ایک لمحہ جیسے موت کا ایلچی ہے
...... اور جیسے وہ میری زندگی چھین لینے کے
لئے آرہا ہے ....
رانی:۔ (روتی آواز میں) میں سچ کہتی ہوں مہاراج۔ اس
سوامی نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔
راجہ:۔ رانی..... رانی..... یہ زندگی صرف اسلئے
چل رہی ہے۔ کیونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ کس
منٹ یہ زندگی ختم ہو جائے گی۔
رانی:۔ مہاراج حوصلہ رکھئے۔ ہمت پیدا کیجئے۔ اٹھئے تو۔
راجہ:۔ رانی..... میرا ایک ایک دن، ایک ایک پل
...... کیسے گزر رہا ہے جیسے میں اپنے دل کی
دھڑکنوں کو گن رہا ہوں۔ ایک منٹ کے بعد جو
دوسرا منٹ آتا ہے وہ اس سے زیادہ خوفناک
اور خطرناک معلوم ہوتا ہے۔
رانی:۔ اس طرح ڈرنے سے تو آپ پاگل ہو جائیں گے
مہاراج۔
راجہ:۔ میں پاگل ..... پاگل ...... بے ہوش..... بتاؤ
...... بتاؤ ..... رانی میں ہوش میں رہ کر کیا کروں
گا۔ ہوش میں ہی مجھے تو موت کے سوا کچھ دکھائی ہی
نہیں دیتا ہے۔
رانی:۔ (روتی ہوئی) میں آپ کو کیسے سمجھا سکتی ہوں....
...... آپ کو نہ کھانے کی سدھ ہے نہ پینے کی بدھ
نہ زندگی کے کسی اور کام کی۔ آپ تو دیپک کی
لو کی طرح ایک موت کی..... ہائے اس نگوڑی
موت کی ہی..... ہائے...... لو لگا کے بیٹھے ہیں
راجہ:۔ پھر بھی وہ آتی نہیں رانی۔ موت کا انتظار موت

سے زیادہ بھیانک ہے۔

رانی :- مہاراج ڈر نہیں اس لئے ڈراتا ہے کیونکہ ہم ڈرتے ہیں اگر ہم ڈریں نہیں تو ڈر ہمارا کچھ نہیں کر سکتا۔

راجہ :- ڈر، ڈر، ڈر ...... ڈر مگر آجائے تو شاید اس میں اتنا ڈر نہ معلوم ہو۔ لیکن اس کا انتظار ......
موت کا انتظار ......

رانی :- دیکھئے مہاراج ...... اس ڈر کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ آپ دن بدن سوکھ کر کانٹا ہوتے جا رہے ہیں آپ کا جسم کیا سے کیا ہو گیا ہے (رو کر) آپ تو خود ہی موت کو بلا رہے ہیں۔ ایسا نہ کیجئے مہاراج ...... اس سوامی کی بات بالکل جھوٹی ہے۔

راجہ :- یہ زندگی کیا ہے؟ کس لئے ہے! جب مرنا ہی ہے تو پھر زندگی کیوں؟ زندگی ہماری زندگی تب ہی رہ سکتی ہے۔ جب ہمیں موت کا خیال تک نہ ہو اگر زندگی کے سر پر موت ہمیشہ سوار رہے تو ایسی زندگی موت سے بدتر ہے۔

رانی :- آپ موت کے خیال کو دماغ سے نکال دیکھئے مہاراج

راجہ :- موت کے خیال کو دماغ سے نکال دینے سے ہی کیا موت نہیں آئے گی۔ موت ......
موت ...... جب ہر گھڑی موت سر پر منڈلا رہی ہو ...... تو پھر زندگی ہاں یہ زندگی کیسے بیت سکتی ہے۔

ستار کی آواز

(چوتھا منظر)

رانی :- مہاراج اٹھئے۔ دیکھئے نا آخر سارا مہینہ گزر گیا اور آپ زندہ ہیں۔ میں کہتی نہ تھی کہ آپ ...... جھوٹا ہے وہ سوامی۔

راجہ :- رانی ...... میں زندہ ہوں سچ مچ زندہ ہوں۔ موت کی ندی کو پار کر گیا ہوں۔ مہینہ بیت گیا اس مہینے کا ایک ایک منٹ کیسا بیتا ہے

رانی :- مہاراج اس سوامی کو بلایا جائے اور اسے وہ سزا دی جائے جس کا کہ وہ سزاوار ہے۔ کیسی باتیں بناتا تھا۔ اوہ ......

راجہ :- تو ہاں رانی، اسے بلایا جائے (دربان کے جانے کی اور سوامی جی کے آنے کی آواز)

راجہ :- سوامی جی پدھاریئے۔ دیکھتے ہیں آپ۔ کیا کہا تھا آپ نے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ میرا علاج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایک مہینہ میں ...... کیا آپ نے جنم پتری ٹھیک طرح نہیں دیکھی تھی؟

سوامی :- (دھیمی آواز میں) جنم پتری دیکھی تھی اور اچھی طرح دیکھی تھی لیکن کیا کوئی اچھی سے اچھی آنکھ والا ہمیشہ اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔

راجہ :- جب آپ اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے تو آپ نے کیوں اس طرح کی بات کہی تھی۔ اب تو آپ کو اپنی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔

سوامی :- میں اپنی سزا بھگتنے کے لئے بالکل تیار ہوں لیکن ......

راجہ :- لیکن ...... لیکن ...... کیا؟

سوامی :- مہاراج سزا سے پہلے میری ایک خواہش ہے

راجہ :- کیا خواہش ہے؟

سوامی :- اگر آپ کا حکم ہو تو کہوں!

راجہ :- ہاں کہئے ضرور کہئے۔

سوامی :- مہاراج آپ اس بڑے آئینے کے سامنے ایک منٹ کے لئے کھڑے ہو جائیں تو جو کچھ مجھے کہنا ہے اسے میں آپ کے حضور میں کہہ سکوں گا۔

راجہ :- اچھی بات ہے

(راجہ کے چل کر کھڑے ہونے کی آواز)

سوامی :- دیکھتے ہیں آپ اپنے سارے جسم کو اس بڑے آئینہ میں مہاراج ......

راجہ :- ہاں دیکھ رہا ہوں تو پھر ......

سوامی:- کیا آپ کا یہ جسم وہی جسم ہے جو پہلے تھا۔ آپ
تو بالکل دبلے پتلے کانٹے جیسے بدن کے ہو گئے ہیں
پہلے تو آپ کا جسم بہت موٹا تھا!؟

راجہ:- تو پھر۔۔۔۔۔

سوامی:- آپ کے موٹاپے کی تو موت ہو گئی اور اس میں سے
آپ کا اصلی دبلا پتلا جسم نئے روپ میں بدل سا
گیا ہے۔ آپ کی موت واقع ہو کر جیسے آپ کا نیا
جنم ہو گیا ہے۔ اور آپ چاہتے ہی کیا تھے مہاراج؟

راجہ:- سوامی جی میں اس مرنے کی چنتا میں یہ
بھول ہی گیا تھا کہ میں دبلا پتلا اور چھریرے بدن
کا ہونا چاہتا تھا (آئینہ میں بار بار اپنے کو دیکھ کر)
سچ مچ میں کتنا دبلا ہو گیا ہوں اور وہ بھی بنا کسی
دوائی کے۔ خوب سوامی جی۔ خوب۔ تو یہ آپ کی
مجھے اپنی بیماری سے اچھا کرنے کی ایک تدبیر تھی۔
یہ میرا علاج تھا۔

سوامی:- مہاراج۔۔۔۔۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ جب انسان
بڑا بن جاتا ہے تو جہاں اس کا من پھولنے لگ
جاتا ہے وہیں تن بھی پھولنے لگ جاتا ہے۔ اگر
بڑے آدمیوں کے دل میں اس موت کی فکر کا ڈر
ہمیشہ بیٹھا رہے تو پھر نہ اُن کا من پھول سکتا
ہے اور نہ تن۔

راجہ:- سچ مچ اس ایک مہینے میں میری سچ مچ موت ہو گئی
ہے میں اب ایک بالکل نئے روپ میں پیدا ہو گیا
ہوں۔ سوامی جی۔۔۔۔ سوامی جی میں آپ کا بیحد
ممنون ہوں۔ آپ کو آدھی سلطنت اور آپ جو
چاہیں ملے گا۔

سوامی:- مجھے آپ کی صحت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیئے۔
مہاراج! بھگوان سے یہی پرارتھنا ہے کہ آپ سدا سکھی رہیں۔

معیار کی توسیع اشاعت اور استحکام کی خاطر

۱:- ذی استعداد علم دوست اصحاب اور احباب کے پتے ارسال فرمائیے۔
۲:- اپنے یہاں کی لائبریری۔ نیوز پیپر ایجنٹ کے پتے ارسال فرما دیجئے۔ اور انہیں معیار کی طرف توجہ دلائیے۔
۳:- گذشتہ تین سال کے بالالحاظ ترتیب چھ ماہ کے مختلف پرچے چار آنے فی پرچہ کے حساب سے ارسال
کئے جا سکتے ہیں۔

۴:- انفرادی خریداران جنکی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے آئندہ ایک سال کا چندہ جلد از جلد ارسال فرما دیں۔
ایجنٹ صاحبان اپنا گذشتہ حساب جلد صاف فرما دیں۔
آپ اپنی نظر میں کوئی تعاون چاہے سادہ ہی کیوں نہ سمجھیں لیکن ہمارے لئے یہ بہت گرانقدر اور باعث سپاسگزاری
ہو گا۔ باہمی اشتراک معجز نما اثرات رکھتا ہے۔

منیجر معیار

ہیرالال ساٹے

کس کی کہانی لکھوں۔۔۔؟؟

بہت دنوں سے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔ آج دل بے چین تھا کچھ لکھنے کے لئے۔ بار بار دماغ میں کچھ خیالات اُبھرتے آرہے تھے۔ مگر کوئی کہانی کا تسلسل صحیح طور پر دماغ میں نہیں آرہا تھا۔ مختلف کہانیاں تو آرہی تھیں۔ مختلف کہانیاں مختلف قسم کی تھیں۔ یوں تو ہر انسان اپنے ساتھ ایک کہانی لئے پھرتا ہے کبھی انسان کی زندگی کی گہرائی میں چلے جائیں تو کہیں بہت سی کہانیاں مل جاتی ہیں۔ میں آج کوئی انوکھی کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ مگر موسم بھی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ گرم ہوائیں چل رہی تھیں بدقسمتی سے میرا گھر سڑک کے کنارے واقع ہے گھر کے سامنے ہمیشہ موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ میری کہانی کے اُبھرتے ہوئے ان خیالات کو موٹروں کی آوازیں درہم برہم کر رہی تھیں۔ ایک پلاٹ جا کر دوسرا پلاٹ اُبھرتا نظر آرہا تھا جس طرح ایک موٹر کے بعد دوسری موٹر آتی ہے۔ یہ موٹریں خاموشی سے بھی نہیں جاتیں اپنے پیچھے دھول اُڑاتی جاتی ہیں۔ آنکھوں میں۔ کانوں میں، کاغذ پر یہ دھول پھیل جاتی ہے۔ پھر تھوڑے سے وقفہ ہی سے کوئی آدھمکتا ہے۔ ایک بدقسمت جرنلسٹ ہونے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی کام لیکر آہی جاتا ہے۔

"ہمارے گاؤں میں ایک عورت باؤلی میں گر گئی صاحب اُس کے چند وجوہات ہیں"

"ہماری زمین پر فلاں زمیندار نے غنڈوں کی مدد سے قبضہ کر لیا ہے"

"بلدیہ والے مجھے ناجائز طور پر ستاتے ہیں" "فلاں انسپکٹر سڑک کے کنارے دوکان لگانے کے لئے دس روپیہ نذرانہ مانگتا ہے" کوئی صاحب دھمکتے ہیں کہ آپ نے ہمارے جلسے کی کوئی خبر ہی نہیں بھیجی۔ جلسے میں تقریر کرتے ہی عوام نے ان کو نیتا ہی مان لیا۔ پبلسٹی کے بھوکے سیاسی قائدین سے سر چکرایا جاتا ہے۔ پتہ نہیں خبروں کو لوگ اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ جیسے خبر بھیجنے سے ان کی دوکان لگ جائے گی اس پر دس کا قبضہ مل جائے گا۔ اس طرح سے مجھے ان آہوں اور چیخوں کو سننے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مذاق تو نہیں کر رہا ہوں۔ کیا وہ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں۔ صحیح ہے ایک جرنلسٹ ایک درکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماج اور ماحول میں وہ طوفان انگیز تبدیلی نہ لائے۔ مگر ان کو تاثر ضرور کر سکتا ہے۔ اگر جرنلسٹ حقیقتوں کو لکھنا شروع کردیں تو ان پارٹیوں کے لیڈروں کو غصہ آجاتا ہے۔

واہ آپ نے فلاں جلسے میں صرف نو آدمیوں کی تعداد بتلائی مگر دس ہزار آدمیوں کی تعداد بتلاتے تو آپ کا کیا جاتا تھا ــــ مگر ہم کمیونسٹوں کی دن رات کی مصروفیتوں کو لکھیں تو کمیونسٹ چلانے لگتے ہیں کہ جھوٹی نیوز دیتا ہے اور ہم کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حکومت کا پٹھو ہے۔ حقیقی واقعات کو چھپاتا ہے۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم ہماری پبلسٹی ہی کرو مگر ہم پر تنقید نہ کرو۔ تاکہ ہمارے کالے کرتوت دوسروں کو معلوم نہ ہوں۔ تم لکھو گے تو ہم تمہارے خلاف آواز اُٹھائیں گے تم کو بدنام کر ڈالیں گے یہاں تک ہمارے ضلع کے کمیونسٹ قائدین نے جرنلسٹوں کو خوف زدہ بھی کیا۔ دوسری طرف حکومت کی جماعت کانگریس کے خلاف لکھیں تو کانگریس والے حکومتی رعب بتلاتے ہیں۔ پولیس کا ڈر دکھلاتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں مجھے کچھ حقیقت لکھنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ خواہ وہ کمیونسٹ ہو کہ کانگریسی۔ یا فرقہ پرست ہی کیوں نہ ہو۔ جو بات حقیقت ہوگی اس بارے میں لکھنا میرا فرض ہو جاتا ہے خواہ وہ ڈی ایس پی کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ کلکٹر کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ یہ میری فطرت کی آواز ہے۔ اس کو میں دبا نہیں سکتا۔ زمانہ اب ایسا آگیا ہے کہ ہر قائد ہر سیاسی جماعت جرنلسٹوں کو اپنے پاکٹ کی سگرٹ کی ڈبی سمجھنے لگی ہے۔ جب جی چاہا ایک سگرٹ سلگا لیا۔ شاید انہیں معلوم نہیں کہ کچھ جرنلسٹ بھی ایسے ہیں جو سگرٹ کی ڈبی بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اپنے فطرت کی آواز کو دبا نہیں سکتے۔ مجھے ان سب بے وقوفوں پر ہنسی سی آتی ہے۔ کچھ

تھوڑی سی سیاسی تبدیلی کو دیکھکر یہ قائدین عجیب و غریب ہوائی قلعے بنانے لگتے ہیں۔ چند ترقی پسند سیاست داں مرحوم سیاست دانوں کے پیچھے چھپتے ہوئے اپنے کو ان کے برابر کا آدمی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اپنے کو ان کا جانشین ہی سمجھنے لگتے ہیں جیسے کہ سیاست کسی کے باپ کی ملکیت ہے۔ مگر تعجب اس بات کا ہے کہ ہمارے پاس چند ایسے قائدین کی تعداد ہے۔ جو اپنے آپ کو جگت نیتا سمجھتے ہیں۔ شائد وہ نہیں جانتے کہ ان کے اعزاز عارضی ہیں۔ کرایہ کے اعزاز میں کچھ حد تو ہے۔ مگر سیاسی اعزاز زمانے کے ایک ہی جھونکے کا محتاج ہوتا ہے۔ ایک ذرا تھپیڑے میں لاپتہ ہو جاتا ہے۔ میں بہت سے ایم ایل اے اور ایم پی کو جانتا ہوں جو اپنے حلقے میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ اپنے عوام سے بات کرتے ہوئے انہیں پسینہ سا آجاتا ہے۔ اسلئے بہت سے ایم ایل اے شہروں میں بسنے لگے ہیں۔ کوئی ایم ایل اے شہر میں رہکر ایل ایل بی کر رہا ہے۔ کوئی ایم ایل اے گھوڑوں کی ریس میں ہر روز حصہ لے رہا ہے۔ کوئی ایم ایل اے پیروی کرکے اپنے مستقبل کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ کوئی ایم ایل اے ڈپٹی منسٹر بننے کی فکر میں یا کوئی اعزاز حاصل کرنے کی لگن میں بڑے بڑے حضور والا کے دربار میں جھاڑو دے رہا ہے۔ ایسے بہت سے نرم و نازک واقعات انہیں دیکھتے ہوئے بھی ہمیں روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ اتفاقاً مجھے ایک سیاسی جلسے میں جانا پڑا۔ ایک شخص اسٹیج پر آکر ہاتھ پھیلا پھیلا کر ہندوستانی بول رہا ہے صحیح لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ جلسے کا اعلان کس مقصد کے لئے تھا اور یہ صاحب اس مقصد کو چھوڑکر ادھر ادھر بھٹک رہے تھے مگر وہ تقریر کئے جا رہے تھے اس ساری مشقت کے باوجود بھی کسی نے کچھ بھی نہ سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک سے پوچھا یہ کون ہیں ایک والنٹیر نے کہا کہ یہ ہمارے ضلع کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ کل تک انڈر گراؤنڈ... تھے یعنی کل تک۔ یہ حضرت بندوق کاندھے پر رکھکر جنگلوں اور جھاڑوں میں چھپتے پھرتے رہے ہیں۔ اپنے آپ کو انقلابی کہتے رہے ہیں اگر ان کی بہادری کے قصے معلوم کرنا چاہیں تو پھر ان تھم خانوں اور جھاڑوں سے پوچھنا پڑے گا تاکہ ان کی ننگی داستان کھلکر سامنے آجائے۔ ان کے ہاتھوں سے قتل کی ہوئی معصوم جانیں تو کچھ بتلا نہ سکیں گی اور اگر کوئی بتلائیگا تو یہ لوگ اسکو زندہ نہ چھوڑیں گے میں یہ سوچ ہی رہا تھا اور وہ حضرت تقریر کئے جا رہے تھے یہ سیاسی قائدین چاہتے ہیں کہ ان کی الٹی بے سمجھ اور لغو باتوں کو ہم اپنی طرح سے اچھی بتاکر اخبار

میں بھیجیں اور ان کے جلسوں کی تعریف کریں

میں آج دراصل ایک رومان بھری کہانی لکھنا چاہتا تھا مگر کچھ ایسی حقیقی کہانیاں میرے اطراف روز بروز ابھر رہی تھیں کہ رومان کی کہانی لکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ یہی حقیقی کہانیاں قلم کے سہارے کاغذ پر پھیلتی ہی جا رہی تھیں اتنے میں ایک درزی آیا۔ "لیجئے صاحب آپکی قمیص!" "آپ کیا چاہتے ہو"۔ اسکی اجرت "کچھ بھی دیجئے صاحب آپ کی مہربانی"۔ "ارے اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ تم نے محنت کی اور تمکو پوری اجرت مانگنے کا حق ہے" "صاحب آپ سے کیا اجرت کا تقاضا کروں۔ کون یہاں صحیح اجرت دیتا ہے۔ ایک اعلیٰ آفیسر ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتا ہے۔ قمیص کے لئے روپیہ دیتے وقت تکرار کرتا ہے ہم درزی لوگ ہی بدنصیب ہیں صاحب۔ صبح شام ہم اپنی جوانی ان قمیصوں پتلونوں، جاکٹوں اور بلوزوں میں بھر بھر کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے پیٹ تک نہیں بھرتے۔ ہمارے سلے ہوئے پائجامے اور پتلون پہن پہن کر لوگ ہماری طرف ایک گندی نگاہ ڈالکر چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھکر بات کرنا۔ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ دن رات کی محنت کے بعد بھی ہم اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ میرے لڑکے حامد کی قمیص پھٹ گئی ہے دو ماہ سے پھٹی قمیص پہنکر قمیصوں کی تیاری میں مدد کر رہا ہے۔ میرا دل جل جاتا ہے صاحب۔ یہ پھٹی قمیص پہنکر ہم کب تک نئی قمیص تیار کرتے رہیں گے۔ کیا یہ فرق کبھی مٹ جائے گا۔ یہ تو ہماری بات ہوئی۔ گھر میں میری بیوی سال بھر سے دمہ سے پریشان مگر دوا علاج کے لئے کبھی پیسے جمع نہیں ہوئے۔ اس طرح محنت کرتے کرتے آدھی زندگی گذر گئی۔ اب ہماری زندگی کی قندیل میں تیل بھی ختم ہونے کو ہے" سلیمان کی باتیں سنکر مجھے بہت سے درزی دوست یاد آگئے جن کے گھروں میں موت واقع ہوئی پھر ان کو چندے مانگنے پڑے۔ اس سماج میں دن بھر محنت کرنے کے باوجود بھی انسان کو بھوکا مرنا پڑتا ہے اس کی لاش کے۔ اچھے اچھے قمیص پہننے والوں کے پاس جاکر بھیک مانگنا پڑتا ہے۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ادھر سیاسی قائدین چھوٹی موٹی تقریریں کرکے یونینوں کو کونسلیں بناتے ہیں اپنے جیکارے اور نعرے لگواتے ہیں۔ اپنے جلسوں کی رونق ان بے نور چہروں سے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج مجھے سب سے زیادہ بگڑے ہوئے یہ سیاسی قائدین ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اخبار ور کی چاپلوسی کرکے ان سے چندے

وصول کرتے ہیں اندر اندر ان کی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ ادھر غریبوں سے وعدے کر کے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ کاش یہ لیڈر پیدا ہی نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ دھن والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں دوڑتی۔ یہاں محنت ایک کرتا ہے پیٹ دوسرے کا بھرتا ہے۔ قتل ایک کرتا ہے سزا دوسرے کو ملتی ہے۔ ہمارے پاس قاتلوں کے سردار زبردست سیاسی قائدین کہلاتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو دیش بھگت اور انقلابی نیتا کہتے ہیں۔ اتنے میں میری بھابی نے مجھے پکارا کہ چلو کیا لکھ رہے ہو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بھابی چلو ابھی آتا ہوں۔ "نہیں نہیں ابھی" آدھمکتے ہوئے چلی گئی سامنے میں بھابی کی فوج مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ چلو چچا جی چائے پینے کے لئے ماتا جی بلا رہی ہیں اتنے میں ایک زبردست آواز میرے کانوں سے آکر ٹکرائی۔ اور میں چائے پینے کے لئے اندر چلا گیا اور خیالات کا تانتا ٹوٹتا گیا اور یہ کہانی نامکمل ہو گئی واقعی زندگی کی کہانی جس طرح شروع ہوتی ہے اسی طرح ختم بھی ہو جائے گی اور یہی ہمارے جیون کا ایک بڑا بھید ہے۔

آخری کش

ناشر

مکتبہ معیار میرٹھ

خطوط و نکات

- لالہ صحرائی
- ابن احمد گورکھپوری
- حبیب الرحمن خاں
- محمود الحسن شاہد

داغ داغ اجالے پر تبصرہ

لالہ صحرائی :-

ستمبر ۵۳ء کے نقوش ادل کی "نشہ" پاکر سب سے پہلے ابن فرید صاحب کا افسانہ "داغ داغ اجالے" پڑھا۔ افسانہ کی پلاٹنگ صاحب افسانہ نے بہت خوب کی ہے۔ اور اس کے لئے وہ مستحق داد ہیں لیکن جیسا کہ آپ نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ موصوف اس پلاٹنگ کو پوری طرح (balance) نہیں کر سکے، جسکی وجہ سے افسانے کے مرکزی تاثر کی نشو نما میں جھول رہ گیا ہے۔ اور اس میں مضمر رمزیت (SYMBOLISM) کے اشارے کنائے بھی واضح اور نمایاں نہیں ہو سکے رمزیت (SYMBOLISM) کی ٹیکنک نہایت ہی زبردست فنی مہارت اور چابکدستی کی متقاضی ہے۔ اور اسی اعتبار سے اپنے بھرپور استعمال کی صورت میں قاری کو ایک عظیم تاثر کی دولت سے فیضیاب کرتی ہے ـــــ ایک ایسے ہی عظیم تاثر سے جو کسی مرصع شعر سے حاصل ہوتا ہے۔! اب ظاہر ہے کہ اگر اس کا استعمال صناعانہ اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ نہ ہوگا۔ تو مطلوبہ تاثر کی ساری شان و شوکت ماند پڑ جائے گی۔ اور افسانہ پھسپھسا ہو کر رہ جائے گا۔

البتہ یہ کہنا زیادتی ہوگا کہ ایک افسانے کا عہد لازماً زندگی کا کوئی ایک ہی واقعہ ہونا چاہیئے، نہ کہ پوری زندگی ـــــ افسانے کی فضا کو یوں محدود کر کے رکھ دینے کا نہ کوئی قاعدہ کلیہ اب تک بن سکا ہے۔ اور نہ ہی شاید بن سکے۔ خود فن افسانہ نویسی کے بیشتر نئے اور پرانے اساتذہ نے متعدد ایسے افسانے لکھے ہیں جن کا عہد (Period) ان کے کرداروں کی تقریباً ساری زندگی پر محیط ہے۔ اس کے باوجود وہ افسانے نہایت ہی کامیاب تخلیقات ہیں۔ اور دنیا کے کلاسیکل افسانوی ادب میں شامل کئے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں علی الخصوص ٹالسٹائی اور منشی پریم چند کی تخلیقات قابل توجہ ہوں گی ـــــ مزید برآں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک ناول کو بھی لازماً اپنے کردار کی پوری زندگی پر محیط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ متقدمین یا متاخرین اساتذہ ادب کے ہاں کسی نے بھی اس خیال کو قاعدے کلیہ کا درجہ نہیں بخشا، اس کے برعکس متعدد ایسے معیاری ناول دنیا کے ادب میں موجود ہیں۔ جن کا عہد کسی فرد کی زندگی کے ایک خاص جزو یا کسی معاشرہ کی زندگی کے ایک خاص شعبہ یا کسی دور زمانہ کے ایک خاص حصے پر مشتمل ہے۔ مثلاً اس ضمن میں آئرلینڈ کے مشہور ادیب LIAM O' FLAHERTY کے مشہور ناول THE INFORMER کو ہی لیجئے، جس کا Period شاید چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں۔ لیکن اسکے باوجود فنی نکتہ نگاہ سے وہ بے حد کامیاب ناول ہے۔

دراصل فنی لحاظ سے ایک اچھے افسانے کے بنیادی لوازمات صرف دو ہی ہیں۔ وحدت تاثر اور شدت تاثر ـــــ اگر کوئی افسانہ ان دو بنیادی لوازمات سے مزین ہے اور بیان و اظہار کے دوسرے

فنی تقاضوں کی تکمیل سے بھی بہرہ ور ہے۔ تو اسے بہر حال ایک کامیاب افسانہ سمجھا جائے گا۔ قطع نظر اس امر کے کہ اس کا عہد انسانی زندگی کے ایک خاص عرصہ پر مشتمل ہے۔ یا پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ یا اس سے بھی بڑھکر ساری نسل انسانی کی پوری تاریخ پر محیط ہے —— رہ گیا ناول سو اسکے لئے بھی بنیادی طور پر وحدت تاثر کا عنصر لازمی ٹھہرتا ہے۔ یہاں اظہار تاثر کے لئے ضرور نسبتاً ایک وسیع کینوس استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی نسبت سے اس کے لئے شدت تاثر کی شرط لازمی نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ اسکی بجائے تاثر واحساس کی ایک آہستہ خرام اور سبک گام رو کی موجودگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اور یہی افسانے اور ناول کا فنی نقطۂ نگاہ سے بنیادی فرق ہے۔ افسانہ ایک بھرپور آبشار ہے اور ناول ایک آہستہ رو اور سبک خرام ندی —— افسانہ ایک شعر یا قطعہ کی مانند ہے۔ اور ناول ایک طویل نظم کی طرح —— بہر حال مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی وحدت تاثر اور شدت تاثر — افسانے کے ذریعہ یہ مقصد فوراً حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ناول کے ذریعے نسبتاً دیر سے ادھر چونکہ انسانی طبائع و اذہان تاثر پذیری اور احساس اندوزی کے لحاظ سے ایک سی صلاحیتیں اور ایک سے ذوق نہیں رکھتے، لہٰذا مربیانِ فن نے ناول اور افسانہ کی دونوں "اصنافِ سخن" کو تربیت اذہان کیلئے پیدا کیا۔ اور ان دونوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا ہے —— بات لمبی ہوتی جاتی ہے اور ادھر ایک خط کی محدود فضا اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ساتھ ہی فالج زدہ ہاتھ میں مدت کے بعد آج قلم پکڑا ہے۔ لہٰذا احتیاطاً اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ ہاں اتنا عرض کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ ابن فرید صاحب کے کچھ افسانے پہلے بھی میری نظروں سے گذر چکے ہیں۔ اور میں ان کی تحریروں میں ایک عمدہ افسانہ نویس کے جوہر مضمر دیکھ رہا ہوں۔ براہ کرم انہیں کسی نہ کسی طور پر اس کام کی سمت ضرور مائل رکھئے، وہ ایک ژرف نگاہ اور محنتی فنکار معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ اسی طرح محنت فرماتے رہے تو انشاء اللہ اس محنت اور اپنے خداداد اوصاف کے سہارے وہ ایک روز ضرور اس رخنے کو بھرنے کا موجب ہو جائیں گے۔ جو تحریک اسلامی کے ساتھ اچھے اور معیاری افسانہ نگاروں کی عدم وابستگی کے باعث اس کے ادبی مورچہ میں ان دنوں نمایاں نظر آتا ہے۔ خدا کرے یہ مرحلہ جلد طے ہو اور حق کے سپاہی اس کی بخشی ہوئی تاب و توانائی سے طاغوتِ ابلیسیت کو ہر ہر مورچے پر شکست و نامرادی سے ہمکنار کر دیں!

یہ سطور بھی محض اس لئے لکھی ہیں کہ ابن فرید صاحب میں ایک فنکار شخصیت کا امید افزا پرتو جھلکتا نظر آتا ہے۔ جس کی مزید نشو و ارتقا انشاء اللہ خاصے خوش آئند نتائج کی حامل ہوگی۔ ورنہ سچ پوچھئے تو افسانہ نویسی کے میدان میں اپنے ہاں جوہر قابل ذرا کم ہی نظر آتے ہیں۔

ابن احمد:—

کتنے افسانے آئے دن لکھے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں اور سنے جاتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے قائم کی جاتی ہے اگرچہ یہ رائے منضبط نہ ہوتی ہو اور خواہ وہ وقتی ہی حیثیت کیوں نہ رکھتی ہو۔ ...... دسمبر میں داغ داغ اجالے کے زیر عنوان محترم ابن فرید صاحب نے جو افسانہ معیار کی زبانی سنایا ہے چونکہ آپ نے اسکو کسی وجہ سے اہمیت دیکر قارئین سے رائے طلب کی ہے۔ لہٰذا ایک مخلص قاری کی حیثیت سے جو کچھ رائے رکھتا ہوں قلم بند کرنے کی جرأت کر رہا ہوں شائد یہ بات پہلے ہی سے واضح ہو کہ جب رائے دینے کا سوال ہو تو دیانتداری کے سوائے ہر تعلق سے بے پرواہ ہو کر دیجاتی ہے —

آپ کے الفاظ میں اسٹیونسن کے بتلائے ہوئے تین مختلف طریقوں میں سے اس افسانہ میں تخلیقی عمل کا تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا ہے یعنی افسانہ میں کردار کی اہمیت مقدم ہے پھر ماحول بھی کسی قدر خصوصیت کا حامل ہے۔ مگر پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔

افسانہ نگار کے دوسرے افسانوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اگر رائے زنی مناسب ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کی طبیعت کا رجحان جنسیات کی طرف ہے خصوصاً صنف نازک کے درمیان پھیلے ہوئے گونا گوں فکری و عملی فساد کی جانب اس کی توجہ پہلے پہنچتی ہے۔ بے شک افسانہ نگار آخر تک پہنچتے پہنچتے اپنے بعض افسانوں میں تنقید و اصلاح حال کی اس نازک ذمہ داری سے بڑی حد تک عہدہ برآ ہو جاتا ہے جو بحیثیت ادیب اس پر آ پڑتی ہے مگر کسی ایک گروہ انسانی کے مخصوص مسائل میں اس قدر دلچسپی لینا کہ دوسرے اہم مسائل کی اہمیت کبھی محسوس ہی نہ ہو

ایک انتہاپسند رجحان کا پتہ دیتا ہے۔

آنند جی کا تبصرہ نہ صرف ناول اور افسانے کے فرق کو واضح کرنے کی حد تک درست ہے بلکہ بڑی حد تک خود افسانے کے بارے میں صحیح ہے مگر کسی افسانے کے اندر تاثرات و کیفیات کی داشتبا بندی نہیں کی جا سکتی۔ مگر اتنا واضح ہے کہ افسانہ کا ظرف تنگ بھی ہوتا ہے اور نازک بھی۔ ایک واقعہ کے مختلف تاثرات کا تو افسانہ متحمل ہو سکتا ہے لیکن واقعات کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اس میں نہیں ہوتی۔ داغ داغ اُجالے کے سلسلے میں جی تو ایسا چاہتا ہے۔ کہ یہ افسانہ بس ایک ہی موڑ مڑتا ——— گھر یا کالج سے دفتر تک ——— یا زیادہ سے زیادہ دفتر سے بال روم تک کی اجازت نکل سکتی ہے۔ اس صورت میں افسانہ کو وہیں ختم ہو جانا چاہیئے جہاں ایمبیسڈر سے واپسی کے بعد صبح کو اس کے مکروہ باطن اور اس کی مکروہ صورت دونوں کا منہ چڑانے کے لئے آئینہ موجود ہوتا ہے اس کے بعد جو کچھ افسانے کے تحت کہا گیا ہے دراصل وہ ایک دوسرے ہی افسانے کا حصہ ہے جسے ایک ہی افسانہ میں پیش کر کے افسانہ نگار نے ایک طرح کی فنی زیادتی کی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ آپ میرے تاثرات میں شریک ہوں مگر میں ابن فرید جیسے فنکار کے سلسلے میں یہ سوچکر حیران ہوں کہ انہوں نے کیونکر اسے جائز رکھا کہ ان کا یہ نازک فنپارہ ایک سپاٹ کہانی بن جائے۔ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ اُن کی یہ اچھوتی تخلیق ازدواجی زندگی کی گراں باریوں کو بھی سہار سکے گی۔

افسانہ کا جہاں سے غیر ضروری (باعتبار فن اور حسن) حصہ شروع ہوتا ہے وہیں سے دراصل افسانہ میں جھول بھی شروع ہوتا ہے چند روز بال روم اور دفتر کی متضاد زندگی گذارتے ہوئے نجمہ نے اپنی زندگی کے انجام کے بارے میں اتنی دوراندیشی سے کام لیا کہ وہ جان گئی کہ اس کی زندگی کی گاڑی بہت جلد کسی بہت بڑی خندق میں گر جائے گی۔ اور پھر کسی کے بس کا نہ رہیگا کہ اسے اس سے نجات دلا سکے۔ چنانچہ وہ ازدواجی زندگی پر راضی ہو گئی۔ یہ اپنے کردار کے بارے میں افسانہ نگار کی خوش فہمی ہی نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ چنانچہ نجمہ ازدواجی زندگی میں پہلا قدم رکھتے ہی ناکام ہو جاتی ہے۔ خانگی کاموں کو ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ پابند زندگی سے طبیعت بھر جاتی ہے ——— شادی سے پہلے اس کا مذبذب ہونا بھی محل نظر ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ اسکو اس امر کا تاثر حاصل ہو کہ ملازمت ہی اس کی اصل زندگی یا سامان زندگی ہے کیونکہ ازدواجی زندگی پر دفتری زندگی کو فوری طور پر ترجیح دینا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے وہ بدستور فریب خوردگی کا شکار رہتی ہے۔ اور اس پر راضی بھی ہے۔ اس موقع پر شوہر کی عدم موجودگی کا عذر عذر لنگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ سراسر اپنے مردہ ضمیر کو فریب دینا ہے اور اگر افسانہ نگار اس عذر کے اندر کوئی معقولیت یا وزن محسوس کرتا ہے تو یہ اس کے کردار (نجمہ) کی خامی سے زیادہ اسکی فنی لغزش کا ثبوت ہے۔ کہنے کا مقصود یہ ہے کہ وہ ہر حال میں قبول حق کی صلاحیت سے یکساں طور پر عاری رہتی ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں اگر ہم اس کی بلند آوازیں سنتے ہیں تو غلطی سے اُسے طلب حق سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ دراصل وہ چیخیں ہیں جو بے راہ روی کے دوران کھائی ہوئی شدید چوٹوں کے اثر سے بلند ہو جاتی ہیں۔

سب سے آخر میں ہم اس سبب کو واضح کرنا چاہتے ہیں جو اس فن پارہ کو ہر صورت سے مکمل اور معیاری بنانے میں حارج ہوا ہے مجھے یقین ہے کہ ہمارے بیشتر فنکاروں کو اپنی نازک ذمہ داری کا ضرور احساس ہوگا۔ یہ ذمہ داری دوگونہ ہے ایک نظریاتی حیثیت سے عائد ہوتی ہے۔ دوسری فنی حیثیت سے۔ اس سوال سے قطع نظر کہ کون سی ذمہ داری مقدم ہے۔ دونوں ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا ایک کامیاب فن کار کے لئے ہم شرط لازم سمجھتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہر فن کار اپنی اُفتاد طبع کے لحاظ سے ان دوگونہ ذمہ داریوں کا کم و بیش احساس رکھتے ہوئے میدان ادب میں اتر سکتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک سے یکسر صرف نظر کر کے کامیاب ادیب نہیں کہلا سکتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ادیب اپنی نظریاتی حیثیت کے تقاضے کے احساس میں غلو کر کے فنی حیثیت کے تقاضوں کو بھلا بیٹھتا ہے یہ صورت حال اگر شروع ہی سے اختیار کی جائے تو پوری تخلیق فنی اعتبار سے ناکارہ بنکر رہ جاتی ہے۔ ورنہ جہاں سے اختیار کی جاتی ہے وہیں سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ غلطی سے ایک ادیب کی ذمہ داری میں اسکو بھی داخل سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمارے فکر و عمل کی غلطی کی نشاندہی کے ساتھ اصلاح کی طرف نہ صرف [illegible]

اس خرابی کا مکمل نسخہ بھی تجویز کرے۔ واقعیت Realism اور مثالیت (——ism) کے درمیان ایک ادیب کے متوازن طرزِ عمل کو متعین کرنے میں جو دشواری پیش آتی ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے ایک مفکر ادیب کی یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے اسے اس طرح پیش کیا جائے کہ جو کچھ ہونا چاہیئے خود بخود سامنے آجائے" یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اپنی تخلیق میں اس اصول کو کما حقہٗ نبھانا ایک ادیب کے لئے آسان بھی نہیں۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس پر ہمارے ادیبوں کی کامیابی کا انحصار ہے۔

"داغ داغ اُجالے" میں افسوس کہ اس اصول کو کامیابی کے ساتھ نہیں نبھایا گیا۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسکو تو پیش کیا ہی گیا ہے۔ مگر جو کچھ ہونا چاہیئے۔ وہ بھی پیش کر دیا گیا ہے یہ اس افسانہ کی ناکامی کا راز ہے

بیشک ابن فرید صاحب نے چند افسانے بہت کامیاب پیش کئے ہیں۔ اور ان سے افسانوں کے مجموعہ کا مطالبہ کئے جانے میں میں بھی ایڈیٹر معیار کا ہمنوا ہوں۔ مگر یہ خیال داغ داغ اُجالے کے بعد کا نہیں پہلے کا ہے۔ اس افسانہ کا اُٹھان بیشک اپنے اندر عظیم افسانہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ عظیم افسانہ بن نہ سکا بلکہ "یہ جہاں" —— کو سامنے رکھتے ہوئے اسکو ترقی معکوس (Counter Progress) بھی کہہ سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بار اور میں اپنے سرمایۂ خلوص کو حاضرِ خدمت کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ افسانہ چاہے مختلف... حیثیتوں سے ناپسند ہو۔ مگر ابن فرید صاحب ضرور عزیز ہیں اور ان کی افسانہ کی راہ میں کامیاب کوششوں کا دل سے معترف ہوں :—

تنقید نمبر پر تنقیدی نظر

حبیب الرحمٰن خاں (میوات)

مسلسل انتظار و بیہم شوق و اضطراب کے بعد معیار کا تنقید نمبر نظر افروز ہوا۔ پڑھکر عجیب سرور حاصل ہوا۔ بعض مضمون البتہ میری تشنہ لبی دور نہ کر سکے۔ مثلاً عربی شاعری پر جس نوعیت کا مضمون درکار تھا۔ وہ معدوم ہے۔ اس قسم کا مضمون اس سے پیشتر فروری ۱۹۵۴ء میں آچکا ہے۔ اب تو عربی شاعری میں اسلامی اقدار کو اُجاگر کرنے کا موقع تھا — حماسہ علاوہ کی جاہلی شاعری کا ایک بہترین مرقع ہے۔ فاضل مضمون نگار کو چاہئے تھا کہ وہ کوئی انتخاب اسلامی شاعری کا کرتے اور پھر موازنہ کرکے بتلاتے کہ اسلام نے عربی شاعری میں کس طرح عظیم انقلاب برپا کیا :—

محمود الحسن شاہد :—

برادرم محترم　　　　ہدیۂ سلام و خلوص

سب سے پہلے اس قابل قدر شاہکار پر بے اختیار مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے یہ اس لئے بھی کہ اس دورِ فحاشی و عریانی میں طبیعتوں کے عام رجحان کے خلاف اور حالات کی ناسازگاری قدم قدم پہ مشکلات کی کثرت کے باوجود ہمت کرکے جو کچھ ہو سکا آپ نے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ اور توقع کے خلاف ہر حیثیت سے مفید اور قابلِ اطمینان آپ کی اس مساعیٔ جمیلہ نے عام اسکے کہ وہ ترقی پسندوں کا حلقہ ہو۔ یا کوئی اور کم از کم اس حقیقت کو ثابت کر دیا۔ کہ ادب اسلامی اپنا ایک مخصوص مگر قیمتی اور وسیع تنقیدی ذخیرہ رکھتا ہے اور دوسرے تمام مکاتیبِ فکر کے خلاف اس کا اپنا ایک الگ اور مستقل فلسفہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اسکول سے تعلق رکھنے والے نقاد اور ادبا اس سے دلچسپی اسکے متعلق اظہارِ خیال نہ کریں۔ جیسا کہ اب تک وہ اپنی تنگ نظری کی بناپر صرف نظر کرتے آئے ہیں۔ انشاء اللہ یہ تنقید نمبر تعمیر پسند ادب اور اسکے تنقیدی اندازِ فکر کو دوسرے سنجیدہ و باشعور حلقوں کے سمجھنے میں کافی معاون ہوگا اور یہ بات کھلکر سامنے آجائے گی۔ کہ ہماری ادبی تنظیم کی بنیاد کس قدر گہری ہے۔ اور کتنے تناسب اور ابتدائی مراحل کی پیدا وار ہے نیز ہمارے ادبا و مفکرین نے اس تھوڑی سی مدت میں اس میدان کو کتنا وسیع و کارآمد بنایا ہے۔ آگے چند سطروں میں اپنی رائے درج کرتا ہوں۔ اور جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ بالکل ضروری نہیں کہ سب کی رائے ہمیشہ ایکسی ہو۔ اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے

ادب اور اسلامی ادب —— مسعود جاوید

مقالہ پر مغز اور سنجیدگی کا حامل ہے صاحبِ مقالہ نے ادب کا صحیح قیام اور اسکی غرض و غایت بیان کرنے میں مقصدی بحث کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ اور زندگی چونکہ متضاد و وسیع اچھے برے

رتسں کے خیالات کی آماجگاہ ہے اسلئے ہر دور کا ادب زندگی اور
طرت کی پیچیدگی کے باعث اپنے مختلف طرز فکر یشایان تصورات کا
ہار کرتا ہے تاہم بعض اقدار ایسی بھی ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور
مر دور کے ادب میں مشترک پائی جاتی ہیں ۔ اسی لئے ہمیں بعض
بے ادبا میں بھی چند باتیں مل جایا کرتی ہیں ۔ جو اسلام کی نگاہ میں
فید اور دلچسپ ہیں حالانکہ وہ فکر و نظر کے اعتبار سے سراسر قابل
قید ہوتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں مسعود صاحب نے شعراء جاہلی
یش کیا ۔ جو باوجود غیر موحد ہونے کے انسانی خصائل کے احترام کے
ائل تھے ۔ پھر اس کے بعد گریز کرکے اُردو کے پرانے شعراء کو لاتے ہیں
ور یہ بتایا ہے کہ ان کے یہاں تعمیری رجحانات اور ادب و زندگی کے
رمیان گہرے رابطہ کا پتہ چلتا ہے اور مومن و غالب کے یہاں تو یہ شعور
یادہ نکھرا اور کروٹیں لیتا نظر آتا ہے ۔ جو آگے چلکر حالی و شبلی کے پیکر
فادیت میں جلوہ فرما ہوکر اصلاح و انقلاب کے دھارے میں بدل
اتا ہے ۔ یہاں ادب باقاعدہ زندگی کا ترجمان اور کائنات کا
شارح بنکر سامنے آتا ہے ۔ بالآخر اسی کے گود سے اقبال جنم لیتا
ہے ۔ جسکا تمام زور انسانیت کے لئے ایک تنبیہ اور ارتقاء حیات
کے لئے ایک پائیدار فلسفہ تھا اقبال تعمیر پسند ادبا کے لئے خضر راہ کی
حیثیت رکھتا ہے ۔ اور اس سے ادبی دنیا میں اور مستقل اور الگ
لگ نظریئے پرورش پاتے ہیں ۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے ادب کو تمام تر
نسی تصور حیات کا تابع بنا دیا ۔ اور اسی مقام سے تعمیر پسند ادب باقاعدہ
نظیمی جد و جہد کا آغاز کرتا ہے ۔ یہ تاریخی ترتیب مسعود صاحب
کے ذوق اور تنقیدی ذمہ داری کو سمجھاتی ہے البتہ ایک چیز جو سمجھ
یں نہیں آتی وہ یہ کہ جناب نے ادب کو پروپیگنڈہ سے الگ تسلیم
رکے اسکی سرحدی تعیین میں عربی کے جن شعراء کو پیش کیا ہے
ن سے مجھے اختلاف ہے اسلام نے آکر یقیناً عربوں کو ایک نیا طرز فکر
ور ایک نئی تحریک زندگی سے روشناس کرایا اس انقلاب نے جہاں
ور اثرات حیات انفرادی و اجتماعی میں چھوڑے قلب و نظر کے بدلنے
سے شاعری کو بھی اپنے لئے نئے اسلوب اختیار کرنے پڑے اور ریاست
معیشت معاشرت و ادب سارے کے سارے اسلام کے گرد چکر
کاٹنے لگے ۔ اب ادب میں اسلامی و تعمیری رجحان سمویا جانے لگا ۔ لیکن
یہی فنکار جو دور جاہلیت میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ آگ و شعلہ برساتے

تھے ۔ سینوں کو گرمانا اور دلوں کو برمانا جنکی شاعری کا کمال فن تھا
یکایک سرد و ٹھنڈے پڑ گئے ۔ نئے فکر اور نئے شعور کو شاعری کے
پیکر دلربا میں اُتارنے سے ناکام رہے اور ادب اور پروپیگنڈا دونوں
ایک ہی اسٹیج پر آگئے غالباً اسکی وجہ یہ ہوکہ عربی قوم چونکہ فصاحت
و بلاغت پر مرتی اور سر دھنتی تھی ۔ اسکے شعرا اور ادیب اپنے کمال پر
مفتخر تھے ۔ قرآن نے آکر فصاحت و بلاغت کی ایسی شمع جلائی جسکے
آگے ان کے سب دھندے پڑ گئے ۔ اس لئے فنی انحطاط شاید اسی
مرعوب کن ذہنیت کا نتیجہ ہو دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے ۔ کہ
انقلاب ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھا ۔ ذہن و فکر بدلے ابھی
کتنے دن ہوئے تھے اس لئے نئے تصور کے ساتھ ساتھ نئے فارم
اور اسٹائل کی ضرورت تھی ۔ اور ظاہر ہے کہ دلکش فارم کے لئے دو تین
کیا برسوں کی مدت چاہیئے ۔ تیسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ شعراء جاہلی کے
شعور کو بیدار کرنے میں جن محرکات کا دخل تھا ۔ انہیں اسلام نے
ناجائز ٹھہرا لیا بلکہ مطلق حرام قرار دے دیا ۔ اس فوری تبدیلی کی بنا پر
ان کے شعور کو تیز شعلہ پتاں کرنے والا اور کوئی محرک نہ مل سکا
وجہ کچھ بھی ہو یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے ۔

عہد جاہلیت کی عربی شاعری کا پس منظر ۔ افتخار اعظمی ۔

مضمون طویل ہوگیا ہے موصوف نے طوالت کے ساتھ ساتھ
اگر موضوع کی ہمہ گیری کے پیش نظر زبان کی شگفتگی کا اہتمام کیا ہوتا ۔
تو پڑھنے والے کو کد و کاوش سے نہ دوچار ہونا پڑتا ۔ البتہ اس کا اندازہ
ضرور ہوتا ہے کہ دور جاہلی کے سماجی عوامل معاشی محرکات سیاسی
ضرورتوں کا تجزیہ کرنے میں انہوں نے کافی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے
اور بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کے پیچھے جو قوتیں اور طاقتیں کام کر رہی
تھیں ان کو کسی حد تک سمجھانے میں بھی کامیاب ہیں ۔ لیکن یہ کام
یہیں تک نہ تھا جہاں مقصدی مباحث اور ان کی عقلی تشکیل کے
اسباب پر غور و فکر کیا گیا تھا ۔ شاعری کے حسین مناظر بھی پیش کئے
جاتے اور فن کے معیار پر تولا اور پرکھا جاتا ۔ اگرچہ جیسا کہ موضوع ہے
اس کیلئے یہ مسئلہ خارج از بحث تھا تاہم اجمالاً ان کی شاعری
پر تبصرہ خصوصاً صنف سخن کے ہر ہر شعبہ پر ان کی تحقیقات کا جائزہ
مضمون کی وقعت کو دو چند کر دیتا ۔ دوسری چیز جو مجھے اس مضمون
میں محسوس ہوئی ۔ وہ یہ کہ افتخار صاحب اپنے مفہوم کو ادا کرنے میں

وقت کے خلاف پر پیچ راستوں کو پسند کیا ہے حالانکہ تعمیر پسند ادب کی ایک یہ بھی خوبی ہے۔ کہ بات میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ ... پختگی اور زود فہمی کی صلاحیت ہو۔ ادھر نوک قلم سے نکلا نہیں کہ قاری کے دل و دماغ کو بجلی کی طرح چیر گیا۔

شاعر کا قول و فعل۔ امتیاز علی عرشی۔

مصنف نے اپنے دعاوی میں زیادتی سے کام لیا ہے۔ جسکی پوری پوری ہمنوائی میرے بس کی نہیں۔ عقل و کردار انسان کی دو جداگانہ صلاحیتیں ہیں۔ ضروری نہیں وہ دونوں کو بیک وقت لیکر آگے بڑھ سکے۔ جیسا کہ موصوف نے اسکو ثابت کرنے میں پورا پورا زور صرف کیا ہے البتہ کثرت و قلت کا تناسب رہا ہے۔

کردار ہے کیا؟ جہاں تک میں نے سمجھا ہے عقل کے شعوری حرکت و رجحان کا نام ہے۔ اور اسکے طریق اظہار اور تعمیل حکم کا جواب یہاں عقلی کیفیت اور اسکے حسن و قبح کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان کے عقل مزاج اور اسکی تربیت میں صالح و پاکیزہ عناصر نے حصہ لیا ہے تو پھر اسکی کرداری حیثیت بھی اغلباً سنجیدہ صاف اور ستھری ہوگی۔ اسکے قول و عمل میں تضاد کے بجائے یکانگت و یکسانیت پائی جائے گی۔ وہ خلوت و جلوت دونوں میں یک رنگ یک آواز ہوگا اور یہی ادب اسلامی کا طرۂ امتیاز اور ہمارا مطلوب ہے۔ عقیدہ کی پختگی اور اس پر کامل یقین زندگی کے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے بڑے مہمات تک کو گرفت میں رکھتا ہے۔ مقصد کی لگن اور اسکا خیال وہ شے ہے جو زندگی کے بڑے بڑے ہمالہ کو پرکاہ سمجھتا ہے خود موصوف کی نظروں میں حضرت حسان کے علاوہ حضرت عمر بن کلثوم عنترہ شنفری۔ رہے ہوں گے۔ ان کی بہادری عالی حوصلگی جوانمردی بے جگری کا غلغلہ سفینوں ہی میں نہیں بلکہ ان کے سینوں سے بھی ابلا کرتی تھی۔ وہ رزم و بزم دونوں کے شہسوار تھے۔ جو کچھ کہتے اسے کرتے بھی دور کیوں جائیے شارح حیات ترجمان حقیقت علامہ اقبال سے ملنے والوں کا بیان ہے کہ آخری زندگی کچھ نہیں سالوں سے وہ اپنے مرد مومن کے صحیح حافظین اور مرد قلندر کے آئینہ دار تھے۔ لیکن یہ یک رنگی یکسانی اسی وقت ممکن ہے جبکہ شاعر کچھ ایسے تصورات سے وابستہ ہو جہاں آخرت کا مفاد زندگی کا نصب العین اور افعال و کردار میں اسکی حیثیت فیصلہ کن عنصر کی ہو اس موقع پہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ طرفہ وغیرہ تو اس احساس و شعور سے بیگانہ تھے۔ پھر کیونکر ممکن ہوا تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ عربی قوم اگرچہ رشد و ہدایت کے باب میں برسوں سے محروم رہی تھی لیکن ان میں بنیادی انسانی اخلاقیات کی کمی نہیں تھی۔ اور یہی چیز تھی جو ان کی شاعری کو اس حد تک لائی تھی۔

بقیہ صفحہ ۲۶ مغربی ادب کے تین دور

رومانی کہانیوں حسن و عشق کی بے سروپا داستانوں لطائف، و چھوٹے واقعات کے ضمن میں خوامخواہ الجھ کر رہ گیا ہے بغیر کسی عقلی دلیل کے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی، صنف مخالف کے ساتھ آزادانہ اختلاط اور عریاں اور بیہودہ ملاقات کے اظہار کو جائز اور صحیح قرار دے گا پھر چاہے لیلا ہر دہ اعلیٰ مقاصد اور مستقبل کی تعمیر کے منصوبوں کا کتنا ہی ڈھونگ رچائے۔

(باقی آئندہ)

خیال اپنا اپنا

دوماہی "نئی نسلیں" لکھنؤ

مرتبین :- م۔ نسیم، طیب عثمانی
پتہ :- ۴/۱۰ نظیر آباد لکھنؤ۔

اس نئے دوماہی کے کئی شمارے نظر سے گذر چکے ہیں۔ نسیم صاحب نے اس نئے رسالہ کو جس اٹھان کے ساتھ تعارف کرایا ہے وہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ خوبصورتی۔ گٹ اپ اور طباعت کے لحاظ سے مثالی کہا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ خالص ادبی نہیں بلکہ علوم وفنون کے "تقریباً" تمام ہی گوشے اس کے دائرہ میں آتے ہیں۔ اگرچہ فی الحال رسالہ کا حجم اس پھیلاؤ کا متحمل معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن نسیم صاحب کی اسکیم اچھی ہے اور وہ یہ کہ ہر شعبہ علم کا ایک نگراں بنا یا گیا ہے۔ جو اپنے شعبہ کے معیار مضامین کا ذمہ دار ہے۔ ادب کی اصناف کے نگراں الگ الگ مقرر کئے گئے ہیں اگر اچھے نگراں مل جائیں اور ساتھ ہی وہ کام کرنے والے بھی ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسکیم کامیاب نہ ہو اس طرح علمی کام اچھے پیمانے پر کیا جا سکتا ہے۔

نسیم صاحب، صاحب صلاحیت بھی ہیں اور صاحب وسائل بھی اس لئے ہمیں اُمید ہے کہ وہ "نئی نسلیں" کو روز افزوں ترقی دے کر اسلامی ادب کا معیار قائم کریں گے۔ داخلی حیثیت سے بھی اور خارجی رنگ روپ کے لحاظ سے بھی۔

ایک چیز البتہ ہمیں شدت سے کھٹکی ہے جو خلوص و دیانت کے ساتھ بغیر کسی آزردگی کا لحاظ کئے واضح کر دینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ "نئی نسلیں" کا رجحان شعر دسے نعروں کی ایجاد کی طرف پایا جاتا ہے۔ مثلاً ادب برائے زندگی۔ زندگی برائے بندگی۔ (یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ بندگی کیسی ؟ بندگی رب یا مجرد بندگی جس کا مطلب غلامی کی تعلیم بھی نکل سکتا ہے)۔ یا مثلاً شمارہ اوّل کے اداریہ میں اس طرح کی قافیہ پیمائی کی گئی تھی۔

زندگی بے زندگی افسردگی آزردگی، شرمندگی، زندگی پابندگی پائندگی، تابندگی، .... وغیرہ وغیرہ۔

اول تو نعرہ ایجاد کرنے کی ہمارے یہاں اس وقت کوئی ضرورت ہی نہیں اور اگر ایسا ہو بھی تو یہ کام ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں ایک دو الفاظ میں پورے مزاج کو سمو دینا پڑتا ہے۔ یہ کام ایک فرد کے کرنے کا نہیں۔ اس لئے اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ہر چند کہ یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ بات چونکہ اب "نئی نسلیں" ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اسکی پیروی میں ایک اور جریدہ نے بھی اسکو اخذ کرکے نمایاں طور سے شائع کیا ہے۔ اس لئے یہ وضاحت غالباً مناسب سمجھی جائے گی۔

۱۹۵۵ء کو "نئی نسلیں" نے نئے نمونہ کا سال قرار دے کر ایک دوماہی اشاعت اور اسکے ساتھ ایک مختصر اضافی اشاعت عمل میں آ رہی ہے تازہ اضافی اشاعت میں ایک مفید تنقیدی مطالعہ ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے جس میں کلام اقبال کے تخلیقی عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے پچھلی اضافی اشاعت میں انتخار اعظمی کے قلم سے عشقیہ شاعری کے موضوع کو درج کیا گیا ہے۔ جسکو مرتبین نے بحث ونظر کی آماجگاہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ مقالہ اگرچہ تجزیہ اور انتخاب کلام، کے لحاظ سے کمزور ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا موضوع بہت اہم ہے یہ موضوع تخلیقی تجربوں کیساتھ تخلیقی تنقید بھی چاہتا ہے۔ تعمیری ادب میں عشقیہ عناصر کا مقام ابھی پوری طرح صاف نہیں ہے یہ ہم سب مانتے ہیں کہ عشق کا غیر صحت مند تصور تعمیری ادب میں کوئی مقام نہیں پا سکتا۔ لیکن صحت مند تصور کیا ہے اور اسے کیا مقام ملنا چاہیئے؟ اس کا جواب ابھی دیا جانا ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ تر تخلیقی ہے تنقیدی

بھی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں شاید کم ہی سے ہمارے یہاں فنکاروں نے انفرادی حیثیت سے عقیدہ شاعری کے موضوع پر جو تجربے کئے ہیں وہ چاہے آگے چل کر ہمارے لئے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن تاریخی اہمیت کے لحاظ سے ان سے صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔ اس وقت ہمارے پاس تجربہ کی سہولت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم ایک قابل اعتماد فنکار کے کام آسکتے ہیں۔ اگر یہ چیز زبان بندی کی نذر ہو جائے تو پھر ترقی معلوم۔

یہ تو رہا اس مسئلہ کا وہ پہلو جو تخلیقی تجربات سے متعلق ہے اب کچھ تخلیقی تنقید پر بھی غور فرما لیجئے۔ تخلیقی تنقید میں دو مفہوم داخل ہیں ایک یہ کہ وہ خود تخلیقی ادب کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ یعنی اس میں تخلیقیت پائی جاتی ہو دوسرے وہ تخلیقی ادب کے لئے ایک بہتر فضا پیدا کرتی ہو۔ یہ فنکار کی تخلیقی صلاحیتوں اور اس کے تخلیقی تجربوں کے نشو و ارتقا اور رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہو ——— اس موضوع پر افتخار اعظمی کا طویل مقالہ ہو یا ابن فرید کی تشریحی اور وحید الدین خاں کی تجزیاتی تنقیدیں ـ ان میں یہ دونوں بنیادی چیزیں موجود ہونی چاہیں۔ اس سے ایک طرف تو فنکاروں کو اس بات کی آزادی بھی مل سکتی ہے۔ کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نشو و نما دیکر اپنے تجربات سے تعمیری ادب کے نئے نئے گوشوں کو منور کر سکیں۔ اور دوسری طرف انہیں بے راہ روی سے روکا بھی جا سکتا ہے جو تعمیری ادب کی اس ابتدائی تاریخ میں بہت ضروری ہے۔

بہر کیف "نئی نسلیں" سے ہمیں بہت امیدیں ہیں اس نئے اقدام کے لئے مرتبین اور خصوصاً نسیم صاحب مستحقِ مبارکباد ہیں۔

ہفتہ وار "عزم" بنارس

ادارہ :۔ رفیق احمد بہاری۔ خمار اکبر آبادی۔ حمید اللہ بنارسی

سالانہ قیمت تین روپے فی پرچہ ۲؍

پتہ :۔ ہفتہ وار "عزم" ندیسر بنارس۔

اس ہفتہ وار کے بہت سے شمارے دیکھنے کے بعد تبصرہ نگار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ہفتہ وار کئی چیزیں ایک ساتھ لیکر چلنا چاہتا ہے اس میں کچھ نظموں، غزلوں اور کہانیوں کی چاشنی بھی ہے، سوویٹ یونین میں مذہبی عقائد کی آزادی، جیسے موضوع پر آپ کو مضمون بھی مل سکتا ہے اور پٹنہ کے لحاظ سے مذہبی جماعتوں کے جلسوں اور میمورنڈموں کی خبریں بھی اس لحاظ سے اس میں ہلکا پھلکا پن بھی ہے مقامیت بھی اور جماعتیت بھی۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اگر ہمارے ناظرین میں سے اردو کے کچھ ایسے عاشق ہیں جو اردو رسم کی تحریر کو سینے سے لگا لینے ہی کو اس مسئلہ کا واحد حل سمجھتے ہیں۔ تو انہیں "عزم" کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اہم ہدایتیں :۔

مصنف :۔ ابو الاعلیٰ مودودی، قیمت ۸؍ صفحات ۵۶

ناشر :۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور

موضوعات کا اندازہ ذیل کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) تعلق باللہ (۲) بے جا پندار سے احتراز (۳) قریبی ماحول کی اصلاح (۴) سمع و طاعت اور امر و نظم (۵) مجاہدہ فی سبیل اللہ (۶) مخالفین (۷) خواتین کے لئے ہدایات۔

ظاہر ہے کہ اس میں عام دلچسپی کی باتیں کم ہیں فلسفہ کے بجائے عملی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ مخصوص لوگوں کے لئے ہے۔ مگر ہے خاصہ کی چیز۔

"سود" حصہ دوم

مصنف :۔ ابو الاعلیٰ مودودی، قیمت دو روپے آٹھ آنے

ناشر :۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور

پیش نظر کتاب مولانا مودودی کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے جنہیں اس قسم کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے اور ان کو جدید طریق پر پیش کرنے میں خاص ملکہ ہے۔

اس کتاب میں سود کی توجیہات، عقلی حیثیت سے اس کے جواز اور عدم جواز پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور دلائل کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سود ایک ایسی لعنت ہے جو معیشت انسانی کے لئے ایک مہلک ناسور ہے اس میں سود اور اس کے آغاز اور اس کی ترقی کو پوری تفصیلات کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ جدید بنکنگ کے طریقے پر سوائی سسٹم کی تنظیم کے سلسلہ میں بہت سے ایسے بنیادی اصول اجمالی طور سے بتائے گئے ہیں۔ جو یقیناً

پرنٹر پبلشر محمد جمیل خاں　　کمال پرنٹنگ پریس دہلی　　مقام اشاعت :- خندق اسٹریٹ میرٹھ

MAIYAR MONTHLY Meerut U.P   Registered No. A




معیار
The Maiyar Monthly

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

جلد ۵، شمارہ ۲ ماہنامہ فروری ۱۹۵۵ء

معیار

مدیر

نجم الاسلام

مجملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ جرائد کیلئے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ شہر

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

ترتیب

نقشِ اوّل

پچھلے شمارہ کے نقشِ اوّل میں معیار کی مالی حالت آپ کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ یہ بات اگرچہ ذوق پر گراں تھی لیکن اس وقت صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی کہ کوئی دوسرا چارہ کار نظر ہی نہیں آتا تھا۔ غنیمت ہے کہ اس اپیل کا اثر کسی حد تک نکلا، جو خاطرخواہ نہ سہی لیکن اُمید افزا ضرور ہے۔ یہ بھی کافی ہے اگر خدا کی مہربانی شاملِ حال رہے۔ آگے چل کر قابلِ اطمینان صورت بھی پیدا ہو ہی جائے گی۔

پچھلے شمارہ میں زبانِ قلم (یعنی نقشِ اوّل) اور زبانِ حال (یعنی پچھلے شمارہ کے ایک ... کتابت جس کی طرف احباب نے کافی توجہ دلائی ہے) سے نکل کر جو باتیں آپ تک پہونچی تھیں ان کے ... اب بھی آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمارا دل تو یہ چاہتا ہے کہ ہم رسالہ کو بہتر سے بہتر معیارِ طباعت اور جدید ترین طریقوں سے مزیّن کر کے اچھے خیالات کو نفیس ترین گٹ اَپ کے ساتھ پیش کریں۔ یہ کچھ مشکل بھی نہیں۔ پریس کی ترقیاں تیزی سے عام ہو رہی ہیں۔ مگر ابھی ان کا دروازہ صرف ایسے لوگوں کے لئے کھلا ہوا ہے جو بہت مضبوط مالی حیثیت کے مالک ہیں۔ ہمیں یہ سہولت میسّر نہیں ہے لیکن جب بھی حالات اجازت دیں گے ہم اپنی قوتیں معیار کی بہتری کے لئے استعمال کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔

لیکن حالات کب اجازت دیں گے؟ کب وہ ہمارے لئے سازگار ہوں گے؟ اس کا جواب آپ حضرات کو دینا ہے۔ اس لئے کہ حالات کو سازگار بنانے کی جد و جہد آپ ہی کو کرنی ہے۔ ہم نے جنوری ۱۹۵۵ء کا شمارہ اس عزم کے ساتھ نکالا ہے کہ پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ رسالہ نکلتا رہے گا۔ اس عزم کو نباہنے کے لئے مالی حالت کی بہتری کی ضرورت ہے۔ اب آپ خود غور فرمالیں کہ آپ کا فرض کیا ہے۔

جن احباب نے ہماری گذشتہ اپیل پر دستِ تعاون بڑھایا ہے اور اپنے فرض کو پہچانا ہے ان کی پُرخلوص ہمّت کش کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ادا کرنا بھی چاہیں تو شاید خود ہمارے احباب ہی اس کو یہ کہہ کر لوٹا دیں ؎

ادائے فرض پر اہلِ وفا کا شکریہ کیسا
محبّت میں تو قربانی بھی قربانی نہیں ہوتی

ہمیں بھی اس پر اصرار نہیں ہے۔ اس لئے یہ معاملہ ذاتی تعلقات اور شخصی محبّتوں کا نہیں ہے۔ ایک عظیم مقصد

کی محبت اور ایک اجتماعی فرض کا معاملہ ہے۔ جو ہم نے اچھے ادب کی تخلیق اور اس کی ترویج و اشاعت کی صورت میں اپنے اوپر عائد کیا ہے۔

مگر اس امداد و اعانت کے دُوررس نتائج ایک ایک کرکے ہماری نظر میں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ معمولی توجہ جو ایک کام کی ابتدائی حالت میں معمولی نظر آتی ہے آگے چل کر کتنی اہم ثابت ہوگی۔ جب ہم اور آپ ادب کو اِس راستے کی طرف تیزی سے بڑھتا دیکھیں گے جس کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔

خطوط و نکات کے تحت چند خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔ جن میں معیار کی حالت پر تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مقامِ مسّرت ہے کہ اب اِس کام میں ہاتھ بٹانے اور رکاوٹوں کو دُور کرنے کا جذبہ تحریک پا چلا ہے۔ اِس جذبہ کو کاغذ پر دیکھنے سے ہمیں اپنی مشکلات کا احساس کم ہوتا ہے۔ ممکن ہے قارئین کے جذبات کو بھی اس سے تحریک ہو۔ اگر ایسا ہو تو مستقبل سے ہماری توقعات اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔

سعادت حسن منٹو

چند دِن ہُوئے کہ اُردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت منٹو کے اِنتقال کی خبر سُنی گئی۔ ابھی منٹو کی عمر زیادہ نہیں تھی شاید پچاس سال والی حد سے کم ہی تھی۔ اس پر بھی منٹو نے اُردو ادب میں بہت سی یادگار چیزوں کا اضافہ کیا۔ بہت کچھ لکھا اِس میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو WIT کے لحاظ سے مغربی افسانہ کے اُونچے سے اُونچے معیار پر پُوری اُتریں گی۔ اور اُردو افسانہ کو تو منٹو نے ہر ہر موڑ پر چونکایا ہے۔

منٹو کے ادبی نظریہ سے ہمیں اختلاف ہے لیکن جہاں تک فنی محاسن کا تعلق ہے۔ اسے جدید اُردو افسانہ نگاروں میں ممتاز ترین مقام حاصل تھا۔

سعادت حسن منٹو امرتسر میں پیدا ہُوئے۔ وہیں واجبی سی تعلیم پائی۔ ابتدائی عمر میں اچھی صحبت نہیں ملی۔ جیسا کہ "گنجے فرشتے" میں خود لکھا ہے۔ پھر اچانک ادب کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک مترجم کی حیثیت سے ادبی زندگی شروع کی۔ پہلا ترجمہ غالباً وکٹر ہیوگو کا کوئی ڈرامہ تھا۔ بمبئی آنے پر اخباری دُنیا اور اس کے بعد فلمی دُنیا میں داخل ہوگئے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور چلے گئے۔ بعض عُریاں افسانوں کے سلسلے میں اُن پر کئی بار مقدمے چلائے گئے۔

منٹو اُردو افسانہ میں اپنی بے باکی اور تیز طرّار ذہانت کی بدولت مشہور ہوئے۔ مگر یہ سوال کہ یہ ذہانت اور بے باکی اچھے مصرف میں کہاں تک آئی؟ منٹو کی زندگی میں بھی بحث و نظر کا موضوع رہا ہے اور اب بھی رہے گا۔

ابو محمد امام الدین رامنگری

آے دوست

کب دیا علم نے انکارِ خدا کا فتویٰ
فکرِ گمراہ کی یہ فتنہ گری ہے اے دوست

نظر آتا جو نہیں حُسنِ حقیقت تجھ کو
فی الحقیقت یہ تری بے بصری ہے اے دوست

تو حقیقت کا گُماں جس کو سمجھ بیٹھا ہے
وہ توہم کی ترے سحر گری ہے اے دوست

رُوح کی پیاس کو تو جُوعِ شکم کہتا ہے
یہ حقیقت سے تری بے خبری ہے اے دوست

خسروی رُوحِ رواں ہے تری فرہادی میں
سنگ سازی نہیں یہ شیشہ گری ہے اے دوست

ہر جگہ اپنے مفادات و مصالح پہ نظر
کتنی مذموم تری خود نگری ہے اے دوست

تو سحر جس کو سمجھتا ہے شبِ تیرہ کی
وہ ترے وہم کی اک جلوہ گری ہے اے دوست

ارتقا کا جسے خورشید بتاتا ہے تو
وہ تنزل کا چراغِ سحری ہے اے دوست

اس کے طوفاں میں ہے خود اس کی تباہی مضمر
تیری تہذیب چراغِ سحری ہے اے دوست

سنگ پارہ ہے ترے سر میں کوئی مغز نہیں
تیری تفہیم بھی اک دردسری ہے اے دوست

ابو المجاہد زاہد

معیار

سوئے مقتل لے چلے جب مصر کے اخوان کو
آہ وہ اخوان جو تھے داعئ دینِ متیں
جا رہے تھے دار کی جانب، مگر اس شان سے
لب پہ استغفار، دل میں مستئ عشق و یقیں
اور شہادت سے ذرا پہلے انہیں اخوان نے
بے جھجک لہجہ میں چلّا کر کہا اے حاضریں
یہ ہماری تو ہے دراصل ایک محبوب آرزو
راہِ حق میں دار پر چڑھنے سے ہم ڈرتے نہیں

ارشاد لدھیانوی

شر پسندوں کا ترانہ

بد امنی پھیلائیں گے — ہرگز باز نہ آئیں گے
ایسا دُند مچائیں گے — دھرم دیا گھبرائیں گے
باد ہوائی خبریں گھڑ کر — جنتا کو گرمائیں گے
لوٹیں گے بازاروں کو — اور پھر آگ لگائیں گے
چھید کریں گے ہم تو اسی میں — جس ہانڈی میں کھائیں گے
اوروں پر باندھیں گے بہتاں — آپ نہیں شرمائیں گے
رحم نہیں کھائیں گے کسی پر — ویر تبھی کہلائیں گے
کینہ کپٹ کی ہم تو آگ — رہ رہ کر بھڑکائیں گے
اس کی دُنیا سے سانجھ سویرے — تازہ راڑ اٹھائیں گے

سمجھائے گا جو بھی ہم کو
کچّا ہی کھا جائیں گے

حبیب اللہ شمیم صدیقی

حقائق و معارف

(رباعیات)

احساس کی تشکیل کیا کرتا ہوں
اجمال کی تفصیل کیا کرتا ہوں
الہامِ مشیّت کو بڑی خوبی سے
اشعار میں تبدیل کیا کرتا ہوں

ہوتے ہیں نصب جب کہ یقینوں کے خیام
ہِل جاتی ہے دنیائے جہانِ اوہام
جس طرح کہ پو پھٹتے ہی ہنگامِ سحر
ہو ثابت و سیّار میں برپا کہرام

ایمان کی دولت ہے نگاہوں میں مری
عرفان کی شوکت ہے نگاہوں میں مری
لرزاں ہے مرے دم سے جہانِ اوہام
ایقان کی صولت ہے نگاہوں میں مری

ظاہر میں تو اِک قصۂ پارینہ ہے
باطن میں یہ عرفان کا گنجینہ ہے
انساں کی حقیقت پہ نظر کر اے دوست
خاکی ہے مگر نور کا آئینہ ہے

صدمات میں تپ تپ کے نکھرنا سیکھو
پیمانۂ دل رنج سے بھرنا سیکھو
اے آرزو مندانِ بقاءِ ہستی!
جینا تو بہت سہل ہے مرنا سیکھو

اخترؔ چغتائی

جوشِ عمل

اٹھ کہ پھر اِک عالمِ کیف آفریں پیدا کریں
بربطِ ہستی سے نغماتِ حسیں پیدا کریں

آ، پر و پروازِ رُوح الامیںؑ پیدا کریں
اپنی منزل پھر عرشِ بریں پیدا کریں

جذبِ صدیقیؓ و فاروقیؓ یقیں پیدا کریں
دِل میں عشقِ رحمتہ العالمینؐ پیدا کریں

پھر اُڑا دیں دامنِ تہذیبِ نو کی دھجیاں
پھر براہیمیؑ قبا و آستیں پیدا کریں

موت سے ٹکرائیے، جا جا کر اُفق کے پار بھی
پیکرِ خاکی میں رُوحِ آتشیں پیدا کریں

غرق کردیں پھر شکستہ کشتیاں طوفان میں
موج کے پہلو سے اِک قلزم نشیں پیدا کریں

آؤ اخترؔ پھونک دیں ذرّوں میں رُوحِ آفتاب
سنگ سے یاقوت و الماس و نگیں پیدا کریں

عارف احمد ھاپوڑی

صبحِ جلوہ بار

گلشنِ آفاق میں رنگِ بہار آنے کو ہے
مژدہ ہو اے دل کہ صبحِ جلوہ بار آنے کو ہے

ایک دورِ کامیاب و شان دار آنے کو ہے
آمد آمد ہے بصد عزّ و وقار آنے کو ہے

مسکرا اٹھیں گے غنچے اک نئے انداز سے
باغ میں موجِ نسیمِ خوش گوار آنے کو ہے

ختم ہو جانے کو ہے پژمردگی، افسردگی
فصلِ گل آنے کو ہے، عہدِ بہار آنے کو ہے

پھر عیاں ہونے کو ہے اب قوّتِ صدق و یقیں
جذبۂ عزم و عمل بر روئے کار آنے کو ہے

زلفِ گیتی پھر سنور جانے کو ہے اے ہم نشیں!
چہرۂ انسانیت پر پھر نکھار آنے کو ہے

فوجِ باطل کو شکستِ فاش دینے کے لئے
لشکرِ حق اب قطار اندر قطار آنے کو ہے

شفیق بریلوی

عظمتِ غم

غم ہے آشفتگیٔ فکر و نظر کی تصویر
غم ہے ناشادیٔ قلب و جگر کی تصویر
غم ہے افسردگیٔ برق و شرر کی تصویر
غم ہے بیچارگیٔ دیدۂ تر کی تصویر
قلبِ غنچہ میں سسکتا ہوا ماتم غم ہے
عارضِ گل پہ ڈھلکتی ہوئی شبنم غم ہے

پاس شاعر کے یہی جذبۂ غم جب آیا
نغمہ و کیف کی اک جنتِ رنگیں لایا
اشکِ بیتاب نے آغوشِ تبسم پایا
سوز نے ساز میں ڈھل کر نیا نغمہ گایا
لبِ غنچہ پہ پراگندہ ترنم ہوا ــــ غم
چہرۂ گل پہ پریشان تبسم ہوا ــــ غم

اس کو دی جرأتِ بیباک نے جیا ور پھبن
بن گیا مردِ مجاہد کے جبیں کی یہ شکن
عزم و ایثار نے بخشی اسے خاموش لگن
ہنس کے طے کر لیا ہر مرحلۂ دار و رسن

چاک داماں ہے مگر بوئے مسرت غم ہے
خار کی نوک پہ پیغامِ محبت غم ہے
کاش ہم عظمتِ غم سے ذرا واقف ہوتے
کاش ہم جبر و تشدد سے نہ خائف ہوتے

محشر بدایونی

عظمتِ انسانیت

خدا کی شان دنیا کے ستم لیں امتحاں میرا
کہاں وہ زعمِ فرسودہ کہاں عزمِ جواں میرا

زمیں کا رہنے والا خاک کا ذرہ ہوں اے تارو
فلک کو پست کر دے گا غبارِ ناتواں میرا

فرازِ عرش مجھ سے ہے بہارِ فرش مجھ سے ہے
وہ میرا بامِ رفعت ہے یہ صحنِ گلفشاں میرا

مری موجِ نسیمِ فکر کیا کیا گل کھلاتی ہے
تخیل ہے چمن میرا تدبر باغباں میرا

اتر کر ایک زینہ لامکاں سے صحنِ امکاں میں
لئے ہیں رفعتیں اپنے سروں پر آستاں میرا

سمندر حوصلے میرے، ارادے کوہ ہیں میرے
لرز جاتی ہے دنیا، نام آتا ہے جہاں میرا

فرازِ کہکشاں کو روندتا پائے تجسس سے
نئی منزل کی دھن میں گامزن ہے کارواں میرا

ہزاروں انقلابوں کی جو آئیں آندھیاں تو کیا
مکدر کر نہیں سکتیں سرورِ جاوداں میرا

خدا کی ساری خلقت تھی مری محکوم اے محشر
ہوا چلتی تھی لے کر دوش پر تختِ رواں میرا

محمود فاروقی

قاہرہ کے بیٹے

اہرام نے پہلے تو بڑی دیر تک آپس میں سرگوشیاں کیں اس کے بعد بڑے فخر سے اپنا سر اٹھایا اور نیل کو آواز دی۔

"مصر کی لاڈلی بیٹی" سب سے بڑے اہرام نے کہا۔ "کیا ابھی تک سو رہی ہو؟ دیکھو دُور دُور تک صحرا میں کیا ہی اچھا نظارہ ہے۔ ہر طرف ریت کے بگولے دیوانے بن کر ناچ رہے ہیں گرم گرم لُو کے تھپیڑے کتنے خوشگوار معلوم ہوتے ہیں"

"اس باد سموم کی کیا قدر" دوسرے نے کھلکھلاتے ہوئے طنز کیا اور پھر سب ایک ساتھ قہقہے لگا کر ہنسنے لگے اُن کی اس بھیانک ہنسی میں جو زہر بھرا ہوا تھا نیل کے سوا کوئی اور کیا جان سکتا تھا۔

اسی وقت واقعی صحرا میں بڑا طوفان آیا ہوا تھا دُور دُور تک۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے زمین تک کسی نے مٹیالی جھالری لٹکا دی ہے اس جھالر میں لڑتے ہوئے ریت کے ذرّے تیز دھوپ میں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ ریت کے بڑے تودے آناً فاناً بکھر رہے اور بن رہے تھے۔ تیز گرم ہوا ان کو اپنی ٹھوکروں میں اڑاتے ہوئے پُورے صحرا میں سنسنا رہی تھی اور کہیں چند شتر سوار اپنے چہروں کو سیاہ کپڑوں میں لپیٹے کجاوؤں کی اوٹ میں اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ اُونٹوں نے ریت میں اپنا سر چھپا لیا تھا اور اُن کے پیٹ دھونکنی کی طرح چل رہے تھے۔ ادھر قاہرہ کے اطراف نیل بڑی آہستہ روی سے بہہ رہی تھی بہت ہی اُداس اُداس اور افسردہ افسردہ !!!

"کیا بات ہے لاڈلی؟" بڑے اہرام کی آواز گرم بگولے کی طرح آئی "چُپ کیوں ہو کچھ تو بولو۔ آخر تمھارے وہ چہچہے کیا ہُوئے۔ اور تمھاری روانی کو کِس کی نظر کھا گئی؟"

نیل جانتی تھی کہ آج وہ اس طرح بن کر کیوں بات کر رہے ہیں اور اتنے کیوں اِترا رہے ہیں وہ اُن کو کوئی جواب دینا نہیں چاہتی تھی لیکن بالکل ہی چُپ رہنا ٹھیک بھی نہیں تھا۔

"آج تمھارا دن ہے مصر کے منحوس بوڑھو۔ آج اگر تم نہ بڑبڑاؤ گے تو اور کون بڑبڑائے گا" اس نے ایک طرح سے بے نیازی ظاہر کی۔

"ہم بڑبڑا رہے ہیں" مصر کے بوڑھے ایک ساتھ بڑبڑا اٹھے ان کو بڑھاپے کا طعنہ بہت بُرا معلوم ہوا۔ "ہم تو بڑبڑا رہے ہیں اور تم ہاں تم شاید خوشی سے گنگنا رہی ہو۔ ہے نا یہی بات" نیل نے ان کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ "اِتنا اِترانا ٹھیک نہیں ہے تم تو جانتے ہی ہو یہ کوئی آج ہی کی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ تم بڑبڑاتے ہو اور میں گنگناتی ہوں۔ اور کون ہے جو میرے گنگنانے کو پسند نہیں کرتا۔

"اوہ۔ ابھی تمھاری سرگرانی نہیں گئی" چھوٹا اہرام تنک کر بولا "زمین پہ لیٹی ہوئی خاک میں گھسٹ رہی ہو اور اس پہ یہ غرور! تمھاری متاع کیا ہے۔ ایک قطرۂ آب جو فنا سے نکل کر فنا کی طرف جا رہا ہے"

"اور ہم" دوسرے اہرام نے بات سنبھالی "ہم مصر کی عظمتوں کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے بلندیوں کو سر فراز ہیں۔ ماضی کی امانت ہمارے سینوں میں ہے۔ اور ایک تابناک مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ پستیوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح رفعتوں کا منہ چڑائیں"

"تم" نیل کی مترنم آواز باد سموم کو چیرتی ہوئی سنائی دی "تم اور تمھاری یہ عظمتیں کتنی ہیں یار میں نے تم کو جتایا ہے کہ یہ باعث فخر نہیں بلکہ باعث عار ہیں۔ تمھارے پاس کیا ہے ایک حقیر سا سرمایہ جس کو سونپنے والے سونپ گئے اس حالت میں کہ اُن کے چہرے ذلتوں اور ناکامیوں کے داغ سے سیاہ ہو رہے تھے اور کوئی نہیں تھا جو اُن کے لئے ایک آنسو بھی بہاتا۔ تم بس ایک نشان عبرت ہو اور کچھ نہیں"

"تم کیا جانو" سب سے بوڑھا اہرام بولا "ہم نے اپنے اندر کیا کچھ محفوظ کر رکھا ہے۔ ساتویں شاہدار فرعون کی زرِ بفت اور اس کی کنیز بلورہ کا ہیروں سے ٹکا ہوا سراپا کیا یہ کچھ کم ہے۔ سرہانے عنبریں عود کی رحل پہ جنگلی دانشوروں کے مقدس صحیفے ہیں جو مگرمچھ کی کھال پر لکھے ہوئے پڑے ہیں اور ادھر شیوب اعظم کے بیٹے شمس فرامنہ دیو قریا کے اہرام میں وہ ہیرے جیسی زبرجدی کشتیاں ہیں جنہیں ماہان کی دھرتا دیں بیٹھے صدیوں سے انتظار

پرچیٹ ہمیشہ کے لئے تیار کیا تھا ہم تاریخ کے اس قیمتی سرمایہ کے امانت دار ہیں۔ اب ہم کیا اس بات کو سمجھانے کے لئے تم سے بار بار بحث کرتے ہیں!"

"بس کرو" نیل نے اکتا کر ٹوکا۔ "یہ توقع نہ رکھنا کہ میں تمہاری اس لاف زنی پر مبہوت ہو جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پیٹ میں کون کونسی نحوستیں جمع ہیں۔"

"نحوستیں" بوڑھا اہرام بولا "کیا یہ نحوستیں ہیں۔ تم کو اپنے وطن کی تحقیر کرتے شرم نہیں آتی۔"

"ہاں نحوستیں" نیل تقریباً چیخ اٹھی "یہ نحوستیں نہیں تو اور کیا ہیں؟ تمہارا وہ ساتواں تاجدار فرعون جس کی سیل زدہ ممی پر رات دن چمگادڑیں پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔ تم غالباً اس کے عبرت ناک انجام کو بھول گئے۔ آج بھی میرے سامنے وہ منظر گھوم رہا ہے۔ تم اس وقت نئے نئے بنائے گئے تھے اور عرصہ سے منتظر تھے کہ تمہارے پیٹ میں تمہاری غذا جھونک دی جائے۔

وہ دن صحرا کا ایک ایسا ہی سنسنی خیز دن تھا۔ میں کسی اندرونی جوش و جذبہ سے بری طرح تلملا رہی تھی۔ تم اور تمہارے ساتھی ساکت و صامت ٹکٹکی لگائے میرے کناروں کے پار تک رہے تھے۔ صحرا میں ایک خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا واقعہ ہونے والا ہے اور پھر ہم کو کچھ زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا۔"

"وہی پرانا قصہ" اہرام نے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ ہم دیکھی ہوئی باتیں بار بار سنیں اور وہ بھی تمہارے منہ سے۔"

"آخر میں کیوں نہ بیان کروں تم جو یہ اپنے فرعون کا راگ بار بار الاپتے رہتے ہو۔ کیا یہ مجھ پر زیادتی نہیں ہے؟ میں اس خوشگوار دن کو کیسے بھول سکتی ہوں وہ تو میری فتح کا دن تھا۔"

اس دن بھی تم اسی طرح خوفناک قہقہے لگا رہے تھے جب کہ اسرائیل کا وہ مقدس گڈریا اپنی بکھری ہوئی بھیڑوں کو لئے میرے کنارے پہنچا تھا۔ عین اس کے پیچھے فرعون اپنے جاہ و جلال کے ساتھ رتھ پر سوار درندوں کا لشکر لئے ہوئے ان کو گھیرے چلا آ رہا تھا۔ موسیٰ میرے کنارے آ کر رک گیا اور کچھ ہی دور جوع البقر کی گھاٹیوں میں سے فرعون کا رتھ نمودار ہوا۔ موسیٰ اور اس کے قافلہ کی بے بسی کو دیکھ کر اس کے لشکری خوشی کے مارے نعرے لگانے لگے اور انھوں نے اپنے رہواروں کو بڑے غرور کے ساتھ ایڑھ لگائی اور خونخوار کتوں کی طرح لپکتے چلے آ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی تمہاری باچھیں کھل گئیں۔ اس دن بھی تم آج ہی کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ یوں معلوم دیتا تھا جیسے تمہارے پیٹوں میں ہزاروں شیطان گھسے ہوئے چلا رہے ہوں۔

آہ! کیا میں بھول سکتی ہوں۔ تم نے کیسے کیسے طعنے دیئے تھے۔ لیکن تم بے خبر تھے کہ دور شاہی محلات کے گھاٹ پر خود اس فرعون کی خداترس بیوی کھڑی ہوئی اپنے اللہ سے مناجات کر رہی تھی اس نے بے قرار ہو کر کہا تھا ——

پیاری نیل بچا لے۔ خدا کے لئے بچا لے۔ ظالم فرعون ان کے پیچھے لپکا چلا آ رہا ہے اپنا سینہ شق کر دے نیل اور موسیٰ کو جانے کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ جونہی موسیٰ نے اپنے عصا سے میرے پہلو کو ٹھوکا دیا اور میں نے فرعون کی بیوی کے پرخلوص کرب پر سینہ شق کر دیا۔ پوری قوت سے میں نے اپنی لہروں کو دونوں طرف روک لیا۔ اُف مجھے کس قدر زحمت کرنی پڑی تھی۔ پانی کے بڑھتے ہوئے ریلے اور تڑپتی ہوئی طوفناک موجیں بُری طرح سر پٹک رہی تھیں لیکن میں نے دونوں جانب ان کے پرے روک رکھے تھے۔ کتنے مبارک وہ رہرو تھے جنہوں نے میرے سینہ کے تنگنائے میں قدم رکھا۔ اس کے خوشگوار لمس کو یاد کر کے آج بھی میری پیاسی روح سرشار ہو جاتی ہے۔

جب ان کا آخری آدمی اس کنارے چڑھا فرعون نے اپنا رتھ اسی بھاگتی راہ پر ڈال دیا۔ اُف! وہ کرب ناقابل بیان ہے کہ جو میرے پھٹے ہوئے سینے میں اس وقت ہو رہا تھا۔ فرعون کے بیشتر لشکری اندر اتر آئے۔ اس وقت تو نے ہاں! اے اہرام تو نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا تھا اور شاید تو یہ سمجھا تھا کہ فرعون بھی موسیٰ کی طرح دریا پار کر جائے گا۔

—— لیکن کیا ہوا۔ اگر تجھے یاد نہیں تو اپنے ساتویں تاجدار فرعون کی ممی سے پوچھ لے —— میں نے یکبارگی اپنی باگیں چھوڑ دیں دونوں طرف کی غضبناک لہریں ایک دوسرے سے مل گئیں اور فرعون کا سارا غرور اس کے زریں تاج کے ساتھ ایک ہی لہر میں میلوں دور بہہ گیا۔ تمہارے چہرے سنولا گئے اور تمہارے پیٹ میں شیطانوں کو ایسی چپ لگی کہ مدتوں تک ان کی سسکی تک سنائی نہیں دی۔"

"وہ بلاشبہ تمہاری جیت تھی" اہرام نے اعتراف کیا "لیکن کتنی ناپائیدار ہو تم تو اپنے ذہن میں ان بہت سی باتوں کو بھول گئیں ہو جنہیں یاد رکھنا چاہئے تھا۔ تم نہ تو وہ مصر کی دل آرام قلوپطرہ کو یاد رکھ سکیں۔ ان بہادر شہسواروں کو بھی تم بھول گئیں جو تمہارے سینہ کو روندتے ہوئے ان بکھری ہوئی بستیوں میں داخل ہوئے تھے۔ کیا ہم تمہارے سامنے انطونی بیزار اور نپولین کی داستانیں دہرائیں۔"

"قی قی قی" نیل کی لہریں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔ "کن کا نام لیتے ہو" نیل کہنے لگی "یہ سب یہ سب جن کا تم ابھی نام لے رہے تھے اندھیروں میں پیدا ہوئے۔ اور اندھیروں میں گم ہو گئے وہ اپنی زندگی میں روشنی کی ایک شعاع تک نہیں پا سکے۔ ہاں مجھے وہ سب یاد ہیں۔ کیا میں اس نیل کی ناگن کو بھول سکتی ہوں

بھلا یہ مصر میں جہاں خود ہم نہ رنگیوں کو ڈسا کرتی تھی اور اپنی گھناؤنی عشرتوں میں اس بھیانک سانپ کو بھول بیٹھی تھی۔ جو اس کے پیچھے لپکا چلا آ رہا تھا۔ کیا اس زہریلی ناگن کو زہر بجھا نہیں پینا پڑا۔ میں کتنی ہی بار کہہ چکی ہوں کہ سب تہی دامن لوگ تھے جنہوں نے اس دنیا سے ہر وہ چیز چھینی جو وہ چھین سکتے تھے لیکن دنیا کو کچھ نہ دیا۔ تمہیں حق ہے کہ تم ان بجھے ہوئے دیوں کو اپنے بھائی بھائی کرتے ہوئے طاقتوں میں سجائے رکھو مجھے تو فخر ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے شفاف آئینہ میں روشن و تابناک سیاروں کی آئینہ بندی کی ہے۔ کیا تم بھول گئے اس جرم کو بھول گئے جس کی کج روی نے سات قحط زدہ سال اس سرزمین پر مسلط کر دیئے تھے اور میرا وجود مسلسل سات برس تک ایک قطرۂ آب کو ترستا رہا۔ ان سات سالوں میں آخر کس مردِ حق آگاہ کی حکمت و تدبیر تھی کہ نہ صرف مصر بلکہ گرد و پیش کے باشندے بھی اپنے پیٹ کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھاتے رہے اس کو دنیا نے کیا دیا۔ یہ ناپاک الزام اور گھناؤنے بہتان اور پھر ایک لانبی قید اور اس لئے؟ —— ان کے پچکے ہوئے شکموں کو روٹی۔ ان کی سوکھی زبانوں کو پانی۔ بجھتے ہوئے دیوں کی روشنی اور حریص نگاہوں کو حیا دی اور کون ہے جو اس کے احسان سے انکار کر جائے۔ اور کیا میں اس وقت کو بھول سکتی ہوں جبکہ میں اس پھیلے ہوئے صحرا میں تشنہ لبی سے قریب المرگ ہو گئی تھی۔ مجھے تمہارے باشکوہ فرعونوں کا تو ایک بھی احسان یاد نہیں ہے بلکہ وہ تو ساری عمر میرے ہی احسانوں تلے دبے رہے لیکن میں اس صحرا نشین کا احسان تا عمر نہیں بھلا سکتی جس نے دور دراز فاصلوں سے میرے لئے آبِ حیات، واہ کیا حسن کا ذائقہ اب تک میرے لبوں پر ہے تم سب تو اس وقت بڑے خوش تھے کہ چلو نیل مر چکی عمر بھر کا دردِ سر ختم ہوا لیکن تمہاری مسرتوں پر پانی پھر گیا جبکہ تم نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شتر سوار کو دیکھا جو ایک بختی اونٹ پر سوار مدینہ کی جانب سے اڑا چلا آ رہا تھا۔ تم نے اس وقت بادِ سموم سے سازش کی اور تند و تیز آندھیوں نے اس کو راستہ میں گھیر لیا لیکن وہ خود اپنی جگہ ایک طوفان تھا وہ ان آندھیوں کا منہ حقارت سے پھیرتا ہوا میرے کنارے آ پہنچا۔ تمہاری سازش بری طرح ناکام ہو گئی اور وہ قابلِ احترام خط میرے حوالے کر دیا گیا جس کی واحد مخاطب صرف میں تھی اور جسے دنیا کی ایک معزز ترین شخصیت نے لکھا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ آبِ حیات بن کر میرے پیاسے دہن میں ٹپکتا رہا اور بے اختیار مسرت و خوشی کے آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے اور تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ خشک صحرا جل تھل بن گیا۔"

"اوہ" بڑی دیر بعد ایک اہرام نے آواز نکالی اور سب پھر ایک ساتھ کچھ بولنے لگے۔ بادِ سموم کے جھکڑوں میں ان کی آواز صاف طور پر سنائی نہیں دے رہی تھی اور کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ نیل اُن کے جواب سے بے پرواہ زیرِ لب ایک مناجات گنگناتی رہی اور اپنے مقررہ راستے پر بہتی رہی۔

"وہ درماندے لگتے" بالآخر بوڑھے اہرام کی گونج دار آواز سنائی دی۔ جیسے وہ اس کے لبوں سے نہیں بلکہ اس کے گہرے پیٹ سے نکل رہی ہو۔ "اب ہم بھی باتوں پر کہاں تک تم سے سر کھپائیں۔ ہم تو ان لمحوں کے شمار میں مشغول ہیں جو ہماری مدنظر میں صف بہ صف قدم بڑھا رہے ہیں اور تم کو یہ سن کر قلق ہو گا کہ ان میں سے ایک پر بھی تمہاری خوش نصیبی کی مہر نہیں ہے۔"

"بس چپ بھی رہو" نیل نے گویا ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن یہ نہ سمجھو کہ چند ہی دن پہلے مصر کی تاریک راتوں کا وہ لاڈلا بیٹا مصر کا آخری فرعون اپنی پشت پر قصر عابدین کی گھناؤنی عیاشیوں کا بوجھ اٹھائے اس سرزمین سے رخصت ہو چکا ہے اور اس حال میں کہ وہ اپنے لئے تمہاری توقع کے مطابق چھوٹا موٹا ہرم بھی نہیں بنا سکا اس نے بوڑھے قاہرہ کے سعادت مند فرزند کو اس کی گود میں شہید کرا دیا لیکن قاہرہ نے بھی بہت ہی جلد اس کا بدلہ چکا لیا اور قاہرہ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس بوڑھے کا انتقام بہت ہی سخت اور عبرت ناک ہوتا ہے کون ہے جس نے اسے دکھ پہنچایا اور پھر عافیت سے دن گذار گیا۔ قاہرہ نے اپنے بیٹے کی لاش اپنے دامن میں چھپالی اور میرے کنارے گھات لگائے چپکے سے بیٹھا رہا اور پھر کیا ہوا۔ ابھی سورج تمہارے سروں پر ٹھیک سے طلوع بھی نہ ہوا تھا کہ بوڑھے قاہرہ نے اپنے بیٹے کے قاتل کو اچانک دبوچ لیا۔ اور پھر اس زور سے اسے اٹھا کر پھینکا کہ وہ سمندر پار جانے کس قعرِ مذلت میں جا گرا۔"

"آخری فرعون؟" اہرام نے اعتراض کیا "کیا کہا تم نے وہ آخری فرعون تھا۔ نادان اور بھولی بھالی نیل! فرعون کبھی نہیں مرا اور نہ وہ مر سکتا ہے۔ کیا میں تم کو وہ اہم ترین راز بتا دوں جو آج تک ہماری زبان پر نہیں آیا۔

—— نیل جب بھی تیرے کنارے کوئی موسیٰ کسی فرعون کو غرق کر دیتا ہے تو تو یہ سمجھتی ہے کہ فرعون کا خاتمہ ہو گیا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی روح چھپتے چھپاتے ہمارے پُر اسرار ایوانوں میں داخل ہو جاتی ہے اور ساتویں فرعون کی پیشانی پر بوسہ دے کر مقدس دھل کے سامنے جھک جاتی ہے اور پھر بڑے ادب سے قبطی دانشوروں کے صحیفوں کی تلاوت شروع کر دیتی ہے اور پھر ایک سیاہ اور لانبی رات میں جبکہ مقدس بھیڑیوں کے شور و غوغا سے گونج رہا ہوتا ہے ہمارے اندرونی سناٹے جگمگا اٹھتے ہیں۔ ساتویں فرعون اور اس کی محبوب کنیز بلورہ کی ممیاں جاگ اٹھتی ہیں۔ آسمانی کشتیوں کے جھانجھن ہلکے ہلکے سُروں میں بجنے لگتے ہیں۔ اور ایک ایسے مقدس سکوت میں جس میں پُر اسرار سرسراہٹ ہیبت طاری کر دیتی ہے بے چین و مضطرب روح فراعنہ کے اقتدار کی قسم کھا کر اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کا عہد کرتی ہے۔ اور وہ پھر اس حال میں کہ نئی زندگی کے عزائم اس کی بے نور آنکھوں میں چمک اٹھتے ہیں، الٹے پاؤں اہرام سے نکل جاتی ہے۔ تمام زمانہ کے فراعنہ کی مقدس روحیں اپنی دعاؤں کے جلو میں اسے بیرونی دنیا کی طرف رخصت کر دیتی ہیں اور اس کے بعد وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بلورہ کے گرد رقص

کر رہی ہیں اور جو شعلوں کے ساتھ آگ اگل رہی ہیں اور لاوے نیل کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک جاری رہے گا۔ بوڑھے قاہرہ والے قصر ہامین کے لاڈلے کو خاک کر دیا لیکن وہ فراعنہ کے ابیت و اقتدار کی روح سے ابھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ آج وہ معتزز روح ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہو چکی ہے۔ قاہرہ کے گہوارہ میں آج ایک نیا فرعون جاگ اٹھا ہے ـــــ فرعون جاگ اٹھا ہے۔ سامری کا طلسم جاگ اٹھا ہے! قبطی عظمت و شوکت جاگ اٹھی ہے۔ کون ہے جو اس دہکتے ہوئے سورج سے آنکھیں لڑائے ـــ کون ہے؟" اہرام دوبارہ چیخے۔

"موسیٰ!" بے اختیار نیل کی زبان سے نکل گیا۔ جیسے اُس نے کہنا نہ چاہا تھا۔ لیکن کہہ دیا۔

"موسیٰ"۔۔۔"قاہ"۔"قاہ"۔"قاہ"۔ اہرام کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بیوقوف نیل! اپنے موسیٰ اور اس کی میاقی ہوئی بھیڑوں کا حال ذرا اس کُبڑے قاہرہ سے پوچھ لے جو تیرے کنارے صدیوں سے بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ ان کا حال اس شکار کا سا ہے جو شکاری کی زد پر ہو اور نجات کی راہ نہ پائے۔ دیکھ وہ قاہرہ کے بازاروں میں ذلیل و رسوا کی جا رہی ہیں۔ انھیں مسجدوں سے نکالا جا رہا ہے۔ ہر طرف سے اُن کو گھیر لیا گیا ہے۔ زندانوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ فضا زنجیروں کی آہنی جھنکار سے گونج رہی ہے فرعون کے لشکر اور پیادے قضائے لہر بن کر اُن کے پیچھے لپک رہے ہیں۔ بکتر بند سپاہی اُن پر اس طرح جھپٹ رہے ہیں جیسے سفید بگلا اچھلتی ہوئی مچھلیوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ سامری کا بنایا ہوا سنہرا بچھڑا سیکڑوں سروں میں وقت کے نئے فرعون کی تقدیس کا آوازہ بلند کر رہا ہے۔ بس کچھ ہی دیر کی بات ہے کہ ان بھیڑوں کو تیز چھُریوں سے ذبح کر دیا جائے گا اور جب وہ آگ پر بھُوننے کے لئے لٹکائی جائیں گی تو تیرے کنارے وہ جشن نمایاں منایا جائے گا جس کا ہم عرصہ سے انتظار کر رہے ہیں۔ تیرے سینے پر پھر ایک بار مرصع بجرے تیریں گے اور جب مصر کا نیا فرعون اپنی خود پہنے اپنی وردی پر فتح کے ستارے لگائے تیرے کنارے پہنچے گا تو ایک نئی قلوپطرہ ہزار جلوؤں کے ساتھ اس کا استقبال کرے گی۔ پھر اے نیل یہ کیسے ممکن ہو گا کہ تو ہمارے اس حسین خواب کی جیتی جاگتی تصویر کو جھٹلا دے؟"

نیل اُن کی ان باتوں سے پریشان ہو گئی اور اس نے چپکے چپکے قاہرہ سے پوچھا "کیا ہو رہا ہے؟"

"وہی جو ہوتا آیا ہے!" قاہرہ نے سرگوشی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوگا؟" نیل نے بے صبری سے اپنا سوال دُہرایا۔

"وہی جو ہوتا رہا ہے۔" قاہرہ نے اسی انداز میں جواب دیا۔

نیل اس کے ٹھنڈے سے جواب پر چڑ سی گئی۔

"بتاتے کیوں نہیں!" وہ تنک کر بولی۔

"کیا بتاؤں!" اس نے ایک لمبی انگڑائی لی اور خاموش ہو گئی۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر کھنچا ہوا تھا اور وہ دور افق کی طرف منجمد نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت اس شکاری کے عین مشابہ تھی جو اپنا جال پھیلائے اور اس پر دانے بکھیرے شکار کے انتظار میں چُپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے۔

ـــ قاہرہ کو اس حال میں دیکھ کر نیل کو قدرے اطمینان ہوا ـــ بڈھا بابا کوئی ایسی چال ضرور چلے گا جو ساری بازی چوپٹ کر کے رکھ دے گی۔ یہ سوچ کر وہ بے چینی سے کسی پیش آنے والے واقعہ کا انتظار کرنے لگی ـــ ادھر اہرام باد سموم کے جھکڑوں کے ساتھ دبی دبی آواز میں کچھ مشورے کر رہے تھے جیسا کچھ اس طرح خوفناک اور پُر خطر معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہو۔ فضا میں کسی نامعلوم خطرے کی چاپ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی ـــ کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا تھا۔

"نیل" "نیل" آندھی کے تیز جھکڑوں میں قاہرہ کی بھاری آواز سنائی دی۔ اُڑتے ہوئے کثیف غبار کے پیچھے دور سے قاہرہ کچھ اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوا ہے اور اس کی کالی چادر سر سے ڈھلک کر شانوں پر لٹک رہی ہے۔

"نیل۔ او نیل!" اس کی تیز آواز پھر ایک بار سنائی دی "کیا ہے؟" ـــــ نیل بے چینی سے اس کی طرف دوڑی "ادھر نہیں ـــ ادھر نہیں"۔ قاہرہ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چیخا۔ "جوع البقر کی طرف۔ جوع البقر کی طرف!"

نیل نے اپنا رُخ تیزی سے پھیر لیا۔ پیچھے سے برابر قاہرہ کی آواز آ رہی تھی "موسیٰ اور اس کے ساتھی تیری طرف آ رہے ہیں پھر ایک بار تیری آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔ ہوشیار ہو جا نیل نازک وقت سر پر آ پہنچا"۔

جوع البقر کی گھاٹیوں کی طرف سے اچانک گرد و غبار کا طوفان سا اُٹھا۔ صاف طور پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کی چیخ پکار سے صحرا گونج رہا تھا۔ مسلسل گولیوں کے سنسنانے کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ وہی کیفیت تھی جسے نیل نے صدیوں پہلے محسوس کیا تھا۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا تھا ـــ؟ کوئی بہت بڑا واقعہ!

"قاہ۔ قاہ۔ قاہ۔" بوڑھے اہرام یکبارگی چیخ اٹھے جیسے اُن کے پیٹوں میں شیطان ڈکار رہے ہوں تیز و تند ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ ان کا بے ہنگم شور انتہائی خوفناک ہو گیا۔

"پھر ایک بار نیل! پھر ایک بار" ـــ باد سموم کے جھکڑوں کو ڈھکیلتی ہوئی قاہرہ کی بھاری اور دھیمی آواز آئی۔

"ـــ اپنے سینے کو شق کر دے۔ پھر ایک موسیٰ کو تیرے سائے ہوئے راستے سے گذرنا ہے اور ایک فرعون کو بیچ منجدھار میں غرق ہونا ہے۔ پیاری نیل! میرے بیٹے میرے لخت جگر آ رہے ہیں۔ اُن کے استقبال کے لئے تیار ہو جا۔ یہ میرے بڑھاپے کی امانت ہیں جنھیں خدا نے تیرے سپرد کیا ہے"۔

"نعرۂ تکبیر" "نعرۂ تکبیر" ایک بلند گاڑی پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے نعرہ لگایا جس کا اس کے ساتھیوں نے پوری قوت سے دہرایا۔ وہ ان کی صدائے بازگشت کا جواب اہرام نے اسی جوش کے ساتھ دیا۔

"اللہ اکبر وللہ الحمد"۔ "اللہ اکبر وللہ الحمد"۔ قاہرہ کے بیٹوں نے پوری اطمینان اور وقار سے فرعون کے نعرہ کا جواب دیا۔ اور باوجود آندھی کے شور کے ان کا نعرہ پورے صحرا میں گونج گیا۔ "اللہ اکبر وللہ الحمد" "اللہ اکبر وللہ الحمد"۔

"پیاری نیل"، صدیوں کی اوٹ سے ایک بڑی نرم اور پیاری آواز سنائی دی — جیسے کسی شاہی محل کے گھاٹ پر فرعون کی بیوی کھڑی مناجات کر رہی ہو۔ "پیاری نیل بچالے خدا کے لئے موسیٰ کو بچالے۔ نیل! اور موسیٰ کے لئے راستہ چھوڑ دے نیل! ... پیاری نیل ... نیل!"

نیل کے کانوں میں مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ اچانک بھنور آنے والے اس ہنگامے سے مبہوت سی ہو گئی تھی۔ خوف، مسرت، اندیشہ اور عزم کے جوش سے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

"اچھا" نیل نے امنڈتے ہوئے جذبات کے ریلے کو تھامتے ہوئے بڑی مشکل سے ایک لفظ کہا اور اپنی قوتوں کو ایک بہت بڑے کام کے سرانجام دینے کے لئے مجتمع کر لیا اور بڑی بے چینی سے اس نے اپنے رب کو پکارا!

"مجھے ہمت دے میرے معبود، میرے مالک میری مدد کر۔۔۔" اس کو پورا پورا یقین تھا وہ پھر ایک بار مصر کے منحوس بوڑھوں کو شرمندہ کر دیگی اور پھر صدیوں تک ان کو ہمت نہ پڑے گی کہ خدا کے سامنے اپنے فراعنہ کی ڈینگ ماریں۔ اہرام اپنی آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ نیل کے ارادوں کو وہ بھانپ چکے تھے اور ان کے چہرے لحہ بہ لحہ سنولائے جا رہے تھے۔

تعمیر پسند افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ

اُبھری لکیریں

قیمت
دو روپے آٹھ آنے

ناشر:- مکتبۂ معیار میرٹھ

علیگ النسا

آغر تاباں

آنند ورکنگ ہوم سے جدا ہوا تو حیدری بیگم کی کشش نے مجھے کھینچ لیا مگر تھوڑے ہی دنوں میں طبیعت چھک ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حیدری بیگم کے گھر والے زبان کے معاملے میں بہت پختہ تھے۔ کھٹا کھاتے کھاتے ان کی زبان اتنی رقیق ہو گئی تھی کہ منہ سے ق کے بجائے خ نکلتا چنانچہ جس وقت وہ کسی بات کو درجۂ وثوق تک پہنچانے کے لئے کہتیں کہ "مجھ سے قسم لے لو" تو معلوم ہوتا کہ شوہر فروشی کے لئے کمر بستہ ہیں اور کسی طرح اس غریب سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں تاکہ شادی کا سپلیمنٹری کیا جائے لیکن کچھ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مجھے وہاں بھی چین نہ ملا۔ اور کیسے ملتا جبکہ ان کے گھر کے تمام افراد۔ نوکر۔ بچے۔ عزیز و اقارب۔ بھنگی۔ چمار۔ دھوبی۔ گوالے غرض کہ سبھی نے مجھے غیر ملکی کہہ کہہ کر پریشان کر ڈالا۔ دوسرے یہ کہ میرے دل میں عورتوں کی اس قدر عزت ہے کہ عورتوں کے دلوں میں میری اتنی عزت نہیں۔ اسی لئے جب ان کو ق کے بجائے خ اور مونث کے بجائے مذکر بولتے ہوئے سنتا تو آدھا خون تو جل کر تارکول ہو جاتا اور بقیہ رگوں میں کوہ پھاند مچانے لگتا۔ کتنی متلی آور گفتگو ہوتی تھی ان کی "ہو جی رخیہ تم حورمہ کھاتے؟" "تیں پول کے لاجی حدسیہ تم چیچ بولتے۔ نکو باہا وبڑا ڈیگاں مارتے" "حِصہ بخہ تو چپ بوم مار بیٹے" وغیرہ وغیرہ۔

تو خیر بہت جلد ان کے گھر کے لمبی لمبی۔ دو دو میل اونچی ٹوپیاں پہننے والے مردوں "اور نکو" "ہاؤ" "اور چیچ" بولنے والی عورتوں نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا اور میں اپنی "خسمت" کو روتا پیٹتا وہاں سے چل پڑا۔ اگر میں دو چار دن اور وہاں رہ لیتا تو ایک دن آپ یہ "خبر" سنتے کہ حیدری بیگم کے یہاں میری "حبر" بن چکی ہے۔

کوئی اور صورت نظر نہ آئی۔ سوچا کہ جب دوسروں کے گھر پڑے پڑے انٹرمیڈیٹ ہو گئے تو تھوڑے دنوں کی بے شرمی اور لاد کر گریجویشن بھی کر ڈالو تاکہ "جو روئیشن" کے وقت یہ تو نہ ہو کہ

قاضی صاحب تو اڑے ہیں کہ دکھاؤ ڈگری
اور سمجھے میں ہے تاباں کہ مری لاج رہے

بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جب بہت چھوٹے تھے تو ایک صاحبہ ہمارے گھر اکثر آکر ہمیں کبھی ان کو اور کبھی اپنے گھر کو دیکھنے کا موقع دیتی تھیں۔ رنگ تو سیاہ مگر چہرہ سفید صورت سے سیرت ٹپکتی مگر دل اندر سے پروفیسرانہ۔ ان کی کوٹھی دہلی کے قریب ہی ہوا کرتی تھی اور خاندان حکومت کے مشوروں سے انحراف کی وجہ سے کافی وسیع اور عریض تھا جس میں بھانت بھانت کے رشتے دار بندھے ہوئے تھے۔ نام ان کا علیگ النسا خانم کرکلی تھا اور شادی ہمارے ایک رشتے کے بھائی سے ہوئی تھی جنہیں ہم لوگ تعلیماً "سید بھائی" کہا کرتے تھے۔ سید بھائی کو مرے تو ایک زمانہ گذر گیا تھا مگر وہ اب تک زندہ تھیں اور ہر سال اپنے شوہر کا فاتحہ کرا کے مٹھائی خود کھا لیتیں اور بچے فقیروں میں بٹوا دیتیں۔ چنانچہ میں نے طے کیا کہ بی۔ اے۔ انھیں کے گھر رہ کر پاس کیا جائے۔ اپنی روانگی کا انہیں تار دے دیا۔

اسٹیشن پر کوئی نہ تھا صرف علیگ النسا موجود تھیں میرا سامان ایک تکے پر رکھوا دیا گیا جس کی گھوڑی چالیس دن سے بھوکی تھی اور روزہ کھولنے کی نیت سے عنقریب اوپر کی طرف پرواز کرنے والی تھی۔ دائیں طرف وہ بیٹھ گئیں اور بائیں طرف میں اور تکے والا ثالث کی حیثیت سے ٹِک ٹِک کرنے پر مامور ہو گیا۔ پاؤں ٹیکنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے تکے والے نے رائے دی کہ پہیئے میں ہی گھسیڑ لئے جائیں تاکہ تکے کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی حرکت میں رہیں۔ اس طرح دونوں کے چلنے سے رفتار بھی دگنی ہو جائے گی اور گھر جلدی پہنچ جائیں گے۔

"آلار" اور "دیاؤ" کی ورزش کرانے کے بعد بمشکل تمام تکے والے نے روزہ دار کو اذن جہاد دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ گھوڑا کبھی آگے بڑھتا کبھی پیچھے ہٹتا تکے والے کی دِسل (بصورت چابک) پر اچھل کر آگے لپکتا لیکن فوراً ہی ایک اتھلیٹ (Athelete) کی طرح فٹ فالٹ کا خیال کر کے رُک جاتا کہ نئے سرے سے اسٹارٹ لیا جائے۔

اِسں سنو گرز کی دوڑ میں گھوڑے نے ہم لوگوں کو اس طرح پچھینٹ کے رکھ دیا کہ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ ایسا معلوم ہوتا کہ تھرمامیٹر جھٹکا جا رہا ہے۔ خدا خدا کر کے انجن کی شنٹنگ ختم ہوئی اور گاڑی ہلتی ہوئی چلی۔ ابھی بمشکل بیس قدم بھی پورے نہ ہوئے ہوں گے کہ ایک چھوٹے سے گڑھے نے یکے کو بڑے تپاک سے دعوتِ قیام دی اور میں صرف پندرہ گز دور ہائی جمپ کرتا ہوا کھڑا ہو گیا لیکن تانگے والے نے فوراً ایک پر تن اپالوجی دے دی۔ اور اس طرح کی سیکڑوں اپالوجیوں کے درمیان آخر کار اس نے مجھے علیگٹ النسا کے گھر پہنچا ہی دیا۔

ان کا گھرانہ بہت بڑا تھا۔ میری طرح اور بھی بہت سے لڑکے تعلیم کی غرض سے ان کے مکان میں رہتے تھے۔ گھر کیا تھا اچھا خاصا محل تھا جسے چار حصوں میں بانٹ کر چاروں بہوؤں کو سونپ دیا گیا تھا۔ مجھے جو کمرہ دیا گیا اس کی منتظمہ ایک لمبی تڑنگی، دبلی پتلی، چھریرے بدن کی ٹی۔بی زدہ محترمہ تھیں۔ صورت بڑی عجیب و غریب مگر خوش پوشی کی بنا پر کبھی کبھی خوبصورت بھی معلوم ہونے لگتیں خصوصاً دعوتوں کے موقع پر تو بالکل کارٹون بن جاتیں۔ بولتیں تو معلوم ہوتا کہ بی بی سی سے ملہار راگ چھوڑ رہا ہے۔ بات چیت اردو میں کرتیں مگر ڈانٹنے کے لئے انگریزی کو مادری زبان قرار دے رکھا تھا۔ خوش دل اس قدر کہ میں نے سامان کمرے میں پوری طرح رکھا بھی نہ تھا کہ اپنے کمرے میں بلا کر مجھے خوب ڈانٹا اور دل کھول کر ڈانٹا۔ میں نے دریافت کیا "جناب! میری غلطی؟" بولیں۔ "ٹھہر جاؤ۔ ذرا اچھی طرح ڈانٹ لینے دو پھر بتاتی ہوں ورنہ کہیں ڈانٹ کا فلو (FLOW) نہ ختم ہو جائے۔"

میں سمجھ گیا بے چاری جسمانی رعب کی تلافی فرما رہی ہیں۔ ڈانٹ چکیں تو بولیں "دیکھو اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم جھڑکیوں کے عادی ہو جاؤ گے تو اپنی شادی کے بعد بہت کامیاب زندگی گذار دو گے۔ بیوی چلاتے چلاتے تھک جائے گی مگر تم یہاں سے اتنے "ڈانٹ پروف" ہو کے نکلو گے کہ تمہارے کانوں پر کھٹمل تک نہ رینگیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خود میری پریکٹس بڑھے گی۔ اور بچے باپ سے زیادہ ماں کے رعب میں رہیں گے۔ اچھا جاؤ۔ کل پھر اسی وقت آکر ایک خوراک پی جانا۔"

یہ ہجر و وصال کی گفتگو کسی گوشۂ تنہائی میں نہیں ہوئی بلکہ آموختے کے وقت دائیں طرف محترمہ "چت بھی اپنا پٹ بھی اپنا" اور بائیں طرف

آلنسہ "جو منیت امام کی سو میری" میٹھی ہوئی مکھن کے ڈبوں پر اپنا اپنا لیبل چپکا رہی تھیں۔

آنے کو تو اپنے کمرے پر واپس آ گیا مگر یہ چھٹکارا زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا کیونکہ ابھی ٹھیک سے آئینے میں اپنا اترا ہوا چہرہ دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک صاحب کوٹ پتلون پہنے چندیا گھٹائے۔ ایک ہاتھ میں "مرچنٹ آف وینس" اور دوسرے میں پھٹا ہوا بھٹا لئے کمرے میں بلا اجازت گھس آئے۔ فرمایا۔ "جناب میرے دادا جان قبلہ سید صاحب کا تقریباً اسّی سال قبل انتقال ہوا تھا۔ ان کا فاتحہ کرانا میرے فرائض میں داخل ہے لہٰذا بھلا لئے کچھ رقم۔؟"

میں نے کہا۔ "آج بدھ کا دن ہے۔ کل تشریف لائیے گا۔"

بولے "بات اصل یہ ہے کہ اب تو میں لیدھی لے آیا ہوں۔ آج لیپ پوت کر گھر جینت کروں گا تو کل فاتحہ کرا دوں گا۔ اس لئے آج کا کام کل پر نہ چھوڑیئے۔"

چار و ناچار ان کی طلب کردہ رقم ان کے حوالے کی۔ اور وہ "جو دے اس کا بھی بھلا" جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔" کی گردان رٹتے ہوئے باہر چلے گئے۔

جانے کو تو وہ چلے گئے مگر ملک الموت کو راستہ دکھا گئے۔ تین چار اصحاب میرے کمرے کے اوپر پولس ایکشن کر بیٹھے اور مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے رات ویسے ہی ہو چکی تھی۔ اس پر طرفہ یہ کہ انھوں نے سوئچ آن کر دیا اور سب اپنی اپنی جیبوں سے ٹارچ نکال کر میرے رخِ تاباں کو "تہا تا یاں" بنانے لگے۔ پہلے تو سب مجھے ایسے گھورتے رہے جیسے مجھ میں تاریخی کھنڈرات تلاش کر رہے ہوں پھر ایک دم سے سب ہنسنے لگے۔ یکا یک سب پہلے کی طرح پھر سنجیدہ ہو گئے۔ میرے چہرے کی رنگت بھی ان کی خوشی اور رنج کے مطابق لال پیلی ہوتی رہی۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے۔ ایک صاحب تھیلے میں سے ایک عدد گھنٹہ نکال کر کانوں کو میٹھے تالوں سے نوازنے لگے۔ "ٹن ٹن ٹن ..." ایک دو۔ تین .... مجھے خیال گذرا کہ یہاں وقت بتانے کا شاید کوئی انوکھا طریقہ نکالا گیا ہے۔ لیکن جب بارھویں کے بعد تیرھویں "ٹن" گونجی تو خیال ہوا کہ غالباً ریلوے "ٹائم" کا نفاذ ہے لیکن چھبیسویں "ٹن" پر کان کھڑے ہو گئے "یا اللہ! کہیں یہ دونج اسٹینڈرڈ ٹائم تو نہیں؟" پانچ منٹ بعد جا کر کہیں گھنٹہ گھر خاموش ہوا۔ ایک صاحب نے چیخ کر پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے لاؤڈ اسپیکر کو ایک ٹریٹ سرٹیفکیٹ دکھلایا۔ بولے بلکہ چیخے "کیوں یہ نام کیوں رکھا۔ دوسرا کیوں نہیں رکھا؟"

دست بستہ عرض کیا: "ماموں جان! یہ تو آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کی غلطی ہے۔"

ماموں جان نے اپنی فوجیں کوریا سے ہٹا لیں اور دوسرے صاحب میدان میں آئے "آپ کا دولت خانہ؟"

میں نے کہا "آج کل تو گھر یہی ہے اور کنجی والد صاحب کے پاس رہتی ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر ایک زبردست قہقہہ لگا کر ہیروشیما کی سرزمین نے شرما کر گھونگٹ کاڑھ لیا۔

"ارے اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کسمساتے ہوئے کہا اور ادھر دوسرا بم پھٹا کہ بکنی کا جزیرہ پاش پاش ہو گیا۔ اب تو یہ حال ہو گیا کہ ادھر منہ سے بات نکلی نہیں کہ لگا ادھر ایک چھت پھاڑ قہقہہ اور اسی کے ساتھ ساتھ گھنٹے کی کان پھاڑ ٹن ٹن۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی منٹ میں حواس باختہ ہو گئے۔ ایک صاحب جو صورت سے خوش رو اور گلے سے خوش گلو نظر آ رہے تھے۔ بولے "یہ لیجئے ڈوپٹہ اور ناچئے۔"

میں نے کہا "شرعاً ناجائز ہے۔"

"تو نماز ہی پڑھ دیجئے؟"

"وقت نہیں رہا۔"

"اچھا چھوڑیئے۔ کچھ نہیں تو وقت ہی بتا دیجئے۔"

ظالموں نے اتنا پریشان کیا کہ ان کی فرمائش نہ ٹال سکا اور انہوں نے مجھے نچوا کر چھوڑا۔ اور وہ بھی خیریت ہی سمجھئے کہ فلم دیکھتے دیکھتے میں تھوڑا بہت ناچ سیکھ چکا تھا ورنہ بڑی بری گت بنتی۔ نچا چکے تو بولے "روپے نکالو۔ محنتانے کے۔"

"کیسا محنتانہ؟ کیسے روپے۔ ناچا آپ کے گھر ہو یا میرے؟"

"اجی یہ سب آپ ہی کی تفریح کے لئے سامان کیا گیا تھا۔ ورنہ ہم کو کیا غرض تھی کہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے۔"

اس خیال سے کہ وہ کہیں میرے لئے مزید آرام و آسائش نہ مہیا کرنا شروع کر دیں۔ مجبوراً ان کی ہتھیلی پر تین روپے چپکا دیئے اور وہ پاس والے کمرے میں چلے گئے اور وصول تحصیل کرنے لگے۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ کلیگ النساء مجھے خود بلانے آئیں۔ کھانے کی میز پر پہنچا تو سب کو مصروف عمل پایا۔ معلوم ہوا کہ چونکہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس وجہ سے ایک دوسرے کے انتظار میں گاڑی چھٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اسی لئے کھانے کے سلسلے میں "اکلوتا سسٹم" رائج ہے۔ دور ہی سے کھانے کی خوشبو تھنے پھاڑے ڈالتی تھی۔ کوئی مذاق تھوڑی تھا۔ کلیگ النساء جیسی حاتم دل میزبان مجھ ایسے کانچ کے مہمان کی خاطر کرنے والی تھیں۔ میرے دماغ کی داد دیجئے کہ محض خوشبو کا تجزیہ کر کے پتہ چلا لیا کہ نرگسی کوفتے۔ کباب۔ پلاؤ۔ بریانی۔ زردہ۔ فیرنی اور شاہی ٹکڑے۔ دسترخوان کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ سوچا کہ یہ آخر کلیگ النساء نے اتنا تکلف کیوں کیا۔ آخر میں کتنا کھاؤں گا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ مہمان نوازی کی بھی تو لاج رکھنا ہوتی ہے۔ کلیگ النساء خود تو بچوں کے ساتھ کھا پی چکی تھی بلکہ ان کو مار کوٹ کے سلا بھی چکی تھیں۔ بیرے کو جس زور شور سے بلایا گیا وہ آنے والے کھانے کی "مرغنیت" کی صحیح طور پر غمازی کرتا تھا۔

"دیکھو صاحب کو کھانا لگا دو" بوائے کو اس طرح مخاطب کیا گیا جیسے میں اکثر اپنے نوکر سے کہتا ہوں "جاؤ! ذرا بیلوں کو پانی دکھا لاؤ۔" بالآخر ایک عدد سالن کی پلیٹ نے خالی میز کا سونا پن دور کیا۔ پلیٹ کے پیندے میں دو موٹی موٹی روٹیاں بھی چپکی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ جلدی کیا ہے۔ اب تو ابتدا ہوئی ہے۔ دھیرے دھیرے سب ہی چیزیں آ جائیں گی۔ مجھے خود بھی یہ امریکن طریقہ پسند ہے کہ کھاتے جاؤ اور منگاتے جاؤ۔ یہ کیا کہ لگا ہے ڈھیر سامنے کہ کھا رہے ہیں ایک چیز اور نیت لگی ہے دوسری پر۔ چنانچہ کسی اور چیز کا انتظار کئے بغیر میں نے پلیٹ پر دھاوا بول دیا اور آن کی آن میں روٹی معہ سالن صاف۔ اب جو گھوم کر دیکھا تو بوائے ندارد۔ ظاہر ہے بے چارا دوسری چیزوں کے لانے کی فکر میں ہو گا۔ کچھ دیر انتظار بھی کیا مگر اس کی صورت نہ دکھائی دی کیا کیا جائے۔؟ معدہ پر تو ستم نے علی گڑھ کے تالے ٹھونک دیئے تھے لیکن دوسری طرف بھوک نے پیٹ پر بے شرمی کا بورڈ چپکا دیا تھا۔ کلیگ النساء کی طرف دیکھا تو وہ شاید وظیفہ پڑھ رہی تھیں میں بھی بیٹھا رہا۔ پھر ان کی طرف دیکھا اور مراقبہ میں پا کر خود بھی سر جھکا لیا۔ آخر کار وہ چونکیں اور مجھ سے پوچھا کہ پانی پیجئے گے؟ ہاں اس خیال سے کر دی کہ جب تک کچھ اور آئے ایک گلاس ٹھنڈا پانی ہی چڑھا لیا جائے۔ پانی تو خیر حلق سے اتر گیا مگر اپنی گرمی۔ بدبو اور گھڑ ا تالو کے نیچے ڈیپازٹ کر گیا۔ کلیگ النساء نے خود ہی بوائے کو آواز دی۔ اس کی صورت دیکھ کر دل کو بڑی تسکین ہوئی۔

"جی صاب"

"صاحب کے ہاتھ دھلاؤ۔"

"ارے ہمیں تو چکر آگیا۔ بس ؟ اور وہ پلاؤ، زردہ، قورمہ، مرغ یہ تمام سٹرم کیا صرف اگربتی کی طرح خوشبو دینے کے لئے تھے۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی ضیافت نصیب ہوئی تھی۔ جتنا ہی اس مسئلے پر سوچتا اتنا ہی کم سوچا جاتا اور جس قدر اسے نظر انداز کرتا اتنا ہی یاد آتا۔ سوچنے لگا کہ اگر یہی حال رہا تو ہو چکی ہماری گذر۔ ہم ٹھیرے ہاکی اور فٹ بال کے کھیلنے والے۔ کوئی کروشیا کاڑھنے والے تھوڑی ہیں کہ دو چپاتی کھالیں اور پہنچے اسپتال کہ پیٹ کا آپریشن (Operation) کرو۔ وہ یہاں تو جب تک اتنا نہ کھالیں کہ حلق تک نوالے اٹکے رہیں اور ہم فونٹین پین سے ٹھونستے رہیں۔ جب تک معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔

تکلفاً یا یوں سمجھئے کہ مجبوراً ہاتھ دھو کر اٹھنا پڑا اور ایک ہوٹل میں دوسری دفعہ ہاتھ دھونے کا سامان کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔

اُسی رات کو بوریا بستر باندھ چپکے سے اسٹیشن اور وہاں سے دولت خانے گھر پر لوگ پوچھتے ہیں کہ تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی اور میں کہتا ہوں کہ نہیں۔ وہاں تو یہاں سب خیریت ہے۔ اور آپ لوگوں کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب" والقصّہ ہے۔ پڑھائی سے طبیعت اُچاٹ ہو چکی ہے۔ اور اس سے زیادہ دل کہکشاں میں لگتا ہے۔ جس نے ڈومیسٹک سائنس سے زیادہ ملٹری سائنس سیکھی ہے۔

علیگڑھ النساء اب بھی مہربان ہیں اور وہ اب بھی مجھے گھر آنے کی دعوت دیتی رہتی ہیں اور میں اب بھی اُن کو اپنی آمد کا یقین دلاتا رہتا ہوں۔

متین طارق قرشی

تجربہ کی باتیں

تجربہ تجربہ ہوتا ہے خواہ کسی بیوقوف نے کیا ہو یا ارسطو نے فرق یہ ہے تو صرف اتنا کہ ارسطو کا نام مشہور ہو گیا اور اس کے تجربات پر لوگ آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے لیکن دوسروں کے تجربات۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

کی نذر ہو گئے مگر میں کہتا ہوں کہ تجربات کے معاملے میں خواب کو بھی حقیقت ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ اس سے کچھ نہ کچھ نفع ہی حاصل ہوتا ہے پچھلے زمانے کے انسانوں نے اپنا نقصان کر کے بہت سے تجربے کئے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہماری چھوٹی سی عمر اس کام میں لگ جاتی اور ہم آج کے نئے تجربے نہ کر سکتے اور ہمارا ہر کام مضحکہ خیز نہ ہوتا کیونکہ وہ نیا ہوتا ہر نئے کام پر لوگ پہلے پہلے ہنستے ہی ہیں۔ فی زمانہ برف سے بارود بنانے کا تجربہ مکان کو نیچے کے بجائے اوپر کی طرف سے شروع کرنے کا تجربہ۔ بھوسہ ڈال کر کھیت میں اناج اُگانے کا تجربہ۔ کتابیں گھول کر پینے سے علم حاصل کرنے کا تجربہ۔ ہنسی کی دعوت ہے کہ نہیں کیونکہ یہ سب باتیں نئی ہیں۔ البتہ جب یہ تجربات آنکھوں کے سامنے آ جائیں گے۔ تو یقین کئے بنا چارہ نہ رہے گا۔ جیسے ہم پرانے تجربات پر یقین رکھتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان سے کبھی بھی واسطہ نہ پڑا ہو۔ مثلاً یہ تجربہ کہ آگ جلاتی ہے نیز کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے کوئی بے حیا ہی بچ جائے تو بچ جائے ورنہ عام طور سے نتیجہ موت ہوتا ہے بالکل صحیح ہے اگر اس میں آپ کو کچھ شک ہو تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ اور اگر آپ اتنے دل گردے والے ہیں کہ کنوئیں میں چھلانگ لگا سکیں تو پھر ہمیں کہنے دیجئے کہ اس معاملے میں لکیر کے فقیر ہونا بُرا نہیں اگرچہ لوگ قدامت پرست کہیں میرے خیال میں آپ بھی ایسی جدت پسندی کو پسند نہ فرمائیں گے جو دیدہ و دانستہ زہر کھا کر حاصل کی جائے۔

اور پسماندگان

"کیا خوب آدمی تھا"

کہہ کر تذکرہ کریں گے یہ بات تجربات سے زیادہ جذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں سے بیوقوفی کی سرحد شروع ہوتی ہے اس لئے جو آدمی تجربات کے بعد بھی جذبات سے کام لیتا ہے وہ پرلے درجے کا ابوالہول گنا جاتا ہے۔ اس تصور کو سامنے رکھ کر بعض لوگ عوام کو بھیڑوں سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس طرح بھیڑوں میں ذاتی دماغ ناپید ہوتا ہے اسی طرح عوام بے دماغ ہیں اور اگر کہیں کہیں دماغ ہے بھی تو بے مغز۔ خالی خولی دماغ۔ بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جس طرف ایک بھیڑ جائے اُس کے پیچھے پورا گلہ ہو لے۔ آگے کنواں ہو یا کھتی۔ انھیں بہرحال قدم قدم چل کر جو نیت امام کی سو میری پر عمل کرنا ہے۔

بھیڑوں کے تصور پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ بھیڑیں مُنڈنے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس لئے عوام کو بھی اپنی حجامت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

یہ دلیل واقعی بہت بھاری بھرکم ہے جس کے سامنے سوائے سر جھکانے کے چارہ نہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مُنڈنے والے مُنڈتے ہیں اور دوسرے مزے اڑاتے ہیں۔ اور خوب مارا کے نعرے لگاتے ہیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر ایک لیڈر قسم کے آدمی سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ حضرت یہ "خوب مارا" کا کیا مطلب ہے تو ارشاد فرمایا کہ ہر چند کہ یہ ہماری خاص رمزوں میں ہے مگر چونکہ تم بھی اپنے ہی آدمی ہو اس لئے کان میں بتا رہا ہوں کسی سے کہنا مت۔ دیکھو باوجود اس کے کہ لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہے کہ یہ دیسی چیزوں کا پرچار کرنے والے بدیسی اشیاء کا استعمال کرتے ہیں الیکشن جیت کر اپنا دروازہ غریبوں پر بند کر دیتے ہیں۔ اوّل درجہ میں سفر کرتے ہیں آپس میں قوموں کو لڑاتے ہیں مگر پھر بھی ہمارے نام اور کام پر مٹے جاتے ہیں۔ گاڑیاں کھینچتے ہیں۔ ہار پہناتے ہیں حتیٰ کہ اشاروں پر جان دے دیتے ہیں۔

پھر اس تفصیل سے الگ یہ تجربہ اپنی جگہ درست ہے کہ عوام سادہ لوح ہیں انہیں لوگ اپنی اپنی غرض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بیشتر غرض کے لئے طریقۂ استعمال یہ ہے یعنی اچھے پوشوں کی محفل ہو تو جھنڈل کا نام کافی ہے۔

عورتوں کا معاملہ ہو تو حقوق کی یاد دلا دو۔ مزدوروں سے واسطہ پڑے تو روٹی کا نعرہ لگا دو۔

مسلمان سامنے آئیں تو اسلامیات اچھا موضوع ہے مقصد سب کا ایک ہے اپنا اُلو سیدھا کرنا اور طاؤس ورباب کے مزے اڑانا۔

یہ سو بار کا تجربہ ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں۔ یوں اس کے بعد بھی کوئی حجامت کرانا چاہے تو دوسری بات ہے حالانکہ دودھ سے منہ جل جانے کے بعد چھاچھ کو پھونک مار کر پینے کی ہدایتیں پہلے سے موجود ہیں۔ یعنی کسی بات کے بارے میں ایک مرتبہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کی تکرار حماقت ہے۔ مثلاً شاعر کا تالیاں پٹنے کے بعد دوبارا شعر پڑھنا کالی جھنڈیوں کے استقبال کے بعد پھر اسٹیج پر آنے کا تجربہ وہی لوگ کرتے ہیں جو بھینس کو عقل سے بڑی مانتے ہیں یہ ایک پرانی بحث ہے جس پر ہمیشہ سے گفتگو ہوتی چلی آئی ہے مگر اس کا تجربہ پہلے پہل ایک شیخ چلی نام کے آدمی نے کیا تھا جو اپنی بھینس کی پشت پر چڑھ کر پیڑ کی شاخ میں جھولا جھول رہا تھا کہ تڑاخ کی آواز ہوئی آواز سن کر بھینس سر پر پیر رکھ کر بھاگی اور میاں شیخ چلی دھم سے نیچے۔ بھینس بہر حال صحیح سالم تھی لیکن شیخ چلی ہمیشہ کے لئے تیسرے پیر کے محتاج ہو گئے تھے۔ اس وقت سے عقل سے بھینس بڑی ہونے کی کہاوت مشہور چلی آتی ہے۔ جو واقعہ بھی ہے حصہ جثہ میں بھی ڈیل ڈول میں بھی بھینس بڑی ہے۔ زیادہ کھاتی ہے عقل کچھ بھی نہیں۔ بھینس نظر آتی ہے عقل نہیں۔ بھینس پر آدمی سوار ہو سکتا ہے۔ عقل کا غلام بنا رہتا ہے۔ بھینس کو اپنی مرضی پر رکھتا ہے اور عقل آدمی کو اپنی مرضی سے چلاتی ہے پھر بھینس چلتی ہے تو نقصان کم فائدہ زیادہ ہوتا ہے مگر جب عقل چل نکلتی ہے تو آدمی آدمی نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ننگے ناچ ناچتا ہے۔ آگ لگاتا ہے۔ ایٹم بم بناتا ہے۔ ذخیرے جلاتا ہے۔ خدائی کے دعوے کرتا ہے۔ دنیا کو برباد کرتا ہے۔

غرض عقل پر بھروسہ کر کے سراسر نقصان ہے اور بھینس دودھ دیتی ہے جو اس کا کام ہے۔ دودھ سے خون بنتا ہے۔ خون روح کی سواری ہے جس سے عقل کی شعاعیں پھوٹتی ہیں اگر خدانخواستہ روح نہ رہے تو عقل کا ٹٹو بھی بیٹھا کا بیٹھا ہی رہ جائے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عقل کی بقا کے لئے بھینس کے دودھ کی ضرورت ہے تب کہیں جا کر وہ کام کی ہوتی ہے۔

عقل کے کام وہ ہوتے ہیں جنہیں ہم عقلمندی کے کام کہتے ہیں جن کو کوئی عقلمند ہی کر سکتا ہے جیسے کسی کو کھانے سے۔ آزادی سے۔ ماں باپ کے زمین سے محروم کر دینا کسی کو غلام بنا لینا دھوکہ دے دینا اچھے خاصے آدمیوں کو لڑا دینا قتل کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا چوری ایسی صفائی سے کرنا کہ شبہ تک نہ ہونے دینا جو یہ کام نہ کر سکے وہ سیدھا ہے یعنی بھینس ہے۔

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور کا تجربہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہے جس کی تصدیق کے لئے ویسے تو آپ ہاتھی کو دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کہاں تک درست ہے لیکن ان کا فرق جاننے کے لئے انسائیکلو پیڈیا کی یہ عبارت یاد رکھئے کہ۔

> " سونڈ کے علاوہ ہاتھی کے بدن میں دانت بھی عجائبات سے ہیں اندرونی دانتوں کا مقصد تو ظاہر ہے مگر خارجی دانتوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ دوسروں کو دھوکا دیا جائے "

خیر یہ اصطلاحی باتیں ہیں ہمیں اور آپ کو اس سے کیا لینا ہاں البتہ اس محاورے کا استعمال اور اثر ہر جگہ ہوتا ہے جس سے بچت ممکن نہیں۔ مطلب ظاہر و باطن کے تضاد سے ہے یعنی جو کچھ آپ ہیں وہ ظاہر نہ ہونے پائے اور جو ظاہر ہو وہ حقیقت نہ ہو جو کہیں وہ کیا نہ جائے اور جو کیا جائے وہ کہا نہ جائے دل میں کچھ زبان پر کچھ۔ اندر اور باہر اور گھر میں چاہے تلا باریاں کھا رہے ہوں لیکن باہر مونچھیں کلابتو ہوں۔ اندرون خانہ بیوی منہ جھاڑ سر پہاڑ مفلسی کی تصویر بنی بیٹھی ہو لیکن ہوٹل میں صاحب یاران میکدہ کو دعوت دے رہے ہوں۔ بچے کے پاس خواہ لکھنے پڑھنے کا سامان نہ ہو مگر ٹینس کا ریکٹ بغل میں ضرور ہو در پردہ ایک دوسرے کے خون کے لوگ پیاسے ہوں مگر اسٹیج پر اتحاد کا نعرہ لگ رہا ہو۔

مخاطب کو آمدنی اصل سے کئی گنا زیادہ بتانا تو ارث کسی نہ کسی

نواب اعظم یار جنگ سے منسوب کرتا یعنی جھوٹ بول کر اپنی معصومیت جتانا کھانے اور دکھانے کے دانتوں کی تفصیلات میں سے ہیں۔ یا مثلاً آپ کو کسی سے دلی نفرت ہے اس کی عادت و اطوار کو آپ پسند نہیں کرتے۔ لیکن سرراہے انہیں صاحب سے ملاقات ہو جاتی ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں۔ تپاک سے بات چیت ہوتی ہے گلے شکوے زبان پر آتے ہیں گویا اس وقت آپ کھانے کے دانتوں سے نہیں دکھانے کے دانتوں سے کام لے رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر جانتے بوجھتے تجاہلِ عارفانہ ضروری ہے کیونکہ قدرت نے اسی کام کیلئے انہیں بنایا ہے۔ یا مثلاً الیکشن کا زمانہ ہے ہر دو فریق مختلف اوقات میں آتے ہیں اور ووٹ کا مطالبہ کرتے ہیں اب یہ انہیں دانتوں کا کرشمہ ہے کہ ہر فریق خوشی بخوشی واپس لوٹتا ہے۔ غرض ہر نکڑ ہر موڑ اور ہر جگہ اِن دانتوں کے مظاہرے ہو رہے ہیں جو ان سے رُو گردانی کرتا ہے وہ دھوبی کے کتے کی مانند گھر اور گھاٹ دونوں سے جاتا رہتا ہے

دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا

گھر اور گھاٹ دونوں رہنے کی جگہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گھر پر آدمی رات دن رہتے ہیں۔ اور گھاٹ پر دھوبی اور اُن کا کتا دن میں رہتے ہیں۔ کبھی جب کتا کسی لالچ میں گھاٹ چھوڑ دیتا ہے تو مارا مارا پھرتا ہے کیونکہ دھوبی کا گھر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملا کرتا سُنا ہے انگلینڈ میں گھاٹ نہیں ہوتے اس لئے کتے گھروں میں رہتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ملک میں گھر کم ہیں اس لئے بہت سے آدمی بھی گھاٹ پر رہتے ہیں یونہی پرانے زمانے میں دریاؤں کے کنارے گھاٹ بہت بنائے جاتے تھے۔ فی زمانہ تقسیم نے اِس دِقت کو دُور کر دیا ہے اب نہ گھاٹ کی ضرورت ہے نہ گھر کی لوگ آوارہ پھرتے ہیں اُن کے ساتھ کتے بھی گلیوں میں گھومتے ہیں یُوں بھی کتے کے کوئی کام لیں کا نہیں ہے کپڑے اس پر نہیں لادے جا سکتے۔ گاڑی میں اُسے نہیں جوتا جا سکتا آدمی اور کتے میں اس لحاظ سے کچھ زیادہ فرق نہیں دنیا میں بہت سے اس قماش کے ہیں اور اُن کے مقابلے میں کتے مہذب۔ مہذب ملکوں میں کتوں کو علوم و فنون سکھانے کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ پیانو بجانا۔ چوری کرنا۔ چوریوں کا پتہ لگانا اور سرکس کے مظاہروں میں حصّہ لینا یہ سب کتوں کے قابلِ قدر کام ہیں۔ کہیں اُن کے مقابلے میں آدمی نکھٹو ہونا فخر خیال کرتا ہے۔

ایسے آدمی جو کسی کام کے نہ ہوں انہیں ہم دھوبی کے کتے کہہ سکتے ہیں۔ بہت سے آدمی دھوبی کا کتا ہوتے ہیں کیونکہ وہ کوئی کام نہیں کرتے ہر وقت لیٹے یا بات بناتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا انہیں بولنے کی بیماری ہو جاتی ہے جیسے کتوں کو وہ رات بھونکنے کا مرض ہوتا ہے رات کو تو وہ اس لئے بھونکتے ہیں کہ مالک کو ان کی وفاداری کا یقین آ جائے لیکن دن میں بھونکنا اُن کی عادت میں شامل ہے۔

کتے کی سب سے بڑی خصوصیت مالک کی وفاداری ہے کتا وہی اچھا ہوتا ہے جو وفادار ہو اور مالک کے کہنے پر پُورا پُورا عمل کرے چاہے مالک اُسے کھانے کو دے یا نہ دے مگر وہ دُم ہلا کر اس کی ٹھوکروں میں پڑا رہے۔ دُنیا میں زیادہ تر اسی قسم کے کتے پائے جاتے ہیں جو اپنے مالک پر جان تک دے دیتے ہیں اور وہ اُن کو روٹی تک نہیں دیتے۔ ہاں اُن کتوں کی کچھ قدر زیادہ ہوتی ہے جو اپنی قوم سے نفرت کرتے اور غداری کا فرض انجام دیتے ہیں ایسے کتے ملک و قوم کے لئے خسارہ ثابت ہیں وہ ذرا سے ٹکڑے کے لالچ میں اصلی مالک سے منہ موڑ کر آنے والوں سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں اور مزے اُڑاتے ہیں۔ مگر یہ چار دن کی چاندنی ہوتی ہے اندھیری رات آئے پر گھر اور گھاٹ دونوں کھوئے جاتے ہیں۔ آخر ایک دن بال کی کھال اُترتی ہے اور حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔

بال کی کھال

دُنیا میں ہر چیز کھال رکھتی ہے۔ کھال اُوپر ہوتی ہے اس کے نیچے بال ہوتا ہے۔ کھال عیب کو ڈھکتی ہے اگر خدا نخواستہ کھال اُتر جائے تو تترا گوشت ہی گوشت رہ جاتا ہے۔ کھال اُترے ہوئے حصّے کو ہم ایک منٹ کے لئے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ بال کے بھی کھال ہوتی ہے مگر بہت باریک اور مشکل سے اُترنے والی لیکن کبھی نہ کبھی اُترتی ضرور ہے جب اُترتی ہے تو حقیقت واضح ہوتی ہے اِسی لئے وہ بُری لگتی ہے۔

بال کی کھال نکالنے والوں کو نقاد کہتے ہیں اُن کا کوئی خاص نشان تو ہوتا نہیں وہ صرف اپنی باتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ بس یُوں سمجھ لیجئے کہ وہ کنکھجوری مچھلی کی طرح پیچھے لگے رہتے ہیں۔ آپ کے منہ سے کوئی جملہ نکلا اور اُدھر اعتراض ہوا آپ مانیں یا نہ مانیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کر لی۔ رہا نماز پڑھنے کا معاملہ تو انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مسجد بنانا ثواب ہے اس ثواب کو وہ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے

[illegible] اس کی یہ ہے کہ نقاد مقراض تنقید سے ہمہ وقت ادبی جانوں خراش کے لئے تیار رہتا ہے۔ یوں کٹتے کہ بال کی کھال اُتر آتی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ باتیں ناگوار ہیں اُن کا کہنا ہے کہ اس طرح کھال اُترنے کے بعد شعر کی حیثیت پر نُچے پرندے سے زیادہ نہیں رہتی پر نُچنے کے بعد پرندہ اونچا نہیں اڑ سکتا یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے ادیبوں کی پرواز اونچی نہیں ہے۔ قومیت۔ مزدور۔ جنسی بھوک پر اکتفا کئے دست بدعا ہیں کہ یہ نقاد نام کے لوگ دنیا سے ایسے غائب ہوں جیسے گدھے کے سر سے سینگ لیکن حقیقت میں اگر بال کی کھال اُتارنے کا رواج نہ ہوتا تو دنیا ہمیشہ اندھیر نگری بنی رہتی اور یہاں ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجہ کا معاملہ جاری رہتا نہ کوئی کسی کی بات سُنتا نہ فریاد۔ اپنا من اپنا راج ہوتا جس کے گلے میں پھانسی فٹ ہوتی وہ بن آئی مرتا لیکن اب چونکہ بال کی کھال نکالنے کا قاعدہ بھی ہے۔ اس لئے لوگ کولھو کے بیل بنے رہنا اچھا خیال نہیں کرتے۔

کولھو کے بیل۔

کولھو کو بیل چلاتے ہیں یا دن بھر چکر کاٹتے ہیں اور وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ جو لوگ بیلوں کی طرح چلتے رہتے ہیں لیکن باوجود اس کے آگے نہیں بڑھتے۔ کولھو کے بیل ہوتے ہیں۔ یہ ہر جگہ ہر ملک ہر قوم میں پائے جاتے ہیں جو عمر بھر لکیر کے فقیر بنے ایک ڈگر پر چلتے ہیں نہ انہیں دنیا کی خبر ہوتی ہے نہ دین کی بس اپنے کام سے کام اور کام ہے پُرانی لکیر کو پیٹنا۔ پھر لطف یہ ہے کہ کولھوؤں کے بیلوں کی زیادہ ضرورت نہیں رہی مگر ہمارے ملک میں ان کی تعداد کثیر ہے۔ چنانچہ لوگ انبوہ جشن دارد کوئی کسی کو نکٹا نہیں کہہ سکتا۔ لیڈر۔ ادیب۔ شاعر۔ فلسفی سب کے سب ؎

یہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی ۔ آپ اپنی خبر نہیں آتی

یہ بات تجربہ کی بنا پر کہی گئی ہے یقین نہ آئے تو خود تجربہ کر کے دیکھ لو۔

نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

صلاح الدین بلوا

اور مسافر جھول رہے تھے

آپ کبھی خیال (خیالِ جاناں ہی سہی) میں مستغرق ہوں اس قدر کہ دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہ ہو اور ٹھیک اسی وقت کوئی آپ کے کان پکڑ کر یوں ہلا دیجیے گویا آپ تخیلی دیلی ہوں تو اپنے سرِ عزیز کی قسم کھا کر کہیں کیا آپ چڑ نہ جائیں گے؟ بلکہ عجب نہیں کہ آپ موقع و محل کا لحاظ کیے بنا دیاں ہی پہ دنگل منعقد فرما دیں گے ——— مگر آپ جانتے ہیں جب میرے بدتمیز کلاس میٹ فخر الدین نے میرے کان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ دیا تو گویا میں جھنجھلایا تو بہت مگر آپ سن کر حیرت فرمائیں گے کہ میں نے دنگل ونگل منعقد نہیں کیا البتہ سوال ضرور ہوا۔

"کیوں خیر تو ہے؟

"کمبخت سوتلے ہے۔ یہاں گاڑی ہے کہ بس دندناتی ہوئی چلی آرہی ہے اور تم ہو کہ .... کہ اسکی آواز گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ میں گم ہو کر رہ گئی طبیعت تو اسکی اس نامعقول بے تکلفی پر بہت جھنجھلائی مگر انتقام سرِ دست مستقبل کے کسی مناسب موقع کیلئے اٹھا رکھا۔ ادھر یوں الرٹ کھڑا ہو گیا گویا بس حکم کی دیر ہے گاڑی کو الٹ کر رکھ دوں گا۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ہم لوگ اسکول سے نئے نئے فارغ ہوئے تھے اور ہم دونوں کچھ خاص قسم کے بزنس کے سلسلہ میں رنگ پور جا رہے تھے۔ ہریاسے گرا سوار ہوئے تھے اور اب تک بردنی جنکشن پہنچ پائے تھے۔ منزل ہنوز بہت دور تھی ——— جسکے انتظار میں ہم لوگ باہر پلیٹ فارم پر سر مارے رہے تھے اور محکمۂ ریل کے ادنیٰ قلی سے لیکر اسٹیشن ماسٹر تک کو بہ آوازِ آہستہ کوس رہے تھے ——— بس نہیں تھا ورنہ اس وقت سبھوں کی ایک طرف سے مرمت کر دیتا۔ کمبخت مذاق کی بھی حد کرتے تھے کہ گاڑیوں کو خواہ مخواہ اور لغو طول کے محض تفریحاً تین تین چار چار گھنٹے لیٹ فرما دیتے تھے ——— چنانچہ میں اسی پلیٹ فارم پر اکڑوں بیٹھا ہوا بیکار مباحث سے بچنے کی خاطر سوچنے پر مجبور ہو گیا — زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ اس کمبخت نے مجھے کان پکڑ کر یوں اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ گویا میں اس کا نوکر تھا۔ اور یہ کہ میں نے اس کا بہت بھاری قصور کیا تھا ——— گولی ماریئے ایسی بے تکلفی پر جناب۔ یہ بھی بھلا کوئی بے تکلفی میں بے تکلفی ہوئی کہ اچھے خاصے شریف انسان کی بھرے عام بے عزتی فرما دی۔ اس وقت میں نے صرف کھولنے ہی پر اکتفا کیا۔ اور آئندہ کوئی سخت قسم کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ ملک عہد کر کے سامان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ہمارے سامان قلی کے سر پر دیا اور ڈبوں کی جانب لپکے۔ مگر باوجود انتہائی کوششوں اور فخر الدین کی روایتی چرب زبانی کے کچھ نہیں بنا۔ اور ہم لوگ پلیٹ فارم کے گز ناپتے رہے۔ اودھ ترہٹ کی گاڑیوں پر خدا کی رحمت رہا کرتی ہے یا لعنت۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ یعنی میں اب آپ سے کیا بیان کروں آپ مبالغہ تصور فرمائیں گے۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ سوائے تل کے اور کسی چیز کے رکھنے کی گاڑی میں جگہ نہ تھی۔ جگہ تھی ضرور مگر یہ ڈبے ہم لوگوں کی رسائی سے ان معنوں میں باہر تھے کہ ہم لوگوں کی جیب تھرڈ کے محصول کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سمجھے اور ڈبوں سے کیا مطلب؟ تیسرے درجے کے الف سے لیکر ے تک کے ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ مگر فی الواقع بھرے ہوئے نہیں تھے تو کم از کم بھرے ہوئے ہونے کا پوز ضرور بنا رہے تھے ——— کمبختوں نے یہ کیا تھا کہ دروازہ پر بھیڑ لگا دی تھی۔ اور اندر کافی جگہ تھی (یہ عقدہ گھمبیر بعد میں کھلا) ان مسافروں کی یہ کارفرمائی کس جذبے کے تحت تھی میں کچھ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے اوروں کی طرح کبھی ماہرِ نفسیات ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

اسی جھنجھٹ میں چند منٹ گزر گئے۔ اور ہم لوگوں کی کوششوں کا ماحصل بس اتنا تھا کہ کچھ بک بک جھک جھک ہو چکی تھی۔ باقی رہا ٹرین میں قدم رکھنا تو اس سے ہم لوگ اتنی ہی دور تھے جتنی گاڑی کی آمد کے وقت تھے۔

حیرت یہ تھی کہ یہ ایک جنکشن تھا جہاں گاڑی بہت کچھ توقف

بھاگ جاتی تھی۔ مگر کوئی معمولی اسٹیشن ہوتا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے۔ سب اٹکے ہوتے۔ اور ہم دونوں سوائے آہوں کے دھوئیں چھوڑنے کے کچھ نہ کر پاتے۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ تھک کر ہم لوگوں نے ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیا ہوگا۔ مگر نہیں صاحب کیسا تھکنا اور کہاں کا کوششوں سے باز آنا۔ مستقل طور پر جو پلیٹ فارم کے ایک حصے سے لیکر انجن تک کے پلیٹ فارم کی پیمائش جاری رکھی۔

ایک ڈبہ کے پاس جب پہنچے تو کچھ عجیب نظارہ دیکھا۔ باہر کے مسافر اندر جانے کے لئے زور لگا رہے تھے اور اندر کا ایک مسافر انہیں گالیوں اور مکوں کے ذریعہ ایسا کرنے سے باز رکھ رہا تھا۔ یہ صاحب کوئی ۲۶ سے ۲۷ برس کے ہوں گے۔ کوئی ایسے تگڑے نہ تھے مگر تڑپ اور چمک اُن میں بجلی کی مانند تھی ـــــ جھٹ ادھر جاتے جھٹ ادھر آتے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں کبھی ایک کو گالی دی۔ ابھی دوسرے کو چانٹا رسید کیا۔ حد تو یہ کی کہ اُس نے ایک آدمی کو جو اندر آنے میں کچھ کامیاب ہوگیا تھا اس طرح لات ماری کہ وہ تلملا گیا مگر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

مصلحت بھی اس کی متقاضی تھی ـــــ لوگ اس کی حیوانیت پر دم بخود تھے۔ مگر واہ رے خود غرضی یا مرعوبیت کہ پھر بھی کوئی خاص قسم کا اثر طاری نہ ہوا ـــــ میرے تو بس کی بات نہ تھی ورنہ آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ اُسے ٹھوک دیتے۔ بدلے کے لئے میری طبیعت بے حد بے چین تھی۔ میں نے سوچا۔ انسان خود غرض ہوتا ہے تو کیسا وحشی ہو جاتا ہے اُسکی مثال میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ وہ کیسا حیوان نما انسان تھا۔ کہ اُسے اپنے خالق کا کچھ بھی خوف نہیں تھا۔ کیا وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔ جو اس سرکشی پر اُتر آیا تھا کیا وہ سمجھتا تھا کہ تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ لیکر اُس درجہ کا وہ پورا حقدار ہو گیا۔ اس قدر کہ دوسروں کو اُس میں قدم رکھنے دینے کا بھی روادار نہیں تھا۔ کیوں روادار ہوتا؟ "اقتدار" سی نے تو اُسکی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ اور اور وہ فرعون کی مانند ظلم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں سوچتا رہا اور سوچ سوچ کر میرا خون کھولتا رہا ـــــ اور کیا بتاؤں آپ سے مجھے یہ تمنا کس قدر پریشان کئے ہوئے تھی۔ کہ کسی عنوان اُسے گاڑی سے کھینچ اتاردوں۔ اور پھر اُسکی تا حیوشی اس جمہوریت کے دور میں کردوں ـــــ

میں اپنی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ فخرالدین نے مجھے ٹہوکا دیا دیکھا تو وہ ڈبے کے اندر جا گھسا تھا ـــــ دروازہ کے راستہ نہیں کھڑکی کے راستے۔ اور قلی سامان لیکر اندر گھسیڑ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ آناً فاناً میں اُس نے اس موذی کو کیونکر رام کر لیا۔ ؟ کھڑکی سے ہو کر گاڑی میں کودنا تو واقعی میرے لئے ایک مرحلہ سے کسی طور سے کم نہیں تھا مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اُسکی ڈانٹوں اور پھٹکاروں کے سایہ میں میں کسی طرح ڈبہ میں داخل ہوگیا۔ یہ فکر مجھے کھائی جاتی تھی کہ آخر معلوم تو ہو کہ وہ کیسے اندر گھسا۔ میں نے ڈبے میں داخل ہو کر اوسان درست کئے اور اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ باہر والے مسافروں کی زور آزمائی جاری تھی۔ اور اندر والوں کی بھی مدافعانہ بلکہ جارحانہ کارروائی شباب پر تھی۔ یہ درندہ صفت انسان ہنوز آدم زار کارروائی میں مشغول تھا ـــــ اور موقع موقع پر مغلظات اور مکوں کی بارش شروع کر دیتا تھا اس قدر کہ میں کھول اُٹھتا اور جی یہی چاہتا کہ اس کا اور اپنا سر ایک کرلوں۔

"یہ تو پکا شیطان معلوم ہوتا ہے" میں نے آہستہ سے فخرالدین کے کان میں کہا۔

"چپکے رہو ـــــ ورنہ نہایت عزت و آبرو سے نکالے جاؤ گے" اور اُس نے جلد ہی اپنی توجہ اُس خبیث کی طرف منعطف کرلی۔

گاڑی جلد ہی چل پڑی بہت سے کوشاں مسافر پائیدان پر لٹکے رہ گئے۔ اُن کی زبوں حالی دیکھکر مجھے بڑا ترس آیا۔ مگر ایسا ترس آنا ہی کس کام کا کہ میں اُن لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ خالی خولی ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں۔ گو اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں بے حس انسانوں کے درمیان بیٹھا ہوں۔ یعنی جناب حالت یہ تھی کہ اگر اندر کے مسافر چاہتے تو اُن باہر کے لٹکے والوں کو اندر جگہ مل جاتی۔ مگر تو بہ کیجئے وہ لوگ کیوں چاہنے لگے؟ چاہنا تو درکنار اُن لوگوں نے ان کی حالت پر غور فرمانا بھی گوارا نہیں کیا۔ بلکہ جو جہاں تھے وہاں جھک مارنے لگے۔ یعنی اونگھنے لگے۔ واہ رے انسان۔ میں نے سوچا کس قدر کھوکھلا ہے تو ہے تجھے صرف اپنی غرض سے غرض ہے۔ جبتک تجھے اس ڈبہ میں جگہ نہیں ملی تھی۔ تو کتنا پریشان تھا۔ مگر جونہی تو اس میں گھسا اپنی تکلیفوں کو بھول گیا۔ اُن کو بھول گیا جو تیری ہی طرح اندر آنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

آپ کہیں گے کہ آپ کو بڑی ہمدردی تھی تو کیوں نہیں اپنی نشست اُن میں سے کسی کے حوالہ کر دی۔ یقیناً مجھے کر دینا چاہیئے تھا اور میں شائد

کر بھی دیتا۔ مگر اس شیطان کا خوف دامن گیر تھا۔ اُس کا تو کم لیکن بدتمیز اور نامعقول ساتھی کی خفگی کا زیادہ خوف تھا۔ کمبخت جھوٹتے ہی کہتا ادھو! بڑے سخی داتا بنے ہیں۔ مگر سخاوت تو اس وقت دیکھی جاتی جبکہ اپنی کوششوں سے جگہ حاصل کی جاتی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ لوگوں کی موجودگی کی پرواہ کئے بنا میری تواضع کر دیتا۔

میں نے ایک اچٹتی نگاہ اُس شیطان پر ڈالی جو نہایت اطمینان سے کیلا کھانے میں مصروف تھا۔ اور اسکے چھلکوں کو کھڑکی کے راستے باہر پھینک رہا تھا۔ اُن کھڑکیوں سے جنکا سہارا لئے چند مسافر باہر کھڑے تھے —— آپ سے کیا عرض کروں کہ میں اُس پر کسقدر چڑا ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں اسے ختم کرنے کے بہتیرے منصوبے سوچتا اور مسترد کر دیتا اگر میں آنکھوں سے کھا سکتا تو اب تک اسے بغیر ڈکار لئے ہضم کر جاتا۔ اگر تصور ہی تصور میں اسے نگلنا ممکن ہوتا تو پتہ نہیں میں اسے کب کا چیر و بدن بنا چکا ہوتا۔ دل ہی دل میں اُسکی ہر ادا۔ ہر بات اور ہر انداز پر جل جل کر کباب ہوتا رہا۔ مگر وہ کمبخت کمال اطمینان سے کیلے کھانے اور سگریٹ پینے میں مشغول تھا۔

میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ کر اس بات کی دعائیں کرنے لگا کہ اے خدا کسی سخت انسان کو بھیج دے جو اسے اچھا سبق دے جس نے انسانوں کو ڈبے میں آنا محال کر دیا ہے۔ میں نے یہ دعا اسقدر رقت اور خشیت کے ساتھ کی تھی کہ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی اس سے انتقام لینے والا کوئی ایسا شخص آ نکلے گا جو اسے مار مار کر بھرتا بنا دے گا۔ [illegible] انتظار میں پتھرا گئیں۔ مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں آیا —— یہاں تک کہ مارے مایوسی کے میری آنکھیں تھک سی گئیں —— اور غنودگی سی طاری ہونے لگی کہ یکایک کھٹ سے دروازہ کھلا اور خاکی لباس میں ملبوس ایک ریلوے سپاہی اور ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوئے۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے۔ گھبرائی ہوئی نگاہ فخرالدین پر ڈالی تھا مگر اس کی آنکھوں میں سکون و طمانیت کی جھلک نمایاں تھی اس کی اندرونی کیفیت کا بہتر اندازہ مجھ میں نہ ہی کیا۔

یکایک ٹی ٹی ای کی نگاہیں ایک بہت بڑے گٹھڑ پر ٹھہر گئیں۔ یہ گٹھڑ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کپڑے کی گانٹھ ہے۔

اس نے پوچھا —— "یہ گانٹھ کس کی ہے ؟ ——"

مسافر جواب تک نیم بیداری کے عالم میں تھے۔ جاگ پڑے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول سے موافقت کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ٹی ٹی کی نگاہوں کے ساتھ پورے ڈبے کی سیر میں مشغول تھیں آخر وہ کون شخص تھا ؟

میری نظریں بے اختیار اُس درندہ صفت مسافر پر جا کر پڑیں جو حالات سے بے خبر اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا۔ اس شانِ بے نیازی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا گویا اسے اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں توبہ!

چند لمحے انتظار کے بعد ٹی ٹی نے دوا نعمدلرآولز میں اپنے سوال کو دہرایا۔

"اس گانٹھ کا مالک ہے ؟" مگر پھر کوئی جواب نہیں آیا۔

اب تو مارے غصہ کے ٹی ٹی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے اپنے سپاہی کو حکم دیا کہ گانٹھ کو نیچے اُتار لے —— یکایک اُس شیطان نما مسافر نے جنبش کی اور انتہائی شان اور رعونت سے بولا "کون ہے جو یہ اسباب میرا ہے"

"اس نوازش کا شکریہ —— اسے بک کرایا گیا ہے ؟" ٹی ٹی کے چہرہ پر طنز رقصاں تھا۔ سکوت اور مکمل سکوت۔

"میں جواب چاہتا ہوں"

"مگر میرے پاس ٹکٹ ہے" اُس نے پھر اسی رعونت سے جواب دیا۔ ہم سب دم بخود بیٹھے تھے۔ دیکھئے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

"میں معقول جواب چاہتا ہوں —— صاف بولو یہ دونوں گانٹھیں بک کرائی گئی ہیں ؟" ادھر جواب کیا رکھا تھا۔ خاموشی۔

ٹی ٹی نے آگے بڑھ کر گانٹھوں کو اپنی چھڑی کی نوک سے پیٹا۔ اور معنی خیز انداز سے سر ہلایا۔ پھر اس شیطان سے اس کا ٹکٹ لے لیا۔

"آپ الٰہ آباد سے آ رہے ہیں اور کسی نے چیک نہیں کیا آپ کو" اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"آپ اسکے پورے چارج دیدیجئے ورنہ ......"

"پورے چارج ؟" اس کے ہوش اُڑ گئے اُس کے چہرے سے پچھلی تمام رعونت و غضبناکی رفوچکر ہو چکی تھی۔ اب وہ بھیگی بلی سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔

"یہ تو شاید نہ ہو سکے گا" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"بہت خوب! تو پھر یہ دونوں گانٹھیں اتار لی جاتی ہیں سو شیرنگہ"

اور ڈبے کے ساتھ جو بیس بتی آگے بڑھی —

اسکے چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی — وہ شخص جو دوسروں کی پریشانی کو ابتک خاطر میں نہیں لایا تھا —

سپاہی نے ایک گانٹھ کو اُٹھانا چاہا — اور بولا "حضور یہ تو بڑا بھاری ہے"

اچھا ٹھہر جاؤ — گاڑی رکنے دو — ایک قلی کی مدد سے اتارنا —

اسکے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں — اس نے دکھ بھری نگاہوں سے پورے ڈبے کو دیکھا ——— جو ابھی چند لمحے پیشتر آگ برسانے میں مشغول تھیں — کتنی دکھی معلوم ہوتی تھیں — اس کا جسم آنے والی تکلیفوں کا تصور کرکے کانپ گیا — وہی ہاتھ پاؤں جو بیچارے اور ضرورت مند مسافروں کو نیچے ڈھکیلنے اور لات سے نوازنے میں مصروف تھے — اپنے سے زبردست کو دیکھتے ہی تھرتھرانے لگے — میں نے حقارت اور ترس کے ملے جلے احساسات سے دیکھا — یہ انسان جو اپنے سے ہر چھوٹے پر ظلم کرتا ہے اپنے سے ہر بڑے سے کس قدر گھبراتا ہے —

یہ ہے انسان کی طاقت — اس نے سوچا تھا کہ شاید میں اسی طرح لوگوں کو مارتا پیٹتا اپنی منزل کو پہنچ جاؤں گا — مگر اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہے جو ہر فرعون کے لئے موسیٰ پیدا کر دیتی ہے — جو ہر ظالم کا زور ختم کرکے رکھتی ہے — جسکے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں —

مجھے یقین تھا کہ ٹی ٹی اس سے پورا محصول وصول کرکے اس کا نشہ بہت کچھ ہرن کر دے گا — مگر ایسا نہیں ہوا — کیونکہ چند دلال معاملہ کو رفت گذشت کرنے کی کوشش میں مشغول ہوگئے — اور آخر رشوت کی ایک رقم نے اُس شیطان کو پورے محصول کی ادائیگی سے محفوظ رکھا —

"ہنہ! یہ سب کے سب درندے ہیں — کیا مسافر کیا ٹی ٹی"

اور میں نے حقارت کی ایک نگاہ سب پر ڈال کر کھڑکی سے باہر تھوک دیا —

گاڑی چل رہی تھی — اور مسافر ہنوز باہر پائیدانوں پر جھول رہے تھے —

ڈرامہ

پاگل

شبنم سبحانی

پہلا سین

محمود بیگ :- ایک عزت دار اور دولت و ثروت کے مالک زمیندار۔
جلیل اور جگ موہن :- مشہور وکلا۔
یعقوب :- ایک مفلس کسان۔
جج ——— سپاہی و شریف ۔ بھائی محمود بیگ ۔

(اجلاس میں ہر طرف سکوت چھایا ہے ۔ یعقوب مسلسل بیان دیتا چلا جا رہا ہے ۔ پیشکار اپنی برق رفتار قلموں کو صفحۂ قرطاس پر دوڑاتے چلے جا رہے ہیں۔ جج کورٹ کی عالیشان اور بلند کرسی پر بیٹھا ہوا بیان غور سے سن رہا ہے ۔ اسکی نگاہیں چشمے کے شیشوں کو پار کرتی ہوئی مدعی کے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔ پاس کی کرسیوں پر زمیندار محمود بیگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں جنکے سفید، باریک کپڑوں سے رئیسانہ شان ظاہر ہو رہی ہے۔ یعقوب کے غبار آلودہ گندے کپڑے الجھے ہوئے بال ننگے پاؤں اس کے افلاس کو عیاں کر رہے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بولتے بولتے رو پڑتا ہے ۔ آنسوؤں کے چند قطرے اسکی بڑی بڑی آنکھوں سے نکل پڑتے ہیں جنہیں وہ فوراً دامن سے خشک کر لیتا ہے ۔)

یعقوب :- میرا مفلس باپ انکی زمین میں آباد تھا ۔ ان کا کاشتکار تھا بلکہ یہ سمجھیے کہ ان کا نوکر تھا ۔ اپنا خون پسینہ ایک کر کے انکے تمام احکام کی تعمیل کرتا تھا اُنکے اشاروں پر ناچتا تھا ۔ یہ میرے محترم باپ کو جانور سے بھی بدتر سمجھتے تھے اسلئے کہ وہ انکا اسامی تھا انکے غریب تھا ۔ یہ روپیہ پیسے اقتدار کے مالک اسے ذلیل نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔

ایک دن جب اس ظالم زمیندار کے یہاں شادی تھی اتفاق دیکھئے کہ میری غریب و مفلس ماں کی آخری سانسیں چل رہی تھیں اس کی حالت خراب تھی ۔ باپ اسکی تیمارداری میں لگا ہوا تھا ۔ اسکے دن آخری لمحات میں اسکے سرہانے بیٹھا حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا ۔ زمیندار کا آدمی آیا ۔ تحکمانہ انداز میں بولا "چلتے ہو یا نہیں ! ایسے کام نہیں چلے گا ایسے ایسے موقعوں پہ اگر بابو کے یہاں حاضری نہ دو گے تو زندہ نہ رہنے پاؤ گے ۔ ایسا موقع روز نہیں آتا یہ نمک حرامی اچھی نہیں" "سرکار میں حاضر ہوں ۔ مجھے خود اس بات کی چنتا ہے کہ بابو کی اکلوتی لڑکی کی شادی ہے ۔" باپ کانپتا ہوا بولا "مگر آہ اس دکھیاری کے ان آخری لمحات میں بھی میں کیا کام نہ آسکوں گا ۔ سرکار! بابو سے میری مجبوری بیان کر دینا" باپ ماں کی طرف دیکھ کر گڑگڑاتا ہوا بولا ۔ وہ چلا گیا ۔ ابھی کچھ وقت نہ گذرا تھا کہ پھر وہی سپاہی آتا ہوا نمودار ہوا ۔ اسوقت ماں کی حالت اور خراب ہو گئی تھی ۔ باپ نے اس بار بھی بہت بہت منت سماجت کی اور نہ گیا ۔ اسپر یہ آئے (زمیندار کی طرف اشارہ کر کے) باپ کو خوب ڈانٹا اور اسکی معذوری کے قطع نظر زبردستی اسے لے گئے ۔ غم سے نڈھال بوڑھا باپ کچھ کام نہ کر سکا ۔ چپکے سے واپس لوٹ آیا ۔ دوسرے دن آہ (آنکھوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے) جبکہ میری ماں مر چکی تھی میرے مکان پر مصیبت کے بادل منڈلا رہے تھے ۔ یہ آئے اور سزا دینے لگے ۔ پہلے سے کچھ کشیدگی چل ہی رہی تھی رات کی نافرمانی کی بنا پر زمیندار کے جوتے باپ کے سر پر برسنے لگے ۔ باپ کو بے گھر کر دیا گیا ۔ کھیت چھین لیے گئے مظلوم باپ نے انکی زمین سے اجڑ کر دوسری جگہ ڈیرا ڈالا ۔ کوئی وسائل و ذرائع تھے نہیں ۔ جس کے ذریعہ کھیتوں کو واپس لے لیتا ۔ مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگا ۔ میں اسوقت مالی پور میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا ۔ یہ احوال معلوم ہوئے ۔ میں واپس لوٹ آنے کی تیاری کرنے لگا ۔

اسی درمیان میں ایک دن زمیندار کے غلے سے بھرے گودام میں آگ لگ گئی سارا غلہ جل گیا ۔ یہ شاید اسے انھیں پاپوں کا بدلہ ملا تھا ۔ یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ کس نے آگ لگائی ۔ مگر اسکی مشتبہ نگاہیں باپ کی جانب اٹھیں ۔ دوسرے دن حاسدوں اور چاپلوسوں نے جن میرے باپ کی پرانی دشمنی تھی جا کر یقین دلایا کہ یہ کام باپ ہی کا ہو سکتا ہے ۔

اب کیا تھا۔ یہ آتے باپ شدت کے بخار میں مبتلا تھا۔ غضب مارا۔ سارا سامان اٹھا کر لے گئے۔ چھپر میں آگ لگا دی۔ دوسرے دن جب باپ جلے گھر کے کنارے زمین پر بے ہوش پڑا تھا میں آیا (آنسو خشک کرتے ہوئے) میں نے باپ کو ہوش میں لانے کی فکر کی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سارا واقعہ مختصراً بیان کیا۔ اسکے آخری کلمے یہ تھے جو کہ اسنے اپنی سفید ریش پہ آنسوؤں کے چند قطرے لڑھکاتے ہوئے کہا تھا "بیٹا! میری آخری دعائیں تیرے ساتھ۔ خدا تجھے حفاظت سے رکھے۔ اگر زندہ رہنا تو ان ظالموں سے ضرور بدلہ لینا" اسکے بعد اسنے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ جج۔ یہ ہے میرا بیان۔ بس انصاف چاہتا ہوں۔ انصاف۔ ان درندوں سے بدلہ۔ میں اپنا کھیت واپس لینا چاہتا ہوں" (بیان ختم ہوا۔ پیشکاروں نے انگڑائیاں لیتے ہوئے قلم میز پر رکھ دیا۔)

جج:۔ اسکا فیصلہ آئندہ دوشنبہ کو سنایا جائے گا (یہ کہہ کر وہ اپنے بھاری جوتوں کو ٹپکتا اجلاس سے باہر چلا جاتا ہے۔ کورٹ برخاست ہو جاتی ہے۔ تمام عملے اور مدعین باہر چلے جاتے ہیں)

دوسرا سین

(پانچ بج چکے ہیں۔ گاؤں میں لوگ کھیتوں سے واپس آ رہے ہیں۔ زمیندار محمود بیگ کے بلند اور وسیع مکان کے سامنے ایک وسیع اور صاف صحن میں درجنوں کرسیاں ادھر ادھر پڑی ہیں۔ کئی چارپائیاں بچھی ہیں۔ بیچ میں ایک پلنگ پر وہ بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہیں۔ ایک طرف دوری پر درجنوں بیل بندھے ہیں خدمتگار ادھر سے ادھر جا رہے ہیں۔ دوسری کرسیوں پر شہر کے مشہور وکلا جلیل اور جگ موہن بیٹھے ہوئے ہیں۔ نو وار دان کے سامنے میز پر چائے کے کپ اور پیالیاں کی تشتریاں رکھی ہوئی ہیں۔

جلیل:۔ (رومال سے منہ پونچھتے ہوئے) جناب! معاملہ کوئی ایسا سنگین نہیں۔ آپ مارنے کے الزام سے بری تو ہو ہی جائیں گے مگر کھیت اور مکان دینا پڑے گا۔

محمود بیگ:۔ مگر وکیل صاحب میں آپکا ممنون احسان ہوں گا اگر آپ کوئی ترکیب مقدمے کے خارج کرانے کی بتا دیں۔

جگ موہن:۔ یہ تو بڑا آسان ہے جج کو خوش کرنے کی ضرورت ہے۔

محمود بیگ:۔ کیسے؟

جگ موہن:۔ کچھ تحفے تحائف اور روپیہ بھیجکر آپ بڑی آسانی سے اپنا کام بنا سکتے ہیں۔

محمود:۔ خیر یہ تو بڑا آسان کام ہے کل ہی انشاء اللہ ہو جائے گا۔

جلیل:۔ آپ ہم لوگوں سے بالکل مطمئن رہیئے ہمارا جو کام ہے اسے ہم پورا کرینگے خیر و خوبی کے ساتھ۔

محمود:۔ یہ جناب کا احسان ہے جسکا میں ہزار ہزار شکریہ ادا کرتا ہوں امید ہے معاف فرمائیں گے (حقہ کا ایک کش کھینچکر) ذرا ٹھہریئے ابھی آیا۔ (یہ کہہ کر محمود بیگ اندرون خانہ میں چلے جاتے ہیں وکلا۔ اپنی اپنی شیروانیاں پہن کر تیار ہونے لگتے ہیں جو کہ آتے وقت اتار کر رکھ دی تھیں اتنے میں محمود بیگ نمودار ہوتے ہیں)

جلیل:۔ ہاں جناب تو اب چل رہے ہیں جناب کی یاد فرمائی کا شکریہ

محمود:۔ (سو روپے کے دو نوٹ دیتے ہوئے) یہ لیجئے پھر آئندہ خدمت کروں گا ذرا خیال رکھیئے گا (وکلا۔ سائکل اٹھا کر چلے جاتے ہیں محمود بیگ اسی چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینا شروع کر دیتے ہیں

تیسرا سین

(آٹھ بج رہے ہیں آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں ہلکی ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اسوقت کی لطیف خنکی ہر شخص کے دل و دماغ کو تازگی بخش رہی ہے جج صاحب اپنی کوٹھی کے سامنے والے برانڈے میں جو کہ گارڈن سے متصل ہے ایک آرام کرسی پر چادر اوڑھے دراز ہیں سامنے رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر اخبار پائنیر کے منتشر اوراق ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ جن پر ایک جگہ موٹے حرفوں سے لکھا ہوا ہے "گورنمنٹ رشوت خور ملازموں کو سخت سزائیں دیگی"۔ جج صاحب ایک ہاتھ میں چائے کی گرم گرم پیالی اور دوسرے ہاتھ میں قلم لئے پیڈ پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہے کبھی کبھی کوئی لڑکا یا نوکر مؤدبانہ انداز سے ادھر سے گذر جاتا ہے۔ اتنے میں سامنے کے پھاٹک کو پار کر کے چار مزدور اور ایک وضع و قطع سے شریف شخص چھاتا دیئے آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مزدوروں کے سر پر سفید کپڑوں میں بندھے ہوئے ٹوکرے ہیں۔ گارڈن کو پار کرتے ہوئے سب برانڈے میں آکر رک جاتے ہیں۔ مزدور ٹوکرے نیچے رکھ بیٹھ جاتے ہیں۔ چھاتا والے شخص آگے بڑھ کر جج سے قریب آتے ہیں۔)

نو وارد:۔ آداب عرض ہے۔

نج:۔ (میز پہ چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے) آداب عرض۔
تشریف رکھئے جناب کا اسم گرامی کیا ہے۔ کہاں سے تشریف لارہے ہیں؟
نووارد:۔ (ایک کرسی پہ بیٹھتے ہوئے) میرا نام شریف ہے۔ میں زمیندار محمود بیگ کا چھوٹا بھائی ہوں (جیب سے ایک رقعہ نکالتے ہوئے) بھائی صاحب نے مجھے آپکی خدمت میں ان تحائف کے ساتھ بھیجا ہے اور لیجئے یہ رقعہ بھی دیا ہے۔

نج:۔ (رقعہ پڑھ کر) اوہ! اچھا سمجھا۔ محمود بیگ۔

شریف:۔ (روپیوں کی دو گڈیاں میز پہ رکھتے ہوئے) اور یہ پانچسو روپے بھی آپکی نذر کے لئے دیئے ہیں۔

نج:۔ (چائے کی ایک پیالی پیش کرتے ہوئے) یہ پیجئے۔ زمیندار سے کہدینا بالکل مطمئن رہیں۔

(سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر محمود بیگ کے نام ایک خط لکھتا ہے)

لو اسے اُنھیں دیدینا۔

شریف:۔ (خط لیتے ہوئے) بھائی صاحب نے فرمایا ہے کہ جج صاحب سے کہدینا کہ ذرا خیال رکھیں گے عین نوازش ہوگی۔

نج:۔ اوہ۔ تم کہہ دینا گھبرائیں نہیں۔ میں نے خط میں لکھ دیا ہے

(شریف چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

نج۔ (ہمدردانہ لہجہ میں) آداب عرض کہدینا بالکل اطمینان رکھیں گے۔

(مزدور اور شریف چلے جاتے ہیں۔ نج صاحب کے نوکران بڑے بڑے ٹوکروں کو اندر لے جاتے ہیں۔ نج صاحب چشمہ اتار کر روپیوں کی گڈی گننے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ سیاہی بڑھ جاتی ہے پانی زوروں سے برسنے لگتا ہے)

چوتھا سین

(دوشنبہ کا دن ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ آج اجلاس میں غیر معمولی سکوت پھیلا ہوا ہے۔ نج اپنی عالیشان کرسی پر اسی آب و تاب سے دراز ہے۔ پیشکار حضرات کاغذ سنبھالے بیٹھے ہیں۔ وکلا، متعدد کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ محمود بیگ اپنے چہروں پر امید و خوشی کی جھلکیاں لئے ہوئے پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں۔ غریب یعقوب آج بھی انھیں چیتھڑوں میں ملبوس ایک طرف کھڑا ہے جن میں ایک ہفتہ پہلے وہ دکھائی پڑ رہا تھا اسکی نظروں میں اُمید کی جھلکیاں نظر آرہی ہیں۔ وہ دانت پیستا ہوا زمیندار کی جانب گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ پورا اجلاس منتظر نگاہوں سے نج کو

دیکھ رہا ہے۔ یکایک نج قلم رکھ دیتا ہے۔ اور کھڑا ہوجاتا ہے۔ اسکے ہاتھ میں سرکاری مثل ہے جسے وہ پڑھتا ہے)

نج:۔ "اس مقدمے کی سماعت پر غور کرنے سے اور تمام بیانوں سے یہ واضح ہوگیا کہ مدعی یعقوب جو ایک نیچی ذات سے متعلق ہے۔ ان شرفا پہ بیجا الزامات تراشے ہیں۔ اسکی ساری گواہیاں دلیلیں مصنوعی اور انھیں رک دینے کے لئے ہوئی ہیں۔ اسکا باپ اپنے مہلک مرض سے مرا ہے کسی کے چوٹ پہنچانے سے نہیں۔ کھیت اور کچھ بھی اس کا نہیں۔ سب زمیندار کے ہیں۔ محمود بیگ اس معاملے سے ایک بری کئے جاتے ہیں۔ البتہ یعقوب کو بیجا الزام لگا کر دعویٰ کرنے اور عزت پر دھبہ لگانے کے جرم میں سہما کی سخت سزا دی جاتی ہے"

نج کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ محمود بیگ اچھل پڑے انکا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے۔ یعقوب مخمور نگاہوں سے سارے اجلاس کو دیکھتا ہے۔ محمود بیگ باہر آتے ہیں۔ چاروں طرف سے مبارکباد کی صدائیں سنائی پڑتی ہیں عملے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ وہ ہر صدائے مبارک پر روپیوں کی بارش کرتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہوجاتے ہیں مفلس یعقوب سپاہیوں کے آہنی پنجوں میں جکڑا اٹھتا ہے۔ اسے جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ یکایک غمگین یعقوب فرط خوشی سے اُچھل پڑتا ہے جیل کی باؤنڈری میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مجنونانہ انداز میں کہنے لگتا ہے۔

آج اس دُنیاوی عدالت کے اجلاس میں وہ بری ہوگیا اور اُلٹا میں ہی مجرم ٹھہرا لیکن ابھی مجھے ایک اور اجلاس میں انصاف کے لئے دعویٰ کرنا ہے۔ وہاں یہ بے انصافی نہ ہوگی یہ خونخوار درندے اس نج کے فیصلے کے مطابق آگ کے سمندر میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ اور یہ غدار نج بھی قاہ قاہ قاہا۔

جیل کی بلند دیواروں دپیڑ کی شاخوں و آسمان پر معلق بادلوں اور فضا میں پرواز کرنے والے طائروں نے کہا "بیشک بیشک بیشک"، سپاہیوں نے کہا "پاگل پاگل پاگل"۔

حقی حزیں ایم۔ اے

کبھی سے یُوں شبِ غم میں خطاب ہوتا ہے
سوال آپ ہی اپنا جواب ہوتا ہے

جو سوچیے تو وہی لطفِ خاص ہے اُن کا
کبھی کبھی جو بشکل عتاب ہوتا ہے

کوئی سمجھ نہ سکے رازِ ربطِ دل سرِ بزم
اِس اہتمام سے اب اجتناب ہوتا ہے

جھکی ہی پڑتی ہیں کچھ سوچ کر جو وہ نظریں
مرے خیال سے بھی اب حجاب ہوتا ہے

نگاہِ ناز کی نازک کلامیوں کو نہ پُوچھ
نگاہِ شوق سے اکثر خطاب ہوتا ہے

نہ دے فریبِ سکوں اب کوئی حزیں کہ مجھے
سکون کے نام سے بھی اضطراب ہوتا ہے

حفیظ میرٹھی

ہائے کیا شئے ہے وہ نظر بھی
وجہِ سکوں بھی فتنہ گر بھی

چاہے رُک جا، چاہے بڑھ جا
منزل ہے اِک راہ گذر بھی

راہِ وفا کا ہر ہر کانٹا
راحتِ دل بھی جانِ جگر بھی

مجبوروں کو ہنسنا ہوگا
درد سے بے قابُو ہوکر بھی

عشق نہ جب تک رُوح رواں ہو
دِل بھی ہے بیکار نظر بھی

عقل کے اِحسانات مُسلّم
عقل ہے لیکن غارت گر بھی

اُف کتنی بے درد ہے دُنیا
ہنستی ہے چیخیں سُن کر بھی

وہ دیکھو وہ حفیظ آتا ہے
دیوانہ بھی دیوانہ گر بھی

شمیل احمد نذیری

جنوں کی گُم رہی کو راہِ جاناں کون کہتا ہے
خرد کی قید کو جیب و گریباں کون کہتا ہے

سرِ محفل تو سب کرتے ہیں حُسن و عشق کی باتیں
سرِ مقتل مگر یہ حرفِ ارزاں کون کہتا ہے

عیاں ہے لالہ و گُل سے نمایاں ماہ و انجم سے
تمہارے حُسن کو بھی حُسنِ پنہاں کون کہتا ہے

زمانے نے اسی کی چھاؤں میں راہِ وفا پائی
تمہارے گیسوؤں کو زلفِ پیچاں کون کہتا ہے

سحر میں بھی ہمارے ہاتھ کچھ آیا تو رسوائی
بڑی پُر درد تھی شامِ غریباں کون کہتا ہے

نہ مے نوشی نہ بے ہوشی نہ دعوئ ہمہ دانی
سہیلِ خشک کو آخر غزل خواں کون کہتا ہے

شاکر تسلیم

محوِ حیرت ہوں اے نازشِ انجمن
اتنی آرائشوں پر یہ ویرانہ پن
جیسے پہلے کوئی واسطہ ہی نہ تھا
مجھ سے برتو نہ اس درجہ بیگانہ پن
تیرے حُسنِ کرم تک مری زندگی
اور مری زندگی تک ترا بانکپن
بے سبب تو نہیں ان کی بے مہریاں
کوئی لغزش ہمیں سے ہوئی غالباً
آج تک مسکرانے کی ہمّت نہیں
ہم پہ گذرا ہے وہ دَورِ ہمّت شکن
یوں جھجکتے ہیں ہر گام پر رہنما
جیسے مُڑ مُڑ کے دیکھے کوئی راہزن
آج شاکر وہ غنچے بھی مُرجھا گئے
خود بہاریں رہیں جن پہ سایہ فگن

کیفی امروہوی

تابِ نظارہ کہاں بچشمِ پریشاں نظری!
حُسن ہے محوِ خود آرائی و جلوہ نگری

ہے وہ تفسیر کشِ زمزمہ سازِ حیات
نالۂ نیم شبی ہو کہ فغانِ سحری

ہمنشیں نعمتِ اخلاص کہاں سے پاؤں
رونقِ بزم ہے جب کم نگہی، کج نظری

شکوۂ فتنۂ افلاک ہے یوں زیرِ لبی
بن گئی عادتِ آدم بھی تو اب فتنہ گری

فرد جب خود ہی اسیرِ غمِ دوراں ہو ندیم!
کیا کرے پرسشِ احوالِ پریشاں نظری

ہائے کیا چیز ہے کیفی یہ غریب الوطنی
ہمنوا بھی تو نہیں کوئی بجز بے خبری

طالب چاندپوری

دل و نگاہ میں وسعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
تخیّلات میں رفعت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار ضبطِ مسلسل کی خو سہی لیکن
زباں پہ شکرِ مشیّت نہیں تو کچھ بھی نہیں

کسی کو زعمِ خودی ہو کہ پاسِ خودداری
رگوں میں جوشِ حمیّت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار صاحبِ ثروت ہوا کرے کوئی
غمِ حیات کی دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر ایک قلب سہی آشنائے درد مگر
وہ درد ۔ دردِ محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظر نواز نظاروں کو ڈھونڈنے والے
نظر میں حسنِ حقیقت نہیں تو کچھ بھی نہیں

مری نگاہ میں طالب وہ دوست ہو کہ عزیز
شریکِ رنج و مصیبت نہیں تو کچھ بھی نہیں

محسن انصاری

شیشہ خالی ہو اپری ہے کہاں
رات اندھیری ہے چاندنی ہے کہاں
روشنی کو ترستی ہے دُنیا
روشنی، آہ روشنی ہے کہاں
دُھوپ بن کر جو پھیلی ہو ہر سمت
باغِ عالم میں وہ خوشی ہے کہاں
دِل کی گہرائیوں میں ڈوب کے دیکھ
دہر کی وہ ہماہمی ہے کہاں
پُوچھنے والے اپنے نفس سے پُوچھ
حاصلِ عمر بندگی ہے کہاں
آدمیّت کا نام ہے باقی
آدمیّت کی برتری ہے کہاں
آشیانوں کی اپنے خیر مناؤ
اس سے کیا برق کوندتی ہے کہاں
نغمہ و شعر سی متاعِ لطیف
پُوچھیئے مت کہ بک گئی ہے کہاں
نظم و آئینِ نو میں اے محسن
ڈھونڈتا ہوں کہ آدمی ہے کہاں

تاج الدین اورنگ آبادی

تصوّر میں ہے پوشیدہ حقیقت کا عیاں ہونا
تغیرِ صورتِ معنیٰ نشاں کا بے نشاں ہونا
جہاں کا ہر عمل رکھتا ہے پوشیدہ جزا اپنی
وہاں ممکن ہے ہر ذرّہ کا بڑھ کر آسماں ہونا
جو اپنی زندگی کو وقف کر دے عیش کی خاطر
نہیں مرنے سے کم دُنیا میں اس کا نیم جاں ہونا
سوالِ غیرتِ قومی کو حل کرنا ہے عالم میں
ضروری ہوگیا ہے کچھ ہمارا امتحاں ہونا
بہادر ہے وہی دُنیا میں جو ہے حق کا شیدائی
اسی کے حق میں ہے تسخیرِ آخر آسماں ہونا
خرد مندی رسائی کیلئے کافی نہیں ہمدم
کہ ہے اعمال پر موقوف سب کچھ این و آں ہونا
یہاں پر تاجِ شاہی اور گدائی بے حقیقت ہے
مسلّم شوخیٔ فطرت کا تقدیری نشاں ہونا

انور صدیقی

ہمارا تنقیدی نقطۂ نظر ـــــ اور تنقید نمبر

"تنقید نمبر" پر باقاعدہ تبصرے سے پہلے میں اُردو ادب میں تنقید نگاری کے مختلف مکاتیب فکر کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دینی چاہتا ہوں۔ تنقید نگاری کا فن زندگی کے پھیلاؤ کے ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ سائنسی انکشافات نے اسے شعور کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اب تنقید نگاری چند بندھے ٹکے جامد اور غیر متغیر عروضی اصولوں کے گرد نہیں گھومتی۔ اب وہ حقیقت کے بحر بیکراں میں غوطہ زنی کرتی ہے اور زندگی کے صدف سے اعلیٰ قدروں کے گہر ہائے خوش آب نکالتی ہے۔ تنقید نگاری پہلے بڑی حد تک عینی بنیادوں پر تھی اب وہ زندگی، سماج اور اسکے عوامل اور محرکات پر غور کرتی ہے، ان کا تجزیہ کرتی ہے خیر و شر کے عناصر کو الگ کر کے خیر کے عناصر کو چمکاتی اور جلا دیتی ہے۔ ہمارے ادب میں تنقید نگاری کی ابتداء تو بہت پہلے ہو گئی تھی مگر باقاعدہ کوشش مولانا حالی سے شروع ہوئی۔ حالی نے سب سے پہلے تنقید نگاری کے اصولوں کو مرتب کرنے کی کوشش کی اور جملہ اصناف سخن کی افادیت پر غور کیا۔ ان کی تنقید نگاری میں تعمیری قدریں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ملتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے ہر جگہ ایک واضح اخلاقی نقطۂ نظر پر زور دیا ہے۔ وہ غزل سے اسوجہ سے ناراض تھے، کہ وہ اخلاقی اقدار سے گریز کی حامل تھی۔ وہ بھی میتھو آرنالڈ (Mattew Arnold) کی طرح اخلاق سے بغاوت کو زندگی سے بغاوت سمجھتے تھے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ حالی کے پیش نظر تنقید نگاری کا وہ تصور تھا جو ادب کے ذریعہ سماج کی تشکیل جدید میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ حالی سے عملی اور نظریاتی دونوں تنقید کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ حالی کے بعد تنقید نگاری کی شاہراہ پر بہت سے کارواں حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں مختلف مکاتیب فکر کے لوگ شامل تھے ـــــ کچھ دنوں تک حالی کی انسان پسندی کے چراغ جلتے رہے مگر بعد میں اشتراکی تحریک کی مقبولیت کی وجہ سے ہندوستان میں تنقید کا ایک نیا نقطۂ نظر درآمد کیا گیا۔ پہلے تو اس نظریئے کے نقوش بہت دھندلے تھے مگر بعد میں گورکی کے خطبوں، کاڈویل، طامسن اور لوئی ناکس کی تحریروں سے مارکسی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوئی۔ پہلے پہل تو ہمارے ادب میں مارکسی تنقید شدید جذباتیت کی شکار رہی اور بعض ناقدین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اشتراکی اسٹیٹ کے وجود میں آنے کے بعد ادب کے پچھلے سرمائے کو نذر آتش کر دیا جائے گا۔ اس قسم کی جذباتی انتہا پسندی کی مثالیں ہمیں اختر حسین رائے پوری کی کتاب "ادب اور انقلاب" میں مل سکتی ہیں۔ مارکسی فلسفہ فی الحقیقت صرف ایک معاشی نظریہ ہے جسے لوگ کھینچ تان کر نہ صرف ادب بلکہ پوری زندگی پر حاوی کر دینا چاہتے ہیں۔ مارکسی تنقید مارکسی فلسفہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ادب بھی ذرائع پیداوار میں تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور بقول انگلز کے ہر دور کا ادب اپنے دور کے انقلاب کے کسی نہ کسی پہلو کا ترجمان ضرور ہوتا ہے۔ ادب میں طبقاتی شعور پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اسے بڑا سائنٹفک نظریہ بتایا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ فاضل نقاد کی نظریں مارکسی فلسفہ کے تناقضات (Inconsistencies) کی طرف نہ گئیں۔ مارکسی ناقدین جب پرانے شعراء کے یہاں طبقاتی اور سماجی شعور دیکھنے لگتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ادیب کی زندگی پر مارکسیت کا فلسفہ لاد رہے ہیں اس سلسلے میں احتشام حسین کا مقالہ "غالب کا تفکر" دیکھنے کی چیز ہے مارکسی تنقید ادب کی بعض ابدی قدروں کو نہیں مانتی۔ اسکے نزدیک ابدیت ایک فریب اور ابدیت کی باتیں محض طلسم وہم و گمان ہیں۔ ادب میں خارجی حقیقت تو بدل سکتی ہے مگر داخلی حقیقت اپنی جگہ جوں کی توں رہتی ہے۔ اس خارجی تبدیلی کو مارکسی نقاد اپنی سطح بینی کی وجہ سے مکمل اور بھرپور تبدیلی سمجھ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا حال ان بوڑھوں کا ہوتا ہے جو اپنے ماضی کی ہر تبدیلی کو بہتر تبدیلی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مارکسی تنقید سماج اور کائنات کے محض خارجی مظاہر سے حقیقت کا استنباط کرتی ہے۔ اسے زندگی اور

کائنات کی داخلی ماہیت اور حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ اس حقیقت کے ادراک کے لئے وحی الٰہی کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ میں مارکسی تنقید کا تفصیلی جائزہ لوں اسکے لئے ایک الگ سے مقالے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں صرف چند دیگر تنقیدی نظریوں پر اجمالی اشارے کرنے کے بعد "معیار" کے تنقید نمبر پر تبصرہ کروں گا اور اسی سلسلے میں تعمیر پسند تنقید کا بھی تذکرہ کروں گا۔

مارکسی تنقید کے بعد ہماری نظریں امریکی ناقدین کے دو گروہوں کی طرف جاتی ہیں ایک گروہ کی قیادت مشہور نقاد اسپنگارن (J.E. SPINGARN) کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے گروہ کا سرخیل (Lewis E Gates) ہے۔ اسپگارن کے زیر اثر ادب میں (Expressionism) یعنی اظہاریت کے اسکول کو فروغ ہوا۔ اس نے اپنی تنقید کو "تخلیقی تنقید" کا نام دیا ہے۔ اظہاریت کے مکتبۂ فکر کا خیال ہے کہ تنقید کا کام صرف ان جذبات کی تکمیل ہے جو فنکار پر تخلیق کرتے ہوئے طاری ہوئے تھے نقاد کا کام فنکار کے وجدان کی تہوں میں اتر کر اسکے تخلیقی جذبات کو خود محسوس کرنا ہے اور دوسروں کو محسوس کرانا ہے۔ اسطرح سے نقاد کو خود فن کار کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ تو اظہاریت کا مکتبۂ فکر ہوا —— اب میں اثریت کے اسکول کی طرف آتا ہوں جسکا خیال ہے کہ تنقید بھی فن کی طرح ایک تخلیق ہے۔ تنقید کے یہ دونوں نظریئے اپنے اندر صالح اقدار کی اہمیت کے امکانات نہیں رکھتے۔ ان اسکولوں کو خیر و شر میں امتیاز کرنا نہیں آتا۔ اظہاریت کا اسکول تو بالکل ہی "تنقیدی فراریت" کی مثال ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ایک تخلیق عیاشی کے متعلق ہے اور اس پر نقاد تنقید کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی عیاشی کے قریب ہونا پڑے گا۔ تنقید کے یہ دونوں نظریئے بنیادی طور پر جمالیاتی ہیں اور انھیں زندگی کی صالح قدروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے یہ مکاتیب تنقید نگاری میں عینیت پسندی سے قریب ہیں۔

تنقید نگاری میں لاتعینیت کا بھی ایک مکتبۂ فکر ہے۔ اس طرز فکر کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ ادب کبھی بھی کسی نظریہ اور کسی نظام حیات کا پابند نہیں ہوتا۔ کسی نظام حیات سے وابستگی تنقید نگاری اور ادب دونوں کی موت ہے۔ اس طرز فکر کے لوگ پورے یورپ اور ایشیا میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ شعوری طور پر یہ نقاد ایک دوسرے سے قریب نہیں ہیں تنقید کے اس انسان دشمن نظریئے کے ماننے والوں میں سارترے (SARTRE) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ ادیب کو اپنے درد کے لئے نہ لکھنا چاہئے اور نہ انسان کے غم کو گلے لگانا چاہئے۔ تنقید نگاری کا یہ اسکول ہمارے ملک میں بھی اپنے کچھ نمائندے رکھتا ہے جن میں نیاز فتحپوری کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔ تنقید نگاری کا یہ اسکول غالباً ادب کو مقصود بالذات ہی سمجھتا ہے اور زندگی اور سماج کے متعلق کچھ نہیں سوچتا۔ ادب میں واضح نظام حیات کی جلوہ گری دیکھنا یہ مکتبۂ فکر اپنی توہین سمجھتا ہے۔

نفسیاتی تنقید اس دور میں فرائڈ WILLIAM JAMES اور HAVELOCK ELLIS وغیرہ کے انکشافات کے زیر اثر پروان چڑھی یہ مکتبۂ فکر شعور اور لاشعور کے متعلق یہ نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ فرائڈ کے نظریہ کے مطابق شعور کے مقابلے میں لاشعور ایک بیکراں وسعت کا حامل ہے۔ اپنی اس دلیل کے لئے اس نے ایک تودۂ یخ کی مثال پیش کی ہے جو سطح آب پر تیر رہا ہے اور اسکا ⅛ حصہ پانی کے اندر ہے اور بقیہ حصہ پانی کے باہر ہے پانی کے اندر والا حصہ لاشعور ہے اور باہر والا حصہ شعور۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نفسیاتی نقطۂ نظر میں لاشعور کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نفسیاتی تنقید کے اصول کی رو سے نقاد کا کام صرف فنکار کے لاشعور کا تجزیہ کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اسکے اندر کون کون سے محرکات کارفرما ہیں۔ ہمارے ادب میں بھی اس طرز تنقید کی ابتدا ہو چکی ہے۔ میراجی، راشد اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے اس کی ترقی میں کافی حصہ لیا ہے۔ تنقید نگاری کا یہ اسکول نقاد سے قوت فیصلہ چھین لیتا ہے اور اسے فنکار کے لاشعور کا پابند بنا دیتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس طرز تنقید کی رُو سے فنکار کے متعلق بہت سی رائیں ہو سکتی ہیں۔ تحلیل نفسی کی یہ ستم ظریفی ہی ہے جس کی وجہ سے راشد نے فیض احمد فیض کے کلام میں (Oedipus complex) دیکھا جنسی جذبات چونکہ انسان کے حاوی جذبات (Ruling passions) ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ نظریہ ہر جگہ جنسیت کی جلوہ گری دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظریہ ہیئت اجتماعی کے لئے انتہائی خطرناک ہے فنکار کے ذہن کا تجزیہ ضروری ہے مگر فنکار کی تخلیقات کی روشنی میں ورنہ اسطرح

کے مرموم سنسنی خیر انکشافات جو یہ طرز تنقید کر رہا ہے وہ اسے خود ہی لے ڈوبے گا۔ تنقید نگاری میں محض فنکار کے ذہن کا ہی مطالعہ کافی نہیں ہے بلکہ سماجی تحرکات کا بھی مطالعہ ہونا چاہیئے جس کی طرف سے نفسیاتی تنقید چشم پوشی برت رہی ہے۔ نفسیاتی تنقید کا بہت بڑا حصہ امراض جنس کے مریضوں کا روزنامچہ بنکر رہ گیا ہے۔ یہ نظریہ اگر اخلاقی اقدار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ انساں کے اندرون کا بھی مطالعہ کرے تو اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اسلئے کہ انسان اپنی فطرت پر صالح پیدا کیا گیا ہے۔ تنقید کے اس تحلیلی نظریہ کو خیر و شر کے محرکات کا تجزیہ کرنا چاہیئے اور سماج کی فلاح کے لئے خیر کے عوامل کو فروغ دینا چاہیئے۔ نفسیاتی تنقید کو ابھی ہنیت کے علاوہ زندگی کی ابدی صداقتوں سے بھی قریب ہونا چاہیئے تب جا کر کہیں اسکی ادبی جگہ متعین ہوگی اور وہ زندگی گیر ہو سکیگی۔

اب میں اردو ادب میں تنقید نگاری کے نئے تعمیری رجحان کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

یہ رجحان نیا ہوتے ہوئے بھی نیا نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں حالی اور ان کے معاصرین کی تنقیدوں میں بھی اس رجحان کی جھلک ملتی ہے۔ تعمیری تنقید یا اسلامی تنقید سے آپ کو چونکنا نہ چاہیئے۔ یہ نظریہ خدا پرستی اور انسان پسندی کے علاوہ کسی خطرناک قدر کو فروغ نہیں دینا چاہتا تعمیر پسند مکتبۂ فکر فنکاروں کی فکری توانائی اور صحت مندی پر زور دیتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ فنکار ادراک حقیقت کے کونسے ذرائع استعمال کرتا ہے اور نیز یہ کہ وہ ذرائع اسے حقیقت کے قریب لے بھی جاتے ہیں یا نہیں؟ فنکار کائنات کی تخلیقی نمائت کا بھی درک رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ سب بھی تعمیری اور اسلامی تنقید کے موضوع ہیں۔ تنقید کا یہ نظریہ اس بات کو بھی جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ فنکار انسانیت کا کیا تصور رکھتا ہے وہ انسانیت اور زندگی کی تقسیم تو نہیں کرتا یہ نظریہ کائنات اور زندگی کی اکائی پر زور دیتا ہے اور اخلاقی اقدار کی برتری منواتا ہے۔ زندگی سے شر و فساد کی قوتوں کے قدم اکھاڑ دینا چاہتا ہے اور ادب کو زندگی کے صالح پہلوؤں کا ترجمان اور مفسر بناتا ہے تنقید نگاری کا اتنا آفاقی نظریہ ہمیں تاریخ ادب میں کہیں بھی نہیں ملتا جس میں انسان دوستی، خدا پرستی اور تعمیر پسندی پر اتنا زور دیا گیا ہے۔ ادب اور انسانیت کی وحدت کے امکانات اس طرز تنقید سے روشن اور تابندہ ہوتے ہیں۔ مارکسی تنقید طبقہ واری حدود میں گھری ہوئی ہے اور نفسیاتی تنقید لاشعور کی پہنائیوں میں گم ہے۔ اسوقت میدان میں تعمیر پسند تنقید ہی تخریب کے سنگ خارا کو توڑ کر "لعل و ناب" بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ "معیار" کا تنقید نمبر بھی اسی کوشش کا ایک حصہ ہے ——— اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔

اس مختصری تمہید کے بعد میں تنقید نمبر میں شائع شدہ مقالوں کا ایک اجمالی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ "تنقید نمبر" کا سب سے پہلا مقالہ پروفیسر عاصی ضیائی کا ہے۔ موصوف اسلامی ادب کی تحریک کے ان چند گنے چنے نقادوں میں سے ہیں جو اپنی تنقیدوں میں اپنے بھرپور تنقیدی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں "تنقید اور نقاد کی ذمہ داریاں" ان کا کچھ اہم مقالہ نہیں ہے ——— انھوں نے اس مقالہ میں انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے جنھیں دوسرے نقاد ابتک کہتے آئے ہیں۔ عاصی ضیائی نے اپنے اس مقالے میں کسی تخلیقی اپج کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ مبادیات تنقید پر اردو ادب میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اسکی بازآفرینی ہی پروفیسر موصوف نے کی ہے۔ جن لوگوں نے محی الدین قادری زور کی کتاب "روح تنقید" اور خلیل الرب کی کتاب "مبادیات تنقید" دیکھی ہے وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسمیں کتنی سی باتیں کہی گئیں ہیں عاصی ضیائی کو تنقید کے مختلف نظریوں اور نقاد کے فیصلے کے متعلق جتنے مباحث ہیں ان پر روشنی ڈالنی چاہیئے تھی۔ ان کے اس مضمون میں مجھے ایک اور قابل غور غلطی نظر آتی ہے وہ یہ کہ پروفیسر موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "نقاد کی تنقید خواہ شعوری طور پر اسکی اپنی رائے ہو لیکن وہ خود شعوری (یا لاشعوری؟) طور پر دراصل اپنے معاشرے کے ذوق کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے" اس رائے میں فاضل نقاد سماجی جبریت (Social Determinism) کے مارکسی نظریہ سے مرعوب معلوم ہوتے ہیں۔ نقاد فنکار کی طرح صرف سماج کی آواز نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج کی آواز کو متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔ تاریخ ادب میں صد ایسے نقاد ملیں گے جنھوں نے سماجی بدحالی اور انتشار سے ہٹ سماج میں اپنے پاکیزہ خیالات و افکار کے بیج بوئے ہیں۔ اگر جبر کا یہ عمل کلیتاً مان لیا جائے تو اس تخریب پسندی کے دور میں تعمیر پسندی کی قدروں کا ابھرنا ایک غیر فطری عمل بن جاتا ہے تخریب

تقاضا تو یہ تھا کہ تعمیر پسندی بھی تخریب پسندی بن جاتی۔ مگر دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوا تعمیر پسندی کی قدریں ظلم و تخریب کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شمع فروزاں کی طرح روشن ہیں۔ عاصی ضیائی صاحب کو خیر و شر کے عوامل اور انکی آویزش کے عمل پر نظر رکھتے ہوئے یہ رائے دینی چاہیئے تھی۔ ان خامیوں کے باوجود بھی اس مقالے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل نقاد کو اپنی بات کہنی آتی ہے

عاصی ضیائی کے اس مختصر سے مضمون کے بعد ابن فرید جی۔ اسے کا مقالہ "ادب کی نفسیاتی ماہیئت" آتا ہے۔ ناظرین "معیار" کے لئے ابن فرید کا نام کچھ نیا نہ ہوگا۔ ابن فرید نے اس مقالے میں حقیقت نگاری اور تصوریت کے نظریوں کا نفسیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے تصوریت کے تصور پر انکی تنقید بھرپور اور ناقابل تردید ہے۔ مگر حقیقت نگاری کے سلسلے میں وہ کچھ بھٹک گئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری کے حد بد تصورات پر وہ کچھ زیادہ نہیں بڑھ سکے ہیں انھوں نے خارجی مظاہر کی ہو بہو عکاسی کو حقیقت نگاری سایا ہے حالانکہ مارکسی نقطہ نظر حقیقت نگاری کو اصولاً محض خارج کی تصویر کشی نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں کاڈویل نے اپنی کتاب (ILLUSION and REALITY) میں خوب کھل کر لکھا ہے۔ گورکی نے بھی اپنے خطبات اور تحریروں میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ دعویٰ ہی دعویٰ ہے سچ بات تو یہ ہے کہ مارکسی فلسفہ حقیقت نگاری کو صرف طبقاتی کشمکش اور ذرائع پیداوار تک محدود کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت نہیں حقیقت کا ایک رُخ ہے۔ بھرپور حقیقت نگاری تو وہ ہوگی جو کائنات کے سینے میں اتر کر اسکی غایت اور مقصد کا پتہ لگا سکے گی۔ اور اُسی کے لحاظ سے اسکے خارجی اظہار کو بھی دیکھے گی حقیقت نگاری کے غلط تصور سے جو غیر متوازی نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا تجزیہ ابن فرید نے بڑی ژرف بینی سے کیا ہے حقیقت نے اپنے اظہار کے لئے جو طریقے اختیار کئے ہیں ان کے کھوکھلے پن کو نمایاں کرنے میں فاضل نقاد نے بڑا استدلالی انداز اختیار کیا ہے موصوف نے اثریت اور اظہاریت کے مکاتیب فکر پر بھی تنقید کی ہے جو ادب میں عینی بنیادوں کی حامل ہیں رمزیت اور ایمائیت حقیقت کی شکل بناتے نہیں بگاڑتے ہیں اور اس پر ایک فریب انگیں پردہ ڈالتے ہیں۔ عام طور پر ایمائیت کا سہارا ان لوگوں نے لیا ہے جو اپنی ذہنی کجروی چھپانا چاہتے تھے۔ ابن فرید نے اس مقالے میں بڑا اثباتی انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے نفسیاتی حقائق کی روشنی میں فکر کی تنومندی پر زور جام تو دیا ہے فکر کی تنومندی سے فن جام بلورین کی طرح شفاف بن جاتا ہے۔ مقالے کے آخر میں ابن فرید نے رجائیت پر زور دیا ہے۔ اس حصے میں انکا انداز ذرا تقریری ہوگیا ہے۔ رجائیت کی اسلامی بنیادوں کو بھی بتانا ضروری تھا۔ مگر فاضل نقاد نے اسطرف توجہ نہ کی۔ انھیں چاہیے تھا کہ تصورِ آخرت کی وجہ سے جو جد و جہد اور حرکت و عمل کا جذبہ وجود میں آتا ہے اسکی طرف نشان دہی کرتے۔ اسطرح یہ حصہ اور زیادہ استدلالی ہو جاتا ہے۔ آخر میں استدلال کی کمی نے مقالے کے وحدت تاثر کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے بہرحال اس مقالے سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ ہمارے نقاد اپنے نقطۂ نظر سے ادب اور نفسیات کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ رجحان ہمارے تنقیدی محاذ کی ترقی کی بشارت ہے۔ اس خالص نظریاتی مقالے میں نقاد کو کچھ عملی اشارے بھی پیش کرنے چاہئیں تھے جس سے مقالے کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی۔

ابن فرید کے مقالے کے بعد نجم الاسلام کا مقالہ "ادب اور تنقید کا تعمیر پسند نظریہ" آتا ہے میرے خیال میں ہماری ادبی تحریک کی ابتداء کے بعد سے یہ پہلا مکمل نظریاتی مقالہ ہے۔ اسکے استدلال نے اسکی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں اب تک ہمارے یہاں جو مقالے لکھے جاتے تھے ان میں صرف بلند بانگ دعوے کئے جاتے تھے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاتی تھی۔ یا آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ پہلے کی تنقیدیں منفی ہوا کرتی تھیں اور اب ان میں اثباتی رنگ آگیا ہے نجم الاسلام کا مقالہ بڑا Well-planned معلوم ہوتا ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے عام معلومات کے لئے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جائے نجم الاسلام نے ایک ایک بات کو بڑی ژرف نگاہی کے ساتھ پیش کیا ہے اس مقالے کا خصوصاً وہ حصہ مجھے بڑا استدلالی اور ناقابل تردید معلوم ہوتا ہے جس میں زندگی، اسکی ابتدا اور اسکے پھیلاؤ پر روشنی ڈالی گئی ہے فاضل نقاد نے حقیقت کے مکمل ادراک میں انسانی عقل کو محدود قرار دینے میں غیر معمولی دہانیت کا ثبوت دیا ہے —— نجم الاسلام کے دوسرے مقالوں پر اس مقالے کو فوقیت حاصل ہے۔

اس کے بعد شاراحمد فاروقی کے مقالے "تنقید جدید" پر مجھے کچھ کہنا ہے۔ نجم الاسلام کا مقالہ جتنا استدلالی ہے یہ اتنا ہی غیر استدلالی ہے۔ اسمیں نقاد کا لہجہ پروپیگنڈائی ہوگیا ہے۔ اور وہ بات باقی نہیں رہی جو

بلاتعیار نالانے (Higher serious) کہا ہے۔ اس میں ادرفاقی نے طنزو تعریض سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً انھوں نے جہاں شکیل الرحمٰن کے مقالے کا ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ وہاں طنز کے نشتر زیادہ تیز ہوگئے ہیں۔ ایک جگہ تو طنز بھونڈا بھی ہوگیا ہے شکیل الرحمٰن کے اقتباس کے درمیان ہی میں انھوں نے کچھ طنزیاتی جملے لکھ دیئے ہیں جو ایک متوازن اور اعتدال پسند نقاد کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتے۔ اسطرح کا طنز جو پھکڑ بازی بنجاتا ہے وہ ممتاز حسین جیسے ناقدین کے لئے تو ٹھیک کہا جا سکتا ہے مگر اسلام پسند ناقدین کے لئے یہ ایک منفی فعل بنجاتا ہے۔ ترقی پسند نظریات کی۔ دمیں ہمیں نہایت ہی ناقابل تردید دلائل پیش کرنے چاہئیں جذباتی اور طنزیاتی اندازِ تنقید ہمارے کسی کام کا نہیں ہے —— اور یوں بھی تنقید جیسے سنجیدہ فن میں طنز کے کچوکے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے اس کے لئے تو پیروڈی یا رشید احمد صدیقی کا طرزِ تحریر ٹھیک ہو سکتا ہے مجھے امید ہے کہ نثار صاحب خود بھی اس انداز کو پسند نہ کرتے ہونگے فاروقی صاحب اکثر جذباتی انداز میں ترقی پسندوں کے خلاف عریانی اور فحاشی کے الزامات کا اعادہ کرتے رہتے ہیں جو آج ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ہمیں اب ترقی پسندوں پر اس قسم کے اعتراضات کے بجائے ان کے نظریہ کائنات وغیرہ پر مدلل بحث کرنی چاہیں۔ اگر ان پر عملی تنقید کی بھی جائے تو اس انداز سے کہ جسکا عملی نمونہ ہمیں حمید اللہ صدیقی کے مقالے " ترقی پسند ادب کا جائزہ " میں ملتا ہے نثار احمد فاروقی صاحب کو تمرد اور اختصار کے بجائے عملی تنقید بھی کرنی چاہیئے تھی اور قدرے تفصیل سے بھی۔ ان خامیوں کے باوجود اس مقالے سے مقالہ نگار کے جدید اور کلاسیکی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

نثار احمد فاروقی کے مقالے کے بعد جمیل احمد فاروقی کا مقالہ " ادب کے مثبت تصورات —— اور انکے تقاضے " آتا ہے جمیل احمد فاروقی ابھی حال ہی میں تنقیدی میدان میں آئے ہیں مگر اپنی غیر معمولی سوجھ بوجھ کی وجہ سے انھوں نے تعمیر پسند تنقید میں اپنی ایک جگہ بنالی ہے۔ انکی تحریر میں تحریکیت اور انکی نظر میں گہرائی ہے جمیل احمد فاروقی نے اگرچہ اپنے اس مقالے میں انھیں تصورات کا اعادہ کیا ہے جنھیں وہ اپنے پچھلے مقالوں میں پیش کر چکے ہیں مگر پھر بھی اسمیں ایک نئی شان ہے اور ایک نیا سلجھاؤ ہے اس مقالے کے ابتدائی حصوں میں انھوں نے اس نظریہ پر سائنٹفک انداز تنقید کی ہے کہ ادب ہمیشہ لایقینیت کی گود میں پروان چڑھتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے بعد وہ فوراً اسلام کی طرف آگئے ہیں اور اسے بغیر کسی ٹھوس دلیل کے اور قاری کے ذہن کو ہموار کئے بغیر دم توڑتی ہوئی انسانیت کیلئے پیش کر دیتے ہیں۔ ہمارے ناقدین کو اس غیر استدلالی انداز تنقید سے بچنا چاہیئے دعویٰ بلادلیل کے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ابوالخطیب نے اس ضمن میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ انھوں نے واقعی بڑے مدلل طور پر زندگی کے مادہ پرستانہ تصورات کی تنقید کی ہے اور اسکے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا ہے جمیل احمد فاروقی نے ادب کی فکری بنیادوں کے سلسلے میں بڑا حسین انداز اختیار کیا ہے انھوں نے مختلف ادبی نظریوں پر بڑے بھرپور وار کئے ہیں خصوصاً انھوں نے حقیقت نگاری کے سلسلے میں مارکسی نظریئے کی دھجیاں اڑادی ہیں۔ فی الحقیقت مارکسی نظریہ حقیقت نگاری حقیقت کے ساتھ ایک مذاق ہے مارکسی حقیقت نگاری کا تصور صرف طبقاتی کشمکش اور ذرائع پیداوار کے گرد گھومتا ہے۔ جمیل فاروقی کا خیال ہے کہ ایک مادہ پرست کسی طرح بھی حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا اسلئے کہ اسکی نظریں کائنات کے مظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی سچائی تک نہیں پہنچ سکتیں اسکے لئے تو خدا پرستی اور کائنات کی مقصدی تخلیق کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اس لئے عرفان حقیقت کے لئے خالق کائنات کی رہنمائی ضروری ہے۔

جمیل فاروقی کا یہ مقالہ انکی بالغ نظری اور بھرپور تنقیدی شعور کا مظہر ہے !! معزز علی بیگ کا مقالہ " ادب میں افادیت کے لوازم " بڑے کام کی چیز ہے لیکن حسرت ہے کہ معزز علی بیگ جیسا مغربی علوم کا جاننے والا کس طرح موضوع کے بہت سے گوشوں کو تشنہ چھوڑ گیا۔ ہم فاضل نقاد سے اسکی بھی شکایت کرینگے کہ انھوں نے اسمیں بیجا اختصار و ایجاز سے کیوں کام لیا اس مقالے میں ادبی شگفتگی بھی نہیں ہے حالانکہ بعض وقت واعظ کی شگفتگی بیان سے بھی اسکا وعظ گوارا کر لیا جاتا ہے ——

معزز علی بیگ کے مقالے کے بعد مسعود جاوید کا اہم مقالہ " ادب اور اسلامی ادب " آتا ہے مسعود جاوید اسلامی ادب کے اچھے ناقدین میں ہیں۔ انکا کلاسیکی شعور انکی تنقید میں ایک رنگ اعتدال پیدا کرتا ہے۔ زیر نظر مقالے میں مسعود جاوید نے اسلامی ادب کو کلاسیکی ادب کی روایات سے متصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل نقاد نے شروع میں عربی شاعری کی مثالوں سے اسلامی ادب کا تصور واضح کیا ہے۔ اسکے انھوں نے ہندوستان کے قدیم ادب کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے مسعود جاوید کا ایک عجیب

خیال ہے کہ اسلامی ادب اور جائز ادب کی تفریق جائز نہیں ہے۔ جو چیز اسلامی ادب سے متصادم نہیں ہے وہ اسلامی ہے اور جو متصادم ہے وہ اسلامی کیسے ہو سکتی ہے۔ مسعود جاوید کو غالباً یہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اسلام ادب سے مراد وہ ادب ہے جس میں اسلام کی اساسی اور آفاقی قدریں مکمل اور منضبط طور پر موجود ہوں۔ جائز ادب سے مراد وہ ادب ہے جس میں اسلام کی تہذیبی و بنیادی قدریں شعوری طور پر تو نہ ملتی ہوں، مگر وہ معاشرے اور انسانیت کیلئے صحت مند ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تقسیم (**Classification**) اب بھی ٹھیک ہے۔ کلاسیکی ادب میں مسعود جاوید ذرا تفصیل سے اسلامی قدریں دیکھنے کی کوشش کرتے تو بڑا اچھا ہوتا۔

ایک جگہ مسعود جاوید سے ہمیں اور اختلاف پیدا ہوتا ہے جہاں وہ حلقہ ادب اسلامی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حلقہ ادب اسلامی (پاکستان) سے متعلق بہت سے افراد انتہا پسند ہیں ورنہ انھیں ادب اور تبلیغ میں فرق کرنا نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا اشارہ نعیم صدیقی اور کوثر نیازی وغیرہ کی طرف ہے جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک اسلامی کے سرگرم کارکن بھی ہیں کم از کم نعیم کے متعلق تو میں اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ اسکی بعض نظمیں پروپیگنڈائی ہیں مگر ان میں بھی آپکو ایسے عناصر مل جائیں گے جو سالہا سال زندہ رہ سکتے ہیں جہاں اس نے "جس روز قیادت بدلے گی" اور "قرار داد مقاصد" ایسی نظمیں لکھی ہیں وہیں اسکے یہاں "اگر میں چاہتا ہوں" "ایک سوال چار جواب" اور "عالی عالی" جیسی بلند پایہ نظمیں بھی ملتی ہیں جو وقت کی ہر تبدیلی کے بعد بھی زندگی سے ہمکنار رہیں گی میں اسکا بھی قائل نہیں ہوں کہ ہنگامی موضوعات پر نظمیں نہ لکھی جائیں۔ لکھی جائیں اور ضرور لکھی جائیں مگر شرط یہ ہے کہ اسمیں فنکار کو اپنے احساس کی گرمی کی مدد سے آفاقی عناصر بھی شامل کر دینے چاہئیں۔ ہنگامی موضوعات کو اپنے احساس کی بھٹی میں تپا کر فنکار ایسے روپ دے سکتا ہے جو سدا بہار ہوں۔ اسکی مثال میں میں نعیم کی مشہور نظم "چڑیل" کو پیش کرتا ہوں جو صرف ایک معمولی سے واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ موضوع خواہ ہنگامی ہو یا مستقل صرف اچھے **Treatment** اور **Approach** کا محتاج ہے۔ محمود فاروقی نے دستوری جلوس پر جو ایک رپورتاژ "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کاروان ہمارا" لکھا تھا وہ ہمیں کیوں نہیں بھولتا محض اسلئے ناکہ محمود نے اپنے لافانی اسلوب اور شدت احساس کے ذریعہ اسمیں ایک جادو گھول دیا تھا۔ اور اگر اس

مسئلے کو دوسری طرح سے بھی دیکھا جائے تب بھی ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ناقدین نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ ادب کسی قوم، معاشرے یا نظریئے کی تاریخ ہوتی ہے۔ جب ادب کسی قوم، معاشرے اور نظریے کی تاریخ ہوتی ہے تو ہر قوم کی زندگی میں ہنگامی مسائل پیش آتے ہیں پھر کیوں نہ انھیں ادب میں پیش کیا جائے۔ ایلیا اہرن برگ نے اس مسئلہ کا بڑا اچھا حل پیش کیا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ اگر وہ ہنگامی لمحہ جس پر ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ قوم کے لئے تاریخ ساز یا اہم لمحہ ہے تو وہ ادب بھی قوم کی تاریخ کے ساتھ ساتھ زندہ رہیگا۔ آخر ہومر اور ورجل کی رزمیہ نظمیں اب بھی کیوں مقبول ہیں؟

میرا خیال ہے کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس دور کے پر خلوص ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ آج کا ادب تحریکوں سے زندگی حاصل کرتا ہے فنکار اگر عملاً ان مراحل سے گذرتا ہے جس سے تحریک گذرتی ہے تو اسکی تخلیقات میں خلوص بس جاتا ہے جو ایک بلند پایہ ادب کی جان ہے۔ نعیم اور کوثر کی شاعری پر جو دھار آگئی ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے۔

مسعود جاوید نے کچھ ایسے مسائل چھیڑ دیئے جن پر اظہار خیال ضروری ہو گیا اور یوں بھی

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

اسکے بعد ہمارے سامنے ابوالخطیب کا گرانقدر مقالہ "ادب، زندگی اور اسلام" آتا ہے۔ اس مقالے پر اظہار خیال سے پہلے میں ابوالخطیب کے متعلق چند تعارفی باتیں بتا دینا چاہتا ہوں خطیب ہمارا وہ قابل قدر افسانہ نگار اور نقاد ہے جس نے ترقی پسند تحریک اور اشتراکی تحریک کے بہت سے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ اسکی زندگی اب تاریکی سے نکل کر روشنی میں آگئی ہے اب وہ کسی کی "زلف شکن در شکن" سے گذر کر "کاکل گیتی" سنوارنے کی فکر میں ہے میں نے خود بھی انھیں مراحل سے گذرنے کے بعد لکھا تھا کہ

ے ہم آج کاکل گیتی سنوارنے کے لئے
کسی کی زلف شکن در شکن سے گذرے ہیں

آپ کو اسکے تجربات اور اسکی ذہانت کی جھلکیاں اس مقالہ میں جابجا ملیں گی۔ اس نے پہلے مادہ پرستانہ نظریات زندگی پر بڑے بھرپور وار کئے ہیں۔ اس نے مغربی مفکرین کے اقتباسات سے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ مادیت ہمارے دکھوں کا علاج نہیں ہے۔ ہماری روح کی تشنگی صرف خدا پرستانہ نظام کے ذریعہ سے ہی بجھ سکتی ہے۔ انسانیت کی فلاح اسی خدا پرستانہ نظام کے اختیار کرنے میں مضمر ہے

جسے پیغمبر اسلام نے آج سے تیرہ صدی پہلے عرب میں پیش کیا تھا۔ یہ کوئی احیائی (Revivalist) رجحان نہیں ہے اسلئے کہ اسلام کوئی ایسی چیز نہیں جسکے احیاء کی ضرورت پڑے۔ وہ تو ایک متحرک نظام ہے جو زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہے۔ خطیب نے نام نہاد Rationalism یعنی عقلیت کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ اس نے اسلام اور آرٹ کے تعلق کی وضاحت بڑی تفصیل سے کی ہے جس سے ذہن مکمل طور پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ خطیب نے اس بات کو بھی اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ بغیر کسی عظیم نظامِ فکر کے اعلیٰ ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ بے مقصد ادب انسانیت کی کسی طرح بھی امن و مسرت سے ہم کنار نہیں کر سکتا۔ لایقینیت کی گود میں پروان چڑھا ہوا ادب ہمارے جمالیاتی معیار پر بھی تو پورا نہیں اتر سکتا۔ غلط قسم کی انفرادیت پسندی جو مزاج کی حد تک بھی پہنچ جاتی ہے انسانیت کے لئے کسی قسم کی افادیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ انفرادیت بغیر سماجی شعور کے بیکار ہے۔ انسان جب اپنی نیابت کے احساس سے ادب کی تخلیق کرے گا تو اسکا ادب لازماً اعلیٰ، بامقصد، اور کائنات گیر ہوگا۔ ادب، زندگی اور اسلام کے تعلق کی وضاحت آج تک خطیب سے بہتر کوئی اور اسلام پسند نقاد نہیں کر سکا ہے۔ ابوالخطیب نے مادیت اور اسکے اثرات پر زیادہ توجہ کی ہے اور آرٹ پر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکا ہے۔ اس لیے جہاں ادبی نظریات کی وضاحت کی ہے اور دوسرے نظریوں پر تنقید کی ہے وہیں اگر وہ عالمی ادب سے بھی مثالیں پیش کرتا تو اچھا ہوتا۔ اسطرح مقالے کی افادیت بھی بڑھ جاتی۔ خطیب کی تحریر میں اس گھن گرج کا احساس ہوتا ہے جو کبھی طبع سلیم پر گراں گذرتی ہے۔ علمی مقالوں میں جذباتیت کم اور ٹھہراؤ زیادہ ہونا چاہئے پھر بھی خطیب کے یہاں فکر انگیز انداز ہے جسے اور بھی ترقی دی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد نظریاتی تنقید کا حصہ ختم ہوتا ہے اور عملی تنقید کا حصہ شروع ہوتا ہے یہ حصہ عام قارئین کے لئے بڑا دلچسپ ہے۔ اس لئے کہ عام لوگوں کی نظریاتی مباحث میں کچھ لطف نہیں آتا۔ اس حصہ میں جو کچھ ادب پیدا ہو چکا ہے اس پر تنقید ملے گی جدید اور قدیم دونوں ادب پر تعمیری نقطہ نظر سے تنقید کی گئی ہے۔ اس حصے کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ تعمیر پسند ناقدین کتنی بے لاگ (Disinterested) تنقیدیں کرتے ہیں۔

اس حصے میں پہلا مقالہ حمید اللہ صدیقی کا ہے جس کا عنوان ہے

"ترقی پسند ادب کا ایک جائزہ"۔ حمید اللہ صدیقی پاکستان کے ایک بالغ نظر نقاد ہیں اس مقالے کو پڑھکر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل نقاد تحقیقی کاموں کی کسقدر صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ یہ مقالہ اسلامی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے کچھ نیا نہیں ہے۔ اسلئے کہ یہ "چراغ راہ" کراچی کی اشاعت خاص میں اس سے پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اسکا اعتراف نجم الاسلام نے خود نقش اوّل میں کیا ہے۔ یہ مقالہ کافی حد تک ترمیم شدہ ہے۔ فاضل نقاد نے اسمیں منضبط طریقے سے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا ہے ——— اور اسکے ہر موضوع پر تعمیری نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔ اس مقالے کی یہ خصوصیت ہے کہ اسمیں جو کچھ بھی حوالے یا اقتباسات دیئے گئے ہیں وہ ترقی پسند مصنفین کے جانے ہوتے نمائندوں کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ اس سے پہلے ترقی پسند ادب پر جب بھی کوئی عملی تنقید ہوتی تھی تو ترقی پسند حضرات کہہ دیا کرتے تھے کہ نقاد نے ترقی پسند ادب اور نئے ادب کے فرق کو نہیں سمجھا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین نے مولانا اختر تلہری کو انکی کتاب "روایت اور بغاوت" میں اسی بات پر ہدف تنقید بنایا ہے حمید اللہ صدیقی نے صرف ان لوگوں پر اعتراضات کئے ہیں جن کو سارا ہندوستان اور پاکستان ترقی پسند جانتا ہے۔ حمید صدیقی کے وار ہر جگہ کاری ہیں فاضل نقاد نے بڑے اعتدال اور توازن کے ساتھ ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا ہے۔ انکے یہاں اس جذباتیت کا کہیں نام بھی نہیں جو دوسرے تعمیر پسند نقادوں کے یہاں ترقی پسندوں پر تنقید کرتے وقت نمایاں ہوتی ہے۔ مگر اس اعتدال و توازن کی زیادتی کی وجہ سے تحریر کی تحریکیت میں کمی آگئی ہے غالباً اسی وجہ سے جب یہ مقالہ "چراغ راہ" میں پہلی بار چھپا تھا تو نعیم صدیقی کو جا بجا حواشی کی ضرورت پڑگئی تھی۔

بہر حال اس مقالے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند تحریک اشتراکیت اور مارکسی فلسفہ کے گرد کسطرح گھومتی ہے ——— اور نیز یہ کہ اس کے موضوعات کسی طرح بھی انسانیت کے لئے صحت بخش نہیں ہیں۔ ترقی پسند تحریک طبقاتی کشمکش، عورت اور بھوک کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اس تحریک کے پر فریب اور التباس انگیز نعروں کی حقیقت اس مقالے سے بے نقاب ہو جاتی ہے۔

حمید اللہ صدیقی کے اس تحقیقی مقالے کے بعد ہمارے سامنے ابن فرید کا مقالہ "تعمیری ادب حیثیت" آتا ہے۔ ہندوستان کے تعمیر پسند نقادوں میں ابن فرید ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ خصوصاً افسانوی

موضوعات پر ان کا قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ انھوں نے جدید افسانوی ادب کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ اور اسپر انکی رائیں حقائق کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کا زیر نظر مقالہ اردو کے افسانوی رجحان پر ایک کھلی تنقید ہے۔ انھوں نے شروع میں افسانے میں رمزیاتی (Symbolistic) رجحان پر تنقید کی ہے جو ہمارے ادب میں T. S. Eliot اور Ezra Pound کے مطالعہ کے زیر اثر مقبول ہوا۔ اشاریت اور ایمائیت کے اس نظریے کو فرانس میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ فرانس میں Mallarme School انکی اشاریت اور رمزیت کے لئے بہت مشہور رہے۔ اصل میں جب فکر صاف نہیں ہوتی تو فنکار ابہام اور اشاریت کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ میراجی اور راشد کی ابہام پسندی انکی نظریاتی ناپختگی کی دلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ فرائڈ وغیرہ کو پڑھکر میراجی اور راشد نے لاشعور کی تلاش شروع کر دی اور آخر کار اسی میں کھو کر رہ بھی گئے۔ ایک زمانے میں ابہام پسندی کو اسقدر فروغ ہوا کہ آئرلینڈ کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار W. B. Yeats نے اعلان کیا کہ "جو کچھ بھی شمال (یعنی فرانس) کی طرف سے آرہا ہے ایک ابدی حقیقت ہے" یہ اس ابہام پسندی کا اثر تھا جسے ہمارے ادب میں میراجی اور انکے رفقاء نے فروغ دینے کی کوشش کی۔ مگر اب نظریاتی شعور کی روز افزوں پختگی کی وجہ سے Direct form مقبول ہو رہا ہے۔ پھر بھی آپکو اب بھی ایسے افسانہ نگار مل جائیں گے جن کی آنکھیں اندر کی طرف کھلی ہوتی ہیں۔

اصل میں اس مقالے میں تعمیری ادب کے افسانوی رجحان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ابن فرید کے اس خیال سے ہم اتفاق کرینگے کہ تعمیر پسند افسانہ نگاری نے اولاً مقصد کے پیچھے فن کا سارا احساس کھو دیا تھا ہمارے افسانے حسین وعظ بن کر رہ گئے تھے۔ ابن فرید نے جہاں محمود فاروقی کے افسانوں کو روکھا پھیکا کہا ہے وہاں ہم ان سے ضرور اختلاف کرینگے۔ میں فاروقی کو اسکی بعض خامیوں کے باوجود بھی بڑا افسانہ نگار سمجھتا ہوں بات یہ ہے کہ اس کے افسانوں سے مقصدیت فطری طور پر ابھرتی ہے ——— وہ مقصد کو ابھارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسکی کہانیوں کا فطری ارتقاء ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے اسکے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا تنوع ہے۔ اسکے افسانے "جلوۂ صد رنگ" کی بہترین مثال ہیں E. M. Foster نے اپنی کتاب "Aspects of the Novel" میں لکھا ہے کہ کہانی کی ندرت ہی افسانے یا ناول کی جان ہے۔ اور نیز یہ کہ ہم افسانے ہی کہانی کے لئے پڑھتے ہیں۔ محمود فاروقی کے افسانوں کے پلاٹ میں یکسانیت نہیں رنگارنگی ہے۔ "ذہنی مجرم" اسکا ایک ایسا افسانہ ہے جو اپنی نوعیت کا بین الاقوامی ادب میں پہلا افسانہ ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد ہر شخص اپنے کو ذہنی مجرم محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسکے افسانوں پر آفاقی تاثر ہمیں اپنے دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔ اور ویسے بھی میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اسکے افسانوں میں گداز اور جاذبیت کی کمی ہے جمیل احمد فاروقی نے محمود پر اپنے مقالے میں اسکے افسانوں میں "غزلیت" محسوس کی تھی غزل کا مخصوص دھیما دھیما گداز اور اسکی داخلی کیفیت اور اسکا وحدت تاثر ہمیں فاروقی کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ہاں! عاصی ضیائی، اسعد گیلانی اور عامر کے افسانوں پر بے رنگی اور روکھے پن کا گمان ضرور ہوتا ہے۔ محمود کے "بساطی باڑہ" میں جو تحلیلی انداز ہے اسکا اعتراف خود ابن فرید نے اسی مقالے میں کیا ہے

جنسی موضاعت پر تعمیر پسند تحریک میں جیلانی بی۔ اے نے کامیابی سے لکھا ہے اسکے یہاں جنسی انفعالیت نہیں ہے ہاں "العلم بن العورت" میں وہ کچھ غیر محتاط ضرور ہو گیا ہے۔ ابن فرید نے اسلام پسند فنکاروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ زندگی کے جنسی پہلو سے منہ نہ موڑیں بلکہ قرآنی حدود میں رہ کر اس کی عکاسی کریں۔ قرآن نے واقعی اس مسئلہ کو بڑی اچھی طرح حل کیا ہے۔ سورۂ یوسفؑ کے اندر جب زلیخا جنسی جذبات سے مغلوب ہو کر حضرت یوسف کے دامن کو کھینچتی ہے تو قرآن کس احتیاط سے کام لیتا ہے۔ قرآن نے پوری سورۂ میں کہیں بھی زلیخا کے خارجی حسن کی منظر کشی نہیں کی ہے پھر بھی زلیخا کا نفسیاتی مطالعہ اس طور پر کیا ہے کہ وہ ہمیں کمزور جذبات کی ایک مورت معلوم ہوتی ہے۔ اگر جنسی مراحل کی عکاسی میں قرآنی اسلوب یا جمیل احمد فاروقی کی اصطلاح میں "اسلامی حقیقت نگاری" سے کام لیا جائے تو صحت مند تاثر ناگزیر ہے۔

ابن فرید نے "مشیر" کے افسانوی انتخاب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے مجھے اس سے سو فیصدی اتفاق ہے: "مشیر" اکثر غیر محتاط قسم کے افسانوں کو بھی منتخب کرتا ہے۔ پریم پجاری جیسے لچر قسم کے افسانہ نگاروں کو بھی "مشیر" میں جگہ ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب خورشید صاحب اسکی طرف خصوصی توجہ کریں گے۔ ابن فرید نے جنسیت پر لکھنے والوں کو

بروقت مطلع کیا ہے۔ اگر وہ اپنی تحریروں میں اسلام کے مقرر کردہ حدود کا خیال نہ رکھیں گے تو وہ ہمارے ساتھ زیادہ دنوں تک نہ چل سکیں گے۔

ابن فرید کے مقالے کا عنوان دیکھ کر محسوس ہوا تھا کہ وہ جنسیت کی سائنٹفک اور نظریاتی polemical کریں گے ـــــ مگر مقالے کے مندرجات پر نظر ڈالنے کے بعد بڑی مایوسی ہوئی۔ انھوں نے جنسیت کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے جنسیت طور پر کچھ نہیں لکھا اگرچہ وہ اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ جنسی پہلو کو بھی افسانوں میں جگہ ملنی چاہیے۔ فاضل نقاد کو یہاں یہ بتانا چاہیے تھا کہ ایک اسلام پسند افسانہ نگار اس موضوع پر کسطرح قلم اٹھاتے؟ ان چند خامیوں کے باوجود بھی یہ مقالہ نہایت ہی بصیرت افروز اور ابن فرید کے نو بہار تنقیدی شعور کا مظہر ہے۔ ابن فرید کے اندازِ نگارش میں کہیں کہیں اخلاقی ہے اور بعض جگہ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ نفسیات پر کوئی علمی مقالہ تو نہیں لکھا جا رہا ہے

عاصی ضیائی رامپوری کا دوسرا مقالہ "شعر اقبال کا فنی اسلوب" اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ ابتک عام ناقدین نے جب بھی اقبال کے اسلوب پر قلم اٹھایا ہے انکی نظر صرف ان کے فنی اغلاط کی طرف گئی ہے۔ اس قسم کی خردہ گیری اقبال پر عرصہ سے ہو رہی ہے "اقبال کامل" میں عبد السلام ندوی نے بھی ان کے فنی معائب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گو بقول پروفیسر احتشام یہ قوم کی بدنصیبی ہے جو اقبال جیسے مفکر کے یہاں فنی خامیاں ڈھونڈتی ہے احتشام حسین کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ عاصی نے بڑے تاریخی اور ادبی شعور کے ساتھ اقبال کے فنی ارتقا کو دکھایا ہے اس سلسلے میں انھوں نے بعض باتیں بالکل نئی کہی ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ اقبال کی نظم "شکوہ" میں ایک ابتدائی پہلو بھی تھا اور نیز یہ کہ انھیں "جواب شکوہ" لکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی یہ نکتہ کم از کم مجھے تو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے اس مقالہ سے عاصی کے کلاسیکی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے انھیں فن اور اسکے تدریجی اور ارتقائی عمل کا پورا پورا احساس ہے ـــــ انھوں نے اقبال کے کلام کو کلاسیکی پس منظر میں دیکھنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے ہمارے دوسرے ناقدین کو بھی ادبی روایات کے تسلسل پر غور کرنا چاہیے جس کی طرف عاصی ضیائی نے ایک ابتدائی قدم اٹھایا ہے۔ عاصی کے دونوں مقالوں کے (تنقید نمبر میں شائع ہوتے ہیں) تقابلی مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ـــــ

عاصی عملی تنقید میں زیادہ کامیاب ہیں لہٰذا میں انھیں مشورہ دوں گا کہ وہ

تنقید کے اس شعبے کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

افتخار اعظمی کا مقالہ "عہد جاہلیت کی عربی شاعری کا پس منظر" انکے اپنے رنگ میں ہے اس کے مطالعہ کے بعد مقالہ نگار کی عرق ریزیوں کا احساس ہوتا ہے۔ افتخار اعظمی نے اپنے مخصوص تحلیقی اسلوب میں عہد جاہلیت کے سیاسی، معاشرتی، اور معاشی پس منظر میں عربی شاعری کو دیکھنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ اُردو ادب میں ابتداً شاعری کی تخلیقات کو اس کے ماحول سے الگ کر کے دیکھا جاتا تھا۔ مگر بعد میں جب تنقید کا سائنٹفک نظریہ پروان چڑھا تو اسکے اثر سے ماحول کے اثرات پر زور دیا جانے لگا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایک ادب کی تخلیقات کا جائزہ اسکے سماجی اور معاشرتی ماحول سے ہٹ کر لیا بھی نہیں جا سکتا۔ اس ضمن میں ایمرسن (Emerson) کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر دور کے ادب میں "روحِ عصر" (SPIRIT OF THE AGE) پوری طرح کارفرما ہوتی ہے عہد جاہلیت کی شاعری قبائلی نظام کی پیداوار ہے لہٰذا ہمیں اسمیں تقریباً وہی عناصر ملیں گے جو متعلق نظام میں ملتے ہیں۔ ماحول کی جکڑ بندیوں نے جاہلیت کی عربی شاعری کی آفاقیت کو کافی حد تک ختم کر دیا تھا۔ پھر بھی اس تاریک دور میں ہمیں روشنی کے کچھ آثار ضرور ملتے ہیں۔ یہ پیغمبر اسلام سے پہلے کے پیغمبروں کی مساعی کے اثرات تھے عہد باطل میں بھی خیر کی قوتیں ہر وقت موجود رہتی ہیں جنکا اثر شاعری پر کبھی شعوری یا لاشعوری طور پر پڑتا ہے افتخار اعظمی نے اس پہلو کو بڑی کامیابی سے اجاگر کیا ہے اور غالباً یہی حصہ اس مقالے کی جان ہے۔ یہ مقالہ یقیناً ان لوگوں کی کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتا جو عربی ادب سے براہ راست واقف ہیں۔ اس مقالے میں روشنی سے زیادہ گرمی ہے۔ اقتباسات کی کثرت کی وجہ سے "مثل بندی" کا بھی شبہ ہونے لگتا ہے

میں افتخار اعظمی کو یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی جولانگاہ کو ذرا وسیع کریں۔ عربی ادب کے علاوہ بھی وہ عالمی ادب کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوں اور اسطرح اپنے تنقیدی شعور کو پروان چڑھائیں۔ تعمیر پسند تحریک ابھی ایسے دور سے گزر رہی ہے جس میں صرف نظریات کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ افتخار اعظمی کو نظریاتی اور (POLEMICAL) قسم کے بھی مقالے لکھنے چاہئیں۔

افتخار اعظمی کے مقالے کے بعد مولانا امتیاز علی عرشی کا مقالہ "شاعر کا قول و فعل" آتا ہے۔ یہ مقالہ بڑے معرکے کا ہے اور اسمیں ایک دلچسپی بحث چھیڑی گئی ہے جس کی طرف اکثر لوگوں کی نظریں نہیں جاتیں۔ مولانا نے اُردو

تنقید نگاری کے ایک تاریک پہلو پر نظر ڈالی ہے بہت سے ناقدین شاعروں کے اشعار سے انکے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اس طرز تنقید کو بالکل غلط بتایا ہے۔ ہر ادبی تخلیق میں صاحب تخلیق کی شخصیت ضرور جھلکیاں دکھاتی ہے۔ مگر قدیم اُردو ادب کا سرمایہ اشاریت اور ایمائیت کے غلاف میں اسقدر لپٹا ہوا ہے کہ شاعر کے متعلق صرف اسکے اشعار سے کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی مولانا نے اپنے اس استدلال پر سیکڑوں مثالیں پیش کی ہیں۔ مگر یہ بات صرف قدماء کے لئے ہی درست ہوسکتی ہے آج کا ادب تحریکی ادب ہے اب تخیل کی پروں پر فضائے بیکراں میں اُڑنے کا دور ختم ہوگیا ہے آج کی ادبی تحریکیں تحریری شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی طلب کرتی ہیں ترقی پسند تحریک کا بھی یہی حال ہے اور اسلام پسند تحریک کا بھی۔ ترقی پسند تحریک میں نرودا، گورکی، لوئی ارگان اور ناظم حکمت صرف شاعر یا افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ اس معاشرے کے باعمل افراد بھی ہیں نعیم صدیقی اور کوثر نیازی صرف شاعر نہیں ہیں، وہ اقامتِ دین کے جیالے اور جانباز سپاہی بھی ہیں اس کے علاوہ اب بہت کم ایسے ناقدین رہ گئے ہیں جو صرف اشعار سے شاعر کے حالات زندگی کا پتہ لگاتے ہیں اب تو شاعر کی زندگی اس کی سوانح اور اسکے سماجی پس منظر میں دیکھی جاتی ہے۔ مولانا عرشی کی بات آج سے ۵۰ سال پہلے کے اصول نقد کے متعلق تو درست ہوسکتی ہے مگر اس دور کے لئے تو قطعی صحیح نہیں ہے

محمد عثمان رمز مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے ہیں۔ انھوں نے ارسطو کی "بوطیقا" (POETICS) پر اظہار خیال کیا ہے نجم الاسلام نے "نقشِ اوّل" میں اس قسم کے مقالوں کی افادیت سے انکار کیا ہے جو میرے خیال میں یہ رویہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ ہمیں ماضی کی برگزیدہ روایتوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ ادب القدما (CLASSICS) کے متعلق ہمارے یہ نظریات دوسروں کو غلط فہمیوں میں ڈال سکتے ہیں ہمیں کم از کم ایسی غلطیوں کا ارتکاب نہ کرنا چاہیئے جنکا خمیازہ ترقی پسند تحریک ابتک بھگت رہی ہے — ارسطو کے شعری نظریات پر بہت کچھ کام ہوچکا ہے۔ اسپر کچھ نئی باتیں کہنا ذرا مشکل ہوگیا ہے۔ رمز بھی اسی شکل میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اس میں اکثر وہی باتیں کہی گئی ہیں جنھیں دوسرے ناقدین ابتک کہتے آئے ہیں۔ اس میں مقالہ نگار کا اپنا کوئی مثبت نقطۂ نظر نہیں دکھائی دیتا۔ پھر بھی یہ مقالہ بڑے منضبط طور پر لکھا گیا ہے۔ اسکی تو کم از کم مقالہ نگار کو داد ملنی ہی چاہیئے۔

عثمان رمز کے اس مقالے کے بعد جمیل احمد فاروقی کا مقالہ "ہمارے اسلام پسند شاعر" آتا ہے جمیل فاروقی نے اسی نمبر میں ایک اور بلند پایہ نظریاتی مقالہ لکھا ہے۔ یہ انکا دوسرا مضمون ہے اس میں اسلام پسند شعراء پر عملی تنقید ہے۔ اس مقالہ کو کافی بحث انگیز بنا دیا گیا ہے۔ اسپر سب سے بڑا اعتراض "نقشِ اوّل" میں یہ اٹھایا گیا ہے کہ اس میں کچھ نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ کوئی بھی سمجھدار انسان اسطرح نقاد کے فیصلہ (JUDGEMENT) پر اثر انداز ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ایک نقاد سے اس قسم کا مطالبہ تنقید اور اصولِ تنقید کے ساتھ سخت بددیانتی ہوگی۔ نقاد اپنی عملی تنقید میں شخصیتوں کے انتخاب میں آزاد ہے جو بھی فنکار اسکے معیار نقد پر پورا اترتا ہے اسکا وہ جائزہ لیتا ہے۔ نقاد کا کام مورخ کا نہیں کہ وہ ہر واقعہ کی تفصیل پیش کرے اور ایک ایک شخصیت پر روشنی ڈالے جمیل احمد فاروقی نے مقالے کی ابتدا میں ہی لکھ دیا ہے کہ وہ انھیں فنکاروں کا جائزہ لے رہے ہیں جو جدید فن و ہیئت کے ساتھ دوسری ادبی تحریکوں کا مقابلہ کرسکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں"۔ نقاد کا کام فہرست نگاری نہیں ہوتا اسکی نظر ہمیشہ انتخابی ہوتی ہے۔ اسطرح سے اس مقالے میں چند ناموں کے باقی رہ جانے کا اعتراض بے معنے ہوکر رہ جاتا ہے۔

جمیل احمد فاروقی نے اکثر شعراء پر اظہارِ خیال کے سلسلے میں بڑے اجمال سے کام لیا ہے۔ اس لئے انکی تنقید کچھ (Penetrating) نہیں معلوم ہوتی بعض جگہوں پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر کی صرف ایک تخلیق کے مطالعہ سے ہی اسکے تمام کارناموں پر فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ ماہر القادری اسی اندازِ تنقید کے شکار ہوگئے ہیں۔ شمیم جامعید پر بھی کم و بیش اسی قسم کی تنقید کی گئی ہے۔ اسکی شاعری کا طنزیہ پہلو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے جو "فرضِ صدارت" اور "موسٹ ارجنٹ" جیسی نظموں میں پورے کمال کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ زاہد کی شاعری پر اظہارِ خیال کے سلسلے میں اسکی نظم "مس انڈیا" کو پیش کیا گیا ہے جسکے اندر سوئفٹ SWIFT کی زہرناکی اور (Misanthropy) پیدا ہوگئی ہے —

اس نظم میں زاہد کو مریض سے ہمدردی نہیں رہ جاتی اور وہ اسے سخت سُست سنانے لگتا ہے اس قسم کی نظموں کو شرفِ نمائندگی بخشنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

جمیل احمد فاروقی کی اس تنقید کو عملی تنقید کا بہت اونچا نمونہ تو نہیں کہا جاسکتا پھر بھی تعمیر پسند تحریک کی تاریخ میں یہ پہلا جرأت مندانہ اور بےلاگ قدم ضرور ہے۔ جمیل احمد فاروقی میں نظریاتی تنقید کی بے پناہ صلاحیت

(دیکھئے صفحہ ۵۴)

ماھنامہ

معیار

کا

تنقید نمبر

جو

ادب اور تنقید کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ، صالح اور صحت مند رجحانات کی منہ بولتی تصویر، تعمیری ادب کی منزل کا واضح نشان، اسلامی ادب کی آفاقی قدروں کا حسین مرقع، دنیائے ادب کے جاہلی نظریات کیلئے ایک مستقل چیلنج، مرعوب کُن باطل افکار پر ایک کاری ضرب ہے، تمام حق پسند اہلِ ذوق کے مطالعہ کے لائق، تعمیری اور اسلامی ادب پر سیر حاصل مواد رکھنے والی یہ عظیم پیش کش ——

صرف ایک روپیہ

میں مل سکتی ہے —— مکتبہ معیار سے طلب کیجئے

اصغر علی عابدی

مغربی ادب کے تین دور

(قسط دوم)

۲۔ حقیقت پسندی

رومانیت کے بعد اب ہیں دوشیزۂ ادب کے ماتھے پر لگے ہوئے اس ٹیکے کی چمک دمک کا اندازہ لگانا ہے۔ جسے اس کے شیدائی بالعموم "حقیقت پسندی" (Realism) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ رومانیت (Romanticism) کی طرح حقیقت پسندی کا منبع اور مبداء بھی یورپ ہی ہے، اگرچہ یورپ کے تمدنی ارتقاء اور عالمی سیادت World leadership سے قبل عربوں ایرانیوں اور خود ہندوستانیوں کا ایک گروہ ایسا ضرور تھا۔ جو حقیقت پسندی کا متلاشی اور اس کے جلوۂ بے پایاں کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ لیکن قدیم کلاسیکل دور کی حقیقت پسندی دورِ جدید کی حقیقت پسندی سے کہیں "غرد تر" اور مختلف ہے۔

یورپ میں حقیقت پسندی کے نشو و ارتقاء کا ابتدائی دور ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء کا ہے لیکن جس طرح رومانیت کے عالمِ وجود میں آنے یا نشو و نما پانے سے ضابطہ بندی (Classicism) کچھ مٹ نہیں گئی۔ اسی طرح حقیقت پسندی کی نئی تحریک سے رومانیت کے سوتے بھی کچھ خشک نہیں ہوئے بلکہ ہم کسی قدر گہری نظر سے حالات کا جائزہ لیں۔ تو ہمیں اس بات کا علم ہوگا کہ جن تاریخی تغیرات کے باعث رومانیات نے ترقی کی تھی۔ حقیقت پسندی بھی انہیں کی خوشہ چیں ہے۔ انیسویں صدی کے تہذیبی اور تمدنی انقلابات جُوں جُوں ایک قائم اور مستقل وجود کی حیثیت سے سرزمینِ یورپ پر ٹک گئے تو اُن کی شورہ پشتی نے بھی اعتدال کا چولا بدل لیا۔ اور سنجیدگی اور "حقیقت پسندی" کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء کا زمانہ یورپ کا وہ دور ہے۔ جبکہ زندگی کو "مذہبی اور دینی" بنیادوں سے اکھاڑ کر سراسر مادّی اور الحادی بنیادوں کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ اور اس نئے نظامِ فکر کے مطابق اکثر تعمیری کام آگے بڑھنے لگے تھے۔ چنانچہ اس لحاظ سے رومانیت اور حقیقت پسندی کے دور پیدائش کو یوں متعین کیا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں قدیم عیسائی افکار یا مذہبی افکار اور جدید لادینی یا مادّہ پرستانہ خیالات میں ایک "جنگِ مناظرہ" (Dialect) جاری تھی۔ اور دعوے (Thesis) اور جواب دعویٰ (Antithesis) کے اتحاد سے کوئی "مرکب" (Synthesis) تیار نہیں ہوا تھا ٹھیک اسی ہنگامی زمانہ میں رومانیت کا وجود عمل میں آیا۔ اور اس کے بعد جب تہذیب ایک نئے راستہ پر "مستقلاً" گامزن ہو گئی۔ اور ہنگامی دور ختم ہوا، تو "حقیقت پسندی" نے جنم لیا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں رومانیت کو حقیقت پسندی کے وجود سے ذرا بھی ٹھیس نہ لگی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ جن تہذیبی نظریات میں "تصادم" اور کشمکش کا بازار گرم ہوا۔ وہ کچھ اس امر کا نتیجہ نہ تھا۔ کہ ان کے اندر فی الواقع کوئی بنیادی اختلاف تھا۔ یعنی نام نہاد جاہلی مذہبی افکار اور مادہ پرستی میں درحقیقت کوئی مقصدی فرق نہ تھا۔ بلکہ یہ دونوں تو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔ کیونکہ دونوں انسانی زندگی کو ایک ہی رُخ پر لے جانے کے حامی تھے۔ فرق صرف ظاہری شکل اور طریقۂ کار کا تھا۔ چنانچہ بعد کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ "مادیت اور عقلیت" کی کامیابی کے بعد "جاہلی مذہب" نے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ اور چرچ زندگی کے وسیع میدان سے ہٹ کر صرف ایک محدود کونے میں اپنی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اُدھر مادیت نے بھی چرچ کی حکومت کے مقابلہ میں کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کیا۔ سیاسی۔ معاشی۔ اور معاشرتی تمام شعبہ جات حیات میں وہی پہلے کی سی بے راہ روی دوبارہ عود کر آئی۔ اِسی لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اِن کے سطحی انقلابات ادب کے سرد پا اصول و نظریات کی اُلٹ پھیر سے ادب کے اندر کوئی انقلاب آ جاتا۔ اور ہر نیا اصول پُرانے اصول سے لازماً بہتر ہوتا۔ جس طرح سیاست کے دائرہ میں

جمہوریت کے تمام شور و غوغے کے باوجود ناجائز انتفاع لوٹ کھسوٹ اور وحشت و بربریت کا مظاہرہ اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بنیادی فرق نہ ہوا۔ اسی طرح ادب کی گاڑی بھی نئی نئی اصطلاحات" اور نئے نئے رموز و نکات" کے باوجود ایک ہی مقام پر کھڑی رہی۔ جس طرح معیشت کے میدان میں نئے افکار کے ہڑبونگ۔ مزدوروں۔ کارخانہ داروں۔ اور ان کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ۔ باہمی تصادم۔ چیخ و پکار اور واویلا کے باوجود "خرابی" کی جڑ کا کوئی تیشہ نہ چلایا جا سکا۔ محض اس مسئلہ کی نوعیت کچھ بدل گئی۔ پیٹ بھرے اور مدہ سے نوالا چھیننے کے انداز میں کچھ ظاہری فرق ہو گیا۔ اسی طرح ادبی جذبات و حسیات نے بھی محض ایک نیا روپ اختیار کیا۔ زندگی کا دریا بہ حیثیت مجموعی جس رُخ پر بہہ رہا تھا۔ ادب کے "قطرے" بھی صرف اسی رُخ بہنے کے لئے مجبور اور بے بس تھے۔ اکثر لوگ حالات و واقعات کا محض سرسری جائزہ لے کر یا اصطلاحات اور الفاظ کی بدلی ہوئی شکل دیکھ کر ہی "انقلاب! اے انقلاب" پکار اٹھتے ہیں لیکن اگر وہ واقعات کا گہری نظر سے مشاہدہ کرتے۔ ان کے نتائج اور پوری زندگی کی حرکت پر غور کرتے۔ تو وہ یقیناً لفظ "انقلاب" کو زبان پر لانے سے قبل کچھ سوچتے۔ اور پشیمان ہو کر اپنی نظریں نیچی کر لیتے۔

تاہم کسی "تغیر" یا "فرق" کو سراسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہری یا سطحی جو کچھ بھی تبدیلی انسانی تمدن میں ہوئی ہے۔ اس حیثیت سے بہرحال ادب نے بھی ایک نیا لباس پہنا ہے۔ اور ہمیں اس کی وضع قطع اور کتر بیونت کا اندازہ لگانا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں انسان کی مادی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر کی بنا پر تقریباً تمام علوم میں ٹھوس واقعات اور حقائق و اعداد کی تلاش کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ اس بناء پر ادب میں بھی اسی طرزِ فکر کا اثر و نفوذ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس زمانہ میں حقائق (Facts) کے "شیدائیوں" نے ادب کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ اپنی محصور دنیا کے قابلِ مشاہدہ امور کو جوں کا توں پیش کر دے۔ اور واقعات کی محض تصویر کشی اور مصوری پر اکتفاء کرے۔ اس میں ذہن انسانی کی کوئی کاوش، کوئی اصول و مستقبل کی کوئی اُمنگ موجود نہ ہو۔ وہ سرتاپا محض ٹھوس اور آنکھوں سے دکھائی دینے والی اشیاء کا ایک ذکر ہو۔

البتہ حقیقت پسندی کے اس نقشہ میں یہ اصول برابر موجود رہا۔ کہ واقعات کی مصوری اور نقاشی کے ساتھ ساتھ اس امر کا خیال رکھا جائے۔ کہ انسان اپنی ابتدائی حیوانی اشکال اور اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں پر نہ چل پڑے اور کسی خلاف عقل (Irrational) بات کو نہ سراہے یعنی مختصر طور پر۔

(۱) واقعات کو جوں کا توں پیش کر دینا۔

(۲) انسان کے نسلی ارتقاء (ڈارون کے نظریہ کے مطابق) اور تہذیبی ترقی کے ساتھ مطابقت رکھنا اور "عقل پرستی" کا اعلان کرنا۔

اب دیکھئے اس بظاہر ٹھوس اور "جامد ادب" میں جذباتی رنگ آمیزی کی گنجائش کس طرح نکلتی ہے۔ اس تصویر کشی پر غور کیجئے۔ ایک شخص جب اس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تو مختلف واقعات و حوادث کے انتخاب میں جن کو وہ اپنے رمانہ کے پلاٹ یا نظم کے منظر کے لئے منتخب کرتا ہے سراسر اپنے جذبات سے کام لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے جذبات کالعدم تو نہیں ہو جاتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ کبھی تو ادیب ایسی چیزیں پیش کرتا ہے۔ جو واقعی انسان کی "تہذیبی ترقی" کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور کبھی وہ ایسی گندہ فحش اور ناپاک تصویر لوگوں کے سامنے رکھتا ہے کہ پڑھنے والے کے "حیوانی جذبات" خواہ مخواہ برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ جس طرح عہد قدیم کو رومانیت کا شیوہ تھا۔ لیکن اگر کوئی پڑھنے والا ادیب کو اس امر کی طرف توجہ دلائے۔ تو وہ صاف طور پر "حقیقت پسندی" کی اصطلاح کو زبان سے نکال کر اس کا منہ بند کر دیتا ہے۔ اور اپنی جگہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر اس جھوٹی طمانیت سے واقعہ اپنی جگہ اسی طرح برقرار رہتا ہے۔ حقیقت پسندی کا بلند بانگ دعویٰ کرنے کے باوجود بیشتر ادیب رومانیت پسند ہی رہتے ہیں۔

اسی طرح "زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے اور عقلیت کا ہمرکاب بننے کا تصور ہر شخص کے ذہن میں جدا ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف محض اعتقاد کے فرق کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر شخص کے اپنے احساسات اسے ٹھوس اور متعین چیزوں کو مختلف زاویوں سے دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر ادیب اپنے منشاء کے مطابق ہی واقعات کو ترتیب دیتا ہے۔ جن کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر خاص طرح کے اثرات پڑتے ہیں۔ اسی طرح پیرو ہی "رومانیت" اور "جذباتیت" عود کر آتی ہے۔ اور دوسری مہذب شکل میں اپنا نقشہ جما دیتی ہے۔ (باقی آئندہ)

ابنِ فریدی بہار

خیال اپنا اپنا

"جھلکیاں" پر ایک نظر

غزل پر ایک سخت دور وہ بھی گذر چکا ہے جب اُسے ایک وحشی صنفِ سخن قرار دے دیا گیا تھا۔ اور پھر اُسکا مرعوب کُن تنقید سے متاثر ہوکر اسے انحطاط پذیر یا بوڑھا دور کی گھٹی ہوئی صنفِ سخن قرار دے دیا گیا تھا لیکن جب امتدادِ زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ غزل بڑی ہی سخت جان ہے تو اس میں محاسن کے مختلف پہلو تلاش کئے جانے لگے۔ بات اِس قدر نہ بگڑتی اور تاویلیں اِس قدر زیادہ نہ کرنی پڑتیں اگر پہلے سے ہی کوئی سوچا سمجھا اقدام کیا گیا ہوتا۔ جو ظاہر ہے غزل کے حق ہی میں ہوتا۔ لیکن یہ وقتی نفرت تو محض تمام پُرانی قدروں اور تمام پُرانے اسالیب ادب کو یکسر ٹھکرا دینے کے لئے تھی۔ تمام پُرانے کو تمام نئے کے سامنے بے وقعت قرار دے دیے کی تھی تاکہ اس انتشار و تحریب میں اچھے اور بُرے کی تمیز نہ کی جا سکے۔ پھر بھی کچھ سنجیدہ فکر ایسے بھی تھے جنہوں نے اس شور و غوغا پر ذرا بھی کوئی توجہ نہ دی اور متانت کے ساتھ اپنی فکری کاوشوں میں مشغول رہے۔ اِن میں اقبال وہ غزل گو ہیں جنہوں نے اس صنف کو وافر فکری مواد فراہم کیا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اس کے ذریعہ ایک ہم آہنگ اور متوازن طرزِ فکر کو پیش کیا۔ اِس دور میں یہی جوہر تھی جس نے غزل کو کافی جاندار بنا دیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ میر و غالب نے اقبال سے زیادہ بلند پائے کے اشعار کہے ہیں اور اُن کا مرتبہ بلند بھی ہے لیکن جس طرح موجودہ معاشرہ کے ایک ایک عمل میں ایک دوسرے سے قُرب اور تعلق ناگزیر ہے۔ اس کے لحاظ سے ان کے دو متذکرہ غزل گو شعرا کے یہاں اشعار میں واحد نظریۂ فکر کا اظہار سامنے نہیں آتا۔ لیکن اقبال نے نظم کی طرح غزل کو بھی فکری تسلسل سے آراستہ کیا ہے۔ ان کے اِتباع میں مختلف شعرا نے اپنی روِش تبدیل کی جگر اور فانی۔ اصغر اور حسرت ایسے بلند پایہ غزل گو شعرا کے یہاں بھی اس رجحان کی کافی عکاسی ملتی ہے۔ خواہ اس کا اثر انھوں نے براہِ راست اقبال سے نہ لیا ہو۔

غزل میں فکری تسلسل اور مختلف بیہ خیالات کا آزادانہ اظہار اس کے لئے مزید سے رنگی کا باعث ہوا کسی نقاد نے غزل کے بارے میں اس تاثر کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کیا تھا کہ غزل کے تمام اشعار ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی اِس طرح منسلک ہیں جیسے ہماری دن بھر کی مصروفیات یکے بعد دیگرے انجام پذیر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں رکھتیں۔ یہ حیثیت غزل کے دامن کو اس قدر وسیع کر دیتی ہے کہ اس کے ہر شعر میں مجمل طور پر خیالات و افکار کے انبار لگا دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اندر اس قدر ہمہ گیری اور آفاقیت پیدا کر لیتی ہے کہ وقتی احتجاجات اس پر اثر انداز نہیں ہو پاتے ہیں۔

غزل پر جس زمانہ میں سخت دور گذر رہا تھا۔ چند ہی ایسے غزل گو شاعر تھے جنہوں نے اسے اپنائے رکھا۔ ان میں جگر و حسرت ایسے شعراء کے علاوہ اور بھی چند ایک ایسے شاعر ہیں جو زیادہ معروف نہیں ہو سکے۔ عروج زیدی بدایونی انھیں میں سے ایک ہیں۔ غزل کو انھوں نے ہمیشہ اپنائے رکھا۔ اور اپنی جودتِ فکر کو زیادہ تر اسی صنفِ سخن کے ذریعہ اظہار کا موقع دیا ماہر القادری نے عروج کے بارے میں لکھا ہے کہ "عروج دل سے نگاہ تک محبت ہی محبت ہیں"۔ ؎

دُعا مانگی تھی میں نے اپنا دل آباد رہنے کی
فقط اتنی خطا پر اُس کی ویرانی نہیں جاتی

اور یہ بھی کہ عروج محسوس ہوتے شعر کہتے ہیں۔ انھوں نے شعروں میں اپنی زندگی سمونے کی کوشش کی ہے۔ ؎

میری غزلیں صرف غزلیں ہی نہیں ہیں اے عروج
سرگزشتِ دل کی جیتی جاگتی تصویر ہیں

آپ نے جب سے مرے دل میں جگہ پائی ہے
سانس لینے میں بھی اندیشۂ رُسوائی ہے

اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ شاعر خواہ کتنا ہی اپنی زندگی اور اپنے مشاغل سے اشعار کو بالاتر رکھنے کی کوشش کرے مگر وہ جو اس کے تحت الشعور میں پرورش پاتا رہتا ہے اپنے اظہار کا پورا موقع فراہم کر لیتا ہے۔ شاعر اس سے کس طرح بچ کر نہیں جا سکتا۔ اِس لئے عروج نے اپنے اشعار میں جس زندگی کو سمویا ہے۔ اس کے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ عروج کے کلام کو سامنے رکھا جائے۔

غزل کا پہلا تقاضا ہے کہ شاعر جنون و مستی کے عالم میں کھو رہا ہے۔ اس کے

احساس تپ سخت درد دل اس طرح چھایا رہتا ہے کہ وہ تمام خارجی کیفیات کو داخلی کیفیات میں تبدیل کر دے۔ اور جب وہ کچھ پیش کرے تو دوسروں کا غم بھی اس کا اپنا غم بن جائے۔ عروج کا تمام سرمایۂ شعر انھیں کیفیات کی غمازی کرتا ہوا پایا جاتا ہے ؎

آپ کی پہلی لطف ہے جو کہ سارا دور ازل
آپ سمجھے تھے بھری محفل میں یا سمجھا تھا میں

خدا کے واسطے اب ناخدا بن کر چلے آؤ
جھکولے کھا رہی ہے کشتی عمر رواں میری

اس آرزو میں ہر ستم ناروا قبول
تکلیف التفات گوارا کریں گے آپ

یہ تو میں بھی جانتا ہوں ضبط کرنا چاہیے
اور اگر بڑھ جائے دل کی تشنگی تیرے بغیر؟

در جنت پہ میں نے سجا تو یہ پیغام آیا
جہاں پہلے پہل کھائی تھی ٹھوکر وہ مقام آیا

جنت ... کر جنت گھٹ رہی
کس جرم کی تم نے مجھ کو سزا دی؟

عروج بدایوں کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے ذرہ ذرہ میں شعریت رچی بسی ہوئی ہے۔ لیکن فانی نے اپنی غم پسندی کو عام کر کے وہاں کے لئے اس کو بھی ایک شعار قرار دے دیا ہے۔ بدایوں کے اب تقریباً تمام ہی اچھے شعرا اس وادی میں دو چار قدم ضرور آگے چلتے ہیں۔ عروج نے بھی اس دشت میں بادیہ پیمائی کی ہے ؎

عروج آتی ہیں جب غم کی گھٹائیں سر پہ منڈلا کر
تسلی کے لئے فانی کا دیواں دیکھ لیتا ہوں

یہ تو صرف خراج عقیدت ہے ورنہ ؎

رات دن میری طرح غم سے ہم آغوش ہے کون؟
میں وفاکوش ہوں تو وفاکوش ہے کون؟

جب کوئی غم کا طلب گار ازل میں نہ ہوا
دل نے آواز دی بڑھ کر کہ یہ انعام مجھے

کر رہی ہے ضبط کی تاکید چشم دل نواز
درد اب سینے میں کروٹ بھی بدل سکتا نہیں

غم کا جو محرم نہیں اسرار کی منزل نہیں
ایسے دل کو دل کہے جاؤ مگر وہ دل نہیں

کثرت اندوہ غم میں بھی جئے جاتا ہوں میں
زندگی اک زہر ہے لیکن پئے جاتا ہوں میں

مجبوریٔ وفا کا افسانہ کیا سناؤں
نالاں ہوں زندگی سے لیکن پڑا ہے جینا

لیکن اس کے برخلاف ایک اور جذبہ ہے جو عروج کو قنوطیت پسندی پر قناعت کرنے نہیں دیتا ؎

تنگ آ گئے ہیں کوشش ضبط فغاں سے ہم
ٹکرا نہ دیں زمیں کو کہیں آسماں سے ہم

یہ دبی آگ ہے اس سے دھواں اٹھتا یقینی ہے
شریعت عاشقی میں کوشش ضبط فغاں کب تک

اتنی غم آزمائی کیوں ہے؟
...

ان میں ایک غرور ... جذبہ ... جواں کے اور ایسا استغنا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ... کی پوری ... ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

عروج نے اس پیغام کو اپنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ حالانکہ انھوں نے صوفیاء کی معروف بیخودی کے بحر غواص میں غوطے لگائے ہیں ؎

جینے بھی انسان پر کھلتا نہیں ہے یہ عروج
اک فریب مستقل ہے جان و تن کا واسطہ

آغوش موج حسن میسر کہاں عروج
وہ قطرہ ہوں جو واصل دریا نہ ہو سکا

اور اسی رو میں گناہ کو بھی رواجی پسندیدگی کی سند دی ہے ؎

ان کی رحمت ڈھونڈتی پھرتی ہے محشر میں عروج
آج وہ دن ہے گنہ گاری پہ مجھ کو ناز ہے

یقین رحمت باری ہے وجہ معصیت کوشی
کوئی میری طرح مجبور عصیاں ہو نہیں سکتا

ؔ اس وقت میرے سامنے بغرض تبصرہ عروج زیدی بدایونی کا مجموعۂ کلام "جھلکیاں" ہے۔ اسے نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات سائز ۲۲×۱۸ کاغذ سفید چکنا۔ طباعت ... قیمت تین روپے (...)

دیکھ لے محشر میں زاہد میری شانِ معصیت
معرفت کی گود میں آسودہ ہیں رسوائیاں

اُمیدِ عفو کی یہ بےسرو سامانی نہیں جاتی
گنہ کرتا ہوں لیکن پاک دامانی نہیں جاتی

حالانکہ ایک خدا پرست کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ دانستہ گناہ کرے اور گناہ بھی خداوند کریم کو آزمانے کے لئے۔ پھر یہ بھی کہ گناہ دانستہ کرنا انسانی وقار کے منافی ہے۔ اس سے تو اگر کوئی خطا ہو جائے تو عفو کا طلبگار ہو جانے کے بعد دوبارہ اس طرف رخ نہ کرے۔ ہاں اس طرح کی تمام نادانستہ لغزشوں پر ادمان سے رجوع پر وہ ضرور بخشش کا حقدار ہوگا۔

تصوف کی مروجہ بے اعتدالیوں میں سے وحدت ادیان بھی ایک ایسا نظریہ ہے جس نے الٰہ واحد کے تصوّر کو بڑا ہی غیر واضح اور ناقابلِ فہم بنا دیا ہے۔ عروج نے کہیں کہیں اس کو بھی اپنا موضوع بنالیا ہے۔

ترے عروج کو دیر و حرم سے کیا مطلب؟
اسے طواف کو تیرا حریمِ ناز رہے

آتی ہے مجھ کو دیر و حرم سے صدائے دوست
نغمے تو مختلف ہیں مگر ایک ساز ہے

سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اللہ کے بارے میں تمام متضاد نظریات درست ہیں تو پھر اسلام نے اللہ احد کے اس مخصوص تصوّر کو کیوں پیش کیا جو اس سے ایک متوازن زندگی اور صالح عبودیت کا متقاضی ہے۔ اس تصوّر کے خلاف تو میں عروج ہی کے شعر پیش کئے دیتا ہوں۔ شاید حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لئے یہی کافی ہو ؎

جادۂ مہر و وفا میں لغزشوں سے ہوشیار
اس روش پر ٹھوکریں کھاتے ہیں فرزانے بہت

احتیاط اے راہ ایماں کے مسافر احتیاط
راہِ کعبہ میں بھی مل جاتے ہیں بت خانے بہت

بہرحال یہ فروگذاشتیں ہیں جو کسی مخصوص تصوّر سے رغبت کے بعد عروج صاحب میں پیدا ہو گئی ہیں ورنہ ان کا خودداری اور خود اختیاری کا جذبہ ان کے برخلاف بہت اعلیٰ ہے ؎

حریمِ ناز کے جلوؤں پہ اک تنقید لکھنی ہے
ہم اپنی خود فراموشی کو عنوانِ بیاں کرلیں

میں نہیں ہوں آج تک شرمندۂ احسانِ دوست
میرے دل کی ہر تمنا اب بھی میرے دل میں ہے

کیا حوادث سے ڈریں پروردۂ سیلاب ہیں
پاس آکر دور ہو جاتے ہیں خود ساحل سے ہم

میں اپنی زباں سے تو کہتا نہیں افسانہ
صورت سے نمایاں ہے حالِ دلِ دیوانہ

نہ گھبرا اے ہجوم رنج و کلفت دیکھنے والے
یہ عالم دیکھتے ہیں دورِ عشرت دیکھنے والے

خودداریوں کو ناز ہے مجھ خستہ حال پر
محتاج ہوں مگر کبھی ساحل نہیں ملا

مصیبت سے نہیں ڈرتا کہ ہمت ہے جواں میری
ہمیشہ برق سے کھیلی ہے شاخِ آشیاں میری

ایسے تمام مقاموں پر عروج ایک ایسے انسان نظر آتے ہیں جو ہمیشہ ستیزہ کار رہنے والا ہو۔ جو ہمیشہ شمشیر خاراشگاف ہو۔ جو اپنی ناکامی کو صبح اور اپنی محرومیت کو اپنے لئے تطہیرِ نفس تصوّر کرے۔ ان میں ایک ایسی بغاوت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کو تند و تیز مصائب کے جھونکوں [illegible] مسکراتے اور نغمے بکھیرنے پر اکسا دیتی ہے۔ اور وہ ستم ہائے تازگی ناوک [illegible] ہوئے بھی چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں ؎

یہ سمجھ کر کھا رہا ہوں جھوٹے وعدوں کا فریب
وہ تو کیا آئیں گے لطفِ انتظار آجائے گا

جنوں پر مرے آپ ہنس تو رہے ہیں
کہیں خود تماشا نہ بن جائیے گا

لیکن جب وہ اس خودداری اور شوخی ہی شوخی میں آگے بڑھ جاتے ہیں تو بات بنتی نہیں بگڑ بھی جاتی ہے ؎

میں کبھی ہرگز نہ جاتا باغِ جنّت میں عروج
وہ تو یہ کہئے اسے ہندوستاں سمجھا تھا میں

عروج احساسِ خودداری جہاں مجروح ہوتا ہو
وہاں کعبہ بھی ہو تو ہم اُدھر سجدہ نہیں کرتے

عروج کے اندر ایک صالح جذبہ بڑے لاشعوری انداز میں پرورش پا رہا ہے۔ اس سے شاید وہ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اور جو اپنا اظہار اکثر بڑے لطیف انداز میں کر جاتا ہے ؎

آپ خود آواز دے کر رہنمائی کیجئے
کھو گئے ہیں درمیانِ کعبہ و بُت خانہ ہم

اس کا مخاطب کون ہے عروج شاید اس سے پوری طرح آگاہ ہیں ؎

میرا سجدہ بُت کے قدموں پر مچل سکتا نہیں
دینِ برحق کفر کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
میں ہوں عاصی وہ خطا پوش حقیقی ہے عروج
اس کی رحمت کے سوا میرا خطا پوش ہے کون

اور اس سے اپنے تعلق کو بھی پہچانتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کو ان کی زندگی پر ان کے دل و دماغ پر اور ان کی کیفیات پر کیا اختیار حاصل ہے ؎

میں کہاں اور کہاں جرأتِ عرضِ مطلب
اعتبارِ کرم دوست کی سزا پائی ہے

چنانچہ وہ خود اپنے اندر اس کیلئے ایک والہانہ کشش پاتے ہیں ؎

سچ تو یہ ہے کہ بندگی، عین شہود کا ہے نام
یہ بھی کوئی نماز ہے، آپ نہ ہوں نماز ہو
یہ تو میں بھی جانتا ہوں صبر کرنا چاہیئے
اور اگر بڑھ جائے دل کی تشنگی تیرے بغیر؟

[illegible] کریں تو ہم دیکھیں گے کہ شاعری کا صحت مند رخ جو عروج اپنے شاذ و نادر اشعار کے ذریعہ ہی پیش کرتے ہیں ادب میں لافانیت۔ پائیداری اور دوام پیدا کرسکتا ہے۔ اب انسانیت مختلف راہوں پر ٹھوکریں کھاتے کھاتے تھک چکی ہے۔ اور پھر اُسی سمت کو مڑنا چاہتی ہے جدھر سے اُس نے متعدد بار فرار اختیار کیا ہے۔ ایسے موقع پر ہمارا ہر فعل اور ہماری ہر فکری کاوش کو ایک انتشار اور پراگندگی کے پیش کرنے کے بجائے یکسو ہو جانا پڑے گا۔ [illegible] ایک سلیقہ مندی اور رفعتِ خیال پیش کرنا پڑے گا تاکہ ہمارے وہ انعکاسات جو ہمارے جذبات کے سہارے عالمِ وجود میں آتے ہیں دوسروں کے جذبات کو بھی صالحیت اور انسان دوستی اور فلاحِ عالم کے لئے متحرک کرسکیں۔ ورنہ پھر تباہی اور ہولناکی کے گڑھے میں گرتی ہوئی نسلِ انسانی کو ہم ایک اور دھکا دینے سے زیادہ کچھ نہ کرسکیں گے۔ عروج نے انسانیت کے لئے اس سخت لمحہ کو محسوس کیا ہے لیکن ابھی یہ احساس زیادہ واضح اور ترشا ہوا نہیں ہے۔ کاش وہ اپنی صلاحیتوں کو کلیتاً اس طرف لگا دیتے ؎

مآلِ تبسم پہ نالاں ہیں میری نظریں
خوشی میں بھی رونے کو جی چاہتا ہے

میں خوب جانتا ہوں ہر اک شے کی ماہیت
ہاں اپنی ذات کا مجھے عرفاں نہیں ہنوز

تہذیبِ نو کو ناز ہے اصلاحِ حال پر
لیکن یہ کیا کہ آدمی انساں نہیں ہنوز

دوستوں سے دشمنی کرنا مبارک ہو تمہیں
میں نہیں پابند ہرگز اس نئے دستور کا

مشربِ ہی عروج اپنا دنیا سے نرالا ہے
ہر ایک مصیبت پہ ہے سجدۂ شکرانہ

آپ کو اس پہ ناز کیوں ہے عروج
زندگی بے ثبات ہوتی ہے

جاہلوں کو بھی فکرِ شعر کا دعویٰ عروج
عہدِ حاضر دے رہا ہے شاعری کے فن میں آگ

یہ مری افتاد پر احباب کا احسان ہے
خود بھی اِک ٹھوکر لگا دی مجھکو گرتا دیکھکر

دوسروں کو متحد وہ کیا کریں گے اے عروج
اپنے گھر والوں کی جو تنظیم کرسکتے نہیں

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے عروج کے بارے میں کہا ہے۔

"عروج ایک نوجوان شاعر ہیں اور ان کی شاعری بھی جوان ہے مگر وہ موجودہ ادب کے گمراہ کُن رجحانات سے غیر متاثر ہیں"۔

ہم ان کے آیندہ کلام میں صالحیت کا اظہار بیش از بیش دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ

آدمی میں وسعتِ ذوقِ بصیرت چاہیئے

خطوط و نکات

مولانا امام الدین صاحب رام نگری

جنوری ۱۹۵۵ء کا معیار آج ملا۔ نقشِ اوّل سے معلوم ہوا کہ معیار کا سفینہ کس طرح غرقاب ہوتے ہوتے بچا۔ آپ نے معیار سے تعلق رکھنے والے مختلف حلقوں کا جو تذکرہ کیا ہے اس کے پیشِ نظر افسوس بھی محسوس کر رہا ہوں اور پشیمانی بھی کہ اس مرحلے پر معیار کے لئے اپنے کو کچھ کرنے کے قابل نہیں پا رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ ایسی باتوں کی کوئی قیمت نہیں لیکن ایسے موقع پر دو کلمے تعلقِ خاطر کے نہ کہنا بھی انسانیت و اخلاق کے کس قدر خلاف ہے۔

آپ نے نقشِ اوّل میں جو اپنا مشاہدہ اور برنارڈ شا کا جو قول نقل کیا ہے وہ میرے جیسے عمر رسیدہ کے لئے بھی سبق آموز ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کی ہمت کو مزید استحکام عطا فرمائے۔ اور آپ نے جو لائحۂ عمل بنایا ہے۔ اسے کامیابی سے نوازے۔

انور صدّیقی۔ جون پور

میں "معیار" کی توسیعِ اشاعت کے لئے کوشاں ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی چند خریدار اور دوں گا۔ بدر فاروقی صاحب کی خدمت میں ارمغانِ آداب پیش کریں۔ حفیظ صاحب پر آپ کی عملی تنقید نظر سے گذری۔ اس سے شعرا پر الگ الگ لکھنے کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس مقالہ میں اگر آپ اُن "اضافوں" (Contributions) کا بھی تجزیہ کر سکتے جو حفیظ نے کئے ہیں۔ تو مقالے کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

کیفی امروہوی۔ دہلی

کئی مہینے کے انتظار کے بعد "معیار" ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ لوگ اِس کٹھن امتحان میں ثابت قدم رہے۔ "معیار" کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو آپ جیسے مخلص اور پیہم جد و جہد کرنے والے کارکن ملے۔ میں آپ کو اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو ان کی مستقل مزاجی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں "معیار" جیسے صالح مجلوں کا باقی رہنا انتہائی ضروری ہے۔

آپ کا مضمون بھی خوب ہے۔ حفیظ صاحب پر اس قسم کے مقالے کی سخت ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس ذمّہ داری کو بڑے سلجھے ہوئے انداز میں پورا کیا ہے۔ ان کی زندگی کے یہ دونوں رخ اور اس پر مختصر تنقیدی اشارات اور اس کے کلام کا اقتباس یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی روشنی میں حفیظ صاحب پر مزید بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ چونکہ پہلا مضمون تھا اس لئے اپنی نوعیت۔ اندار اور ضرورت کے لحاظ سے بہت ٹھیک ہے۔ ضرورت ہے اب اس کے بعد اسی کی روشنی میں یا اس سے قطعِ نظر کچھ نئی قدریں بھی سامنے آئیں۔ کیونکہ یہ مضمون دوسروں کے لئے (حفیظ صاحب کے جانے پہچانے ہونے کے باوجود بھی) تعارفی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے بعد بہت کچھ گنجائش ہے۔

ابنِ فرید صاحب کا خاکہ بھی نظر سے گذرا۔ عنوان تو بہت مناسب ہے لیکن نفسِ تنقید یا احساسِ تحریر کچھ بلند نہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیچڑ اچھالنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ بس رہی بقدرِ حیات ہو تو محبوب ہوتی ہے" بہتے ہوئے لہو میں نشتریت سے کیا حاصل؟

شاکر تسلیم کی غزل اور مطیع الرحمٰن اختر کی نظم "سحر" بہت پسند آئی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

شبنم سبحانی۔ الٰہ آباد

اِدھر ایک طویل عرصے سے میں معیار کی (نعتیہ نمبر کے بعد) کوئی بھی کاپی نہ دیکھ سکا۔ اور نہ آپ لوگوں کے کچھ حالات کا ہی علم ہوا۔ البتہ کا ہے گاہے اگر ہے

آپ کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم ہوجایا کرتا تھا۔ لکھنؤ میں اسلام پسندوں کے اجتماع میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہاں معیار کی تازہ اشاعت نظر سے گذری۔ آپ حضرات کے حالات کا علم ہوا۔

"معیار" کے ظاہر و باطن سے اس بار اس قدر متاثر ہوا کہ آپ لوگوں سے پھر ربط پیدا کرنے کی ایک زبردست لہر دل میں اٹھ پڑی اور اسی کے تحت یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ معیار کے مالی استحکام کے لئے ہم سب کو ہاتھ بٹانا ہے۔ اور اس کے لئے میں الہ آباد کے رفقاء کو متوجہ کروں گا۔

قیام الدین۔کراچی

آپ کے خط اور "نقش اول" نے مجھے نہ صرف چونکا دیا بلکہ عدیم الفرصت ہوتے کے باوجود احساس ندامت میں اب تک مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس قدر دور رہ کر آنسو تو بہائے جاسکتے ہیں مگر آپ کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے عملاً کوئی امداد نہیں کی جاسکتی۔ امیں محض سالانہ چندہ بھیجتے رہنے کو کوئی خاص امداد میں سمجھتا ہوں۔

اگر معیار کے احباب بلا کر صرف سالانہ چندہ ہی پابندی سے بھیجتے رہیں تو یہ رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔ مجھے نجم الاسلام صاحب کے مقالے "حفیظ میرٹھی" نے بہت ہی محظوظ کیا۔ بات یہ ہے کہ حفیظ صاحب کے یہ اشعار ان حسین ساعتوں کی یادگار ہیں جب میرٹھ میں وہ بات بھی تھی۔ حفیظ صاحب کی مزاج پرسی فرمائیے۔ اور بہت بہت سلام کہہ دیجئے۔ تازہ کلام کی فرمائش ان سے اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ کوئی چیز کسی دیوانہ سے حاصل کی جاسکتی ہے مگر شاعر سے نہیں اور پھر وہ تو دیوانہ اور شاعر دونوں ہی ہیں۔

اے۔ایچ۔خان۔پونہ

معیار کا اداریہ پڑھ کر اور اس کے حالات کا اندازہ لگا کر واقعی افسوس ہوا۔ مزید آپ کے خط نے بے چین کر دیا۔ اپنی حقیر پیشکش ایک ڈرافٹ مبلغ ... . بھیج رہا ہوں۔ حتی الامکان انشاءاللہ اشاعت کے لئے کوشش کروں گا۔ اور جس قدر قدرت ہوسکے گی اس میں بھی دریغ نہ کروں گا۔

ہمارا تنقیدی نقطۂ نظر
(بقیہ صفحہ ۴۵)

معلوم ہوتی ہے لہٰذا انھیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے اور یوں بھی تحریک کیلئے ابھی نظریاتی تنقیدیں ہی سودمند ہیں۔ عملی تنقید کا دور تو لبعد میں آئیگا۔

اس مختصر سے تنقیدی جائزے کے بعد میں تعمیر پسند ناقدین کو چند مشورے دینا چاہتا ہوں تعمیر پسند تنقید کو شروع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے پھر بھی اس نے اس قلیل عرصے میں بہت سے پائدار کام کئے ہیں ——— لیکن تنقید نگاری کچھ آسان فن نہیں ہے اسکے لئے بڑے استدلالی اور متوازن ذہن کی ضرورت ہے۔ T-S ELIOT نقاد سے آفاقی فطنت (Universal Intelligence) کا مطالبہ کرتا ہے۔ CAZAMIA نے تو کہا ہے کہ A critic should be a myriad man

ہمارے ناقدین کو اسلامی قدروں اور ادبیات عالم کا شعور بڑھانا چاہیئے۔ ادب کو اس کے تسلسل میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ذی احترام اور برگزیدہ روایات کا احترام کرنا چاہیئے۔ ہمیں ادب کے سارے سرمائے میں سے صحت مند قدروں کا تجزیہ کرنا ہے اور انھیں سماج پر غالب کرنا ہے۔ "معیار" کے تنقیدی سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے تمام ناقدین اپنے تنقیدی شعور کو بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ انکے لئے بھی اچھا شگون ہے اور تحریک کے لئے بھی۔

پرنٹر پبلشر — محمد جمیل خاں
کمال پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت خندق اسٹریٹ



Only Title Page Printed at Pilot Press, 3762, Churiwalan, Delhi


معیار
Maiyar

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ـــــ ۵
نمبر ـــــ ۳

مارچ ۱۹۵۵ء

معیار

مدیر
نجم الاسلام

جملہ خط وکتابت، ترسیل زر اور تبادلہ رسالے کے لئے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ
احمد نور صاحب فیصل لائن جیکب آباد

ترتیب

نظمیں

مقالے

غزلیں

افسانے اور خاکے

مثنوی

خیال اپنا اپنا

نقشِ اوّل

ایک نئی ادبی تحریک جو نظم و ترتیب کے ساتھ بروئے کار آرہی ہے۔ اپنے معاونین سے کچھ مطالبے کر رہی ہے۔ کیا ہم نے اِن مطالبوں کو سننے سمجھنے اور پورا کرنے کا عزم کر لیا ہے؟ اس کا جواب آپ کو دینا ہے۔ آیئے ان مطالبوں کو سنیں سمجھیں اور پورا کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ اِس وقت ہمارے سامنے داخلی تیاری کے لحاظ سے کئی اہم باتیں ہیں۔

۱ــــــ فکر و خیال کی قوّتوں کا تخلیقی کاموں میں استعمال۔

۲ــــــ تخلیقی تفکّر کا اِرتقاء۔ تعلیمی، اِصلاحی اور ادبی زاویوں سے۔

۳ــــــ ادبی تحریک مزاج کی تشکیل اور مخصوص تصانیف کی پرورش۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان موضوعات پر تفصیل سے کچھ کہا جا سکے۔ لیکن مجمل طور سے کہا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تخلیقی کاموں کے مسئلے ہی کو لے لیجئے۔ اس پر عرصے سے کافی توجّہ دی گئی ہے۔ ابتدائے کار میں بھی ہمارے یہاں بہت کچھ تخلیقی کام ہوا ہے۔ شعر و ادب کی بہت سی اصناف میں کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔ بہت سے تجربے ابھی کئے جاتے ہیں۔ اِن تجربات کی بنا کیا رہی ہے؟ یہ سب جانتے ہیں۔ اِن تجربات کی بنا اِسلام کا تحریکی تصوّر ہے۔ جو تعمیر پسند ادیبوں کے فکر و خیال کی قوّتوں کو چلائے رہا ہے۔ یہ تصوّر اپنے اندر اجتماعی تقاضوں کا پورا پورا شعور رکھتا ہے۔ اور یہی اس کا وصفِ امتیازی ہے۔

اب جبکہ ایک ادبی تحریک ایک مخصوص مزاج کی تشکیل کر رہی ہے۔ اپنے بنیادی تصوّر کے امتیازی اوصاف کو بھلا نہیں سکتی۔ اس وقت پہلے سے زیادہ گیرائی اور گہرائی کے ساتھ بنیادی تصوّرات کو نکھارنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے مطالعہ شرطِ اوّلیں ہے۔ مطالعہ کے بعد غور و فکر اور آزادانہ سوچ بچار کا مرحلہ آتا ہے۔ غور و فکر ہر کام کے لئے لازم ہے مگر ادبی کام چونکہ ایک تخلیقی کام ہے اِس لئے یہاں غور و فکر کی نوعیّت تخلیقی ہو جاتی ہے۔ اور اس کو تخلیقی تفکر (CREATIVE THINKING) کہا جاتا ہے۔ تخلیقی تفکر معمولی قوّتِ غور و فکر سے قدرے مختلف چیز ہے۔ اس کے کچھ شرائط و ضوابط ہیں جنہیں پورا کرنا ضروری ہے۔ تخلیقی تفکر سب سے پہلے اعلیٰ درجہ کا نفسیاتی اور اخلاقی ورک چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے جب بھی ہم تخلیقی فکر کو ترقی دینا چاہیں گے۔ اسے دو مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔ ایک تعلیمی نفسیات کے تربیت دوسرے اصلاحی نفسیات کے اُتار چڑھاؤ سے۔ تعلیمی نفسیات اور اصلاحی نفسیات کی اصطلاحیں شاید اپنا مفہوم پوری طرح ادا نہ کر سکیں اور تشریح طلب ہوں۔ اِس لئے یہ اشارہ ضروری ہے کہ تعلیمی نفسیات سے مراد نفسیات کا وہ مطالعہ ہے جس کے ذریعہ ہم ذہن کی داخلی ساخت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نفسیات بتاتی ہے کہ ذہن کی نشوونما کن حالات میں ہوتی ہے۔ کیا کیا چیزیں اس کے لئے ضروری ہیں۔ قوّتِ غور و فکر کن کن عوامل سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ابنِ خلدون کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے یہاں اس طرف واضح اِشارے ملتے ہیں۔ جدید ماہرینِ نفسیات میں بھی بہت سے ناموں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ماہرینِ تعلیم و نفسیات جو اخلاقی اور مذہبی رجحان کے لئے مشہور ہیں۔ ان میں ٹیشا نوری کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ان سب نے تعلیمی نفسیات سے فائدہ اُٹھا کر ذہنی ترقی اور قوّتِ فکر کی بالیدگی کے کچھ اصول اخذ کئے ہیں۔ ہمیں ان کے اصولوں پر ایمان نہیں لانا ہے۔ لیکن ان کے کئے ہوئے کام سے فائدہ اُٹھا کر اپنے لئے خود کچھ اصول اخذ کرنے ہیں۔ اور اپنے مزاج کے مطابق ذہنی تعمیر کی راہیں بنانی ہیں۔ اور اس کے لئے ان سب مفکرین اور ماہرینِ تعلیم کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

اس کے بعد ہم اپنے آپ کو اس پوزیشن میں لا سکتے ہیں کہ انفرادی خصوصیات کو نظر میں رکھتے ہوئے ادب کے تخلیقی کام کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔ اور تخلیقی تفکر کے بنیادی اصولوں کو ادب کی پر منطبق کر سکیں۔ یہی ہمارا منشا ہے۔

اَب رہی تیسری بات یعنی ادبی تحریک کے مزاج کی تشکیل اور مخصوص فضائیت کی پرورش کا معاملہ۔ حقیقت میں تعمیر پسند ادبی تحریک کے مستقبل کو روشناس بنانے کا واحد پائیدار طریقہ یہی ہے کہ اس تحریک کا مزاج پوری طرح نکھر جائے اور ایک مخصوص فضائیت پیدا ہو جائے۔ یہ فضائیت اور مزاج کسی حد تک ہمارے یہاں اب بھی موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روز بروز اپنے آپ کو طاقتور پا رہے ہیں لیکن اس میں اتنی پختگی پیدا کر دینی ہے کہ انفرادیت کی وہ کمزوریاں اور خرابیاں جو ہر نیا آنے والا اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ لاتا ہے۔ اس ماحول میں پنپ نہ سکیں۔ ان کو برداشت کرنے پر ہمارا مزاج تیار نہ ہو۔

مخصوص تعمیری مزاج اور فضائیت کو پروان چڑھانے اور پختگی دینے کے لئے جو قدم اٹھانے ہوں گے، بہت کچھ کام تو مطالعہ ہی کرے گا۔ اس کے علاوہ کچھ تنظیمی اقدام بھی کرنے ہوں گے ——— تعمیری تحریکات پر زیادہ سے زیادہ لٹریچر، فکر و عمل کی مطابقت۔ اجتماعی شعور کی ترقی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کام کئی طریقوں سے کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ارباب فکر و دانش کی ایک تنظیمی مجلس کا قیام ضروری ہے۔ تفصیلات میں جانا اسی کا کام ہے۔ ذہنی تربیت کے شعور سے کئی کام متعلق کئے جا سکتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ ہر ایک معاون کی ذہنی صلاحیتوں کے مطالعہ کا مسئلہ ہے۔ اگر ہمارا مطالعہ ٹھیک رہتا ہے تو ادبی تحریک کسی موڑ پر بھی غلط روی کا شکار نہیں ہوگی۔ دوسرے تقسیم کار کا تجربہ بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے لیکن ایک بات اس معاملے میں بہت ضروری ہے کہ اس میں خیال انگیزی ہی کو نہیں قابلیت عمل (WORKABILITY) کو بھی اتنا ہی دخل ہونا چاہئے۔

ابھی ہمارے ہاں ادبی نظریات پر اجتہادی شدت و رطوبت نظر نہیں آتی۔ یہ کام بھی کرنے کا ہے۔ پھر فکر و عمل کی مطابقت کو لیجئے۔ ادب میں تحریکیت کے عناصر داخل کرنے کی اولین شرط دراصل یہی مطابقت ہے۔ ورنہ کامیابی معلوم ——— غرض مدعا یہ ہے کہ تعمیر پسند ادبی تحریک میں انتقاد اور خود انتقادی کو بنیادی اہمیت حاصل ہو جانی چاہئے۔ کیونکہ اوپر کے سب کام تنقید ہی سے متعلق ہیں۔

مالی استحکام کے سلسلہ میں معیار کے خیرخواہوں کی کوشش ہمارے لئے بہت حوصلہ افزا ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک ضروری گذارش ہمیں قلمی تعاون کے بارے میں بھی کرنی ہے۔ گزشتہ دو ماہ سے مضامین موصول ہونے کی رفتار انتہائی مایوس کن ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو اندیشہ ہے کہ "دورِ تاخیر" کہیں پھر شروع نہ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ اشاعتوں کی تاخیر توسیع اشاعت پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ مضامین حاصل کرنے کے لئے جتنی کوششیں ادارہ کی جانب سے ہونی چاہئیں۔ وہ نہیں ہو پائیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ "معیار" کے ادارۂ تحریر کے سب ہی حضرات گذارے کو اپنے ذرائع معاش معیار کی حدود سے باہر تلاش کرنے پڑ رہے ہیں۔ اب قارئین خود ہی اندازہ لگالیں کہ غریب "معیار" کے حصہ میں کتنا وقت آتا ہوگا۔ بقول صاحب نظرے "موجودہ معاشی نظام اتنا نالائق ہے کہ کسی کو دو وقت کی روٹی نہیں دیتا جب تک کہ اس کا سارا وقت اور اس کی تمام قوتیں شوخت نہ لے"۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے قلمی معاونین ہماری معذوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے "معیار" کو معیاری مواد (MATTER) کے فقدان کی مزید شکایت کا موقع نہیں دیں گے اور ہم بھی خط و کتابت کا انتظام کرکے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

محمد نیاز

عرضِ نیاز

ہم اے حریفو! زمیں پہ رہتے ہیں اور ہیں آسماں سے واقف
ہٹاؤ برقِ تپاں کے چرچے، کہ ہم ہیں برقِ تپاں سے واقف

یہ علم و فن کے نگار خانوں کی سیر و تفریح کرنے والے
اسی قدر آپ ہیں غافل، کہ جس قدر این و آں سے واقف

بڑا ہی دشوار ہے کہ فرقِ بیانِ عشق و ہوس کو سمجھو!
یہی بہت ہے کہ یہ گماں ہے کہ ہو زبان و بیاں سے واقف

گیا ہے گلچیں تو باغباں خود رواں ہے نقشِ قدم پہ اس کے
بتائے دیتے ہیں، پھر نہ کہنا کہ ہم نہ تھے باغباں سے واقف

کچھ اور تاروں کا خون پی پی کے تیرہ شب تیرہ تر ہوئی ہے
مزاجِ ہر ذرہ ہے تمھاری سحر گہِ ضو فشاں سے واقف

لیا ترے آستاں کا نام اور سنتے ہی لوگ مسکرائے
مراد یہ تھی کہ ہم سمجھتے، یہ ہیں ترے آستاں سے واقف

کسی زباں پر حذر نہیں ہے، کسی کو چنداں خطر نہیں ہے
ابھی تو کوئی بشر نہیں ہے جنونِ آتش بجاں سے واقف

نہ منزلیں ہی نئی نئی ہیں، نہ کارواں ہی نیا نیا ہے
یہ کارواں منزلوں سے واقف یہ منزلیں کارواں سے واقف
صبا! بصد آفریں یہ تقریبِ پیشِ اخوانِ عصر کرنا
ہے وقت کا ہر شدید لمحہ تمہارے عزمِ جواں سے واقف
ابھی ہمارے خلاف کچھ ہی مشاغلِ دوستاں ہوں چھوڑو
یہ دوستوں سے کہو کہ ہم ہیں مشاغلِ دوستاں سے واقف
یہ پاسبانانِ ملک و ملت ہزار چوروں سے باخبر ہوں
وہ چور ہیں چور بھی کہ ہیں پاسبانیِ پاسباں سے واقف
حیات اظہار چاہتی ہے تو اہلِ دل منہ سے پھوٹتے ہیں!
وگرنہ دنیا میں کیا کمی ہے بہت ہیں شعر و بیاں سے واقف
تمہیں بھی دعویٰ ہے عشق ہی کا، ہمیں بھی دعویٰ ہے عشق ہی کا
تم آہ و نالہ سے بے خبر، ہم مذاقِ شور و فغاں سے واقف
خزاں کو فصلِ بہار کہہ لو، کہ تم ہو ناواقفِ حقیقت
وہ کیا کہے گا رہا جو بے در کے زندگی بھر خزاں سے واقف
یہ آب و گل کا فریبِ رنگیں، حسین دھوکا، خنک تماشا!
گئے وہ دن جب نظر نہیں تھی حقیقتِ جہوشاں سے واقف
یہ کون سی منزلِ طلب ہے، یہ کون سا عالمِ جنوں ہے
ینا نہ بے خانماں نہیں خود نیاز بے خانماں سے واقف

اختر بھٹناگر کاشی پوری

کیا کروں؟

آج بھی دسترس سے بہت دور ہیں
نکہت و رنگ کے کارواں کیا کروں؟
شمع جلتی نہیں، نیند آتی نہیں
کس کو دوں اپنی تنہائیاں، کیا کروں؟
مجھ پہ تسکین کی ہر راہ مسدود ہے
پھر تخیل کی محفل سجاؤں، تو کیوں؟
زندگی تیری میراث ہے تیرگی
روشنی کو نظر میں بساؤں تو کیوں؟
کون ہے کس کو آواز دوں، کیا کروں
رات کی لاش وزنی ہے، تنہا ہوں میں
وقت کہتا ہے چل، فرض کہتا ہے رک
کس مصیبت میں اس وقت اُلجھا ہوں میں
جھیل پر تیری نقرئی چاندنی
میرے احساس میں بجلیاں بھر گئی!
میں نے عنوان بھی جس کا سوچا نہ تھا
اُس افسانے میں رنگینیاں بھر گئی"

وقت کے روز و شب اُٹھتے طوفان میں
قافلے آرزوؤں کے گُم ہو گئے!
چاند بُجھتا رہا، دِل سِسکتا رہا
دَھڑکنوں کے فسانے لہو رو گئے
منزلِ گُم شُدہ ڈھونڈنے کے لئے
مشعلیں لے کے آہوں کی نِکلاہٹوں میں
راہِ پُرخار کی مُشکلوں کی قسم
اَن گِنت بار گر گر کے سنبھلا ہُوں میں
دُور شمشان میں جَل رہی ہے چِتا
زندگی تیرے انجام پر شاد ہُوں
حسبِ توفیقِ دِل آہ و نالہ کروں
اِس غُلامی میں بھی کتنا آزاد ہُوں
خودکشی کر کے مَر جاؤں یا چُپ رہوں
یا فلک بوس زرّیں مکاں پھُونک دُوں
اِک اِشارہ تو دو میری ناکامیو
تُم کہو تو میں سارا جہاں پھُونک دُوں

محمود عالم

سجدۂ شکر

خالقِ کون و مکاں
یہ ترے چاند ستارے یہ حسیں کاہکشاں
حُسن و انوار کا یہ سیلِ رواں
ہر طرف رقص کناں
تیری قدرت تری عظمت تری وحدت کے نشاں
خالقِ حُسنِ جہاں
تو نہاں ہے ترے جلوے ہیں عیاں
خالقِ کون و مکاں
کس قدر پاس تھا تو ——— تجھ سے مگر دور تھا میں
کتنا بے نور تھا میں
خالقِ حُسنِ بہار
یہ ترے نقش و نگار
آبشاروں میں مچلتے ہوئے نغموں کی بہار
کوہساروں سے اُبلتے ہوئے چشموں کا خمار
یہ حسیں چشمے اُبلتے ہوئے کہساروں سے
گود میں وادیٔ گل پوش کے لہراتے ہوئے
پیچ و خم کھاتے ہوئے زلفِ پریشاں کی طرح
رقص کرتے ہوئے ہر موڑ پہ بل کھاتے ہوئے
جیسے فن کار کے سینے میں اچھوتا سا خیال

کتنے رومان بداماں ہیں ترے نقش و نگار
خالقِ حُسنِ بہار
خالقِ چرخ و زمیں
یہ تری صبحِ دلآویز تری شامِ حسیں
سحر انگیز یہ نیرنگِ حسیں
یہ شفق زار حسیں نقش و نگارِ رنگیں
خالقِ چرخ و زمیں
تو حسیں ہے تری تخلیق حسیں
تیری تخلیق کا ہر جلوۂ صد رنگ حسیں
ریگزاروں میں یہ سنکے ہوئے طوفاں بھی حسیں
یہ گلستاں بھی حسیں تیرے بیاباں بھی حسیں
تیرے کانٹے بھی حسیں اور تری کلیاں بھی حسیں
نکہت و رنگِ بہارِ طرب انگیز حسیں
ذرّے ذرّے ترے جلوؤں کے امیں
خالقِ چرخ و زمیں
دیدۂ شوق نے آخر تجھے پہچان لیا
دلِ بے تاب نے منزل کا نشاں جان لیا
سجدۂ شکر سے لبریز ہے آج اپنی جبیں . . . . .

افتخار اعظمی

جمال عبدالنّاصر

روشِ افرنگ کی سیکھی ہے کہاں سے تم نے
جو بھی حق بات کہے، اُس کو گرفتار کرو!

یہ بھی اندازِ محبت ہے تمھارا کیا خوب
خاطرِ دوست نہیں، خاطرِ اغیار کرو

وادیِ غرب میں جو فتنے ہیں خوابیدہ انھیں
وادیِ شرق میں اِس شان سے بیدار کرو

مدتوں سرد رہا مصر کا بازارِ ستم
تم جو آئے ہو تو پھر گرم یہ بازار کرو

تا بہ کے آہ یہ آئینِ ہلاکت آموز
زندہ ہے مصر میں اب سنّتِ فرعون ہنوز!

مصر سے تا بہ کراچی ہوئی تجدیدِ ستم
گر وہ شاہانِ ستم کیش نہیں ہیں، نہ سہی!

کیوں نہ ظاہر ہو ابوالہول کے چہرہ پہ نشاط
مصر میں تازہ ابھی تک ہے وہی رسمِ شہی!

خوش ہیں مغرب کے جفا کیش کہ اب مشرق سے
رسمِ تہذیب اُٹھی، عظمتِ انساں نہ رہی

کیا قیامت ہے کہ ایران سے تا مصرِ جدید
جوئے خوں بادۂ گل رنگ کے مانند بہی!

کیا عجب دہر میں پھر آئے وہی بادِ بہار
جس سے ہو آتشِ نمرود گلستاں بکنار!
سینۂ نیل سے تازہ کوئی طوفان اُٹھے
مصر کی خاک سے پھر موسیِٔ عمران اُٹھے

کیف نوگانوی

تہذیب جواں ہے!

شاہراہوں پہ یہ آوارہ جوانی کی بہار
یہ ہوسناک نگاہیں یہ دمکتے رخسار
یہ اشارے یہ کنائے یہ تبسم کے شرار
گوہرِ عصمت و اخلاق کہاں ہے ہمدم؟
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

درسگاہوں میں ہے تعلیم کا فرسودہ نظام
خانقاہوں میں جمود اور ہلاکت کا پیام
پیکرِ جہل و عداوت ہیں مساجد کے امام
ابنِ آدم ہدفِ وہم و گماں ہے ہمدم
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

اک طرف دولت و ثروت پہ اجارہ داری
اک طرف بھوک، جہالت، مرض و بیکاری
عصرِ حاضر کی سیاست ہے فقط عیاری
حاملِ عدل و مساوات کہاں ہے ہمدم؟
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

بے گناہوں کے لہو سے یہ زمیں ہے گلرنگ
دورِ الحاد کے عفریت ہیں آمادہ بجنگ
نعرۂ امن و مساوات پہ انسان ہے دنگ
زندگی تشنہ لب و شعلہ فشاں ہے ہمدم
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

پابہ زنجیر ہیں صد حیف زبان اور قلم
حق پرستی ہے جہاں میں ہدفِ ظلم و ستم
کھل گیا عدل و مساوات و اخوت کا بھرم
شیطنت نغمہ زن و رقص کناں ہے ہمدم
ایٹمی دور کی تہذیب جواں ہے ہمدم

شہزور کاشمیری

سوال و جواب

سوال

میری خطا معاف خداوندِ کائنات
آتی نہیں ہے میری سمجھ میں یہ ایک بات
قانونِ ہست و بود کی رُو سے جہان میں
تکمیلِ روحِ عزم و عمل ہے اگر ممات
آتی ہے موت کس لئے پھر ایسے شخص کو
جو جی رہا ہو دہر میں بے مقصدِ حیات؟
ہے مقصدِ حیات ہی اصل حیاتِ روح
یعنی مدارِ حوصلۂ دل ہیں خواہشات
جس دل میں اضطراب نہ ہو خواہشات سے
پیدا کرے وہ کیسے شعور اور حسیات؟
مفقود جس کے قلب سے ہوں حسیاتِ زیست
کیونکر عمل کی اُس پہ مسلط ہوں کیفیات؟
جس آدمی کے قلب میں ذوقِ عمل نہ ہو
تکمیلِ روحِ عزم کرے کیسے اُس کی ذات؟
سمجھا تھا میں کہ موت ہے زندوں کے واسطے
مُردوں کو موت، یہ تو ہے اوجِ عجائبات!

جواب

زندوں کو اُن کی موت ہے اِک نعمتِ حیات
مُردوں کی موت رحمتِ دنیائے ممکنات
ہے اُن کی موت اصل میں تکمیلِ روحِ عزم
اِن کی اصل شکستِ طلسماتِ ظلمات
زندوں کو اُن کی موت سے آفاقیت نصیب
مُردوں کو موت مرگ ہے یعنی ضدِ حیات

نجم الاسلام

ہیمنگ وے

ہیمنگ وے امریکہ کا صفِ اوّل کا مصنف ہے جسے ۱۹۵۴ء میں ادبی خدمات کے سلسلہ میں نوبل پرائز دیا گیا۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے ہیمنگ وے کا نام بالکل اجنبیت رکھتا ہے لیکن امریکی ادب کی تاریخ میں اس کا مقام بہت اہم ہے۔ ادب اور تنقید کے بارے میں اس کا نظریہ بڑی حد تک انفرادیت لیے ہوئے ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی ادبی صلاحیتیں ۱۹۲۴ء سے جبکہ اس نے پہلی بار اپنی کہانیوں کا مجموعہ "ہمارے وقت میں" (In our time) شائع کرایا برابر اپنے اظہار کے قابلِ تعریف پہلو تلاش کرتی رہیں۔ اسٹاک ہام میں اس کو جس نظر سے دیکھا گیا اس نے ساری دنیا میں اس کی شہرت پھیلا دی۔ ہیمنگ وے کے بارے میں بہت سے مضامین شائع کئے گئے، طبیعتیں جانچی گئیں لیکن اردو میں ابھی تک اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ بہت سے لوگوں کا تعصب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر نظریہ کا اختلاف اس کی توجہ کو روا رکھتا ہے تو شاید ہمیں بھی اس مضمون کی اشاعت سے اعراض کرنا چاہئے تھا لیکن حقیقت میں نظریہ کے اختلاف اور تعصب میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینا ہی غلطی ہے۔ ہیمنگ وے ایسے [illegible] کی اچھی آواز ہے یا بری؟ اس کا فیصلہ تجزیہ اور تحلیل کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بہرکیف وہ ایک ایسی آواز ہے جس کی گونج سویڈش اکاڈمی کی توجہ سے سر [illegible] دیر تک [illegible] گئی ہے۔ اس کے اثرات ظاہر ہیں [illegible] اثرات [illegible] ضروری ہے۔

ہیمنگ وے کے بارے میں حال ہی میں ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے یہ مضمون ان خیالات پر مشتمل ہے جو اس نے ایک ایڈیٹر Harvey Breit سے انٹرویو کے دوران میں ظاہر کئے۔ یہ خیالات اس کے ادبی و تنقیدی رجحانات اور اس کی تخلیقات سے متعلق ہیں۔ ہاروے بریٹ کا یہ مضمون معلومات افزا ہے۔ اور ہیمنگ وے کی ادبی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔

نوبل پرائز ملنے کی خبر کا اثر ہیمنگ وے پر کیونکر ہوا اس کے متعلق بریٹ نے [illegible] انداز میں لکھا ہے۔

"ہوانا میں اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اٹھائیس تاریخ کو موسم بے سکون اور خوشگوار تھا۔ [illegible] ہواؤں کے کوئی آثار [illegible] اس دن بعد [illegible] کے اس صدر مقام کے ماہر ولنٹ ہیمنگ وے کے گھر Finca Vigia کے چاروں طرف لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی ٹیلی فون پر بات چیت کرنے سے دو گھنٹہ پیشتر ہی اسٹاک ہام سے سرکاری طور پر یہ اطلاع آ چکی تھی کہ ہیمنگ وے نے نوبل پرائز جیت لیا ہے۔ کئی دن پہلے سے چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور یہ لوگ بالکل تیار اور متوجہ تھے۔

اب وہ ٹیلی فون پر تھا۔ ریسور میں سے دور کی آوازوں کے ساتھ ملی جلی ہوئی آواز آتی۔ اس نے آواز پر قابو رکھتے ہوئے دھیمے اور صاف لہجے میں مناسب جواب دیا۔ لہجہ بدلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آواز میں جوش محسوس ہوتا تھا۔ لوگوں کے شور و غل اور بات چیت کی ہلکی ہلکی آوازیں بالکل اس کے پیچھے سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں لیکن وہ متحمل اور غیر متوجہ تھا اور بات چیت کے لئے بالکل تیار نظر آتا تھا۔"

ہیمنگ وے کا نظریۂ ادب کیا ہے؟ وہ مصنف سے کیا چاہتا ہے؟ تنقید کے بارے میں اس کے تاثرات کیا ہیں؟ ان سب کے بارے میں بریٹ نے اس کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ مصنف کے بارے میں ہیمنگ وے کہتا ہے۔

"لکھنے والے کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں تک اس سے ممکن ہو سچائی کے ساتھ لکھے۔ افسانہ نگار اپنی معلومات کو اپنی قوتِ ایجاد کے ذریعہ افسانہ کی صورت دیتا ہے۔ تو اس لئے نہیں کہ تخلیقات کو فوٹوگرافک یا حقیقت پسندانہ بنا دے۔ مصنف کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنی معلومات کو ترتیب دے کر ایک ایسی چیز تیار کرے جو الفاظ کا جامہ پہننے کے بعد قارئین کے لئے ان کے اپنے تجربات کا جزو بن جائے۔"

سچائی کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو کی شرط لگا کر ہیمنگ وے اپنے مخصوص تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ تصور محض حقیقت پسندی سے مختلف ہے۔ اس طرح اس کا نظریہ محدود حقیقت پسندی اور محض حقیقت پسندی Absolute Realism کے درمیان کی ایک چیز بن جاتا ہے۔ ایک طرف وہ حقیقت پر زور بھی نہیں دیتا اور دوسری طرف سچائی، زندگی اور تجربہ جیسے الفاظ سے مخصوص خیال کو محدود بھی کر دینا چاہتا ہے۔ تنقید کے سلسلے میں اس کے ریمارک بریٹ نے اس طرح نقل کئے ہیں۔

"میں نے تنقید سے بہت کچھ سیکھا ہے مگر اس وقت جبکہ تنقید سادہ طرز کی تھی۔ اور جب مجھے تنقید نے [illegible] در جانے لیا کیا تو! پھر لکھنا شروع کیا میں نے اس سے

کچھ نہیں سیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ نقاد ادب کی تخلیق کے اسرار بہت ہی کم جانتے ہیں۔"

خطابت سے ہیمنگ وے کو کوئی لگاؤ نہیں ہے وہ خطابت کو صحیح ادبی ذوق کے نشو و ارتقاء میں ایک بھاری رکاوٹ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

"سچ پوچھئے تو مائیکروفون ادب اور فن کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ آدمی کو اپنے خیالات و نظریات لکھے ہوئے لفظوں میں ادا کرنے چاہئیں بجائے اس کے کہ وہ تقریروں اور مباحثوں کے ذریعہ انھیں ادا کرے۔"

بریٹ نے ہیمنگ وے کو یاد دلایا کہ اٹلی کے ایک مصنف **Ignazia Silone** سے ایک بار یہ پوچھا گیا کہ تاریخ کا سب سے اہم دن کون سا ہے تو اس نے جواب دیا ۲۵ دسمبر سنہ صفر۔

ہیمنگ وے نے جواب میں کہا "میرے نزدیک کوئی تاریخ اہم نہیں۔ نجوم اور اس قسم کے دوسرے علوم پر میرا عقیدہ کبھی نہیں رہا میں نہیں جانتا کہ **'Man'** (انسان اعلیٰ) سے کیا مطلب ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ **'man'** (معمولی آدمی) کیا ہے۔ میں نے جو کچھ سیکھا ہے ان معمولی آدمیوں، مردوں اور عورتوں اور کچھ جانوروں کے متعلق سیکھا ہے۔"

ہیمنگ وے آج کل کیا لکھ رہا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اس نے یقین اور ضبط کے ساتھ کہا۔

"افریقہ کے بارے میں میں نے تین افسانے لکھنے شروع کئے تھے جن کا مجموعہ **Charles Scribners** کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ سات غیر مطبوعہ افسانے موجود ہیں پہلا افسانہ میں نے لکھ کر جب دوسرا شروع کیا تو وہ ناول کی صورت اختیار کرنے لگا۔ آج کل میں اسی کہانی پر لکھ رہا ہوں۔"

آخر میں اس نے نوبل پرائز کے بارے میں اپنے جو تاثرات ظاہر کئے وہ بھی قابل مطالعہ ہیں۔ بریٹ ہیمنگ وے کے الفاظ اس طرح پیش کرتا ہے۔

"بہ حیثیت ایک نوبل پرائز حاصل کرنے والے کے، میں سوائے اس افسوس کے اور کیا ظاہر کروں کہ نہ تو مارک ٹوین **Mark Twain** کو کبھی انعام دیا گیا اور نہ ہنری جیمس **Henry James** کو میں صرف اپنے ہی ملک کے دو آدمیوں کی بات کہتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور بھی چوٹی کے مصنفین ہیں جنھوں نے کوئی انعام نہیں پایا۔"

"آج مجھے خوشی ہوتی اور میں اور زیادہ خوش ہوتا اگر **Isac Dineoen** یا **Bernard Berensen** جیسے اچھے لکھنے والے انعام پاتے جنھوں نے پینٹنگ پر اس قدر عمدگی اور جامعیت سے لکھا ہے اور اسی میں عمر گذار دی ہے۔ اور میرے لئے سب سے زیادہ خوشی کا موقع ہوتا اگر مجھے یہ خبر ملتی کہ "کارل سینڈ برگ **Carl Sandburg** کو دیا گیا ہے۔"

"اب جب کہ میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں اور سویڈش اکاڈمی کے فیصلہ کا اعزاز و احترام بھی مجھ پر لازم ہے۔ مجھے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہنی چاہئے۔ جسے کوئی اعزاز دیا جائے اسے خوش دلی اور احترام کے ساتھ اعزاز کو قبول کر لینا چاہئے۔"

بریٹ نے ہیمنگ وے پر ایک مختصر سا تبصرہ بھی کیا ہے۔ جو افادیت کا حامل ہیں۔ ہیمنگ وے کی عمر چھپن برس ہے۔ شروع ہی سے جبکہ سنہ ۱۹۲۴ء میں اس نے افسانوں کا ایک مجموعہ "ہمارے وقت میں" شائع کیا تھا۔ یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ امریکی ادب اور زندگی میں ایک امتیازی اوصاف کا مالک داخل ہوا ہے اور دو سال بیشتر تو اس کی فنی تربیت و تنظیم کی صلاحیتیں معراج پر پہونچ گئیں۔ جب اس نے اپنا پہلا ناول **"The Sun also rises"** شائع کیا لوگوں کو اس کی فنی صلاحیتوں پر ہر سوال معقولیت سے خالی نظر آنے لگا۔

وہ سب سے زیادہ باثر اور صاحب فکر ادیب شمار کیا جانے لگا۔ اس نے لعینہ کبھی تقریر اور مباحثہ کا سہارا لئے ایسی چیزوں کو چھیڑا جنہیں بقول **Faulkner** قلب کی ابدی صداقتیں کہا جا سکتا ہے۔ عقل اور وجدان، بربریت اور محبت، حسن اور اخلاقی قیود، عمل اور اخلاق سب واضح صورت میں ہیمنگ وے کی پر زور اور تنقیحی مگر فطری زبان میں ڈھل ڈھل کر سامنے آنے لگے۔

جو کچھ اس نے لکھا وہ اس کے پڑھنے والوں کے تجربات کا ایک جزو بن گیا۔ ہیمنگ وے نے اپنی تمام عمر جس چیز کے حصول کی کوشش میں گذاری وہ ایک ما بعد الطبیعیاتی مقصد سے بڑھکر دوسرا کوئی جمالیاتی مقصد نہیں تھا۔ اس کے ہر واضح اور پر زور لفظ میں ان بنیادی رجحانات کی جھلک ظاہر ہونے لگی جن کا وہ تمام عمر حامل رہا تھا۔ اس طرح لوگوں نے اس سے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ محض ادب پارے ہی نہیں تھے ان میں اس کے وجود کی جامعیت بھی تھی جسے ہیمنگ وے نے کبھی نمائشی طریقے سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بڑی حد تک بے پروائی سے کام لیا لیکن بہرکیف۔ یہ چیز موجود تھی اور ظاہر ہو کر رہی تھی۔ یہ ایک عظیم تجربہ تھا جو ہیمنگ وے نے کیا۔ زندگی کے اسرار و رموز کی فکر میں ایک سنجیدہ شخص اپنی تمام سنجیدہ کوششیں صرف کرنے لگا۔ اور بالآخر مختلف لوگوں مختلف شخصیتوں کے مطالعہ کی روشنی اسے منزل کی طرف کشاں کشاں لے گئی۔ بلزاک سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔ **Stendhal** اور **Henry James** کی ذہنی بلندیاں اس کے تجربوں کے لئے شمع راہ بن گئیں۔

یہاں کہا جا سکتا ہے کہ ہیمنگ وے کی حیثیت ایک میڈیم **medium** کی سی نظر آتی ہے۔ کیا وہ بلزاک، اسٹینڈھال، اور ہنری جیمس ہی کو دہرا رہا ہے؟ اس کی کوئی اپنی حیثیت نہیں ہے؟ بریٹ اس پہلو سے ہیمنگ وے کی پوزیشن کو مبنی بر صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" ایک سنجیدہ قسم کا مصنف ہر کیف ایک میڈیم کا کام کرتا ہے۔ ہیمنگ وے خود ایک میڈیم ہے۔ ایسا مصنف ہر اس چیز کو جو واقع ہوتی ہے۔ جو کار آمد ہوتی ہے۔ جس کا وہ تجربہ کرتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ سونگھتا ہے۔ سنتا ہے۔ نوٹ کرتا ہے ـــــ اُسے میڈیم کے ذریعہ ایک حقیقی شکل دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر چیخوف کے ساتھ جو کچھ واقعات پیش آتے رہے اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہی افسانے بنتے گئے۔ Yeats کے یہاں یہی چیزیں نظموں کا جامہ پہنتی رہیں۔ Gide نے ان کو اخباری مضامین کی شکل دی۔ گویا ان کی اپنی کوئی خاص شکل نہیں ہوتی۔ جیسا سانچہ ملتا ہے اسی میں ڈھل جاتی ہیں۔

ہیمنگ وے ایک سنجیدہ مصنف اور آرٹسٹ ہے۔ اس کا فن حقیقی توانائی کا ایک عمل ہے۔ اس کے یہاں عمل نام ہے بے لچک ایمان داری اور خود دی کے بے لاگ اظہار کا۔ اور یہی چیز آرٹسٹ کو بھاتی ہے۔ ہیمنگ وے کے آرٹ میں زندگی کی اسی کشاکش کا اظہار ملتا ہے مگر اس کا آرٹ لفاظی اور ابہام سے پاک ہے۔ وہ مختصر لفظوں میں زندگی کی ایک واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ اس وصف کو اس نے شروع سے نبھایا ہے "یقیناً ہنرکاری طور سے" اتنی تاخیر کے بعد اس کی قدر کیوں پہچانی گئی؟

" ان عوامل سے ہٹ کر حس پر قیاس سے کام لیکر ہی رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نسل کی کچھ خاص ضرورتیں ہوتی ہیں، وہ اسی چیز کو اپناتی ہے جو اس کی ضرورت اور اس کے مذاق کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ تنقید کا فرض ہے کہ ہر نسل کی ضرورت کی نشاندہی اور ان میں امتیاز کرے۔

ہم سے پہلے کے لوگوں کی ضرورتیں ہم سے مختلف تھیں۔ اُس وقت کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ پڑھنے کے بعد اس میں بیلوں کی دوڑ اور گہما گہمی اور Brett کے کردار میں ظلم کے سوا کچھ پاتا ہی نہیں تھا۔ ہیمنگ وے کی ایک اور تصنیف 'Death in the afternoon' میں لوگوں کو محض تشدد کی مدح سرائی ہی نظر آتی تھی۔ فکرِ ہر کس بقدر ہمت اوست' والا معاملہ رہا۔

اب ہم ہیمنگ وے کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ توازن کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ ہماری ضرورتیں اور ہماری پسند کے معیار جدا ہیں۔ "سورج بھی نکلتا ہے" کے ماہی گیری کے مناظر میں ہمیں ان ماہیوں Pastoral کی خوبصورتی کا احساس ہو رہا ہے۔ امریکی اور ہسپانوی لوگوں کے دلچسپ تعلقات ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ Brett کا اخلاقی تعلق ہمیں سوچ بچار پر آمادہ کر رہا ہے۔ دوسری کتاب "دوپہر بعد موت" میں اب لوگوں کو جرأت اور بہادری کی تعریف مل رہی ہے۔

بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کی نظر میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ مگر ایک دن پس منظر پیش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ آج ہماری نظر میں ہیمنگ وے کی دنیا انسانیت اور رحمدلی کی دنیا ہے کل تک یہی موت اور تشدد کی کشاکش سے بھرپور تھی۔

اس فرق کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ فیصلہ کر دینے والے بعض لمحاتی تاثرات کے تحت فیصلہ کر دیے جاتے ہیں۔ اور اس رویہ کی بدولت ان کے فیصلے خام کاری پر مبنی ہوتے ہیں، یہ وقتی خام کاری افسوس ناک کہی جائے یا نہ کہی جائے مگر اس کے بھیانک نتائج بعض لوگوں کی زندگی بھر بھگتنے پڑتے ہیں، جوائس Joyce نوبل پرائز سے محروم ہی رہا اور Yeats کو انعام مل گیا۔

ہر کیف ہیمنگ وے اپنی اس مختصر زندگی میں ہنسی خوشی ایک مدت تک لکھتا رہا ہے۔ اس نے اس عمر میں بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ برسوں ایسا ہوتا رہا کہ اس سے کم درجہ اور کم اثر رکھنے والے مصنفوں کو نوبل پرائز ملتا رہا۔ لیکن اس کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ خوش رہا، اور اب بھی اسے کسی سے شکایت نہیں ہے۔"

غمِ آرزو میری نظر میں

جمیل احمد فاروقی

افتخار اعظمی کی ایک نظم "غمِ آرزو" "خوشہ" کراچی کے [illegible] شمارے میں شائع ہوئی ہے ابھی حال ہی میں نظر سے گذری۔

افتخار اعظمی ایک کہنہ مشق اور بالغ نظر ادیب اور شاعر کی حیثیت سے تعمیر پسند حلقوں میں کافی مقبول ہیں۔ انہوں نے تعمیری ادب کو کچھ نہ کچھ دیا ہے جس میں شاعری سے زیادہ مقالوں کا حصہ ہے۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے انھوں نے پہلی بار پستی سے فرش پر قدم رکھا ہے جہاں قدم قدم پر سینۂ گیتی داغدار نظر آتا ہے اور ہر طرف جسمِ انسانی [illegible] ہے ؎

بہہ رہی ہے جسمِ انساں سے ابھی تک خون [illegible]
سینۂ گیتی نظر آتا ہے مجھ کو [illegible]

اگرچہ ابھی تک ان کی مدہوشی [illegible] جہاں [illegible] اور ان کے جنونِ دل کو قدرے مایوس [illegible] ہے ——— مگر اس خاک [illegible] اندر پایا جاتا ہے [illegible] اور [illegible]

کبھی [illegible]

"کسی سرمایۂ تسکینِ جاں" کے [illegible] آنکھیں خون کے آنسو رلاتی ہیں [illegible] تمام [illegible] لیل و نہار اور مسلسل [illegible] کے لیے ترستی ہی [illegible]

[illegible]

جو [illegible]
[illegible]

[illegible] صنوف شاہوں [illegible] کبھی [illegible] جس نے رومان [illegible] سائے میں [illegible] شب تاب ہے [illegible] ان کے [illegible]

آئینہ روئے یار بن جاتا ہے اور وہ عارض محبوب چومنے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ اور وہی تجلّی، [illegible] اور ترنم سے معمور [illegible] فضائیں بھی ہیں جو انھیں ہر لغزش کا مجنوں کی دعوت دیتی ہیں ——— [illegible] کے باوجود بھی انھیں اس کراہتی اور سسکتی ہوئی زندگی کا خیال ہے! انھیں تعمیر انسانیت کا احساس ہے اور وہ اس میں اپنا خونِ [illegible] بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ [illegible] روایت [illegible] رومان کے [illegible] شعر کی ایک [illegible] کتنا بڑا انقلاب ہے اور کتنی عظیم قربانی۔

[illegible] یہ سوال ذہن میں ابھر آتا ہے کہ کیا تعمیری یا اسلامی ادب کے تقاضے [illegible] ہو جاتے ہیں؟ کیا سماجی شعور کی یہ ہلکی کرن اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوئی خفیف سا بھی ارتعاش پیدا کر سکی ہے؟

مجھے اس موقع پر بالزاک Balzac کا ایک قول یاد آتا ہے جو ادب کے مقصد کے بارے میں ایک بار اس کی زبان سے نکلا تھا۔ ایک قندیل کتنی ہی [illegible] اپنی [illegible] سے فضا کو [illegible] جائے [illegible] خواہ کتنی ہی حسین اور فن کا [illegible] سے محروم ہے [illegible] آخر تعمیری ادب کیا چاہتا ہے یہی نا [illegible] زندگی کی [illegible] ایک ادب اور شاعر کا [illegible] کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ [illegible] رجحانات کے [illegible] ہماری [illegible] کرے جو خالق کائنات کے تخلیقی مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ ایک [illegible] [illegible] بلکہ [illegible] ادبی تخلیق میں لازمی ہے [illegible] کوئی بھی [illegible] حیات کی [illegible]

اس میں نہیں پائی جاتی [illegible] ؎

[illegible] ابھی تک خون [illegible]
سینۂ گیتی نظر آتا ہے مجھ کو داغ داغ
جو [illegible] میں انھیں [illegible] آب [illegible] رنگ
[illegible] بھی محروم [illegible] داغ داغ

جادہ پیمائے بےخودی میں کاروانِ شوق ہے
کیا عجب مل جائے اُس کو اپنی منزل کا سراغ

چشمِ انساں سے جوئے خوں کا بہنا اور سینۂ گیتی کا داغ داغ نظر آنا یہ تو ہر شاعر اور ہر مکتبۂ فکر کا فن کار کہہ سکتا ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ ان تلخ حقیقتوں کے پیچھے جو اسباب کارفرما ہیں اُن کی تہوں کو شاعر نے کہاں تک ٹٹولا ہے اور کن نتائج پر پہنچا ہے اور پھر سب سے اہم چیز یہ کہ اِن نتائج کی روشنی میں کس تصورِ حیات کی شاعر نے نشان دہی کی ہے۔ نظم کا کوئی شعر بھی کسی ٹھوس نظریۂ حیات کی طرف قاری کی رہنمائی نہیں کرتا۔

بلاشبہ شاعری اور دوسرے فنون میں فرق ہے۔ اس میں شاعر کو اپنے جذبات و احساسات کو وسیلہ medium بنانا پڑتا ہے اور یہ بھی امرِ مسلمہ ہے کہ پیرائۂ بیان suggestive ہونا چاہئے لیکن اس کا یہ مفہوم تو ہرگز نہیں کہ قاری کو زمین اور آسمان کے درمیان معلّق چھوڑ دیا جائے یا اسے ایک لق و دق میدان میں بالکل تنہا چھوڑ کر یہ کہہ دیا جائے کہ جس طرف چاہو چل پڑو۔ اس کے برعکس عظیم شعری تخلیق میں فکر انگیز اشاروں کے ذریعہ ایسے گہرے نقوش ثبت کر دیئے جاتے ہیں جن سے قاری کا تخیل بے راہ روی نہ اختیار کر سکے۔ بلکہ اعلیٰ درجے کے فن کار کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ خود قاری کے فکری دھاروں کو توڑ کر اپنے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اِس کے ثبوت میں ایک اچھی مثال پیش کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب ہم نظم کے آخری شعر کو پڑھتے ہیں تو صاف صاف واضح ہو جاتا ہے کہ خود شاعر کی فکر و نظر کے پیچھے کوئی زندہ اور متحرک نظامِ فکر نہیں ؎

جادہ پیمائے بےخودی میں کاروانِ شوق ہے
کیا عجب مل جائے اُس کو اپنی منزل کا سراغ

وہ خود ما آشنائے منزل ہے اور ابھی تو بےخودی کے ہاتھوں میں اس کی زمامِ شوق ہے دیکھئے منزل کا سراغ ملتا بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی شعری تخلیق جس میں خود زندگی کا کوئی متعین اور درخشاں تصور موجود نہ ہو اور جس میں کاروانِ شوق بجائے شعور و آگہی کے بےخودی و مستی کے سہارے آگے بڑھ رہا ہو وہ بھلا قاری کو کیا دے سکتی ہے اور کیا suggest کر سکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری میں جب تک تناسب اور اعتدال کے ساتھ ساتھ نظریاتی شعور کا بھرپور دھارا موجود نہ ہو اس وقت تک نہ تو وہ جدید انسانی تخیل کو اسیر کر سکتی ہے اور نہ فن اور مقصد کے اعلیٰ تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس نظم کے دو ہی غالب رجحانات ہیں۔ ایک تو مجہولیت و ما کا رجحان ہے جو زندگی کے حقائق سے فرار اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے۔ پہلا بند شروع سے آخر تک اسی فراری ذہنیت کا مظہر ہے۔ اس میں جن خیالات کو نظم کیا گیا ہے اس کی پوری تفصیل نظموں کے ابتدائی حصوں میں پیش کر دی گئی ہے بلکہ بعض اشعار میں تو ایسا مواد

پیش کیا گیا ہے جو نہ صرف مقصدی نقطۂ نگاہ سے غیر ضروری ہے بلکہ غیر صحت مند اور عامیانہ بھی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

یہ تجلّی، یہ تبسّم، یہ ترنّم، یہ فضا،
آج کی شب ہے روا ہر لغزشِ گامِ جنوں
تیرے آئینے میں رقصاں ہے جمالِ روئے یار
شوق کہتا ہے کہ بڑھ کر تیرے عارض چوم لوں

اور دوسرا رجحان شکست خوردگی اور قنوطیت کا ہے جو بظاہر الگ نظر آتا ہے مگر اُسی مجہولیت و ماایت کی پیداوار ہے۔ نظم کا دوسرا بند ایسے جذبات و احساسات میں ڈوبا ہوا ہے جو زندگی کو بجائے حرارت اور نئی اُمنگ دینے کے اسے اور بھی تلخ تر اور مضمحل بنا دیتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں

کی بہت سعیٔ علاجِ گردشِ دوراں مگر
ایک حالت پر رہا قائم مزاجِ روزگار
دیکھئے رقصِ حوادث سے ہے کب ملتی اماں
ہے ابھی تک تو نشیمن کی فضا ساز گار
جب بکھر کر صیاد و گلچیں پاسباں کے بھیس میں
پھر چمن میں آئے کیونکر کاروانِ نوبہار

ان اشعار میں کس قدر یاسیت کا عنصر پایا جاتا ہے تو اسا ؟ مرحلے کوئی منا سب سمت نہیں رکھتا۔ جد و جہد اور ہمت وغیرہ کے نعرے دیتے کھلاتے لگتے ہیں کائنات بجھی بجھی سی اور تاریک نظر آنے لگتی ہے اور پھر اسی طرح جب شاعر چشمِ انساں میں جوئے خوں کی یاد دلاتا ہے اور زندگی کے سوگوار ویرانوں کو اپنے خونِ دل سے سیراب کرنے کا عزم کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے پاؤں جکڑ دئے گئے ہوں ایسی تھکن اور روح کی گہرائیوں میں ایسا جمود و اضمحلال محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تحریک نہیں پیدا ہوتی۔ یہ بند پوری نظم میں ایک جوڑ پیوند بن کر رہ گیا ہے۔ بلکہ آخری شعر نے تو قاری کی رہی سہی توانائی بھی چھین لی ہے۔ کہاں کا سفر اور کیسی منزل۔ جب بےخودی ہی مرادِ مسافر ٹھہری تو منزل کا خدا حافظ۔ ایسے ... ہوگا ... تو مرحلے کی نوعیت معلوم اور نہ نسخۂ شفا کی خبر۔

اس مختصر سی تشریح کے بعد ... کا ... انداز ... لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کو فکری حیثیت سے جس مقام پر ہونا چاہئے تھا اور جس ... شاعر کی شدت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ... میں منتقل کرنا چاہئے تھا اس میں وہ بُری طرح ناکام ہی نہیں رہا بلکہ بعض ... غیر شعوری انتخاب نے اِس نظم کو غیر مقصدی تاثرات کا حامل بنا دیا ہے۔ جن لوگوں نے ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی

کی نظم "جاگیر" دیکھی ہے۔ وہ جانتے ہوں گے کہ شاعر کا مقصد جاگیردارانہ نظام کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنا تھا مگر موضوع اور مواد کے غیر متناسب اور غیر محتاط treatment کی وجہ سے اس کی نظم کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا اور بجائے نفرت کے جاگیردارانہ نظام سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ "غم آرزو" ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں بظاہر شاعر رومان سے انقلاب کی طرف قدم اٹھانا چاہتا ہے۔ اور آسمان سے زمین پر اترنے کی کوشش کرتا ہے لیکن موضوع کے انتخاب اور مواد کے اجزائے ترکیبی میں توازن اور تناسب کے فقدان کی وجہ سے اس کی نظم کا بنیادی مقصد ہی مجروح ہو کر رہ گیا۔ سستی رومانیت اور گہری قنوطیت غالب آ گئی۔

یہ کمزوری صرف ایک یا دو شاعروں تک محدود نہیں ہے بلکہ عام طور پر نظم گو شعراء اس طرح کی فکری ناہمواریوں کے شکار ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں ان مسائل کے سلسلے میں اپنے دو مضامین کے چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ افتخار اعظمی اور دوسرے تعمیر پسند فن کاروں کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

"افسانہ اور حقیقت نگاری" میں ایک مقام پر راقم الحروف نے لکھا ہے کہ

"کائنات کی ہر چیز اپنی معنی آفرینی اور مقصدی وجود کے باوجود یکساں طور پر اہمیت نہیں رکھتی پانی ہوا سورج کی روشنی سے مقابلے میں سونا چاندی اور جواہرات کس قدر اہم ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ایک لوہار کا بچہ بھی لگا سکتا ہے اور یہی حال کائنات کی ہر چیز اور زندگی کے تمام مظاہر کا ہے۔ اسی طرح زندگی کا کوئی واقعہ نیک اور حقیقی ہونے کے باوجود معیار اہمیت پر برابر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح اندھے اور آنکھیں رکھنے والے برابر نہیں ہو سکتے اور تاریکی و روشنی مساوی حیثیت نہیں رکھتیں ٹھیک اسی طرح زندگی کا کوئی واقعہ اور زمین کی کوئی چیز بھی اپنی مقصدی تخلیق کے باوجود یکساں اہمیت اور افادیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک دائرہ عمل میں مختلف اہمیت و افادیت کا مستحق ہے اور اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے فن کار کو اس چیز یا اس واقعہ کو پوری زندگی سے ملا کر دیکھنا چاہئے کیونکہ اگر اس کی نگاہ پوری زندگی کے مقصدی وجود اور اس کے عوامل پر نہیں ہے تو اس کا قوی امکان ہے کہ جس قدر دیانت داری اور وسیع النظری مطلوب ہے وہ پہلے سے اس کی تخلیق میں ناپید ہو کر رہ جائے اور دوسرا ضروری پہلو جو فن کار کے تخلیقی عمل میں بہت سے زیادہ پیش نظر رہنا چاہئے وہ یہ کہ جس چیز یا زندگی کے جس واقعہ کو وہ ایک خاص صنف ادب میں جگہ دینا چاہتا ہے خود اس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ کائنات میں اس کی اہمیت اور افادیت کتنی ہے؟ اور پورے نظام زندگی سے اس کا کیا اور کتنا رشتہ ہے۔"

ایک دوسرا مقالہ جدید اردو غزل میں تعمیری رجحانات بھی ہے۔ اس کا ایک اہم اقتباس جو نفس موضوع سے گہرا تعلق رکھتا ہے اسے بھی پیش نظر رکھئے۔

"اگر ایک آرٹسٹ خدا پرستانہ نظام حیات کو تمام انسانی دکھوں کا مداوا سمجھتا ہے، اگر اسے اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ موجودہ سماجی نظام کی مادی و اخلاقی پستیوں کا سبب لادینی جمہوریت ہے تو پھر اسے ایک واضح فیصلہ کرنا ہوگا۔ اور ادب میں کیوں اور کیسے کا صاف صاف جواب دینا پڑے گا اور اسے یہ بھی کھل کر بتانا ہوگا کہ حقیقت کے ان مظاہر کے پیچھے خود خالق کائنات کے تخلیقی مقاصد کیا ہیں اور وہ حو شعوری طور پر ان سے کہاں تک اور کس حد تک اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان عظیم مقاصد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ادیب یا آرٹسٹ کو موضوع اور مواد (Subject matter) کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط اور حکمت سے کام لینا ہوگا۔ نہ تو ہر موضوع ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ اور نہ ہر موضوع کے اپروچ میں فن کار کی تمام تخلیقی صلاحیتیں اپنی تابانیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آ سکتی ہیں۔ ادیب ہر چیز اور ہر انسان کے متعلق نہیں لکھ سکتا۔ اسے اپنے موضوع اور مواد کے انتخاب میں انتخابی طریقہ کار کو اپنانا ہی پڑتا ہے۔ ایک کتاب اس لئے نہیں لکھی جاتی کہ ادیب کو اس کے لکھنے کا طریقہ معلوم ہے بلکہ اس لئے کہ وہ کتاب خود ادیب کے دماغ سے نکلنے کے لئے بے چین ہے۔ ایسے خارجی و داخلی محسوسات سے ہو کر اسے گذرنا پڑتا ہے کہ وہ کچھ لکھنے کے لئے مضطرب ہے۔ فی الحقیقت یہی جذبۂ تخلیق creative impulse ایک ادیب یا آرٹسٹ کے فن کی جان ہے۔ اور یہ اسی وقت نمایاں ہو سکتا ہے جب احساس میں شدت و گرمی ہو اور مقصد کی وسعت و ہمہ گیری اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو۔"

ابوخالد۔ ایم اے

جہانِ صوت و صدا کو بے صدا بنانے کی جدوجہد

مشہور مردِ دانا لقمان نے اپنے جگر بند کو جہاں اور نصیحتیں کیں جن کی قدر و قیمت یہ ہے کہ قرآن کریم کے صفحات میں ان کو جگہ ملی وہاں ایک یہ بھی تھی کہ اپنی آواز کو پست کرو، سب سے ناگوار آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔" شور و غل سے اظہار بیزاری کا اس سے بلیغ طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ گدھوں سے آپ کو خواہ کتنی ہی ہمدردی ہو اور ہمدردی کے وجوہ بھی چاہے آپ کے نزدیک جس قدر وزنی اور مبنی بر معقولیت ہوں لیکن گدھے کی آواز آپ کے اعصاب اور سماعت پر کوئی خوش گوار اثر چھوڑ جاتی ہے اس سے یقیناً آپ کو انکار ہوگا۔

چیخ و پکار کا تہذیب و اخلاق کے نقطۂ نظر سے معیوب ہونا اپنی جگہ پر اس کا اثر انسانی صحت پر خراب پڑتا ہے یہ بات بھی اب تحقیق و تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور کون جانے دانش مند لقمان نے بیٹے کو سلیقہ مندی کا سبق دیتے میں اس پہلو کو بھی نگاہ میں رکھا ہو۔ علامہ اقبال نے فرمایا ؎

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب

جہانِ صوت و صدا کے سائنس دان اب اس فکر میں ہیں کہ اس لطیفۂ ازلی کو مقید کر دیں کیونکہ ان کے اعصاب اس کے حریف نہیں ہو پاتے، ان کا خیال ہے کہ اس جہانِ صوت و صدا کو اگر عالم صمت و سکوت میں نہ تبدیل کیا گیا تو گوش لذت کوش و حق نیوش دونوں کام کے نہ رہ جائیں گے اور اعصاب کا پیہم تشنج اور ضربات قلب کا متواتر اختلال انسان کو تدریجاً اس دردناک انجام سے دوچار کر دے گا جو ایک مینڈک کا ہوتا ہے اگر اس کو پانی میں ایسے جوش دیا جائے کہ درجۂ حرارت آہستہ آہستہ بڑھ کر انتہائی نقطہ پر پہنچے۔

جان سڈنی John Sydney نے اپنے ایک مقالے کی ابتدا اس سوال سے کرتے ہوئے کہ کیا مستقبل کا انسان شور و ہنگامے کی دنیا کے باعث بہرا ہو جائے گا؟ "شور و غل کے مضر اثرات اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر و عزائم و امکانات پر بہت دلچسپ مفید اور سائنٹیفک معلومات بہم پہنچائی ہیں ذیل کی سطروں میں اس کے مقالے کا آزاد ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

مشہور سائنس دان اور موجد ٹامس ایڈیسن Thomas Edison نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا جب انسان کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہے گا کہ اپنے ابنائے جنس سے مخصوص برقی تاروں کے ذریعہ ربط پیدا کرے۔ اس دعویٰ کو ایک حد تک مبالغہ آمیز رنگ آمیزی پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن عہد حاضر کے سائنس داں آں جہانی ایڈیسن سے اس امر میں یقیناً متفق ہوں گے کہ گذشتہ زمانے کے مقابلے میں آج ہم کہیں زیادہ شور و ہنگامے کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ کہ شور و غل صحت اور کارکردگی دونوں کے لئے مضر ہے۔

اس میں دراصل شبہ کی گنجائش نہیں کہ شور و غل کی زیادتی سماعت کو نقصان پہونچاتی ہے۔ ہنگامی اور وقفات کے ساتھ متواتر اور پیہم شور و غل سماعتی عضلات پر بے شمار کاری ضربیں لگاتا ہے اور کان کی نازک مشینری ان حملوں سے بالکل تباہ نہ ہو تو مجروح ضرور ہی ہو جاتی ہے۔

جس طرح ہم مسافت اور طول و عرض کو انچ اور فٹ کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اسی طرح سائنس دانوں نے شور و غل کی پیمائش کے لئے ایک مخصوص پیمانہ وضع کر لیا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام Decibles ہے۔ آواز کی اکائی کو اسی نام سے پکارتے ہیں چنانچہ ایک جیٹ طیارہ قریب فاصلے پر ۱۵۰ صوتی اکائیاں Decibles بناتا ہے۔ اسی طرح پر Propeller سے چلنے والے طیارے اور ایک ایکسپریس ٹرین سے بالترتیب ۱۱۵ اور ۱۹۰ اکائی شور و غل وجود پذیر ہوتا ہے۔

دوسری جانب پتوں کی سرسراہٹ یا سرگوشی سے صرف ۱۰ Decibles شور و غل پیدا ہوتا ہے۔

۵۰ یونٹ یا اس سے زیادہ شور و غل اگر مسلسل قائم رہے تو اس کا اثر ہماری کارکردگی پر بھی پڑتا ہے اور اس سے نظامِ اعصاب میں بھی خلل و انتشار واقع ہوتا ہے۔

اس معاملے کا ہماری صحت و سلامتی سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات جان لینا کافی ہوگا کہ ایک چالو سڑک کا شور مقابلتاً ۱۵ اکائی زیادہ

ہوا کرتا ہے۔ یہی حال ایک دفتر کا ہے جہاں جمع و تفریق Adding Machine اور ٹائپ رائٹر مسلسل کھٹکھٹاتے رہتے ہوں۔ غالباً آپ اس کا یہ جواب دیں گے کہ اس شور کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں۔ ہمیں اس کا خیال تک نہیں ہوتا۔ زاویہ راہ نمبر ۶ Street Corner اور چونتیسویں سڑک Thirty fourth Street میں اتنا شور ہوتا ہے کہ اس سے ایک اوسط صحت کا آدمی اس مدت کے لئے جب وہ وہاں ہو بہرا ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں پر تین شاہراہیں، تین ٹرام کی پٹڑیاں اور اوپر سے گزرنے والی دوہری ریلوے لائن ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔

چند سال قبل سائنس دانوں نے تجربہ کیا کہ ایک ٹیکسی موٹر گاڑی Taxi car کے گزرنے سے جتنا شور و غل پیدا ہوا اس سے ایک سوتے ہوئے آدمی کے خون کا دباؤ بڑھ گیا۔ اسی طرح محض آہستہ پاس سے گزرنے کی آواز سے اس کے اعصاب میں اتنی بڑی کھنچ Tension پیدا ہو گئی جتنی عام طور پر حالت بیداری میں ہوا کرتی ہے۔

شور و غل کا جو اثر ہماری صحت پر پڑتا ہے اس کی نوعیت کا [illegible] کرنے کے لئے یوں سمجھئے کہ ایک مینڈک کو زندہ ابالا جا سکتا ہے اگر پانی کا درجہ حرارت بتدریج ابلنے کے نقطے تک پہونچایا جائے۔ درحقیقت حسی تطبیق Sensory Adaptation یا حس کے [illegible] ہو جانے کا معاملہ ہے [illegible] حس اعصابی منتہا Sensitive Nerve Terminals اسی طرح بے حس ہو جاتے ہیں [illegible] ہم [illegible] ہوتے ہیں ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ شور کا ہمارے اوپر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا ہے اور [illegible] ایک تدریجی نقصان ہم کو پہونچتا رہتا ہے۔

ایک ایسے دفتر میں جہاں شور و غل زیادہ ہو [illegible] کرنے والے مضراب "Key" پر زیادہ سخت ضرب لگاتے ہیں اور [illegible] میں جتنی زیادہ قوت حیات Energy خرچ کرتے ہیں اس کے برعکس جہاں شور نسبتاً کم ہو ان کی کارکردگی میں ۵ ا فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شور کو کیسے [illegible] میں اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش شروع ہو گئی ہے۔ ٹرام اور اوپر سے [illegible] گاڑیوں کی پٹڑی کو [illegible] بے صدا بنا دیا گیا ہے یہاں تک کہ [illegible] اس [illegible] میں [illegible] والوں سے درخواست کی ہے کہ [illegible] رات کے بعد [illegible] کر [illegible] کریں۔

ایک لاری یا ٹرک جس کے پرزے ڈھیلے ڈھالے ہوں اور [illegible] کی دیکھ بھال نہ ہوتی ہو اس لاری یا ٹرک سے یا [illegible] زیادہ شور پیدا کرتی ہے جو [illegible] حالت میں ہو یہی وجہ ہے کہ باہر [illegible] صوت و صدا کا خیال ہے کہ عام شاہراہوں اور گلیوں میں ایسی گاڑیوں کے استعمال کو قانون سازی کے ذریعہ قطعاً ممنوع قرار دے دیا جائے۔

لندن کے کچھ افسر گاربج ٹن Garbage Tin کا تجربہ کر رہے ہیں۔ یہ ٹن بے صدا ہوتے ہیں اور ان سے آوازیں نہیں پیدا ہوتی۔ وہاں کی دودھ بیچنے والی ایک کمپنی اپنے ملازمین کو ربڑ کے جوتے مہیا کرتی ہے اور بوتلوں کو ایسے ڈبوں میں رکھتی ہے جس میں اندر کی جانب ربڑ کی ایک موٹی تہہ ہوتی ہے تاکہ ہلنے سے کھڑکھڑاہٹ کی صدا نہ پیدا ہو۔

کارخانے کی سیٹی کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کیا ہی جا سکتا ہے۔ چند سال پہلے تو سیٹیاں ٹھیک تھیں۔ ان کا کوئی بدل نہ تھا لیکن اب تو الارم کلاک بجلی کی گھڑی اور صبح کی ریڈیو کی نشست کا زمانہ ہے۔ اب لوگ کارخانے جا اور آ سکتے ہیں اور اس طرح کہ پورے مضافات کے اعصاب کی جان بھی نہ نکالنی پڑے۔ ریل کی سیٹیاں ان لوگوں کے اعصاب کے لئے ایک مستقل مصیبت ہیں جو بدقسمتی سے ریلوے لائن سے سماعت کی مسافت پر سکونت پذیر ہیں۔

سڑکوں کے شور سے متعلق ساز و آہنگ کی مصیبت والی ڈرل Peneu-matic drills کبھی بدترین مسئلہ ہے۔ یہ ڈرل پر سکوت بنائی جا سکتی ہے لیکن اس کے خلاف یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے مقدار کار میں تخفیف یعنی نقص واقع ہو۔ ممکن ہے یہ خیال درست ہو مگر ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہر نئے کام کی یوں ہی مخالفت ہوتی ہے۔ آلہ سکوت افزا "Silencer" کے ساتھ جو ڈرل ہو گی وہ غیر مجروح انسانی قابلیت کار کے اعتبار سے بہرحال نسبتاً سستی ہو گی۔

آپ کے آئندہ کے مکانات بالکل بے صدا ہوں گے۔ یہ تبدیلی جاذب صدا دیوار اور ایسی کھڑکیوں کے ذریعہ پیدا کی جا سکے گی جو اپنی ساخت کی محض خصوصیات کے باعث شور و غل کو مفقود کر سکیں گی۔

شور و غل کے خلاف جنگ اور اس کے مضرات کا اعتراف کوئی جدید العہد اقدام نہیں۔ قدیم زمانے میں یونانیوں نے بھی اپنے شہروں میں شور و غل کو ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ SYBARIS جس کی بنیاد جنوبی اٹلی میں ۲۰۰ قبل مسیح میں پڑی تھی پورے شہر کو متعدد حلقہ جات میں تقسیم کر دیا گیا تھا چنانچہ صنعتی کاروبار سے جو شور و غل ہوتا تھا بعض حلقوں میں اس کی بالکل ممانعت تھی۔ اس وقت بھی لوگوں میں یہ احساس موجود تھا کہ یا انسان شور و غل کو ختم کرے یا شور و غل انسان کو ختم کر دے گا۔

انسان شور و غل کو ختم کرتا ہے یا شور و غل انسان کو، یہ بات تو آئندہ معلوم ہو سکے گی لیکن اگر انسانی عزائم پایۂ تکمیل کو پہونچ گئے تو ساری دنیا ایک طویل و عریض شہر خموشاں بن جائے گی۔ حقیقتاً خاک کے استعمار کر کے قبل قیامت انہیں بیدار کرنے والے ہو۔ اس کے جیسے ہو کر رہ جائیں گے۔ ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

وہ بھی عجیب حالت ہوگی جب اِس خطرے سے کہ مبادا اپنے یا مخاطب کے دل کی دھڑکنیں معمول سے زیادہ نہ بڑھ جائیں ۔ ساری گفتگو سرگوشی کے انداز میں ہوا کرے گی ۔ ساقی اپنے جلوے سے ایمان و آگہی کی دشمنی میں تو کامیاب ہوسکے گا۔ لیکن مطرب غریب بے بس اور لاچار ہوکر رہ جائے گا ۔ اس کے نغمے فردوس گوش نہ بن سکیں گے ۔ جادہ حیات میں ہر نبض پا ہی نہیں شست گام بھی خموش ہوگا ؎

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

ذوالفقار علی خاں کے موٹر کی خموشی سے علامہ رحمتہ اللہ علیہ نے جو فلسفیانہ نتائج مرتب کئے معلوم نہیں ان کی نوعیت کیا ہوتی اگر ان کے سامنے یہ حادثہ پیش آتا کہ ریل گاڑی کے پیچھے جنگھاڑتے انجن اور سر پہ شور قیامت برپا کرتے ہوئے لیتارے بے صدا ہوکر پرچھائیوں کی طرح سامنے اور اُوپر سے گذر جاتے اور ساری دنیا خوابوں کی ایک بستی بن جاتی جہاں موت کا سا سکوت طاری ہوتا اور بولتے باتیں کرتے ہوئے انسانوں کے بجائے اس عالم آب و گل پر سائے منڈلاتے ہوتے ؎

اب کہاں انسان جنہیں انسان کہیں
چلتی پھرتی دیکھ لو پرچھائیاں

ناحق اور نازیبا سننے والے کانوں سے بے شک بہتر بہرا ہونا لیکن کچھ نہ سُن سکنے سے سُنائی دینا یقیناً اچھا پھر یہ بات بھی کم غور و فکر کی محتاج نہیں کہ انسان کا تدریج ایک مشینی وجود میں منتقل ہوجانا خود انسانیت کے نقطۂ نظر سے کس حد تک مناسب و مفید ہوگا ۔ خدا کے عطا کردہ علم اور صلاحیت سے بیش از بیش فائدہ اٹھا اور تسخیر کائنات کے ذریعہ انسانی معاشرے کو اور خالق ارض و سما کی منشاء کے مطابق اس کے بخشے ہوئے خزائن کو اس دنیا کے سنوارنے میں لگانا بجائے خود ایک سعی محمود ہے ۔ لیکن اس زندگی کا تصور جس میں انسان اور انسان کے درمیان ایک جان دار ربط کے بجائے بجلی کے تاروں اور بیٹریوں کا جال ہوا اور ہر انسان ایک چلتا پھرتا تار گھر بن جائے ۔ جذبۂ حیرت کو تو ضرور بیدار کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک منفی اور یاس انگیز احساس بھی اس تخیل کے پیچھے سے اُبھرنے لگتا ہے ۔ اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں کوئی طمانیت نہیں پیدا ہوتی ۔

اقبال نے صنعتی انقلاب پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ؎

ہے دل کے لئے قوت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

مجھے تو سائنس دانوں کی اِن جادو جہد تگ و دو انسانیت ہی کو کچلتی اور روندتی نظر آتی ہے ممکن ہے یہ میرا وہم ہو ۔

اصغر علی عابد

مغربی ادب کے تین دور[۳]

(قسط سوم)

آج کا حقیقت پسند" ادیب رومانیت پسندی کے نام سے چڑتا ہے۔ اور اس کے ذکر سے جھنجلا اٹھتا ہے۔ لیکن خود اپنی حقیقت پسندی میں وہ سب سے بڑا رومانی ہوتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حقیقت پسندی رومانیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل Perverted Romanticism ہے۔

دراصل رومانیت کی پیدائش کے وقت چاہے وہ کسی دور کی رومانیت ہو زندگی میں مادیت کی طرف جو میلان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اسی طرح برقرار رہا بلکہ کچھ اور بڑھ گیا۔ اس لئے حقیقت پسندی اور رومانیت میں سوائے لفظی الٹ پھیر کے کسی بنیادی فرق کا امکان قطعاً ناممکن ہے۔ بنیادی فرق اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ انسانی سوسائٹی کی گاڑی مادیت کے علی الرغم کسی دوسرے اصول پر چل پڑتی اور سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا۔

اس نظری موازنہ کے بعد اب ذرا واقعات کی سرزمین پر بھی قدم رکھ کر دیکھ لیجئے کہ رومانیت اور حقیقت پسندی میں فرق و امتیاز کس حد تک ہے اور یگانگت و اتحاد کس حد تک یورپ میں اسٹیونسن R L Stevenson بری James Barrie اور کپلنگ Rudyard Kipling اسی دور کی پیداوار ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا لٹریچر خالصاً رومانی ہے اسٹیونسن کی 'Treasure Island' اور "Prince Otto" بری کی Sentimental Little Minister Tommey اور Alice Sit by the fire اور اسی طرح کپلنگ کی نظمیں اور تصنیفات جن کا تعلق امپیریلزم اور نیشنلزم سے ہے سراسر رومانیت کی نمائندہ ہیں۔ پھر یہی حال فرانس، اٹلی، جرمنی، اور روس کے بڑے طبقے کا ہے۔ جو حقیقت پسندی کے اس دور میں بھی رومانیت پسند رہا۔ مزید براں وہ طبقہ جو خود کو حقیقت پسندوں میں شمار کرتا ہے اور تاریخ کی زبان بھی اسے حقیقت پسند ہی کہتی ہے۔ مثلاً فرانس کے فلابرٹ 'Gustave Flaubert' گان کورٹ برادران 'Gon Court Brothers' موپاسان Maupassant- زولا Emile Zola اور مشہور و معروف۔ اناطول فرانس Anatole France جس کا اصلی نام Jacques Thibault تھا طرز بیان۔ اسلوب۔ اور انداز نگارش کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سب کے سب ایک ہی رُخ پر بہے جا رہے ہیں۔ اور وہ ہے رُومانیت کی غیر شعوری منزل مقصود۔

انگلستان میں مری ڈتھ (Meredeth) اور ہارڈی (Hardy) اپنی کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کے باوجود جیمس (William James) برنارڈ شا (George Bernard Shaw) اور ویلز (H G Wells) اپنی سائنٹیفک ناول نگاری۔ طنز۔ اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ ساتھ اعتبار سے رومانیت ہی کے دلدادہ ہیں۔ بلکہ جیمس ولیم اور ہارڈی وغیرہ تو سراسر رومانی ہیں۔ البتہ شا اور ویلز کچھ بدلے ہوئے ہیں لیکن شا اپنے زور بیان۔ اشتراکیت پسندی اور بعض وقت بے جا تنقید اور غیر علمی مقصدیت کی بنا پر نِرا جذباتی بن جاتا ہے۔ اور یہ رومانیت ہی کی ڈھلی ہوئی شکل ہے۔ اسی طرح ویلز 'Time machine' The first man in the Moon اور Modern Utopia میں ایک جذبات پرست رومانی نظر آتا ہے۔ اس کی مؤخر الذکر کتاب میں لفظ "Utopia" اس کی حقیقت پسندی پر ایک کھلا ہوا طنز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ دراصل ایک "خیالی حقیقت پسندی" 'Utopian Realism'

ہی کے دلدادہ تھے۔

انگلستان کے علاوہ روس میں جو رفتہ رفتہ یورپ کے صفحہ پر نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ ٹالسٹائی (Tolstoi) چیخوف (Chekov) اور گورکی (Gorky) کے نام آتے ہیں۔ لیکن سوائے ٹالسٹائی کے جس نے انسانی فطرت کی صحیح عکاسی کی بڑی حد تک کوشش کی اور ان کے عمل کے صحیح رخ کو متعین کرنے میں وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوا دوسروں کو حقیقت پسند کہنا مضحکہ خیز ہے۔ اور سطحی اصلاح پسندی کے باعث جو تھوڑے عرصے بعد ہی بے فائدہ ثابت ہوئے۔ چیخوف اپنی تخشن نگاری۔ قنوطیت اور مجنونانہ کردار نگاری کے باعث "حقیقت" سے کوسوں دور جا پڑا۔ بہت سے لوگ چیخوف کی جزرسی میں کھو کر اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اس کی سینکڑوں بے حقیقت باتوں کو حقیقت سے قریب سمجھنے لگتے ہیں لیکن یہ ان کی نظر کا دھوکا ہے۔ چیخوف اپنے ادب میں "مقصدیت" کے اجزا بھی رکھتا ہے۔ اور جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے کہ اس کی مقصدیت کہاں تک "حقیقت پسندی" کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس وقت تک اس کو "حقیقت پسند" کہنا بالکل بے جا بات ہے۔ یہی حال گورکی کا ہے۔ جو لوگ اس کی زندگی کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ گورکی جیسے شخص کو "حقیقت پسندی" سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک اور اس کے بعد اپنی زندگی کے آخری دور میں کمیونسٹوں کا ساتھ دے کر ہر وقت اپنی جذباتیت کا علی الاعلان مظاہرہ کیا ہے۔ گورکی اگر کوئی "حقیقت" سے قریب تر کہہ سکتا ہے تو وہ صرف کمیونسٹوں کا فرقہ ہے۔ مگر اس دور کے ادیبوں میں چند اُمور مشترک ہیں۔

(۱) گھریلو۔ روایاتی۔ معاشرتی اور اخلاقی اُصولوں کے پس منظر میں انفرادی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اور ان کی خامی یا خوبی کا ذکر اپنے رجحان اور طرزِ فکر کے مطابق۔

(۲) خاندانوں، گروہوں، اور مختلف طبقات کے معاشرتی مسائل پر غیر معمولی اصلاحی مطالبات کے تحت روشنی ڈالنا۔ مزدوروں، عورتوں اور تقسیمِ دولت کے مسائل پر گفتگو کرنا۔

مگر ان دونوں اُمور میں "فضا" اور طرز (Style) کے اعتبار سے حقیقت پسندوں نے متضاد رجحانات کا اظہار کیا ہے۔

(۱) یعنی اگر معاشرتی اور تمدنی مسائل پر وہ ایک رجائیت پسند اور جرنلسٹ کی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہیں تو اپنے اسی قلم سے نفسیاتی مسائل کا ذکر کرتے وقت مکمل قنوطی (Pessimist) اور طنز نگار بن جاتے ہیں۔

(۲) حقیقت پسند بھی زمانۂ ماضی کے "قانون پسند" اہلِ قلم کی طرح اپنے مدعا کی وضاحت کے لئے کسی صحیح محاورے، صحیح لفظ اور صحیح توازن Pro-portion کے پابند رہنے کی "دردسری" مول لیتے ہیں۔

چنانچہ ان حالات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ کس حد تک حقیقت پسند تھے۔ اور کس حد تک جذباتی، رومانی یا وہی "قدامت پسند"!

اِن واقعات کو دیکھ کر یہ نتائج بھی بآسانی نکالے جا سکتے ہیں۔ کہ رومانیت کی طرح حقیقت پسندی میں بنیادی طور پر (۱) مادیت اور خدا سے بغاوت کے جراثیم موجود ہیں۔ بلکہ یہ "غیر فطری اور باغیانہ جذبات" پر کی ہوئی ادبی ترقی کا دوسرا قدم ہے۔ (۲) اِنسان کے وہ جذبات و احساسات جو نظامِ کائنات پر وسیع النظری سے غور کرنے اور زندگی کی تعمیر کے لئے ایک ضابطہ پر چلنے میں ممد و معاون ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب "واقعیت" کے ڈھونگ کے ساتھ گندہ اور غلیظ گلیوں کی چھان بین بدکردار عورتوں کی تعریف دفتروں کی مثلوں، کارخانوں کے دھوئیں اور کسان کے کھیتوں میں مٹی کے ڈھیلوں سے لطف اندوز ہونے میں ضائع ہو گئے۔ اور انسان ان سے کوئی صحیح خدمت نہ لے سکا۔

۳۔ جدیدیت

مادہ پرستانہ افکار جن کو ڈارون اور آگسٹ کومتے کے "ایجابی نظریات" Positive Ideas کے سہارے آگے بڑھایا گیا تھا۔ اور نئے استقرائی اندازِ تحقیق Inductive method کی بیساکھیاں لگا کر کھڑا کیا گیا تھا۔ زندگی کی مستقل اور پائیدار بنیادوں کے لئے کچھ زیادہ مفید نہ تھے۔ البتہ مسخ شدہ عیسائیت کے "ردِ عمل" کی شکل میں ان کی حیثیت ضرور طاقتور دکھائی دیتی تھی۔ لیکن جیسا کہ ایک ردِ عمل کی خصوصیت ہے۔ وہ حریف طاقتوں کے میدان سے ہٹتے ہی اپنی تمام "اصلیت" اور "خوبی" کھو بیٹھتا ہے۔ مذہب کے جاہلی افکار کے خلاف مادیت کے ردِ عمل نے بھی اس وقت اپنی تمام حرکت Action ترقی Progress معاشرتی ارتقاء Social Development اور تعمیری کاموں کی صلاحیت Constructiveness چاہے وہ کسی نوعیت کی ہو کھو دی۔ جب اس کا مدِ مقابل یعنی "مذہب کا جاہلی تصور" میدان سے ہٹ گیا۔ اور اس نے گرجاؤں۔ مکانات کے پُرسکون گوشوں، عبادات و رسومات، اور بوڑھے اور جھکے ہوئے اشخاص کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ جب تک "جاہلی مذہبی افکار" اور ان کے نتائج

ں ـــــــ یعنی مادی افکار میں نظری اور عملی کش مکش ہوتی رہی۔ اس وقت تک ثانی الذکر کے لئے میدان صاف ہوتا رہا لیکن جونہی "مذہب" (جیسا کچھ بھی وہ تھا) نے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے کو ہی اپنی عافیت کوشی کے لئے مفید خیال کیا۔ اور تمدنی نظام کا سارا بوجھ "مادیت" کے کندھوں پر پڑا تو اس وقت اس نئے فکر کی حقیقت کھلی، اور اس کی خوبی با ارتقاء کے طور پر نہیں بلکہ اس کی کمزوری کے طور پر بہت ہی جلد ایک اور ذہنی "بغاوت" "فرار و دوری" کا چرچا شروع ہوگیا۔

ہم گذشتہ سطور میں بتا چکے ہیں کہ جس زمانہ میں مسخ شدہ عیسائیت اور نئے مادی افکار میں ایک "جنگِ مناظرہ" جاری تھی۔ اور ایک طرف سے "دعویٰ" اور دوسری طرف سے "جواب دعویٰ" پیش کیا جا رہا تھا۔ اس وقت ادب کے محل سرا میں "رومانیت" کے خوبصورت چراغ روشن ہوئے۔ جس کا تعلق زیادہ تر جذباتیت سے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایک جذبات پرست دور میں یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ پھر اسی طرح جب مادی نظام کی میخیں رفتہ رفتہ یورپ والوں کے ذہنی میدان میں اچھی طرح گڑ گئیں اور زندگی میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہوا۔ تو "حقیقت پسندی" نے اپنا روئے منور دکھایا ادب کے پرستار مجرد فکری اور ذہنی کاوشوں کو ادب سے خارج کر دینے پر تل گئے۔ جس طرح ان کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ زندگی کے معاملات میں

مابعد الطبیعی نظریات Metaphysical Theories

کو داخل نہ کیا جاوے اسی طرح انہوں نے اپنے ادب سے بھی ان عناصر کو خارج کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ چاہے وہ اس میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ اب ہمیں اس امر کی وضاحت کرنی ہے کہ مادیت کی ناکامی یا اس کی خامیوں سے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایک طرح کی بغاوت رونما ہوگئی۔ مثلاً "معاشیات" میں سرمایہ داری (Capitalism) کے خلاف رابرٹ اوون (Robert Owen) لوئی بلان (Louis Blanc) فوری ایر (Fourier) سینٹ سائمن Saint Simon اور سب سے بڑھ کر کارل مارکس Karl Marx اور اس کے "ہم زلف" اینگلز Fredric Engles کے نظریات وافکار کی اشاعت سیاسیات میں ملوکیت Imperialism کے علی الرغم انتہا پسند جمہوری (Radical Democratic) افکار ملنے اور بالغ ہونے لگے۔ اسی طرح ادب میں بھی اس عام بحرانی کیفیت اور ایک وسیع و ہمہ گیر انتشار ذہنی کے نتیجے کے طور پر جو کارل مارکس اور اس کے گرویدہ طبقے کے رجحان کے مطابق محض سرمایہ داری اور امپیریلزم کے خلاف کوئی تعمیری انقلاب یا "جواب دعویٰ" نہ تھا۔ بلکہ مادیت کے منفی Negative نظریات کی کمزوری اور خود سرمایہ داری کے ضمیمے کے طور پر وجود میں آیا۔ اور ایک لحاظ سے اس کی تکمیل کرتا تھا۔ "باغی عناصر" کا ظہور ہونے لگا۔ قدیم ادبی عقائد و روایات (Conventions) چاہے وہ "رومانیت" کے ہوں یا "حقیقت پسندی" کے سب کے خلاف ان نئے عناصر نے "جو جدیدیت" (Modernism) کے معصوم نام سے موسوم ہوئے سخت تشدد اور دشمنی کا علم بلند کیا۔

آج کل ہندوستانی ادیبوں میں اس "جدیدیت" کا بڑا چرچا ہے۔ اور یورپ کی طرح یہاں بھی نئے سیاسی، معاشی اور تاریخی نظریات کے ساتھ ساتھ "جدیدیت" زندگی میں داخل ہو رہی ہے۔

اس نئے رجحان کا بنیادی کردار در اصل لفظ "بغاوت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا مدار نہ صرف گذشتہ زمانہ کے ضابطہ بند ادب classicism رومانیت، اور حقیقت پسندی کے خلاف بغاوت پر رکھا گیا ہے۔ بلکہ خود اپنے وجود کے خلاف بھی اس میں ہر آن "بغاوت" ہی کی جاتی ہے۔ ہر وہ ترکیب، محاورہ، مثال، تشبیہ، استعارہ، اور تلمیح جو ایک دفعہ استعمال کی جائے، نئے ادب میں دوسری دفعہ استعمال کرنا گناہِ عظیم ہے۔ یہ "جدیدیت" اگرچہ قدامت پسندی اور رومانیت وغیرہ کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر ظہور میں آئی ہے لیکن اس انوکھے ردِ عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ خود اس میں کوئی ضابطہ قانون یا کلیہ موجود نہیں، جس طرح پچھلے زمانہ میں قدامت کے علی الرغم رومانیت نے جنم لیتے ہوئے دنیا کو کچھ نئے اصولوں سے واقف کرایا، اور یہی کام پھر "حقیقت پسندی" نے بھی انجام دیا۔ یعنی اس نے بھی ایک "اصول اور قاعدہ" پیش کیا مگر اس "انقلابی جدت پسندی" نے اپنا کوئی اصول یا قاعدہ پیش نہیں کیا بلکہ تمام اصولوں اور قاعدوں سے آزاد رہنے کا نام ہی اس کے نزدیک ادب کی اہم ترین خصوصیت قرار پا گئی۔ تاہم غیر ارادی طور پر اس میں چند خصوصیات پیدا ہوگئیں اور یہ تین شاخوں میں بٹ گئی ہے۔

(۱) پہلی شاخ کا خاصہ ہے، انداز بیان کی انتہائی سادگی جس سے مراد یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے خیالات کو نہایت صاف اور "عریاں" طریقہ پر پیش کرے، چاہے وہ انسانی زندگی کے کسی شعبے اور اس کے کسی فعل سے

متعلق جو موٹے موٹے الفاظ، استعاروں، محاوروں اور اشارات کے "مہذب پردوں" کو یک لخت چاک کر دیا جائے۔ مثلاً کسی عورت اور مرد کے رشتے کو "نیا ادیب" ان کے تمام صنفی افعال اور جذبات کی پوری تفصیل کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے بیان کرے گا کسی آوارہ عورت کے کردار کا نقشہ پیش کرتے وقت "جدید ادب" کا پیرو اس کی تمام آوارگی کو من وعن پیش کرنے کی سعی کرے گا۔

(۲) دوسری شاخ "مقصدیت" کی علمبردار ہے۔ اس میں قدیم معاشرتی اصولوں پر تنقید، طبقاتی کش مکش کا تذکرہ اور اس کے ایک مفید حل کے طور پر مارکسی خیالات کا تعارف بالعموم اس کا شیوہ بن گیا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کے نئے مسائل کا حل اس وقت مارکسی خیالات میں پایا جاتا ہے اسلئے ادبی مقصدیت کو مارکزم سے مملو کرنا لازمی ٹھیرا۔ عام طور پر شاخ کے ماننے والوں نے اپنے آپ کو "ترقی پسند" کا لقب دیا ہے لیکن در اصل وہ صرف "اشتمالیت پسند" ہیں مگر جب انہیں صاف طور پر اشتمالیت پسند کہا جاتا ہے تو وہ بہت چڑتے ہیں اور جھنجلا کر کہہ اٹھتے ہیں کہ ان "رجعت پسندوں" کو کیا معلوم کہ ترقی پسندی" کیا ہے اس کے بعد وہ ترقی پسندی کا ایک ایسا تجزیہ پیش کرتے ہیں جسے محض ایک چیستاں (Riddle) اور پہیلی کہنا زیادہ بہتر ہے۔ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ یہ لوگ خود ہی بنیادی طور پر اس امر کے قائل ہیں کہ "پرولتاری انقلاب ہی زندگی میں حقیقی اصلاح اور تغیر کا موجب ہو سکتا ہے۔ آسمانِ فکر وضمیر کا درخشاں ترین ستارہ۔ کارل مارکس" ہی تھا لیکن ان تمام باتوں پر سر ہلا دینے کے باوجود جب علی الاعلان ان کو اشتمالیت پرست اور کمیونزم کا علمبردار کہا جاتا ہے، تو یہ حضرات نہ جانے کیا سوچ کر اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس کی تردید کے لئے تمام زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔ اگر "ترقی پسند" ادیب اشتمالیت کے پیرو نہیں۔ اور انسانی زندگی کا مقصد اشتمالی انقلاب کو نہیں بلکہ کسی اور چیز کو قرار دیتے ہیں تو آخر وہ "اور چیز" کونسی ہے؟ کیا "ترقی پسند ادیب" کے لٹریچر میں اس کی جھلک دکھائی جا سکتی ہے؟ یا اشتراکیت اور اشتمالیت کے علاوہ انہوں نے کسی دوسرے فلسفہ کی تبلیغ واشاعت کو بھی "ترقی پسندی" قرار دیا ہے یا قرار دینے اور تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہیں؟ دراصل یہ لوگ آپ اپنی حقیقت سے ناواقف ہیں انہوں نے نہ اس ذہنی انقلاب کو سمجھنے کی کوشش کی جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مذہب کے جاہلی تصور کے خلاف ہوا اور نہ اس "تفلسف" کا تجزیہ کیا جو بیسویں صدی میں مادیت اور سرمایہ داری کے بعد کسی تعمیری فکر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی تخریب اور تنزل کے مظہر کی حیثیت سے نمودار ہوا، ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو کسی شدید طوفان میں خشکی سے بہہ کر چاروں طرف پانی کی خوفناک موجوں سے گھر گیا ہو۔ اور جسے دور دور تک ساحل کا کوئی نشان نظر نہ آتا ہو۔ جس کی بدحواسی میں اس نے ان ہلاکت خیز موجوں ہی کو ساحل سمجھ لیا ہو۔ اور اپنی زندگی اور بقاء کے لئے بھی انہیں کو سہارا بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔

(۳) تیسری شاخ "حقیقت پسندی" کی مخالفت میں واقعات اور حقائق کی تصویر کشی کے بجائے زیادہ زور "مجردات" Abstract Ideas پر دیتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ خصوصیت "مقصدیت" ہی بے جا غلو کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس لکھنے والے کے پیش نظر کچھ مقاصد ہوں اور جو شخص ایک ادیب ہیں۔ بلکہ ایک "مصلح" اور "انقلابی" بننے کا خواہشمند بھی ہو وہ اپنا وقت کسی سوسائٹی کی تصویر کشی میں ضائع کرنے کے بجائے زیادہ توجہ اپنے خیالات کی اشاعت میں دے گا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو "اشاراتی ادب" (Symbolism) یا مجرد قوتوں کے "تشخص" اور ان کے ذریعہ افکار کی اشاعت کا طریقہ رائج تھا۔ وہ اسی کی ایک غیر ترقی یافتہ شکل Undevelop-ed Form تھی۔

(۴) چوتھی شاخ "مستقبل پسندی" Futurism کی ہے۔ اس کا پیرو ہمیشہ حال سے بیزار نظر آتا ہے وہ ہرگز اس بات کا متمنی نہیں کہ کہیں تھم جما کر کھڑا ہو۔ بلکہ وہ ہر آن ایک نئی اڑان کا خواہشمند ہے۔ اسے حاضر وموجود پر کبھی اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ ادب کی گاڑی کو ہر وقت مستقبل کے کسی سراب کی طرف دھکیلتے رہنا چاہتا ہے "مستقبل پسندی" کا یہ خیال بھی مقصدیت ہی کا شعبہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن مقصدیت میں پھر بھی ایک طرح کا ٹھیراؤ اور سکون ہے "مقصدیت" ایک مبہم اور غیر واضح لفظ ہے۔ اور "مستقبل پسندی" ایک واضح اور غیر مبہم اصطلاح ہے اس لئے "جدیدیت" کا سب سے بڑا نمائندہ در اصل یہی خیال ہے اور اس کا سب سے زیادہ اہم جوہر بھی یہی ہے۔ "مستقبل پسندی" کا پیرو، ادب کے مختلف شعبوں نظم، نثر وغیرہ میں، صرف کسی قسم کا ضابطہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ ایک نئے اور تبدیل شدہ انداز میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا خواہش مند ہے۔ چنانچہ اس کے ایک سب سے بڑے اور متعصب وکیل میری نیٹی (F T Marinetti) نے جو اطالیہ کا باشندہ ہے۔ اس انوکھے فکر کی تبلیغ ان الفاظ میں کی ہے۔

"We futurist uphold the idea of a great and strong scientific literature, which, from all and classicism and pedantic purism, will magnify the

most-recent discoveries, the new intoxication of speed, and the celestial life of aviators. Our poetry essentially and totally rebelling against all used forms. The tracks of verse must be torn up and the bridges of things already must be blasted and the locomotives of our inspiration must be started toward the coming, toward the boundless fields of the New and the future. Better a splendid disaster than a monotonous race daily re-run; we have put up too long with the station master of poetry, the conductors of scanning, and the punctual time tables of prosody."

[illegible] کے جدید ادب [illegible] ایک طاقت ور
سائنسی ادب ہوتی ہے جو قدامت [illegible] روایات و ضوابط کی پابندیوں سے آزاد
ہے۔ اور جو پرانی اور فرسودہ خیالات [illegible] کے بجائے نئی نئی ایجادات اور اختراعات
سے محبت کرتا ہے وہ زمین پر رینگنے والے کیڑوں کے کردار کے بجائے تیز رفتاری
کے ہوائی [illegible] کو چلانے والوں کی [illegible] زندگی کی [illegible] تعریف
کرتا ہے ہماری [illegible] فرسودہ ہیئتوں کے خلاف بغاوت
کرتی ہے [illegible] شاعری کے تمام راستوں کو [illegible] جانا چاہیے۔
روایت [illegible] کی منزل کو جانے والے تمام پلوں کو اڑا دینے چاہیے اور
ہمیں [illegible] تخلیقی ادب کی تمام گاڑیوں کو آنے والے دور کی طرف بڑھانا
ہے۔ [illegible] کی طرف اقدام کی ضرورت ہے اور [illegible] مستقبل
کی [illegible] اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ ایک [illegible] اور

'قانون پسند ادب' کو بار بار استعمال کیا جائے۔ ہم اپنا شاعری کے پرانے ہدایت کاروں کے احکامات پر بہت چل چکے۔ "فاعلاتن، فاعلاتن فاعلات" کے اوزان اور پیمانہ جات کے چکّر میں ہم ایک عمر گذار دی اور فن عروض اور ردیف، قافیہ کے 'نظام نامے' پڑھتے پڑھتے ہم نے اپنی زبانیں خشک کرلیں لیکن اب ان چیزوں کا کوئی وقت نہیں رہا۔"

یہ ہے جدید ادب کی "مستقبل پسندی" اگرچہ یہ بظاہر صرف فن اور تکنیک تک محدود معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا تعلق جتنا فن کے "انتشار" سے ہے اتنا ہی خیالات اور افکار کے انتشار سے بھی ہے۔ یہ ادب جتنا تشبیہ، محاورے، استعارے اور ضرب المثال کا اس کے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینے پر تلا ہوا ہے۔ اتنا ہی یہ ہر نئے فکر اور ہر نئے خیال کو اس کی پیدائش کے اوّلین لمحہ میں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ ہر شخص جو "عصر" ہے ادیب لا کر ہی اس "فطرت" کا احساس نہ ہو۔ لیکن جس ذہنی انتشار کے سیلاب میں ان کے ذہن بہہ رہے ہیں۔ اُن کا لازمی نتیجہ یہی فکری پراگندگی اور "دماغی ہیضہ" ہے۔

(۵) "افادیت پرستی" Utilitarianism

مادّی تفلسف اور عقلیت کا لازمی جزو ہے اور جب مادّیت کے ساتھ ساتھ دورِ عروج کو پہنچا ہے، نئے ادب کی ایک شاخ پر مسلّط ہے۔ مگر یہ جیز "خیالات" اور تکنیک دونوں سے یکساں طور پر وابستہ ہے، اور ایک لحاظ سے "قاعدے" اور "ضابطے" سے بچنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ "افادی ادب" کا گرویدہ وقت۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے اپنے ادبی مقاصد کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی ملک حالتِ جنگ میں ہے تو وہاں کا ادیب اپنی قوم کے جذبات کو دشمن کے خلاف بھڑکانے میں ساری قوت صرف کر دے گا۔ ابھی حال میں جب جرمنی اور روس میں لڑائی ہو رہی تھی تو روس کا ہر نیا ادیب اپنا سارا زورِ قلم روسی سپاہی کو جرمنوں کے مظالم کی جھوٹی سچّی داستانیں سنا سنا کر جوش دلانے میں صرف کر رہا تھا۔

(۶) لذت پسندی Hedonism بھی جدیدیت کے تاج کا ایک موتی ہے اس تصور کی پیدائش کے پیچھے ادیب کا صنفی میلان ہے جو اس کی عمر کے مختلف مدارج اور حالات کے ساتھ ساتھ مختلف روپ اختیار کرتا ہے۔ فرائڈ نے جنس پرستی کو وجہ جواز بخشنے کے لئے ایک فلسفہ تراشا تھا اس فلسفہ کا دلدادہ ہر شے میں لذت کی تلاش کرتا ہے حتیٰ کہ گندے کیڑوں کی بدبو میں اس کے لئے لذت ہی لذت ہے۔ وہ ظاہر پرست اور خیال پرست بھی ہوتا ہے۔ اس نکرے نے بڑے بڑے پر مغرب! خلاق ادب کو جنم دیا۔ لذت پسند ادیب شروع میں تو اپنے اس مرض کو تسکین دینے کے لئے یہ اقدام کرتا رہا لیکن رفتہ رفتہ وہ اِس افیون کا عادی ہو گیا

اور دن بدن اس کی چاٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس میں اور عہدِ عتیق کے حسن پرستوں sex worshipper میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

یہ ہے "جدیدیت" کا مختصر تجزیہ۔ اس کی جن چھ شاخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے پیرو الگ الگ دیکھے جا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ جدیدیت کی تمام شاخوں کی خصوصیات بیسویں صدی کے آغاز سے لیکر جنگِ عالمگیر ثانی کے اختتام تک سب شاخوں کے پیروؤں کی مشترک خصوصیات ہیں۔ اس تقسیم کی ضرورت صرف اس لئے پیش آتی ہے کہ ان میں سے ہر شاخ اپنی مخصوص نوعیت میں دوسروں سے زیادہ آگے ہے اور فنکاروں کے یہاں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ لیکن جدیدیت کے اس تجزیہ کے بعد اب ہمیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ دوسری جنگِ عالمگیر کے بعد سے ادب پر ایک تحریک اثر مرتب ہو رہا ہے اور اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ جدیدیت کی وہ قدریں جنہیں مادہ پرستانہ تصورِ زندگی، حسن اور جمال کے جنس پرستانہ نقطۂ نظر۔ اور آرٹ میں انتشار کو ترقی پسندی قرار دینے والے زاویوں نے پیدا کیا تھا۔ انسانیت کی عظیم معاشی معاشرتی اور اخلاقی تباہی کے نیچے آکر دم توڑنے لگی ہیں۔ اب عام طور پر ہر سنجیدہ شاعر۔ افسانہ نگار اور ناول نویس صالح اور تعمیری قدروں کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ اس جگہ اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ صرف اشارۃً ہی یہ بتایا جا سکتا ہے کہ "جدیدیت" اب مرحوم و مغفور ہوتی جا رہی ہے۔ پروفیسر ٹوئن بی۔ شوئٹزر۔ اور دوسرے فلسفیوں نے اپنی تحقیقات سے زندگی کے زوال اور ارتقا کی منازل کی نشان دہی کا اظہار کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کے نقطۂ نظر میں ابھی پوری وسعت نہیں پیدا ہوئی ہے لیکن انہوں نے اتنی بات تو کھول دی ہے کہ دنیا میں ہمیشہ سے انسانیت کے عروج و زوال کی مستقل قدریں رہی ہیں۔ تمام دنیا کے تمدن ایک خاص محرکات کے تحت زوال کا شکار ہوئے۔ خاص محرکات نے انہیں آگے بڑھایا جن کا نتیجہ تک یہ فلسفی اور مورخ پہنچے ان کو ادیبوں نے اپنی آنکھوں دیکھے واقعات کے ذریعہ پیش کیا۔ 'Chicago Confidential' 'New york Confidential' اور 'Washington Confidential' جدیدیت کی بنیادوں پر تعمیر شدہ سماج کو اس بے دردی کے ساتھ عریاں کر کے پیش کیا ہے کہ ان کے پڑھنے والے اس گھناؤنی تصویر سے خوف و ہراس میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جدیدیت سے یہ نفرت ہو سکتا ہے کہ کسی ایسے ردِ عمل کی شکل میں ظاہر ہو۔ جس میں عہدِ جدید کے صالح عناصر کو بھی مغربی دنیا پامال کر کے رکھ دے جیسا کہ مسخ شدہ عیسائی مذہبیت سے ردِ عمل کے وقت اس نے اس کے ساتھ [illegible] تمام عناصر کو ایک ساتھ پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ چاہے ایک محقق اور ریسرچ اسکالر ایسا نہ کرے لیکن ادیبوں اور آرٹسٹوں سے یہ غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نازک موقع پر جبکہ مغربی دنیا اب پھر ایک نئے موڑ پر کھڑی ہوئی ہے اور اس کا ادب تیزی سے ایک نیا موڑ مڑنے والا ہے۔ مغرب کو سیدھی راہ دکھانے کی شدید ضرورت ہے اور غالباً یہ کام اب مشرق کے سپوت کریں گے۔ ان میں بھی وہ لوگ جو زندگی اور آرٹ کا خدا پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو زندگی کے اصل اور مادی حقائق کو حقیقت پسندی کی اصلی بنیاد مانتے ہیں۔

جمال اور حسن کو پاکیزہ سیرت اور عمل صالح میں دیکھتے ہیں۔ اور اس پہلو اور رنگ کو جو ہمیشہ سے انقلابی اور تعمیری کردار رکھنے والوں کا خاصہ ہے۔ انسان کی فطری روحانیت پسندی کے لئے ایک اساسی قدر کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔

(ختم شد)

تسکین قریشی

جرأتِ شوق بہ اندازۂ احساس نہیں
تجھ کو اے دل ابھی دعوائے جنوں راس نہیں

کون افتادِ رہِ عشق ہے جو راس نہیں
تم مقابل ہو تو کیا دوری ہے کیا پاس نہیں

آہ تنہائیِ دل، آج کوئی پاس نہیں
عشق کو ہوش نہیں، حُسن کو احساس نہیں

رنگ و نکہت کو نہ دیکھو کہ اسی گلشن میں
وہ بھی کلیاں ہیں جنہیں موسمِ گُل راس نہیں

عشق ہے آہ، وہ غارت گرِ دل جس کے بغیر
مستیِ ہوش نہیں، لذتِ احساس نہیں

دے تو رکھا ہے ہمیں وعدۂ بیہم کا فریب
کون کہتا ہے وفاؤں کا انھیں پاس نہیں

زندگی حادثۂ مرگِ مسلسل ہے، اگر
شورشِ شوق نہیں، شدتِ احساس نہیں

جادۂ شوق میں ہر غم ہے چراغِ منزل
دل ہو روشن تو کہیں تیرگیِ یاس نہیں

دہر کے ہر غم و راحت سے گذر جا اے دل
کوئی حالت بھی یہاں قابلِ احساس نہیں

غمِ دوراں سے بھی لطفِ غمِ ہستی نہ ملا
دل کو کچھ سوزِ محبت کے سوا راس نہیں

نہ سہی شاعرِ "فن کار" مگر اے تسکیں
میرے شعروں میں کہیں پستیِ احساس نہیں

حفیظ میرٹھی

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی
اب آدمی کا ٹھکانہ، نہ کائنات کی خبر
سنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سَودائی
عَوام کو یہ زمانہ خُدا بناتا ہے
کہاں یہ بھیڑ، کہاں تیری شانِ یکتائی
ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہَوس نہ رَاس آئی
اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا
جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی
اُسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے گی منزل
وہ عزم جو نہیں محتاج ہمّت افزائی
حیات پُوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی
مُشاعروں میں حفیظ آج کل وہی جائے
کہ جس کو حد سے زیادہ ہو ذوقِ رُسوائی

کوثر نیازی

بے قراروں سے، بے سہاروں سے
لوگ چڑتے ہیں غم کے ماروں سے
لالہ و گل سے کھیلنے والو!
پڑ گیا واسطہ جو خاروں سے؟
لُٹ گیا جب چمن تو سوچ آئی
کیا بُری تھی، خزاں بہاروں سے
جن کا دل کو بڑا سہارا تھا
وہی دیکھا کٹے کناروں سے
اے دلِ زار! برملا کہہ دے
بات بنتی نہیں اشاروں سے
اس کو تیراک کون کہتا ہے؛
جو نہ لڑ جائے تند دھاروں سے
کچھ نہ کچھ آس بھی ہے اے کوثر
اور نالاں بھی ہوں سہاروں سے

شاکر تسلیم

کیا خوب ہیں یہ اہلِ نظر بھی
پھولوں سے رغبت کانٹوں کا ڈر بھی
تو ہی نہیں ہے حیران اے دل
کھوئی ہوئی ہے اُن کی نظر بھی
ڈھلتے ہی ڈھلتے ڈھلتی ہیں راتیں
ہوتے ہی ہوتے ہو گی سحر بھی
دونوں ضروری ہیں زندگی میں
کیفِ نظر بھی سوزِ جگر بھی
پھر ایسا موقع شاید نہ آئے
راہِ وفا میں جاں سے گزر بھی
آئے تو کوئی پیغامِ گلشن
اُڑ جائیں ہم تو بے بال و پر بھی
اپنا تو فن ہے انمول شاکر
آگے ملیں گے کچھ پیشہ ور بھی

راشد کیرانوی

○

زندہ باد اے تلاشِ غمِ معتبر
اب جنوں بھی نہیں ہے مرا ہم سفر
کیا ارادہ ہے اے میرے ذوقِ سفر
منزلیں پُرسکوں راستے پُرخطر
ظُلمتیں چاہے کتنی ہی کوشش کریں
ان سے رُکتی نہیں ہونے والی سحر
ذرّے ذرّے نے یُوں خیر مقدم کیا
جیسے واقف ہو مجھ سے ہر اِک رہگذر
کیسے دیکھوں یہ آرائشِ انجمن
زخم خوردہ ہے اے دوست میری نظر
جا رہا ہے عجب شان سے کارواں
راہ رَو مطمئن رہنما بے خبر

احمد نسیم مینانگری

○

سحر کا نُور بھی ہے، تیرگیٔ حال کے بعد
خوشی کا دَور بھی آجائے گا مَلال کے بعد
مری حیات تھی دُشمن، مری حیات ہے دوست
ترے خیال سے پہلے، ترے خیال کے بعد
"فضا تمام نشیمن، فضا تمام قفس"
ترے زوال سے پہلے، ترے زوال کے بعد
ہماری فکر میں ظُلمت، ہماری فکر میں نور
ترے جمال سے پہلے، ترے جمال کے بعد
مٹیں گے نقشِ صداقت نہ اہلِ نخوت سے
یہ زخم اور اُبھرتے ہیں اِندمال کے بعد
نسیمِ دل کی حقیقت تھی ایک ذرّۂ خاک
یہ آفتاب بنا پرتوِ جمال کے بعد

ابنِ احمد بی اے گورکھپوری

○

اگر ہم شادماں ہوتے تو غم خانے کہاں جاتے
ہماری بے لبسی کے تازہ افسانے کہاں جاتے

ہماری بیخودی بھی مصلحت اندیش تھی ساقی!
جو ہم ہشیار ہو جاتے تو میخانے کہاں جاتے

غنیمت ہے چمن میں کچھ تو ہم رنگِ جنوں نکلے
یہ کانٹے پھول بن جاتے تو دیوانے کہاں جاتے

مجھے شکوہ بھلا کیوں ہو کسی کی بے نیازی کا
اگر وہ اپنے ہو جاتے تو بیگانے کہاں جاتے

مداوائے غمِ پنہاں تو کچھ مشکل نہ تھا اے دِل
مگر حسرت بھرے اشکوں کے نذرانے کہاں جاتے

مستفیض منصوری اے

○

میرا ہر سجدہ تصنع ہے عبادت مکر و کیں
اِن قیود دِنار وا کو نہیں سکتی جبیں

دستِ فطرت نے بنایا ہے تجھے نقشِ حسیں
ہر نفس تیرا محبت، ہر ادا حسن آفریں

حِرفِ پروانہ نہ تھا ہمراز آشنائے حسن دوست
ہے زبانِ شمع پر بھی آفریں صد آفریں

حق پرستوں کی نگاہیں ہو گئیں باطل نواز
پھر زمانہ ہنس رہا ہے زہر خندِ آتشیں

رہنما ہی مستند ہے اور نہ راہی مستعد
یہ وہ عالم ہے جہاں میری کوئی منزل نہیں

اقبال نسیم عثمانی

کالی شیروانی

اِسی خیال اور اِسی تصوّر میں مکمل تین گرمیاں، تین برساتیں اور تین سردیاں گذر چکی ہیں۔ مگر اب بھی قسمت میں وہی ڈھاک کے تین پات نظر آ رہے ہیں۔ باقی اللہ۔ اللہ اور خیر صلاّ۔

اوائل اکتوبر سے ہی شیروانی کا خیال لمبی لمبی سسکیوں میں بدل کر کچھ دورے کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دسمبر کے اخیر تک تو یہ تمام ٹھنڈی ٹھنڈی سسکیاں جم جما کر ایک برف کی سِلی بن جاتی ہیں اور میں جنوری کے یخ بستہ ایام میں بھی ٹھنڈی سلی اٹھائے ٹو بہ ٹو پھرتا ہوں مگر کوئی خدا کا بندہ اِتنا بھی نہیں پوچھتا۔ کہ بھیّا جمیل کیا حال ہے۔ اُف! کیسا خون سفید ہو گیا ہے دُنیا کا۔

اب اِسی سال کی تازہ بتازہ سُنئے کہ اکتوبر گذر چکا ہے۔ نومبر گذرتا ہے اور شاید دسمبر گذر جائے گا مگر شیروانی کے بندوبست کا معاملہ ہنوز روزِ اوّل کی کھٹائی میں پڑا ہے۔ شاید نومبر ہی کی کوئی تاریخ تھی کہ مجھے بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ وہ میرے شاعر دوست بھی کچھ کم و بیش یہی تنخواہ پا رہے ہیں جو مجھے ملتی ہے مگر اُن کے پاس کئی کئی گرم شیروانیاں موجود ہیں۔ پوچھنا چاہیئے کہ دب کا اِس کسادبازاری میں کہاں سے اور کس طرح ماریں ـــــ یہ سوچتے ہی میں اُن کے پاس پہونچا اور ابھی حرفِ مطلب زبان پر لایا ہی تھا کہ وہ اِس طرح مُسکرا اُٹھے جیسے ہماری بیماری کا اُن کے پاس کوئی مجرّب نسخہ موجود ہو۔ انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں فرمایا۔

"جمیل بھیّا! ہماری یہ شیروانیاں شادی کی رہینِ منّت ہیں۔"

میں مطلب سمجھتے ہوئے بھی بولا۔ کیا مطلب؟

اور وہ اپنے سینہ بند نسخہ کی ادویات کو دِل ہی دل میں دہراتے ہوئے گل فشاں ہوئے۔

بھئی! جب تنخواہ میں شیروانی کا کوئی بیونت نہ دیکھا تو مجبوراً شادی کر ڈالی۔ اور شادی پر کئی کئی شیروانیاں مل گئیں۔ اب کچھ سردیاں آرام سے

جی چاہتا ہے۔ کچھ کہوں مگر درمیاں ہیں گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل" کی ایک ایسی مشکل آ پڑی ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور پھر ہمارے "کہوں یا نہ کہوں" والے تذبذب کو دیکھ کر اگر خدانخواستہ آپ فرمائیں "ڈوب مر" تو صاحب! ڈوبنا اور ڈوب کر سچ مچ مر بھی جانا کم از کم اپنے بس کا روگ نہیں۔ ویسے ہم لاکھ غیرت مند سہی مگر اتنے غیرت مند بھی تو نہیں کہ بات کی بات میں بے بات جان دے بیٹھیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دِن ابھی عمر کی بہاریں ہی کتنی دیکھی ہیں۔ لاکھوں ارمان ہیں اور کروڑوں حسرتیں اور پھر بقول شخصے۔ع

"ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے"

اب یہ دم نکلنے والی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ پچھلی تین سردیوں سے مستقل اِرادہ کر رہا ہوں کہ میں بھی اللہ کا نام لیکر ایک کالی شیروانی بنوا ہی لوں۔ مگر بھلا ہو مُنّے کی امّاں کا کہ ہر مہینہ کی بیس تاریخ کو بجٹ کچھ اِس طرح فیل کرا دیتی ہیں کہ مستقبل بے گھمایا چرخہ، حال کے چرخہ کی چرخ چوں چرخ چوں کو جاری رکھتا ہی دوبھر ہو جاتا ہے۔ اور یہ گھریلو چرخہ کمبخت اپنی گردش میں گردشِ چرخ سے کم نہیں۔ شاید اُس کی گردش سے کسی خوش نصیب کے دِن پھر بھی جاتے ہوں مگر اس کی گردش قسمت کا ایک ایسا چکّا تلا پہیا۔ بند ھا ٹکا دیکھے کہ مہینہ بند ہونے سے پہلے ہی اپنی قلم بند آمدنی سے اِس طرح ہاتھ جھاڑ اور مُنہ پسار کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی مُردہ کو مٹی دے کر اب رو دیا ہی چاہتے ہوں ـــــ اب آپ ہی بتلائیے کہ "کالی شیروانی" کیسے بنے۔ پیٹ پر پٹی نہیں باندھی جا سکتی۔ منّے کی امّاں کا کہا نہیں ٹالا جا سکتا۔ اِس پر بھی جو کچھ کماتا ہوں وہ سب پیٹ کی نذر۔ اِس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں یا میری "وہ" خدانخواستہ کچھ پیٹو ہیں اور جو کچھ ملتا ہے۔ دِلّی کے کرخنداروں کی طرح چاٹ۔ چٹنی میں اڑا دیتے ہیں۔ اگر یہی ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ مگر یہاں تو رونا اس کا ہے کہ جو کچھ ہمارا نظام ہمیں ہماری مزدوری دیتا ہے وہ اس قدر قلیل ہے کہ "کھاتے چٹ خارے" تو لیا۔ "ہکا رے" ہی بمشکل قایم رکھے جا سکتے ہیں۔ اب پیٹ کی اِن تمام دشواریوں کے پیشِ نظر پھر وہی سوال آتا ہے کہ کالی شیروانی کیسے بنے۔؟

کٹ جائے گی۔ اور میں اپنے دوست کے بتائے ہوئے نسخہ اور اس کے ترکیب استعمال پر بھونچکا سا رہ گیا۔ کچھ دیر خواہ مخواہ سر کھجاتا رہا اور پھر خشک بالوں کی خشکی جھاڑتے ہوئے بولا۔

میں دوست! اس نسخہ کی تمام ادویات قیمتی اور ثقیل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شادی پر آئی ہوئی شیروانیوں سے سردیاں کچھ آرام سے کٹ جائیں گی۔ مگر گرمیوں کے آتے ہی جو مالی مشکلات کے بخارات اٹھیں گے تو پھر منے کی اماں کے ساتھ اس نے مجسم بخار سے سلٹ لینا کم از کم اپنے بس کا کام نہیں۔ کوئی اور سستا سا نسخہ ہو تو بتاؤ۔

مگر انہوں نے لاجواب ہو کر اپنی شیروانی کے پھیلے ہوئے کالر میں کسی ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح گردن ڈال دی۔ اور مجھے دن ہی میں تارے نظر آگئے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد آخر خود ہی بولا۔

بھئی! یہ کوزہ گر کوزہ بناتا ہے اور ہر وقت دھیان رکھتا ہے کہ کہیں اس کے بنائے ہوئے کوزہ کو ٹھیس نہ لگ جائے، کوئی بال نہ آجائے تو کیا وہ تمام ادب نواز حضرات جو ہے آپ کو شاعر اور ادیب گردانتے ہیں اور انہیں خوب خوب بناتے ہیں۔ ان کا کوئی مالی تعاون نہیں کر سکتے جبکہ وہ غریب مالی مشکلات کی چوٹ پر چوٹ کھا کر کسی مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹے جا رہے ہیں۔"

شاعر دوست مسکرائے۔ "اس غلط فہمی میں نہ رہنا بھیا! آج کل ادیب شاعر کی قیمت صرف واہ۔ واہ ہے۔ پیسے نہیں۔ یقین نہ ہو تو تجربہ کر لو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر کھینچتے ہوئے مجھے ایک ریسٹورینٹ کی طرف لے گئے۔ ریسٹورینٹ کا مینیجر خاصہ ادیب و شاعر گر قسم کا آدمی تھا۔ جسے میں بھی جانتا تھا اور وہ بھی۔ ہم اپنا نجی ریسٹورینٹ سمجھ کر صوفوں پر دراز ہو گئے۔ اور ہمارے شاعر دوست کچھ توقف کے بعد میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مینیجر سے بولے۔

"کیوں بھئی چھمو! کیسی ہوتی ہیں ان کی کہانیاں۔"

"ایک دم لاجواب" مینیجر نے جواب دیا "تمہارے سر کی قسم تمہاری غزلیں اور ان کی کہانیاں ایک نشہ ہیں اور وہ بھی دو آتشہ۔"

مینیجر پھر اپنے ادب لطیف پر مسکرایا۔ اور ہمارے شاعر دوست نے بھی مسکراتے ہوئے مجھے اشارہ کیا اور میں نے مینیجر کو سچ مچ نشے میں ڈولتا دیکھ کر موقع غنیمت جانا اور ایک دم برجستہ چائے کا آرڈر دے دیا۔ چائے پی لینے کے بعد خیال تھا کہ پیسے کیا دے گا۔ مگر ازراہِ تکلف پوچھ ہی لیا۔

"کہو بھئی چھمو۔ کتنے پیسے ہوئے؟"

اور اس خدا کے بندہ نے بلا جھجک فی البدیہہ ایک آزاد مصرعہ کہہ ڈالا۔

"کچھ نہیں صرف ساڑھے دس آنے۔"

شاعر دوست مسکرائے، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ادیب صاحب! یہ تو دینے ہی پڑیں گے۔ اور میں نے چپکے چپکے دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر انگلیوں سے پیسے ٹٹولنا شروع کیا۔ مگر وہ بھی شمار میں ساڑھے آٹھ آنے نکلے۔ سوچا۔ ساڑھے دس آنے عام ریٹ ہے۔ ادیب اور شاعروں کو کچھ تو کنسیشن ہو گا جیسے اسٹوڈینٹ کو بھی سینما میں ایک روپیہ پانچ آنے کا ٹکٹ صرف پندرہ آنے میں ہی مل جاتا ہے۔ چنانچہ بسم اللہ کر کے ساڑھے آٹھ آنے کاؤنٹر پر بجا دیئے —— مگر ادیب گر مینیجر نے دو کھوٹے پیسے میری طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں باقی ڈھائی آنے آجائیں گے —— اور ہم دونوں دم دبا کر اس طرح بھاگے جیسے اس کی کوئی چیز اٹھا کر بھاگ رہے ہوں۔

غرض شاعر دوست سے بھی شیروانی بنانے کا کوئی سستا سا نسخہ نہ مل سکا۔ چنانچہ اپنے بیت الحزن پہنچ کر پنسل اور کاغذ سنبھالے حساب میں کمزور ہونے کے باوجود حساب لگاتا رہا۔ پندرہ کرایہ مکان۔ ساٹھ میں خورد و نوش کا سامان۔ بارہ قصائی کے۔ دس کپڑے دھلائی کے۔ پندرہ متفرقات پر اور باقی ورثات پر —— اف! خدایا یہ تو ساری تنخواہ ہی تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ پنسل کاغذ پھینکتے ہوئے ایک تھکی تھکی جمائی لی اور گھگیاتے ہوئے بولا ——

"منے کی اماں! —— کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ کیسی صورت۔

میں نے کہا۔ "یہی کوئی اچھی صورت جس سے کم از کم دل بہلا سکیں" اور وہ کچھ بدگماں ہونے کے قریب ہی تھیں کہ میں قصداً مسکرایا۔ "تم بھی کورا چہار شنبہ ہو بیگم —— اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ صورت سے مراد یہاں "ترکیب" ہے۔"

"شاعر صاحب —— فرماتے ہیں کہ اس سال بھی کالی شیروانی بننے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"ہٹو بھی۔ میں کیا جانوں کہ اب خیر سے باتیں بھی شاعری میں ہوا کریں۔ میں تو اچھی صورت کا نام سنتے ہی سہم گئی تھی ——

"اللہ جانے کیا بات ہے جو آج یوں . . . . کیونکہ ان مردوں کو پھسلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔"

میں نے کہا "ارے! کیا تمہارے نزدیک اب بھی کوئی بات نہیں۔"

"خیر جی۔ بات ہو یا نہ ہو۔ شیروانی اس دفعہ ضرور بنے گی۔"

"میرا کچھ نہیں۔ میں تو گھر میں بیٹھی ہوں دو گھڑی ننگے سر بھی پھر لوں گی

تم چیر یہ چار آنے پوشوں میں آتے جاتے ہو۔ تمھاری عزت اپنی عزت ہے۔"

اور میں اُن کی اس ہونہار گفتگو پر من ہی من میں خوش ہوتا ہوا سوچتا رہا۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت دے ہماری پھوپی اماں کو کہ ایسی لائق بیوی کا ہاتھ میں ہاتھ تھما گئیں ورنہ اگر کسی چلتی پھرتی کو پلے باندھ جاتیں تو بس اپنا ڈبہ ہی گول تھا۔ آخر میں بھی کچھ ہونہار سا بنتے ہوئے بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے منّے کی اماں! مگر سوال تو یہ ہے کہ شیروانی بنے کیسے؟"

"یہ کونسا بھاری سوال ہے۔ اس مہینہ قرض خواہوں کا روک لینا۔ لیجئے شیروانی تیار۔"

اور واقعی یہ ترکیب میری سمجھ میں بھی آگئی۔ سوچنے لگا۔ کون کہتا ہے کہ عورت ناقص العقل ہے۔ مجھے تو یہ مرد ہی کچھ ایسے ویسے نظر آتے ہیں۔ غور کیجئے جس مسئلہ کو متواتر میں سال سے نہ حل کر سکا۔ اسے منّے کی اماں نے چٹکیوں میں حل کر ڈالا ــــــ چنانچہ شیروانی بنانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور مجھے سچ مچ یوں آمادہ بہ شیروانی دیکھ کر اس نے پھر اپنی فرمائشی بیتیرا بدلا ــــ

"شیروانی تو بنا ہی رہے گے ــــ اسی کے ساتھ میری چادر منّے کا جوتہ۔ اور کچھو کا مفلر بھی آئے گا، منّے کے ابّا، یہ سب چیزیں بھی تو ضروری ہیں نا۔"

اور میں جھنجلا کر بولا۔ "جی ہاں! مرنا بھی ضروری ہے۔ اور اس کا ایک وقت معیّن ہے مگر تمھاری فرمائش کا کوئی وقت نہیں۔"

وہ خاموش ہو گئیں اور میں بڑبڑاتا ہوا سیدھا بازار پہونچا۔ اور تنخواہ ملنے سے پہلے دو دن تک تمام مارکیٹ میں کالی سرج دیکھتا پھرتا رہا۔ ایک دوکاندار اتفاق سے جاننے والا تھا دور سے دیکھتے ہی چلایا۔

"آئیے آئیے کس چیز کی تلاش ہے آپ کو؟"

میں مسکرایا بھئی تلاش ہی کیا سردی سے بچنے کا کوئی سہارا ڈھونڈتا پھر رہا ہوں ــــ

دوکاندار کچھ اتنا سمجھدار واقع ہوا تھا کہ اس نے پہلے مجھے کیپسٹن کی سگرٹ سے نوازا۔ پھر اپنے ملازم کو یاں کا آرڈر دیتے ہوئے سرج کے متعدد تھان اٹھا لایا۔ میں دیر تک بیٹھا ہوا اُن تمام تھانوں پر اپنے محبت بھرے ہاتھ اس طرح پھیرتا رہا۔ جیسے سونی بلی کے روئیں دار کتے پر پھیرا کرتا تھا۔ اور پھر اعتراض برائے اعتراض کے طور پر بولا ــــ وہ سرج کچھ نیلی ہے۔ اس کا رنگ گھٹا گھٹا ہے۔ اور اس کا کپڑا نہایت کھدرا ــــ

دوکاندار مسکرایا۔ آپ کے ہاتھ والی سرج بازار میں نایاب ہے۔ بابو جی پچھلے سال یہ بیالیس روپے گز بکی ہے لیکن اس سال کپڑے کا ریٹ گرنے سے میں آپ کو صرف تیس روپے گز دے سکتا ہوں۔ وقت کی بات ہے خرید کے بھی دام نہیں۔ اور میں تیس کا نام سنتے ہی ایسے کانپ اٹھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار کرڑ وی دوا کے نام سے لرز رہا ہو۔ پھر بہ مشکل حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا ــــ بھئی! ہم تو تمھارے پرانے گاہک ہیں یاد ہوگا اب سے آٹھ سال پہلے تم سے ایک سرج لی تھی۔ کچھ تو رعایت ہونی چاہئے۔"

ایک دو آنہ کم کر دیجئے بابو جی!

دوکاندار کچھ حساب سا لگاتے ہوئے بولا۔

ارے بھئی! ایک دو آنے میں کیا ہوتا ہے۔

تو پھر دس بیس روپے کم کر ڈالئے۔ دوکاندار مسکرایا۔ اور میں کچھ خفیف سا ہوتے ہوئے بولا

"اچھا بھئی! ابھی لے لیں گے مگر ابھی نہیں۔ تنخواہ ملنے پر۔"

اور وہ تنخواہ ملنے والا جملہ سن کر اس طرح اچھل پڑا جیسے سچ مچ کسی بچھونے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے جلدی جلدی تھان لپیٹے اور ملازم سے مخاطب ہوا۔

لو میاں! رکھ آؤ۔ بابو جی پھر لیں گے۔ ابھی صرف ٹرائی کرنے آئے تھے۔

میں مسکراتا ہوا کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور وہ میرے ہونٹوں میں دبی ہوئی اپنی کیپسٹن کی سگریٹ حسرت سے دیکھتا رہا۔

پھر تنخواہ ملنے پر منّے کی اماں کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق قرض خواہوں کے تمام حصّے بخرے سرج خریدنے میں صرف کر ڈالے مگر شیروانی سلوانے کے سوال پر پھر دہی مرگی والے دوروں کا اثر شروع ہو گیا کیونکہ جس درزی کے پاس بھی پہونچا کسی نے پندرہ بیس سے کم پر ہاتھ ہی نہ رکھا۔ آخر کافی غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ منّے کی اماں سینے میں کافی ایکسپرٹ ہیں۔ سوزن کاری کے مقابلوں میں وہ متعدد انعامات پا چکی ہیں اگر انہیں شیروانی کٹوا کر دے دی جائے تو وہ درزیوں سے بھی بہتر سی سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی سوچتے ہوئے ایک ملنے والے درزی کے پاس پہونچا اور کپڑا اس کے سامنے پھینکتے ہوئے بولا۔

لو بھئی! ماسٹر۔ میں بھی آ گیا۔ مگر شیروانی سلوانے کے لیے نہیں صرف کٹوانے کے لئے ــ

ماسٹر میرے اس حیرت انگیز انکشاف پر ایک دم بوکھلا گیا اور کچھ نیم خفگی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"میں درزی ہوں جمیل بھیّا قصائی نہیں۔"

بات بڑی سچی تھی اور کڑوی بھی مگر میں وہ کڑوے کڑوے گھونٹ بھی حلق میں اُونڈیلتا ہوا ماسٹر کی خوشامد میں کرتا رہا اور آخر وہ میری خوشامدوں سے موم بتی کی طرح پگھلتا ہوا بولا۔

جمیل بھیا! کبھی کبھی تم ایک آدھ اچھی کہانی سنا دیتے ہو۔ اس لئے تمہاری خاطر صرف تمھیں کاٹے دیتا ہوں۔ پانچ تُوں گا کسی دوسرے سے نہ کہنا۔

اور میں قہر درویش بجانِ درویش پانچ ہی دینے پر تیار ہوگیا۔ دوسرے دن کٹّی پھوٹی شیروانی مُنّے کی امّاں کو دیتے ہوئے بولا۔ پورے پانچ لئے ہیں ظالم نے۔

اُوئی اللہ! پانچ ——— ایک دم ہاتھی کا پاؤں ———

ہاں۔ ہاں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اپنا ملنے والا تھا جو پوری کی پوری شیروانی کے پانچ لے لیا۔ ورنہ دلّی میں تو صرف گلا کاٹنے ہی کے دس لے لیتے ہیں۔

اور وہ ایک دم مسکرائیں جیسے کچھ مجھکو داد دینا چاہتی ہوں۔ اور پھر انھوں نے بیچ کا جیب شیروانی سی کر تیار کر دی تو مجھے اُن پر ڈھیروں پیار آگیا۔ اور تہنیت کے طور پر ایک چھوٹا سا قصیدہ۔ زبان پر آ ہی گیا۔

مُنّے کی امّاں! یہ تمھاری عنایت ہے تم پر شیروانی پڑ گئی۔

بھئی واللہ ایسا بُرا زمانہ جا رہا ہے کہ بڑے بڑے لاٹ صاحب قسم کے اُجلے پوش بو ہرا دھر سے بٹور بٹار کر کچھ اونے پونے اگر شیروانی کا کپڑا خرید بھی لیتے ہیں تو پھر سلوانے کی ہمت تک نہیں پڑتی اور وہ مہینوں بکس میں اس طرح سنگوایا ہوا رکھا رہتا ہے جیسے وراثت میں ملا ہوا کوئی تبرک ہو جسے گاہے گاہے وہ چومتے اور پیشانی سے لگاتے ہیں اور پھر اسی بکس میں بحفاظت تمام رکھ چھوڑتے ہیں۔

اور مُنّے کی امّاں اپنا یہ توصیفی سکالرشپ کر اس طرح مسکرائیں جیسے کوئی ادیب اپنا شاہکار دادِ پا کر مسکرا رہا ہو۔

ابھی یہ بات چل ہی رہی تھی کہ دروازہ پر کوئی جانی پہچانی سی دستک پڑی۔ اور میں نے مُنّے سے کہا۔

ذرا دیکھنا بیٹا کون ہے ——— اور وہ دروازے اپنے مخصوص انداز میں چلّاتا ہوا آیا ———

ابّا۔ ابّا۔ قسائی (قصائی) آگیا۔

میں نے کہا۔ چُپ بے۔ اور کہہ دے گھر پر نہیں ہیں۔

اور پھر اسی طرح بہت سے قرض خواہ صبح سے شام تک زنجیر پہ زنجیر بجاتے رہے چکّر پر چکّر لگاتے رہے۔ اور میرا دماغ بھی جیسے چکرا کر رہ گیا۔ پہروں سوچتا رہا ——— "شیروانی تو بن گئی بابو جی! مگر ان قرض خواہوں کا کیا ہوگا" اور یہ سوچتے ہی مجھے مُنّے کی امّاں پر غصّہ آگیا۔ اور یہ محسوس ہوا جیسے انھوں نے کوئی خوبصورت سازشی جال بچھا کر مجھے اس میں پھانس دیا ہو۔ جی چاہا کہ اُن کی سِوائی ہوئی شیروانی انھیں کے منہ پر دے ماروں لیکن پھر خیال آیا کہ انھوں نے صرف مشورہ ہی تو دیا تھا۔ وہ ایسا ہی مشورہ دے سکتی ہیں لیکن میں نے اپنی ناسمجھی سے اس پر عمل کیا۔ اصل مجرم میں ہوں وہ نہیں۔

پھر ——— پھر ——— اور مجھے اپنے اُوپر بھی غصّہ آرہا تھا۔ دوسرے دن بازار جاتے ہوئے ایک قرض خواہ نے کہا ——— "بابو جی! چار پیسے" ——— اور میں اتنا سنتے ہی زمین پر اس طرح گڑ کر رہ گیا۔ جیسے سچ مچ کسی نے کالی شیروانی کا پلّہ پکڑ کر تھام لیا ہو۔

اُف! یہ کالی شیروانی ——— قرض کی کالی ناگن ———

جوانی کا آخری دن

محمود فاروقی

جوانی کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم؟ اس کا کچھ تعین کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن احساسات اور جذبات کی کروٹیں جوانی کے آغاز اور اس کے انجام کو موہوم نقطوں کی طرح ضرور نشان زد کرتی ہیں۔

چنانچہ اس نے بھی گرمیوں کی اس سنسان دوپہر میں پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی جوانی ختم ہو رہی ہے۔

اس وقت وہ شہر سے دور ایک چھوٹے سے مضافاتی ہسپتال میں علاج کی خاطر آیا ہوا تھا۔ آج اس کے داخلے کا پہلا دن تھا۔ ابھی تک ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اس کی گھناؤنی بیماریوں کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ ایسی بیماریاں جو نہ صرف اس کے جسم بلکہ اس کی تمام جوان تمناؤں اور آرزوؤں کو بھی شکار کر چکی تھیں۔

ہسپتال کے باہر دور دور تک پھیلے ہوئے میدان اور خزاں رسیدہ پیڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس سارے ویران منظر میں دور بہتی ہوئی ایک چھوٹی سی ندی اور چند آم کے درخت فرحت اور تازگی کا واحد سبب تھے ——— وہ ہسپتال کے ایک برآمدے میں کھڑا ہوا اس سنسان منظر کو دیکھ رہا تھا اس کی نظریں گوندنی کے ایک خزاں رسیدہ بوڑھے پیڑ کے سایہ پر لگی ہوئی تھیں جو جلتی دوپہر میں جھکتے ہوئے سورج کے ساتھ مشرقی جانب آہستہ آہستہ کھسک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس سرکتے ہوئے سایہ کے ساتھ اس کی جوانی کی بچی کھچی پونجی اور اس کے جسم کی رہی سہی توانائی دل میں ٹھہرے ہوئے ولولے ذہن میں رکے ہوئے حسین خواب اور مستقبل کی تلملاتی ہوئی تمام آرزوئیں اس کو تنہا چھوڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف بھاگی چلی جا رہی ہیں۔ اس سنسان دوپہر میں اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی جوانی کا آخری دن اور وہ لمحہ اس کے شباب کا آخری لمحہ ہے جسے گوندنی کا منحوس سایہ اپنے تاریک آغوش میں دبائے بھاگا جا رہا ہے۔

اس انوکھے اور تکلیف دہ احساس کے ساتھ اس کا دل بری طرح بھر آیا اس کی آنکھیں حسرت و یاس سے ڈبڈبا گئیں۔ اس تکلیف دہ خیال سے بچنے کے لئے اس نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ آم کا ایک درخت ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید بور سے لدا کھڑا تھا اسے آم کی کنواری کونپلوں کو دیکھتے ہوئے ذرا سے تسکین سی ہوئی ——— اسے وہ دن یاد آیا جبکہ وہ اس آم کے نوجوان پیڑ کی طرح جوان ہونے لگا تھا وہ بارش کی ایک خوشگوار صبح تھی جب کہ اسے اپنے نوجوان ہونے کا پہلا احساس ہوا تھا ——— اس دن صبح وہ بہت جلد اٹھ گیا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس دل فریب منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ کھلے دریچہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ ایک بے آستین کی نیلی بنیان اور سفید نیکر پہنے ہوئے تھا۔ اس نے دریچہ کے کٹہرے پر دونوں ہاتھ ٹیک دیئے تو اس کے مضبوط اور طاقتور بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں اور اس نے ایک عجیب و غریب طاقت کو جسم میں مچلتے ہوئے محسوس کیا۔ اور ایک احساس برتری کے ساتھ اپنی نظریں سامنے پھیلے ہوئے میدان پر ڈالیں ——— لیکن بڑے تناور درخت بہتا ہوا نہر کا تیز دھارا … بادلوں میں گھرے ہوئے سیاہ پہاڑ سب کے سب اسے حقیر نظر آئے۔ اس کے دل میں نت نئے ہنگامے اور ولولے مچلنے لگے اس کی طبیعت چاہ رہی تھی کہ وہ کائنات کی ان ساری بڑی بڑی چیزوں کو اپنی مٹھیوں میں پکڑ کر بھینچ دے ——— یقیناً وہ اس کی جوانی کا پہلا خوشگوار دن تھا۔

اسے یاد آیا کہ وہ تھوڑی دیر بعد ہی نیچے اتر آیا تھا تاکہ ہوسٹل کی نچلی منزل سے اپنے دوست ارشاد کو ساتھ لے کر تالاب میں نہانے کے لئے جائے۔ جب وہ نیچے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ خود ارشاد تیرنے کا لباس پہنے اس کی طرف آ رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اور ارشاد تالاب کی طرف دوڑ رہے تھے بارش کی ہلکی ہلکی پھوار ان کے جوانی سے تمتمائے ہوئے دلکش چہروں پر نثار ہو رہی تھی۔ وہ ایک استوار رفتار کے ساتھ چھوٹی سی پگڈنڈی پر دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کے سانس سے بھرے ہوئے سینوں میں ان گنت تمنائیں رقص کر رہی تھیں۔

ہسپتال کے برآمدے میں کھڑے ہوئے وہ آغاز جوانی کی اس پرلطف یاد میں اس قدر کھو گیا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ گو زندگی کا سفر کٹتا ہوا سا یہ اس کی جوانی کو اپنے دامن میں لپیٹے بھاگا جا رہا ہے۔ اتنے عرصہ کے بعد بھی اسے اس دن کی ایک ایک تفصیل اچھی طرح یاد تھی ——————

غالباً اسی دن شام کو وہ اور ارشاد ہاسٹل کے ایک دریچہ میں کھڑے ہوئے نہایت بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔

ارشاد اس سے کہہ رہا تھا میں یہ چاکلیٹ نہیں کھاؤں گا۔

کیوں؟ اس نے سوال کیا۔

اس لئے کہ یہ چرائے ہوئے ہیں تم انہیں عالیہ کے کمرے سے چرا کر لائے ہو ——— اور وہ صرف اس لئے اس نے ارشاد سے کہا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ اور عالیہ وہ تو تم کو بہت زیادہ پسند کرتی ہے وہ تو خوش ہو گی کہ تم نے اس کے چاکلیٹ کھائے۔

لیکن میں تو اسکی چال ڈھال کو پسند نہیں کرتا۔ ارشاد نے بیزاری سے جواب دیا۔ اور اس لئے میں یہ چاکلیٹ کبھی بھی نہیں کھاؤں گا۔

اسے یاد آیا کہ عالیہ اسی وقت اپنی ہنسی سناتے ہوئے ان کے قریب آ گئی۔ اور اس نے حسب معمول ارشاد کو چڑانے کیلئے کہا "کھاؤ ... خوش رہو"

زندگی ارشاد نے دریچہ کے باہر دیکھتے ہوئے عالیہ کو جواب دیا صرف کھانے پینے اور خوش رہنے ... کامیاب ... سکتی بلکہ حقیقی کامیابی تو کھونے پانے اور ... میں ... ہے۔

تمہارا مطلب ہے ... تو ... ہوئے کہا کہ ہم اپنی تمام نعمتوں کو دوسروں ... تقسیم کر دیں۔

ہاں خدا کی نعمتوں کا ... اور ... کے ساتھ تقسیم کر دینے ہی میں ہے۔

یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں ... حصہ لیتے ہوئے عالیہ کو ... ——————

یہ سب دراصل مکار اور ... جو لوگ زندگی کی ... دوسروں ... لفظوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تمہاری ... ارشاد نے ... ایک ... لفظوں کی حقیقت کو سمجھنے لگو گے۔ ہاں کمزور اور ... اپنی ... کو ان لفظوں میں چھپاتے ہیں۔ اور تمہارے جیسے بہادر و دلیر اپنی کامیابی کو عالیہ سے کہہ دوں کہاں چھپایا کرتے ہیں یہ کہکر ارشاد نے اس کی ابھری ہوئی جیب کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جس میں وہ عالیہ کے چاکلیٹ کا ڈبہ چھپائے ہوئے تھا۔

ارشاد کی نظروں کے ساتھ عالیہ کی نظر بھی اس کی جیب پر پڑی اور عالیہ نے تیزی کے ساتھ اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

... لیکن عالیہ ڈبے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے چلائی اور پھر ... ارشاد کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم سچ کہتے ہو واقعی نعمتیں اگر تقسیم نہ کی جائیں تو چرالی جاتی ہیں۔

دونوں ہی برے ہیں عالیہ

کون دونوں؟ عالیہ نے ارشاد کا جملہ پورا ہونے نہیں دیا۔

تقسیم نہ کرنے والے اور ان کو چرانے والے!

پھر اچھا کون ہے ارشاد! عالیہ نے بڑے بھولے پن سے پوچھا

جو ان دونوں سے مختلف ہو! ارشاد یہ کہکر دریچہ کے باہر اس طرح دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس تیسری شخصیت کی تلاش کر رہا ہو اسکی پشت ان دونوں کی جانب تھی۔ اور ان دونوں نے جیسے ایک ساتھ محسوس کیا کہ ارشاد ان دونوں سے مختلف ہے۔ مختلف لیکن کس قدر باوقار اور چھا جانے والی شخصیت کا مالک۔

کاش، وہ ارشاد کی راہ پر چل سکتا۔ اس کے منہ سے سرد آہ نکلی اور ... کے ساتھ برآمدے میں پڑے ہوئے ایک کوچ پر لیٹ گیا لیکن ... کا ذہن اسی طرح پچھلی یادوں کے کھوج میں دوڑ رہا تھا ——————

اس نے ہاسٹل کو خیرباد کہتے ہوئے ارشاد سے کہا تھا دیکھو ارشاد تم ڈاکٹر بننا چاہتے ہو اور میں بیرسٹر۔ اگر تمہارے یہ باغیانہ خیالات نہ بدلے تو پھر تم کسی عدالت میں ملو گے۔ جبکہ ... پر ملک سے غداری اور بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا جا رہا ہو گا۔ اس وقت تم کو میری قانونی ... کی مدد ہو گی۔

تمہاری ... خدا سے ... عدالت اگر مجھے باغی قرار دیں تو کیا عجب ہے ... اور میرا ... ہماری آئندہ ملاقات شاید کسی ہسپتال میں ہو ... جہاں ... اور جسمانی علاج کے لئے مجھے ہی اصلاح تجویز صرف کرنی پڑے گی۔

اور وہ اس وقت ایک ہسپتال میں پڑا ہوا تھا اور بیماریاں آکر

کی جوانی کو گھن کی طرح کھا گئی تھیں۔ اس کی نظر برآمدہ کے باہر پڑی۔ گوندنی کا ایک پھیلتے ہوئے منڈیر تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہ دوسری طرف آم کے پیڑ پر کوئل کوک رہی تھی۔ آہ کتنا فرق ہے۔ ان دونوں درختوں میں بالکل اتنا ہی جتنا اسکے اور ارشاد کے راستہ میں تھا۔

ارشاد ڈاکٹر بنکر معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ بن سکا بجز ایک شاعر کے اس نے اپنی جوانی کے ۲۰ سال بس یوہی ضائع کر دیئے۔ ان گذرے ہوئے بیس سالوں کی ایک ایک تفصیل آج جبکہ گوندنی کا منحوس سایہ اس کی جوانی کو اپنے لپیٹ میں لئے ہوئے کھا رہا تھا اسکے دل میں زہریلے ڈنک کی طرح کھٹک رہی تھی اسے متعدد آوارہ دوستوں کے مسخ چہرے اور گھناؤنی عورتوں کے آلودہ جسم گندے قحبہ خانے پر شور شراب خانے ایک ایک کرکے یاد آگئے۔ اسکو اپنی وہ گیتیں اور نظمیں بھی یاد آئیں جنکو لوگ ادب کے ارتقائی نمونے کہا کرتے تھے۔ اور وہ بھی اپنی ان تخلیقات پر بڑا ناز کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے اپنی ان تخلیقات پر بڑی ندامت سی محسوس ہو رہی تھی جسنے لکھا ہی کیا تھا بس بھوک کے قصے اپیٹ کی بھوک جنسی بھوک —— بھوک کے اس خیال پر اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت دیر سے بھوکا ہے۔ اور بھوک بڑی تیزی سے اس کے حواس پر چھائی جا رہی تھی۔ بھوک، بھوک وہ بڑبڑانے لگا۔ کمبخت بھوک آخر کبھی ختم بھی ہوگی لیکن اسے فوراً ہی یہ محسوس ہوا اس کو، یہ بھوک اس کی معدہ اور نفس کی بھوک سے بالکل ہی مختلف ہے۔ انوکھی ہے جسے وہ اپنی گذشتہ زندگی میں ڈھونڈھتا رہا ہے۔ نہ تو اسے اس وقت اپنا معدہ بھرنے کی ضرورت معلوم ہو رہی تھی اور نہ ہی اس کا نفس بھوکا تھا۔ ان دونوں کی بھوک تو جیسے ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ اسے بالکل ہی نئی اور انوکھی قسم کی بھوک لگ رہی تھی۔ نفس اور معدے کے بجائے اس کے جسم میں کوئی نہ معلوم شے غذا کا مطالبہ کر رہی تھی یہ کیسی بھوک ہے؟ وہ ہسپتال کی کوچ پر لیٹا ہوا بڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اسے یاد آیا کہ بھوک کے موضوع پر ارشاد سے اس کی ایک دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔

ارشاد سے اسکی یہ ملاقات کسی سفر میں ہوئی تھی۔ بہت دنوں کی جدائی کے بعد وہ دونوں ایک اسٹیشن کے کیفے پر مل گئے تھے۔ ارشاد کسی بلیک زدہ مقام پر ریلیف کے لئے جا رہا تھا۔ اور وہ ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے۔ اسی وقت اس نے ارشاد کو مشاعرہ میں پڑھا جانے والا اپنا ایک گیت سنایا تھا۔ اس گیت کا عنوان تھا میں بھوکا ہوں اور اس میں اس نے کچھ اس قسم کے خیالات پیش کئے تھے۔

میں بھوکا ہوں ...... میرا جسم بھوکا ہے۔
پھر یہ لوگ آخر اپنی خوابگاہوں پر موٹے موٹے پردے کیوں
ڈال دیتے ہیں۔
اور اپنے باورچی خانوں کو کس لئے مقفل کر دیتے ہیں۔
مجھے اپنے جسم کی بھوک مٹانا ہوگی۔
چاہے خدا کتنا ہی خفا کیوں نہ ہو۔
مگر خدا کو اس سے کیا۔
وہ تو سو رہا ہے —— ایک میٹھی نیند۔
اسے کیا خبر دنیا بھر کے بھوکے جسموں اور دلوں کی۔
آؤ بھوک کے مارو آؤ۔
آؤ ہم باورچی خانوں کے دروازے توڑیں۔
اور خوابگاہوں کے پردوں کو پھاڑیں۔
وہاں ہم کو روٹی ملیگی اور منتظر مچلتے ہوئے جسم بھی۔
جنہیں آنچ لو دیتی ہے جنہیں آرزوئیں تمتما دیتی ہیں۔

ارشاد اس نظم کو سنکر بڑی دیر تک خاموش رہا جیسے اسکو خدا کے سو جانے کا سخت افسوس ہوا ہو۔ کچھ دیر بعد ارشاد نے اسکی طرف سموسوں سے بھری ہوئی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور خوابگاہوں اور باورچی خانوں کے دروازے توڑتے ہوئے اپنے دل کے بند دریچوں کو بھول نہ جانا۔ کبھی تمہارے دل کے دروازے کھلیں تو تم کو معلوم ہو کہ تمہاری روح تمہارے جسم سے کہیں زیادہ بھوکی ہے۔

لیکن وہ ان گزرے ہوئے ۲۰ سالوں میں صرف باورچی خانوں اور خوابگاہوں میں ہی نقب لگاتا رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنے دل کے بند دروازوں کو کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر آج جبکہ اس نے غذاؤں کو نہیں بلکہ غذاؤں نے اسے ہضم کر لیا تھا۔ اور گوندنی کا تاریک سایہ اسکی بچی کچی جوانی کو ہضم کرنے کے لئے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اسے محسوس ہوا کہ اسکے دل کے دروازے چوپٹ کھل چکے ہیں۔ اور ایک نئی طرح کی عجیب و غریب بھوک لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔

نئی بھوک شدید ہوتی چلی گئی اور وہ اسکے تمام اعصاب پر بری طرح چھا گئی۔ واقعی ارشاد نے سچ کہا تھا کہ اسکی روح اس کے جسم سے زیادہ بھوکی ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۳)

کٹی ہوئی جیب

فضل من اللہ

رات بڑی ہی خوشگوار تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹ بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان میں ستارے یوں لگتے تھے جیسے کسی معصوم بچی کی نیلی چنریا میں موتی ٹکے ہوئے ہوں۔ فضا میں خنکی تھی۔ دلنواز خنکی ——— اور خوشبو بھی! مدھم مدھم، میٹھی میٹھی خوشبو۔ اور میں چہل قدمی کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ میں سیر سے پوری طرح لطف اندوز ہوا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دن تو در اصل یہی ہوتے ہیں باقی ہمارا سارا سال کچھ اس کی یاد اور کچھ انتظار میں کٹ جاتا ہے۔

فیروز پور روڈ سے اچھرہ جانے کے لئے اچھرہ روڈ پر مڑیں تو سیدھے ہاتھ ایک کوٹھی کی لمبی دیوار دور تک چلی جاتی ہے۔ یہ کوٹھی لالہ سوایا رام نے بنوائی تھی اس دیوار کے قریب سے ہوتا ہوا بیری کا ایک پیڑ بھی ہے جو سڑک پر جھک گیا ہے جب میں اس پیڑ کے قریب پہنچا تو پھولوں سے لدے ہوئے پیڑ نے خوشبو کو میرے قدم لینے بھیجی اور میں نے ایک روحانی سرور محسوس کیا ——— ایک ناقابل بیان روحانی سرور!

اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہے اور آواز رسا پیدا ہوئی ہے اُف! کتنی دلدوز چیخ تھی وہ! میں نے چاروں طرف دیکھا میرے کانوں کو ہر طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کی مگر میں کچھ سن سکا نہ دیکھ سکا میں نے اس کو وہم سمجھ کر ذہن سے نکال دیا اور ابھی ایک قدم چلا ہی تھا کہ وہی سسکی ایک بار پھر میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کراہ میرے پاؤں کے قریب کہیں سے سنائی دی ہے میں نے جوتوں پر نظر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا سوائے ایک چیتھڑے کے۔ یہ چیتھڑا کچھ جوتے کی نوک پر پڑا تھا اور باقی جوتے کے تلے تھا۔ میں نے جھک کر اُسے اٹھا لیا۔

یہ ایک کٹی ہوئی جیب تھی!

یہ کٹی ہوئی جیب ابھی سسک رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ چاند رات۔ یہ رومانی موسم اور کٹی ہوئی جیب ——— یعنی کوئی نسبت تو ہو، عطری قہقہے ہوں، ساغر کھنکتے ہوں، تذکرۂ حسن عشق ہو اور کوئی صاحب غزل مرصع پڑھتے پڑھتے مقطع عرض کر رہے ہیں ؎

سر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

"کاش! "کٹی ہوئی جیب نے میرے استعجاب کو اور بڑھنے نہ دیا اور بھرآئی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ "کاش میرا کوئی مزار ہوتا"! اس مزار کے بالیں سنگِ مرمر کا ایک کتبہ ایستادہ ہوتا جس پر کوئی درد بھرا شعر کندہ کر کے کبھو ناز سے گزرنے والے سے دو ہاتھ اٹھا کر . . . فاتحہ پڑھتے جاتا اور یوں میرا اجنبی ستم رسیدہ ہمدردی اور دعا کے چند کلمات سے نوازی جاتی مگر افسوس . "

اجنبی! ستم رسیدہ!

اور اچانک میرے ذہن میں وہ الفاظ بھی آ گئے جو اس کتبہ میں ہو سکتے تھے

اجنبی!

اپنے قدموں کو روکو ذرا!

سنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستان!

"اجنبی" کٹی ہوئی جیب نے کہا "میری کہانی سنو گے؟"

"کٹی ہوئی جیب کی کہانی" میں نے خود سے کہا اور پھر خود پر ہنس کر کہنے لگا "بڑی ستم ظریف ہے یہ قدرت ——— میر تقی میر کے راستے میں کاسۂ سر رکھ دیا اور عزیز احمد کی ملاقات ——— جبکہ چاندنی اسی طرح چھٹکی ہوئی تھی اور جیب بہر حال دماد یے پر تلی ہوئی تھی ——— در یتیم تاج سے گرا دی ——— اور میرے راستے میں ایک کٹی ہوئی جیب کہانی سنانے کے لئے بھیج دی"۔

اور پھر میں کہانی سننے اور کہانی لکھنے کے متعلق سوچنے لگا۔ کہانی لکھنا میرے لئے چنداں مشکل نہیں۔ مگر اس وقت ہر کہانی لکھنے والے کے لئے مشکل پیش آتی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی عظیم مصنف ہو جب ایک اشکوں بھری داستان اُسے سنائی جائے اور وہ اس سے متاثر بھی اسی شدت سے ہو جس شدت سے کہ سنانے والا خود متاثر ہو ایسے عالم میں جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور پھر افکار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا۔ اِدھر اساتذہ فن اس بات پر رہ

رہتے ہیں کہ دیکھنا اگر واقعہ ہی کو افسانہ بنانا چاہو تو بخوشی ایسا کرنا مگر اُس میں افسانویت ضرور پیدا کر دینا یعنی جیب تک پہنچ کے چہرۂ سادہ پر بناوٹ کا غازہ رنگین نہ ملو گے کشش پیدا نہیں ہوگی ـــــ مجھے ایک کہانی سننا بھی تھی اور اسی لکھنا بھی اور میں اِسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کٹی ہوئی جیب نے پھر مجسم التجا بنکر کہا ـــ

" تو میری کہانی نہیں سنو گے، کیا حرج ہے آخر اسی میں ؟"

" ضرور ضرور" میں نے دماغی کشمکش سے بچنے کے لئے کہا۔

کٹی ہوئی جیب نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

مجھے اپنے مالک سے جدا ہوئے چند گھنٹے ہوئے ہیں وہ گوجرانوالہ کے ایک دور کے گاؤں سے لاہور زمین کی الاٹمنٹ کے قضیہ کے حل کے سلسلہ میں آیا تھا اُس قضیہ سے نمٹ کر وہ اچھرہ میں اپنی بیٹی سے ملنے آیا تھا اُس کا لڑکا اُس کے ہمراہ تھا باپ بیٹا یہاں اچھرا موڑ پر بس سے اترے تو میرے مالک نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ کچھ پھل خرید کر لے چلے تو اُس کے چہرے پر مایوسی اور خوف کی زردی چھا گئی میں وہاں نہیں تھی۔ وہ یہ خبر بمشکل بیٹے کو سنا سکا اور بیٹے کی حالت بھی اُس سے مختلف نہ تھی۔

میں اِس وقت ایک جیب کترے کے قبضہ میں تھی جو قریب ہی کا ایک دکان پر بیڑی سُلگا رہا تھا مگر اِس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی سوائے جیب کترے کے نہ میرے مالک کو نہ اُس سپاہی کو جو قریب ہی کھڑا تھا جیب کترا خوش پوش نوجوان تھا اُس پر بھلا کون شبہ کر سکتا تھا؟

پھر اِس جیب تراش نے اُس وقت ہاتھ صاف کیا تھا جب میرا مالک زمین کی الاٹمنٹ کے قضیہ سے فارغ ہو کر لاٹ صاحب کے دفتر سے باہر نکلا تھا اور آدمیوں کی بھیڑ میں بس میں سوار ہوا تھا اُسے بس میں جگہ حاصل کرنے کی فکر تھی۔ ہر شخص کو ہوتی ہے ـــــ اور اُسے اپنے لڑکے کا خیال بھی تو تھا اگر وہ اِس سے بچھڑ جاتا تو اِس بہت بڑے بے رحم شہر میں اُسے کون سنبھالتا ـــــ چنانچہ اُس نے بیٹے کا ہاتھ بھی پکڑا اور بس کا دروازہ بھی اور میری اُسے فکر نہ رہی اور اُس جیب کترے کا کام بن گیا جو اُس کے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ اور پھر اُس نے مجھے اپنی جیب میں قید کر دیا تھا جو چھوٹی تھی، تنگ تھی اور گرم اور جس میں میرا دم گھٹ گیا تھا۔ میں نے کھلی ہوا میں زندگی بسر کی تھی جس ٹرنک میں مجھے رکھا گیا وہ بھی کھلا تھا اور اُس میں بھی ہوا آتی جاتی تھی۔ میرے مالک نے بوسکی کی گلابی قمیض پہن رکھی تھی جو شہر کی کوشش اور دیہات کی مٹی کے درمیان ایک چیز تھی اور اُس بزرگوں کے دور کی سوتی کپڑے کی جیب لگا دی تھی۔ جب میرا مالک پلٹ کر ہوا کے جھونکے مجھے بڑا ہی لطف پہنچاتے۔ اور یہاں میرا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میں چیخ رہی تھی سسک رہی تھی مگر اس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی نہ جیب کترے کو نہ میرے مالک کو۔

پھر جیب کترا بیڑی سُلگا کر اسی سڑک پر آیا اُس نے جیب ٹٹولی، دس دس کے پانچ نوٹ نکالے اور مجھے یہاں پھینک گیا "

" آہ! مجھے تم سے ۔۔۔۔ "

میں نے دلی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا مگر یہ اظہار قبل از وقت تھا وہ ذرا سانس لینے کے لئے رُکی تھی اُس کی بات کہاں پوری ہوئی تھی۔

" سنو تو" اُس نے کچھ اسی انداز سے کہا جیسے اس نے بزرگوں کا غم اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔

" ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے "

چودھری میرا مالک جب گاڑی سے چلا تو وہ دو سو روپے لیکر چلا، گاؤں میں اُس کی آٹے دال کی دکان تھی مگر زمیندار لوگ جیسی زمین سے جو محبت ہوتی ہے وہ اُسے بھلا بیٹھا تھا۔ وہ بیٹے کو بھی ساتھ لایا تاکہ وہ بھی شہر کی زندگی اور رنگینی دیکھے اور پھر جو حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس کا اُس نے بندوبست کر لیا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اُس نے پان کھایا اور پاسنگ شو کی ایک ڈبیا اور ایک بکس دیا سلائی کا خریدا اور ٹکٹ لے کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں وہ سگریٹ پھونکتا اور مسافروں کی عجیب و غریب باتیں سنتا رہا۔ لڑکا بھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔ لاہور پہنچ کر وہ ایک معمولی سے ہوٹل میں پہنچے۔ لڑکا پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور باپ بیٹے پر اپنی فیاضی کا سکہ جمانا چاہتا تھا چنانچہ جب ہوٹل کے نوکر نے اُس سے پوچھا "کیا لاؤں؟" تو اُس نے ترنگ میں آکر کہا "جو مرضی چاہے لے آؤ ـــــ" اور دو آدمیوں کے لئے چائے مانگی۔ اور جب وہ فارغ ہوئے تو بل مبلغ تین روپے کچھ آنے ادا کیا گیا، باپ تو خیر شہر یاد بن کر آیا تھا مگر بیٹے نے حیران ہو کر سوچا "بھوک کو ہلانے کے تین روپے اور کچھ آنے؟"

ہوٹل سے نکلے تو تھوڑی دور گول چکر میں ایک مجمع نظر آیا شوقِ تجسس اُسے وہاں کشاں کشاں لے گیا۔ ایک تانگہ کی گدیوں پر ایک پیٹی میں بہت سی شیشیاں پڑی تھیں اور اُن کے پاس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اُس کا چہرہ سرخ تھا۔ قندھاری انار کے دانوں کی طرح، ویسے ہی چہرے والا ایک شخص سیٹ پر کھڑا لیکچر دے رہا تھا۔ لیکچر دار تقریر ختم ہو رہی تھی اور اب مقوی طاقت کی اس دوائی کے فائدے اور ترکیب استعمال بتا رہا تھا "صاحبان ۔۔۔۔ " مگر اتنی لمبی تقریر کے باوجود جب مجمع حرکت میں نہ آیا تو اُس نے پینترا بدلا ۔۔۔

" صاحبان! بڑی بڑی مشینیں کام کرتے کرتے گھس جاتی ہیں تو ذرا غور کرو کہ آدمی کا کیا حال ہوتا ہوگا جو بہر حال فولاد کا بنا ہوا نہیں۔ بھائیو ہمارا شربت فولاد ۔۔۔۔۔۔ "

چودھری نے فقط یہی سُنا اور اُس کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔ میکانکی طور پر اُس کا ہاتھ جیب کی طرف گیا۔ اُس نے جیب سے سوا روپیہ نکالا اور ایک بوتل لے لی، اور پھر وہی بھیڑ چال۔

اور جب بھیڑ چھٹی تو ایک نوجوان دوسرے سے کہتا جا رہا تھا۔ "چار سو بیس ہیں جیب کٹے، فائدہ ہو وے نہیں سالے ٹھگ ہیں ٹھگ، چار آنے کا سوا روپیہ بنا لیتے ہیں زبان کے زور پر"

مگر میرے مالک نے یہ ریمارک نہیں سنے اور وہ چل دیا۔

آگے چل کر ایک بازار میں آٹھ آنے کے عوض اُس نے دو انگوٹھیاں خریدیں۔ یہ طلسمی انگوٹھیاں تھیں جو دنیا کی ہر بیماری کے لئے موثر علاج کا حکم رکھنے کے علاوہ ہر طرح کی کامیابی کی کنجی بھی تھیں۔ مقرر نے اس کا ایک ایک مائدہ گنوایا تھا اور کہا تھا کہ ایک بزرگ کی خدمت کرکے اس نے یہ چیز حاصل کی ہے۔ تقریر کو چیدہ گواہوں نے دو آتشہ کر دیا تھا جو رحمانے کہاں سے آ پہنچے تھے اور سبھی مسکرا مسکرا کر کہتے تھے کہ طلسمی انگوٹھی کو جیسا سنا ویسا پایا۔ دو پیسے کی انگوٹھی چونی میں جھوٹی گواہیوں اور چرب زبانی کے بل بک گئی۔

لاہور میں ایسے طلسمات سینکڑوں ہیں۔ میرے مالک کی قسمت اچھی ہوتی تو وہ تانگہ پکڑ فنانشل کمشنر کے دفتر پہنچتا مگر چونکہ اسے جیب کی خاطر اور کچھ بیٹے کی ... کی خاطر پیدل ہی منزل مقصود تک پہنچنے کا اُس نے قصد کیا۔

ایک جگہ اُس نے ایک طلسمی سرمہ خریدا جو آنکھوں کے ہر مرض کے لئے شافی تھا اور جس کا تجربہ بوڑھے حکیم صاحب نے عملاً کرکے دکھایا تھا کہ پانی کا ایک چھوٹا سا گلاس ایک سفوف پڑنے سے سُرخ ہو گیا مگر سُرمے کی ایک سلائی نے اُسے پھر صاف کر دیا۔ میرا مالک اس معجزے سے کس طرح روگردانی کر سکتا تھا۔

چلتے چلتے وہ انارکلی پہنچ گیا اور کتابوں اور رسالوں کے ایک سٹال پر آکر رک گیا۔ اور اُس نے ایک رسالہ اُٹھا لیا اور بیٹے سے پوچھا۔ "یہی تو نہیں؟" لڑکے نے نام پڑھا اور اثبات میں جواب دیا۔ میرا مالک بس حرف شناس تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق حد سے زیادہ ہوتا ہے مگر جنہیں تعلیم کی جگہ حسرت ملتی ہے۔ میرا مالک پہلی جماعت میں تھا کہ اُسے مدرسے سے اُٹھا لیا گیا اور پھر ساری عمر وہ پڑھ نہ سکا۔ البتہ اُس کے شوق نے یہ صورت ضرور اختیار کی کہ کاغذ کا ٹکڑا خواہ غلاظت کے ڈھیر پر بھی ملتا تو بھی اُٹھا لیتا اور عجیب عجیب شکلیں بنا کر پڑھنے والوں جیسا منہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اسی شوق کے ہاتھوں اُسے اس رسالے سے تعارف ہوا تھا۔

نمبردار کا لڑکا اُس کے ہاں ایک دن کچھ ردی اخبار اور رسالے دے گیا۔

عادت کے مطابق جب وہ مختلف رسالوں کو دیکھتے دیکھتے اِس رسالے تک آیا اور پھر رسالے کے آخر صفحے تک پہنچا تو "پچاس ہزار روپے کے نقد انعام" کے الفاظ پڑھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور دھڑکتے دل سے بیٹے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں جب وہ آیا تو اُس نے اُس سے کہا۔

"لیاقت علی ذرا یہ پڑھنا تو۔"

اور پھر لیاقت علی نے پڑھ کر اُسے بتایا کہ یہ رسالہ دہلی سے نکلتا ہے۔ "یہ اشتہار ایک معمہ کا ہے۔" پھر اُس نے معمہ کی تشریح کی اور بتایا کہ "اگر حل صحیح نکل آئے تو پچاس ہزار روپے انعام ملتے ہیں۔ مگر اگر یہ غلط ہو تو سوا روپیہ ڈوب جاتا ہے۔"

"ڈوب جاتا؟"

اُس نے یوں ایسے کہا جیسے کسی نے خسر کا نام لے لیا ہو۔

لیکن ... [illegible] ... پہنچ گئی تھی کہ اس حقیقت کی یاد تک باقی نہ رہی ... [illegible] ... اور پھر وہ خواب دیکھنے لگا۔ ہوائی محل ... [illegible] ... جانے والے خواب!— ... [illegible] ... منگوانے کے لئے اس نے بیٹے سے خط لکھوایا اور پھر وہی ... اور جب ... چکر چلا۔ وہی انتظار، وہی امید، اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، محرومی — ناامیدی اور گالیاں ایک بد ... قسمیں کھا کھا کر توبہ کا اعلان۔

اور آج ... اس رسالے نے ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ میرا مالک ایک بار پھر خود فریبی کا شکار ہو گیا۔ حقیقت پسند بننا کتنا مشکل ہے۔

پھر وہ بازار میں ... اور ... چیزیں خریدنے لگا۔ لیاقت علی کے لئے بوٹ، کوٹ کا کپڑا اور ... کے لئے سلیپر، بچے کے لئے کھلونے، بیوی کے لئے دوپٹہ۔ حتیٰ کہ جب وہ بازار سے نکلا تو اُس کے پاس سوا سو روپیہ کم ہو چکا تھا۔

زمین کا قبضہ دلانے کے لئے اُس نے وکیل کیا اور چند وکیل کی فیس کے علاوہ بھی خرچ کرنے پڑے۔ ... میں سے محنت تھی اور وہ ہر قیمت پر زمین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ گورنمنٹ اُسے یہ زمین خدا واسطے نہیں دے رہی لیکن اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ مشرقی پنجاب میں جو زمین وہ چھوڑ آیا ہے اُسے وہ کھو چکا ہے اور پھر بقول عقلمند دانے کے لہوئیں میں ڈھیلا گرے تو سالم کیسے برآمد ہو، اور اب وہ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مطمئن تھا کہ اُس کا کام ہو جائے گا۔ جب وہ گاؤں سے چلا تھا تو بھی یہی اطمینان لے کر چلا تھا وہ کہتا تھا کہ روپیہ سب کا بہنوئی ہوتا ہے اور سارے کام خود کرا لیتا ہے۔

اور پھر جب وہ اس قضیے سے فارغ ہو کر اچھرہ آنے کے لئے بس میں سوار ہوا

میں اس سے جدا کر دی گئی ——— باقی تم کو معلوم ہی ہے۔

"لیکن" میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ میں پہلے جلد بازی کر کے پچھتا چکا تھا جب میں دوبارہ جلد بازی کر کے اس سے ہمدردی جتاتا تو شاید وہ پھر برہم ہو جاتی لہذا میں نے اس سے ذرا مانوس ہونا زیادہ مناسب سمجھا ——— اور اس لیکن کے بعد کہا۔

"لیکن تم تو بے جان کپڑے کی ایک بے جان جیب ہو تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں؟"

"یہ نہ کہو، جتنی جان مجھ میں ہے آدمی میں کہاں؟ میں آدمی کے دکھ درد کی شریک ہوں، سردی کی شدت میں اس کے ہاتھ گرم کرتی ہوں۔ اور جب وہ مجھے نقدی سے پُر کرتا ہے تو اس کی خوشی میں اور جب مجھے خالی کر دیتا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے تو اس کے غم میں شریک ہوتی ہوں، مجھے بے جان نہ کہو"

اب میں نے ڈرتے ڈرتے، جھجکتے جھجکتے ہمدردی کا اظہار کیا۔

وہ بھڑک اٹھی ———

"ہمدردی؟" اس نے چیخ کر کہا، اس چیخ کی کربناکی میں صدیوں کا غم جب معلوم ہوتا تھا۔ "آدمی بھی عجیب ہے، تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور تم جیب کترے کو کوسو گے، سوگ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ احمق کہیں کے۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے اسے ٹوکنا چاہا، مگر وہ بھڑک اٹھی [illegible] جیب کتر [illegible] مجھے تو عافیت اسی میں ہے کہ آرام سے مرجایئے چنانچہ میں بھی [illegible] آنکھیں

جھکائے سہا ہوا اس کی چیخیں سنتے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی ——— ۔

"آدمی آدمی کو لوٹتا ہے۔ آدمی آدمی کی جیب سوروپ بدل کر کاٹتا ہے۔ کبھی سوداگر کے بھیس میں، کبھی جعلی اور کبھی اصلی حکیم اور ڈاکٹر کے بھیس میں کبھی حکومت کے بھیس میں، کبھی ستہ کمپنی کے مالک کے بھیس میں ——— سوروپ بدل کر مگر آدمی آدمی کو برا نہیں کہے گا۔ فقط چند لوگوں کو جیب کترا، ڈاکو، لٹیرا کہہ کر خوش ہو جائے گا۔"

"آدمی آدمی کا گوشت کھاتا ہے۔ آدمی آدمی کو پھاڑ کھاتا ہے مگر وہ اس نے گدھوں کو مردار خور اور چند جنگلی جانوروں کو درندہ کہا ہے۔ سب سے بڑا مردار خور ——— سب سے بڑا درندہ تو آدمی خود ہے۔"

پھر وہ قہقہے لگانے لگی، اس کے قہقہے زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ میں پانی پانی ہوا [illegible] ——— [illegible] ڈر مر سمٹا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کٹی ہوئی جیب میرے [illegible] تھی۔ اس کی کہانی میرے ذہن میں محو تھی، موسم بڑا ہی خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، فضا معطر تھی ——— خوشگوار خنکی سے بھرپور تھی ——— آسمان کا نیلا رنگ بڑا ہی پیارا لگتا تھا اور پیارے نیلے آسمان میں ستارے ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی معصوم بچی کی نیلی چُنریا میں موتی ٹکے ہوئے ہوں۔

جوانی کا آخری دن ——— بقیہ صفحہ ۳۹

باہر آم کے پیڑ پر کوئل برابر کو کے جا رہی تھی جیسے اس کی روح بھی بھوک سے بے تاب ہو کوکو .... کوکو ..... کوئل بُری طرح چیخی اور وہ بھی بے چین ہو کر پکار اٹھا میں بھوکا ہوں۔

ان کو بارلی نشاستہ دو! ایک جانی پہچانی آواز اس کے کان میں آئی۔ ڈاکٹر اس کی طرف پشت کئے ایک مریض کا معائنہ کر رہا تھا۔

وہ سمجھا بارلی کا نشاستہ اس کے لئے تجویز کیا جا رہا ہے۔ بارلی کا نشاستہ وہ بڑبڑایا، اسے ابکائی سی آنے لگی۔ ڈاکٹر وہ اپنے اضطراب پر قابو نہ پا کر چلا اٹھا۔ بارلی کا نشاستہ مجھے .... نہیں چاہیے ڈاکٹر، کمپونڈر اور مریض سب کے سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے لیکن وہ ان سب سے بے پروا چلائے جا رہا تھا۔

میری روح بھوکی ہے اور تم کو معلوم ہے ڈاکٹر روح [illegible] بارلی کا نشاستہ نہیں کھاتی۔ روح کی غذا بارلی کا نشاستہ نہیں [illegible]

وہ کہتے کہتے لڑکھڑا گیا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ وہ ڈاکٹر کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ادھر آم کے پیڑ پر کوئل بھی برابر کو کے جا رہی تھی "ایک ..... محبت بھری مانوس آواز اس کے کانوں میں آئی۔ میرے پاس تمہاری روح کے لئے غذا موجود ہے۔ بلاشبہ یہ رشاد کی آواز تھی وہ چونک اٹھا اور تم ——— اس نے ڈاکٹر کو حیرت سے گھورتے ہوئے کہا۔

ارشاد میرے اچھے دوست تم۔ وہ دوبارہ ڈاکٹر کے تنومند سینہ سے لپٹ گیا۔

اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ڈاکٹر کے کاندھوں پر سے اس کی نمناک نظریں پھسلتی ہوئی برآمدہ کے باہر گوندنی کے سایہ [illegible] پر پڑیں۔ اور اسے یوں معلوم دیا جیسے وہ سایہ سمٹتے سمٹتے اچانک غائب ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی [illegible] ———

اقبال احمد انصاری

انتقام

یہ اُن دنوں کی بات ہے جبکہ میں اپنے باپ، بہن اور چھوٹے بھائیوں کو مغربی پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ میں جلتا بھنتا دیکھ کر، جان بچا کر اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان بھاگ آیا تھا۔ یہاں میں نیا تھا اور رفیوجی کہلاتا تھا۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں کہ ان دنوں جذبۂ انتقام نے مجھ پر پورا قابو پا لیا تھا۔ یہی جذبہ ہے کہ میں حیروں کو بیر کھتا۔ دیکھتا اور بڑبڑاتا سوچتا تھا ——— میری بہن کی آہ و چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی بلکہ کانوں کے راستہ تحلیل ہو کر دل میں عجیب جلن، ٹیس اور اعصاب میں ہیجان بھر رہی تھی معصوم ملتجی نگاہوں کا سماں میرے تصور میں ویسے ہی تازہ تھا۔ اور جب اپنی ماں کے اصرار پر میں نے مقامی کالج میں داخلہ لے لیا تو احمد کی طرف اپنی نفرت و انتقام کو مرکوز کر دیا .. پوری کلاس میں وہی تو ایک مسلمان تھا۔ اسی کے باپ بھائیوں نے میری زندگی، میرا خاندان اور سب کچھ تباہ کیا۔ یہ انسانیت کے دشمن، لٹیرے .... "

یہ جانے کیا کیا سوچ جاتا لیکن وہ تو ہمیشہ ہی سے مجھ سے میل جول بڑھانے کی کوشش کرتا۔ جسے میں ریاکاری سے منسوب کرتا۔ وہ کتنے پُرخلوص لہجے میں مجھ سے باتیں کرتا ہے، میرے وطن، خاندان، موجودہ حالات کے متعلق باتیں دریافت کرتا ہے۔ — جیسے اسے مجھ سے سچ مچ کی ہمدردی ہی تو ہے۔ جیسے میں ان مسلمانوں کو جانتا نہیں۔ میں اس سے نفرت کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ مخلصانہ ہمدردی کی آنچ تدریجاً پچھا کر رہا کہ مجھے کبھی کبھی [illegible] محسوس ہو جاتی۔ میں اس خلش کو مخالف طریقوں سے دبا دیتا۔ آخر یہ ان لوگوں کے [illegible] ڈرتا ہوگا اس لئے ... حکمت عملی ہی تو یہ سب جانتے ہیں۔

جذبہ انتقام آدمی کو ایک [illegible] عینک ... لگا دیتا ہے جس میں چیزیں اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر نہیں آتیں بلکہ [illegible] مروڑی .. اسی جذبہ کے تحت تو میں ایک ایسی سوسائٹی کا ممبر ہو گیا تھا جس کا کام ہی یہاں مسلمانوں کو گن گن کر ختم کرنا اور تکلیف پہنچانا تھا۔ سوسائٹی کی سرگرمیوں میں شریک ہو کر میرے تپتے ہوئے دل اور ہیجان انگیز اعصاب میں کچھ تسکین کا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔

احمد کی باتیں جب زبردستی بھی میرے دل میں کچھ کچھ گھر کرنے لگتیں تو میں انہیں اپنا فرض یاد کر کے کھرچ ڈالتا اس کے روز میری خیریت، ماتا کا حال میری تکلیفوں اور دوسری باتوں کے دریافت کرتے رہنے کے باوجود ایک دن میں نے سوسائٹی کے سرغنہ کو اس کا نام اور پتہ فہرست میں نوٹ کرا دیا۔ میں نے ایسا یہ سوچ کر کیا کہ اس طرح میری طبیعت کا غبار دور ہو جائے گا ... جلن، ٹیس اور جذبۂ انتقام کو سکون مل جائے گا ... میری بہن کی آہیں ٹھنڈی پڑ کر اب مزید پریشان نہ کریں گی۔ احمد [illegible] یہ گر نہیں، یہ خلوص، ہمدردی و دلسوزی نہیں بلکہ ڈھونگ ہے۔ اپنی کمزوری کو چھپانے کا۔ آخر بزدل ہے نا! اکیلا .. ڈرتا ہے، جانتا ہے کہ میں [illegible] اس کا دشمن ہوں ... کیا ہوا جو وہ [illegible] میرا حال پوچھتا ہے۔ کیلا خریدتا ہے تو مجھے بھی کھلا دیتا ہے۔ نہیں میں اتنی سی [illegible] بیچ نہیں سکتا۔ اپنے فرض سے نہیں ہٹ سکتا۔ میں نے بہت اچھا کیا۔ اس کے بھائیوں نے مجھے یتیم و بے وطن کیا میں بھی اس کے باپ کو بے اولاد کر دوں گا .... میرے بڈھے باپ کی روح بھی منڈلا کر یہی کہہ رہی ہے ... اچھا ہی کیا "

ایک ہفتہ کے اندر احمد موت کی آغوش میں پہنچ جانے والا تھا پلان تیار ہو چکا تھا۔ اتفاق سے اسی دوران مجھے ملیریا کا سخت حملہ ہوا اور میں کالج نہ جا سکا۔ بستر تھامنے پر مجبور ہو گیا۔ پڑے پڑے بہت سی باتیں سوچتا ... احمد خاص طور پر سوچ کا موضوع بنا ہوا تھا ... مجھے بھی لاشعوری طور پر۔ پورا یقین تھا کہ اسی ہفتہ وہ موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ [illegible] ٹھیک ہو جانے کی بھی امید تھی۔ جلن ... ایک انجان [illegible] جلن بڑھتی بیماری تھی۔ بلکہ یہ خواہش بیدار ہوتی رہتی کہ کاش احمد سے وہ ایک بار ملتے ... کسی ملاقات کو آخری بھی سکا

یہ حقیقت ہے کہ بیماری کی حالت میں آدمی کی نفسیات پر نمایاں اثر پڑتا ہے اور اس میں کچھ فرق آ جاتا ہے۔ اسی دوران میں بہت سی ایسی باتیں سوچ جاتا ہیں جو عام حالت میں سمجھ میں نہیں آ سکتیں ...

میرے دل پر اس کے خلوص و محبت کی چھاپ میرے اندازہ سے زیادہ گہری محسوس ہو رہی تھی۔ اور یہی احساس تکلیف پہنچا رہا تھا۔ تحت الشعور سے ایسے خیال

بھی اُبھرتے معلوم پڑتے کہ ناحق میں نے ایسا کیا ....

"اگر وہ ڈر کر بھی مجھ سے محبت اور خلوص سے پیش آتا ہے تو اس نے میرا کیا بگاڑا جو میں اس کی جان لینے پر تُلا ہوں ... کیا میں احمد سے انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش میں حق بجانب ہوں ؟ کس احمد نے ۔ یا احمد کی رُوح نے میری بہن کی بے عزتی کی ! کیا اسی نے میرے ضعیف باپ کی کوکھ میں چُھرا بھونک کر اس کی سرخ ، بے نور آنکھیں باہر نکال دیں .. اُف ! میں نے بُرا کیا ۔

"احمد تو معصوم ہے .... " " احمد معصوم تو ہے ۔ یہ صحیح ہے لیکن میری بہن ، میرے ننھے منے بھائی یہ سب بھی تو معصوم تھے معصوم قتل کئے گئے ۔ معصوم پھر قتل ہوں گے ... ذمہ داری میرے سر نہیں ... ٹھیک ہے"

ابھی میری بہن کی آہوں نے پُراسرار قہقہوں میں ڈھل کر مجھے پریشان کرنا نہیں چھوڑا تھا ، ابھی میرے ضعیف باپ کی رُوح نے سسک سسک کر میرے سر پر منڈلانا بند نہ کیا تھا ، ابھی لفظ "مسلمان" میرے لئے تمام کراہتوں ، نفرتوں کا سرچشمہ ہی تھا ...." مسلمان احمد ۔ مسلمان کیسے معصوم ہو سکتا ہے ..... وہ بھی ڈاڑھی رکھائے ہوئے ہے ۔ پورا کٹر مسلمان ہے" میرا بیمار ذہن اس سے زیادہ سوچنے کی تاب نہ لا کر سو جاتا میرے وجود کے ساتھ ۔

لیکن جذبات کا تھا ، رکا ، گدلا پانی ۔ پورے بہاؤ سے نکلنے لگا ۔ ایک تھا تھم طوفان بڑی تیزی سے جنبار کو سمیٹے رخصت ہو رہا تھا ۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب احمد اس شام کو میرے مکان پر آ پہنچا ۔ مجھے بیمار سن کر میرا حال پوچھنے ۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میں سکھوں کے محلہ میں رہتا ہوں ۔ جہاں سب ہی رنبیر جی ___ دل چین رنبیر جی ___ بستے ہیں ..... اس کی آمد پر جیسے کسی نے ایکسرے کر کے اس کے دل کو میرے سامنے رکھ دیا ۔ وہ دل جہاں نہ کوئی خوف تھا ۔ نہ کوئی حرص ... بلکہ ہمدردی اور خلوص و محبت کے پاکیزہ جذبات تھے ۔

وہ میری علالت پر مجھے دیکھنے آیا تھا ۔ مسلمان احمد سکھوں کے محلہ میں آیا تھا ..

میرے اندر کا غبار دب رہا تھا ... غم ، غصہ اور نفرت کے بادل جو قلب کی اُوپری سطح پر چھا گئے تھے ۔ اب چھٹ رہے تھے اور دل کے اندر یہاں محبت بیدار ہو رہی تھی ۔ یہ عمل جتلا رہے تھے کہ نفرت و انتقام فطری نہ تھے بلکہ یہ کاوٹ عائد کردہ تھے ۔ وہ دل کی گہرائیوں میں جڑ نہیں پکڑ سکے ۔ بلکہ اُوپری سطح پر ایک گھٹا سی بنا دی جس سے محبت کی کرنوں کا گذر دشوار ہو گیا تھا ۔ یہ سب اندرونی طور پر چند تاریک لمحوں میں ہوا اور اب کوئی خلش ، کوئی چُبھن باقی نہ تھی ۔ وہ رنگین عینک بھی اُتر گئی جو مصنوعی تھی اور جسے جذبۂ انتقام نے میری آنکھوں پر چڑھا دیا تھا ___ اب باتیں اپنے اصلی رنگ و رُوپ میں نظر آنے لگی تھیں ۔ ذہن نے اس بات کے ماننے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کی کہ وہ مسلمان نہ تھے جنہوں نے جہلم و چناب کے کنارے انسانی خون سے ہولیاں کھیلیں اور گنگا و جمنا کی سرزمین پر وہی ڈرامہ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے دھرم کے لئے نہیں کھیلا ۔ یہ سب انانیت پسند قوم پرستی کے نشہ سے بدمست ہو گئے تھے ___ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے حیوانی جذبات و خواہشات کی تسکین کے لئے کیا ۔ ایسے ہی تاثرات کی ایک باڑھ تھی جو میرے قلب میں اُمنڈی آ رہی تھی ... پھر مجھے خدشات نے گھیر لیا ۔ "ظالم معصوم احمد کو موقع ملنے پا کر چھوڑ نہیں سکتے ___ یہ نہیں ہو سکتا ! ہرگز نہ ہوگا ۔ میں احمد کو ضرور بچاؤں گا ... "

وہ شام کو تو آیا ہی تھے ۔ میٹھے باتیں کرتے رات ہو چلی ۔ اس نے واپس جانے کو کہا ۔ میری آنکھوں میں شدتِ جذبات سے آنسو آ گئے ۔ جنہیں میں روک بھی نہ سکا ___ کتنا سکون بخش تھا وہ آنسو ۔ میں کس دل سے اسے جانے کی اجازت دیدیتا .... میں نے اسے بتلا دیا کہ دشمن اس کی گھات میں ہیں ... وہ کچھ متفکر سا نظر آیا پھر ہشاش ! جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔ وفورِ جذبات سے میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے ۔ "احمد ۔ تم نے مجھ پر فتح پا لی ، بلکہ تمہاری انسانیت اور محبت نے میرے دل کو جیت لیا ۔ تم نے میرے اندر دل کو بدل دیا ... تمہاری سچائی ایمان لانے کے قابل ہے"

وہ سنجیدہ چہرہ نیچے کئے پیر کے انگوٹھے سے یونہی سخت زمین کرید رہا تھا ۔ اس کو بچانے کی فکر مجھے متردد کئے ہوئے تھی ۔ آخر میں نے ایک ترکیب نکالی " احمد تم نے میرے دل کو ' میرے اندرون کو بدل دیا ۔ مجھے اجازت دو ___ صرف تمہیں خطرات سے بچا لینے کے لئے ۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے تمہارے ظاہر کو بدل دوں ___ میں تمہیں سکھ بناؤں گا ___ صرف اُوپر سے ، تمہیں بچانے کے لئے ___ راہ بھر کے لئے ۔ جبکہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا ۔ اپنی کمزوری کے باوجود میں بھی چلوں گا .... ایک سکھ دوست بنا کر "

وہ خاموش کھڑا رہا ۔ پھر بیٹھ گیا میں نے اس کی ڈاڑھی تیل لگا کر کنگھے سے سلجھا دی ... اس کے سر پر ایک صاف عمامہ باندھ دیا ۔ ہاتھ میں کڑا ڈال دیا ...... اس ہیئت میں وہ بالکل سکھ لگ رہا تھا لیکن مجھے اس کی نئی ہیئت سے خوشی نہیں ہو رہی تھی ___ آخر کڑا ، کنگھا ، کیس ، کرپان .. آدمی کو کیا دے سکتے ہیں ... سچائی ، محبت تو کچھ اور ہی چیز ہے ___ بلکہ مجھے صدمہ ہو رہا تھا کہ کہیں احمد کی خودداری کو ٹھیس نہ لگ رہی ...

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ سے جو کچھ کہا وہ مجھے اب تک یاد ہے بلکہ ذہن پر نقش ہو کر مجھے روشنی دکھلاتی رہی ہیں ۔ "عظیم سچائی اور محبت و انسانیت کے مزاج کی تلاش کی ضرورت ہے"

ایک مزاحیہ رزمیہ مثنوی

رزم نامہ

نجم الاسلام

"محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا" قیامت یہ ناچیز ہے دیکھنا[1]
ذرا بات کی چشم تر ہو گئی!!! نہ ہونی تھی جن کو خبر ہو گئی
کہیں قیس کو دشت دکھلا دیا کہیں کوہ کا کوہ کٹوا دیا!!!!!
نہیں اس کے کاٹے کا کوئی علاج کیے اس نے تاراج کتنے ہی راج
جو سر چڑھ کے بولا یہ جادو کبھی تہ و بالا دنیا کی دنیا ہوئی
اسی سے وہ جنگیں ہوئیں خوفناک کہ ہو دامنِ ضبط سننے سے چاک

سناؤں تمہیں بات اک روز کی جو اک کافی ہاؤس میں واقع ہوئی
ہوا یوں کہ آئی تھی کھلا یہاں وہ دوشیزۂ ہند شیریں زباں
گلابوں سے گالوں کے باعث جسے دیا نام روزی کا ماں باپ نے
ہر اک باخبر حلقے کا ہے بیاں کہ مرتے تھے سب اس پہ پیر و جواں
بہت اس کی دلی میں تشہیر تھی اک عالم کے خوابوں کی تعبیر تھی

---

[1] ملاحظہ ہو پوپ کی مزاحیہ رزمیہ نظم "ریپ آف دی لاک" Rape of the Lock کا ابتدائیہ

What dire offence from am'rous causes springs,
What mighty contests rise from trivial things,

وہ امریکی شیروں میں کھیلی ہوئی   وہ سوڈ کی ڈیروں میں کھیلی پلی
وہ آنکھوں کی ٹھنڈک وہ دلکا سرور   جوانی کے بدمست نشے میں چور
جوانانِ کالج کے قصوں کی ہیر   کلرکوں کی اک حسرتِ دل پذیر
ادیبانِ نوخیز اس کے غلام   لٹاتے تھے دل شاعرانِ کرام
بہت شور تھا اردو بازار میں   نکلتی تھی اکثر ادھر کار میں

دوکانوں پہ دانشوروں کے گروہ   کو رہتی سرِ شام روزی کی ٹوہ
کوئی فیض کے شعر پڑھتا ہوا   ترقی کے زینے پہ چڑھتا ہوا
کوئی فلم کے گیت گاتا ہوا   کوئی نظمِ تازہ سناتا ہوا
ادب اور سیاست کی چالوں میں گم   نگاہیں سڑک پر خیالوں میں گم
کوئی مفتخر فکرِ چالاک پر   کوئی مفتخر طبعِ بیباک پر
دلوں میں خوشی لب پہ آہ و فغاں   غرض اک نئی روح سی تھی رواں

ان ہی نوجوانوں میں اک مرد تھا   جو الفت کے ہر کھیل میں فرد تھا
بہت ذہن چلتا تھا رومان میں   محبت کے فیضان و عرفان میں
بفضلِ خدا اس میں جرأت بھی تھی   محبت میں مرنے کی ہمت بھی تھی
اسی سے وہ کچھ سب میں ممتاز تھا   اسے اپنی جرأت پہ خود ناز تھا
چڑھاتے تھے کہہ کر اسے شیر دل   چہکاتا تھا اکثر وہی سب کی دل
دل اس کا بھی روزی پہ مائل ہوا   کیوپڈ کے تیروں سے گھائل ہوا
خیالی پلاؤ پکانے لگا   تعاقب میں پاؤں اٹھانے لگا
تئی دلی تک دوڑ ہونے لگی   محبت کی دھن عقل کھونے لگی

پھر اک روز ایسا خدا نے کیا   مرادوں کو پہونچا وہ مردِ خدا
ملاقات کیفے میں ہو ہی گئی!   پریشانیاں دل سے دھو ہی گئیں

شریفانہ باہم تعارف ہوا — درِ گفتگو دونوں جانب کھُلا
بہت خاکساری دکھائی گئی — لوائے سے کافی منگائی گئی!
کبھی بات موسم کی ہونے لگی — تو لفظوں کی بارش سی ہونے لگی
کبھی فلم انگریزی پر تبصرے — کبھی "یوتھ کن ٹیسٹ" تذکرے
کبھی شیکسپیر اور ملٹن کی بات — کبھی جارجٹ اور ساٹن کی بات
ایلوجی کبھی حسنِ پوشاک کی — کبھی اپنے پاپا کے املاک کی
غرض گفتگو یوں ہی چلتی رہی — محبت زبانوں میں پلتی رہی

اثر اپنا کافی دکھانے لگی — سیاست کے نکتے سجھانے لگی
بُرا اس نگوڑی سیاست کا ہو — گئی بیچ جو تلخ کامی کا بو
اِدھر عشق کٹر ترقی پسند — اُدھر حسن سرمائے میں مست مند
اِدھر عشق کی روسیت جوش پہ — اُدھر طرزِ جمہوریت جوش پر
اِدھر اشتراکی خیالوں کا زور — اُدھر خاص امریکی چالوں کا شور
صدائیں بلندی پہ جانے لگیں — ترقی پسندی دکھانے لگیں
دلائل کے انبار ہونے لگے — لڑائی کے آثار ہونے لگے

اُٹھے چھوڑ کر لوگ میز و جام — ہوئے جمع آ آکے سب خاص و عام
سٹائر کا ایکسچینج ہونے لگا!! — ایمونیشن، ارینج ہونے لگا

۱؎ youth contest "مقابلہ حسن و شباب" ۲؎ Eulogy مدح سرائی

۳؎ Coffee (which makes politician wise,
And see through all things with his half shut eyes)
"POPE" [The Rape of the lock]

۴؎ satire، طنز ۵؎ exchange تبادلہ ۶؎ Ammunition گولا بارود ۷؎ Arrange منظم

یہ انداز میڈم دکھاتی ہو کیوں — مجھے دھونس دیکر ڈراتی ہو کیوں
تمہی کیا فقط اک زمانے میں ہو — جو مشغول یوں آزمانے میں ہو"

"کوئی نوج ایسا بھی عاشق ہوا — الجھتا ہے یہ عورتوں سے موا
جوانی کے یہ زور یارب گھٹیں — ٹھہر مردوے! تیری مونچھیں کٹیں"

غرض ایک گھمسان کا رن پڑا — بڑا سخت ہنگامہ برپا ہوا
کوئی شیر دل کو بچانے لگا — کوئی رونی کا دل بڑھانے لگا
پوٹیٹو[1] کے ویفر[2] برسنے لگے — بم ایٹم کے کانوں میں لسنے لگے
ہر اک سمت کافی بکھرنے لگی — محبت بلا موت مرنے لگی
پیالی کے گولے سے پھٹنے لگے — جیالے جواں دور ہٹنے لگے
کسی ذی نے ہاتھوں میں ساسر[3] کی شیلڈ[4] — کسی کو بنی چھوڑتے وار فیلڈ[5]
پڑی ہے جو لپر چاکلیٹو کی مار — دیا نشہ عشق سب کا اتار
ٹمے ایلش کی، مسرہ توڑی گئی — "ٹیر گیس"[7] اس طرح چھوڑی گئی
ارے لو وہ "کم بیٹ"[8] ہونے لگا — لڑائی میں رنگ آگیا ناچ کا
چلے بے تکلف وہ نینوں کے بان — تو سنہد کے وارمیوں[9] کے بان
پڑے کھکے چمچ کے قبضوں پہ ہاتھ — کسی نے دی دشمن کو جوتوں سے مات
کہیں تیر سگرٹ کے چھوڑے گئے — پھپھولے جلے دل کے پھوڑے گئے

---

۱ Potato آلو ۲ Wafer ورق ۳ Saucer تشتری ۴ Shield ڈھال
۵ War field میدانِ جنگ ۶ Hoh Tany فاکران
۷ Tear Gas اشک آور گیس ۸ Combat دست بدست مقابلہ ۹ Warman جنگ باز

ہوائیں وہ بازو لچکنے لگے　　وہ مژگاں کے خنجر چمکنے لگے
عجب گرم بازار مستی ہوا　　گراں سخت سودا ئے ہستی ہوا
چھڑا ہر طرف آہ و نالہ کا راگ　　اُجڑنے لگے ہونے والے سہاگ
بہت امنِ عالم کو خطرہ ہوا　　کہ اک کوریا در پیدا ہوا
گئے بھاگ ویٹر[۱] منیجر کے پاس　　منیجر کے غائب ہوئے سب حواس
کیا فون عجلت میں یو این اوکو[۲]　　کہ حل اس کا شاید یو این او سے ہو
خبر اس کی اخبار کو لگ گئی　　جہاں سے پھر اغیار کو لگ گئی
چلے سب کے دیکھیں تماشا ہو ذرا　　تماشا پھر اس پر تماشا بنا
حکومت کو بھی سخت تشویش تھی　　"یہ ہے داخلی جنگ یا خارجی"
نوعیت تھی پیچیدہ کچھ اس قدر　　پہونچتی تھی دشوار تہ تک نظر
ابھی فیصلہ کرنے پائے نہ تھے　　اُڑان ایک بھی بھرنے پائے نہ تھے
کسی نے خبر دی کہ لو آگئے　　نمائندے یو این[۳] کے بھیجے ہوئے
سناؤں تمہیں انکے حالات بھی　　مناسب ہے ہو جائے یہ بات بھی
وہ اربابِ خوش فکر عالی مقام　　فراست کا جن کی زمانے میں نام
فلاطون بھی جن کو سجدہ کرے　　ارسطو بھی جن کی سمجھ پر مرے
لسانی طلاقت میں مانے ہوئے　　زبانی رفاقت میں مانے ہوئے
سیاسی مسائل میں وہ سوجھ بوجھ　　کہ جتنے سب نشینانِ بامِ عروج
جو ناامن کا جاہے گھر میں شکار　　مگر دوسرے ملک میں تیں...
جو دکھ درد میں خلق کے پیش پیش　　لبوں پر شکر آستینوں میں نیش

---

۱ Waiter ۔۔ خدمت گار　　۲ U.N.O　　۳ مجلس اقوام متحدہ U.N.

کوئی رُدس کا سچا خدمت گذار　　کسی پر یو ایس اے[۱] کا فینٹم[۲] سوار

حکومت کو کیا کم تھے پہلے ہی کام　　بچاری کو تھا چین لینا حرام
جدھر دیکھو اخبار رکھے ہوئے　　بیانوں کے انبار رکھے ہوئے
کسی شے کا ٹائم نہ کوئی مقام　　فقط کام سے دُھن کہ پورے ہوں کام
کبھی ہانگ کو چین کی تمنا　　کمولسٹوں کے زور کا سامنا
کبھی چین کی اُلجھنوں کا خیال　　لڑائی کا احساس، فکر مآل
کبھی غور حالات کے موڑ پر　　کبھی پاک امریکی گٹھ جوڑ پر
کبھی ایشیا کو جگانے کی دُھن!　　کبھی دشمنوں سے بچانے کی دھن
وہ ادگھاٹنوں[۴] کے جھمیلے کہ بس　　وہ جلسوں کے ریلے کہ ڈھیلے ہوں کس
وہ کاغذ کے گھوڑوں کی ہر سمت ریس[۵]　　نظر آتے سوتے میں بھی جن کی فیس[۶]
اِدھر عمر ہی ختم تا حدِ دِرِ نگاہ　　اُدھر تھکنی جانیں! خدا کی پناہ
نہ کھانے کی فرصت نہ پینے کا ہوش　　نہ مرنے کی مہلت نہ جینے کا ہوش

مزید اب غمِ میزبانی ہوا　　رسیپشن[۷] کیا، چائے پانی ہوا
کہا چار و ناچار خوش آمدید　　یہ دن ہے ہمارے لئے روزِ عید
زہے آمدِ صاحبانِ شرف　　توجہ کریں آؤ محل کی طرف
عجب کیا کریں عقدہ دل کھلے　　رکاوٹ جو ہے آج حائل کھلے

بچھایا گیا ہر طرف دام سخت[۳]　　سجایا گیا چودھراہٹ کا تخت
بٹھائے گئے اس پہ مہماں تمام　　بصد شان و شوکت بصد اہتمام

---

۱ U.S.A امریکہ　۲ Phantom بھوت　۳ Coachin ٹراونکورچین (جنوبی ہند کا ایک علاقہ)

۴ افتتاحی تقریبات　۵ Race دوڑ　۶ Face چہرہ　۷ Reception استقبال

پئے مشورت مجلس آراستند   نشستند و گفتند و برخاستند
کوئی آبزرور[۱] بنایا گیا   کسی کو صدر میں بٹھایا گیا
طبیعت تو ہر روز بیکل رہی   مگر خاصی اس روز ہل چل رہی

وسائل تھے کم اور حالات سخت   پھنسا تھا مصیبت کی مجبوں میں سخت
کسی کی سمجھ کام دیتی نہ تھی   گرہ کھلنے کا نام لیتی نہ تھی
بہت آ رہے تھے بھیانک خیال   بڑا جنگ کا ڈر سی تھا سب کا حال

الٰہی میں صدقے تری شان کو   جو لے کام نادان انسان سے
تری قدرتوں کا ٹھکانا نہیں   کسی نے ترا بھید جانا نہیں
جسے چاہے تو کیوں نہ ہو سرفراز   نہیں کیوں نہ نادان دانائے راز
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار   تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار

اٹھا شخص اک ایسے حالات میں   کہ تھا ایک ہی سلسلے حضرات میں
مخاطب ہوا اہلِ مجلس سے یوں   "اجازت اگر ہو تو میں کچھ کہوں
اہنسا پہ باپو جی عامل رہے   سدا قول میں اپنے کامل رہے
یہی راہ اک امنِ عالم کی ہے   یہی راہ ایک ربطِ باہم کی ہے
اگر جنگ جو اپنے ہتھیار لیں   اور ان کو سمندر میں جا پھینک دیں
تو یوں صورتِ امنِ عالم کھلے   کہ در جیسے کہتے ہی سم سم کھلے"

نہایت ہی معقول تجویز تھی   جو بے چوں چرا سب نے منظور کی
مگر پھر عمل کا جو آیا سوال!!   تو سب ہوش اڑ گئے بھول چال

بالآخر لگی ہونے پھر سے سپیچ[۲]   یہ سوچا گیا اہلِ دانش کے بیچ

۱؎ نگراں observer   ۲؎ تقریر speech

"سیاست میں ہے آج نازک وہ موڑ   کہ موسیقی ہے صرف ایٹم کا توڑ"
بلائے گئے نامور اہلِ فن!!   بڑے خوش گلو اور نازک بدن
خیال اور دھرپد کے مشاق سب   یہاں تک کہ دیپک میں بھی طاق سب
الاپوں کے سب دیس چھائے ہوئے   زمانے میں استاد مانے ہوئے
ستاروں پہ تانے اڑاتے ہوئے   محبت کے نغمے سناتے ہوئے
پئے صلح نکلے کچھ اس شان سے   کہ سنتے ہی جائے ہر اک جان سے

وہ نغمہ محبت کا گایا گیا!   فن اتنی بلندی پہ لایا گیا
کہ اک بیخودی سب پہ چھانے لگی   لڑائی کی باتیں بھلانے لگی
فضاؤں سے نشے برسنے لگے   خیالات پھولوں میں بسنے لگے
رہا کوئی دانتوں میں انگلی کو داب'   کہ جیسے نظر آئے تصویرِ خواب
'کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی   رہی نرگسِ آسا کھڑی کی کھڑی'

عجب عالمِ کیف پیدا ہوا   لبوں پر تبسم ہویدا ہوا!!
ہوئے خوش فریقین ذیشان سب   کیا ایک "ناجنگ اعلان" تب
گئی پٹ خلیج اختلافات کی   گھٹائیں چھٹیں ساری آفات کی

خدا سارے عالم کو یہ دن دکھائے
ہر آغازِ بد، نیک انجام پائے

خیال اپنا اپنا

مثنوی سرودِ بیخودی

مصنف ۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور
ملنے کا پتہ :۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور ۔ ۴ حالی روڈ ۔ علی گڑھ
قیمت :۔ دو روپے ، ضخامت ۱۲ صفحات ، مجلد ، سفید کاغذ

صاحبِ "سرود لقا" نے اس مرتبہ ایک فارسی تصنیف پیش کی ہے۔ جس میں بیخودی کے موضوع پر ایک مثنوی اور چند غزلیات شامل ہیں۔ فلسفہ بیخودی کی موافقت جو اس مثنوی میں نہایت شد و مد کے ساتھ کی گئی ہے مصنف نے کن تاثرات کے تحت اور کن مقاصد کے پیش نظر کی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے ہم کتاب کے دیباچہ میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

(۱) "یہ مثنوی اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے جواب میں لکھی گئی ہے مقصود اس کا کسی طرح بیانِ طبیعت نہیں بلکہ گذارشِ احوالِ واقعی کے طور پر ہدیہ ناظرین ہے۔"

(۲) "اس سے اگر آیندہ کے لئے آیندہ آنے والوں اور کام کرنے والوں کی کوشش سے ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑ سکے تو میں اس محنت کو بے فائدہ نہ سمجھوں گا۔ اور لذت دشنام میں بھی لذت احسان مندی محسوس کروں گا۔"

خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے دیباچہ کی پہلی سطر ہی میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو نظریۂ اقبال کی کلی نفی کرنے سے پیدا ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ مثنوی گذارشِ احوالِ واقعی کے طور پر لکھی گئی ہے۔ پھر آگے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مثنوی سے ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ اس سے یقیناً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موضوع حسنِ طبیعت کی جولانیاں دکھلانے کے لئے نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے حصول کے لئے چھیڑا گیا ہے لیکن فلسفۂ بیخودی کوئی نیا فلسفہ نہیں اور نہ اس پر ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ اس لئے کہ رومی سے لیکر اقبال تک اسی فلسفہ بیخودی کی گونج سنائی دیتی رہی ہے یہ اقبال تھا جس نے اس عالم میں بیخودی کے فلسفہ کو لیکر (جس کا اولیں تصور نطشے نے پیش کیا تھا) ایک نئی ادا پیدا کی۔ اور اس سے مردہ دلوں میں زندگی کا نیا جوش دوڑایا خودی کا یہ پہلو خود ڈاکٹر صاحب کو بھی تسلیم ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں۔ "اور یہ حقیقت ہے کہ خودی کا فلسفہ زندگی کی گرمی پیدا کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے تھی لیکن پھر بھی زندگی کے لئے خودی ہی عین مقصود نہیں اور نہ ہونا چاہیئے۔"

اس صورت میں دو سوال اٹھتے ہیں یمکن ہے مصنف ان کا جواب بہتر طریقے پر دے سکیں۔ ایک تو یہ کہ جب خودی کا فلسفہ زندگی کا ایک جزو ہے ۔ (جزو لازم نہ سہی بقول مصنف) تو اس جزو کا مقام آپ کے پیش کردہ (یا دوسرے لوگوں کے پیش کردہ) فلسفۂ بیخودی میں کیا مقام رکھتا ہے ۔ کیا فلسفۂ بیخودی کے مطابق زندگی کو نئے جوش اور گرمی" کی ضرورت نہیں ؟

دوسری بات یہ کہ ایسی صورت میں جبکہ بیخودی کا فلسفہ پہلے سے پیش ہوتا ہی رہا ہے اور خود آپ کی مثنوی میں "بیخودی" کا کوئی ایسا نیا تصور موجود نہیں ہے جو دوسرے لوگوں کے تصور سے مختلف ہو ۔ تو پھر وہ کون سی بنیاد رہ جاتی ہے جس پر ایک نئے طرزِ فکر کی تعمیر ہو سکتی ہے ۔

ضرورت ہے کہ اس کی تشریح مصنف خود اپنے قلم سے کریں تاکہ "سرود بیخودی" کو ایک پرانا راگ سمجھکر ادبی دنیا یونہی نہ گذر جائے ۔ اگر فلسفۂ بیخودی کا کوئی پوشیدہ پہلو ہمارے آج کے حالات میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے تو یقیناً اس کی وضاحت ضروری ہے تاکہ لوگ اس سے تفصیلی طور سے واقفیت حاصل کر سکیں ۔

مثنوی کے دیباچہ میں بھی مصنف نے اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ وضاحت ناکافی ہے ۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ مثنوی میں بیخودی کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ کہیں دیباچہ میں پیش کردہ تصورات سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا ۔ دیباچہ میں ڈاکٹر صاحب خودی کو زندگی کی گرمی کا سبب تسلیم کرتے ہیں مگر مثنوی میں اسے عشق کی ایک زوال آمادہ صورت کہتے ہیں "خودی و بیخودی ہر دو از احوالِ عشق اند ولے خودی درحالتِ نزول پیدا میشود"

عشق را ہرگز نہ احوال خودی است
عشق افسردہ بہ احوال خودی است

آگے چل کر وہ کہتے ہیں ۔ ع ـــــ بیخودی باید برائے بیخودی

لیکن دیباچہ میں وہ بیخودی کے تصور کو عین اسلامی تصور کہہ کر اسلام کے حرکی پہلو پر امید افزا رجحانات پیش کرتے ہیں ۔ گویا وہ خودی و بیخودی برائے عبودیت الٰہی

صحیح تشریح اقبال کے رموز میں ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور صاحب اقبال کے اس تصور کو نامکمل کہتے ہیں تا آنکہ بیخودی برائے بیخودی نہ رہ جائے۔ آخر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ اسلام بیخودی برائے بیخودی کی تلقین کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب "تیز ماد تو" کی مضرتوں کو خاص طور سے نظر میں رکھتے ہیں۔ اس ترکیب کا استعمال ان کے یہاں کئی جگہوں پر ملتا ہے لیکن "تیز ماد تو" اور خودی کے اس تصور میں جو نطشے نہیں بلکہ اقبال پیش کرتا ہے کیا نسبت ہے؟ اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ظاہر ہے کہ خودی "تیز ماد تو" نہیں۔ جیسا کہ غالباً ڈاکٹر صاحب کو بھی تسلیم ہوگا۔

پڑھنے والوں کو مثنوی کے وہ حصے عجیب معلوم ہوں گے جہاں بیخودی میں ان باتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جنہیں اقبال خودی کا طرۂ امتیاز کہہ چکے ہیں۔

"خودی بہ تمکین و قرار تلقین کند و بیخودی بہ اضطراب و ذوق عمل"

اضطرابِ عاشقی پر آب است — زندگی را بیخودی سیلاب است
چوں خودی تلقین بہ تمکیں می کند — ذوق و شوق عشق را از ما برد

یہاں عاشقی اور بیخودی کو مترادف مان لیا گیا ہے۔ حالانکہ عشق اور عاشقی جیسے الفاظ خودی کے ساتھ بھی اتنی خوبصورتی سے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اور اقبال نے کئے ہیں۔

دیباچہ میں خودی، خودبینی، خودشناسی، خودآگاہی، اور خودپرستی جیسے الفاظ ہم معنی الفاظ کی طرح استعمال کئے گئے ہیں لیکن مثنوی میں یہ کہا گیا ہے کہ "انکشافِ حقیقت جس میں یقیناً خودآگاہی بھی شامل ہے وسیلۂ بیخودی سے ہوتی ہے اور خودی اس کے حصول میں مانع ہے۔" بڑی حد تک یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن کب؟ جبکہ خودی کا مطلب خودپرستی ہو اور بیخودی کا مطلب صرف خودپرستی کا انکار۔ لیکن نہ تو اقبال کے نزدیک خودی خودپرستی ہے نہ شاید "اسرارِ بیخودی" کا مصنف اپنے تصور کو خودپرستی کی نفی کی حد تک محدود سمجھتا ہے۔ لہٰذا تضاد دور ہو تو کیونکر ہو۔

بایں ہمہ مثنوی کے بہت سے مقامات مصنف کے گہرے فلسفیانہ رجحان، غور و فکر اور شاعرانہ صلاحیت کا بہت عمدگی سے مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ خودی کا اقتضا حدود بندیٔ وطن اور امتیاز قوم و ملک ہے جبکہ بیخودی فلسفۂ سیاست بین الاقوام کا اثبات کرتی ہے۔

این زمین از ملت و ملک و وطن — خوش نباید لایق ما زیستن
این زمینِ ما و تو ملکِ خداست — ہر کجا خواہیم روم ہر من رواست

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

ہر کسے در فکر حاضر بودہ است — پیر خود صد رنجہا افزودہ است
چشم بکشا روز فردا ہم ببیں — بیخودی مارا شود چوں جاں گزیں
از مذاق روز فردا بے خبر — جز بہ حاضر شد نہ انساں را نظر
پیش از یکدم نہ بیند چوں کسے — بر خودی پالیدہ ماند خویش بسے
و آنکہ شد از روز فردا ہم خبر — بر خودی آنرا نشد یک دم نظر
وقت چوں پابند ماہ و سال نیست — بیخودی جز بہر ما احوال نیست

تو کہ خود را وقف کردی بہر خویش — از غم انساں نداری جان ریش
من کہ بہر دیگراں سوزم تمام — بہر انساں اشک ریزم صبح و شام
نوعِ انساں را چناں منظر دہم — این زغالِ خشک را اخگر دہم
اے مثالِ شمع روشن کن جہاں — گو ہمی سوزد برائے دیگراں
گر خودی را در عمے بگذاشتی — نوعِ انساں را بلند افراشتی
ہر کسے از یک خودی در صد محن — خوش بروں آئے ز تاریخ کہن
کس ندارد جز ہوائے خویشتن — ہر کسے باشد برائے خویشتن
ہیچ کس از بیخودی از خود نرست — نوزدہ صد سال تاریخ در گذشت
جز خودی چوں کس نہ بیند ہیچ کس — بندۂ در بند تو شد چوں مگس
از خودی گر تو فروزاں آمدی — نوعِ انساں را پشیماں آمدی
از خودی چوں احتراق دیگر است — باز در عالم نفاق دیگر است
باز دیگر قلبِ انساں تنگ شد — باز در عالم صلائے جنگ شد
گر خودی باشد بے تقریب ما — غرق خواہد شد چنیں تہذیب ما
از فساد جنگ بگذار عالمے — زانکہ گردد نیست ہنجار عالمے

مثنوی کے بعد کتاب کے آخر میں "بادۂ تلخ" کے عنوان سے غزلیں درج کی گئی ہیں جن کے مضامین بیشتر فلسفۂ بیخودی ہی سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان کی شمولیت بالکل مناسب کہی جا سکتی ہے۔ غزلیں عموماً فارسی اساتذہ کی مشہور زمینوں میں ہیں۔

ایک دو جگہ اشعار میں گڑبڑ بھی معلوم ہوئی۔ مثلاً "پس چہ باید کرد! انسانِ نو" کے تحت دو اشعار ملتے ہیں ؎

آدمی را ذوق آدم چوں شود — ہر کسے از بیخودی بے چوں شود
اے میاں اخویش را زنگ خودی — شستہ باید بر مگس بے خودی (?)

یوں مجموعی حیثیت سے مثنوی شگفتہ ہے اور جا بجا اس میں ایسے اشعار ہیں جو بلاشبہ قابلِ تعریف ہیں۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی کے لحاظ سے کتاب عمدہ ہے۔

(ل۔ آ)

پندرہ روزہ "سیل نو" حیدرآباد دکن

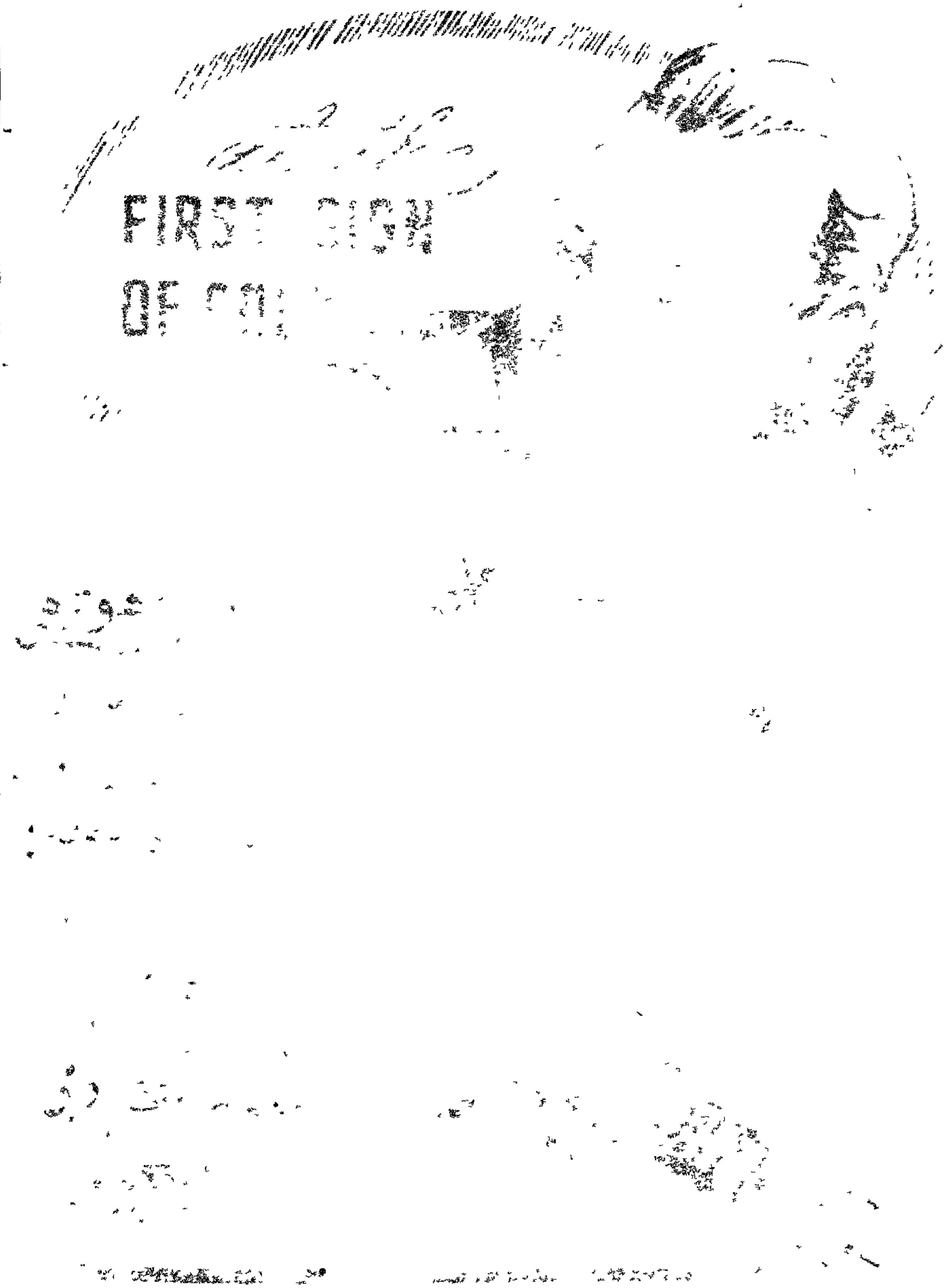
مدیر:- ابو الہدایت۔ بی۔ اے۔
قیمت سالانہ:- تین روپیہ سکۂ ہند۔ فی پرچہ ۔ ۲ر سکۂ ہند
شاہی قیمت ۸ روپیہ۔
پتہ :- غریب خانہ گوشہ محل۔ حیدرآباد دکن۔

اگرچہ اس پرچہ کا اجراء حال ہی میں ہوا ہے لیکن وہ روایت جس پر اس کا انداز اس کی ترتیب، اس کی طباعت، اور کتابت چل رہی ہے کافی پرانی ہے۔ یہ روایت "حیاتِ نو" کی قائم کردہ ہے۔ افسوس ہے کہ بعض وجوہات سے "حیاتِ نو" قائم نہیں رہ سکا۔ لیکن جن مفید خدمتوں کی انجام دہی "حیاتِ نو" کے ذمہ داروں پر فرض تھی وہ یقیناً ایسی نہیں تھیں کہ حیاتِ نو کے بند ہو جانے سے رک جائیں۔ بالآخر کچھ اربابِ عمل ایک نئی جد و جہد پر تیار ہو ہی گئے اور ان کی اس جد و جہد کا نتیجہ "سیل نو" کی صورت میں نکل آیا۔ صاحبانِ "سیل نو" نے اپنا جد و جہد مالی اور دیگر حیثیتوں سے مستحکم بنیادوں پر کہاں تک رکھی ہے اور کہاں تک "وہ سیل نو" کو کامیابی کے ساتھ چلائے جائیں گے ؟ اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔

ہم اس معاصر کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

(ن۔ م)

پرنٹر و پبلشر۔ محمد جمیل خاں
کمال پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت۔ خندق اسٹریٹ بہار


FIRST SIGN


معیار
Maiyar

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ــــ ۵
نمبر ــــ ۴

اپریل ۵۵ء

مدیر
نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیل زر اور تبادلہ زر کیلئے

دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیمس ملی لائن جیکب آباد

زر تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترتیب

نقشِ اوّل

پچھلی بار انہی صفحات میں ادب کی تخلیقی نوعیت کے ذہنی پہلو کو چھیڑا گیا تھا۔ بات معلوم نہیں آپ کو کیسی لگی تشنگی کی شکایت کا تو سوال نہیں۔ دو صفحے ہوتے ہی کیا ہیں۔ لکھنے والا زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ ان باتوں کو ایک مختصر مضمون کی سی شکل دے دے۔ اب اسی شکل کو چاہیے Formal essay کی صورت دے دیجئے یا انہیں Familiar essay بنا کر تھوڑی دیر کو گپ شپ کا سامان مہیا کر دیجئے۔ گپ شپ کا تو یہاں کوئی موقع نہیں۔ اب رہ گیا Formal essay تو ایک حد تک آپ کو اس کی جھلک مل سکتی ہے اور میرے خیال میں اس سے زیادہ طوالت کسی بھی تحریر میں ہونی نہیں چاہیئے خصوصاً جبکہ موضوع گپ شپ کی قسم کا نہ ہو نقش کا مقصد جہاں تک معیار کے پیشِ نظر رہتا ہے وہ یہ ہے کہ تھوڑا بہت جو کچھ بھی لکھنے کا موقع ملے اس میں کوئی بات ایسی ہو کہ ہماری بڑھتی ہوئی تخلیقی جد و جہد کے مطالبوں کو پورا کرنے پر اکسا سکے مقصود یہ نہیں ہے کہ ان دو صفحات میں سارے مطالبے خود ہی پورے کرنے کی کوشش کی جائے بس ایک آدمی اتنا کرنا چاہتا ہے کہ آپ کو وقت کی ضرورت کا احساس دلا کر آپ کی قوتِ فکر کو تحریک دلا دے۔ اور اگر اس میں کسی حد تک بھی کامیابی ہو جائے تو سمجھئے بڑی چیز حاصل ہو گئی۔ قوتِ فکر کی پاکیزگی ایسی چیز ہے جو بے جان سے بے جان موضوع میں بھی بلا کی روح پھونک دیتی ہے۔ ابھی تک ایک یہ خیال عام رہا ہے کہ شعری اور فکری صلاحیتیں بالکلیہ وجدانی ہوتی ہیں۔ اور وجدانی بھی ایسی کہ سرفروشی کے عالم کی کوئی حد، کوئی اصول، کوئی ضابطہ ہی نہیں، اسی لئے آپ اعداد و شمار اٹھا کر دیکھ لیجئے صحیح معنوں میں لکھے پڑھے فن کار کم رہے ہیں برخلاف اس کے سطحی اور رو رو اُتی سے ٹھونسنے، ٹھانسنے، بے جد و جہد کئے ملے ہوئے علم پر جسے علم کا عکس بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے بہتوں کی گاڑی زندگی بھر جیسے تیسے لڑھکتی رہتی ہے۔ ٹیپ کو لے لیجئے۔ کہ ان حضرت نے انتہا کر دی بارش پر بھی کچھ لکھنے بیٹھے تو بجائے کھڑکی کے باہر جھانک کر برستی ہوئی بارش کو دیکھنے کے، ادبی لغت اٹھا کر الٹا پلٹا اور نظم تیار، اور اس کے نتائج سب کو معلوم ہے کہ اس کے نتائج کیا ہیں

مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ علم و فن کے سائنسی نظریہ کا اثر بڑھ رہا ہے، اور ادب بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔ سائنس نے بہت سی باتوں کو جنہیں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا حقیقتِ ثانیہ کی صورت دی ہے۔ اس نظریہ کو بہت سے ذہنی ردِّ عمل دیکھنے پڑے ہیں۔ پہلے سائنس کو مادیت کا ہم معنی سمجھا گیا اسکے اصولوں کے زیر اثر لا دینی تصورات کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً عمل اور ردِّ عمل کا اصول جدلیاتی مادیت میں ڈھل گیا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ وہ خیال جو سائنس کی حس پسند روح کو الوہی علوم کے منافی سمجھتا تھا اب تصحیح کی منزل سے گذر چکا اور غور و فکر کا طالب ہے۔ سائنس محض کائنات کے تکوینی اسرار کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ کہ ہم اسے دوسرے مقاصد کے لئے بھی کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ حق کی خدمت بھی کر سکتی ہے بس توجہ کی ضرورت ہے اور یہ ہماری اپنی ذمہ داری ہے ہماری فکری قوتوں پر اس کا اثر تیزی سے پڑ رہا ہے۔ پچاس سال بعد کے ادب کے بارے میں اور ادب کیا ہر تخلیقی فن کے بارے میں حیرت انگیز اندازے قائم کئے جا سکتے ہیں۔

ایک چیز جس کو شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ انسانی ذہن تجزیہ و تحلیل کی ایسی منزل میں قدم رکھ رہا ہے جہاں طبیعی اور نفسی علوم کی سرحدیں مل گئی ہیں۔ پہلے کائناتی شواہد کو نفسی اور وجدانی علوم کی ترازو میں تولا جاتا تھا اب حالت برعکس ہو گئی کائنات کے شواہد سے حقائق مرتب کر لئے گئے ہیں اور اسی کے سانچوں میں نفسی علوم کو ڈھالا جا رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں ذہنی کشاکش کے بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے پہلے کی طرح آج بھی الجھنیں زیادہ اٹھ رہی ہیں اور اچھے نتائج نہیں نکل رہے ہیں، باوجود اس کے کہ تجزیاتی و تحلیلی تنقید کے اصول اب ہمارے سامنے پہلے سے کہیں زیادہ واضح ہو کر آ چکے ہیں۔

نظامِ کائنات کی وہ دو بنیادی صورتیں جن پر ابوالاعلیٰ کے یہاں "تکوینی" اور "تشریعی" اصطلاحات کے تحت بحث کی گئی ہے۔ ہمارے لئے آج پہلے سے زیادہ اہم ہیں۔ ابوالاعلیٰ نے دونوں کی ہم آہنگی اور توافق پر فلسفیانہ افکار کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ توافق اسلامی نظریہ کی روح ہے۔ مگر آج کے دوسرے

ارباب فکر کے تضاد کو دیکھئے کہ تکوینی نظام کو ماورائی قوتوں کے زیر اثر مان لینے میں انہیں کوئی تامل ہے نہ کوئی اہمیت نظر آتی ہے لیکن اختیاری پہلو پر بحث کرتے ہوئے وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسی زندگی اور کائنات کا ایک حصہ جس کی تسخیر کے لئے ہم فکر کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ ہماری دسترس سے باہر بھی ہے اور اس سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس ہم آہنگی پر مودودی اور دیگر ابوالاعلیٰ نے سائنسی نظریۂ علم کی ایک نئی تحقیق کے امکانات روشن کئے ہیں۔

تکوینی نظام کے اسرار کی نقاب کشائی سائنس کر رہی ہے اور تشریعی نظام کی باگ ڈور جن نظریوں اور فلسفوں کے ہاتھوں میں ہے ان کا تضاد پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ بحالت موجودہ دونوں میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی تا آنکہ کوئی واحد بنیاد جو بیک وقت بنیاد اور بقول شخصے Mighty Idea کا کام انجام دے واضح ہو کر مقبول ہو جائے۔ ایسا ممکن ہے اور اس ممکن کو سچ کر دکھانے کی ایک شدید ترین جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس دوڑ میں ان لوگوں کو بھی حصہ لینا ہے جو اسلامی تحریک کے تعمیری و تخلیقی میلانات اپنا کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ سائنس کو برا بھلا کہنے کا زمانہ کبھی کا گزر چکا ہے اب ضرورت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور آج ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں سائنس اور مابعدیت کو ایک کر دکھانے کا قریب بھی کھل چکا ہے، اگرچہ جدید مفکرین ابھی تک اس وادی میں بھٹک رہے ہیں ان میں سے اگر کچھ کو Life Force کی اصطلاح مل گئی ہے تو اسے کیا کیجئے یہ قوت ان کے نزدیک کائنات اور اس کی سب سے اہم تخلیق انسان سے ہم آہنگ نہیں بلکہ ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ایک بڑا سانحہ ہے جو تماشا کے "تسلسل اور فوق البشر" میں دیکھا جا سکتا ہے

یہ بھاری کمی اگر پوری ہو سکتی ہے تو اسلامی نظام فکر کی روشنی میں۔ اس کی کامیابی جس بات پر منحصر ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تکوینی اور تشریعی قوانین کے سرچشمہ کو ایک تسلیم کر لیا جائے اس کے بعد توافق کے نظریہ پر ایک بہتر شے تعمیر ہو سکتی ہے۔

یہاں اس سلسلے میں تنقید اور سائنس کے تعلق پر خاص طور سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اب وہ دور نہیں جب لوگ Judgement کا نام دے کر ہی تنقید کو برا بھلا کہنے لگتے تھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ استقرائی انداز تنقید میں تیزی سے تسلیمی عنصر روز پکڑتا جا رہا ہے۔ اور درحقیقت سائنس اس کے حق میں ہے سائنس اسے حماقت ہی کہہ سکتی ہے کہ تجربہ تو کیا جائے، مطالعہ کئے جائیں۔ تشریح اور speculation سے تو کام لیا جائے اور اس کے بعد کوئی نتیجہ نکالے بغیر بات ختم کر دی جائے تجربہ اور مشاہدہ کے بعد Inference وہی اہمیت رکھتا ہے جو تنقید میں استقرا اور تشریح کے بعد کے حصے یعنی Judgement کو حاصل ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں تخلیقی ادب کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر سائنس کے اثرات کے امکانات کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ تنقید کی ایک مثال اوپر پیش کر دی گئی ہے۔ یہی صورت تخلیقی صورت کی ہے۔

صرف ماضی میں نہیں آج کی تخلیقی جدوجہد کا وصف امتیازی ہے دراصل تجربات علمی کے اس سائنٹیفک طریق سے تعلق رکھتا ہے جو عمل گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی صرف To determine such and such سپرد قلم کرا دیتا ہے بلکہ ایک مربوط طریقۂ عمل بھی دیتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ طرز انتقاد جو آج بعض خامیوں کے سبب تخلیقی فنکاروں کو بچوں کا کھیل نظر آتا ہے۔ سائنٹیفک طرز تحلیل کو پوری طرح جذب کر کے دیدہ و بینا بن جائے گا۔ ابھی تک بہت سے سوالوں کے جوابات ایک سے زیادہ مل رہے ہیں لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا جب سوالات کا ایک اور حقیقی جواب مل جائے گا۔ اس وقت ادب اور نفسیات کو آپ علوم طبیعی کے پہلو بہ پہلو چلتا ہوا دیکھیں گے۔ مگر اس کا راستہ مادیت پرستی سے الگ پائیں گے۔ اور وہ ایک عجیب ہوگا جب انسانی افکار و اعمال کا تجزیہ اتنے ہی سلیقے سے کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی جتنے سلیقے سے غیر ذی حیاتی اجزائے ترکیب کا تجزیہ ہو جاتا ہے۔

فاروق بانسپاری

عورت

تنہائی سے اکتائی ہوئی فطرتِ آدم
درگاہِ خدا میں ہوئی یوں محوِ مناجات

اے خالقِ جنت ترے الطاف کے صدقے
اک پیکرِ خاکی پہ ہیں کس درجہ عنایات

دلبستگیٔ بندۂ مجبور کی خاطر
کیا کیا نہ دکھائے تری قدرت نے کمالات

تا حدِّ نظر لالہ و گل کی یہ نمائش
آغوشِ مسرّت میں یہ ہنستے ہوئے لمحات

گلشن کی فضاؤں میں ترنّم ہی ترنّم
ہر ساز کے پردے سے نکلتے ہوئے نغمات

جس چیز کی خواہش ہو بیک آن مہیّا
یہ میرے سوالات کے برجستہ جوابات

شاخوں کو یہ آئینہ دکھاتی ہوئی نہریں
یہ وجد کے عالم میں مہکتے ہوئے باغات

یہ کوثر و تسنیم کے دلچسپ نظارے
رنگینیٔ ماحول کے پُرکیف اشارات

سبزے پہ چمکتی ہوئی شبنم کے یہ موتی
احساس پہ چھائی ہوئی اک تاروں بھری رات

خوشبو میں یہ ڈوبی ہوئی مستانہ ہوائیں
سینوں میں یہ انگڑائیاں لیتے ہوئے جذبات

یہ راز سمجھ میں نہیں آتا مرے آقا
بے کیف ہیں کیا جانیے کیوں زیست کے لمحات

ہر وقت کسی شئے کی کمی ہوتی ہے محسوس
مطلوب کوئی چیز ہے بے نام و نشانات

ناگاہ نہاں خانۂ قدرت کا کھلا در
ہلکا سا تبسّم تھا مشیّت کے لبوں پر

اک جلوۂ نادیدہ مجسّم نظر آیا
آئینۂ تخلیق کا کہیے جسے جوہر

دامن میں لئے دولتِ آسائشِ گیتی / سینے میں دبائے ہوئے ہنگامۂ محشر
پلکوں پہ حیا مستِ مئے شوق نگاہیں / میٹھا سا رگِ جاں میں اُترتا ہوا نشتر
ظلمت کدۂ دہر کی وہ عظمتِ معصوم / دیتے ہیں سلامی جسے مہر و مہ و اختر
احساس کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی وہ تیغ / دارا کو سکھاتی ہے جو انداز سکندر
پاکیزگیٔ نفس کا رنگین مُرقّع / اوڑھے ہوئے صد آیۂ تطہیر کی چادر
اِک پیکرِ خاکی میں نہاں حُسن کی دُنیا / اِک چھوٹے سے قطرے میں محبّت کا سمندر
ہونٹوں پہ تبسّم ہو تو نکھری ہوئی جنّت / آنکھوں میں جو آنسو ہو تو بہتا ہوا کوثر
برہم ہو تو آنے لگے شعلوں کو پسینہ / شاداں ہو تو شبنم سے بھی خنکی میں فزوں تر
سختی بھی قیامت کی نزاکت بھی بلا کی / کہہ سکتا ہے پھر کون یہ شیشہ ہے کہ پتھر
آجائے اگر غیظ میں تو صورِ سرافیل / مائل بہ سکوں ہو تو علاجِ غمِ محشر
قائم جو رہے وضع پہ اپنی تو ہمہ خیر / بڑھ جائے اگر حد سے تو سرتابقدم شر
جنگاہِ بغاوت میں حقیقت سے بھی منکر / دھوکے پہ بھی قرباں رہِ تسلیم میں اکثر
مشہور ہے دُنیا میں جو عورت کے لقب سے / تصویرِ وفا جذبۂ ایثار کا پیکر
اُٹھا دلِ آدم میں جو طوفانِ تمنّا / ارشاد کیا شانِ کریمی نے یہ ہنس کر

تو جس کا طلبگار ہے وہ جام یہی ہے
لے جا کہ مرا آخری انعام یہی ہے

محمد نیاز

دیوانہ پن!

تو ہے مری جان و تن! تو ہے مرا فکر و فن!
تو ہے سخن در دہن! تو لبِ من نغمہ زن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

سوزِ دلِ نل دمن! دردِ دلِ کوہ کن!
ہیر کے دل کی لگن! قیس کے دل کی جلن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

شعر کے نشتر کا پھل! نظم کے دل کا کنول!
جانِ عروسِ غزل! روحِ روانِ سخن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

رند کا دستِ طلب! مستیٔ مستِ طلب!
لغزشِ جستِ طلب! مُغ کی جبیں کی شکن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

مستیٔ صہبائے دید! نعرۂ ہل من مزید!
رندِ سیہ کی اُمید! مستِ خدا کا چلن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

یہ غمِ دنیا و دیں؟ تو ہے تو کچھ بھی نہیں!
عرش ہے میری زمیں! چرخ ہے میرا وطن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

خونِ عروقِ حیات! فاتحِ جیشِ ممات!
تجھ سے ہے مولا صفات! بندۂ خاکی بدن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

ہوش کی دنیا، جہاں! تیری، مکاں لامکاں!
ایں سوئے وہم و گماں! آں سوئے تخمین و ظن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

ہم اسیرِ کمند! اور دلِ ارجمند؟
برطرفِ قید و بند! بیغمِ دار و رسن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

بندۂ سودِ نیل و گنگ! دیدۂ تیغ و تفنگ؟
یافتی کیدِ فرنگ؟ می نگری برہمن؟
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

برگِ من و سازِ من! قوتِ آوازِ من!
اے تو ئی شہبازِ من! ایں ہمہ زاغ و زغن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

غازیِ بے تیغِ تیز! فاتحِ بے رستخیز!
وارثِ من، شعلہ ریز! برقِ بلا سوز بن!
اے مرے دیوانہ پن!
اے مرے دیوانہ پن!

سوال ہے عصمتِ چمن کا

محمود عالم

مرے بزرگو!
یہ عصمتِ گلستاں کے تاجر
ذلیل تاجر — ہوس کی خاطر
یہ آج گلشن کی آبرو کا ذلیل بیوپار کر رہے ہیں
چمن کی عصمت لٹا رہے ہیں
ہوس کی دیوی پہ گلستاں کی عظیم قدریں چڑھا رہے ہیں
یہ کیسے فتنے جگا رہے ہیں
یہ کیسا اُودھم مچا رہے ہیں
مرے بزرگو — مرے ندیمو
چمن کی عصمت کے پاسدارو
خموش کیوں ہو — نظر اٹھاؤ
ہے آج دیدنی یہ "تماشا" دیکھو
گلی گلی اب ہے خوں افشاں
ہر رو رو، بہار حیراں
نسیم افسردہ، گُل پریشاں
فضائے گلشن خزاں بداماں
یہاں وہاں سازشوں کے طوفاں
تمام رسوائیوں کے ساماں
تمام بربادیوں کے ساماں

مرے بزرگو!
چمن کی عظمت کے رازدارو
عظیم قدروں کے پاسدارو
خموش کیوں ہو
بایں مذاقِ چمن سرائی بتاؤ آخر خموش کیوں ہو
چمن کی عظمت سسک رہی ہے
تمام کلیاں ہیں سہمی سہمی
تمام شاخیں لرز رہی ہیں
تمام گلشن دہل رہا ہے
تمھاری غیرت کو بے بسی پھر چمن کی آواز دے رہی ہے
تمھارے عزمِ جواں سے عصمت چمن کی فریاد کر رہی ہے
تمھارے ذوقِ بہار ساماں کو ہر کلی پھر بلا رہی ہے
مرے بزرگو بایں مذاقِ چمن سرائی خموش کیوں ہو
زباں کھولو — قدم اٹھاؤ
اٹھو گلستاں کی آبرو اک عظیم شے ہے اسے بچالو
عظیم قدروں کی لاج رکھ لو
چمن کی عصمت کے پاسدارو
چمن کی عظمت کے رازدارو
مرے بزرگو — مرے ندیمو

مُلّا رموزی (مرحوم)

اب کہاں!

بے پردگی کے کام ہیں دشوار اب کہاں
یورپ کی پی ہے جب تو ہیں ہشیار اب کہاں

جس سے لگا کے تکیہ میں لکھتا تھا شان سے
بارش کے بعد بھائی وہ دیوار اب کہاں

جس کے ذریعہ فتح کی دنیا رسولؐ نے
اخلاق کی وہ دولت بیدار اب کہاں

توبہ کے بعد پھر نہ کبھی توڑتے تھے عہد
بی، اے کے عہد میں وہ گنہگار اب کہاں

سائنس سے قریب ہوئے اور خدا سے دور
ہم اس کی نعمتوں کے سزاوار اب کہاں

جب عشق بی، اے پاس ہے اور حسن بی اے پاس
ایک دوسرے کا کوئی وفادار اب کہاں

بجلی کی روشنی کی نفاست پہ جو ہے
اس شخص میں جلالت کردار اب کہاں

شعر زوال و شعر گدائی گلی گلی
اقبال کے جلال کے اشعار اب کہاں

بلند فاروقی ایم اے۔

سامعین

(والٹر ڈی لامیئر Walter de la Mare نے پُراسرار فضا قائم کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ذیل کی نظم LISENERS کا بامحاورہ ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ نظم کی پُراسرار فضائیت ایک خاص عہد سے پیدا کی گئی ہے۔ چند دوستوں میں یہ عہد ہوتا ہے کہ وہ ایک مقررہ جگہ پر پھر ملیں گے۔ ان میں سے ایک ساتھی اس عہد کو پورا کرنے کے لئے سفر سے واپس آتا ہے لیکن دوسرے ساتھی مر چکے ہیں۔ جگہ سنسان ہے)

(۱)

"ہے کوئی اندر یہاں"

دی اس مسافر نے صدا

چاندنی سے جگمگاتے در پہ کھٹ کھٹ کر کے واں

خامشی میں اس کا گھوڑا چر رہا تھا گھاس کو

فرش پر اس گھاس کے میدان میں بالکل بے تکان

(۲)

پھڑپھڑاتی ایک چڑیا برج سے باہر آڑی

اور مسافر سر پہ اپنے دیکھتا ہی رہ گیا

کھٹکھٹایا در یہ پھر اک بار اس نے زور سے

"ہے کوئی اندر یہاں!!"

پھر اس نے چلّا کر کہا

(۳)

کوئی بھی لینے نہیں آیا مسافر کی خبر

اور نہ اس دہلیز پر شاخوں میں سر آیا نظر

آگے جھک کر جھانکتا جو چشمِ گردآلود کو

جب وہاں سکتے میں وہ حیران کھڑا تھا منتظر

(۴)

سننے والوں کا مگر سایوں کی مانند اک گروہ

پُرسکوں اس چاندنی میں سب کھڑا سنتا رہا

لق و دق وہ گھر بنا تھا جن کا مسکن ان دنوں

آج انسانوں کی بستی کی صدا سنتا رہا

(۵)

اور اس نے دل میں سوچا
"ہیں وہ سب کتنے عجیب
ان کی خاموشی صدا کا ہے نرالا اک جواب"

(۶)

اس نے پھر اک بار بڑھ کر کھٹکھٹایا زور سے
اور بھی کچھ زور سے ـــــ اور تان کر گردن ذرا
"ان سے کہہ دینا ـــــ
میں آیا اور نہ بولا کوئی بھی"
"میں رہا وعدہ پہ قائم"
اس نے چلا کر کہا

(۷)

سننے والوں نے نہ کی جنبش مگر پھر بھی ذرا
گو کہ ہر وہ حرف جو اس نے کیا تھا اب ادا
دیر تک اس کی، مکاں میں گونج سی ہوتی رہی
اک وہی تنہا تھا بس جو رہ گیا تھا جاگتا

(۸)

لو نہیں آئی صدا، وہ ہو گیا پا بر رکاب
لوہے اور پتھر سے اک جھنکار پھر پیدا ہوئی
اور ٹپاٹپ ٹاپ کی آواز بھی جب رک گئی
پھر خاموشی کی تب اک بار پھر پیدا ہوئی

غزل اور غزل گو

محمد عثمان رمز

غزل کی بابت اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ غزل اور دوسری تمام اصناف شاعری سے بالکل مختلف اور جداگانہ صنف شاعری ہے۔ اس کا ہر شعر خود اک کائنات ہوتا ہے جس میں ایک دنیا مضمر ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بیشتر اشعار ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور ان میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہوتا۔ غالباً پروفیسر کلیم نے غزل کی اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غزل کی بے ربطی اور بے تنظیمی کا شکوہ کیا ہے نہ صرف اتنا ہی بلکہ پروفیسر کلیم صاحب نے غزل کو "نیم وحشی" صنف شاعری بھی قرار دیا۔ کلیم صاحب نے کیوں ایسا کیا یہ محض گمان و قیاس کی بات ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ ان سے اتفاق نہ کریں

میں سمجھتا ہوں غزل کا ہر شعر لیبنز (Leibnitz) کا ایک موناڈ (Monad) ہے میں اس کی مزید تشریح کرتا ہوں۔ اس جرمن فلسفی کا خیال ہے کہ کائنات میں "قوت" (Force) کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ذرّے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ذرّات ایک دوسرے سے کسی نہ کسی پہلو سے مختلف ہیں۔ یہی مل جل کر اشیاء (Things) بناتے ہیں۔ اس طرح کہ دو چیزیں کبھی آپس میں یکساں نہیں ہوتیں مگر پھر بھی مشابہت کے کچھ پہلو ہوتے ہیں۔ اس فلسفی کے مطابق یہ تمام موناڈ (Monad) باوجود ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ ہونے کے Pre-established Harmony سے باہم رشتہ ہیں جن کی ترتیب تنظیم اور تعلیکس (Reflexion) کا کام ایک سب سے بڑا موناڈ (Highest monad) انجام دیتا ہے۔

مثلاً غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مختلف اور جدا نظر آتا ہے اور بذاتِ خود ایک کائنات بداماں معلوم ہوتا ہے مگر اس کی ترتیب تنظیم اور تعلیکس کے لئے ایک منظم، مربوط اور مترتب شخصیت کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ یہ شخصیت جس قدر اپنے فکر و فلسفہ اور خیال و جذبات میں ہم آہنگی پیدا کرے گی اسی قدر غزل کے اشعار ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہوں گے۔

یہاں یہ سوال ہمارے پردۂ ذہن پر اُبھر سکتا ہے کہ غزل ہی کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت کیوں؟ دوسری اصناف شاعری میں کیا مربوط، منظم اور مترتب شخصیت کی ضرورت نہیں؟ لیکن ہم ان سوالات پر اگر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ غزل میں جو قوت متحرکہ کام کرتی ہے وہ دیگر اصناف شاعری سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہے۔ مثلاً قصائد، مثنوی اور قطعات وغیرہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشاہدات تجربہ اور بالخصوص شعور کی کارفرمائیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک شاعر جتنا اپنے مشاہدات، تجربے اور شعور کو اپنے جذبات اور وجدان میں سمو لیتا ہے اتنا ہی وہ کامیاب ہوتا ہے نیز یہ کہ مشاہدات، تجربے اور شعور کی چھلنیوں سے چھن کر جو فلسفہ ان اصناف شاعری میں نظم کیا جاتا ہے وہ زیادہ تر "حقیقی" (Realistic) ہوتا ہے۔ مگر اسی کے مقابل اگر آپ غزل کو دیکھیں تو اس میں داخلیت، وجدان اور لاشعور جیسی قوت متحرکہ کام کرتی ہوئی ملے گی، یہاں مجھے اپنے اس خیال کے کسی ایک پہلو پر زور دیکر کوئی سنسنی خیز نتیجہ اخذ کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ میری غرض صرف اتنی ہے کہ صنف غزل میں شعور کے مقابلہ میں لاشعور کا خاصا حصّہ ہوتا ہے۔ ورنہ یوں تو مشاہدات و تجربات غزل میں بھی پائے جاتے ہیں اور داخلیت اور وجدان دوسری اصناف شاعری میں بھی بہ الفاظ دیگر غزل اور دوسری اصناف شاعری میں مشاہدات و تجربے، داخلیت و خارجیت، فکر و فلسفہ اور (سب سے اہم) شعور و لاشعور کے تناسب میں فرق ہے نہ کہ نوعیت میں۔

اب میں آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ غالب اپنے

ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ان اشعار میں آپ مشاہدات اور تجربے کے امتزاج کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ مکمل اور کامیاب مثال حالی کی نظم "بیوہ کی فریاد" سے دی جا سکتی ہے۔ حالی اس نظم میں لکھتے ہیں ؎

رونا ان بن باسیوں کا کیا | دیس نکالا جن کو ملا ہے
اب تو مارے خواہ نکالے | پڑی ہوں میں تیرے دروازے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حالی ہندوستانی سماج کی "بیوہ" عورتوں سے کس قدر باخبر ہے اور ان کے شعور نے کس قسم کا درد محسوس کیا ہے۔ نہ صرف یہ اگر ان اشعار کو دیکھئے تو یہ اشعار اپنے شاعر کے ماس پسندانہ مزاج کی بھی غمازی کر رہے ہیں اور ہر شعر شاعر کے قریبی مشاہدے پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی بیشتر نظموں کا آپ غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو مشاہدات تجربے اور ایک مخصوص شعوری فکر کا امتزاج ملے گا۔ ان کی ہر نظم کم و بیش اس سانچے میں ڈھلی ہوئی ملے گی۔ اکثر فکر و فلسفہ غالب ملیں گے۔ مگر غزل کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ اس میں داخلیت، وجدان اور لاشعور ہی کام کرتے پائے جاتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں ان قوت محرکات کا مفصل ذکر کروں میں ایک بار پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں اور دوسری اصناف شاعری میں کام کرنے والی قوت محرکات میں محض تناسب کا فرق ہے نوعیت کا نہیں۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد آئیے ذرا ان قوت محرکات کا تفصیلی جائزہ لیں۔

داخلیت

پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ داخلیت سے میری مراد یہاں داخلی شخصیت ہے۔ اس لئے کہ میرے نزدیک مجرد داخلیت کوئی چیز نہیں۔ لہذا داخلیت کے استعمال کو داخلی شخصیت کے مترادف سمجھنا چاہئے۔ داخلی شخصیت اور خارجی شخصیت میں بہت کچھ فرق ہے۔ انسان کی خارجی شخصیت کو ماحول بناتا اور بگاڑتا ہے مگر داخلی شخصیت خود انسان کے ہاتھوں بنتی اور بگڑتی ہے ان دونوں میں اس تفاوت کے باوجود کوئی خط مستقیم نہیں کھینچا جا سکتا۔ اس لئے کہ کبھی انسان اگر اپنے ماحول کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے تو کبھی ماحول انسان کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔ (کبھی ماحول شخصیت پیدا کرتا (یا بدلتا) ہے) تو کبھی شخصیتیں ماحول پیدا کرتی (یا بدلتی) ہیں۔ البتہ ان میں سے کسی ایک کی تخلیق یا تبدیلی سے پہلے ایک کشمکش کا دور گزرتا ہے اور داخلیت و خارجیت کی یہ کشمکش ایک بڑی حد تک شعور و لاشعور کی کشمکش پیدا کر دیتی ہے۔ جس کو چھپائے چھپایا نہیں جا سکتا۔ میں یہاں ڈاکٹر اقبال کی مثال دیتا ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کے محدود مطالعے سے میں جو کچھ اندازہ لگا سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اقبال میں شعور و لاشعور کی کشمکش اس وقت تک جاری رہی جب تک وہ اس طرح کے اشعار کہتے رہے ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

؎ میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

اقبال کا "لاشعور و شعور" ایک اچھا خاصا موضوع ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مغربی فلسفوں کی قدریں اور رومی کی فکری بنیادیں اقبال کے لاشعور میں ایک مدت خاص کے اندر کچھ اس انداز سے رچ بس گئیں کہ جب انہوں نے خودی کی تلاش میں اسلام کی طرف رخ کیا تو اس میں ایک گونہ تاخیر معلوم ہوتی ہے۔ خیر تو یہ ہمارا موضوع نہیں۔ بلکہ یہاں تو یہ دیکھنا ہے کہ شعور و لاشعور کی کشمکش کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں فرائڈ اور اس کے مکتبۂ فکر کے چند دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ اس کشمکش کی وجہ "جنس" ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ شعور و لاشعور کی کشمکش کی وجہ بہت سارے عوامل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہٹلر کی یہود دشمنی کا جذبہ جنگ لڑنے سے پہلے لاشعور کے ایک گوشے میں پڑا رہا ہے اس کے بعد جیوں جیوں وہ (ہٹلر) کامرانی کی طرف بڑھتا گیا ویسے ویسے مذکورہ جنگ میں وہ یہود دشمنی کے موقف کو اپناتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا لاشعور شعور میں تبدیل ہو گیا۔ لہذا لاشعور کو محض "جنس" کی عینک سے دیکھنا اسی قدر محدود تصور ہوگا جس طرح حالی اور اقبال سے پہلے ہمارے بیشتر شعرا عشق سے "عشق جنس" مراد لیا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل "لاشعور —— بحیثیت ایک قوت متحرکہ —— کی" ذیلی سرخی کے تحت پیش کی جاتی ہے۔ مگر اس سے پہلے وجدان کا جائزہ پیش کرتا ہوں۔

وجدان

یہاں وجدان سے میری مراد وہ اندھی قوت نہیں جو محض

[illegible] میں بیٹھکر حق ہو کے نعرے لگایا کرتی ہے اور نہ ہی اس سے میری مراد وہ قوت ہے جو شاعر کو متوجِ زندگی سے دُور ہٹا کر منظرِ ساحل" میں گم کر دیتی ہے۔ بلکہ وجدان کو میں ایک ایسی قوت یا نت سمجھتا ہوں جو احساسات کی گہرائیوں میں ڈوب کر حقائقِ زندگی کے تابندہ اور درخشندہ موتی نکالتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو غزل کا ماضی صرف یہ کہ اس قوت سے ناآشنا تھا بلکہ شاعر کی گم گشتگی اور گنگناہٹ ہی کو وجدان کے رُوپ میں پیش کرتا ہے اس میں بھی شک نہیں کہ دورِ حاضر بھی اس لحاظ سے کم مایہ ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک غزل گو قوتِ وجدان حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتا ہے۔ اور یقیناً اس کے حصول میں تغزل کی کامیابی کا ایک بہت بڑا راز مضمر ہے۔ اس لئے کہ وجدان کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے اور زندگی کی قدروں کی تلاش میں صرف عقل پر بھروسہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر کی تراشیدہ آنکھوں پر اعتماد کر لیا جائے۔ میں ڈاکٹر اقبال کے مندرجہ ذیل شعر اسی جذبہ کے تحت پڑھتا ہوں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مگر میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محض "دل" پر بھروسہ کر لینا ۔ ۔ جیسا کہ صوفیانہ تغزل نے کیا ۔۔۔ کسی طرح بے پتوار کی کشتی سے کم نہیں۔

اب معاملہ محض وجدان کی نوعیت کا رہ جاتا ہے۔ اس پر اگر ہم غور کریں تو ہمیں آسانی سے اس کا علم ہو سکتا ہے کہ اس معاملہ میں ہمیشہ افراد اور قوموں میں اختلاف رہا ہے بالکل اسی طرح جس طرح جوہری کی نگینوں کی پرکھ میرا مشاہدہ بتاتا ہے کہ کبھی انسان کی قوتِ وجدان اپنی ذاتی فکر و فلسفہ کی حد تک بڑھکر رک جاتی ہے۔ کبھی قوم اور ملک کے اجتماعی فکر و فلسفہ پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کائنات کے طلسم کدے میں گم ہو جاتی ہے۔ مگر ان کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسانی تاریخ کی ابتداء سے قوتِ وجدان ان حدود سے آگے بڑھکر ان سب کے پیدا کرنے والے تک پہنچتی رہی ہے۔ اور فی الحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر بالخصوص غزل گو کی قوتِ وجدان کو سجدہ ریز ہونا چاہئے، ورنہ دوسرے مقامات اس قوت کی سرلیں نہیں بلکہ قریب منزل ہیں جن سے بچے ہی میں فلاح ہے۔

لاشعور اس کے بعد آئیے ذرا لاشعور کا تجزیہ کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ غزل گو پر اس قوت کا کتنا اثر ہوتا ہے کس طرح کا اثر ہوتا ہے۔ اور کیا ہو ناچاہئے۔

فرائڈ اور دوسرے علمائے نفسیات کے نزدیک ہمارے دماغ کے تین خانے ہیں پہلا شعور، دوسرا لاشعور، تیسرا تحت الشعور۔ اس میں تحت الشعور کی حیثیت *No man's land* کی ہے۔ اہم رول شعور اور لاشعور ہی ادا کرتے ہیں۔ شعور کو میں نظر انداز کرتا ہوں۔ لاشعور کی طرف آتا ہوں۔ نفسیات دانوں میں سے اکثر اس پر متفق الرائے ہیں کہ لاشعور ہماری دنیائے خواب میں طرح طرح سے آتا ہے اس لئے کہ حالتِ بیداری میں اس پر شعور اور تحت الشعور کا بوجھ ہوتا ہے۔ اور وہ ابھر نہیں سکتا۔ البتہ خواب کی حالت میں جب ان دونوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑتی ہے تو لاشعور اسٹیج پر آتا ہے۔

اب چونکہ بات غزل کے سلسلہ میں ہو رہی ہے اور میں نے پچھلی سطروں میں یہ لکھا بھی ہے کہ غزل کا تعلق شعور سے زیادہ لاشعور سے ہوتا ہے اس لئے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ "حضرت جب لاشعور دنیائے خواب میں ظاہر ہوتا ہے تو کیا غزل گو اپنی غزلیں دنیائے خواب ہی میں کہتے ہیں"؟

اس سوال کے صحیح جواب کے لئے اگر آپ خود غزل گو ہیں تو اس پر سوچیے کہ آپ کس طرح اور کس حالت میں غزلیں کہتے ہیں۔ اور اگر آپ غزل گو نہیں ہیں تو اس کا قریبی مشاہدہ کیجئے۔ میں اس سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کو پیش کرنا چاہوں گا بلکہ میں نے دوسرے غزل گو شعراء سے جو تاثر لیا ہے وہ بھی درج کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں آپ کے سامنے اس ضمن میں ایک دوسری دلیل پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اگر ہم لاشعور کا گہری نظروں سے مطالعہ کریں تو ہمیں اس کا علم ہو سکتا ہے کہ لاشعور کی اہم خصوصیت اس کی بے ربطی اور عدم تسلسل کی صورت ہے۔ اسی طرح اگر ہم غزل کی خصوصیات معلوم کریں تو ہمیں اس کا علم ہو سکتا ہے کہ غزل کی اہم خصوصیت بے ربطی اور عدمِ تسلسل ہے۔ جس کا شکوہ کلیم صاحب نے کیا ہے اس لحاظ سے لاشعور کے اظہار کے لئے اگر کوئی صنفِ ادب موزوں ترین صنف ہو سکتی ہے۔ تو وہ غزل ہے۔ اب آئیے ذرا مشاہدات اور تجربات کی دنیائے حقیقت سے چند مثالیں بھی لیں۔

آپ جیسے ہی اچھے سے اچھے شاعر کو لیں آپ کو اس کی تصنیفات سے یہ علم ہو جائے گا کہ اس نے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ اپنے فکر و فلسفہ کی لڑی میں پرو دیا ہے اور اس نے شعوری طور پر ایک ایک لفظ رکھا ہے۔ اسی طرح آپ جتنے اچھے سے اچھے نظم گو کو لیں آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ اپنی نظم میں زیادہ سے زیادہ الفاظ شعوری لاتا ہے۔ بالخصوص ان کا موضوع اور مضمونِ تخلیق سوچا سمجھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر اس کے برعکس ایک غزل گو بالعموم مصرعہ ثانی کہنے کے بعد گنگناتا رہتا ہے۔ تاوقتیکہ مصرع اولیٰ ہاتھ لگ جائے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ مصرع ثانی نکلتے نکلتے چلے آتے ہیں اور مصرع اولیٰ کی

فکرِ غزل گو کے بعد میں رہتا ہے۔ میں آپ کے سامنے چند ایک واقعے پیش کرتا ہوں۔

ایک بار میں استادی نوح ناروی صاحب سے ملنے کی غرض سے ان کے پاس گیا ہوا تھا۔ علیک سلیک اور کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ فرمانے لگے: "میاں رمز میں نے سالاں طرح ... کی غزل کہنی شروع کر دی ہے اتنے اشعار ہوئے۔ ایک مصرع ایسا ہوا ہے جس پر کل سے اس وقت تک گرہ نہیں لگ سکی"۔ میں نے وہ مصرع پوچھا کہ استاد کون مصرع ہے۔ بولے ؎

قافلے والے نہیں معلوم کس منزل میں ہیں

دوسرے دن جب ان سے حسبِ معمول ملا تو انہوں نے علیک سلیک کے بعد ہی فرمایا دیکھو فلاں کام کر رہا تھا کہ یہ مصرع ایک دم سے میرے ذہن میں آیا۔ اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے مصرع سنایا ؎

گرد غائب نقش پا گم بند آواز جرس

اور پھر شعر پورا کیا ؎

گرد غائب نقش پا گم بند آوازِ جرس
قافلے والے نہیں معلوم کس منزل میں ہیں

اس وقت میں نے اس پر کچھ غور کیا مگر آج اس کی اہمیت، حقیقت اور خصوصیت میرے سامنے ہیں پھر یوں ہی ان سے ایک بات ہوئی تھی کہ انہوں نے فرمایا "تمہیں ایسا ایک واقعہ سناتا ہوں"۔ یہ واقعہ ہمارے موضوع سے غیر متعلق نہیں۔ نوح صاحب نے مجھ سے کہا کہ استاد ... کی وفات ... ایک سال بعد انہوں نے یہ خواب دیکھا کہ وہ (نوح صاحب) استاد داغ سے اپنی ایک غزل پر اصلاح لے رہے ہیں مگر آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ سب کچھ خواب تھا۔ اس کے ... اس غزل کے چند اشعار ان کے ذہن میں محفوظ رہ گئے۔ ... انہوں نے ... بیداری کا سب سے پہلا کام سمجھتے ہوئے نوٹ کر لیے۔ اس وقت وہ (استاد نوح صاحب) ان اشعار کو شمار کر سکے۔ اور یہ ہی ... یاد رہ گئے۔

میں جب یہ مقالہ لکھ رہا تھا تو میرے ... احمد صاحب ناظم حلقہ ... ڈاکٹر ... کا ایک واقعہ سنایا ... احمد صاحب کی نظر سے ڈاکٹر صاحب کے کسی مکتوب میں کہیں گذرا تھا۔ ... صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال نے عالمِ خواب میں مندرجہ ذیل شعر کہا اور پھر اس کے معنی ... سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے رہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

... کسی طاق میں ... پڑی ہے
حاکمِ اسکندر و چنگیز ... کو

اس سے ایک اور اہم ترین نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ کس طرح شعور کی زبان کا سمجھنا بہت ہی مشکل ہے اور ہوتا ہے اسی طرح جس غزل میں جس حد تک لاشعور کا دخل ہو گا اس غزل کا سمجھنا اتنا ہی دشوار ہو گا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس غزل گو کی تخلیق میں جس تناسب سے لاشعور کام کر رہا ہو گا اسی اعتبار سے اس غزل گو کا سمجھنا مشکل ہو گا۔ اسی لئے غالب کے اشعار (غزل کے) کی تشریح و توضیح میں نجود دہلوی سے لے کر عبدالرحمٰن بجنوری (اور ان کے بعد بھی) طرح طرح کی موشگافیاں ملتی ہیں۔

آپ نے یہاں تک کی تحریر سے اس کا اندازہ ضرور لگا لیا ہو گا کہ لاشعور کا ہنر کتنا اور کس طرح کا ہوتا ہے۔ مگر اس سے تو یہ نتیجہ بھی لوگ نکال سکتے ہیں کہ میں شاید صنفِ غزل کو بس اب یا تب حرام قرار دینے والا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر میں اس مقالہ کو یہیں ختم کر دوں تو اس کا نتیجہ یہی کچھ ہو سکتا ہے مگر اس کے علاوہ کسی ایک حقیقت ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ شعور لاشعور کا خادم نہیں بلکہ لاشعور کا غلام ہے۔ انسان ہی وہ وجود احسن یا تخلیق احسن ہے جو اپنی زندگی کو کسی ایک نظریہ اور نظامِ زندگی کے مطابق ڈھالتا ہے اور اسی کے مطابق چلاتا ہے اس لئے اس کا یہ فعل ہرگز لاشعوری نہیں ہو سکتا بلکہ انسان اس مقصدِ زندگی کے حصول کے لئے اپنے لاشعور کو شعور کا تابع بناتا ہے۔ تاکہ ظاہر و باطن اور قول و عمل بہ الفاظِ دیگر پوری زندگی میں یک رنگی ہو۔ جس طرح زندگی کی تربیت، اصلاح، سدھار اور سنوار میں شعوری قوت کا غالب ہونا نہ صرف ضروری بلکہ مقدم ہے۔ اسی طرح ادب میں بحیثیت مجموعی (جو زندگی کا ترجمان اور مفسر ہوتا ہے) شعور کی قوت کا غالب ہونا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ غزل ادب کے دائرہ سے باہر نہیں اس لئے غزل اس اصول سے بھی مستثنیٰ نہیں کی جا سکتی۔

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم لاشعور کی خوبیاں ... داخلی تحصیت وجدان اور لاشعور کے تحت کہتے رہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم داخلی تحصیت میں یک رنگی، وجدان میں ایک قوت یا قوت ... ایک فطری نظامِ زندگی مل سکتا ہے) ... لاشعور کے بجائے شعور ... تاکہ ہماری غزلیں زیادہ سے زیادہ ہماری زندگی کی ترجمان ثابت ہوں۔

... عملاً اگر ہم اپنے سرمایۂ ماضی کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی غزلوں کا جائزہ لیں تو ہم ... مندرجہ ذیل نتیجوں پر پہنچ سکتے ہیں۔

(۱) اردو ادب کی ابتداء سے لے کر داغ تک جو سرمایۂ غزل ملتا ہے اس پر لاشعوریت کا غلبہ ہے۔ اس کے ثبوت میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان شعراء کے پاس زندگی کا کوئی نظریاتی **Ideological** تصور نہ تھا بلکہ زندگی کا ایک تخیلی تصور تھا جو ان کی تخلیق کے

پس پشت کام کر رہا تھا۔ اسی طرح آج بھی جگر صاحب، نوح صاحب اور اس طرح کے دوسرے شعراء کا کام جس ڈگر پر چل رہے ہیں وہ انھیں قدماء کی ہے۔ جہاں زندگی ایک بے روح موت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس مورتی کی تراش خراش بے پناہ جاذب۔ شاید حالی نے زندگی کے اس جامد اور غیر متحرک پہلو سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا ؎

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالی نے غزل کی پہنائیوں کو وسعت دی مگر داخلی شخصیت خارجی شخصیت سے مغلوب ہو گئی اور حالی کو کہنا پڑا ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اقبال نے مینائے غزل میں نئی شراب ڈھالی مگر ان میں شعور و لاشعور کی کشمکش جس کی طرف میں اشارہ بھی کر چکا ہوں عمر عزیز کے ایک طویل حصّہ تک جاری رہی اس لئے بیشتر سرمایۂ غزل بھی اس سے خالی نہیں۔ پھر بھی اقبال کی قدر و قیمت ایک سنگ میل کی ہے۔ جہاں سے غزل میں نئی سمت سفر پیدا ہوتی ہے۔

(۲) اقبال کے بعد غزل گو شعراء میں ایک مقصدی گروہ نظر آتا ہے جو خود کو "ترقی پسند" کہتا ہے لوگ کبھی کبھی اس کو "اشتراکی" کہتے ہیں مگر یہ اشتراکی ترقی پسند گروہ، خیر اس گروہ نے شعور و لاشعور کی کشمکش کو بھی ختم کیا۔ داخلی اور خارجی شخصیت میں بھی قدرے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس گروہ میں جتنے بھی غزل گو شعراء پائے جاتے ہیں ان کی قوت وجدان نے ایک خطرناک ٹھوکر کھائی۔ ٹھوکر اس لحاظ سے کھائی کہ زندگی کے جس نظریے کو یہ اپنی غزلوں میں سمو رہے ہیں وہ نظریۂ ایک فرد کی نجی فکری آنچ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے جس کا لازمائی نتیجہ دیکھا جا رہا ہے کہ زندگی یک رخی ہو گئی ہے۔ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں توازن نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کے برعکس "معاشی عوامل" کا عنصر ان کی زندگی کا مرکز و محور نظر آتا ہے۔ زندگی کے اسی یک رخے پن نے شعوری قوت کو محدود کر دیا ہے۔ جس کے سبب غزل کی وسعت اسی طرح معاشی عوامل کے اردگرد محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح متاخرین کے یہاں غزل کی وسعت "وصل و ہجر" تک محدود ہو گئی تھی۔ آئیے چند مثالیں بھی دیکھ لیں ؎

کچھ کہہ چکے ہیں بانوئے محمل نشیں کو ہم
ہر کنیز آبلہ پا تم بھی کچھ کہو (ساغر نظامی؟)

یہ شعر مقصدیت کے اعتبار سے مارکسی ہے۔ اس میں شاعر نے بڑے سلیقہ سے طبقہ واریت کو پیش کیا ہے۔ ایک نظر آپ خط کشیدہ ٹکڑوں پر ڈالیں آپ کو اس کا احساس ہوگا کہ شاعر کیا کہہ گیا ہے۔ اس شعر میں نہ صرف یہ کہ رنگِ تغزل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ شعور و لاشعور کی ہم آہنگی کی بھی یہ ایک مثال ہے، مگر بات وہی ہے کہ بنیادی طور پر جس فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے وہ قوت وجدان کی اس ٹھوکر کا نتیجہ ہے جو انسان ایک دوسرے انسان کے "روکنا" بن جانے سے کھاتا ہے۔ مگر ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو ؎

کیوں کوئی "لال کتاب" بول اٹھے
ہر قصور آپ ہمارا سمجھیں (شاد عارفی)

یہاں شاعر نے بالکل کھل کر بات کرنی چاہی ہے۔ اور طنز ہی طنز میں ایک پورے نظام "لال کتاب" کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی ایک بنیاد پہلے شعر میں ملتی ہے۔ مگر بات وہی ہے کہ انسان اپنا خود ساختہ قدروں کو اپنائے یا اس کو جس کی طرف یہ پورا نظام فطرت اشارہ کر رہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر غزل گو "آستانوں" پر جبہ سائی کرے یا کسی ایک آستانہ ———— ——— ور اس کے بے شمار ساقی ہوں یا "ایک ساقی"؟

(۳) درحقیقت یہی ایک خلش تھی جس نے ایک "فطری نظام زندگی" کے جیسا، کی طرف مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کو اکسایا۔ ان کی تاریخ بیان کرنے کا یہ کوئی مقام نہیں، نہ ہی ان کے اس "فطری نظام زندگی" پر کچھ کہنے کا یہ موقع ہے۔ بلکہ اب یہ نظام "حقیقت منتظر" کے بجائے "حقیقت" سرگرم عمل ہے۔ اور اس میں ادباء اور شعراء اپنا اپنا حصّہ ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہر نئے انقلاب کے ماننے والے شعراء زندگی کی فطری قدروں کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں جو ماضی، حال اور مستقبل کی زنجیروں سے آزاد ہیں۔ اور غزل کا یہی مزاج بھی ہے کہ وہ اس طرح کے زمان و مکاں کی قیود، سرخ و سپید کے بندھن اور دھن دولت کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔ وہ ان تمام چھوٹے بڑے خداؤں کی خدائی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے جو کار اٹھتی ہے ؎

یہی اک سبق دیا ہے مجھے مسلکِ فنا نے
کہ میں حال کو حال سمجھوں جو ترا کہا نہ مانے (حفیظ؟)

اس میں تنقید زمیہ تھی اسے شعور نے کس طرح اپنے لاشعور پر قابو حاصل

جاتی ہے پر کھنے کی چیز ہے پھر اس وسعت اصول حیات کو کس طرح پیمانۂ غزل میں ڈھالتا ہے۔ یہ بھی معمولی چیز نہیں۔ حفیظ کے اس شعر کے علاوہ ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

چاہے کتنا ہی وہ محبوب تھا، کتنا ہی عزیز
تم خفا جس سے ہوئے اس سے خفا ہیں ہم بھی

اس میں صرف یہ کہ شاعر نے کسی ایک "کی ایمائیت کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ اس نے اس ایمائیت سے پیدا ہونے والے نتائج کو بھی اسی میں سمو دیا ہے۔ "اس کو" اپنا بنا لینے کے بعد معلوم نہیں کتنے اپنے غیر ہو جاتے ہیں اور کتنے غیر اپنوں سے بڑھکر پھر اس میں "اس کی رضا" کا جو پہلو پایا جاتا ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے ہم ان "انقلاب نو" کے غزل خوانوں کی تخلیقات سے اس طرح کی ہزار مثالیں پیش کر سکتے ہیں مگر مثالوں سے صفحے پر کرنا یہاں مقصود نہیں یہاں تو ایک خط فکر پیش کرنا ہے۔

البتہ اس "انقلاب نو" کے غزل خوانوں کی تخلیقات میں (ان کی غزلوں میں) ایک دوسری خصوصیت (اس وسعت داماں کے علاوہ) جو پائی جاتی ہے وہ یہ کہ ان کی غزل کا ہر شعر اپنے ماقبل اور مابعد کے اشعار سے روح نظریہ کے اعتبار سے ہم رشتہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح لیبنز Leibnitz نے اپنے مونادز Monads کے بارے میں کہا۔ غزل میں یہ وحدت تاثر، فکر، اور فلسفہ، یہ تنظیم، ترتیب اور تعکیس فی الحقیقت اس روح نظریہ زندگی کا فیضان ——— ہے بلکہ لازمی نتیجہ ہے جو خود اپنے اندر وحدت تنظیم ترتیب اور قوت تعکیس رکھتا ہے۔ ترقی پسند ——— یا استثنا کی غزل گو شعرا میں ——— وحدت تاثر تو ملتا ہے (وہ بھی کامیاب غزل گو شعرا کے یہاں) ورنہ دوسری چیزیں مفقود یا نہ ہونے کے برابر اس لئے کہ زندگی کے معاشی حصہ میں مارکس کا حل جنسی حصہ میں فرائڈ کا نسخہ عمرانی شعبہ میں کامتے اور ڈارون وغیرہ پھر وحدت نظریہ پیدا ہو تو کیوں اور کیسے۔ اس کی توقع ایک خیال خام کے علاوہ اور کچھ نہیں اس لئے غزل پر بے ربطی، عدم تنظیم، بیزم نوط ہونے کا الزام لگانا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ خود زندگی میں انتشار، اختلال، بدنظمی اور بے ربطی ہو۔ اور خود زندگی کے پاس ایک کوئی نظریہ نہ ہو جو اس میں وحدت زندگی پیدا کر سکے، ورنہ اس پر ہر اعتراض مہمل اور بے معنی ہے۔

البتہ میں اب بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس اعتبار سے غزل تمام اصناف شاعری میں ایک مشکل ترین صنف شاعری ہے۔ اس لئے کہ غزل کہنے کے لئے غزل گو کو صرف اپنی داخلی شخصیت پر قابو ہونا چاہئے بلکہ اس کی داخلی اور خارجی شخصیت کو یکساں ہونا چاہئے۔ اور اگر کہیں سے بھی بیْنَ ذالِکَ کے آثار نظر آئے تو شعور و لاشعور کی دوئی نمایاں ہو کر رہے گی۔ اسی طرح غزل گو کے لئے اس قوت وجدان کی ضرورت ہے جو حقیقت کی گہرائیوں میں اسے صحیح سلامت اتار سکے اور اسے باخبر واپس بھی لائے اسے اس گنگناہٹ کی ضرورت نہیں جو آرام کرسی پر دراز ہوتے ہی ذہن و فکر پر مسلط ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بلکہ اسے اس بے خبری کی بھی ضرورت نہیں جو کہ ہوش سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

یوں ہی اسے ایک ایسے شعور کی ضرورت ہے جو اسے زندگی کی "سیدھی ڈگر" پر (اور اس کی طرف) اس کی رہنمائی اور رہبری کر سکے۔ اگر اس کے اندر یہ قوت نہیں تو پھر اس کا نتیجہ لازماً ناکامی ہوگا۔

اب اگر میں اپنے ما فی الضمیر کو کسی حد تک ادا کر سکا ہوں تو پھر "انقلاب نو" کے غزل خوانوں سے میں عرض کروں گا کہ جس وقت وہ اپنی اپنی غزلوں میں ان قوت محرکات کو سمونے کی کوشش کریں گے اس وقت ممکن ہے کہ غالبی "ساغر و مینا" کام نہ دیں اس وقت انہیں اپنے کارخانۂ فکر کے تیار شدہ "شیشہ و ساغر" پیش کرنے ہیں۔ یہ مقام کم ہمت کا ہے اور زیادہ کٹھن بھی ہیں لیکن جہاں غالبی "ساغر و مینا" کام آتے ہیں وہاں ان میں سے "پرانی شراب" کو باہر ڈھالتے ہوئے "نئی شراب" بھرنی ہوگی اور یہ کام میرے نزدیک ذرا کٹھن اور ہمت طلب ہے۔ یہ ایک دوسری بحث ہے کہ ہم "پرانے ساغر و مینا" پر کس حد تک بھروسہ کر سکتے ہیں کون ہمارے مصرف کے ہیں اور کون نہیں، یہاں ان سے قطع نظر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ غزل کو وہ کون سی قوت محرکات ہیں جو غزل میں "اس انقلاب نو" کی روح پھونک سکتی ہیں۔ جسے ہم نے اپنے لئے اور عام انسانیت کے لئے یکساں طور پر فطری اور ضروری سمجھا ہے۔ میں نے ان کا تذکرہ کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اور خود غزل گو حضرات کی تعداد میں ماشاء اللہ روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر معیاری غزل چند ایک کے علاوہ ناقابل اطمینان ہے۔ بلکہ اکثر ایک پوری غزل پڑھ لینے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کی منزل کیا ہے البتہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

سید مستفیض الحسن، ایم۔ اے

اسلوبِ بیان

کسی ادیب کی ذہنی ترقی کا پتہ اُس کی قوتِ بیانیہ اور اسلوبِ تحریر سے چلتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کا صحیح تجزیہ کر کے حسنِ بیان کے رشتے میں پرو سکتا ہے مبہم احساسات کو اپنی قوتِ ممیزہ سے واضح شکلوں میں پیش کر سکتا ہے اُس کے الفاظ اُس کے خیالات کی کما حقہٗ ترجمانی کر سکتے ہیں۔ اُس کے جذبات کی شدت یا اُس کے احساس کی نزاکت اُس کے بیان سے منعکس ہے۔ تو وہ ایک کامیاب ادیب ہے ورنہ ابھی اُس کو کثرتِ مشق کی ضرورت ہے۔ اچھے اسلوبِ تحریر سے ادیب کے ذہن کے سلجھے ہوئے اور تربیت یافتہ ہونے کا پتہ چلتا ہے اور بے ڈھنگے طرزِ بیان سے ادیب کے منتشر خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اچھا اسلوب ادیب کو نہ صرف اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں معاونت کرتا ہے، بلکہ یہ بات بھی بڑی حد تک طرزِ ادا ہی پر منحصر ہے کہ ادیب اپنا نقطۂ نظر کس حد تک قاری کے ذہن نشین کرا سکا ہے۔

نثر ہو یا نظم دونوں اصناف ادب میں اسلوبِ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سلسلے میں کسی ایک صنف کو دوسرے پر فوقیت دینا درست نہیں۔ دونوں ہی اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں۔ اگر ان میں کوئی تمیز و حد امتیاز ہے تو وہ خالص ٹیکنیکی (Technical) ہے یعنی نظم مترنم الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ نثر میں یہ بات نہیں ہوتی ہے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ ٹیکنیک بھی جس کا ذکر ہوا اسلوبِ بیان ہی کا نام ہے۔ شعر عالمِ تخیئل سے متعلق ہوتا ہے، اس لئے اس کا اسلوب نازک ہوتا ہے۔ نثر واقعاتی اُمور کی نگارش کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے اس کا اسلوب سادہ، صاف، واضح اور سلجھا ہوا ہونا چاہئے۔ لیکن یہ اعتبار بھی اصطلاحی ہے اور یہ حد بندی قطعی صحیح نہیں۔ بعض اوقات نثر بھی لطیف ہو جاتی ہے اور اس میں شعری نزاکتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات نظم بھی اصطلاحاً تو نثر ہوتی ہے اس میں واقعاتی اُمور بیان کئے جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلوبِ بیان بیشتر اس امر پر کہ ادیب نے اظہارِ خیال کے لئے کس قسم کے پیرائے کو منتخب کیا ہے نیز ادیب کے ذہنی جھکاؤ (Inclination of mind) پر منحصر ہے۔ اس کے لئے کوئی نپے تُلے قوانین وضع کرنا اصولاً صحیح نہیں۔ خیال (Idea) ذریعۂ خیال (Medium of Expression)

اور اسلوبِ بیان (style) ادیب کی اپنی شخصیت کے تین پرتو ہوتے ہیں۔ یہ محال ہے کہ ادیب اپنی شخصیت کو اپنی ادبی تخلیق میں جھلکنے سے روک دے۔ ادیب تو کیا مورخ یا سائنس داں کے لئے بھی یہ ممکن نہیں۔ یہ کچھ ضروری سا ہے کہ ادیب کا اپنا نقطۂ نظر (شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر) اُس کی تخلیق میں رنگ آمیزی کرتا ہے، یہی بات اسلوبِ بیان کے بارے میں بھی درست ہے۔ ادیب کا نقطۂ نظر قطعی طور پر خارجی (Objective) ہونا تقریباً ناممکن ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کی خشک بحثوں میں بھی مصنف کی شخصیت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح ادب ادیب کے اپنے احساسات اور خیالات کی جلوہ کاری ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلوبِ بیان بھی ادیب کی شخصیت سے جِلا پاتا ہے۔ مکمل طور پر objective ہو جانا ادیب کے بس کی بات نہیں۔

ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا اور وہ ادب جس کو اُس نے جنم دیا ہے، اُس کے زمانے کے ہزاروں ذہنوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کیونکہ ادیب کے خیالات بھی اُس کے ماحول کی پیداوار (بڑی حد تک) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُس کا اسلوبِ بیان اُس زمانے کی لسانی تحریکوں سے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے اسلوب کے پرکھنے کا معیار یہ ہوگا کہ عصری رجحانات کے مطابق وہ محل و مقام کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرے (Proper words in proper places) اس کا الفاظ کا شعور جس درجہ بیدار ہوگا اُتنا ہی اُس کا طرزِ بیان موثر، جدید، اور نکھرا ہوا ہوگا۔ ادیب کن الفاظ کو پسند کرتا ہے؟ وہ کن ترکیبوں سے گریز کرتا ہے؟ اُس کے الفاظ اُس کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ اُس کے مضمون کی نزاکت یا شان و شکوہ اُس کے منتخب کردہ الفاظ سے نمایاں ہے یا نہیں؟ یہ ہیں وہ معیار جو اُس کے اسٹائل پر فیصلہ کرنے میں معاون ہوں گے۔

ادیب کے ذہن میں رد و قبول کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اُس کی نگارشات کے لئے کیسا لفظی ماحول Atmosphere مناسب ہوگا تاکہ وہ اپنے خیالوں کو پوری پوری رعنائیوں کے ساتھ رقم کر دے۔

یوں کی اِن کوششوں سے ہی زبانیں بنتی ہیں۔ الفاظ بنتے ہیں اور اُن کے معانی ساتھ کچھ مخصوص باتیں منسلک ہو جاتی ہیں۔ ادیب زبان کی رُوح کو سمجھتا ہے اور اُس کو اپنے اسلوب سے صیقل کرتا ہے تاکہ وہ بدلتے ہوئے خیالات کی صحیح صحیح عکاسی کر سکے۔ زبانوں کی تاریخ دیکھئے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان بہت سی منازل ارتقاء سے گزرتی ہے۔ کچھ الفاظ ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ کچھ نئے نئے الفاظ زبان میں شامل ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے الفاظ کے مفہوم میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئی اصطلاحیں بنتی ہیں۔ اُردو زبان ایک انتخابی مرحلہ (Process of Electicism) سے گزرتی ہے۔ یقیناً اِس کو تمام کچھ کر شستہ اور سلیس بنا رہی ہے۔ اور وہ دقیق اور مشکل مضامین کے اظہار کا ذریعہ بننے کے لائق ہو جاتی ہے۔ رد و قبول کے ان مراحل میں ادیب اس جستجو میں رہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ (Suggestive) الفاظ کو اپنائے تاکہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب حُسن و خوبی کے ساتھ سمو دے، تاکہ قاری اُس کے فن پارہ کو پڑھنے سے اُکتائے بھی نہیں اور ادیب کے نقطۂ نظر اور مقصد سے بھی متفق ہو جائے۔ اور اگر متفق نہ ہو تو کم سے کم واقفیت ہی حاصل کرے۔

ظاہر ہے کہ ادیب کا نقطۂ نظر اور اس کا مقصد بھی اس کے اسلوبِ بیان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ادیب کے مقاصد بلند رہیں (اور رہنے چاہئیں کیونکہ ادب حقائق ہی کی عکاسی کا نام ہے۔) تو اُس کا اسلوب سنجیدہ، نکھرا اور سلجھا ہوا ہونا ضروری ہے۔ وہ جس خیال کی عکاسی کر رہا ہے وہ صحیح طور سے پڑھنے والوں کو منتقل ہو جائے تاکہ حقِ محاکات ادا ہو جائے اور اُس کی تخلیق اُس خلوص، جوش اور شگفتگی کی امانت دار ہو جائے جس کی عکاسی وہ اس فن پارہ میں کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے ادیب کو جہاں ضروری عناصر کی حد بندی کرنی پڑتی ہے وہیں اس کو غیر ضروری عناصر کو احتیاط سے علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ عمل اُس کے اسلوب کی نفاست اور پاکیزگی کا ضامن ہوگا۔ شِلر نے ایک موقع پر کہا تھا

The artist may be known, rather by what he omits

گویا غیر ضروری تزئین (Surplusage) فن پارے کی فطری جاذبیت پر بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے اور اُس کے اثر کو کم کر دیتی ہے۔ اِس سے ادب کی مقصدیت فوت ہونے لگتی ہے۔ اِس لئے ادیب کی نظر ہمیشہ مقصد و منتہیٰ پر رہنی چاہئے۔ ادیب کو اپنے مقصد کے مطابق ہی اسلوب اختیار کرنا چاہئے۔ تاکہ اُس کی تخلیق سُوکھے چوبی اصولوں کی طرح بے جان اور بے رُوح بن کر نہ رہ جائے۔ اُس کی افادیت ختم نہ ہو جائے۔ اسلوبِ بیان کی تربیت میں ادیب کے ذہن کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے تاکہ قاری کو یہ محسوس ہو کہ حقیقت کی مٹھاس اُس کے لبوں کو چھو گئی ہے۔

ادیب کو یہ یاد رکھنا بڑا مفید ہوگا کہ کسی بات کو بہترین طریق پر ادا کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ اُس کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہئے کہ وہ اُسی طریق کو اختیار کرے چاہے اُسے کتنی بھی کاوش کرنی پڑے۔ اس ضمن میں مجھے فلابرٹ (Flaubert) کا قول یاد آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

"There is but one – one form, one mode – to express what I want to say"

جب تک اظہارِ مطلب کے لئے اتنی سعی نہ کی جائے کہ اُس سے بہتر طریقہ اظہار ممکن ہی نہ ہو تب تک ادیب اسلوب کی صحیح تربیت نہیں کر سکتا۔

اس طرح اسلوبِ بیان کا مسئلہ مختصراً یہ ہے کہ اظہارِ مطلب میں ادیب کی نظر مقصد سے نہ ہٹنے پائے۔ وہ اپنے مقصد کو ذہن نشین کرانے کے لئے مناسب صنفِ بیان اختیار کرے۔ موزوں اور Suggestive الفاظ استعمال کرے۔ شگفتہ، سلیس اور چُست فقرے ہوں۔ اور جُملے مربوط ہوں اور یہ مجموعہ ادیب کی حدِ بساط میں بہترین ہو۔ تاکہ مضمون کی رُوح اور قالب متحد ہو جائیں اور اُس کا قاری پر وہی اثر مرتب ہو جو فن کار کے ذہن پر فن پارہ کی تخلیق کے دوران میں ہوا تھا۔

محمد اکرم

جعفری کی "ترقی پسند ادب"

تمام دنیا کی اشتراکی تحریکیں اپنے پیغمبر ثانی لینن کے ان الفاظ پر کہ جس طبقہ کو آج لوٹا جا رہا ہے وہ جب اپنے دشمنوں کے خلاف جد و جہد کرے گا تو ایسی جد و جہد میں جھوٹ، فریب اور مکر کا استعمال ناگزیر ہوگا۔" آج بھی اسی شدت سے عمل پیرا ہیں جس شدت سے وہ انقلاب روس کے قبل تھیں۔ ناممکن تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارباب حل و عقد اس مقدس ہدایت کی پیروی نہ کرتے۔ شاید اسی وجہ سے اس ادبی تحریک کے رہنماؤں نے دورنگی کو حقائق بیانی پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ حتیٰ کہ جعفری جیسے سنجیدہ نقاد بھی اس کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے۔ خصوصاً اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں تو وہ "میکیا ولین ڈپلومیسی" کے اس رنگ میں بالکل رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انجمن کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ادبی تحریک دراصل سجاد ظہیر صاحب کی ادبی اور تحریکی سرگرمیوں کی پیداوار ہے۔ جو خود جعفری صاحب کے الفاظ میں ایک کمیونسٹ ہیں (۱۹۳۵ء میں) انہوں نے لندن کے نانکنگ ریسٹوران میں اس انجمن کی تشکیل کی اور وہیں سے انجمن کا ایک اعلان نامہ بھی شائع کیا۔ اس کے چند ہی ماہ بعد پیرس کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے کمیونسٹ ادیبوں نے شرکت کی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن کا پہلا جلسہ ہوا اور اس کے بعد ہی اردو ادب نے ایک نیا موڑ لیا۔ ایسا صرف اردو ادب ہی میں نہیں ہوا بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ادب کی ترقی پسند انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان سب کا مقصد وجود ایک تھا اور طریقہ کار بھی ایک۔ خصوصاً ہندوستان کی انجمن مشہور انگریزی اخبار "اسٹیٹس مین" کے نامہ نگار کے بقول کمیونسٹ انٹرنیشنل کی مدد اور منشا سے جاری کی گئی تھی اور اس کا مقصد اشتراکیت کی تبلیغ اور کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم تھا۔ مگر سردار کو اس سے انکار ہے۔ انھوں نے اسے ایک ناپاک سازش قرار دیا ہے جو ان کے اپنے الفاظ میں "قدامت پرستوں، برطانوی سامراج کے آلہ کاروں اور قوم اور ملک کی پستی، زبوں حالی اور جہالت کو بدستور قائم رکھنے والوں کی طرف سے اس لئے کی گئی تھی کہ ادب کی یہ نوزائیدہ تحریک تھی لیکن اسی کتاب میں دوسرے صفحات کے اظہار شدہ خیالات کے ذریعہ انھوں نے خود ہی اس تہمت

کہاوت "دروغ گو را حافظہ نباشد" کی تصدیق کرتی ہے۔ ایسے حرف اول ہی میں وہ لکھتے ہیں۔ "ان کا یعنی روسیوں کا کوئی شاعر مرزا ترسون زادہ بنکر یہاں آتا ہے۔ اور اپنی زبان میں ہندوستان پر ایک شاندار نظم لکھ جاتا ہے۔ جسے پڑھکر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی سیاسی سماجی اور تہذیبی جد و جہد میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ امریکہ کا ہاورڈ فاسٹ ہمارے لئے کہانیاں لکھ رہا ہے۔ حبشی موسیقار پال رابسن ہمارے لئے گیت گا رہا ہے۔ ترکی کی کسی جیل میں بیٹھا ہوا ناظم حکمت انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہونے والے کسی ہبرجی کے ساتھ اظہار ہمدردی کر رہا ہے"۔ مگر یہ کون لوگ ہیں۔ ہندوستان میں گرفتار ہونے والے کسی ہبرجی کے ساتھ ان کی ساری ہمدردیاں کیوں ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہے۔ اور ان کا نعرہ کیا ہے۔ مجروح سلطانپوری کے الفاظ میں (جن کی سردار نے بڑی تعریف کی ہے) وہ نعرہ یہ ہے۔

"لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی دیش ہمارا ہو کے رہے گا
روس کا کوہسار تو دیکھو دھرتی کا شرنگار تو دیکھو
ایک زمیں کیا لال ابھی ہر ایک ستارہ ہو کے رہے گا
اور جاں نثار اختر یہ راگ الاپتے ہیں
لال پھریرا اس دنیا میں لہرائیں آؤ

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے (یہ سب اسی کتاب سے لی گئی ہیں) کہ کمیونسٹ پارٹی اور انجمن نظریاتی اعتبار سے سو فیصدی متفق ہیں۔ مگر سردار کو اس سے انکار ہے اور وہ اس انکار کو ایک اور جھوٹ سے یوں نبھاتے ہیں "اس میں سجاد ظہیر جیسے کمیونسٹ بھی ہیں اور عباس جیسا نہرو پرست بھی"۔

یہ تو ممکن ہے کہ خواجہ احمد عباس پنڈت نہرو کی شخصیت سے متاثر ہوں۔ لیکن ہر وہ شخص جس نے عباس کو تھوڑا سا بھی پڑھا ہے۔ میری اس رائے سے اتفاق کرے گا کہ وہ نظریاتی اعتبار سے بالکل کمیونسٹ ہیں۔ ان کا افسانہ "کہتے ہیں جس کو عشق" (سویرا ۵۲ء) اور ان کی گفتگو "نقوش لاہور"

میں شائع ہوئی تھی۔ اس حقیقت پر دال ہے۔

اسی مخصوص انداز میں ایک بار ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی انجمن کی مدافعت (defend) کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس پر بروقت تنقید کی اور لکھا معاف کیجئے جناب کلمہ پڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں مسلمان نہ ہو۔ سب کچھ تو وہی کہتے جو کمیونسٹ کہتے ہیں مگر پھر کہہ دیا کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں" یہ اور بات ہے کہ عصمت اس وقت اتنی ڈپلومیٹ نہیں تھیں جتنی کہ ایک کمیونسٹ انجمن کی رکن کو ہونا چاہئے۔

اب رہا قیادت اور رہنمائی کا سوال تو حضرت فراق نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے چنانچہ انجمن کی کل ہند کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں فرمایا "صرف مزدوروں اور کسانوں کی مالا جپکر ادیب ادب میں زندگی پیدا نہیں کر سکتے کہیں جاکر اپنی جانب [illegible] احتیاط کرنی بھی پڑے گی۔ اگر آپ نے حسن پرکھیں امریکہ میں رنگ کے امتیاز پر کھیں۔ ازبقیہ میں [illegible] پرکھیں تو آپ کس کی طرف سے لکھیں گے۔ ظاہر ہے کمیونسٹوں کی طرف سے انجمن کی اس درجہ پالیسی کو دیکھکر جتنے کمیونسٹوں کا [illegible] طریقہ کار [illegible] آجا سے شروع کرتے ہیں وہ پہلے تو جمہوریت امن اور [illegible] قیادت [illegible] ان کے ہاتھ آجاتی ہے تو تمام غیر کمیونسٹ [illegible] چیلے ہیں۔ مثال کے لئے البانیہ ہی کو لیجئے [illegible] کے وقت اس ملک میں کمیونسٹ [illegible] پایا [illegible] تھے مگر تھے Diplomat [illegible] اشارے پر انھوں نے ایک [illegible] محاذ بنایا اور جب اقتدار کسی طرح ان کے ہاتھ آگیا تو تمام غیر کمیونسٹوں کو یا تو قتل کر ڈالا یا تنگدستی اور عسرت کی بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔

خود انجمن نے بھی اس [illegible] مسلک کو ہمیشہ ایک رکھا ہے۔ احمد علی سلام مچھلی شہری [illegible] ان کا نام لینا بھی جرم ہے لیکن [illegible] تحریک سے نکال دیا [illegible] مصلحت پسندی کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔

ممتاز شیریں بیاد وکے [illegible] لکھتی ہیں [illegible] نہیں لیکن [illegible] صاحب نے [illegible] سر لگا رکھا ہے [illegible] اتنا تنگ [illegible] جو کمیونسٹ آئیڈیالوجی کے پرچار میں مدد [illegible] رسالہ میں ایک صاحب نے انجمن کے ارباب [illegible] وعدہ یاد بھی [illegible]

سلام مچھلی شہری نے خوشتر گرامی کو لکھے گئے ایک خط میں ترقی پسندوں کی ذہنیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے۔

"کمیونسٹ نہیں ہوں اس لئے جاہل ہوں۔ ترقی پسند نہیں ہوں اسلئے فنکار نہیں ہوں" ادب اور پروپیگنڈے پر لکھتے ہوئے سردار نے روس کی ہلکی سی تعریف بھی کی ہے۔ چنانچہ سامرسٹ نام کے ایک کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نوجوان ہندوستان آنے کے بجائے سوویٹ روس چلا جاتا اور اس کی ملاقات لینن یا گورکی سے ہو جاتی۔ اور وہاں زندگی کا انقلابی گیان حاصل کرکے انسانوں کی بستی میں ان کی زندگی کو خوبصورت اور خوشگوار بنانے کی جدوجہد کرتا۔ کیا اس صورت میں ادب اور فن کا وہ شاہکار پروپیگنڈہ سا جاتا۔

وہ تو خیر خیالی دنیا کی ایک بات تھی لیکن حقائق کی دنیا میں ایک بار عزیز احمد نے بھی کیا تھا بلکہ اس نے تو یہ سفر جیسا کہ اس نے خود بھی لکھا ہے اسی انقلابی گیان کو حاصل کرنے ہی کے لئے کیا تھا اس نے وہاں کیا دیکھا یہ بڑی دلچسپ داستان ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

میرے سفر کے دوران میں مجھے ولیشود کے ماڈل ٹاؤن کی سیر کرائی گئی جو دنیا میں اپنی قسم کا واحد شہر ہے۔ تمام آبادی [illegible] مجرموں پر مشتمل تھی [illegible] بسائے گئے تھے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ مجرموں کے اقتصادی ماحول کی اصلاح کرنے سے ان کی جرائم پیشہ ذہنیت کی کہاں تک اصلاح ہو سکتی ہے چنانچہ میں نے دیکھا کہ بہت سے شہری حکومت کی مہربانی اور نگہداشت کی وجہ سے بڑے اچھے شہری بن گئے ہیں جب میں نے پہلے پہل شہر کو دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ سوویٹ روس کا یہ کارنامہ نہ صرف شاندار بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی قابل قدر تھا لیکن تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس بستی میں صرف [illegible] بسائے گئے تھے جنہوں نے اپنے قیدی بھائیوں کی مخبری کی تھی [illegible] نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کی مخبری کی گئی تھی انہیں یا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا [illegible] جنگلوں میں جلاوطن کر [illegible] اور ان لوگوں کو حکومت [illegible] راحتوں اور انعام سے نوازا گیا [illegible] اسی شہر میں بسایا گیا۔ [illegible] انسانی اخلاق خود غرضی کی وجہ سے [illegible] تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اسی [illegible] کے اس انکشاف کے بعد [illegible] نکال دیا گیا۔ اور اسی دن سے تمام دنیا کے کمیونسٹ ملاؤں نے اسے غدار [illegible] دیا اور اسی قسم کی دوسری گالیوں سے نوازنا شروع کیا [illegible]

یہ گالی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ژید ایک فسطائی تھا کیونکہ اس نے جرمنی کے ساتھ ایسے وقت میں تعاون کیا جب نازی اس کے وطن فرانس کو غلام بنا کر فرانسیسی عوام کے خون کی ندیاں بہا رہے تھے۔" یہاں سردار کا ایک اور جھوٹ عیاں ہوتا ہے کیونکہ اگر ژید نے فرانسیسی قوم کے ساتھ واقعی غداری کی تو اسے جنگ کے اختتام کے فوراً ہی بعد کیوں نہ پارٹی سے نکال دیا گیا۔

اور اگر سردار کا یہ الزام مان بھی لیا جائے تو بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ان لوگوں کو یہ اعتراض کرنے کا کیا حق ہے جنہوں نے خود بھی وطن سے ایسی ہی غداری کی ہے اور جنگِ آزادی میں بیرونی استعماری طاقتوں کا ساتھ دیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب ہندوستانی جنتا خصوصاً طلباء "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کر رہے تھے تو یہی ترقی پسند فن کار عوامی طاقتوں کا ساتھ چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو رہے تھے (مثلاً فیض) یہی ہیں گاؤں گاؤں گھوم کر انگریزوں کی حمایت کا پروپیگنڈا بھی کر رہے تھے۔ بات صرف ایک آندرے ژید کی نہیں بلکہ آج ہر اس دانشور کو جو سوویٹ سامراجیت کا آلۂ کار بننے سے انکار کرتا ہے ہر وقت خدشہ رہتا ہے کہ بیسویں صدی کے یہ ترقی پسند "اس ضرب المثل ملا" کے مانند جو اپنے مخالف کو فوراً ہی کفر کا فتویٰ دیدیتا ہے اسے بھی فسطائی ہونے کا فتویٰ نہ دیدیں۔ چنانچہ مشہور ترقی پسند ادیب کامریڈ عادل رشید اور اختر حسین رائپوری (جس وقت وہ ترقی پسند تھے) اقبال پر فسطائی ہونے کا الزام لگایا۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ ان کی بیشتر تحریریں اسلامی نظام کی تشکیلِ نو اور قرآنی دستور کو واضح کرنے میں ممد ہیں۔

قرآنی نظام ——— جو سوویٹ انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ میں "مذہبی [illegible] ناجائز لوٹ کھسوٹ اور جاگیردارانہ معاشرت میں عدم مساوات کو لامحالہ طور پر حق بجانب قرار دیتا ہے۔"

اپنے حرفِ اول کے بعد سردار نے انجمن کا اعلان نامہ بھی شائع کیا ہے جس میں کہا ہے کہ ادیبوں کا فرض ہے کہ ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مارکسزم جو ترقی پسندوں کا مستعمل رہا ہے۔ اس زمانے کا ایک سائنسی نظریہ ہے۔ سائنسداں اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ مارکسزم کی بنیاد نیوٹن کے نظریہ عمل اور ردِ عمل پر ہے جس کی آئن سٹائن نے نظریہ اضافی کے ذریعے دھجیاں اڑا دیں۔ ہر [illegible] طرح نظریہ اضافت کے شائع ہو جانے کے بعد مارکس کا جدلیاتی [illegible] بالکل بے سود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سابق کمیونسٹ رکن ژید اور ٹلے [illegible] ہے جب تک [illegible] روس میں رہے [illegible] کی تمام لائبریریوں میں آئن سٹائن کی کتابیں ممنوع تھیں۔

بدقسمتی سے ترقی پسندوں نے خدا اور مذہب کو عقلیت پسندی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا سمجھا۔ احتشام حسین اپنے مضمون "سجاد ظہیر بہ حیثیت ادیب" میں لکھتے ہیں "ہندوستان کی مذہب پرستی سے گھبرا کر سجاد ظہیر نے یہ رائے قائم کی کہ جب تک لوگ مذہب سے بیزار نہ ہوں گے ان کے قدم ترقی کی جانب نہ اٹھ سکیں گے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل سے زیادہ جذبات سے کام لیا۔" غرض عقلیت پرستی کے نام پر اس ادبی تحریک نے اپنی تشکیل کے فوراً ہی بعد سب سے زیادہ غیر عقلی نظریہ کو سب سے زیادہ غیر عقلی طریقہ پر (یعنی دلیل کے بجائے جذبات ابھار کر) کامیاب بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ چونکہ الحاد انجمن کے اربابِ حل و عقد کا بنیادی عقیدہ ہے اس لئے قدرتی طور پر اس کے ادبی سرمایہ کا بڑا حصہ ان تخلیقات پر مشتمل ہے۔ جن میں خدا کا یا تو انکار کیا گیا ہے یا خدا کا مذاق اڑایا گیا ہے مثلاً سلام مچھلی شہری (جب وہ ترقی پسند تھے) کا یہ شعر

مجھے دیوتاؤں اوتاروں اور خداؤں کے قصوں سے نہ بہلاؤ
میں شاعر ہو گیا ہوں ——— اشتراکی شاعر

یا اختر الایمان کا یہ شعر

اگر پہچانتا ہوں یہ بھی اس کی رحمت و جود و سخاوت ہے
اسی نے دی لئیم شہر کو دارائی اور ملکیت مجھے بخشی
اسی نے بادہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
اسی نے ہر دو کاروں کو توانگر کر دیا دریوزہ گر مجھ کو

اس پر ظ انصاری کا یہ نوٹ "شبلی نے تصوف کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب آدمی پر مصیبت پڑتی ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے۔ لیکن اختر الایمان کے یہاں خدا اس وجہ سے نہیں آیا بلکہ طنز کو تیکھا کرنے کے لئے قادرِ مطلق کا استعمال کیا گیا ہے۔" حالانکہ تمام عصری سائنسدان [illegible] اس بات پر کامل اتفاق رکھتے ہیں کہ کائنات کی سب سے نمایاں حقیقت ہستی باری تعالیٰ کا وجود ہے۔ مثلاً سر آرتھر کیتھ اپنی کتاب "My Belief" (میرا عقیدہ) میں لکھتے ہیں۔

yet it (human brain) perceives how well ordered all things are and how beautiful are the inventions of nature. Design is manifested

every where Whether you are layman or scientist we must postulate a law of universe.

اور آئن سٹائن ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

Our religious insight is the source and guide of our scientific insight.

اور پروفیسر جوڈ کہتے ہیں۔

Science and religion now pointed to the same kind of universe and taught almost by different methods the same truths

اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے پاکستان سائنس کانفرنس منعقدہ ۵ فروری ۵۴ء کو خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا۔

One who does not believe in God is either half educated or not educated

سردار ایک حقیقت نگار نقاد ہیں مگر بعض جگہ مارکس نے ان میں تعصب اور بیجا جانب داری پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے جوش کی مدح سرائی کا ایک نیا ریکارڈ قایم کیا ہے کیونکہ ان کے الفاظ میں اُن کا (یعنی جوش کا) زاویہ نظر اس اعتبار سے بنا ہے کہ وہ مذہبی وہم پرستی کی مخالفت کا ایک حصہ ہے۔ نیاز فتحپوری اپنی محض عقلی غیر حقیقی اور رومانوی افسانہ نگاری کے باوجود اس لئے سراہے جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مضامین اور رسالہ نگار کے ذریعہ الحاد کی تبلیغ کی ہے اور رسالت وحی الہام پر پھبتیاں کسی ہیں اور اس طرح ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے پہلے اس کے لئے زمین تیار کرنے میں مدد کی ہے۔ اقبال اپنے اعلیٰ خیالات۔ اچھوتا پن اور حسن کلام کے باوجود اسلئے تنقید کئے جاتے ہیں کہ ملائیت پر ان کی تنقید اسلامی نظام کی تشکیل نو کا ایک حصہ ہے۔ اور ٹالسٹائی اور پریم چندر کی خامی یہی ہے کہ انہوں نے معاشرہ کی اصلاح کے لئے انقلاب کے بجائے (غالباً خونیں انقلاب مراد ہے) بلند اخلاقی اور تزکیہ نفس کی تعلیم دی ہے۔

حالانکہ عصر حاضر کے تمام ماہرین عمرانیات متفق ہیں کہ افراد میں بلند اخلاقی اور ایثار کا جذبہ پیدا کئے بغیر حقیقی امن اور خوشحالی کا حصول ممکن نہیں۔ چنانچہ پروفیسر الڈوس ہکسلے لکھتے ہیں

Technological advance is rapid but without progress in charity (i.e morals) technological advance is useless

ڈاکٹر ایلکسس کیرل Alexis Carral اپنی کتاب "Man the Unknown" میں لکھتے ہیں۔

" Despite the marvels of scientific civilization human personality tends to dissolve robbers enjoy prosperity in peace, gangsters are protected by politicians and respected by judges. They are the heroes whom the children admire in cinema and imitate in games

اور مشہور عالم تاریخ داں آرنلڈ ٹائن بی لکھتا ہے۔

The great need of the world is rebirth of super-natural belief

سائنس کے انکشافات اور اس کے کمالات نے سردار کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں چنانچہ اس کتاب میں وہ سائنس سے حسن ظن رکھتے نظر آتے

اور سائنسی ادراک۔ سائنسی شعور اور سائنسی حقیقت لگا، یہ بھی مرغوب اصطلاحات کثرت سے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "یہ مسئلہ صرف سائنس حل کر سکتی ہے اور اس کا جواب صرف طبعی علوم ہی دے سکتے ہیں کہ شعور کیا ہے اور یہ کیسے پیدا ہوتا ہے" ان کا یہ انکشاف ممکن ہے بعض کامریڈوں کو عجوبہ نہ معلوم ہوتا ہے جو ان لوگوں کو جو سائنس کے ابجد سے بھی واقف ہیں یہ انکشاف حد درجہ عجیب چیز معلوم ہو سکتا ہے کیونکہ سائنس کا یہ مقصد ہے کہ وہ کائنات کی حقیقت [illegible] ہے۔ اس کے ذریعہ تو انسان صرف اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ کسی واقعہ یا [illegible] حرکت کے مستقبل قریب کے امکانات کو واقع ہونے سے پہلے بتا سکے۔ مثلاً ایک سائنسداں یہ تو بتا سکتا ہے کہ آج سے کئی سال بعد فلاں سیارہ کہاں اور کس [illegible] ت میں ہوگا لیکن وہ یہ بتانے سے بالکل قاصر ہے کہ اجرام فلکیہ در اصل ہیں کیا [illegible] کن عناصر سے مرکب ہیں۔ اسی حقیقت کا اظہار مشہور عالم سائنسداں آرتھر [illegible] ان الفاظ میں کرتا ہے۔ سائنس سائنس ہونے کی حیثیت سے کیوں کا سوال نہیں اٹھاتا [illegible] اپنا طریقہ استعمال کرنے سے قاصر ہے اور [illegible] سائنس اقدار کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی اور ایسے مسائل [illegible] ہے اور [illegible] ہے کہ سائنس کی [illegible] علم کا نام [illegible] سائنس علوم میں [illegible] مختلف صورتیں [illegible] ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف اور متضاد نتائج [illegible] ہیں مثلاً مادہ ہی کو لیجئے

[illegible] اس کے متعلق تین باہم مختلف [illegible] [illegible] بر آمد کی ہیں مثلاً کسی چیز کو جلتے دیکھ کر جو عام تاثر لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا وہ یہ تھا کہ چیزیں جل کر فنا ہو جاتی ہیں مگر ایک سائنسداں نے خوب طبعی [illegible] ایک موم بتی [illegible] وزن کیا [illegible] اور اسے [illegible] موم بتی کے جلنے سے جو گیس بنے وہ فضا میں [illegible] ملکہ [illegible] موم بتی کے جلنے کے بعد جب [illegible] اور اس میں بھی [illegible] انتظام کیا کہ باہر سے ہوا گیس [illegible] ہے [illegible] کر دیا ہے۔ اسی قدر [illegible] تھی جتنی موم بتی جلنے سے قبل [illegible] بتاتے ہو اکہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ دوسری حالتوں میں تبدیل [illegible] یہی انکشاف بعد میں Conservation of mass کے اصطلاحی نام سے موسوم ہوا لیکن ابھی [illegible] اور انہی [illegible] برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ایٹم الکٹرول [illegible] پروٹون [illegible] ہو جاتے ہیں اس طرح مادہ مستقل طور پر ایک [illegible] طریقہ سے طاقت یا توانائی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ جو غائب ہوتا

رہتا ہے یا کام میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

غرض مادہ کے الکٹرونی نظریئے سے عمل رد عمل کے لئے جو ٹھوس بنیاد سے اکھاڑ پھینکا۔ بس ظاہر ہوا کہ سائنسی نظریات کی حقیقت [illegible] گھروندوں سے زیادہ نہیں جو بعد میں ہو ہوائے تضاد نظریئے [illegible] ایک [illegible] کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ اور [illegible] ہوا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے [illegible] سائنس کی بنیاد پر شعور جیسی لطیف شے کی تحریر ممکن نہیں بلکہ [illegible] خودکشی کے مترادف ہوگا۔

اسی ایک طویل نظم [illegible] آدمی ہیں [illegible] اظہار کیا ہے اس پر سردار نے سخت تنقید کی ہے [illegible] ایک طرف تو وہ خدا و مذہب اور تقدیر کے قائل نہیں لیکن دوسری طرف وہ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان اپنے خیالات اور اپنے افعال و حرکات پر قادر نہیں اور جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے [illegible] ہوتا ہے۔

جو شیاں منانے پر بھی ہے مجبور آدمی
آنسو بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی
دنیا میں آنے پر بھی ہے مجبور آدمی
دنیا سے جانے پر بھی ہے مجبور آدمی
کیا پاتے آدمی کی کہو ان کچھ سے ہم نشیں
اس ناتواں کے قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں

وہ کہتے ہیں جوش کا یہ "فلسفہ جبریت" ترقی پسندی کا منافی ہے کیونکہ یہ فلسفہ آدمی کو مجبور محض بنا دیتا ہے۔

سردار نے مارکسزم اور [illegible] [illegible] کہ [illegible] ہے [illegible] نہیں کہ [illegible] فلسفہ جبریت ہوتی تو اپنا فلسفہ نہیں [illegible] ہوتے ہیں بہت قبل [illegible] انجلز نے اس نظریہ کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ لیکن اس میں [illegible] کے باوجود بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ [illegible] تاریخ کی تشکیل کرتا ہے۔

کیونکہ یہاں [illegible] کے باوجود مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اتفاقات اور حادثات انسانی [illegible] اثر ڈالتے ہیں [illegible] کے لئے ارادی طور پر کوشش کی جاتی ہے وہ بہت کم واقع ہوتی ہے۔ اس طرح ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات میں بھی اتفاقات اور حادثات [illegible] حکمرانی ہے۔

اسی کتاب میں سردار نے محسوس کو جنہوں نے خود سردار صاحب کے الفاظ میں اپنی تنقیدی نگاہ سے ترقی پسند تنقید — کے راستوں کو روشن کیا ہے بہت سراہا ہے۔ اور بہتیری جگہوں میں ان کے اقتباسات پیش کئے ہیں ایک اقتباس یہ ہے کہ انسانی تمدن اور اس کے تمام شعبوں کا پہلا بنیادی پتھر اقتصادیات ہے۔ اس طرح انہوں نے مارکسسٹ ادیب رالف فاکس کے خیالات کی ترجمانی کی ہے" زندگی کی تعمیر و تخریب کی ذمہ داری صرف معاشی محرکات ہی پر عائد ہوتی ہے"

لیکن دوسری جگہ پر سردار نے بالکل غیر شعوری طور پر اس نظریہ کی خود ہی تردید کر دی ہے۔ چنانچہ سائنس کی تعریف کرتے ہوئے انہوں ایک جرمن انقلابی لیب نٹ کا حوالہ دیا ہے جو لکھتا ہے" تاریخ کی تشکیل وہ تمام قوتیں ملکر کرتی ہیں جو عالم انسانیت اور عام فطرت میں کار فرما ہیں۔

ٹالسٹائی کے متعلق سردار نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے خیالات ایشیائی نظام کے پیداوار ہیں۔ اس کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت ہی ہے لیکن یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ شعور ماحول کی پیداوار ہے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ملحدانہ ماحول میں پروان چڑھا ہوا شخص اور جو خود بھی اوائل عمری میں کٹر ملحد رہ چکا ہو۔ (ملاحظہ ہو)

ایک ایسے نظام کا حامی بن جائے جو ایشیائی ماحول کی پیداوار ہو۔ ایسے ماحول میں پلے ہوئے ایک کٹر ملحد کا اتنا بڑا موحد بن جانا یقیناً ایک بڑا معجزہ ہے لیکن اس کے خیالات کو ایشیائی نظام کا نتیجہ قرار دینا نظریات درحقیقت اپنے زمانے کو طریق پیدائش کی پیداوار ہیں کے فلسفہ کا کلی استیصال کر دیتا ہے۔

غرض یہ کتاب جو بقول سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کی بالکل صحیح عکاسی کرتی ہے۔ پہلے ہی مطالعہ میں ایک ایسی کھچڑی معلوم ہوتی ہے جو غیر عقلی دلائل۔ ابہام اور اصرار کے دانوں سے مرکب ہو۔ پھر بھی الزام نہ تو سردار پر دھرا جا سکتا ہے اور نہ سردار پر کیونکہ یہ باہم متضاد افکار تو دراصل ہیں اس غلط نظام زندگی کے جس کی ترویج و اشاعت کا فخر انجمن کو حاصل ہے۔

تعاون کی راہیں

اگر آپ معیار کے لئے دست تعاون بڑھائیں تو بمصداق قطرہ قطرہ دریا میشود۔ بہت کچھ دوررس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے کسی بھی تعاون کو حقیر نہ گردانیں۔ اس کا مجموعی اثر متین اور محسوس مرتب ہوتا ہے

۱ ۔ سلم دوست اور ادبی استعداد اصحاب کو معیار سے متعارف کرائیے۔ آپ خود ہی لکھیں تو ہمیں ایسے پتے ارسال فرمائیں جنہیں ہم براہ راست معیار کی طرف متوجہ کریں۔

۲ ۔ اپنے یہاں کے اسکول۔ لائبریریوں اور دیانت دار نیوز ایجنٹوں کے پتے ارسال فرمائیے۔

۳ ۔ ایسی فرموں کے پتے ارسال کیجئے جنہیں ہم اشتہار دینے کے لئے تیار کر سکیں۔

۴ ۔ اہل قلم حضرات دفتر کے تقاضوں کا انتظار کئے بغیر اپنی تخلیقات ارسال فرمائیں۔

۵ ۔ اپنے مفید مشوروں سے بلا تامل نوازیں۔

ناظم ادارہ معیار

شاکرؔ تسلیم

اے ساقیِ زمانہ اِس دورِ مے کشی میں
اِک جام اور وہ بھی برسوں کی تشنگی میں

سر دے کے ابتدائے دل کرتی ہے پاسداری
اِک عہد کر لیا ہے ساقی سے بیخودی میں

دَر پردہ سازشیں تو ہوتی رہیں گی لیکن
مجھ سے نظر ملائے ہمت نہیں کسی میں

اِس ارتقائے نو کے سارے دیئے بجھا دو
ہم تیرگی کے مارے جی لیں گے تیرگی میں

صدیوں بھی جن کا بھرنا شاکرؔ ہے سخت مشکل
وہ زخم دے گئی ہے دنیا ہنسی ہنسی میں

چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

رُخ بدلنے کو ہے کیا محفلِ دوراں کوئی
بربطِ دار پہ ہے آج غزل خواں کوئی

یہ ندا آئی طوافِ حرم و دیر کے بعد
دل سے بڑھ کر ہے کہاں صاحبِ ایماں کوئی

ٹھہری ٹھہری سی یہ موجیں یہ سکوتِ دریا
پرورش پا کے اُبھرتا نہ ہو طوفاں کوئی

کھینچ کر چشمِ تصوّر میں بہارِ گلشن
کیوں قفس ہی میں بنا لوں نہ گلستاں کوئی

جراُتِ عشق پہ ہے ناز مجھے بھی جوہرؔ
میرے ہاتھوں سے چھڑا سکتا ہے داماں کوئی

احقر بھٹناگر کاشی پوری

اُسی کی ہے یہ حیات اپنی جو زخم کھا کھا کے مُسکرائے
شرار کو گُل سمجھ کے چُن لے، ستم سے لُطف کرم اُٹھائے
نہ جانے کب تک سیاستوں کے حسین فریبوں کی گھاٹیوں سے
یُونہی گزرتی رہے گی دُنیا حقیقتوں سے نظر بچائے
ہمارے وجدان کے اُجالے ہیں ہر بلا خیز رہ گذر میں
ہمیں ڈرانے کی کوششیں کر رہے ہیں کیوں ظلمتوں کے سائے
پکاروں گا تمھاری اُلفت کے تازگی بخش آسروں کو
عمل کی پُر پیچ وادیوں میں کبھی اگر پاؤں ڈگمگائے
مرے خیالوں میں بجلیاں گھر رہی ہیں آ آ کے کتنے ڈھانچے
سروں پہ فاقوں کا بار سینوں پہ آمریت کے غم اُٹھائے
جواں ارادوں کی تابناکی ہی اِس اندھیرے کی جان لے گی
غلیظ دامن میں زندگی کی حقیقتوں کو جو ہے چھپائے
ہماری گم گشتگی بھی احقر جہاں کے حق میں مفید نکلی
وہیں وہیں بن گئی ہیں راہیں جدھر جدھر بھی قدم بڑھائے

مضطر مرزاپوری

آنکھ میں نورِ یقیں ہے دل میں کیفِ جستجو
تیرے جلووں کو لئے میں پھر رہا ہوں کو بکو

یہ خلوصِ یاد کی اللہ رے پاکیزگی
نام جب آتا ہے ان کا آنکھ کرتی ہے وضو

ڈوب جائیں گے ستارے شمع بھی بجھ جائے گی
آ خیالِ یار آ پڑھ لیں نمازِ آرزو

جب زباں کھولی تو پھر وہ لطف ہی جاتا رہا
آنکھوں آنکھوں میں جو مل جاتا تھا کیفِ گفتگو

ہائے یہ دل میں خیالِ خام کیونکر آ گیا
پھر وہی اپنے چمن میں ہو بہارِ رنگ و بو

باغباں خوش ہے مگر اس کو خبر اس کی نہیں
فصلِ گل میں پھول کو پینا پڑا اپنا لہو

جادۂ رنگیں کا مضطر راز ہے جوشِ جنوں
اضطرابِ عشق میں ہے حسن کا ذوقِ نمو

ظفر عالمگیر

چمک چمک کے مجھے بجلیاں ڈراتی ہیں
سنبھل سنبھل کے نشیمن بنا رہا ہوں میں

قضا کے خار سے الجھی ہوئی ہے نبضِ حیات
کسی کی زلف کے خم کو بھلا رہا ہوں میں

کلی کلی کو مرا انتظار تھا کب سے
خزاں چمن سے چلی ہے کہ آ رہا ہوں میں

مذاقِ نغمہ سرائی نہ ہو سکا پابند
خزاں میں گیت بہاروں کے گا رہا ہوں میں

ستم ہے اہلِ چمن پر چمن کا یہ آئیں
کلی کلی کو بغاوت سکھا رہا ہوں میں

کبھی ہجومِ تمنا میں اشکبار رہا
تمہارے غم میں کبھی مسکرا رہا ہوں میں

سنا ہے تم مرا اوروں سے شکوہ کرتے ہو
یہ منصفی سے کہو کیا ستا رہا ہوں میں

مظہر نسیم الٰہ آبادی بی اے

○

مرے خیال میں ہرگز نہیں وہ فرزانہ
جسے نہ آتے ہوں آدابِ بزمِ جانانہ

کچھ اُن کو یورشِ رنج و الم سے خوف نہیں
گذر رہے ہیں جو دُنیا سے بے نیازانہ

بس اپنے آپ ہی آنکھوں میں آگئے آنسو
کسی کی یاد نے چھیڑا کچھ ایسا افسانہ

مجھے یقین ہے ٹھکرا دے دولتِ عشرت
تجھے نصیب جو ہو کچھ نشاطِ غم خانہ

نسیم ضبطِ محبت کا حشر کیا ہوگا؟
چھلک گیا جو کہیں اشکِ غم کا پیمانہ

رحمان خاور

○

کلی کلی کے لبوں پر ہیں جن کے افسانے
کہیں وہی تو نہیں ہیں تمہارے دیوانے

حیات و موت کو سب کچھ سمجھنے والوں نے
تیری نگاہ کے انداز ہی نہ پہچانے

وہیں سے خار گلوں کے رقیب کہلائے
چلے جہاں سے بہاروں کی زلف سلجھانے

یہاں تو گرد بھی رکھتی ہے منزلوں کا بدل
جو کارواں کی ہیں باتیں وہ کارواں جانے

نگاہِ لطف سے خاور کو دیکھنے والے
تراشتا ہے زمانہ نہیں سے افسانے

سکون

اسعد گیلانی

شرر شرر شڑاق۔
پرنالہ ٹوٹا اور پانی کی دو شلشلاتی دھاریں دیوار پر پیچ و خم کھاتی فرش پر رینگنے لگیں۔ تھپ سے ایک گارے کا تودا اور نیچے آرہا اور دھاروں نے ایک دیواری دریا کی صورت اختیار کرلی۔ جس میں لہریں بھی تھیں اور لہروں میں پیچ و تاب بھی۔ فرش پر چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔
"جاؤ ارشد پرنالہ ٹھیک کر آؤ۔ ورنہ مکان پانی سے بھر جائے گا۔ اور دیوار کی تو خیر نہیں۔" امی نے کہا۔ ارشد نے دروازے سے سر باہر نکال کر جھانکا۔ پانی کی ایک سرد بوند اس کی کنپٹی پر پڑی۔ بس کسی نے چاقو ہی تو چبھو دیا جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ اور اس نے سر اندر کھینچ لیا۔
"امی جان۔ میں باہر نکلا اور نمونیہ ہوا۔" اس نے گھبراہٹ سے کہا۔
"کیسی بُری فال منہ سے نکالتے ہو شیدے۔ تم تو میرے شیر ہو اور پھر دوسرا کون جائے۔" اور لنگوٹ کس کر وہ پھاوڑا تلاش کرنے لگا۔
پوہ ماگھ کی جھڑیاں دھیمی دھیمی برساتیں شمالی سرد ہوائیں اور پھر کسی کا پرنالہ ٹوٹ جائے کا ٹوٹنے دبی جانے یا پھر ارشد اس مصیبت سے دوچار تھا پھاوڑا کندھے پر رکھے ایک قدم دروازے سے باہر نکالا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسکے رونگٹے مساموں میں سوئیوں کی طرح گڑ گئے وہ جھجکا لیکن پھر دل کڑا کر کے صحن میں چھلانگ لگا ہی دی۔ وہ جیسے دریا میں تیرنے والے برف کے کسی تودے پر آپڑا تھا۔ جو اس کے قدموں تلے سے پھسلا جا رہا تھا۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے گر گیا اور پھاوڑا دور جا پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو پھر پھسلا۔ جیسے زمین اس کے نیچے تیزی سے گردش کر رہی تھی یا وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر کسی عمیق غار کی گہرائی میں گرا جا رہا تھا۔
بسم اللہ۔ امی کی آواز آئی۔ بیٹا ذرا سنبھل کر چوٹ تو نہیں آئی ابا نے تحیّت سے کہا۔ اور خجالت رفع کرنے کے لئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جسم سردی سے سُن ہو رہا تھا۔ پھاوڑا چلاتا دو کبر تھا جب ٹوکری گارے سے بھر گئی تو وہ اُسے کندھے پر لاد کر ایک ہاتھ میں پالہ اٹھائے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ سردی سے اسکی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور جسم لرز رہا تھا۔ ٹوکری منڈیر پر رکھ کر وہ چھت کا سوراخ دیکھنے کیلئے جھک گیا۔ جس میں سے پانی مکان میں ٹپک رہا تھا۔ چھت کا سا۔ پانی بہہ کر اسی سوراخ میں جا رہا تھا۔ بوندوں کی ٹپ ٹپ تیز ہوا کی سائیں سائیں اور اس کے دانتوں کی کٹکٹاہٹ قدرت کی اس پُر سکون موسیقی میں وہ پانی کی بوچھاڑ کے اندر کھڑا سوراخ بند کر رہا تھا۔ اور اس کے ذہن میں گرم لحاف کا تصور خوشگوار لہریں پیدا کر رہا تھا۔
اچانک قریب کی چھت سے تھپ تھپ کی آواز آئی جو اُسے اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ رابی تھی جس کی باریک باریک انگلیاں بڑی تیزی سے چھت کا کوئی سوراخ بند کرنے میں مصروف تھیں
"بارش ہو بڑے زوروں پر ہے راپی۔"
اور جواب میں اس نے صرف ایک سسکی سُنی۔
"کیا کوئی سوراخ بند کر رہی ہو؟" اس نے بے تکے پن سے کہا۔
جواب میں پھر ایک سسکی کی آواز آئی۔
"کیا مکان میں پانی بہت جمع ہو گیا ہے؟" اس نے راپی کے قریب جا کر کہا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"میں نے خالہ جان سے کہا بھی کہ میرے پاؤں میں درد ہے۔ لیکن انہوں نے زبردستی بارش میں اوپر بھیجا۔ شبو بھی تو پاس بیٹھا تھا اُسے نہ کہا۔ کہنے لگیں تمہارے پھول کتنوڑے ہی جھڑ جائیں گے۔ سوتیلی جو ہوئیں۔ میری امی ہوتی تو کبھوں بھیجتی۔" وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔
ارشد سوچنے لگا۔ یہ سوتیلا پن بھی کتنی بڑی لعنت ہے۔ وہ بھی اس کام کے لئے چھت پر آیا تھا۔ اور راپی بھی۔ وہی الفاظ اس سے کہے گئے تھے۔ جو راپی کو۔ بلکہ اسکو کہنی میں تو اب تک چوٹ کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور خراش والی جگہ پر تو سرد ہوا کا ہر جھونکا سینکڑوں سوئیاں چبھوتا ہوا

گزر جاتا تھا لیکن فرق صرف کہنے والوں میں تھا ماں کے الفاظ شیریں اور سوتیلی کے وہی الفاظ بغض و عداوت کا نشان بن جاتے تھے۔

اچانک کھٹ سے اس کی کھوپڑی پر کوئی کنکر آ پڑا۔ پھنا کر اس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نہ تھا صرف چھت کے برابر برف کے سے سفید دانے برس رہے تھے اور پانی بھیگے ہوئے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی گٹھڑی سی بنی سردی سے کانپ رہی تھی۔

"رانی تم نیچے جاؤ تم سے یہ بڑا سوراخ بند نہ ہوگا۔ اس کے بھرنے کو پھاوڑے اور زیادہ گارے کی ضرورت ہے میں [illegible]

وہ جھجکی ... "ہاں ہاں جاؤ میں کہہ رہا ہوں" ارشد نے جھڑک کر کہا اور وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے مکان کے صحن میں اتر گئی۔

وہ جھک کر اپنی چھت کا سوراخ بند کرنے لگا۔ ایک بڑا سا اولا اس کی ریڑھ کی ہڈی پر آ کر لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بارش کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطروں میں وہ گرم گرم قطرے مل گئے [illegible] سردی کے دوزخ اور گرمی کی بہشت کے درمیان وہ معلق تھا۔

"ارشد بابو اب تک بند نہیں ہوا" اماں کی آواز نیچے سے آئی۔

اچانک جیسے وہ بخار سے جوہڑ میں کود پڑا ہو۔

"ساری چھت کے پانی کا بہاؤ اس طرف ہے۔ بند کر رہا ہوں ابا جی" ارشد نے گھبرا کر کہا۔

اور پھر اس نے پرنالہ لگا کر گارے سے اسے اچھی طرح جما دیا۔

"کہاں بھاگی آرہی ہے ڈائن۔ ابھی تو پانی دھڑا دھڑ آرہا ہے"

رانی کا استقبال ایک کرخت آواز سے ہوا۔ اور دوسرے لمحہ ارشد اور وہ چھت پر کھڑے تیزی سے ایک بڑا سوراخ بند کر رہا تھا۔ اسے ایسا ہو رہا تھا جیسے اس نے کسی مظلوم اور بیکس انسان کو سائبیریا کے برفستانوں میں سردی سے دم توڑتے ہوئے لحاف اڑھا دیا ہو۔

اور جب وہ [illegible] بند کر چکا تو اس نے بارش کی بوچھاڑ میں مکان کی چھت پر [illegible] ہو کر چاروں طرف دیکھا۔

[illegible] درخت بارش میں نہائے ہوئے عجیب چاپ کھڑے تھے۔ کھیتوں میں [illegible] بہا چلا جا رہا تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر پانی کی چادریں پھیلی ہوئی تھیں اور آسمان سے بوندوں کی مسلسل قطاریں چاندی کی کڑیوں کی طرح معلق نظر آتی تھیں۔ قدرت کا ایک [illegible] منظر یہاں سے وہاں تک پوری فضا میں پھیلا ہوا تھا اور ارشد ایک عالم کیف میں [illegible] دل کے ساتھ اس منظر میں کھویا ہوا کھڑا تھا۔

ابن فریدی

چند تصویر بتاں

انسان خود اپنی شکل اُس آئینہ میں دیکھنے کی پروا نہیں کرتا جس میں وہ دوسروں کی شکل دیکھتا ہے۔

(۱)

پہلا رُخ

جب میں احمد بھائی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ غصہ سے کانپ رہے تھے۔ ان کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ اور وہ نیمو کو سخت سست کہہ رہے تھے اور نیمو مسکین صورت بنائے کھڑا تھا۔ وہ ان کی طرف تک رہا تھا جیسے وہ ... ختم ہو جائے گی۔ اور وہ اس میں سما جائے گا۔ میں بے حد متردد ہو گیا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ احمد بھائی نے طیش کے عالم ہی میں میری طرف دیکھا۔ کیا ہوا احمد بھائی؟ اور احمد بھائی ایک دم پھٹ پڑے۔

ہو کیا۔ دیکھتے ہو اس کی ذلیل حرکت! ذرا سی کام چوری کی خاطر جھوٹ بول گیا۔ دھوبی کی دوکان بند ہے۔ حالانکہ میں ابھی دیکھتا چلا آ رہا ہوں اس کی دوکان کھلی ہوئی ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ واقعی غلطی نیمو ہی کی تھی۔

دوسرا رُخ

نیمو دھوبی کے پاس جا چکا تھا۔ میں احمد بھائی کے پاس ہی بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ احمد بھائی نے فون اٹھا لیا۔

"ہلو ...... راشد؟ ...... اخاہ اسلام علیکم۔ کہو بھئی کیا بات ہے؟ .... عظمت سے ملنا ہوگا؟ ..... کیوں؟ .... اچھا سفارش کے لئے .. ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن بھئی اس وقت تو مجبوری ہے۔ سر میں اس قدر سخت درد ہو رہا ہے کہ کمرے سے باہر بھی نکلا نہیں جاتا۔ اس وقت تو معاف کرو۔ پھر کسی دن۔ کسی وقت"

احمد بھائی نے فون رکھ دیا۔

احمد بھائی مگر تو یہ کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"اچھا ہی ہوں" اتنے میں نیمو دھوبی کے یہاں سے سوٹ لے کر آ گیا۔ احمد بھائی کپڑے بدلنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو کہیں جانے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔

"کہاں جا رہے ہیں احمد بھائی؟"

"ذرا کلب" اور میں سوچنے لگا۔ کیا وہ دوسرے نیمو نہیں؟

(۲)

پہلا رُخ

ان دنوں دفتر میں بڑی مصروفیت تھی جب گھر سے خبر آئی۔ کہ خالو صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اس قدر اشتیاق تھا۔ کہ میں مصروفیت کے باوجود چند دنوں کی چھٹی لے کر ملنے چلا گیا۔ ابھی مجھے آئے ہوئے بھی ایک دن نہ گزرا تھا۔ کہ خالو صاحب بیمار پڑ گئے۔ اور وہ تین دنوں کے اندر ہی اندر انھوں نے آخری رخت سفر باندھا۔ مجبوراً مجھے رخصت بڑھوانی پڑی۔ میں نے افسر کو تار دیدیا۔ اور پریشاں سا بستر پر پڑا رہا۔ گھر کے تمام افراد پر افسردگی چھائی ہوئی تھی جیسے پورا ماحول نوحہ کناں تھا۔

یوں ہی کچھ دن گزر گئے۔ تیسرے دن میرے نام سرکاری رجسٹری آئی۔ افسر نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تھی۔ اور کارروائی کی دھمکی دی تھی۔ پریشانیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ میں فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ افسر کے پاس گیا صورت حال سمجھائی مگر وہ اپنی جگہ اڑا رہا۔ بڑا ملاحوڑا لیکچر فرائض کی اہمیت پر دے ڈالا۔ اور نہ معلوم کیا کیا۔ میرے تمام عذر اس کے نزدیک معمولی تھے۔ اور دراصل اس کی نگاہ میں ماں باپ کی موت پر بھی تو قیمت رکھتے تھے۔

دوسرا رُخ

اُس ہفتہ اور اسی مصروفیت کے دوران افسر کے ایک دور کے

رشتہ دار کا انتقال ہو گیا۔ اُس نے فوراً چھٹی لی۔ اور کام کو بے ترتیب چھوڑ کر چلا گیا۔ میں حیران تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا وہ اپنا اس دن کا لمبا چوڑا لیکچر بھول گیا؟ یا انسان خود اپنی شکل اُس آئینہ میں دیکھنے کی پرواہ نہیں کرتا جس میں وہ دوسروں کی شکل دیکھتا ہے۔

(۳)

پہلا رُخ

جب انسان کسی بالاتر ہستی کے سامنے جواب دہی کا تصوّر اپنے دل میں رکھتا ہے تو اس کی اپنی معمولی سی معمولی لغزش اس کو بے انتہا مضطرب کئے رکھتی ہے۔ اور وہ اپنے کئے پر کافی پچھتاوا محسوس کیا کرتا ہے۔

مجھ سے بھی ایسی ہی چند ایک لغزشیں ہو گئیں اور میرے نگراں نے مجھ کو تنبیہ کی۔ آپ آخر اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟ اور یہ تصوّر کر کے میں لرز اُٹھا۔

دوسرا رُخ

ابھی یہ زخم تازہ تھا۔ کہ میں نے اپنے نگراں کو انہیں لغزشوں میں متعدد بار اور دانستہ گرفتار پایا۔

اور میں ایک بار پھر لرز اُٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟

(۴)

پہلا رُخ

بڑی بیگم کا یہ طریقہ تھا۔ کہ ذرا سی چیز کے ضائع ہو جانے پر بھی وہ بے انتہا ناراض ہوتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی ذرا ذرا سی چیزیں مل کر بہت بڑی مقدار بنا دیتی ہیں۔ بہر حال ان کا کہنا بھی کیا غلط تھا۔

اُس دن بھی جب آٹا تولتے ہوئے گلاس سے ایک چٹکی آٹا گر گیا تو وہ بہت ہی خفا ہوئیں۔ اور بڑی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ یہ اُن کے نزدیک پھوہڑ پن تھا۔

دوسرا رُخ

مگر میں نے اکثر دیکھا کہ اُن کے یہاں تمام برقی قمقمے اکثر سُورج نکلے تک روشن رہا کرتے تھے۔ ایک دن یونہی میں نے ان سے سوال کر دیا۔

"بڑی بیگم" بجلی کا بل آپ کے یہاں مہینے میں کتنے کا آتا ہوگا؟

"بھیا وہ تو مالک مکان ہی ادا کرتا ہوگا۔ ہم تو کرایہ ہی کرایہ دیتے ہیں"

ٹھیک ہے جب بجلی مفت ہے تو پھر کیوں بڑی بیگم اس پر اپنا موڈ

چسپاں کریں۔

(۵)

پہلا رُخ

"بھیا تم نے تو بچوں کے بارے میں بہت کچھ لکھ ڈالا ہے۔ ذرا اپنے اس بھانجے کی ہی سدھار کی کوئی سبیل بتاؤ"۔

اُس دور کی عزیز بہن نے کہا۔ اور اس کیلئے ناشتہ تیار کرنے چلی گئیں۔

دوسرا رُخ

وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ پڑوس کا لڑکا بہن کے پاس آیا۔

"جی دو انڈے دے دیجئے۔ پھر واپس ہو جائیں گے"

"بچے انڈے تو ہیں ہی نہیں۔ کئی دنوں سے مرغیوں نے دیئے ہی نہیں"

لڑکا واپس چلا گیا۔ اور بہن نے ناشتہ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

ایک پلیٹ میں انڈے کا حلوہ بھی تھا۔ وہ چونک پڑا۔

"آپ نے تو لڑکے سے کہا تھا۔ کہ انڈے ہیں ہی نہیں"

"ارے وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا تھا"

اور وہ پھر سوچنے لگا کہ اس کی تربیت سے زیادہ مؤثر تربیت وہاں پہلے سے ہی ہو رہی ہے۔

(۶)

پہلا رُخ

"بھائی صاحب ہم تو یہ کہتے ہیں کہ کاش دنیا ایک بار پھر نیک آدمیوں سے بھر جائے تو۔ سارے دُکھ دور ہو جائیں"

میر جون فرد نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

دوسرا رُخ

اس ۔ ایک نوجوان شخص نے اس کی ہتھیلی پر چار روپے رکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی میں نے ایک کا نوٹ دیا تھا۔ پانچ کا نہیں"۔

میر جون فردش نے مسکراتے ہوئے نوٹ رکھ لئے اور کہا "بے وقوف اگر یہ لے کر چلا بھی جاتا تو کس کو پتہ چلتا۔ اچھی حاصی ... ملاتی رقم کھو دی"۔

(۷)

پہلا رُخ

عشرت کے چہرے پر ہم نے گھر میں کبھی بھی بشاشت نہ دیکھی۔ جب

وہ ابا یا امی کے سامنے آئے تو شکوہ سنج ہے ۔۔۔۔۔ آج یہ نہیں ہے کل وہ نہیں ہے فلاں سوٹ خراب ہے۔ فلاں کپڑا بہت پُرانا ہوگیا۔ فلاں نے اتنا اچھا جوتا خریدا ہے۔ میرے پاس اس سے کمتر بھی نہیں۔ اس کی گھڑی بڑی خوبصورت ہے۔ ہمیں کوئی کیوں لے دینے لگا۔ غرض وہ دنیا جہاں سے اپنا موازنہ کرتے رہتے۔ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کیلئے سب کا جینا اجیرن کئے رہتے۔

دوسرا رُخ

ایک دن میں نے مذاقاً اُس سے کہدیا "عشرت تم نعمت کو جانتے ہو؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، وہ تو میرا کلاس فیلو ہے"

"دیکھو وہ پڑھنے میں کتنا تیز ہے۔ اور اخلاق کا تو اتنا اچھا ہے کہ سب ہی اُس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور تم ۔۔۔۔۔۔۔؟"

"لیکن دُنیا میں اور دوسرے بھی تو ہیں۔ جو مجھ سے بھی بڑے ہیں"

اس سے قبل کہ میں جملہ پورا کروں عشرت بول اُٹھے۔

"لیکن عشرت پھر یہی۔ تم دوسرے معاملات میں کیوں نہیں سوچتے"

"اونہہ عجیب منطق ہے آپ کی؟"

اور میں غور کررہا تھا کہ منطق حقیقتاً کس کی عجیب ہے؟

(۸)

پہلا رُخ

جمعدار نے انگڑائی لیکر دامن سے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔ "اُف۔ بڑی تیز دھوپ ہے"۔ اور ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا ہوکر سستانے لگا۔

دوسرا رُخ

دو ایک پیڑوں کے نیچے چند مزدور سایے میں بیٹھ گئے تھے۔

"کیوں حرام خورو! ۔۔۔۔۔ اتنی سی دھوپ تم سے برداشت نہیں ہوتی؟" جمعدار غرّایا۔

(۹)

پہلا رُخ

سیٹھ جی کے یہاں بیماری کا سلسلہ جاری ہی رہتا تھا۔ وہ روز ہی کوئی۔ کوئی دوا لینے آجاتے تھے۔ جب ایک عرصہ تک میں نے یہی حال دیکھا تو مجھے ان کے گھر والوں کی طرف سے بڑی فکر ہوگئی۔

دوسرا رُخ

"سیٹھ جی بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ اپنے گھر والوں کو میسلن کے ایک ایک انجکشن لگوا دیجئے" میں نے کہا۔

"تو پھر لیتے چلئے لگا دیجئے"

"لیکن وہ تو آپ کو بازار سے خریدنے ہوں گے؟"

سیٹھ جی اچھا کہہ کر چلے گئے۔ اور پھر کبھی نہ آئے۔

(۱۰)

پہلا رُخ

صاحب میں یہ کیسے مان لوں کہ آپ کے اسلام نے غلاموں کی آزادی کی ابتدا کی؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ کتنے ہی مسلمان امرا کے پاس متعدد غلام ہوا کرتے تھے"

دوسرا رُخ

اسی اثنا میں اُس کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جھک کر زمیں بوس سلام کیا۔

(۱۱)

پہلا رُخ

حاجی شفیع جانماز پر بیٹھے ہوئے تسبیح کے دانے گھما رہے تھے۔ اور مسکرا رہے تھے۔ اتنے میں سلیمہ نے چاۓ لاکر اُن کے سامنے رکھدی۔

دوسرا رُخ

حاجی شفیع نے اُسی طرح مُسکراتے ہوئے کہا: "میری بیٹی تو ابھی سے بزرگ بن بیٹھی ہے"

سلیمہ نے اُن کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے وہ کچھ نہ سمجھی ہو۔

"کسی میں دینداری۔ بڑھاپا نہیں تو کیا ہے"؟ حاجی شفیع اب بھی مسکرا رہے تھے۔ اور سلیمہ کے ذہن میں دین کے اس تصور پر سوچ کر چنگاریاں سی چھوٹ رہی ہیں۔

(۱۲)

پہلا رُخ

پیچھے سے تیز ہارن کی آواز آئی۔ اور میں چونک پڑا۔

"نالائق موٹر کیا چلاتے ہیں سمجھتے ہیں سڑک ان کے باپ کی ہے"۔ میں نے مڑ کر دیکھا ۔۔۔۔ اوہ یہ تو خالد تھا۔ اس نے موٹر روک لی۔ "کہئے کہاں جا رہے ہیں؟" خالد نے مجھ سے سوال کیا۔

"گھر ہی جا رہا تھا"

"تو آئیے بیٹھئے میں ادھر ہی سے گزروں گا"

میں موٹر میں بیٹھ گیا۔ اور موٹر چل دی۔

دوسرا رُخ

خالد نے کئی بار ہارن بجایا لیکن باوجود ایک بڈھا سڑک نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"نالائق سڑک پر چلنے کیا ہی سمجھتے ہیں۔ باوا کا صحن ہے۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔

(۱۳)

پہلا رُخ

میں نے ایک مسودہ اپنے دوست کو دکھایا۔ اور انھوں نے متعدد جگہ پر میری خامیوں کی نشاندہی کی۔

میں نے مسودہ انکے پاس چھوڑ دیا تاکہ وہ حسب منشا اس میں ترمیم کر دیں۔

دوسرا رُخ

لیکن پھر مہینوں میں ان سے تقاضے کرتا رہا۔ اور اُن کو اتنا وقت نہ ملا کہ وہ مسودہ میں تحریف و ترمیم کر سکیں۔

بالآخر مجھے یہ باور کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کہ انسان ہر چیز میں خامی نکال سکتا ہے۔ لیکن اصلاح شاذ و نادر ہی کر سکتا ہے۔

(۱۴)

پہلا رُخ

"احاہا۔۔۔! السلام علیکم۔ آپ تو عید کا چاند ہو گئے، کہئے کہاں غائب رہے۔" اور بڑی دیر تک دونوں میں محبت و شیفتگی کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ پھر آنے والا شخص واپس چلا گیا۔

دوسرا رُخ

اور استقبال کرنے والے نے کہا۔

"نامعقول کہیں کا۔ تمام وقت برباد کرا کے چلا گیا۔"

افسانہ

?

تجمی، بی اے

صبح سہانی تھی۔ صبح اُداس تھی!

رات بھر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی کالی گھٹائیں غائب ہونے لگیں۔ اور سورج کی ننھی شعاعوں نے جب لجاتے شرماتے، اٹکھیلیاں کرتے اور ایک دوسرے کو خوشی خوشی آگے بڑھاتے اس وسیع کائنات کو منور کرنا چاہا تو انہیں درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہوئی۔ ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔ نسیم سحری سے لے کر طائران خوش الحان تک اور انسانوں سے لیکر حیوان تک سب ہی ایک لمحہ کیلئے سرشار نظر آنے لگے۔

جاڑوں کی بارش عموماً خوشگوار نہیں ہوتی مگر۔ جانے آج صبح سورج کی ایسلی کرنوں نے کون سا جادو کر دیا تھا کہ موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ سردیوں میں ملی ہوئی سرور آگیں حدت ذہنوں تک کو نکھار دے رہی تھی۔

غرضیکہ موسم بہت ہی پیارا تھا صبح بہت ہی سہانی تھی ——— مگر ——— صبح اداس بھی تھی، اُداس و غمگین۔ اور صبح کی اسی غمگینی کا کسی اور کو احساس ہوا تھا یا نہیں۔ ہاشمی کو شدید احساس ہو رہا تھا۔

انسانی ذہن یکساں نہیں ہوتا ایک ہی چیز کے مختلف ذہنوں پر مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ اثر اس کے اس وقت کے مخصوص رہی حالت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ ذہنی حالت عموماً اس کے ماحول اس کی آس پاس کی دنیا کا عطیہ ہوتی ہے۔

ہاشمی ذہین تھا۔ حساس تھا۔ صاحب شعور تھا۔ مگر غیر منصفانہ بنیادوں پر تعمیر ہوئے معاشرہ نے اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا ——— وہ سب کچھ جو ایک انسان کو کسی حیوان سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کا ذہن ایک ایسی چنگاری بن چکا تھا جس پر راکھ کی تہہ جم چکی ہو۔ اس کا شعور کبھی تو اونگھنے لگتا اور کبھی یکایک جاگ پڑتا ——— تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد مسلسل بیکاری نے اسے پریشان کر ڈالا تھا۔ دونوں اور دولت خانوں کے چکر اس کے جسم کے ساتھ اس کے ذہن کو بھی تھکا دیتے تھے ایسی حالتوں میں مخلص ہستیوں کی خشک ہمت سے تیار کیا ہوا غم اس کا ساتھ نہ دیتا تو وہ اب تک نہ جانے کتنے عمیق غاروں میں چلا گیا ہوتا۔ اس کی زندگی کو بس ایک ہی طرح سے تعبیر دی جا سکتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹی سے ٹھوکر مار کر گرایا ہوا ایک پتھر جو لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے اگر کوئی بڑا پتھر اسے روک نہ لے ——— بڑی بڑی ہستیوں نے اسے اس کے اعلیٰ مقام سے . . انسانیت سے . . . متعدد بار ٹھوکر مار کر گرانے کی اور ایسی جگہ پہنچانے کی کوشش کی تھی جہاں انسان حیوانیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ جہاں نیک و بد کی تمیز مٹ جاتی ہے جو بھی اس کے غم کا ظاہر مداوا کرتا نظر آتا ہے اسی کے ساتھ ہو لیتا ہے ——— مگر اس کے ساتھ تو ایک ایسی قوت تھی جسے لوگ ضمیر کہتے ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر وہ پوشیدہ قوت انگڑائیاں لیکر جاگ جاتی اور ہاشمی کو اس کی ادائیں پسند آجاتیں۔ اور بلندیوں سے ٹھوکر مار کر پھینکے ہوئے پتھر کو سہارے کے لئے ایک بڑا پتھر مل جاتا۔

لیکن کب تک اس طرح زندگی گزاری جا سکتی ہے . . . . . . ؟؟ یہ سوال اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔ آخر کب تک، کیسے، اور کیوں ؟؟ اور یہ آخری مرحلہ آتے ہی اس کے دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں اور ذہن پر عجیب سا دباؤ محسوس ہونے لگتا اتنا زیادہ کہ گویا اب اس کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ مگر ایک، پھر وہی طاقت سرگوشی کے انداز میں کچھ سمجھاتی ——— اور غبارے سے رُندھا ہوا نکل جاتی، وہ پھٹنے سے بچ جاتا ———

ایسے موقعوں پر اس کا ذہن ایک اور پلٹا کھاتا کافی سنجیدگی سے وہ سوچنے میں منہمک ہو جاتا۔ یہ معاشی ناہمواریاں کیوں ہیں؟ کیا یہ ایسی ہی رہیں گی؟ ہمیں ایسی ہی حالت میں رہنا چاہئے؟ نہیں ہرگز نہیں "یہ سرمایہ دارانہ نظام" وہ اور سوچنے لگتا۔ "اس میں انسان مر جاتا ہے۔ انسانیت سسکتی رہ جاتی ہے۔ اور انسان پھر بھی کچھ نہیں پاتا" ——— اس کا کبھی کا مطالعہ کا عاشق ذہن کچھ اور پردے اٹھانے لگتا ———" سرخ نظام، عوامی نظام، ترقی کرتا ہوا نظام" وہ سوچنے لگتا ——— اس میں پیٹ تو شاید بھر دیا جاتا ہے مگر ——— مگر انسان سے وہ سب کچھ لے کر جو اس کی حیات کا جوہر ہیں ——— وہ مشین بن جاتا ہے اور مشین بس مشین ہی رہتی ہے۔ پھر اس میں بھی عدم مساوات ہی رہی۔ کم از کم آدمیت اور مادیت کے درمیان اگر ایک شاطر اور ایک معمولی مزدور کے درمیان

بھی ـــــ تو ـــ پھر ـــ پھر ــــ اور یہاں اس کا ذہن ایک لمحہ کے لئے مچلا جاتا ـــ اور معاً اس کے تخیل کی آنکھیں دُور بہت دُور افق کے پار ایک حسین و ش ربا شکل دیکھتیں مبہم مبہم خط و خال نمایاں نہ ہونے پر بھی وہ انتہائی دلکش لگتی۔ ـــ ایسا حُسن جسے وجدان محسوس تو کر سکتا ہے مگر دماغ اس کی عکاسی نہیں کر سکتا ر پھر ایسا لگتا کہ وہ چہرہ مغموم ہے بیحد مغموم، شاید اس لئے کہ اس سے کوئی پیار نہیں تا۔ کسی کو اس سے محبت نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی احساس ہوتا کہ وہ مجسمہ رحمی ہے۔ ، دھیمی کراہ بھی تصور کے کان سُن لیتے۔ اور تب بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ اسکا وجے سے پیار کرے۔ ایک پاکیزہ محبت جو ایک راہی کو اپنی منزل سے ہوتی ہے یا بھی ایک مخلص داعی کو اپنے بلند نصب العین سے ہو۔ اور وہ تلملا اٹھتا اپنی بے سر و سامانی ، اپنے بازوؤں کی ناتوانی پر اپنے دل و دماغ کی کمزوری پر اور عزم و ارادہ کی میوں پر ـــ اس کے ذہن میں آتش فشاں سا پھٹ پڑتا۔ اس کا جی چاہتا کہ حیالات کو فنا کر دے ان طاقتوں کو کچل ڈالے جنہوں نے اس کے محبوب کو بلکہ ذی شعور کی عزیز ترین شے کو اس طرح مجروح کر رکھا ہے۔

یکایک اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشہ سے ایک خیال اُبھرتا۔ وہ تو مورہی تصور ہے دُنیا ہمیشہ سے ہی ایسی رہی ہے۔ تمہاری منزل تمہارا خیال محض ہم ہے۔ خیال ست و محال است جنوں ل طرح وہ تذبذب میں پڑ جاتا ی جیکے سے پھر سرگوشی کرتا۔ مطالعہ مدد لو، تصور آزاد کرو ـــ اور پھر اس کا محدود مطالعہ اور تصور فوراً مدد کو آجاتے اور تب صدیوں کے طویل پردے سرکنے تے ایک دو، دس بارہ۔ اور اس کی تصور دور بیں نگاہیں کچھ اور ہی دیکھنے یتں اور دیکھتی رہتیں۔ اچانک دور افق پار وہی ہیولا نظر آتا مگر شاداں و مسرور ـــ نُورانی چادروں میں لپٹا لپٹایا۔ بلندیوں کی منتہا کی طرف مائل بہ پرواز ـــ س وقت سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔ تصور میں مترنم قہقہہ کار سنائی دیتی ـــ س وقت معت لینے والا کبھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ مطالعہ ایک جملہ پیش کر دیتا۔

"زمانہ میں وہ دَور آکر رہے گا" وہ چیخ پڑتا ایک بار، دو بار اور تینی بار یہاں تک کہ اس کا گلا رندھ جاتا، اعصاب شل ہو جاتے اور وہ چُپ چاپ چارپائی پر پڑ جاتا۔

مسلسل تلاش معاش اور اس میں ناکامی کا اثر شدید ہونا ہی چاہئے ایسے حالات میں انسان کافی حد تک بہک جاتا ہے گوناگوں تخیلات جانے کہاں کہاں اور کیسے نشیب و فراز سے لے جاتے ہیں۔ ردِّ عمل وہ بھی متواتر ناکامیوں کا بہت ہی سخت ہوتا ہے۔ اس کی بغاوت ہمیشہ اس کے تخیلات ہی تک محدود رہی۔ انتقام محض اس کا مقصود نہیں تھا ایک خرابی کا دوسرے سے بدل جانا اس کے نزدیک جہل تھا۔ وہ ایک ایسا نظام چاہتا تھا جس میں مساوات فکر و عمل ہو اور جس کو پرکھا بھی جا چکا ہو۔ اس کے اندر ایک انسان تھا۔ مگر یہ دنیا۔ یہاں ایک "غیر انسان" کے لئے تو سب کچھ تھا مگر "انسان" کیلئے کچھ بھی نہیں۔

اور یہی ہوا ـــــــ

جب تک گھر کا اثاثہ بیچ کر کام چل سکا چلتا رہا۔ مگر کب تک؟ آخر ایک دن وہ بھی ختم تھا۔ اور اب وہ تھا اور اس کی ساتھی موہوم سی اُمیدیں اور بھوک اور درد اصل یہی ایک آزمائش کا مرحلہ تھا۔ اس کے شعور کی۔ خودی کی اور سب ہی اعلیٰ صلاحیتوں کی آزمائش تھی۔ "سخت مقام" آگئے تھے۔ یا تو دوسرے انسان نما حیوانوں میں شامل ہو جاتا تھا یا پھر بصورت دیگر اس کی شخصیت مثل کندن کے ہو جاتی۔

اور اس دن شام کو تھکے ماندے آکر جب وہ میلے بستر پر گر پڑا تو اسے کھانا کھائے تین دن ہو چکے تھے ـــــ تین طویل دن تین طویل راتیں ـــــ اور پھر رات کو ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی، مگر سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی گھٹائیں بھی غائب ہونے لگیں۔ اور دن کے رانے کی بیغامبر شعاعیں فطرت کی فیاضی کا ثبوت دینے لگیں۔ موسم بہت دلآویز تھا۔ صبح سہانی تھا مگر، باغی کا حساس دل اُداس تھا۔ سارا زمانہ اُداس تھا۔ ساری کائنات ہی تصویرِ یاس تھی۔ اور وہ صبح بھی اُداس تھی۔ اُداس و غمگین۔

اس نے کائنات پر ایک نظر ڈالی۔ اسے بھی ایک طرح کا کیف سا حاصل ہوا۔ مگر دوسرے جذبات نے کسی اور چیز کا موقع ہی نہ دیا۔ فطرت کی فرصت اور فراخ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ پھر نکل پڑا۔ "شاید کوئی دوست ہی مل جائے اور کچھ کھلا دے" اس خیال کے آتے ہی ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آکر رہ گئی "وہ کتنا گرگیا تھا" اس نے سوچا۔ اور پھر ایک دوست کے گھر کی جانب چل پڑا۔ ایک ٹیوشن کی اُمید تھی۔ شاید مل جاتا ـــــ وہ چلتا رہا سوچتا۔ بڑھتی ہوئی بھوک ستاتا۔ لڑکھڑاتا ٹھہرتا۔ اور چلتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا کلیجہ چبائے جا رہا ہو۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ آنکھوں کے تلے کبھی کبھی سیاہ دائرے ناچنے لگتے ـــــ وہ چلتا رہا مگر خیال نہ رہا کہ کدھر جا رہا ہے، کہاں جاتا ہے ـــــ یکایک اس کی پیشانی سے کوئی سخت چیز ٹکرائی۔ ساتھ ہی کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گیا۔ اور متوحش ہو کر بغل میں دیکھا "بابو جرا دیکھ کے چلو، بھیڑ ہے" ایک رکشہ والا کہہ رہا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ بے خیالی میں وہ غلط راستے پر آگیا ہے۔ اور اس وقت شہر کے مشہور غلّہ کے بازار میں

کھڑا ہے۔ سڑک پر فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی بیل گاڑی کے بانس سے لگی تھی جس میں چاول بھرا ہوا تھا۔ اس کے ملاقاتی کا مکان وہاں سے ذرا ہٹ کر بائیں طرف گلی میں تھا۔

چاول کے ڈھیر دیکھ کر اس کے ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گئے۔ مگر وہاں رکھا ہی کیا تھا، بجز حسرت و یاس کے۔ اس کے دل سے ایک کراہ نکلی اور لامحدود فضا میں تحلیل ہو گئی۔ اس نے چاولوں کے ڈھیر پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور لوگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک فقیر نے ایک مہاجن سے سوال کیا۔ "بھگوان کے نام پر ——" اور کاسۂ گدائی بڑھا دیا۔ مہاجن نے ایک مٹھی چاول اس میں پھینکا۔ اسے خیال آیا وہ بھی ایسا ہی کرے، مگر ساتھ ہی اس نے اپنے دانت بھینچ لئے، اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوا۔ "کیا اب میں اتنا گر گیا ہوں۔" اس نے سوچا۔ "اس میں توہین ہے اس کی خودداری کی، بے عزتی ہے اس عظیم کام کی جس کا واسطہ دیا جاتا ہے —— یہ تو اسے کبھی گوارا نہ ہوگا اس سے تو اچھا ہے کہ —— اور آگے وہ نہ سوچ سکا۔ اس کے ذہن کے ایک گوشہ سے یک بیک ایک نئے طرح کے خیال نے سر ابھارا۔

لوگ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ لوگ آتے، چاول دیکھتے۔ دکاندار ایک مٹھی چاول گرد وصاف کر کے تعریفیں کرتے ہوئے دیتا۔ لوگ اگر پسند نہ کرتے تو دوسری جگہ جانے لگتے تو دوکاندار کہتا "بابو، اس چاول کو لیتے جاؤ۔ ایسا بازار بھر میں نہ ملے گا" اور مٹھی بھر چاول دے دیتا —— اسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی ایسا کرے۔ پچاسوں دکانیں ہیں۔ سب سے ایک ایک مٹھی لے کر رکھتا جاؤں۔ اس طرح سے تو کچھ مشکل نہ ہوگا اور رہا رکھنے کا سوال تو اس نے سوچا کہ پتلون کی جیبیں کافی ہوں گی۔

یہ خیال آیا اور اس کے دل و دماغ پر چھا جانا چاہا۔ سیاہیوں کی پیداوار یہ انوکھا بلکہ اچھوتا خیال بالکل کسی کاذب کی طرح تھا۔ جو وہ بعد میں آنے والی پاکیزہ روشنی کا پیش خیمہ ہوتی ہے مگر اکثر و بیشتر مبتلائے فریب بھی کر ہی دیتی ہے۔

لیکن ساتھ ہی اس کے وسیع دماغ کے ان گنت گوشوں سے ننھی ننھی شعاعیں خارج ہونے لگیں۔ کچھ اور ہی خیالات نے اس کا دامن پکڑنا چاہا۔ "یہ انسانیت کے منافی ہے۔ تمہارے محبوب کو اس سے ٹھیس لگے گی ——" اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے تیزی سے گردش کرنے لگے۔ پھر وہ بڑے سے بڑے ہوتے گئے یہاں تک کہ اس کے سامنے یہاں سے وہاں تک بہت دور تک سیاہیوں کا، ظلمتوں کا، سیاہ دائروں کا ایک عظیم الشان

دریا موجیں مارنے لگا اور دور حدِ نظر پر ایک جگہ سے مسرور کن سکون بخش نورانی شعاعیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ موجوں میں کبھی ننھی ننھی قندیلیں ابھرتیں اور پھر ڈوب جاتیں۔ اس کے قدم یکایک لڑکھڑا گئے۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرے شخص نے نیم استہزائیہ انداز میں اسے بازوؤں سے تھام لیا اور کہا۔ "مسٹر ہوش نہیں ہے کیا؟ یہ بازار ہے" —— اس کی آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ اس نے سوچا "نہیں مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میری اپنی خودی خود میرے ہاتھوں مر جائے۔ اُف ——" لیکن یہ نہ تو چوری ہے نہ گداگری۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔" اس خیال نے اسے دبوچ لینا چاہا۔ "ایک وقت کچھ کھا کر تو کم از کم دوسرے تین دنوں تک حالات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔"

کسی نامعلوم خیال کے تحت وہ ہٹ کر سڑک پر آگیا۔ اس نے سوچا کہ "یہاں سے نکل چلوں۔" سڑک پر ایک طرف اپلے ٹھیلے والوں کا انبار لگا تھا۔ پاس سے ایک رکشا گزرا۔ وہ ہٹ کر کنارے آگیا۔ ذہنی جنگ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پیٹ میں کچھ عجیب طرح کا درد ہونے لگا۔ اسے اپنے اندر کسی اہم چیز کی کمی کا احساس ہونے لگا۔

ایک بیل گاڑی والے نے چیخ کر کہا۔ "ہٹ جاؤ بابوجی بیل مار دیگا"

وہ بوکھلا کر جلدی سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا اور دوکان کے قریب آگیا۔ لوگ آ رہے تھے۔ لوگ جا رہے تھے۔ لوگ خرید رہے تھے۔ دوکاندار نے اسے قریب دیکھ کر سمجھا کہ وہ بھی کچھ چاول خریدے گا۔ اور اس نے ایک مٹھی چاول لے کر یکایک اس سے کہا "لو بابو، بہت بڑھیا ہے، اصلی گوریا۔" اور پھر اس کی طرف بڑھا دیا —— یونہی غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ پھیل گئے۔ اور چاول اصلی گوریا۔ چاول کے دانے اس کی ہتھیلیوں میں تھے۔ شاید وہ انکار کر دیتا۔ وہ نہ لیتا مگر اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ جانے کیوں؟؟

ایک بار تو اسے ایسا لگا کہ وہ یہ سفید دانے نہیں ہیں بلکہ —— اور وہ انھیں پھینک دے۔ مگر فوراً ہی اس کے اسی گوشہ سے تحریک ہوئی وہ کچھ عجیب سے انداز میں اسے لے کر خالی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ جیسے وہ دانے اسے نظر نہ آ رہے ہوں۔ اور پھر مٹھی بھینچ لی . . . . .

زندگی کو ٹھوکر لگی۔ کشتیِ حیات ڈگمگانے لگی۔ اس کے سر پر سے ایک کوا کاؤں کاؤں کرتا ہوا گزر گیا۔ ایک جیپ کار اس کے پاس سے گزری اور اس کے میلے مگر بے داغ کپڑوں پر کچھ چھینٹیں ڈالتی گئی ——

ہاتھی کے ہاتھ میں تشنج سا ہو رہا تھا۔ پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیٹ میں کھرچن سی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے بڑے ہوتے

غائب ہوتے پھر موجود ہوتے۔ کبھی کبھی ان کے بیچ روشنی کا ننھا سا نقطہ بھی نمودار ہو جاتا۔ سب سے بڑھکر اس کے دل و دماغ اس کے ذہن، اسکی خودداری میں نہایت شدید جنگ ہو رہی تھی چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ جیسے سارے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ اس نے اپنی پیشانی کے دونوں گوشوں کو سختی سے دبایا۔ سر کو اُوپر کی طرف جھٹکا سا دیا۔ جیسے اس پر کوئی ناگوار سی چیز آپڑی ہو۔

کسی نہ کسی طرح چلتا ہوا وہیں تھوڑی دور میل کے ایک بڑے سے درخت تک پہنچا اور اس کی مضبوط جڑ پر بیٹھ گیا۔ وہ فیصلہ کرنا چاہ رہا تھا! ایک آخری فیصلہ۔ مگر یہی تو دشوار تھا۔

اب بھی موقع ہے سنبھل جاؤ۔ کوئی اس سے کہتا۔ تو بھوکا ہے۔ اس کو احساس ہوتا۔ مگر ایک بار گر جانے کے بعد گرتا ہی جائے گا۔ مگر بھوک ؟؟
"اپنا کوٹ بیچ ڈال" "قلم موجود ہے" "اب تو لے ہی لیا" یہ شدید ترین وار تھا۔ مگر —— اس نے ایک آخری کوشش کی۔

اب اس کی نگاہیں دُور افق میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ مگر اس کا ذہن بے حس ہو رہا تھا۔ اس کا تخیل کچھ نہ سمجھ سکا۔ شاید اس لغزش نے اس کی متاعِ حیات لوٹ لی تھی۔" اس خیال کے آتے ہی اس کا جسم کانپنے لگا۔ اور آنکھوں میں تارے لرزنے لگے، ساتھ ہی تصور کے کانوں میں پُر زور آواز سنائی دی۔ جیسے کسی کی آخری آواز ہو۔ "تم لے چکے تو کیا ہے۔ اب بھی موقع ہے ٹھوکر کے بعد سنبھلا بھی تو جا سکتا ہے۔ کیچڑ کے دھبے دھوئے بھی جا سکتے ہیں ——" مگر اس سے کیا —— مگر اس سے کچھ نہیں ——

وہ سوچے جا رہا تھا —— وہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا —— اور فیصلہ ہونا ہی تھا۔ آخری فیصلہ۔

اور پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ نمناک آنکھیں خشک کیں۔ مٹھی میں دبے ہوئے دانوں پر اس نے فیصلہ کُن نگاہ ڈالی۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ شاید راستہ متعین ہو گیا تھا۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔

اب یہ آپ بتائیں کہ کیا ہوا ہوگا۔ تین دن کی شدید بھوک، ایسا انسان اس کی خودی، اس کے اصول، اور ایک آسودگی کا ذریعہ جس میں بظاہر کوئی خرابی نہیں، ایسی کشمکش میں، ایسی حالت میں آپ کیا کرتے، ہاشمی نے کیا کیا ہوگا، یہ آپ بتائیے۔

ہارون الرشید

روشنی

"اور تم کیا کرو گے ؟"

"میں تو آرٹسٹ بنوں گا۔" صلاح الدین نے جواب دیا۔

"اور آپ مسٹر" ؟

"میں ـــــ میں مرلا اور ڈالمیہ بنوں گا۔" حیدر نے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔

"اور آپ کا کیا ارادہ ہے ؟"

"جی ـــــ ویسے تو کوئی خاص ارادہ نہیں" شاکر نے کہنا شروع کیا "لیکن اگر قسمت نے ۔ تو دیا تو میں ہندوستانی فلموں کا معیار اتنی بلندی پر پہنچا دوں گا ـــــ کہ اگر ہالی ووڈ والے اس بلندی کی طرف نظر اٹھائیں تو ان کے سر سے ہیٹ گر جائے۔"

"اجی واہ صاحب ـــــ اندھوں نے ماچس ریوڑیاں اور اپنے ہی اپنوں کو دیدیں۔"

"مطلب" ؟

"مطلب یہ کہ آپ نے مجھے نہیں پوچھا کہ میں کیا بنوں گا ـــ خیر یہی! پر میرا فرض مجھے جھنجھوڑ رہا ہے ـــــ میری غیرت اور شرافت مجھے اکسا رہی ہے کہ تم جو چاہتے ہو اپنے دوستوں سے کہہ دو ـــــ لہٰذا

"کلیجہ تھام لو بیٹھے سنو پھر داستاں میری"

"میں کیا چاہتا ہوں ـــــ میں ایک انقلاب چاہتا ہوں" سعید نے کہنا شروع کیا۔

"ایک ایسا انقلاب جس میں ہر امیر غریب ہو جائے اور ہر غریب امیر بن جائے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اونچے اونچے محلوں میں گھپ اندھیرا رکھا دوں تاکہ نسلیں کرتے ـــــ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بھگوان کے سوتیلے بیٹوں کی لاش نعمت کے ساتھ ان کے جیون، ان کی زندگی، اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے طور پر بھی مفلسی غربت اور تنگدستی کے کالے اور بھیانک بلند اژدہا

من من کر لہرانے رہیں ـــ ڈستے رہیں ۔۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ اونچے اونچے محلوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے جائیں تاکہ سعید، دودھیا اور چمکیلی روشنی جب چھن چھن کر غریبوں کی کٹیا میں پہنچے تو ان کی زندگی بھی دودھیا اور چمکیلی ہو جائے ـــــ لیکن اس کے لئے لینن کی طرح جدوجہد ـــــ اسٹالن کی طرح ہمت اور گورکی کی طرح ایک مستقل مزاجی کی ضرورت ہے ۔ اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس وقت تو لینن اور اسٹالن پیدا ہی نہیں ہو سکتے جب تک گورکی کا وجود نہ ہو ـــــ اور اسی لئے میں گورکی بننا چاہتا ہوں ـــــ ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر ـــــ پھر میں اسٹالن پیدا کر سکتا ہوں ۔ لینن بنا سکتا ہوں ـــــ سفید دودھیا اور چمکیلی روشنی پھیلا سکتا ہوں۔"

"اللہ اکبر ـــ اللہ اکبر" دور سے اذان کی دل موہ لینے والی آواز آنے لگی۔

"ارے اذان ہو گئی ـــ بھئی دیکھنا۔ کیا وقت ہوا ہے"

"چھ بجنے میں ۔ پندرہ منٹ باقی ہیں" صلاح الدین نے کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا

"ہائیں ! کیا کہا - چھ بجنے میں پندرہ منٹ ـــــ ارے بھائی جلدی چلو ورنہ فلم چھوٹ جائے گی" وہ تو کہیے اذان نے چونکا دیا" شاکر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ۔ اور موذن اپنی حلق کی آخری گہرائی سے پکار رہا تھا

"اللہ اکبر ـ اللہ اکبر"

"لا الٰہ الا اللہ"

اور مسجد کے گنبد پر ایک بوڑھا گدھ سر لٹکائے یوں بیٹھا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا فلسفی ہے اور ہماری گفتگو پر سعید دتبصرہ کر رہا ہے یا کسی پیچیدہ مسئلے کو سلجھا رہا ہے اور اس کا مسئلہ اندھیرے کی تہہ میں دھنسا چلا گیا پھر اس میں گرہیں پڑ گئیں ـــــ وہ گھبرا کر اڑ گیا ۔ اور مسجد کا گنبد ویران ہو گیا اور مسجد کے دروازے بند ہو گئے ـــــ اور سینما ہال کا دروا

کھل گیا اور ہر طرف دودھیا، سفید چمکیلی اور نرم روشنی پھیل گئی ——

اور تیسری گھنٹی کے ساتھ ہال میں گھُپ اندھیرا چھا گیا —— اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ سینما کی گھنٹی نہیں بلکہ کسی خوفناک دیو کی آواز تھی —— جو گرجتا اور چنگھاڑتا ہوا آیا اور ایک معصوم خوبصورت پری کو لے بھاگا ——!

فلم ختم ہو گئی اور پھر ہر طرف سفید روشنی کی کرن پھوٹ نکلی۔ اور میرے خیالات پھر الف لیلیٰ کے اوراق الٹنے لگے کہ دیو کی جان ایک بہت بڑے اژدہے میں تھی اور اس اژدہے کو حاتم طائی نے مار ڈالا —— اور دیو مر گیا —— اور وہ خوبصورت پری آزاد ہو گئی۔

پھر وہ اپنے محل میں واپس آ گئی۔ اس نے پورے محل میں چراغ جلائے اور نرم سفید روشنی کی ایک دھار بہ نکلی ——!!

"ہاں کس خیال میں غرق ہو" صلاح الدین نے کہا "کہو فلم پسند آئی؟"

"سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ اندھیرے اور اُجالے میں جو فرق ہے وہ کس طرح ختم ہو گا۔ کیسے ختم ہو گا۔ کب ختم ہو گا —— کیوں نہیں ساری دنیا میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ کیوں یہ روشنی صرف بڑے بڑے محلوں میں قید ہے۔ کیوں نہیں دودھیا، سفید اور نرم روشنی کا بند ٹوٹ جاتا —— امیر اور غریب کا یہ فرق کس طرح دنیا سے مٹے گا۔ دونوں ہی ماں کے پیٹ سے ننگے پیدا ہوئے تھے —— دونوں ہی بھوکے تھے پھر آج کس طرح ایک کے پاس کپڑے کی کروڑوں تھان موجود ہیں۔ اور دوسرا ایک گز کو ترس رہا ہے۔ ایک کے پاس لاکھوں من غلہ ہے اور دوسرا دو دن سے بھوکا کیوں ہے۔ آخر کیوں —— بولو۔ جواب دو"؟؟؟!

اور وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جیسے وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ بتاؤ ایسا کیوں ہوا —— ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لیکن سب کی نظریں ٹکرا کر زمین میں دھنس گئیں —— اور سب تھکے تھکے قدموں سے چلتے رہے۔ بالکل خاموش —— بالکل اُداس ——

اور پھر مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی —— گدھ پھڑپھڑا کر اُڑ گیا۔

"لو بج گئے 10 بجے میں تو چلتا ہوں —— ورنہ کل کی خیر نہیں اور بچے امتحان ختم ہوا ہے اور اب تک گھر نہیں گیا ——" حیدر نے سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو ——" وہ دیکھو سعید نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور سب کی نظریں آسمان پر گڑ گئیں۔ ایک ستارہ اپنے پیچھے دودھیا چمکیلی اور نرم روشنی کی ایک پتلی سی تار کھینچتا ہوا تاریکی کی گود میں دفن ہو گیا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تم اس سیاہی اور تاریکی کو دور نہیں کر سکتے۔

—— سب مل کر مسجد پر پہنچے ——! اور اذان کی آواز دھیمی ہوتی گئی اور دھیمی ہوتی گئی۔ اور پھر رات کی سیاہی میں آواز ٹکرا کر ڈوب گئی۔ ایک چوراہے پر پہنچ کر ہم لوگ رک گئے۔

"پھر کب ملنا ہو گا" حیدر نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

"جب آپ لوگوں کی رائے ہو" سعید نے ایک مختصر سا جواب دیا۔

"کل شام کو پانچ بجے 10 شاکر نے اپنی رائے پیش کی۔

"ٹھیک ہے" سب نے ایک ساتھ کہا۔ اور چاروں الگ الگ راستے پر چل پڑے۔

میں گھر پہنچا اور لیٹ گیا —— میں نے ہزاروں کروٹیں بدل ڈالیں مگر نیند نہیں آئی۔ اور ہر کروٹ کے ساتھ میری کھٹیا چرمر چرمر کرنے لگی جیسے اسے بھی سکون نہ ہو۔ اور وہ بھی میرے ساتھ پریشان ہو۔ اور میں اکتا کر کھٹیا سمیت باہر آ گیا۔ باہر مسجد کے سامنے ہوا ایک رندہ (؟) سی سانس لے رہی تھی۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک جاگتا رہا اور کس وقت مجھے نیند آئی۔ لیکن صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو مسجد کے دروازے بند ہو رہے تھے —— اور لوگ نکل رہے تھے۔ ایک بوڑھے کو کھانسی آئی —— کھوں! کھوں!! کھوں!!! آخ —— آخ تھو —— اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس نے میری جوانی پر بلغم پھینک دیا۔ میلا اور میلا بلغم۔ جیسے اس نے منہ پر تھوک کر میری فطرت کو جھنجھوڑ دیا۔ مجھکو اپنی اصلیت سے روشناس کرانا چاہا۔ مجھکو اپنے نام سے اور اپنے آپ سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ اپنی جوانی سے گھن آنے لگی —— کیوں میں خدا اور اس کے رسول کو دھوکا دے رہا ہوں۔ جبکہ میں نے اتنی ساری عمر میں اس کی ایک بھی حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس کی ایک بھی بات نہیں مانی —— اس کی ——

"بالو جی" مہتہ نے کہا "ذرا پیر ——!"

"اوہ —— ہاں۔ ہاں —— یہ لو" اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

وقت گزرتا گیا —— صلاح الدین۔ شاکر۔ حیدر اور سعید آتے رہے —— مسجد کا مؤذن پکارتا رہا —— اور پھر اس کی آواز سے گدھ پھڑپھڑاتا رہا —— بوڑھا نمازی کھانستا رہا —— اور میری جوانی پر بلغم کی تہہ جمتی گئی —— کہ ایک روز صبح ہی صبح مجھے کسی کی آواز نے چونکا دیا ——

"بالو جی —— تار"

اور میں تار کا لفظ سن کر چونک پڑا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے

ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ لکھا تھا come sharp
Mother اور میں کسی سے ملے بغیر چل پڑا ——— راستے بھر میرے
ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے رہے۔ یہی کہ ماں کیسی ہے۔ کہیں طبیعت زیادہ
خراب تو نہیں ہو گئی ہے۔ نہ جانے میں انھیں ——— لاحول ولا قوۃ

اور زندگی میں پہلی بار میرا سر اُس دیکھی طاقت اور شعور سے بالا
طاقت کے سامنے جھکا جا رہا تھا۔ اور عقیدتمندی کے آنسو آنکھوں میں جھلک
رہے تھے ——— اور میں زندگی میں پہلی مرتبہ خدا سے دعا مانگ رہا تھا ———
کہ میری ماں کو اچھا کر دے۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ مجھے دعا کے طریقے
دعا کے بول یاد نہیں تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خدا میری دعا
قبول کرے گا ——— اور جب میں گھر پہنچا تو دیکھا ماں کھٹیا پر بیٹھی ہے
وہ مجھے دیکھکر اُٹھنے لگیں ——— میں نے انھیں بٹھاتے ہوئے کہا ———
"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی"

"اچھی ہوں بیٹا ——— بہت اچھی ہوں۔ ڈاکٹروں نے تو جواب دیدیا
تھا۔ نہ جانے کس کی دعا خدا نے سُن لی"

——— مسجد کے مؤذن نے پکارا۔ "اللہ اکبر ——— اللہ اکبر"

"جاؤ بیٹا" ماں نے کہا "غسل کر لو۔ سفر کی تھکاوٹ دور ہو جائیگی"
اور میں پہلی مرتبہ خدا کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور مجھے ایک ایسی خوشی ایسی مسرت
ہوئی۔ جیسے ایک بھولے ہوئے مسافر کو راستہ مل جانے کے بعد۔ جیسے ایک قیدی
پرندہ کو آزاد ہو جانے کے بعد۔ جیسے ایک مجرم کو پھانسی کے تختے پر سے اُتار
دیے کے بعد ———!

تین مہینے کے بعد جب ماں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ میں نوکری
کے سلسلہ میں شہر آ گیا ! پانچ بج رہے تھے۔ میں نے سوچا چلو کچھ
دوستوں سے مل آؤں۔ نہ جانے وہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ میں سب کے
پاس گیا۔ لیکن کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ میں
نے دیکھا خاکی وردی میں ملبوس ہاتھ میں دو تین موٹی موٹی کتابیں لئے حمید
چلا آ رہا ہے۔ جب وہ میرے بالکل قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس

کی بائیں طرف خاکی وردی میں لال حرف سے BIRLA لکھا ہوا ہے۔ اور پھر
اس نے مجھ سے کہا ——— "دیکھو ——— دیکھو میں کیا کہتا تھا کہ میں BIRLA
DALMIA برلا اور ڈالمیہ ہوں گا دیکھتے ہو میرے سینے
پر کیا لکھا ہے۔ اور یہ کہتے کہتے اس کے ویران اور خشک آنکھوں میں دو موٹے
موٹے قطرے لرزنے لگے۔ میں نے پوچھا۔ "اور سب کہاں ہیں"

" اور سب ——— سبھوں کا ایک حال ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔
"صلاح الدین بھی آرٹسٹ بن گیا ——— اور دھرم تلہ کے فٹ پاتھ پر اب بھی بیٹھا
اپنی مفلسی اور غربت کی تصویر بناتا ہوگا ——— شاکر بھی فلمی دنیا میں ہے۔ اب بھی
وہ سیٹی سینما میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ بیچتا ہوگا ——— سعید بھی اخبار میں
کام کر رہا ہے۔ وہ ابھی ابھی اسی راستے سے چیختا اور چلاتا ہوا گذرے گا
——— دیکھو ——— وہ دیکھو سعید آ رہا ہے۔ دیکھو اس کے ہاتھ میں اخباروں
کا ایک بنڈل ہے۔ سنا تم۔ وہ کیا چلا رہا ہے"۔ اور میں نے غور سے سننا شروع
کیا ——— سعید چلا رہا تھا ——— "آج کی تازہ خبر ——— دنیا کا سب سے بڑا ڈکٹیٹر
چل بسا۔ اسٹالن کی موت ——— تمام دنیا پر غم کے بادل ——— روس میں ماتم ———
——— آج کی تازہ خبر ——— آج کی تازہ خبر ———!!"

اور میرے دماغ نے آج سے ایک سال پہلے کی باتیں اُگلنی شروع کر دیں۔
"میں آرٹسٹ ہوں گا" ———!
"میں برلا اور ڈالمیہ بنوں گا" ———!!
"میں ہندوستانی فلموں کا معیار بلند کروں گا" ———!!!
"میں اسٹالن پیدا کروں گا۔ میں گورکی ہوں گا" ———!!!!
——— خیالات کا ہجوم۔ اسٹالن؟ لینن؟؟ گورکی؟؟؟
"نہیں نہیں ——— میرا ——— میرا نہیں سارے سنسار کا رہبر صرف نئی انقلاب،
نئی معاشرت ——— نئی تمدن ——— نئی اخلاق ——— نئی انسانیت ———
نئی جامع ——— نئی آخرت" ——— دفعتاً مسجد کے موذن نے پکارا ———
اور پھر پھر اکر رُک گیا ——— "اللہ اکبر ——— اللہ اکبر"
اور میرے قدم خود بخود مسجد کی طرف اُٹھنے لگے ———!!

تحریر کی جانچ

تصنیف :- بالتوج اسٹین (ہنگری)
ترجمہ :- سیف نوگانوی

"جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔ کیونکہ مجھے زیادہ وقت نہیں ہے۔" کہتے ہوئے مسٹر رچرڈسن اوریول نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ بڑھیا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا لکھ پتی بھتیجا جس سے ملاقات کرنے کے لئے اُسے ایک گھنٹہ سے زیادہ انتظار کرنا پڑا۔ اور اس کے لئے اُسے دربان کی جھڑکی بھی سننی پڑی۔ اس طرح روکھا برتاؤ کرے گا وہ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے رچرڈسن کی طرف دیکھنے لگی۔ رچرڈسن نے پھر اسی رکھائی سے کہا۔ "دیکھو پھوپھی پہلے بتا دوں اگر تم میرے پاس روپے پیسے کی مدد مانگنے آئی ہو تو مہربانی کر کے کچھ نہ کہو۔ معاف کرنا۔" بڑھیا نے روندھا ہوا گلا صاف کرتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔

"میں تم سے روپے پیسے نہیں مانگنے آئی ہوں۔ ہاں ایک عرض ضرور ہے۔"

"جلدی کہہ ڈالو فوراً مجھے ایک بہت بڑے تاجر سے ملنے جانا ہے۔"

"میرے بڑے بیٹے سیتیول کو تم اپنے دفتر میں جگہ دینے کی مہربانی کرو وہ بی کام میں اوّل آیا ہے اور بی اے میں بھی۔ بہت قابل خوش اخلاق اور محنتی ہے۔ شراب نہیں پیتا، جوا نہیں کھیلتا یہاں تک کہ ہم عمر عورتوں سے بھی نہیں ملتا۔ تمہارے بینک کے لئے وہ بہت قابل ثابت ہوگا۔" بڑھیا نے کہا۔

"لیکن میرے یہاں جگہ کہاں ہے؟" رچرڈسن نے جھنجھلا کر کہا۔

"جگہ تو ہے۔ دو خالی جگہوں کا کل اشتہار ہوا ہے مجھے پتہ لگا ہے۔"

"اس میں ایک مجھے بھرنا نہیں ہے۔"

"ایک تو ہے۔" "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم عرضی بھیج دینا۔"

"عرضی لکھا کر لائی ہوں۔" کہتے ہوئے بڑھیا نے ایک کاغذ میز پر رکھ دیا اور معافی مانگ کر چلی گئی۔ اس کے چلے جانے پر رچرڈسن نے غصہ میں عرضی پھاڑ دی اور بڑبڑانے لگا۔ "ان غریبوں اور رشتہ داروں نے تو بس ناک میں دم ہی کر دیا ہے۔" کچھ لمحے بعد اسے یاد آیا۔ لڑکپن میں یہ بڑھیا مجھے کتنا چاہتی تھی۔ ۔۔میرے لئے گرم گرم نانیاں لاتی تھی۔ مجھے بیٹے سمجھ کے چوم لیتی تھی۔ ۔۔میں نے بُرا کیا۔ مجھے عرضی تو کم از کم نہیں پھاڑنی چاہئے تھی۔ خوش قسمتی سے وہ لڑکا اگر انٹرویو میں چُن لیا جاتا تو میرا کیا بگڑتا۔ مسٹر رچرڈسن مضطرب ہو گئے۔ انھوں نے اپنے سکریٹری کو اطلاع دی کہ آدھے گھنٹے تک کوئی ان سے نہ ملے۔ دروازہ بند کر کے انھوں نے عرضی کے ٹکڑے جمع کئے۔ اور اپنے ہاتھ سے اس کی نقل کر ڈالی۔ عرضی اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو تھماتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "دیکھو اس کو بھی رکھ لو۔ میرا رشتہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اس وجہ سے اس کی رعایت کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ انٹرویو میں پورا اترے تو لینا۔ ورنہ نہیں۔"

کچھ دنوں بعد بوڑھی پھوپھی پھر آئی۔ اس نے بڑی ناامیدی سے کہا کہ اس کے لڑکے کو نوکری نہیں ملی حالانکہ انٹرویو میں وہ اوّل آیا تھا۔ جس شخص کو اس جگہ رکھا گیا ہے وہ خود رئیس ہے اور بدکرداری کیلئے شہر بھر میں بدنام بھی ہے۔

مسٹر رچرڈسن نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں اس کی جانچ کروں گا۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی مجھے وقت نہیں ہے۔ گورنر کے یہاں جانا ہے۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔"

بڑھیا کے چلے جانے پر انھوں نے اپنے سکریٹری سے اس تقرر کے بارے میں پوچھا۔

"کیوں وہ لڑکا قابل نہیں تھا؟"

"نہیں صاحب انٹرویو میں تو اوّل آیا تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔"

"تو پھر؟" جھنجھلا کر رچرڈسن نے پوچھا۔

"آپ کے حکم کے مطابق ہم نے اسکی عرضی تحریر جانچنے کے لئے ماہر تحریر کو دی۔ اس نے اپنی جانچ میں بتایا تھا۔ کہ ایسے حروف لکھنے والا شخص جواری، شرابی، اور بدکار ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اُسے نہیں رکھا۔" مسٹر رچرڈسن کے ہاتھ سے پائپ چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

(ترجمہ بتوسط ہندی)

ایڈورڈ کرینک شا

روسی مصنفین کا مقام ___ آج کے حالات میں

(مندرجہ ذیل مقالہ ہندوستان ٹائمز ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا ہے۔ کمیونسٹ مصنفین کو جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ غیر متوقع نہیں ایک کلیت پسند نظام میں ایسی دشواریاں پیش آنی چاہئیں دیکھنا یہ ہے کہ روسی مصنفین ان دشواریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ بالخصوص اب جبکہ پالیسی کا رخ پیچھے پلٹ کر اپنی سابقہ روایات کی طرف آ رہا ہے ۔ ادارہ)

برسوں کے بعد ماسکو میں ایک دلچسپ ترین موقع آیا۔ اظہار بیان کا یہ بذار مصنفین کی ایک ایسی کانگریس کے لئے جو ابھی سست سالی کے لئے ممتاز تھی، بظاہر غلط معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت میں سست سالی بھی دلچسپی ہی کا جزو تھی۔ وہاں آتش افشانیاں نہیں ہوئیں۔ مصنفین اپنے اس مقام کو محفوظ تر بنانے میں لگے رہے۔ جو انہیں اسٹالن کی موت کے بعد حاصل ہوا۔ یہ مقام بہت اہم ہے۔

روسی مصنفین سے یہ توقع لگانی درست نہیں کہ وہ عموماً ادب برائے ادب یا خود نمائی کی خاطر خود نمائی کرنے پر یقین رکھتے ہوں گے۔ ان کے یہاں تعلیمی و اصلاحی عناصر پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔ ٹالسٹائی بھی جب یہ کہتا ہے کہ جوتوں کا ایک عمدہ جوڑا شکسپیر سے زیادہ اہم ہے تو اس لحاظ سے وہ اپنے مرکز سے دور نہیں معلوم ہوتا۔ انیسویں صدی کے روسی مصنفین کا ایک سلسلہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جن کی نظر میں ادب کا ایک سماجی مقصد ہونا ہمیشہ ضروری رہا ہے۔

ادیب کی یاسیت

یہ بات کہ روایت کا وجود ہے آسانی سے ٹھیک ثابت کی جا سکتی ہے

بہت سے دلائل ہیں جو موافقت میں دیئے جا سکتے ہیں مثال کے طور پر یہ ممکن ہے کہ ایک انفرادیت پسند مصنف کے خلاف جو اظہار خیال کی آزادی کے پردے میں ہی یاسیت کو دوسروں پر عائد کر دیا جاتا ہے دلائل کا ایک محاذ قائم کر دیا جائے روسی مصنف کہے گا تو کچھ آپ کر سکتے ہیں اگر اس کا نتیجہ ناامیدی کے سوا کچھ نہیں تو کم سے کم خاموش رہ کر ہی خوش دوقی کا ثبوت دیجئے یہ بات تو ٹھیک ہے ___ اگرچہ جواباً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی نہیں جو ایک کلیت پسند ریاست کے نظام میں قابل عمل بھی ہو۔

Zhdanovism کبھی بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

فن کاروں پر کچھ پابندیاں عائد کر دیتے ہیں ___ اور پوری سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے انہیں کرے اور مخصوص سرکاری پالیسیوں کی تبلیغ کرانے میں بہت بڑا فرق ہے لیکن Zhdanovism اسٹالن کے ساتھ مر چکا ہے۔ روسی مصنف سے ابھی تک یہی توقع لگائی جا رہی ہے کہ وہ کمیونسٹ حکومت کے ساتھ ساتھ چلے گا لیکن کریملن اب یہ بتانے کی طرف مائل نہیں کہ اسے کیا لکھنا چاہئے۔

تقریباً ایک برس سے بڑی غیر یقینی پھیلی ہوئی ہے۔ کھلے ہوئے جذبات عالیہ میں جو اُبال ۱۹۵۲ء کے آخر میں بدھصوں کے ڈھیلے ہونے سے آیا تھا اسے سختی سے بجھا دیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے افراد پر حملوں اور دہشت الزامیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو سنٹرل کمیٹی کی نگاہوں میں حد سے آگے بڑھ چکے تھے۔ اور انہیں تیز لہجے میں بُرا بھلا کہا گیا۔ اہرن برگ کو اظہار رائے کے واضح رجحان کی بدولت اور زورین (Zorin) کو اس لئے کہ اس نے حکومت کی طلب پر اپنے طنز کو غیر محتاط طریقہ سے استعمال کیا تھا۔ سرکاری طور پر اس بات سے اتفاق ظاہر کیا گیا کہ سوویٹ یونین میں بہت سی چیزیں غلط ہیں اور ان پر طنز کیا جا سکتا ہے لیکن بات کہنے اور کرنے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔

زورین کے ڈرامہ "مہمان" (The Guests) کو اس کی ایک بھیانک مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس میں ایک پرانے تحلیت پسند قسم کے انقلابی سے جو لے نتیجہ آمادۂ جنگ رہتا تھا ___ اس کے ہی ایک ایسے لڑکے کی کشمکش دکھائی گئی تھی جسے نئی بیوروکریسی کے ممبر کی حیثیت سے بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ اس کے پاس موٹر کار بھی تھی ایک دیہاتی بنگلہ بھی تھا اور وہ ہمیشہ ایسے اتفاقات پر نظر جمائے رہتا تھا جو مفید مطلب ثابت ہو سکیں۔ زورین کا قصور یہ تھا کہ اس نے اس نوجوان Kurpochev کے ناخوشگوار قسم

کے کیریکٹر کو روسی نظام کی پیداوار بتایا تھا۔ اس پر تنقید کی گئی کہ یقیناً ہمارے اندر Kirpichev موجود ہیں لیکن وہ نظام کی پیداوار نہیں، وہ ماضی کی افسوس ناک باقیات ہیں۔"

کیا دھندلکا کم ہو رہا ہے

۱۹۵۴ء کا بیشتر حصہ ایسا رہا کہ مصنفوں اور فن کاروں کو کچھ پتہ نہیں لگتا کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں اگر وہ اپنی تخلیقات کو خواب آور گولیاں بننے سے روکتے (یعنی حکومت کے مطلوبہ اثرات پیدا کرنا چاہتے) تو الزام لگایا جاتا کہ انھوں نے حقیقت سے آنکھیں پھیر لی ہیں اور اگر وہ حقائق کی عکاسی کرتے تو اعتراض ہوتا کہ انھوں نے تصویر کو بگاڑ کر پیش کیا ہے۔

ماسکو کی حالیہ آل یونین کانگریس کے بعد ان لوگوں کو پہلے سے زیادہ خوشی محسوس ہونی چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ ابھی تک ادب کا اولین فرض پارٹی کی خدمت ہی سمجھا جاتا ہے اور یہ بات بھی اتنی ہی واضح ہے کہ جس وقت پارٹی یہ جان لیتی ہے کہ اسے کس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت اس چیز کے بارے میں وہ کافی دھندلکے میں ہوتی جو وہ چاہتی ہے ——— مگر اس کے کہ اسے لازماً زیادہ زوردار ادب کی ضرورت ہے۔ اور اب غالباً آخری طور سے یہ طے ہو چکا ہے کہ سانچوں کے مطابق کتابیں نہیں تیار کی جا سکتیں۔

اس اجتماع کے موقع پر مصنفین نے محسوس کر لیا کہ ان کے اندر اس خیال کا مذاق اڑانے کا رجحان کافی مضبوط ہو چکا ہے۔ ناول نگار فیڈن (Fedin) نے کہا: "لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ سوشلسٹ حقیقت پسندی کی جامع تعریف کیا ہے اس سے زیادہ بیکار بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ پچاس حصہ ایک اتباتی رجحان کے ہیرو کو لیجئے پانچ حصہ منفی رجحان کے ہیرو کو۔ ایک حصہ معاشرتی تضاد کو، ایک حصہ رومانیت کو اور سو حصہ مقطر پانی کو ——— آپ سوشلسٹ حقیقت پسندی کو تیار پائیں گے۔" آگے چل کر فیڈن نے کہا کہ اصل معاملہ تو انفرادی ادیب کا ہے۔

نصب العین

بہرکیف، حقیقت پسندی کی ایک تعریف ان کے یہاں موجود ہے اور روسی مصنفین اس تعریف پر یقین رکھتے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں سمونوف (Simonov) نے ان سب مسائل کو یکجا کرتے ہوئے کہا: "سوشلسٹ حقیقت پسندی کی جمالیات یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ زندگی کی مبارک اور حسین تصویریں پیش کی جائیں جبکہ زندگی سخت دشوار اور بے رحم نظر آتی ہو۔ لیکن یہ مطالبہ ضرور کرتی ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک نصب العین ہونا چاہیئے ہر قربانی کا وہ مقصد نظر میں رہنا چاہیئے جس کے لئے قربانی کی گئی ہو اور ہر عارضی شکست کے پیچھے آخری فتح کا امید افزا پہلو ہونا چاہیے۔" دوسرے الفاظ میں جیسا کہ سمونوف نے خود بھی اشارہ کیا عقیدہ کا ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ کانگریس میں Zhdanovism کی بدترین تخلیقات پر پھبتیاں کسی گئیں عوام کو مستیوں اور عداد و شمار میں گم کر دینے کے رجحان کو بھی زیر بحث لایا گیا سمونوف نے مزید کہا "اب میں ٹریکٹر یا سیل گاڑی اور ریل کے انجن سے کا استعمال ممکن ہے، سوال صرف اس کا ہے کہ انھیں چلانے والے کس قسم کے لوگ ہیں۔" قارئین اور سامعین کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا بالخصوص Korneichuk نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور کہا کہ ڈرامہ کی سب سے اہم خصوصیت تفریحی قدر و قیمت ہے۔

اسلوب مضامین کے لحاظ سے مصنفین کی درجہ بندی کی بھی شدید مخالفت کی گئی اور نقادوں کو بھی ہیئت اور طریقۂ اظہار سے صرف نظر کرنے پر برا بھلا کہا گیا۔ فیڈن نے کہا "نقادوں کا فارم کے تجزیہ سے انکار Formalism ہے جو بالکل الٹی شکل میں سامنے آیا ہے۔"

مختصر یہ کہ روسی مصنفین سے جس بات کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ عقیدہ کا رجحان رکھنا اور اس کو بحث تر ساتا ہے۔ اور عقیدہ ظاہر ہے کہ کمیونزم ہے۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تب وہ اپنے آپ کو ہر طریقہ اور ہر ڈھنگ سے پیش کر سکتے ہیں۔ صرف عقیدہ نہ رکھنے والوں کو خاموش رہنا پڑے گا۔

آدھا تیتر آدھا بٹیر

متین طارق

کون ایسا لکھا پڑھا ہوگا جس نے اقبال کا نام اور کلام نہ سنا ہو مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آج کے نقادوں نے بہت سے پڑھے لکھوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ اقبال کوئی پرانی قسم کے میراثی تھے جن کا کام زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں ہوتا چنانچہ بعض اوقات تو خیال گذرتا ہے کہ یہ حضرت شاعر بھی تھے یا یوں ہی عمر بھر اندھوں میں کانے سردار بنے رہے نیز اُن کے دیوان کو ہم شعر ہی کہیں یا دیوانے کی بڑ۔ سر پیر کبھی پورب کی ہانک دی کبھی پچھم کی۔ کبھی سیاسی مسئلہ چھیڑ دیا کبھی ملکی واہ وا واہ۔ نہ غم جاناں نہ شب ہجراں۔ نہ سگ لیلیٰ نہ محبوب کا دربان شاعری ہوئی کوئی سیاسی رپورٹ ہو گئی۔

پھر شاعر ہوتا ہے شاعری کیلئے اور شاعری اس لئے ہوتی ہے کہ قوالوں کے مواد میں اضافہ ہو مگر یہاں لے دے کے "حقیقت منتظر" تھی سو وہ بھی لباس مجاز میں ہے اس پر طرہ یہ کہ ہر آدمی منہ دھو کر یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اقبال انھیں کے خاندان سے تھے یا اس میں کچھ جھوٹ ہے تو کم از کم انھوں نے جو کچھ لکھا وہ تو انھیں کیلئے لکھا ہے اور اگر کہیں خدانخواستہ وہ نہ ہوتے تو شاید اقبال بھی نہ ہوتے نہ شاعر بنتے نہ شعر کہتے

چنانچہ یہ اسی پاک خیال کا صدقہ ہے کہ جس کو دیکھو نعرہ لگا رہا ہے کہ

اقبال ہمارا ہے
کیونکہ وہ شاعر ہے
اقبال ہمارا ہے
کیونکہ اُس کی شاعری اشتراکیت پسند ہے
اقبال ہمارا ہے
کیونکہ اُس کا مذہب جمہوریت کا داعی ہے
ہمارے اقبال نے کہا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
اُن کے اقبال نے کہا ہے
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی، اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

جمہوریت نواز اقبال نے کہا
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے ۔ پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

معلوم نہیں مالیخولیا کس کو ہے کیونکہ خود اقبال بڑے مولوی صاحب کے استفسار پر کہہ چکے ہیں کہ

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اس پکی دلیل کے بعد بھی اگر آپ کا تمسخر کو ہی جی چاہتا ہے تو پھر ہاتھی اور اندھوں کی حکایت دہرائیے جس میں بقول شخصے ہر ایک نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہاتھی کا نام تجویز کیا تھا یعنی جس کے ہاتھ میں کان آیا اُس نے کہا چھاج ہے جس نے پیروں پر ہاتھ پھیرا وہ سمجھا کہ یہ کھمبا ہے جس نے پیٹ کو دیکھا اُس نے فیصلہ دیا کہ یہ دیوار ہے اور جس نے پونچھ پکڑی وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو یہ رسّی ہے

غرض جس طرح اندھوں کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی تھی اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی کی تکا بوٹی ہوئی جس کے جو سمجھ میں آجاتا ہے ——— کہہ دیتا ہے جو کہہ دیتا ہے اُسے ثابت کر دیتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ وہ نرے شاعر تھے کیونکہ شاعری کے علاوہ اور کوئی کام اُن کے بس کا نہ تھا۔ کہیں سے آواز آتی ہے کہ اقبال اشتراکیت کے پرستار تھے کیونکہ عمر بھر سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ جمہوریت پسند تھے کیونکہ اُن کا حقہ ہر کوئی پی سکتا تھا۔ کچھ اور ہیں جنہوں نے اقبال کے الحادی ہونے کا فتویٰ دیدیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بے نمازوں نے جب کبھی نماز ادا کی تو حضرت علامہ کو دیر سے بلانا پڑا ہے۔ ایک اور صاحب جو خیر سے اب مرحوم ہیں اس سے بھی دور کی کوڑی لائے ہیں اُن کا خیال ہے کہ اگر قرآن اُردو زبان میں نازل ہوتا تو اقبال کا کلام اُس کے لئے موزوں ہوتا"

ایسی عقلمندی کی بات کو کوئی عقلمند ہی سراہ سکتا لیکن اس سے

"شاعری جز ویست از پیغمبری"

سے خبط کا مزورتیہ چلتا ہے کہ کس طرح لوگوں کے دماغوں پر مسلط ہے جبھی تو اس ریڈیو اور لاسلکی کے دور میں دیوان حافظ سے فال نکالنے کا دستور جاری ہے اور خود بیچارے حافظ شیرازی

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

بہرکیف جتنے منہ اتنی باتیں ہیں البتہ ردعمل کے طور پر "اقبال بچاؤ" کی تحریک بھی چل پڑی ہے کیوں بقول شخصے چور آچکے میراث اقبال کو لوٹ رہے ہیں ہم اور آپ اب تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ مال جان زر دیہ پیسہ لٹتے ہیں مگر علم کی دولت لٹتی ہے نہ کم ہوتی ہے مگر یہاں ادبی لقف زنی کا رونا ہے چور دروازے سے اقبال کا کلام کہیں سے کہیں منتقل ہو رہا ہے اس لئے اس کا سچا ماہر مرد ادب پر فرض ہے جو اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے وہ کافر ہے۔

گو یہ بات بھی تند بد حد لے میں کہی گئی ہے لیکن اس سے یہ ظاہر ضرور ہوتا ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی رتصدیق حرام ہے پر اب اس آدھا تیتر آدھا بٹیر کا حل ہو تو کیا ہو؟

اگر کہیں ایک انار کا معاملہ ہوتا تو ہم کہہ دیتے کہ چلو دانہ دانہ بانٹ دو مگر یہاں معاملہ ہے شعروں کا اور وہ بھی اقبال کے جہاں ایک ہی شعر کی مختلف تعبیریں ہوتی ہیں مثلاً مرحوم کے اس شعر کو دیکھئے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

سنا ہے کہ علامہ نے یہ شعر تحریک خلافت کے لئے لکھا تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہر د رپورٹ سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور تو اور سینما والوں کا کہنا ہے کہ یہ شعر ایک تاریخی فلم کے لئے تیار کرایا گیا لیکن افسوس کہ اس کو اسٹیج نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی ضعیف روایت کی سیر لے کر عہد حاضر کے شعرا سینماؤں میں گانے لکھنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اب ہو تو کیا بحث شش و پنج ہے آج تک شعر و ادب کی کوئی ایسی چھلنی بھی ایجاد نہیں ہوئی کہ شاعر کا کلام اس میں ڈال کر موٹا باریک کلام علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ البتہ دو تجاویز میرے دماغ میں ہیں جس میں پہلی ترکیب کاٹ چھانٹ کی ہے یعنی ڈاک گاڑی کے ڈبے کی طرح خاص خاص رائج الوقت نظریات کے خانے بنا لئے جائیں اور اقبال کے کلام میں سے حصّوں کے میلنڈوں کی طرح ہر خانے کے لیبل کے مطابق ورق ورق شعر شعر اور لفظ لفظ اٹھا کر ہر خانے میں ڈالتے رہئے۔ اور آخر میں ہر ٹکڑے کو یکجا کر کے سی دیا جائے تاکہ دور ہی سے بنگال ہیر آئیل کی طرح پہچان لیا جائے کہ فلاں شعر یا لفظ ۔۔ کارخانے مزدور کی نسل سے اور فلاں "دو رس پیٹ" سے اور یہ نشانِ جمہوریت۔

جہاں تک شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہے وہ تو آسان ہے مگر الفاظ کا انتخاب مشکل ہو جائیگا۔

مثلاً یہ شعر

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
میں سے پھر کیا نکال کر پیوند کے لئے

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جہاں میں دانہ کوئی حیثم اختیار کرے ،
لگانا پڑے گا اس طرح اس شعر کی حیثیت بھی بلند ہو جائے گی اور وقت کا تقاضہ بھی پورا ہو جائے گا۔

ایسے ہی لفظ خودی اور خودی سے تعلقات ایک جگہ جمع ہو جائیں گے جس سے اہل حال کو اچھا خاصہ سرمایہ ہاتھ آجائیگا اور وہ تلاش کی زحمت سے بچ جائیں گے۔

دوسرا طریقہ ہے ٹھیکے کا جو کارآمد بھی زیادہ ہے اور آسان بھی ترکیب یہ ہے کہ اقبال کا آج تک کا شائع شدہ کلام ہر ہر شہر ہر ہر مطبع اور ہر ایک کتب خانے سے ایک جگہ گڈمڈ کر کے چولہے پر رکھ کر عرق کھینچ لیا جائے اور سب سے پہلی بوتل کا نام عرق اقبال رکھا جائے پھر اس کے بعد جوہر اقبال اور روح اقبال وغیرہ۔

کام کی آسانی تو ظاہر ہے کہ لوگ ہمیشہ سے ایسے مرکبات تیار کرنے کے عادی ہیں فائدہ مزید یہ ہوگا کہ مشک آنست کہ خود ببوید ۔ نہ کہ عطار بگوید

شاید لوگ یہ کہیں گے کہ اس طرح تو کتب خانہ اچھا خاصہ طبلۂ عطار ہو جائیگا مگر کچھ بھی ہو یہ جھگڑا مارنے کا ایک ہی نسخہ ہے جس کو از راہ اصلاح زہر مار کرنا پڑیگا اور اگر آپ ایسا نہ کر سکیں تو خادم بحیثیت معترض ادب چلانے سے باز آئیں اور اقبال کو اقبال ہی رہنے دیں اور اس کے کہنے کے مطابق

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

حمید اللہ خان انجم

کیریکٹر

کیریکٹر نام ہے اخلاقی Discipline کا جس سے انسان کی اپنی عملی زندگی میں ایک راسخ اور مستقل میلان طبعی پیدا ہو جاتا ہے جو بلا ارادہ خود بخود ایسا عمل کرتا رہتا ہے۔ جس انسان میں کیریکٹر نہیں وہ نہ صرف نکما اور بیکار آدمی ہے بلکہ اس کا وجود سماج کے لئے بہت مضر اور تباہ کن ہے محض علم حاصل کر لینے سے کیریکٹر نہیں بنتا بڑے بڑے عالم فاضل لوگ ایسے گذرے ہیں جو باوجود تبحر علمی اور عقلی خصوصیت کے اچھا کیریکٹر نہیں رکھتے تھے کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے ایک مخصوص نصاب تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ محض رائج الوقت کتابوں سے کیریکٹر نہیں پیدا ہو سکتا۔ کتابوں کے انتخاب میں غیر معمولی ذہن کی ضرورت ہے۔ ہر ماہر علوم و فنون اس کام کو نہیں کر سکتا۔ قانون کے ذریعہ سے بھی کیریکٹر نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ قانون جرائم کی روک تھام ایک حد تک کر سکتا ہے۔ مگر جرائم نہ کرنے کی صلاحیت اور عمدہ خصلت نہیں پیدا کر سکتا کیریکٹر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی عمدہ کیریکٹر کے حامل میں دیانت ایمانداری۔ حق گوئی۔ حق پرستی۔ مستقل مزاجی۔ استواری۔ بنی نوع انسان سے ہمدردی۔ راست گوئی وغیرہ وغیرہ عمدہ خصائل پائے جاتے ہیں۔ عمدہ کیریکٹر کا مبدا اصل میں فطرت سلیم ہے۔ جو مذہب کی اخلاقی تعلیمات سے، [illegible] ماحول اور سماج یا سوسائٹی کے اثر سے پختگی حاصل کرتی ہے۔ جس کا سماج جس کا خود ہی کیریکٹر گرا ہوا ہے وہ عمدہ کیریکٹر کے آدمی پیدا نہیں کر سکتا۔ عمدہ کیریکٹر کو [illegible] فروغ ہو سکتا ہے۔ بیمار سماج ملک کی بربادی کا سبب ہے۔ ملک کی اصلاح و بہبودی کا اچھے سے اچھا منصوبہ اور بہتر سے بہتر [illegible] اس کی [illegible] سے تباہ و برباد ہو جاتا ہے آج کل سماج کو [illegible] بگاڑنے والی سب سے زبردست چیز سینما ہے۔ سینما کا اصل مقصد دولت حاصل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی مخرب اخلاق تصویریں پبلک کے سامنے لائی جاتی ہیں۔ محض ناچ گانے اور بھڑکیلی حرکات سے حاضرین کو خوش کیا جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس فن میں نام پیدا کر لیا ہے وہ ملک کے بڑے آدمیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے اعزاز انہیں عطا ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ناچ گانا یا سینما بجائے خود بری چیز نہیں ہیں یہ تمدن کے اہم عناصر ہیں اور انہیں نظر انداز رکھ کر ان کی ضرور اصلاح کرنا چاہئے سینما میں تاریخی، اخلاقی، معاشرتی سین دکھانا چاہئے جس سے دیکھنے والے کچھ سیکھ سکیں لوٹنے کھسوٹنے دور از کار کہانیوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ایکٹنگ اور [illegible] نظر نہیں ہونے چاہئیں۔

کیریکٹر (Character) کی تعمیر کا وقت سات سال کی عمر سے لیکر پچیس ۲۵ سال کی عمر تک ہوتا ہے اس زمانہ میں لڑکے سادہ لوح ہوتے ہیں اور جو برا یا بھلا اثر اس زمانہ کم عمری کی طبیعت پر پڑتا ہے وہی مستقل اور دیرپا اور ان کے آئندہ زندگی کے اخلاق کی جڑ اور بنیاد ہوتا ہے۔ اگر لڑکے صحیح راہ پر چلائے گئے اور مناسب تربیت دی گئی اور سماج کا بھی اچھا اثر ان پر پڑتا رہا تو عمدہ کیریکٹر تعمیر ہو سکتا ہے۔ چوبیس ۲۴ پچیس ۲۵ سال کی عمر کے بعد کیریکٹر کی تعمیر نہیں ہو سکتی جو رجحان ہو چکتا ہے اسی میں اضافہ اور اسی کو فروغ ہوتا رہتا ہے نئے کیریکٹر کی بنیاد نہیں پڑ سکتی ہے۔ طالب علم لکیر کا فقیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہماری موجودہ سماج کی حالت بہت افسوس کے قابل ہے۔ قریب قریب پورے سماج کا ڈھانچہ بگڑا ہوا ہے اور سماج کی حالت ایسی ہو چکی ہے اب سدھر نہیں سکتی۔ نہ پولیس کے قابو کی چیز ہے اور نہ گورنمنٹ کے۔ اس کے اسباب جن کی تفصیل طول طویل ہے جو اس مختصر مضمون میں بے محل ہے۔ ایسی سماج سے یہ توقع رکھنا کہ آئندہ نسل کے اخلاق کو درست کرنے میں مدد کرے گی بالکل عبث ہے ——— ادھر طریقۂ تعلیم کا کوئی اصول یا خاص مقصد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ تر توجہ علمی کاموں پر ہے اور وہ بھی بہت سطحی طریقہ پر اخلاقی اور روحانی تعلیم پر کوئی زور نہیں دیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ علمی زندگی اور جسمانی محنت اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں۔ مگر اخلاقی تعلیم و تربیت عملی زندگی کی جان ہیں۔ اس کے بغیر علم محض قالب بے جان ہے جو طرح طرح کے فسادات پیدا کر سکتا ہے۔ جو کتابیں مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان کا بھی

کوئی اصول اور مقصد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے انتخاب اور ان کے مضامین سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس اسکیم کے تحت میں وہ منتخب ہوئی ہیں یا اس اسکیم کے کس حصہ پر وہ خاص طور پر اثر انداز ہیں اور اخلاقی تعلیم اور تربیت کے لئے تو سارے نصاب میں کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔

لوگوں کے نام کے ساتھ ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ کی ڈگریاں لگی ہوئی ہیں۔ بے سمجھے بوجھے اُن سے کتابیں لکھوائی جاتی ہیں۔ اسی طرح بے سمجھے بوجھے کتابیں درج نصاب کردی جاتی ہیں۔ جو مجموعی طور پر اخلاق اور کیریکٹر تعمیر نہیں کر سکتیں۔ انواع اقسام کے خیالات سے لڑکوں کے دماغ میں بھرے جاتے ہیں۔ جوان کے دماغ میں بجائے یکسوئی کے انتشار پیدا کرتے ہیں اور کسی خاص شعبہ میں مہارت اور کمال حاصل کرنے میں ان کے سدراہ ہوتے ہیں —— مختصر یہ کہ لڑکوں میں عمدہ اخلاق پیدا کرنا تعلیم کا اوّلین مقصد ہے۔ جس قوم کے افراد کے عمدہ اخلاق نہیں ہوتے وہ ساری قوم کو تباہ کردیتے ہیں۔ قلت یا کثرتِ آبادی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر کسی قوم کی مردم شماری زیادہ ہوتی ہے مگر اس کا کیریکٹر خراب ہوتا ہے تو وہ گھاس پھونس کے انبار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اگر اس کی مردم شماری قلیل بھی ہوتی ہے مگر اس کے افراد عمدہ اخلاق کے حامل ہوتے ہیں تو باوجود قلت کے مثل کوہ فولاد کے ہر طرح مشکلات کا مقابلہ استقلال اور کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں اور نہ صرف قوم کی ہی قوت اور آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں بلکہ دوسری اقوام کی بھی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اُن پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ اور دنیا میں شان اور عزّت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ کسی کے دست نگر اور محتاج نہیں ہو سکتے بلکہ دوسروں کو اپنا دست نگر اور محتاج بنا سکتے ہیں۔ آج کل ہمارے دیس کے کیریکٹر کی خرابی پہلے سے زیادہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اور یہ خرابی زمانہ سابق کا ورثہ ہے مگر ملک کی آزادی کے غلط معنی سمجھنے سے اس میں روز بروز ترقی ہے۔ گویا قوم کے اصلی رجحان طبع پر سے روک ٹوک اور پابندیاں اُٹھ گئیں اور وہ اپنی اصلی اخلاقی حالت کا آزادی کے ساتھ اظہار کرنے لگی۔ آزادی کو غلط معنی پہنانا اور اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانا بھی کیریکٹر کی خرابی کا نتیجہ ہے۔

امن کے موضوع پر

بہترین نظموں کا مجموعہ

عالمی امن

قیمت —— آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ناشر

مکتبۂ معیار میرٹھ

ایک کشمیری آزاد نظم

مترجمہ: زین العابدین

میں بغاوت کروں گا

میں آج بغاوت کروں گا
میں آج بغاوت کروں گا

رسومات اور بے جا رواجوں سے
طبلوں کی تھاپوں اور گھنگرو کی جھنکاروں سے
ناز اور نخروں سے
میں آج بغاوت کروں گا
مجھے تختِ شاہی سے بغاوت کرنی ہے
بنگلوں، محلات اور شیشہ خانوں سے
کن شیشہ خانوں سے؟
جن میں رہکر نوجوانوں کی آنکھیں اس طرح خیرہ ہوئیں
کہ اب وہ بات سننی تک گوارا نہیں کرتے
کہ اب وہ کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں
کہ اُن میں وہ سوچ نہ رہی
کہ اُن میں وہ سمجھ نہ رہی
کہ اُن میں امتیاز کی قوت رہی
میں آج بغاوت کروں گا
مجھے آج بغاوت کرنی ہے
لالچ، ہوس اور خوف سے
اُن چکداروں اور سودخواروں سے
اُن غلّہ داروں سے

جو چور بازاری کرتے ہیں
جو قحط اور کال پڑنے پر خوش ہوتے ہیں
اُن نابکاروں سے
جو افراتفری اور طغیانی پر کمر باندھے ہوئے ہیں
جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں
جو جنگوں کے انتظار میں ہیں
اُن جنگ بازوں سے
موت کے ان بھیانک سایوں سے
مجھے آج ہزاروں اور لاکھوں خداؤں سے بغاوت کرنی ہے
آج ان کے نظام سے بغاوت کرنی ہے
جس میں بندے خود خدا بن جاتے ہیں
خود مالک بن جاتے ہیں
خود حاکم بن جاتے ہیں
جابر، قاہر اور ظالم بن جاتے ہیں
جو ایسا کرتے ہوئے دوسروں سے شرماتے نہیں
جو نہ خدا کا خوف کھاتے ہیں
جو آنے والی موت سے نہیں ڈرتے
جو موت کے بعد پھر جی اُٹھنے پر خندہ زن ہیں
جو اُس میدانِ حشر کا مذاق اڑاتے ہیں
جہاں ہر ایک تھرا اٹھے گا

خطوط و نکات

سید انور علی

اپریل کا پرچہ موصول ہوا۔ پڑھکر از حد خوشی ہوئی۔ تابش صاحب کی غزلیں بھی مرے لئے پڑھتا ہوں لیکن گزشتہ پرچہ میں یہ دیکھ کر تردد ہوا کہ جس نے کل دار و رسن کی سمت مسکرا کر دیکھنے کا مشورہ دیا تھا اس کا آج یہ حال کہ ؎

آج تک مسکرانے کی ہمت نہیں
ہم پہ گزرا ہے وہ دورِ ہمت شکن

معلوم ہوتا ہے انھوں نے بہت ہی ماضی بعید کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ یادِ رفتہ ست گراں محسوس ہونا بھی تو مشکل ہے لیکن اب تو انہیں اسی عزم کے ساتھ ہی دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کی وہ دعوت دیتے ہیں۔

بہر حال بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ آج میں آپ کو خط لکھ کر بعض باتوں کی طرف متوجہ کرنے کے خیالات لکھ رہا ہوں۔ معیار۔ نئی نسلیں۔ چراغِ راہ وغیرہ کے پرچے دسمبر تا مارچ آپ کی نظر سے گذر چکے ہوں گے۔ آج کل ہمارے مقالہ نگار تنقید کی طرف متوجہ ہیں لیکن میں ان کی تنقید میں وہ تبلیغی رنگ یا اصلاحی تنقید کی زبان اور انداز بیان نہیں پاتا جو ایک اسلامی ادب کے تنقید نگار کی ہونی چاہیئے۔ اگر اسی طرح تنقید کا کام انجام پاتا رہا تو گروہ بندی کا ڈر ہے اور یہ محض بے اعتدالی کی مرہون منت ہوگی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس طرف توجہ دیں۔ ادارہ اسلامی ادب کے نقاد کی ذمہ داریاں۔ انداز تنقید اور دوسرے اہم اداریے مفصل مقالات لکھکر دوسروں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ یہ نئے اختلافات اس نوزائیدہ تحریک کے لئے مضر ثابت رہیں گی

بعض لوگوں کے اندر یہ خامیاں اس وجہ سے ہیں کہ وہ تحریک اسلامی کی تمام ذمہ داریوں سے واقف نہیں ہیں اور نہ اس کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اگرچہ وہ خلوص نیت کے ساتھ اس سے وابستہ ہیں ضرورت اس کی ہے کہ انہیں مشوروں کے ذریعہ اس کی طرف متوجہ کیا جائے۔ بعض لوگوں میں نام و نمود کی بے پناہ خواہش ابھر رہی ہے۔ انہیں ادیب یا شاعر کہلانے کی خواہش اتنی عزیز ہے کہ بجائے سماج کے فرد ہونے کو ننگ سمجھتے ہیں۔ اپنی زندگی اور عمل کو ان اصولوں کا پابند کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے جن پر دنیا کی تعمیر کا عزم لیکر اٹھے ہیں۔ پتہ نہیں ان لوگوں کے پاس کونسی بصیرت ہے۔ جس سے وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ محض کمرے میں بیٹھکر شاعری کر دینے سے سماج کی برائیاں دور ہو جائیں گی۔ اس طرف ہمارے مقالہ نگاروں کو خاص توجہ دینی چاہیئے اور بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ بات اتارنی ہے کہ اسلامی ادیب پہلے سماج کا ایک فرد ہے پھر اس کی ادبی صلاحیتیں تو یہ محض اس مقصد کے لئے ذریعہ ہیں اصل مقصد نہیں۔ اس کی قوتیں حصولِ مقصد کے ذرائع میں صرف نہیں ہوں گی بلکہ ذرائع اس کے مقصد کے لئے استعمال ہوں گے۔

میں نے کوشش کی کہ دوسروں کو بھی خط لکھوں اور اس طرف متوجہ کرکے فرمائش کروں لیکن میرا دل کسی سے مطمئن نہیں ہوا۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ ——— اس پر توجہ دیں اور وقت کی اہم ضرورت سمجھکر قلم اٹھائیں۔

رحمان خاور

معیار کا تازہ پرچہ نظر نواز ہوا۔ کافی اچھا اور ستھرا پرچہ ہے۔ اور مستقبل کے آثار امید افزا ہی نظر آتے ہیں۔ بہر نوع غالباً معیار میری نظر سے پہلی ہی مرتبہ گذرا ہے۔ دل چاہتا ہے۔ کچھ لکھوں۔ چونکہ دوستوں کے اصرار پر نیا نیا ہی رسائل کی دنیا میں آیا ہوں۔ اب یہ بھی خوف غالب ہے کہ مبادا آپ کا پرچہ بھی دوسرے ملک کے ذرا چلتے ہوئے پرچوں کے ڈھرے پر تو نہیں چل رہا ہے جن میں صرف وہی ادیب شاعر شمولیت کر سکتے ہوں۔ جو مشہور ہوں۔ اور پرچہ کی بکری اپنے قلم کے زور سے نہیں بلکہ اپنے نام کے زور سے کرا سکیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "معیار" ان تمام جھمیلوں سے پاک صاف ہوگا۔ اور نئے لکھنے والوں کو موقعہ دیکر اپنے معیاری ہونے کا ثبوت دیتا رہے گا۔ میری مراد اس سے خدانخواستہ یہ بھی نہیں کہ نئے لکھنے والوں کی ہر چیز کو اپنا لیا جائے۔ نہیں۔ بلکہ معیاری۔

علمی تحقیقی — اور — ادبی کتابیں

کتاب	مصنف		قیمت
لسان القرآن — عربی اردو ڈکشنری	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	قیمت مجلد	دس روپے
تدبر قرآن	مولانا امین احسن اصلاحی	"	ڈھائی روپے
تنقیحات	مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	"	سوا دو روپے
پردہ	" " "	"	تین روپے
حقیقت نفاق	مولانا صدر الدین اصلاحی	"	ایک روپیہ آٹھ آنے
اساس دین کی تعمیر	" " "	"	دو روپے آٹھ آنے
مسلمانان ہند کا لائحہ عمل	مولانا ابو اللیث اصلاحی	"	تین روپے
کلام عربی (حصہ اول)	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	"	ایک روپیہ
کلام عربی (حصہ دوم)	" "	"	ایک روپیہ چار آنے
تجدید تصوف و سلوک	مولانا عبد الباری	"	پانچ روپے
حقوق الزوجین	مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	"	ایک روپیہ آٹھ آنے
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں	سید اصغر علی عابدی	"	تین روپے
اشتراکیت اور اسلام	مظہر الدین صدیقی	"	چار روپے آٹھ آنے
سود	مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	"	دو روپے بارہ آنے
گلگونہ	محمد یٰسین تسکین قریشی	"	دو روپے آٹھ آنے
ابھرتی کرنیں (افسانے)	مرتبہ نجم الاسلام	"	" " "
عالمی امن (نظمیں)	ادارہ معیار	"	آٹھ آنے
شوہر کار دگر (ناول)	نسیم انہونوی	"	ایک روپیہ چار آنے
شگفتہ (ناول)	" "	•	تین روپے
کوثر و تسنیم (مجموعہ کلام)	الم مظفر نگری	"	چار روپے
صحیفۂ قدرت (" " ")	قدرت میرٹھی	"	چار روپے آٹھ آنے
لوح و قلم (" ")	" "	"	پانچ روپے
مکمل فائلیں معیار ۱۹۵۲ء (مجلد)	..	"	تین روپے ۸ آنے
۱۹۵۳ء (" ")	" "	"	" "

ان کتابوں کے علاوہ دیگر علمی و ادبی کتابیں اور دینی کتب، قرآن شریف اور سیپارے وغیرہ بھی مل سکتے ہیں۔

مکتبۂ علم و ادب ——— شاہ پیر گیٹ میرٹھ

آپ کا بچہ

ماشاء اللہ! اب تو آپ کا بچہ چھ سات برس کا ہو گیا۔ کچھ پڑھنے بھی لگا۔
اب آپ اس کے نام پندرہ روزہ "نور" جاری کرا دیجئے۔

کیونکہ

"نور" کے مضامین ننھے منے ذہنوں کی نفسیات کے مطابق ہوتے ہیں۔
"نور" کہانیوں ہی کہانیوں میں دین کی باتیں ذہن نشین کر دیتا ہے۔
"نور" کی نظمیں اتنی سادہ اور پر لطف ہوتی ہیں کہ بچہ فوراً یاد کر لیتا ہے۔
"نور" میں بچوں کی آپ بیتی، مسلسل کہانیاں، معلوماتی مضامین، خطوط،
احادیث سبھی کچھ تو ہوتا ہے، آپ نمونہ منگا کر دیکھئے۔ آپ خود پسند کرینگے۔
اور آپ کا بچہ تو اس کا گرویدہ ہی ہو جائے گا۔

"نور" ساڑھے تین روپے میں سال بھر تک ہر مہینے دو بار آپ کے بچے کے ہاتھوں میں ہو گا۔

پاکستانی خریدار
اپنا چندہ مینیجر "چراغ راہ" لوئیا بلڈنگ آرام باغ کراچی بھیج کر رسالہ ہم سے طلب فرمائیں

مینیجر:۔ رسالہ "نور" مکتبہ الحسنات رام پور۔ یو، پی

قاموس القرآن

قرآن حکیم کے الفاظ و معانی کی مستند محققانہ توضیح

یعنی

قرآنی ڈکشنری

مرتبہ

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

صفحات ۸۰۰ سو ــــــ ٹائٹل رنگین بلاک

قیمت غیر مجلد سات روپئے مجلد آٹھ روپے

تدبر قرآن

قرآن اور اس کی دعوت کو سمجھنے کیلئے مولانا امین حسن اصلاحی نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں وہ تمام مباحث زیر بحث آگئے ہیں جن کا تعلق فہم قرآن سے ہے قرآن کے طالب علم کیلئے معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔

قیمت ــــــ تین روپے

بیان اللسان

مکمل عربی اردو ڈکشنری

تیس ہزار قدیم و جدید عربی لغات کا جامع و مستند ذخیرہ

تالیف: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

یہ لغت اب اہل علم اور ارباب ذوق کے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں اس کی بینظیر خصوصیات نے اسے مقبول خاص و عام کردیا ہے۔ علماء، طلبہ اور عام شائقین عربی سب ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں صرف یہ ایک لغت دوسری ضخیم لغات سے مستغنی کردیتی ہے

صفحات نوسو ــــــ کاغذ سفید چکنا

ــــــ ٹائٹل رنگین بلاک کا ــــــ

قیمت۔ آٹھ روپے۔ مجلد۔ چرمی دس روپے

مکتبہ علم و ادب شاہ پیر گیٹ میرٹھ

ماہنامہ معیار کا تنقید نمبر

جو

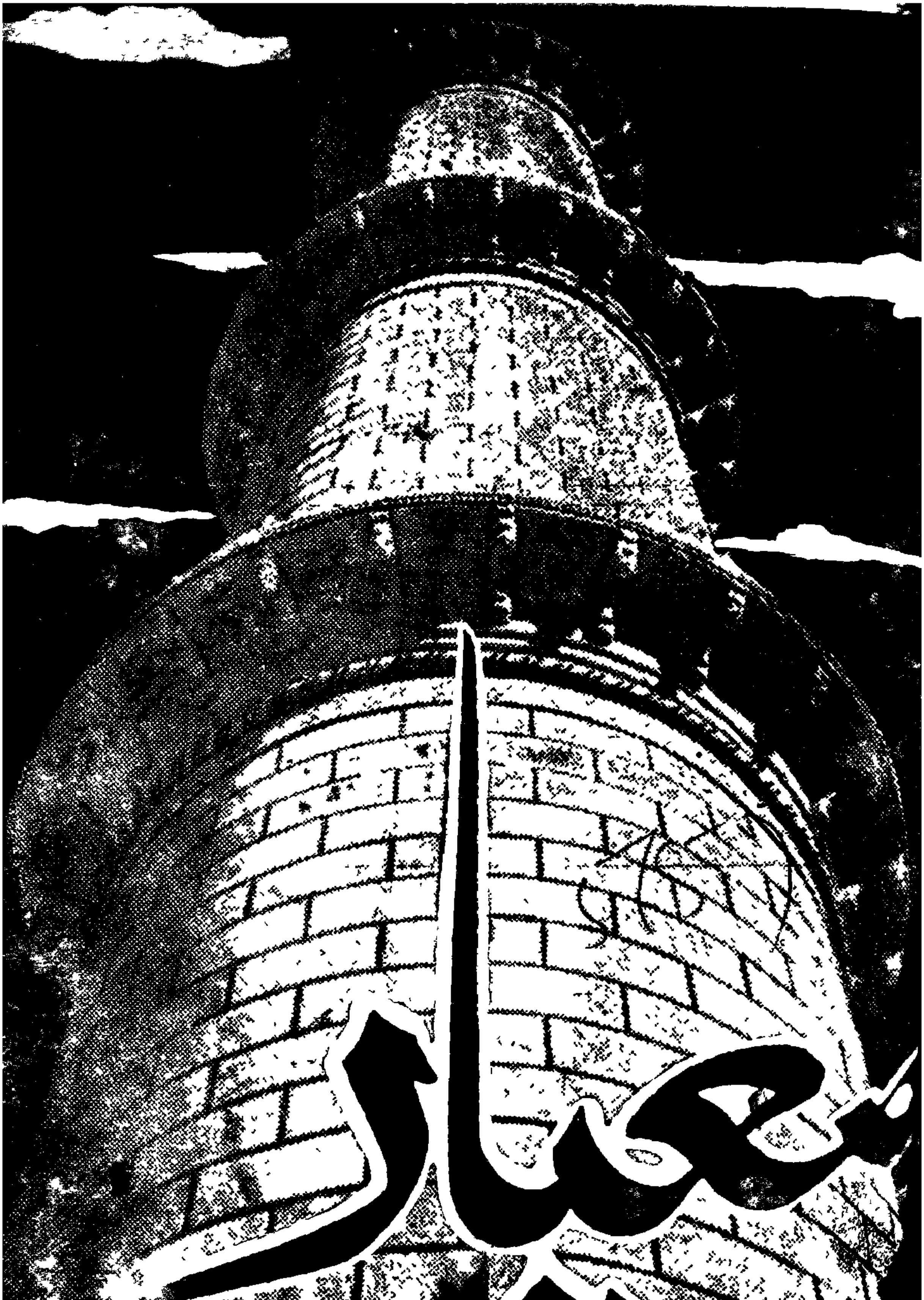
ادب اور تنقید کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ، صالح اور صحت مند رجحانات کی منہ بولتی تصویر، تعمیری ادب کی منزل کا واضح نشان، اسلامی ادب کی آفاقی قدروں کا حسین مرقع، دُنیائے ادب کے جاہلی نظریات کیلئے ایک مستقل چیلنج، مرعوب کُن باطل افکار پر ایک کاری ضرب ہے، تمام حق پسند اہلِ ذوق کے مطالعہ کے لائق تعمیری اور اسلامی ادب پر سند حاصل کرنے والی یہ عظیم پیش کش

صرف ——— ایک روپیہ ——— میں

مل سکتی ہے

مکتبہ معیار میرٹھ


it's SUMMER
FIROZ
لو گرمیاں آگئیں!
گرمیوں کے موسم میں عموماً آپ کا جی کسی کام پر نہیں لگتا اور آپ بے حد پیاس اور
تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔
"روح افزا" کا ایک گلاس آپ کو از سر نو تازہ دم اور بشاش بنا سکتا ہے۔ یہ پیاس
کو بجھاتا ہے۔ تھکاوٹ کو دور کرتا ہے۔ اور جسم میں تازگی اور فرحت پیدا کرتا ہے۔ یہ تازہ
پھلوں کے رس جڑی بوٹیوں اور پھولوں کے عرق سے تیار ہوتا ہے۔ اور وٹامن سی سے
بھرپور ہوتا ہے۔ روح افزا کا گلاس آپ کے جسم کو ۱۵۰ کلوریز طاقت بخشتا ہے۔
روح افزا
فرحت بخش اور تسکین دہ
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔
کتابچہ مشروب مشرق اپنے شہر کے اسٹاکسٹوں سے مفت طلب فرمائیں۔



صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ــــ ۵
نمبر ــــ ۵

مئی ۱۹۵۵ء

مدیر
نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیلِ زر اور تبادلہ زر کیلئے

دفتر ماہنامہ معیار صدیق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فصیلی لائن جیکب آباد

ترتیب

نظمیں

مقالے

غزلیں

افسانے

متفرقات

خطوط و نکات

خیال اپنا اپنا

نقش اوّل

تخلیقی ادب کے وصفی عناصر تین کہے جاتے ہیں۔

۱ــــ مواد (Matter)

۲ــــ اندازِ بیان (Manner)

۳ــــ حظ (Capacity to please)

مواد کی بنیاد زندگی کی حقیقتوں پر ہے۔ اندازِ بیان کی الفاظ کے انتخاب سے لیکر آہنگ تک مختلف چیزوں پر۔ اور حظ؟ حظ کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق جمالیاتی حس سے ہے جو ہر ایک میں کسی قدر مختلف پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حظ تخلیقی ادب کی ایک اہم خصوصیت ہے اسی لئے بعض لوگ تخلیقی ادب کو تفریحی ادب بھی کہتے ہیں۔ تخلیقی ادب کی بعض صورتوں میں جمالیاتی معیار کی ترکیب اتنی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ اِسے بنانے کے لئے ٹرائڈ کی سی چالاکی سے کام لیکر متضاد اصطلاحوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اعلیٰ پائے تک کے تخلیقی ادب میں بعض مناظر آپ کو ایسے ملیں گے جن کے دیکھنے سے آپ کو نفرت ہوگی۔ آپ وہ حصہ پڑھتے ہوئے انتہائی انقباض محسوس کریں گے۔ مگر بہرکیف وہ تخلیقی ادب کا ایک جزو ہے۔ اسپنسر کی **Fairy Queen** کے چند اجزا تو بلاشبہ اتنے مکروہ ہیں کہ آدمی پڑھکر لکھنے والے کے ذوق کا ماتم کرنے لگتا ہے۔ ملٹن کی دوزخ میں جو بھیانک پن ملتا ہے وہ کہیں کہیں ایسی صورت اختیار کرلیتا ہے کہ ہرگز اسے جمالیاتی حس کو تسکین دینے والا نہیں کہا جاسکتا۔ شکسپیر کی ٹریجڈیاں بعض بعض جگہ اتنی ڈراؤنی ہو جاتی ہیں کہ الحفیظ! ظاہر ہے کہ ان حصوں میں محظوظ کرنے کی صلاحیت نہیں مگر یقیناً کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو اس صلاحیت سے بھی اعلیٰ وارفع ہے جس کی وجہ سے ہم باوجود ان مناظر کو جن سے ہمیں کراہیت ہوتی ہے، ڈر لگتا ہے، نفرت پیدا ہوتی ہے۔ دلچسپی سے دیکھتے ہیں اور ہمارا ذہن ان میں کھو جاتا ہے۔

یہ کیا چیز ہے؟ اِس سوال کا جواب مشکل نہیں، اب سے بہت پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہ چیز قوتِ متخیلہ کو اپیل کرنے کی صلاحیت ہے جس کا تعلق **wit** سے ہے۔ اس صلاحیت کو سمجھنے کے لئے **wit** کی مختلف صورتوں کا بیان ضروری ہے۔ جس طرح آدمی کے حواس پانچ ہوتے ہیں اسی طرح ذہنی قوت کو بھی پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔

۱ــــ Common wit

۲ــــ Imagination

۳ــــ Fancy

۴ــــ Estimation

۵ــــ Memory

ادب اِن سب کا اظہار و استعمال چاہتا ہے۔ تب ہی قوتِ متخیلہ کو اپیل کرنے کی صلاحیت اُبھر سکتی ہے۔ ان کے اجزا کے مختلف تناسب سے ادب کی مختلف صورتیں بنتی ہیں **wit** اور **Humour** میں جو نازک فرق ہے وہ اسی تناسب کے سبب سے ہے۔ غرض کہ اس کو ادب میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اب دیکھئے کہ ادب میں قوتِ متخیلہ کو اپیل کرنے کے لئے کس طرح صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس موضوع پر سب سے اچھا پہلا مقالہ ایڈیسن کا ملتا ہے۔ جس میں وہ **Association of Ideas** کے اصول کی مدد سے گتھی کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں بالطبع حواس کی تصاویر کو ذہن میں اکٹھا کرتی ہے۔ جن سے ذہن ایسی تصویریں بنانے میں کامیاب ہوتا ہے جو انتہائی خیال آفریں ہوتی ہیں۔ اور محظوظ کرتی ہیں۔ تب وہ حظ کی دو قسمیں کرتا ہے ایک ابتدائی دوسری ثانوی۔ پہلی نظر کے سامنے کی چیزوں سے متعلق ہے۔ دوسری ان سے جو کہ نظر کے سامنے کی چیزوں کی مختلف تصویریں ذہن میں

جمع ہونے کے بعد Association of Images کے اصول پر مبنی ہیں تفصیل تو اسے لمبی چوڑی ہے جس کے اعادہ کا یہاں موقع نہیں۔ مگر اتنا ضرور اعادہ کے قابل ہے کہ اس طرح ابتدائی اور ثانوی کی تشریح سے وہ حقیقت پسندی ہے کہ دو اسکولوں کے اختلافی موڑ کو واضح کر دیتا ہے۔ اس طرح تخیل کی کارفرمائی کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آتا ہے مگر ہمیں اس پر زور دینا نہیں ہے۔ ہمیں یہاں سے ایک دوسری بحث کا آغاز کرنا ہے۔

ذہن کو اپیل کرنے کی صلاحیت، ہمارے قوائے عملی پر اثر ڈالتی ہے لیکن ذہن کو اپیل کرنے والی صلاحیت اس سے مختلف ہے۔ جذبے کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ وہ قوائے عملی کو تحریک دیدے یا کچھ جذبات کو دبا دے لیکن ذہن کو اپیل کرنے کی صلاحیت خود عمل کی راہ ذہن پر کھولتی ہے۔ اور شعورِ خفتہ کا شانہ ہلا کر جگاتی ہے طنز و مزاح میں اسی درجہ کی ذہنی اپیل کی صلاحیت کم ہوتی ہے محظوظ کرنے کی زیادہ۔ اسی لئے تمام اونچے درجہ کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ طنز و مزاح کا درجہ فکر انگیزی کے مقابلے میں کم ہے

علم طبیعیات میں جب کسی قوت کے مجموعی اثر کو دیکھا جاتا ہے تو صرف ایک مجموعی پیمانۂ قدر پر جانچا جاتا ہے لیکن خود اس کی تہہ میں کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ خاص طور پر قوت کے ساتھ وقت Time اور فاصلہ Space اسی طرح جو فنون میکانکی یا Lesser Arts کہلاتے ہیں ان میں بھی وقت اور فاصلہ اولین اہمیت رکھتے ہیں فنون لطیفہ Fine Arts کا بھی ایک پہلو ایسا ہے جو مادی وسائل کے تابع ہے مگر اس کا سب سے بڑا حصہ یعنی تخیل اس کا پوری طرح پابند نہیں کیونکہ وہ میکانکی کلی طور پر نہیں ہے۔ ادب میں ذہنی اپیل کی صلاحیت اسی لئے وقت اور فاصلہ کے احساس کو کم کر کے پیش کرتی ہے۔ جس کا تعلق پانچ Wits میں سے آخری دو یعنی Estimation اور Memory سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام اعلیٰ قسم کے کارناموں میں اثر انگیزی وقت اور فاصلہ کی طنابیں کھینچ کر ملا دیتی ہے۔ مجموعی اثر اس وقت اختصار کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی بعض ان شکلوں کی تفصیل سے فنکار کامیابی سے گریز کر جاتا ہے۔ جو اس کے مواد اور مواد کی بنیادی حقیقتوں سے متصادم ہو جاتی ہیں متصادم اس معنی میں کہ ان کا اثر پھیل کر کچھ کا کچھ انداز اختیار کر جاتا ہے۔

آج ادب میں اس بات کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جمالیاتی مناظر سے لیکر زندگی کے دوسرے پہلوؤں تک میں ایک طرح کی تفصیل پسندی پھیل گئی ہے جو اکثر بے موقع ہوتی ہے۔ اور اس لئے اس کا بے اثر ہونا ظاہر ہے۔

یونانی ادب کی Helen of Troy آج بھی زندہ ہے مگر آج کی تمام عریاں منظر کشی باوجود لذت پسندی کے اپنی موت مر رہی ہے۔ حالانکہ ہومر نے "ایلیڈ" میں نہ تو ہیلین کے جسم کی تعریف کی ہے نہ ناک کی۔ نقشے کی نہ آنکھ کی نہ بالوں کی نہ دوسرے اعضا کی۔ ہاں اس کے بجائے اس تاثر کو دکھایا ہے جو حسن کا اعلیٰ ترین نمونہ پیدا کر سکتا تھا۔

مارلو (Marlowe) [illegible] ایک حیرت انگیز عام تاثر کی بدولت شیکسپیئر کے تمام ڈراموں سے اسی طرح بڑھی ہوئی کہی جاتی ہیں۔ جس طرح اردو میں مومن کا ایک شعر [illegible] غالب کے دیوان سے۔ وہ Helen کے حسن کو تاثر کی زبان میں اس طرح ادا کرتا ہے۔

Was this the face that launched a thousand ships
And burnt the topless towers of Ilium

دور کیوں جایئے قرآن کی مثال اس سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔

حضرت یوسف کے حسن کا اظہار تاثر کے اظہار کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ حسن کو دیکھکر حسینانِ مصر نے بیخودی کے عالم میں اپنی انگلیاں کاٹ لیں اس کا حال لفظوں کی تفصیل میں کب آسکتا ہے اور آ بھی جائے تو کب ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مواد اور موضوع کے مقصد سے متصادم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حسن کے اظہار کیلئے حسن کے تاثر کو ذریعہ بنایا ہے۔ جو بیک وقت (Matter) کے اخلاقی پہلو اور (Manner) کے فنی پہلو کو کامیابی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔

ابوالمجاہد زاہد

پردہ

مجھ کو بے پردہ نکلنے پر نہ مجبور کرو

اے مرے ہمدم و دمساز، رفیق و سرتاج
آپ کہتے ہیں کہ پردہ تو ہے فرسودہ رواج
میں سمجھتی ہوں کہ پردہ ہے خواتین کی لاج
شرم و غیرت کے کچلنے پہ نہ مجبور کرو

قدرِ نسوانیتِ زن کی انھیں کیا معلوم
اپنے جلوؤں کی نمائش پہ جو اتراتی ہوں
اپنی غیرت کو جو بازار میں لے آتی ہوں
خود ہوسناک نگاہوں میں اُلجھ جاتی ہوں
رنگِ پاکیزگیٔ حُسن سے جو ہوں محروم

بے حجابانہ پھروں سیر گہوں میں تن کر
میرے دمساز! کبھی ہو نہ سکے گا ایسا
اپنی عِفّت کو کروں خود ہی ذلیل و رُسوا
دینِ فطرت کے تقاضوں کو بھلا کر توبہ!
میں بھی سڑکوں پہ چلوں "مردِ مؤنث" بن کر

اپنی خودداری و غیرت کو نہیں کھو سکتی
میرے سرتاج میں بے پردہ نہیں ہو سکتی

تنویر احمد عُلوی

پُلِ صراط

یہ فسردہ دلی یہ کاوشِ فکر
یہ جگر خستگی یہ عزمِ عمل
یہ تعطّل یہ گرمیٔ رفتار
یہ شکستِ یقیں یہ رزمِ عمل

یہ بگولے فضائے حرماں کے
آرزوؤں کے یہ حسین محمل
زندگی کی یہ راہ دُور و دراز
موت کی یہ قریب تر منزل

اِک دُھندلکے میں حال و مستقبل
ابر میں جیسے دو نوں وقت ملیں
یاس کی ظلمتوں میں اُمیدیں
جیسے تاریکیوں میں پھول کھلیں

اور یہ جان و جہاں کی آویزش
جیسے مبہم نمودِ شام و سحر
یہ تگاپو یہ جستجوئے مدام
جیسے تاروں کا ناتمام سفر

ہر قدم پر نشانِ اوج و حضیض
ہر نظر میں سوادِ سُود و زیاں
مُڑ تو سکتے ہیں رُک نہیں سکتے
جیسے دریا میں ایک موج رواں

یہ جہنم ہے اور یہ فردوس
وسط میں یہ بساط ہے اے دوست
دھار سے تیز بال سے باریک
زیست اِک پُل صراط ہے اے دوست

فاروق بانسپاری

آفتاب اور شاعر

خدا کی رحمتیں نازل ہوں خورشیدِ سحر تجھ پر
ضیا باری سے روشن کر دیا سارا جہاں تو نے
ستارے بن گئے شبنم کے قطرے سبزہ زاروں میں
زمیں کو لا کے پہنا دی قبائے آسماں تو نے
رگوں میں آتشِ سیّال بن کر موجِ خوں دوڑی
اُفق پر لیں کچھ اِس انداز سے انگڑائیاں تو نے
دلِ پژمردۂ عالم کو سوزِ زندگی دے کر
شعاعوں سے کیا محکم نظامِ جسم و جاں تو نے
عرب کی رُوح جاگی پردۂ چشمِ عجم اُٹھا
جہاں کے قافلوں کا جانبِ منزل قدم اُٹھا
بہارِ لالہ و گُل کے حسیں جلوے نظر آئے
نقوشِ زندگی صحنِ گلستاں میں اُبھر آئے
طلسمِ خواجگی ٹوٹا فضائے بحر و بر بدلی
جبینوں پر شکن آئی غلاموں کی نظر بدلی
دلوں میں ولولے پیدا ہوئے ارمان جاگ اُٹھے
فرنگی نیند کے ماتے ہوئے اِنسان جاگ اُٹھے
بہار آئی چمن میں رنگ پر سوزِ نہاں آیا
قفس کے رہنے والوں کو خیالِ آشیاں آیا
زمیں پر تو نے ہر سو فیض کا دریا بہایا ہے
اندھیرا میری دُنیا میں ابھی تک آہ چھایا ہے
اِسے بھی اپنے جلوؤں سے ذرا پُر نُور کرتا جا
مری تقدیر کی تاریکیاں بھی دُور کرتا جا

مسلماں اپنے سینے میں لئے رُوحِ جہانداری
ابھی تک ہے گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری
اُمیدِ لطف میں مغرب سے رسم وراہ رکھتا ہے
ستم یہ ہے کہ سینے میں دلِ آگاہ رکھتا ہے
مسلط ہے کلیسائی قیادت دینداروں پر
حقیقت رقص کرتی ہے توہم کے اشاروں پر
(آفتاب)

مری محفل میں چھیڑی مسلموں کی داستاں تُونے
ستم کی اِنتہا کر دی ستم کے نوحہ خواں تُونے
غضب ہے حیف بے غیرت سمندر اتنا ہو جائے
کہ پانی کے لئے شبنم کے آگے ہاتھ پھیلائے
یہ کیا اندھیر ہے خُمِ طالبِ مے ہو پیالوں سے
مُسلماں زندگی کی بھیک مانگے مرنے والوں سے
زمانے کو بدل دینے کی قوت لے کے بار دیں
خود اپنا وزن کرتا ہے زمانے کی ترازو میں
سمجھتا ہے جسے تو عالمِ بیدار یُیِ انساں
وہ اِک خوابِ پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں ناداں
یہ شانِ ارتقاء یہ پستیِ کردارِ انسانی
لباسِ حق میں باطل کر رہا ہے جلوہ افشانی
وہ آزادی کہ انسانوں کو جس نے کر دیا حیواں
بصد معصومیت اپنی تبہ کاری پہ ہے نازاں
سرِ محفل یہ عُریاں رقصِ نسوانی کے نظارے
جُھکی جاتی ہیں عصمت کی نگاہیں شرم کے مارے

درونِ شہر ع مغرب اتباعِ اہرمن جائز
سرِ بازار شغلِ اختلاطِ مرد و زن جائز
شراب و رقص کی مستیوں کا بانکپن جائز
زبوں کاری کی ہر لعنت بنامِ علم و فن جائز
معاذ اللہ یہ الطافِ تہذیبِ کلیسائی
پرستارِ جہالت بن گئی انساں کی دانائی
ستم ہے دیدہ ور فرعون کو موسیٰ سمجھتے ہیں
سرابِ روشنی کو طور کا جلوہ سمجھتے ہیں

عوامی دور میں ہے شہریاری در دِ سر اب بھی
کرم فرما ہے چنگیزی باندازِ دگر اب بھی
حصولِ حق کا اونچا جتنا پرچم ہوتا جاتا ہے
طلسمِ خواجگی اتنا ہی محکم ہوتا جاتا ہے
کٹی گو پاؤں کی بیڑی کمی آئی نہ الجھن میں
پڑا ہے اب طلائی لعنتوں کا طوق گردن میں
رہائی پانے والے کلبۂ احزاں میں پہونچے ہیں
جو نکلے چاہ سے وہ مصر کے زنداں میں پہونچے ہیں
تری دنیا نہ جب تک تابعِ دینِ خدا ہوگی
ترقی جس قدر ہوگی وہ پستی کی بنا ہوگی
فراست کے پجاری تا بہ کے خنجر اٹھائیں گے
جو اک فتنہ دبے گا لاکھ فتنے سر اٹھائیں گے
زمانہ سازِ فطرت کا نہ جب تک ہمنوا ہوگا
جو نغمہ لب پہ آئے گا وہ آہِ نارسا ہوگا

ثروت میرٹھی

رباعیات

دوست کی مرضی

بلبل کی طرح نالۂ پُر غم کیسا — شبنم کی طرح گریۂ پیہم کیسا
جب دوست کی مرضی ہے مسرت کا مدار — پھر دل کی تمناؤں کا ماتم کیسا

آدمی کا چاہا

پیدا وہی ہوتا ہے جو بوتا ہے — لیکن کبھی پاتا ہے کبھی کھوتا ہے
قانون یہی ہے، آدمی کا چاہا — ہوتا ہے کبھی، کبھی نہیں ہوتا ہے

ظاہر و باطن

اللہ کی رسول کی ہزاروں قسمیں — کر جائیں جہاں کو ہضم اگر ہو بس میں
سر وقفِ سجود، ہاتھ مصروفِ دعا — دل نذرِ فریب مکر ہے نس نس میں

خدا ترسی

نیکی میں بدی میں فرق کرنے والے — سچائی کے راستہ پہ مرنے والے
دولت سے حکومت سے کسی طاقت سے — ڈرتے نہیں اللہ سے ڈرنے والے

دوزخ اور جنت

دونوں کا پتہ بتا رہی ہے قدرت — دنیا دوزخ ہے اور نہ جنت ثروت
راحت نہ ہو جس میں ہے وہ دوزخ دوزخ — آفت نہ ہو جس میں ہے وہ جنت جنت

سعید عقاب

تصنیفاتِ اقبال

ضربِ کلیم

مشعلِ راہِ صداقت ہے تری "ضربِ کلیم"
تیرا نغمہ گلشنِ اسلام میں مثلِ نسیم
چاک کر کے پردۂ اسرارِ ہستی و خودی
ہو گیا تو عرشِ اعلیٰ کی بلندی پر مقیم

بانگِ درا

ہو گیا پھر جادہ پیما کارواں اسلام کا
بن گیا تیرا ترانہ مرکزِ بانگِ درا
زندگی کے ساز پر نغمہ خودی کا چھیڑ کر
زندۂ جاوید بزمِ دہر میں تو ہو گیا

پیامِ مشرق

رفعتِ تہذیب اور اخلاقِ مشرق کا پیام
شانِ مغرب کو کیا مشرق کی عظمت کا غلام
گوئٹے دیوانِ مغرب کا مصنف ہے اگر
ممبرِ مشرق کا تو بھی ہے اک اعلیٰ تر امام

بالِ جبریل

نکتہ ہائے دور رس کی روح "بالِ جبریل"
ہو نہیں سکتا کسی کو اس میں کچھ بھی قال و قیل
تو نے درویش اور سلطاں کو مساوی کر دیا
تیرا اک اک شعر ہے اس امر کی روشن دلیل

اسرار و رموز

اک مقدس خواب کی تعبیر اسرارِ خودی
جس کے پردے میں نہاں ہے غیر فانی زندگی
عالمِ تخئیل کی مہکی ہوئی فردوس ہے
نام جس کا رکھ دیا تو نے رموزِ بیخودی

متین طارق

عزمِ محکم

میری ہر بات زمانے کو بُری لگتی ہے
کیونکہ میں کہہ نہیں سکتا ہوں زمانہ لگتی
مجھکو آتا نہیں لوگوں کی خوشامد کرنا
مُجھ سے ہوتے نہیں غیروں کے دروں پر سجدے
مُجھ سے آتی نہیں بیکار کی اوچھی باتیں
میری محفل میں نہیں حرص و تصنّع کا گذر
میری دُنیا میں نہیں "غرض تمنّا کا پتہ

مجھ کو معلوم ہے دُنیا کا یہ دستور عجیب
نام لیتا ہے صداقت کا بڑا جُرم یہاں
صاف گو ہوتے ہیں اغیار کی تلخی کا شکار
حق کے اظہار پہ پھانسی کی سزا ملتی ہے
ہاتھ اُلفت کے بہانے سے قلم ہوتے ہیں
پردۂ امن میں جراُت کی زباں کٹتی ہے

لیکن اے دوست مرا سر بھی کٹے جان بھی جائے
میں تو حق بات زمانے سے کہے جاؤں گا

محمود شاہد نکادری

اردو ادب میں تنقیدی قدریں

قدیم اردو ادب میں تنقیدی رجحان

یہ حقیقت کسی مزید غور و فکر کی محتاج نہیں کہ زندگی ایسی اکائی ہے جس کے بیشمار اجزا ایک دوسرے سے مربوط انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی آپس میں تنظیم و رابطہ رکھتے ہیں یعنی زندگی کلیت پسند ہے اس کا خارجی و داخلی وجود ایک ہی جوہر کی دو نمایاں تصویریں ہیں ان کے خد و خال میں بظاہر فرق محسوس ہوتا ہے مگر در اصل ایسا ہے نہیں یہ الگ بات ہے کہ کائناتِ دل کی کتنی ہی دنیائیں ہیں۔ جن پر عقل انسانی کا آفتاب طلوع نہیں ہوا اس میں کتنے پرستان خوابیدہ ہیں جہاں کی لیلاؤں کو رام کرنے کی فکر میں انسان کوشاں ہے اس لئے اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی قبل از وقت ہے مگر اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑیگا کہ اس دنیا کی کما حقہٗ دریافت نہیں ہو سکی ہے اس لئے اس کی اہمیت ہے وجدانیت کا فلسفہ سرے سے بے معنی نہیں وہ اپنے اندر وزن اور حقیقت رکھتا ہے انکار کرنے والے ہزار مضحکہ اڑا کریں۔ جذبات کی حسین موجیں اس بحر بیکراں سے اٹھتی ہیں عقل کی شادابی فکر کی تازگی کوئی شک نہیں انہیں بہاروں کی رہین منت ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے ہاتھوں میں زمام حیات نہیں اگرچہ کبھی کبھی اور کسی مقام پر زندگی پرواز کے لئے انہیں سے طاقت بال و پر لیتی ہے۔ میرے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس اہم پہلو کو زندگی کے نگارخانے میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چاہے ایک مادہ پرست اس کو "سہارا" کہکر بچائے بہرحال یہ بار ان ہی کیا کم ہے یہ چند جملے اس لئے لکھنے پڑے کہ ایک طبقہ اس طرف سے افسوسناک حد تک گریز کر رہا ہے۔ اس تجزیہ کے بعد کہ انسان کی اپنے داخلی اور خارجی پہلوؤں میں تقسیم نہیں بلکہ تسلسل حیات کی دو کڑیاں ہیں جو اپنے لطف و کرم سے اس عالم کا اجالا ہے اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹ رہا ہوں یعنی ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے اور تعلق کی نوعیتیں کس دور میں کیا رہی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ادب میں نظریہ کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں نظر کی ہے۔ یہ جملہ اس بات کی قطعی نفی کر رہا ہے کہ فن کو برائے فن ہونا چاہئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھلا اس خیال کے لوگ بھی ہونگے اور اگر بد قسمتی سے ان کا وجود بھی ہو تو یہ امر اور بھی حیرت انگیز ہے کہ اس بھرپور زندگی کے دور میں جب انسان کا انہماک پورے شباب پر ہے وہ تھوڑی مدت میں محنت کر کے زیادہ سے زیادہ نتائج کا خواستگار ہے افکار و خیالات سے لیکر عقائد اعمال۔ محنت و مشقت، اخلاق و معاشرت ہر چیز میں اسی کی مشغولیت یکسوئیت کارفرما نظر آرہی ہے۔ ادب کو زندگی کی حدود سے کیسے نکال باہر کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ ایک معیاری ادب پارے کی تخلیق میں کافی غور و خوض اور محنت درکار ہے ظاہر ہے یہ نظریہ ہمارے لئے مفید نہیں۔ ادب کا زندگی سے رابطہ کوئی نیا نہیں۔ بالخصوص اردو ادب میں اس کا سراغ لگا لینا کچھ مشکل نہیں کیونکہ اس کی عمر ایسی زیادہ نہیں کہ اس کے بارے میں الجھنیں پیش آئیں یہاں وہ فن کار بھی جس کی فنی زندگی کا ماحصل تمامتر زندگی کا عیش اور تلذذ ہے وہ بھی سماج کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکا ہے اس کے فن میں ماحول کے چھینٹے اور قدروں کی پرچھائیاں بآسانی پہچانی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ اگر اردو ادب کے ابتدائی سرمائے پر نگاہ ڈالیں جس کی فضاؤں میں زلف و ابرو کی گھٹائیں ہی گھٹائیں ہیں جس کے سامنے کوئی اونچا تصور نہیں نالہ و نغمہ ہے مگر حسن کا نفسیاتی تجزیہ عشق کا مطالعہ اس دور کی شاعری کا مآل ہے دھڑکنیں ملیں گی لیکن غیر مہذب چیخیں سنائی دیں گی مگر غم دوراں کی نشتر زنی نہ ہوتی کہیں ان ٹیسوں میں بلندی نظر آئے گی۔ اس زمانے کی غزلیات میں معاشرتی گمراہیوں کی ہلکی سسکیاں سنائی دیں گی مگر عام طور پر وہاں صالح قدروں کا گذر نہیں تاہم وہ اس قابل نہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے اس دور کے ادبیاتی سرمایہ میں بڑی حقیقتیں ملتی ہیں بلاشبہ وہ ایک تمدنی و سیاسی زوال کا المیہ ہے۔ لیکن تعجب ہے وہی دور ہمارے ادبی و فنی عروج کا آئینہ دار بھی ہے تخلیق کی گرمی فن کو آب و تاب عطا کرتی ہوئی ملتی ہے بہتر سے بہتر کہنے کا ارتقائی جذبہ ملتا ہے

پھر جب سامراج آیا تو جہاں ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا وہیں ہندوستان کو صنعتی و سائنسی جدوجہد کا شعور بھی ملا یہ الگ بحث ہے کہ انگریز ہندوستان نہ آتے تو نئی دنیا میں اس کا کیا مقام ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریز نے ہمیں ذہن و فکر سے کام لینے اور اس کو تمدنی ترقی میں حصہ لینے کے قابل بنایا۔ مگر یہ انجانی دوستی اس کے وسعت ظرف کا نتیجہ نہیں بلکہ ہندوستان کی سیاسی حیثیت اور اندرونی بے چینیوں نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا بہر حال پہلی تحریک آزادی کی ناکام کوشش اگرچہ بڑی اندوہناک اور دہشت انگیز تھی لیکن اس نے شعر و ادب پر بڑے خوشگوار اثرات چھوڑے اسے فکر انگیزی ذہنی وسعت خیالات و جذبات کو سمونے کی صلاحیت بخشی غالب اس دور کے گوناگوں تجربات کی عکاسی کرتے ہیں وہ برسہا برس کی بساط تہذیب الٹ جانے پر ماتم کناں ہیں لیکن مایوس نہیں۔ انہیں آنے والے دور کی نشانیوں کا سچا شعور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ملک نئی صبح کی گود میں پہنچ چکا ہے جہاں نئے تقاضے ہیں علم و فن کی دنیا میں چراغ نہیں بجلی کے قمقمے ہوں گے۔ لیکن غالب اس سے مرعوب نہیں وہ اپنی تہذیبی غیرت ثقافتی مزاج کو غبار کی طرح دامن سے جھاڑ دینا نہیں چاہتے انھیں اس سے اُنس ہے یہ موقع نہیں کہ غالب کے بارے میں کچھ کہا جائے اور ان کی فلسفیانہ عرفانیت پر تبصرہ کیا جائے لیکن جب تک یہ تاریخی تسلسل ذہن میں تازہ نہ کر لیا جائے اس وقت تک موجودہ ادب کی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ موجودہ ادب زندگی سے جو مضبوط تعلق رکھتا ہے اس کا ابتدائی سرا ادب میں دور تک نظر آتا ہے۔ جس کی طرف ہلکا اشارہ اوپر کی گذارشات میں کر دیا گیا ہے اس نے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ پرانے ادب نے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں لی وہ محض تفریحی سامان تھا البتہ ہمیں پرکھنے اور جانچنے کے معیاروں پر نظر رکھنی چاہئے مارکسی عینک لگا کر غالب۔ سرسید۔ آزاد۔ حالی۔ شبلی کے ادبی کارناموں میں جنس اور بھوک کا حل تلاش کرنا اور اسی انداز پر تنقیدی جائزہ لینا نہایت ہی مہمل خیال ہے ان کا صحیح اندازہ اور قدر و قیمت جانچنے کے لئے ان تخصیصات کا مطالعہ ضروری ہے۔ سرسید کے خلوص میں کلام نہیں مگر ان کے خلوص پر گفتگو کی گنجائش ہے وہ حاذق ہیں مگر نباض نہیں۔ وہ مغربی قومیت کے پجاری ہیں اس لئے کہ انہوں نے سارا زور ایک قوم کی مادی اور دنیادی خوش حالی پر زور دیا تاکہ اس قوم کے زیادہ سے زیادہ افراد کاسۂ گدائی لے کر سامراج کے در دولت کو کھٹکھٹاتے پھریں اور اسی لئے قوم کے فعال عناصر صرف شکم سیری کے عوض اپنی تہذیبی وراثت کو ہمیشہ کے لئے بیچ دیں۔ کاش سرسید ایک قوم کے نہیں پوری انسانیت کے ہوتے تو ان کی قدر بھی عظیم و ہمہ گیر ہوتی اس لئے ان کے ادب میں عظمت نہیں اور جب عظمت نہیں تو عظیم انسانیت کے لئے مفید نہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ انہوں نے ادب کو سیاسی و سماجی، اخلاقی، تعلیمی خیالات سے روشناس کرایا آزاد و حالی، دونوں فکری طور پر مشرقی ہیں۔ دونوں کے یہاں مشرقی شرافت عالمانہ ذوق اور متفکرانہ انداز ملتا ہے۔ مغربی تقلید میں مشرقیت کی ادائیں بھی ملتی ہیں۔ حالی قوم کی زبوں حالی۔ اخلاقی زوال، ذہنی مفلسی، سماجی پستی پر مخلصانہ دردمندی رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ المناک منظر باہمی تعاون۔ سماجی حقوق و فرائض تحریکیت و رجائیت کے فقدان کا نتیجہ ہے وہ محبت کا درس تعاون کا سبق سخت کوشی زمانہ شکنی کا ولولہ دے کر اس بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زندگی کے ایک خانہ کو پُر کر دینے سے زندگی نکھر نہیں سکتی بلکہ سارے اجزاء اہمیت رکھتے ہیں ہر ایک کے کچھ مطالبے ہیں اس کے لئے انھوں نے زبان میں وسعت پیدا کی اپنے تخیل کی لالہ کاری سے اسے حسین بنایا۔ مقدمۂ شعر و شاعری حالی کی تنہا تصنیف ہے جو ان کے نظریۂ ادب اور اس دور کے فکری میلان کو واضح کرتی ہے۔ ترکیب و بندشوں کی چستی۔ زبان و بیان کی صحت مثالوں جملوں کی صفائی عبارتوں کی شستگی، تشبیہات و تمثیلات کی شیرینی۔ فنی تنقید کی عام دلچسپیوں کو چھوڑ کر عقلی و صحت افزا قدروں کو چھیڑنے کا شعور حالی کو اپنے معاصرین کی صف سے اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچاتے ہیں۔ وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے ادب کو تہذیبی انقلاب کا شعور عطا کیا میرا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی تبدیلیوں اور سائنسی ارتقاء سے انکار نہیں کیا مستقبل کی دنیا جس حقیقت کی طرف لپک رہی تھی اس کو بجائے جھٹلانے کے اس میں اپنے لئے مقام پیدا کرنے کی فکرمندی بیدار کی اس لئے وہ ادب کو اس دور کے عام رجحان کے خلاف انسانی اور معاشرتی تطہیر و تعمیر کے لئے استعمال کرنے کی طرف پورا زور صرف کرتے ہیں اور یہی دراصل ادب کی بلندی کی ضمانت ہے وہ ادب کیا جو ایک طبقہ کے لئے پیدا کیا گیا ہو جسے چند عیاش مزاجوں کی حمایت حاصل ہو جو اپنے خانۂ عشرت میں محض اس لئے باریاب کرتے ہوں کہ بدمستیوں کے چند لمحے کچھ دیر اور زندگی گذار لیں۔ حالی نے اس ذہن کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی یہ صرف احتجاج نہ تھا بلکہ اثباتی طور پر سرزمین ادب میں نئے طرز تنقید کی طرح ڈال کر آنے والے دور کی بشارت تھی اس لئے وہ ایک طرف اگر شان مجددیت میں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی بے مثال نکتہ آفرینیوں نے انھیں اردو ادب میں بابا آدم کا درجہ عطا کیا۔ حالی کے بعد شبلی نے اردو ادب کو اپنی وسعت نظر سے مالا مال کیا ان کی "معلمیت" نے

لطف وکرم کے دریا بہائے ادب کو جوانی میں وزن و وقار سنجیدگی و تفلسف کے گُر سکھائے اداؤں میں بانکپن، لب و لہجہ میں پختگی، اسلوب بیان کو تازگی اور پرواز خیال کو بال و پر دیکر مہذب و ترقی یافتہ زبانوں میں شمار کرایا اس طرح ادب تاریخی تدریج کے ساتھ آج (الفاظ با معنیٰ) کے مقصدی مقام سے گذر رہا ہے لیکن یہ کسی دور کے متعلق کہنا صحیح نہیں کہ ادب زندگی سے علیحدہ رہا اقبال سے پہلے ادب میں سچے تجربات پیش کرے اور اسے زندگی کے لئے تخلیق کرنے کی اُمنگ اور حوصلہ ملتا ہے اور حالی جیسے باشعور و مخلص انسان اس میدان کی دشواریوں کو سر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اقبال نے حالی کے تخلیقی آتشکدہ کو اور زیادہ روشن کیا اور ان کی آنچوں میں تہذیب اور وضاحت کو سمویا اور نہ صرف ان خیالات کو عملی شکل دی بلکہ سوچا سمجھا ہوا مقصد اور ارتقاء حیات کے لئے مہذب نظام کا شعوری جذبہ پیکر ادب میں بیدار کیا اس کی محدود فضاؤں کو وسعت سے آشنا کیا اس نے فکر و فن کی دنیا میں کولمبس کی طرح ... زیادہ قیمتی عالم کو دریافت کیا جس میں قومی امتیاز نہیں ... سرحدیں نہیں، کالے گورے کا فرق نہیں۔ طبقاتیت کا ... انسان اور انسانیت کا بسیط تصور ہے اس لئے اقبال عظیم ہے، یہی منبع حقیقت ہے جہاں سے تعمیر پسند ادب نے پاکیزہ تصورات کی کرنیں حاصل کی ہیں جسے عالمگیر بنانے کے لئے تعمیر پسند ادباء میدان میں آئے ہیں۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم ادب ہو یا جدید سر سید۔ حالی۔ آزاد۔ شبلی ہوں یا اقبال غرضیکہ ہر دور میں ادب میں افادی جھلکیاں پائی جاتی ہیں البتہ کہیں مبہم اور واضح اور کہیں ہمہ گیر اقبال سے پہلے جہاں ادب کی عمارت کسی تصور و فلسفہ کی بنیاد پر قائم نہیں ہمیں جستہ جستہ تعمیری رجحانات ملتے ہیں اور قدیم تہذیب کے بہترین اصولوں اور فعال قدروں کا اجالا ہمیں اکثر و بیشتر دکھائی دیتا ہے جو ہمارے لئے مفید ہے اور رہنما بھی اس تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ قدیم ادب میں مقصدی قدروں کا خاصا مواد ملتا ہے جن کا بیشتر حصہ تعمیری ہے جو گمرہیوں، برائیوں کو دور کرنے کے لئے مستقل اور پائدار ہیں اور جو کائنات کی مقصدیت پر پختہ یقین نہیں رکھتا ہے اس میں عوامی تصورات اور عوامی تجربات کا صحت مند شعور رچا ہوا ملتا ہے۔ ادب انہیں خطوط پر گامزن تھا رفتہ رفتہ اصلاحی خیالات و جذبات راہ پا رہے تھے کہ اقبال پیدا ہوا اور اس نے پہلی بار ادب کی دنیا میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ اسی اثناء میں ایک نیا مکتب فکر وجود میں آیا اس لحاظ سے ۱۹۳۶ء ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔

ترقی پسند ادب

یہ گروہ بڑی امنگوں اور ارادوں کو لے کر میدان ادب میں نمودار ہوا لیکن اس کی ترقی پسندی کی تمام توجہ تخریب اور تعصب کی طرف مائل رہی اس کا کلمۂ ادب تھا "ادب برائے زندگی" اور اس کا نعرہ "ادب برائے عوام" تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ادیبوں نے یہ نعرہ لگا کر زندگی اور ادب میں بڑے بڑے فتنے اٹھائے۔ انہوں نے نہ صرف فن کی غیر متوازی تعمیر کی بلکہ اسے پروپیگنڈہ کا آلہ بنا لیا۔ بالآخر ان کے تخلیق پاروں میں بڑی کمزوری آئی اور ان کی حیثیت ایک اشتہار کی سی ہو کر رہ گئی یا اگر اور زیادہ اونچے ہوئے تو الفاظ کے چیگیری مبادے کھڑا کرکے اپنی جذباتی ذمہ داریوں سے الگ ہو لئے اس کی پرواہ نہیں انسانیت کیا چاہتی ہے اور موجودہ مشکلات کے حل کی کیا صحیح سبیل ہو سکتی ہے۔ زندگی کے بگاڑ اخلاق کی تباہی معاشرہ کی بدکرداری، حتیٰ کہ ایک انسان کے مختلف امراض کا اصل سبب انہوں نے یہ سوچا کہ یہ سب مادہ کی ارتقاء اور اس کے عمل تصادم کا نتیجہ ہیں۔ زندگی کے عظیم پیچیدہ متضاد مسائل کا اصلی محور پیٹ ہے۔ لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ جناب اگر ایک دور کا معاشی نظام ایک ہی معیار کا تہذیبی نتیجہ پیدا کرتا ہے تو پھر آنکھیں کھول کر ذرا دیکھئے کہ صرف اسی ملک ہندوستان میں کتنے سماجی طبقات پائے جاتے ہیں اور ذرا آگے بڑھ کر سوچئے تو بیشتر ممالک تہذیب و تمدن کے اعتبار سے باہم دگر کس قدر متفاوت متضاد معیار کے مالک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکسی نقادوں کا بنیادی معیار اور ان کا مادی نظریہ ہی بہت کمزور ہے وہ جس پیمانۂ فکر سے اس وسیع کائنات و حیات کا تول کرنا چاہتے ہیں وہ بہت ہی تنگ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ لامحدود حقیقتوں کے اندازے کے لئے نسبتاً بڑے ظرف کی ضرورت ہے جو اسے اپنے اندر سمو سکے۔ اشتراکیت ذہنی و فکری اعتبار سے بہت ناقص ہے جیسا کہ ایک جگہ ترقی پسند ادب کے سرگرم ادیب سردار جعفری اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں۔

" فکر طبقاتی ہوتی ہے اور زاویۂ نگاہ بھی طبقاتی اس لئے وہی فکر صحیح ہوگی جو اپنے تاریخی زمانے میں سب سے زیادہ ترقی پسند طبقہ کی فکر رہی ہو اور اسی فکر سے ٹھیک زاویۂ نگاہ پیدا ہوگا۔

بھلا سوچئے اس اندازِ نظر اور زاویۂ نگاہ پر جس ادب کی پروان ہوگی اس میں تنگی تعصب آمریت خوف وہراس کے لئے کیا دروازے کھل جائیں گے مان لیجئے ان کے نزدیک سب سے زیادہ ترقی پسند طبقہ مزدوروں کا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار سونپ دی گئی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اقتدار کی کرسی پاتے ہی وہی سامراجی اور اقتدار پرست نہ بن جائے گا جس کے ظلم و بربریت سے عظیم انسانیت کراہ رہی ہے۔ آج کا انسان طبقاتی جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا کسی طبقہ کی فکر خواہ کتنی ہی وسعت گیر ہو وسیع انسانیت کے مزاج کو نہیں سمو سکتی۔ خاصی تنگی باقی رہے گی اور نہ ہی ان کے مخصوص حالات، مخصوص مزاج، مخصوص سیاسی و تمدنی ضروریات کو ایک ہی سانچہ میں ڈھالا جا سکتا ہے خصوصاً اس وقت جبکہ سانچہ کو ڈھالنے والا اس قوت وصلاحیت سے عاری ہے کہ اس اربوں بھری دنیا کے ایک معتدبہ حصے کے مزاج اس کی روحانی و جمالیاتی پہلوؤں کا صحیح تعین کا جائزہ لے سکے اس نارسائی کوتاہی کے باوجود اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ وہ مستقبل کی دنیا کا واقف کار اور مریض انسانیت کا مسیحا ہی تو اسے تمسخر سے زیادہ اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے اور پر علی سردار کا جو خیال پیش کیا ہے وہ دراصل ان کی کوئی ذاتی اپج نہیں ہے بلکہ جہاں اور جس حکمت قدریں ترقی پسند ادب کی بنیاد رہیں اسے نمایاں اہمیت [illegible] اس ادب کے عزائم ـــ وہی ہیں جسے اشتراکیت سارے عالم [illegible] دینا چاہتی ہے۔ یعنی اخلاقی قدریں متغیر ہیں یہ اپنے معاشی دور کی پیداوار اسی کی تابع ہوتی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ اگر کسی سماجی دور میں باپ بیٹی کے جنسی تعلقات حرام ناروا قابلِ مذمت ہیں تو ہم کریں اشتراکی سماج اسے رجعت پرستی ترقی کی راہ میں روڑا سمجھتی ہے اس لئے اس قسم کے بندھن توڑ دینا، وراں سے جلد از جلد چھٹکارا پالینا ترقی پسندی کے عین مطابق ہے۔ چونکہ اس قسم کے رجحانات مذہب کی یادگار رہیں اسی مذہب سے نفرت ہے سائنٹفک طریقہ اور پیداوار قدرت اندوزی ہونے کے موانع جواز ان سے چھین رکھے ہیں اس لئے ترقی پسند ادیب کی جنگ براہِ راست مذہب سے ہے ایسا طرزِ معاملہ۔ چونکہ [illegible] متوقع نہیں اس لئے اگر حیات و کائنات کے بارے میں اشتراکی ذہن فکر کے دوررس سائنٹفک [illegible] اندازہ ہو تو یہ بات نتیجۃً بالکل فطری ہے۔ مارکس کا نظریۂ کائنات جو اس عالم کو بے مقصد اتفاقی عمل کا ثمرہ سمجھتا ہو اور اس کے اندر ہونے والے شکست و ریخت کو جبری عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہو اور جس جدلیاتی فلسفہ کے ڈوپارٹ کے درمیان مختلف الجنس اشیاء پس کر بجائے معجون مرکب ہونے کے اپنا وجود ہی کھو بیٹھتی ہو اس قسم کا غیر معقول نظریہ اپنی قلمرو میں کب یہ برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی ایسا نظریہ بھی برگ و بار لا سکے جو اپنے مزاج و تخیل کے اعتبار سے بالکل متضاد واقع ہو یعنی جو اس کائنات پر یقین رکھتا ہو جس کی نظر میں حادثات و انقلابات کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ہوں عالم کے متعلق غور و فکر کا یہ مقام اور فیصلہ ہی زندگی و تہذیب کے دو جداگانہ راستے متعین کر دیتا ہے۔ ان نظریات کے اثر و تشکیل و تعمیر سے عمرانی ڈھانچہ متاثر ہوتا ہے اور جو اپنے خد و خال کو نمایاں کرنے کے لئے اسی سرچشمہ سے روحِ حیات حاصل کرتا ہے۔ کوئی فرد ہو یا معاشرہ کیونکہ میرے نزدیک فرد اپنی ارتقاء کے لئے معاشرہ کا محتاج ہے بغیر کسی لگن اور نہ بہائے شوق کے صورت پذیر نہیں ہو سکتا ہے اس لئے دراصل کسی فرد یا معاشرہ کی صورت گری چند مخصوص عقائد و تصورات پر مبنی ہے فرد کے ذہنی و عملی نتائج بہت اہم ہیں اگر عناصرِ تہذیب گمراہ کن تخریب گر ہیں تو اس انداز پر جس شخصیت کی تعمیر ہوگی بتر سید فساد انگیز ہوگی جو اپنے مقاصد اور طریقۂ استعمال میں بھی کجرو اور تخریب کن راہ پر چل پڑے گی اس طرح ایک انسان کا تخلیقی جذبہ شر آمیز بن جائے گا۔ رہی نکہ انسانی فطرت میں خیر و شر کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں اس لئے شر کا فطری جذبہ جب گرد و پیش سے ہم موافق مواد پائے گا تو یقیناً انسانی نفسیات کی رزمگاہ میں دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر غالب آجائے گا اس طرح انفرادی و معاشرتی رابطہ خیر و شر کی جنگ گاہ ہے اگر معاشرہ کا غالب حصہ خیر پسند ہے تو تخریبی طاقتیں باہم ہم آہنگ رہیں بکھری تھوڑے دنوں تک روپوش تو ہو جاتی ہیں لیکن ان کی بیخ کنی نہیں ہوتی ہیں اس بیج کی فکری تحلیل دراصل اپنے اندر بڑی تعمیری و ولولہ انگیز بھرپور طاقت رکھتی ہے تحریکیت دراصل مثبت کا جو بنیادی تسلط انگیز جوہر اس کائناتی قدر کے اندر پیوست نظر آتا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی باقی رہ سکتی ہے جبکہ انسان نظریۂ کائنات و نظریۂ حیات کے مارکسی فلسفہ کے تحت تعبیرِ حیات و کائنات میں لگ جائے ـ

آئیے اب اس نظریۂ کائنات کی حقیقت کا مطالعہ کریں جو مارکسی ادیب اور مارکسی نقاد کا بنیادی تصور ہے وہ کہتے ہیں کہ اس عالم کون و مکان کی ابتداء ایک مادہ سے ہوئی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کو

جامد اور ٹھوس ہوتا ہے پھر یہ عالم تو متحرک ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ مادہ بالذات متحرک ہے حرکت اس کی سرشت ہے لیکن اس مرحلہ پر بھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر زندگی اسی حرکت کی ترقی یافتہ شکل ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو پھر کسی دور کے حسن و قبح کا اندازہ کیا ہے کس لئے ایک دور دوسرے دور سے ترقی یافتہ ہے اور اس ارتقائی عمل کو تعمیر کی راہ پر کون لگاتا ہے کیا مادہ سے اوپر کوئی ماورائی طاقت ہے؟ اس موقع پر وہ سماجی عمل میں خارجی قانون تلاش کرتے ہیں جس سے جدلیاتی فلسفہ کے زیر اثر ایک دور اپنے ماقبل دور کی تردید کرتا ہے۔ کیا اس عملی تصادم سے کوئی پیمانہ بنتا ہے جو تعمیر و تخریب کی تعیین کر سکے اس کے لئے کوئی واضح غیر مبہم معیار کی نشاندہی ضروری ہے جس سے ایک انصاف پسند مزاج تجربات کے بارے میں صالح و غیر صالح کا معیار متعین کر سکے۔ ظاہر ہے ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں یہاں بھی اگر انسان قیاسی اور فرضی بنیادوں پر تعمیر زندگی کا کام شروع کرتا ہے تو سائنٹفک کہاں ہوا؟ انفرادیت اور فطریت کا شعور اس میں کہاں رہ گیا اس لئے ایک انسان اگر اپنے تجربات کا کوئی ارتقائی نتیجہ نہیں محسوس کرتا تو اس کی حیثیت ایک ایسے بے شعور پتھر کی سی ہوگی جسے سماجی عمل کی پر شور طوفانی لہروں میں بے سہارا [illegible] بہا لئے جاتا ہو اس میں کوئی طاقت نہیں کہ اپنے مضبوط اور آہنی فکر و عمل کے بوتے پر سماج اور ایک دور کے نظام کو بدل دے یہ سماجی و جبری عمل اپنے نتائج کے اس پہلو سے اور بھی زیادہ خطرناک تباہ کن ہو جاتا ہے کہ اس صورت میں تہذیبی و تمدنی ارتقاء میں کوئی اعلیٰ نصب العین وجہ تحریک نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسان کی ایک حیثیت لاشعوری سی ہے، وہ اپنا شخصی وجود رکھتا ہے وجود کی نشو و نما اس کی انفرادیت اپنے کمال کے لئے بے پناہ حوصلہ کی مالک ہے۔ انا کی اثباتیت کا جذبہ اور اس کی گرمی سے کوئی سینہ مشکل سے خالی ملے گا۔ یہ محرک یعنی جذبۂ خودی اپنے اظہار کے لئے حالات و اسباب کو ہموار بنانے کے لئے سماجی ذمہ داریوں اور مجموعی مفاد کی کہاں تک رعایت کرتا ہے یہاں اس سے بحث نہیں یہاں جذبۂ شخصی کے نقطۂ نگاہ کی توضیح کرتا ہے تکمیل ذات کے ذرائع اور ان سے پیدا شدہ صورت حال گو یہ بھی ایک [illegible] مسئلہ ہے لیکن فی الحقیقت یہ ہماری بحث سے خارج ہے یہاں اس کے ابتدائی پہلو کو لینا ہے انسان ایک بے جان لاشہ کا نام نہیں اس کی ذات میں شعوریت کار فرما ہے جو اسے نفع و ضرر کا احساس عطا کرتی ہے۔ ضرر کا تعلق اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ حفاظت کے لئے کوشاں ہو۔ حیات ذات کا یہ تحریکی پہلو اس کو حرکت کرنے اور مدافعانہ بعض اوقات جارحانہ عمل کے لئے اکساتا ہے دوسرا گوشہ نفع کا ہے یہی شعور اسے قوت تحریک و اختیار کی دولت عطا کر کے تعمیر ذات کا مقصدی اور افادی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ یہ

دونوں جذبے بنیادی اور طبعی ہیں انھیں جذبوں نے اس انسان کو جو تاریخ کے نامعلوم ادوار میں پہاڑوں اور غاروں سے سر نکال کر اس لیلائے فطرت کو جھانک رہا تھا اسے تسخیر عناصر، فضاؤں میں تیرتے تاروں پر کمند ڈالنے کا درس دیا اگر انسان مارکس کے نظریۂ کائنات و حیات کا نتیجہ ہوتا تو اسے اپنے آغاز و انجام کی خبر نہ ہوتی اور مختلف تہذیبیں جو دنیا کے مختلف عہدوں میں قائم ہوئیں اور بگڑیں اول تو وہ نظروں سے اوجھل ہوتیں دوسرے اگر وہ مارکسی اصول نقد کے مطابق بے جان اور لایعنی قدروں کا ڈھیر ہوتیں تو انہیں پرکھنے اور ان کے متعلق کسی ضمنی فیصلہ تک پہنچنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ اور جب فکر و نظر کے پرانے دیپک بجھ جاتے تو آج تہذیب و تمدن کی قندیلیں جگمگانے کے لئے ہم کہاں سے روشنی حاصل کرتے ان حسرت انگیز حقائق سے بلند ہو کر ان ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لیجئے جو مارکسی فلسفہ کی گرفت میں آنے کے بعد زندگی پر پڑیں گے جبکہ حریت کا نقطۂ نظر انسان کے انفرادی خیالات و جذبات کو بے قید بنا کر رکھ دے گا اور کوئی یوں سوچے تب مارکسیت یہ کہتی ہے کہ انسان بحیثیت اپنے اعمال و افکار کے سماجی عمل کے تابع ہے اور اعمال کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کوئی واضح قدر نہیں جس سے صالح غیر صالح میں فرق واقع نہیں ہو سکتا تو اس کے معنی ہیں کہ سماجی عمل بھی بے قید ہے۔ اس پر پابندی نہیں اور جب وہ آزاد غیر ذمہ دار ہوگا تو پھر لازماً انارکیت ہوگی ایسے سماج میں ایک انسان کا ہر سماجی و انفرادی کردار صرف جائز ہوگا بلکہ مارکسی نصب العین عملاً یہی چاہتا بھی ہے ان حقائق کی روشنی میں اس دکھی انسانیت کے بارے میں مارکسی ادیب کا یہ فیصلہ کرنی نہ ما [illegible]۔ انسانیت دکھی اور مظلوم ہے کہاں تک درست ہو سکتا ہے یہ طبقاتی تقسیمیں بالکل فطری ہیں جنہیں برقرار رہنا چاہئے اچھائی اور سرمایہ دار طبقہ وہی کچھ کر رہا ہے جس پر اس کی فکر اس کا رجحان اسے مجبور کرتا ہے یہ چور بازاری، رشوت خوری کیوں بری ہے۔ یہ اونچ نیچ اور نسلی لونی امتیاز یہ معاشی لوٹ کھسوٹ اور سیاسی [illegible] وقومی شر انگیز عصبیتیں [illegible] کیوں ختم ہو جانا چاہئے ایک امیر جسے علوم نہیں کتنے [illegible] کے بعد اس دولت کو جمع کیا وہ کیوں غریبوں میں تقسیم کرے [illegible] یہ سمجھتا ہے کہ بے بس اور نہتے انسانوں کو [illegible] رہنے سے اس کی جیب گرم ہوتی ہے کیوں اس فعل سے باز آجائے ایک [illegible] جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں تدبیر اور جوڑ توڑ سے دولت بہم آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں تو یہ تو اس کا فطری حق ہے کیوں نہ چھین لے نقطۂ نظر کے اس رجحان کی صحیح رہنمائی کے بجائے مارکس کا بنیادی

فلسفہ اس کی پوری تائید میں ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے ذرائع پیداوار اور پیٹ کا نتیجہ ہے اور پیٹ بھرنے کا ہر ذریعہ جائز و مستحسن اور بنیادی حق کا صحیح استعمال ہے ظاہر ہے یہ بھیانک نتیجہ چاہے ترقی پسند ادیبوں کی نظر میں نہ ہو لیکن اسے کیا کیا جائے اس کی تائید انہیں کے یہاں سے ہوتی ہے۔ دراصل یہ مضحکہ خیز تخیل ایک معاشی مسئلہ تھا جسے مارکسی ادیب اور مفکرین بلا وجہ پوری زندگی کے سر منڈھ رہے ہیں اور ظاہر ہے معاش کا حصول اور بھوک کی تسکین بذاتِ خود زندگی نہیں۔ زندگی کے متعدد مسائل کا ایک حصّہ ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس بحث و تنقید نے مارکسی تنقید کے تمام فکری پہلوؤں کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ نظریۂ کائنات و حیات کے بنیادی سوال کا جو حل مارکس پیش کرتا ہے جسے ترقی پسند ادب کی حمایت کا فخر حاصل ہے ان پر اصولی تنقید سے مارکسی سماجی کے بعض نہایت ہی ہمایۂ انسانیت کش نتائج اجاگر ہوتے ہیں۔ بحث و تنقید کے اس مرحلہ میں اب ہم ترقی پسند ادب کے ایک پہلو کو لیتے ہیں یعنی حقیقت نگاری مارکسی ادیبوں کو اس پر بڑا اعزہ ہے کہ انھوں نے ادب کو زندگی سے قریب کیا چونکہ ان کے نزدیک اصلی و مادی مادہ ہی ہے اس لئے خارج اور محسوس اہم ہے اسلامیت سے معنی رجعت پرست غیر ترقی پسند طاقتوں کا تیر قریب آرہے چنانچہ ان کے نزدیک حقیقت کا دائرہ مظاہر ہی تک محدود ہے انسان کے اندر پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ہی اخلاقی، روحانی و جدانی جذبات کا وزن ہے سب جو کچھ ہے خارجی دنیا ہے اسی کو من کل الوجوہ پیش کر دینا حقیقت کی پوری ترجمانی ہے اب آئیے بحث و استدلال کی دنیا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور انسان کی نفسیاتی اور عملی زندگی میں اس کا مشاہدہ کریں۔ تمثیلاً ہم مصر کے حالیہ واقعات کو پیش کرتے ہیں اخباروں، رسالوں اور اذیتوں نے پوری دنیا میں کیا صرف ایک ہی ڈھنڈورا پیٹا حالانکہ واقعات ایسی نوعیت کے تھے کہ اپنی صداقت کے اعتبار سے ہر شخص کو ہمدرد بنا لیتے۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ ان حادثات میں متضاد رائیں ہوئیں اور مختلف نتائج اخذ کئے گئے کسی نے گھی کے چراغ جلائے اور کہیں صفِ ماتم بچھ گئی ... اختلافِ تاثر سے صاف عیاں ہے کہ خارج بذاتِ خود اہم نہیں بلکہ ان مظاہر کو محسوس کرنے والی طاقت یعنی شعور و تفکر کی اہمیت ہے۔ شعور کا کام ہے خارج کو جوں کا توں محسوس کرے اور تفکر کے ذمہ ہے استقراء و تحلیل کر کے منطقی اصول پر جانچ پرکھ کر ایک خاص نتیجہ تک پہنچنا اس چھان پھٹک کی قوت کو تاثرات و تجربات بالیدگی و توانائی عطا کرتے ہیں جو بچتے ہو کر مظاہرِ عالم اور اس

کی تبدیلیوں کو سمجھے اور اس تک پہنچنے کے مخصوص ڈھنگ اختیار کرتی ہے۔ اس لئے حقیقت تو وہ ہو گی جو انسان کے من میں ڈوب کر اور کائنات دل میں اتر کر ان دونوں رازہائے سربستہ کی حقیقت کشائی کرے جو اس عالم اور انسان کی ابتدا و انتہا کا حقیقی اور سچا انکشاف کرے اور اسی حقیقت کی روشنی میں ان مظاہر کا مطالعہ کرے اس طور پر ترقی پسند حقیقت نگاری کی وہ سطحیت باقی نہ رہ جائے گی جس کے ہوتے ہوئے تہذیبی و تمدنی قدروں کی پائداری و آفاقیت کے صالح امکانات باقی نہیں رہتے۔ کیونکہ خارج پرستی ادیب سے تنقیدی صلاحیت چھین لیتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے آرٹسٹ کی سی ہوتی ہے جو صرف نقّاش ہے۔ اچھی بری ہر قسم کی عکاسی کر دینا ہی اپنے فن کا کمال سمجھتا ہے اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ لوگ کیا تاثر قبول کریں گے یا اس سے کیا اثرات مرتب ہوں گے دوسرے لفظوں میں اسے انسان کے غم و مسرت سے کوئی دلچسپی نہیں اس رجحان کی یہ ابتدائی شکل بڑھتے بڑھتے مرارت جھلاہٹ کا شکار بھی ہو سکتی ہے اس لئے کہ انفرادیت جب انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ماحول اور سماج اس کی تسکین و تکمیل کی راہ میں دور تک ساتھ نہیں دے سکتے۔ بالآخر جب وہ مخصوص ذہنی سانچہ اپنے کمالات کے اظہار کا سماجی توافق چاہتا ہے جو ایک فنکار کی فطری خواہش ہے تو معاشرت کا ٹکراؤ اسے پسپا کر دیتا ہے جس سے ایک ذہنی الجھن ایک انتقامی جذبہ کا پیدا ہونا غیر متوقع نہیں۔ خاص طور پر قنوطیت یا سیت ایسے فنکار کی تخلیق میں کونج پیدا کر دیتی ہے اور اس کے فضائے ذہنی پر ناکامی و نامرادی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا جاتے ہیں جو ادیب کی ابدیت کو چھین لیتے ہیں اس کے ادب پاروں میں انسانیت کا صحتمند درس مفقود ہو جاتا ہے اس تحلیل و تجزیہ سے ایک بات اور بھی واضح ہوتی ہے جس کی جانب ابن فرید نے بھی اشارہ کیا۔ لکھتے ہیں۔ "وہ حقیقت پسندی جو صرف ظواہر کی ترجمانی کرے وہ حقیقت سے بہت پیچھے رہ جاتی ہے وہ تو خود اپنے ابطال منطقی طور پر پیش کر دیتی ہے انسانی حقیقتیں صرف اس کے خارج تک محدود نہیں اس کا باطن سے بھی تعلق رکھتی ہیں اس کے اخلاق سے اس کے وجدانات سے اس کے ادراکات سے اس کی معاشیات سے، اس کی سیاسیات سے، اس کے تمدن سے، اس کی معاشرت وغیرہ سے بھی اس کا تعلق ہے۔ اس لئے وہ حقیقت پسندی جو صرف خارج کی ترجمانی کرے۔ حقیقت پسندی نہیں ایک طرح کی بوالعجبی ہے۔ (معیار۔ تنقید نمبر)

ترقی پسند ادیب کی ادبی کاوشوں میں جو تضاد پسندی ہمیں نظر آتی ہے

اس میں دراصل ان کا کوئی قصور نہیں بلکہ وہ نظریۂ کائنات اور نظام زندگی جس کی ترجمانی کو ترقی پسند ادیب اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ اسی میں تناقضات اور پیوند کاریاں ہیں۔ وہ وحدت وہم آہنگی جو فرد سے لے کر معاشرہ تہذیب و تمدن میں اعتدال و توازن کی صرف آفاقی تنظیم پیدا کرے۔ اشتراکیت اس سے قاصر ہے ان تشریحات سے ترقی پسند ادب کے ان پُر فریب نعروں کی پردہ دری ہو جاتی ہے جو غیر صحتمند اور مریضانہ خیالات اپنے طلسمی موضوعات کے پس منظر میں رکھتا ہے اس لئے مستقبل کا عالم ایسے ضابطۂ حیات کا منتظر ہے جو خود آفاقی ہو اور ابدی بھی۔

تعمیر پسند اسکول

ترقی پسند ادیبوں کے بالمقابل جو ادب میں زندگی بخش قدروں کو سمونے کے لئے اٹھے ہیں وہ تعمیر پسند ادب کا حلقہ ہے یہ تحریک نوزائیدہ ہے لیکن پھر بھی خاصی منظم جس کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ ملک گیر ہو چکی ہے اور غیر منظم طور پر عالمی اس لئے کہ اس قسم کے رجحانات ہر عالمی ادب کے یہاں اپنا مقام پیدا کر رہے ہیں اس موقع پر میں پھر اپنے سابقہ الفاظ دہراؤں گا یعنی زندگی ایک اکائی ہے۔ چونکہ اس کے پھیلاؤ اور وسعت کی تہہ میں ترتیب و وحدت کارفرما ہے۔ اس لئے زندگی کا کوئی شعبہ ایک دوسرے کے تعاون سے بے نیاز ہو کر ارتقاء پذیر نہیں ہو سکتا یہ امر اس بات کا بھی ضامن ہے کہ ادب زندگی میں بیگانگی نہیں ان کے درمیان گہرا و کھلا رابطہ ہے تعمیر پسند ادب بھی یہی طرز فکر اپناتا ہے یوں کہئے اس دور میں صرف دو ہی ادبی تحریکیں ہیں جنہیں ادب برائے زندگی کا مکمل شعور ہے جو اپنے اپنے مدرسۂ فکر کے مطابق تہذیب کو وسیع معنوں میں بدل دینے کا جذبہ لیکر میدانِ عمل میں آئی ہیں۔ میری مراد ان تحریکوں سے ترقی پسند اور تعمیر پسند مکتبۂ فکر ہیں مقدم الذکر کے تنقیدی نظریہ پر اجمالی تجربہ اوپر کی گذارشات ہیں آگے ہم تعمیر پسند نظریۂ تنقید یعنی وہ اس کائنات و انسان پر کس زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالتا ہے اور اس نقطۂ نگاہ کا فلسفیانہ پس منظر کیا ہے، اس پر غور کریں گے ہمارے نزدیک اولین چیز کائنات کے موقف کی صحیح تعیین ہے ایک مادہ پرست کی نگاہ میں تو یہ عالم خود بخود وجود میں آگیا ہے اور اس کے اندر کی ساری چیزیں ایک اتفاقی حرکت و تخلیق کا نتیجہ ہیں۔ یہ حرکت غالب اور مقتدر اعلیٰ ہے اس کے آگے انسان اور تہذیبیں سرنگوں سار ہیں برخلاف اس کے تعمیر پسند نظریہ اس کائنات کا ایک حاکم تسلیم کرتا ہے جو مدبر ہے اور منتظم بھی جس نے اس عالم کو زیور تخلیق سے آراستہ کیا ہے۔ ہمارا یہ تخیل مدلل ہے۔ ہم استدلال و استشہاد کی ناقابلِ تردید قوت اس دعوے کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ بحث کے اس مرحلہ میں پھر ہم انسان اور اس کی نفسیات کی طرف رجوع کرتے ہیں انسان کی ایک حیثیت تو اس کی انفرادیت ہے اور دوسرا مقام اجتماعیت اور یہ بھی مسلم ہے کہ انسان جذبات و خیالات کا پتلہ ہے اس کی نفسیات کا وہ پہلو جو جذبات سے متعلق ہے وہ گوناگوں متضاد العناصر ہے۔ محبت و عداوت، رشک وحسد، بغض و کینہ، شفقت و نفرت اپنا اپنا اظہار چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے حرکت بغیر محرک کے نہیں ہو سکتی اور محرک خارجی ہوتا ہے جس کی تعیین سماج میں نہیں ہوتی یہ تعینات خود وہ اساسی اقدار ہیں جن پر سوسائٹی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس مرحلہ پر مسئلہ کی یہ نوعیت بڑی اہم ہے کہ سماجی قدروں کی صحت و عدم صحت کو نظر انداز کر کے بلند جذبات انسانی کو بلند تر اقدار کی تخلیق پر لگایا جا سکے کیونکہ انہیں کی ترقی و رجعت پر سماج کی بلندی و پستی کا انحصار ہے مگر سوال یہاں یہ ہے کہ وہ قدریں کیونکر وجود میں آئیں اور ان کی تنقید کا کیا معیار ہو اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے خیالات و تجربات ایسی بنیادیں فراہم کر سکتے ہیں جو ہیئت اجتماعی کے لئے بنیادی تصورات کا کام دے سکیں تو یہاں یہ بھی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کیا تجربات اور افکار انسانی مکمل ہیں۔ کیا انسان کا ذہنی عمل اپنے ذاتی جذباتی خواہشات سے الگ بھی ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو تقریباً تمام ماہرین نفسیات تسلیم کرتے ہیں کہ انسان جذبات سے مجرد ہو کر نہیں سوچ سکتا ہے یہ پہلو عقل کی گرفت سے آزاد ہے چنانچہ کسی بھی مسئلہ میں وہ ان سے الگ ہو کر نہیں سوچ سکتا ہے۔ پہلوداری اور خواہش کی حمایت اسے ایسے قوانین تراشنے میں مدد نہیں دے سکتے جو ایک سماج کے لئے بنیاد فراہم کرے کیونکہ اسے سماج اور انسانیت کے بارے میں مکمل تحقیق نہیں۔ اس لئے نظری طور پر سماج ایک طاقت کا محتاج ہے جس کی نگاہوں میں اجتماع اور فرد کا مفاد واضح ہو جسے اشخاص و قومیں دونوں محبوب ہوں ایسی طاقت کے وجود کا ثبوت ہی ہمارے جذبات و خواہشات کا عجز و قصور اور معیار صحت کا اختلاف و تضاد ہے اس لئے ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی کا اقرار جو ہم سے قریب اور ہمدرد ہو۔ معاشرتی قدروں کی تعمیر اور صحت انگیزی کے لئے ناگزیر ہے اور اس کی حیثیت فیصلہ کن طاقت کی ہو جس کی مرضیات ہی سوسائٹی کی تنظیمی بنیاد ہوں ظاہر ہے وہ مرضیات اور قوانین زمین و زماں کی تعینات سے آزاد ہوں گی کیونکہ اس کا عطا کرنیوالا خالق الکل ہوگا۔ جس نے اس عالم کو تخلیق کیا اور اس کے لئے قوانین بنائے۔ مزید براں انسان کو خلق کر کے اسے اس عالم کی نیابت سونپی اس لئے کہ وہ ہمارے مزاج اور انداز ساخت کو خوب سمجھتا ہے اس کے اندر تعمیر و تخریب کی جو صلاحیتیں اس نے ودیعت کر دی ہیں ضروری ہے کہ اس کی

وضاحت اور پرکھ کا معیار بھی بتائے تاکہ انسان انھیں بنیادوں پر تعمیر و ترقی کے لئے جد و جہد کرے جس میں سارے انسانوں کے لئے یکساں افادیت اور مفاد کے اعتبار سے بنی نوع انسان کے لئے قابلِ قبول ہو چنانچہ تعمیر پسند نظریۂ تنقید سماجی حل کی صحت و عدم صحت ترقی و رجعت کے بارے میں کسی ایسے قانون کو نہیں تسلیم کرتا جو ریاضی کی صداقتوں کی طرح واضح غیر مبہم ہوں بلکہ وہ بنیادی حل طلب مسئلہ میں اپنے خالق سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اپنے انفرادی و سماجی اعمال کی اساس اس نظریۂ خیر و شر پر رکھتا ہے جسے اس نے خدا کی طرف سے عطیہ کے طور پر قبول کیا ہے تحقیق کی اس منزل میں پہنچ کر ہمیں بڑے اہم قیمتی اصول ملتے ہیں ۔ پہلا اصول یہ کہ انسان کی آزادی اس نظریۂ حاکمیت کے تحت زیادہ وسیع اور محفوظ ہو جاتی ہے اور انسان کی تقسیم کے سارے ذرائع مسدود ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ انسانی عقل و فکر انتشار و اضطراب کی اس زحمت سے بچ جاتی ہے جو الحادی نظریہ کے زیر اثر ہو کر اسے سماجی بے چینیوں سے اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ اس صورت میں اخلاقی بنیادیں افادیت سے محروم ہوں گی تیسری چیز فرد و ریاست کا وہ ٹکراؤ ختم ہو جائے گا جو موجودہ ازمنہ میں علمی و عملی شکلوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں جس کی واضح مثالیں مشرقِ وسطیٰ کے وہ ممالک ہیں جن میں جمہوریت کا نام نہاد تجربہ ہو رہا ہے ۔ اس سلسلہ میں غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کیسے حاصل ہو اس بارے میں مغربی مفکرین سوچ بچار کے جس بلند مقام تک پہنچ سکے اس کا ماحصل موجودہ جمہوریت ہے وہ یہ کہ انھوں نے اقتدار دستور عوام کو عطا کئے دوسرے لفظوں میں عوام کی رائے ہو د عوام پر حاکم ہو بادی النظر میں تو یہ تخیل بڑا خوشنما معلوم ہوتا ہے مگر غور و فکر میں ڈوب کر اور اس کے عملی اثرات و نتائج تک پہنچ کر جو حقیقی خدوخال جمہوریت کے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں وہ بھی مسئلہ کا حل نہیں ان کی حیثیت [illegible] سے زیادہ نہیں۔
اس لئے جمہوریت کا دستوری ڈھانچہ بھی اکثر چند افراد کا نتیجۂ فکر ہوتا ہے جو مخصوص اثرات سماجی و سیاسی اور دولت کے بوتے پر عوامی رائے پر قبضہ کر کے اس منزل تک پہنچے ہیں اور جب ایک بار یہ چند افراد مرکزی قوت حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی قوتوں کی لامحدود وسعتیں اور غیر مسئولیت کا رجحان کسی بھی ایسی تبدیلی کو جس سے ان کے مفاد اور اقتدار پر چوٹ پڑتی ہو نظر انداز کرتے رہتے ہیں بلکہ انھیں عوامی قوتوں کے سر کچل دینے میں کوئی تامل بھی نہیں ہوتا۔
اس طور سے جمہوریت اور عوامی دستور کا پُر فریب تخیل اور تجربہ بڑا مضحکہ خیز بن جاتا ہے اور افراد ایک بار اپنی طاقت اور آزادی رائے کو چند ہاتھوں کی طرف منتقل کر کے طویل و نامعلوم مدت کے لئے بے دست و پا بن جاتے ہیں ۔ اور ایسا ہونا نظری اعتبار سے تصورِ ریاست کے عین مطابق ہے کیونکہ امن و امان ترقی و خوش حالی کے لئے مضبوط ریاست کا وجود لازمی ہے اور ریاست بغیر ایک مرکزی قوت کے لایعنی شے ہے جمہوریت کی بڑی خرابی یہ نہیں کہ وہ عوام کی نمائندگی عملاً کرنے سے قاصر ہے بلکہ فساد کی جڑ یہ ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کی باگ عوام سے چھین کر پھر مٹھی بھر انسانوں کے سپرد کر دیتی ہے جس سے فرد و ریاست کا وہ مضبوط رابطہ باقی نہیں رہ جاتا جو وحدت الٰہ کے تصورِ ریاست میں مضمر ہے۔ توازن و اعتدال کی شکل اسی وقت باقی رہے گی جب فرد و ریاست دونوں کا کعبۂ مقصود ایک ہو افراد اور ریاست کے درمیان کوئی قوت حائل نہ ہو فرد کی صحت مند ترقی سے ریاست کے رگ و ریشہ میں برابر گرم و جوان خون پہنچتا رہے، یہ تو ہوا اس کا سیاسی پہلو اس کی معاشرتی حیثیت بھی بڑی اہم ہے اُوپر کی وضاحت سے ہماری ادبی قدروں کی قیمت اور پیمانہ امکانیت کو جانچا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح نظامِ عالم اور نظامِ حیات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں اس عالم خاک و باد کی ہر چیز میں طبعی و حیاتیاتی حقائق پوشیدہ ہیں اور انسان کی زندگی کے چند بنیادی مسائل بھی انہیں قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں ۔
مگر انسان کا خصوصی امتیاز اور مخلوقات عالم میں اشرفیت کا رتبہ اسے شعوری اور ذہنی صلاحیتوں کے طفیل حاصل ہے جس شے میں فطرت پسندی جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتی ہے وہ شے عقل و فکر کی دنیا میں پہنچ کر اگر نوامیس فطرت سے بغاوت کرتی ہے تو گویا وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتی ہے اور یہ غلطی زندگی کی تعمیر میں بڑی سنگین ہو جاتی ہے کیونکہ مسائل حیات بنیادی طور پر خلقی اور فطری ہیں اس لئے استواری کے لئے فطری اصول و معیار ہی درکار ہے جس کی برکت اصحابِ نظر سے پوشیدہ نہیں سماجی زندگی کے اس انتشار کن دور میں ایک ایسا انسان جو زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کا پابند ہو اور اسے عملاً مسائل حیات میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کا جذبہ رکھتا ہے اس کی پُر یقین شخصیت اور غیر متزلزل کردار سماجی زندگی کا مثالی کردار بن سکتا ہے اخلاقی قدریں صالح ضوابط نامانوس الفاظ نہیں ہر قوم اور ملک ان قیمتی خزانوں سے مالا مال ہے مگر کیا فائدہ کیا انسانیت ان سے مستفید ہو رہی ہے ۔ کیا تہذیب و تمدن کے پریشان گیسو ویران نہیں یہ سوالات نئے نہیں ۔ مظلوموں کی پھٹی پھٹی نگاہیں ۔ مزدوروں کے ویران چہرے، کسانوں کے جھلسے ہوئے رخسار، ان سوالات کا ثبوت ہیں ۔
ہمدردی، غمخواری گفتار سے نہیں ہوا کرتی، اعمال و کردار کی موج نسیم زندگی

کی کلیوں کو تبسم کی خوشگواری دے سکتی ہے۔ قدروں کو بنا لفظوں کی کمی نہیں مجھے یہ تسلیم ہے مگر میں ایک اور بات کہوں گا۔ قدریں کتنی ہی بلند و ارفع کیوں نہ ہوں جب تک ان کی پشت پر ایک عظیم طاقت کا تصور نہ ہو وہ زندگی میں سرایت نہیں کر سکتیں۔ تعمیر پسند ادیب زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو صرف چونکاتا ہی نہیں۔ بلکہ انھیں زندہ و متحرک قدریں عطا کر کے وحدت الٰہ اور تصور آخرت کا عمل حیز نشاط آفریں کیف آگیں جام بخشتا ہے۔ دنیا کے دوسرے نظریہ ہائے اخلاق اور اسلام کے نظریۂ اخلاق میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام قدریں دیگر الگ نہیں ہو جاتا بلکہ انہیں سماج اور فرد کے رگ و پے میں خون بنا کر دوڑا دیتا ہے۔ یہ تصور الٰہ دوسرے مذاہب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ عیسائیت نے الٰہ کی جو تشریح کی اور اس کے عہدنامہ کو جو زندگی کے مخصوص پہلو اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اسلام کی تشریحات سے کوئی مناسبت نہیں۔ جس کی تردید قرآن نے پوری وضاحت سے کی ہے وہ ملک اور زمانے کا پابند تھا مگر قرآن نے جہاں کہیں اپنی دعوت کا بنیادی تعارف کرانے کی کوشش کی ہے تو اس کا مخاطب کوئی قوم نہ تھی۔ اس کی نظر میں ممالک کی حدیں نہ تھیں۔ کالے گورے عربی و عجمی کا تخیل جو تھا۔ اس نے ہمیشہ بنی نوع انسان کے اجتماعی ضمیر کو مخاطب کیا۔ یہ انداز تخاطب ہی اس کی محدودیت کی نفی کرتا ہے۔ اور تمام امکانی شکوک پر تیشہ چلا دیتا ہے اور یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ اسلام ایک قوم اور فرقے کے چند عقائد کا نام ہے یہ غلطی بہت پرانی ہے اب اسے ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ اب انسان زیادہ حقیقت پسند بنتا جا رہا ہے۔ اور حقیقت کی تلاش و جستجو ہی اس دور کا طرۂ امتیاز ہے۔ موجودہ دور کی دشواریاں ہمت شکن ہونے کے ساتھ بڑی حوصلہ افزا ہیں۔ کیونکہ مغربی تصور حیات نے زندگی کے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ ترقی و تنزل کامیابی و ناکامی کے معیار میں فرق آ چکا ہے مگر لغزشیں محسوس کی جا رہی ہیں۔ زخموں کے گہرے گہرے گھاؤ پیہم اضطراب برپا کئے ہوئے ہیں انسان اپنی غلطیوں پر نادم ہے یہ ندامت اور یہ بے چینی سماج کے ہر گوشہ میں رونما ہو چکی ہے یہ رجحان آر انسان دوست کے لئے خوش آیند ہے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تعمیر پسند ادب کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ انسان فطرتاً خیر پسند ہے۔ اس کی ذات کا پائندہ حصہ نفس کے وہ کوائف ہیں جو خود رفتگی اور بیخودی سے متعلق ہیں انسان کی یہی خصوصیت اسے سماجی بناتی ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ محبت و الفت کے میٹھے نغمے چھیڑے، آرزوؤں اور تمناؤں کی بستیاں آراستہ کرے۔ تہذیب و تمدن کے فانوس روشن کرے علم و تحقیق کے گلستاں سجائے یہ سب کیوں اسی لئے تاکہ ان حقائق کے تعاون اور تصرف سے اپنی ذات کو پیکر کمال میں بدل دے، یہ شعوری ڈھلان اسے نیک بننے اور نیکی کو پروان چڑھانے۔ ایثار کرنے اور دوسروں کو قربانی کا درس دینے کی تحریک بخشتا ہے۔ وفا شعاری۔ فرض شناسی، امانت داری، دیانت داری، تابناک قدریں ہیں جو سماج کی ابتدائی تاریخ سے لیکر اس ترقی یافتہ دور تک مستحسن رہی ہیں۔ جس طرح اس کی قدر و قیمت سے دورِ حجری کے انسان نے استفادہ کیا بعینہ دورِ جدید کے مہذب انسانوں کو یہ جرأت نہیں کہ اس سے مستغنی ہو سکیں۔ یہ قدریں اٹل ہیں، ان کو زوال نہیں، وہ ایسے پھول ہیں جن کو خزاں نہیں، انھیں پھولوں کی تختہ بندی، روش آرائی تعمیر پسند ادب کا بنیادی فریضہ ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اخلاقی قدریں، ہر ملک کے انسانوں کا مرکز توجہ رہی ہیں اس لئے یہ کسی ایک قوم اور ملک کی میراث نہیں بلکہ یہ متاع گراں بہا پوری انسانیت کا متاع مشترک ہے اس لئے جو تحریک بھی ان قدروں کو لیکر اٹھے گی اس کا کام عالمی ہوگا۔ اس کے مخاطب بنی نوع انسان ہوں گے۔ بحث کے اختتام پر ہم اخلاق کے بارے میں بھی اجمالاً کچھ کہہ دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر مختلف شکوک ابھر سکتے ہیں اخلاق کے بارے میں مختلف مکاتب فکر میں جو اختلافی شاخیں قائم ہیں۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے یہاں بنیادی طور پر دو نقطۂ نظر کی جانب اشارہ کرتا ہوں ایک ضمیریئین کا ہے جو بہت پرانا اور اپنے انداز تحقیق میں بہت کچھ ہماری توجہ کا مستحق ہے یہ مکتب فکر خیر و شر کو تخلیقی مانتا ہے۔ یعنی حاسہ اخلاق انسان کی سرشت اور فطرت میں ہے اور محبت و الفت، تعاون، ایثار، ہمدردی و رحم، صداقت و راستبازی، دیانت و امانت فطری جذبات ہیں۔ ان جذبات کا صدور اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ خود مسرت و مادی منفعت کا ذریعہ ہیں جو تحریک کا موجب ہیں کیونکہ حسن عمل کے موقع پر ہمارے ذہن میں کوئی اس قسم کا خود غرضانہ جذبہ نہیں ہوتا اور نہ اتنا وقت ہی ہوتا ہے کہ اس پر کچھ غور و فکر کر کے نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کیا جا سکے بلکہ وہ یکایک ابھرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حسن و قبح کی تعیین اور مواقع کی تعیین کیونکر ہو اس مرحلہ پر ہم اسے مابعد الطبعی امور پر چھوڑتے ہیں اور اسے عظیم طاقت کی رہنمائی میں دیدیتے ہیں۔ خدا کی طرف سے ان احکامات کا ذریعہ انبیاء کو قرار دیتے ہیں جو خود اسی کام کے لئے پیدا کئے جاتے رہے ہیں۔ اس طور پر نظریۂ اخلاق کو عظیم قوت دی جا سکتی ہے اور اس کی ماہیت کو ابدی قرار دیکر پُرامن سماج کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔

اسی کے بالمقابل نظریۂ افادی ہے جو حاسۂ اخلاق کی فطریت کا منکر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اخلاق کی بنیاد خود یعنی الی المسرت پر ہے اسے یوں سمجھئے کہ ایک شخص کسی کی مدد اسی لئے کرتا ہے کہ دوسرے سے اسی قسم کے معاملہ کی صحیح توقع وابستہ کی جاسکے یا سخاوت اس لئے آدمی کرتا ہے تاکہ اس کی شہرت کی جذباتی تسکین ہو جو بذاتہ ایک مسرت ہے۔ اس طور پر گویا تمام اخلاقی اعمال اس لئے مستحق ہیں کہ ہم اس سے لطف اندوز ہوں۔ مگر اس نظریۂ میں جو نقائص ہیں وہ بہت واضح اور شرمناک ہیں مثلاً اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔ اور خود غرضی استلذاذ نفس ایک مہذب شریف انسان کے یہاں مذموم ہے اس لئے اخلاقیت کا یہ انداز اپنے تیئں بداخلاقی پر مبنی ہے۔ اِس بے ترتیب استدلال وحقایق کی دُنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اِن دونوں مکاتب فکر کی روشنی میں جو نمایاں بنیادی فرق ہے اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ کون سا نظریۂ اخلاق ہمارا دورنگ ساتھ دے سکتا ہے۔ تعمیر پسند ادب چونکہ بین الانسانی ادب ہے اِس لئے اس کے موضوعات عالمی ہیں کام کی وسعتوں کے پیشِ نظر جو فنکار بھی ان موضوعات کو اپنائے گا اس کے اثرات فن پر ضرور پڑیں گے کیونکہ کسی عظیم بات کو کہنے کے لئے عظیم بننے کی ضرورت ہے ایسے فنکار کے یہاں وسعت تو ہوگی ہی عظمت فن بھی درکار ہے یہیں سے فارم اور شمائل کا کامیاب ترین اور موثر ترین طریق اظہار اپنے جذبات وتاثرات کو پُراثر بنانے کے لئے محتاج ہے۔ ظاہر ہے یہ کام کسی طرح فکری وذہنی تربیت سے کم درجہ کا نہیں۔ ہمارے اسلوب میں جس قدر رنگ وآہنگ کیف ونشاط پیدا کیا جاسکے ضروری ہے۔ فنی طور پر ہمیں اپنے قدماء سے سبق لینا چاہئے۔ تقلید بذاتہ قبیح نہیں، اندھی وجامد تقلید رسوا کن ہے۔ فارم اور شمائل کی بلندی، آہنگی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے اس سلسلہ میں ترقی پسند ادب نے اقبال کے خرمن سے خاصی خوشہ چینی کی ہے۔ فن کے میدان میں ہمارے لئے بڑی وسعت ہے۔ بشرطیکہ کام کیا جائے۔ کیونکہ تخیلات و افکار کا مواد ہمارے پاس زیادہ ہے۔ موضوع کی رنگا رنگی ہم رکھتے ہیں جو جدت طرازی وندرت آفرینی کے لئے کام آسکتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ موضوعات کو فن کا رگ جاں بنائے جس قدر فنکار مخلص ہوگا اسی قدر فن میں آب وتاب پیدا کرسکے گا۔ کیونکہ اس کا فن خونِ جگر سے لالہ کار وتازہ کار ہوگا۔ جمالیاتی لطافت کی رنگ آمیزی بھی ہمارے لئے ضروری ہے۔ البتہ حدود کا خیال رکھنا ہوگا جمالیاتی ذوق ایک مستقل اور نازک بحث ہے اور اسے تعمیری رنگ میں بدلنا اور رکھنا کہیں زیادہ ذمہ داری کا کام ہے میرے خیال میں تعمیر پسند مصنفین میں سے کسی نے اس بحث پر کھل کر قلم نہیں اٹھایا ضرورت ہے اس پر رائے زنی کی جائے اور تحقیق وتدقیق کے اس دروازہ کو بھی پوری احتیاط سے کھولا جائے۔

نجم الاسلام

اصغر علی عابدی — ایک تعمیر پسند قلم کار

اصغر علی عابدی تعمیر پسند ادبی تحریک کے پرانے قلم کار ہیں۔ اور شروع سے لکھ رہے ہیں۔ میں عابدی صاحب اور ان کی تحریروں کو تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد سے جانتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ماہنامہ "انوار" آتا تھا تو ہم لوگ (میرٹھ کے احباب) اسے شوق اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ ہم اس کی ادبی صحت سے مطمئن نہیں تھے۔ جب بھی کوئی نیا پرچہ آتا۔ اس میں فنی اور انٹلی گرنٹ کیلئے ہمیں کافی مواد مل جاتا مگر اس کے باوجود "انوار" ہمیں عزیز تھا کیونکہ اس وقت اس میں وہ نیا پن مل رہا تھا جو اور کہیں نہیں ملتا تھا۔ اور اس کو پیش کرنے میں ظاہر ہے کہ عابدی صاحب کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ عابدی صاحب ہی "انوار" کو حیدرآباد سے نکال رہے تھے۔ اسلئے عابدی صاحب ہمیں "انوار" کے لکھنے والوں میں سب سے زیادہ عزیز تھے۔

اس وقت عابدی صاحب ایک افسانوں کا مجموعہ "خطرناک راہیں" شائع کر چکے تھے۔ اس کے بارے میں میں نے سنا ہی سنا ہے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اب وہ آسانی سے ملتا بھی نہیں، اور رسائل میں عابدی صاحب کے ایک دو افسانے پڑھنے کے بعد افسانوں کا مجموعہ دیکھنے کی خواہش باقی بھی نہیں رہی ہے۔ جہاں تک میری رائے ہے۔ ان کے افسانے "شیوۂ آگہی" تو ظاہر کرتے ہیں مگر انھیں کامیاب افسانے نہیں کہا جا سکتا۔ بس یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک مدیر اور مرتب کو افسانے کے فنی پہلوؤں سے جتنی ابتدائی واقفیت ضروری ہوتی ہے اس سے ان افسانوں کا لکھنے والا حامل ہیں۔

شعر میں انھوں نے ایک دو گیت بھی لکھے ایک آدھ نظم بھی کہی مگر اس میدان کو ایک دو تجربوں کے بعد خیر باد کہہ دیا۔ اس سے ان کے خود انتقادی رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کو احتساب سے بخشتے نہیں۔

عابدی صاحب کے اصل جوہر مقالے کے میدان میں کھلے ہیں۔ یہاں وہ مطالعہ اور قلم کی روانی دونوں سے بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ مواد کو سمیٹنے میں ان کا قلم رک رک کر نہیں چلتا وہ روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ صحافت کا رنگ غالب ہونے لگتا ہے۔ یہ رنگ مقالات کے لئے کہاں تک موزوں ہے۔ اس پر بات چیت کا ایک دروازہ کھل سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کا زور آپ کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہے گا۔

"انوار" کا ادبیات نمبر ابھی تک بہت سے قارئین بھولے نہیں ہوں گے۔ ایک جگہ اس میں عابدی صاحب لکھتے ہیں۔

> "ایسا ادب ہمیشہ بڑے بوڑھوں اور گاؤں والوں کی رسموں، ریتوں، پنگھٹ و خانوں، حرم خانوں اور سیدھی جانوں میں پلے۔ سارنگی کے ساتھ خوب پھڑکتا ہے۔ مگر جہاں ملکی مسائل حل ہوتے ہوں۔ بھوکوں کے پیٹ اور ننگوں کے جسم کا سوال ہو جس جگہ خود انسان انسان کے ظلم کا شکار ہو رہا ہو اور خدا کی سلطنت میں ہر طرف اس کے باغیوں کا راج ہو۔ وہاں یہ ادب اس لنگڑے لولے اور اندھے بہرے فقیر کی طرح کرسے گھسٹ گھسٹ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

یہ اقتباس عابدی صاحب کے طرزِ تحریر کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اس میں آپ کو فری اسٹائل کی قسم کا اندازِ بیان ملے گا۔ یہ اسٹائل عام بول چال کے غیر کتابی الفاظ تک کے استعمال سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور چھوٹی تشبیہیں عام فہم انداز میں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ ایک حد تک یہ چیز اچھی ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس میں زیادتی ہو جاتی ہے تو تنقیدی گرفت کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ تسکین قریشی صاحب نے ادارہ ادبِ اسلامی میرٹھ کی ایک نشست میں ایک غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ تھا ؂

جنونِ محبت کی راہیں بہت ہیں
نظر جا ... [illegible]

یہ غزل اپریل ۱۹۵۱ء کے معیار میں شائع ہوئی۔ عابدی صاحب نے اس پر نقش اوّل میں لکھا ہے۔

"غزلوں میں تسکین قریشی نے مقصد کو آہستہ آہستہ ابھارا ہے۔ جیسے گاڑی کو ذرا پیچھے کر کے آگے بڑھایا ہو۔"

یہ اناڑی تشبیہہ غزل کے نرم و نازک مزاج پر گراں تھی۔ چنانچہ تسکین صاحب نے غزل گوئی کو گاڑی بانی کی صف میں کھڑا کرنے پر زور دار احتجاج کیا۔

یہ تو رہی طرز تحریر کی بات۔ اب عابدی صاحب کے ابتدائی ادبی مقالات پر ایک سرسری نظر ڈالئے۔

سب سے پہلے تو "انوار" کے اداریئے ہی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں گے۔ یہ اداریئے ایک مستقل پلان کے تحت لکھے گئے ہیں۔ مثلاً کئی مسلسل شماروں میں جدید ادب پر تنقیدات کا ایک کامیاب سلسلہ ملتا ہے۔ یہ مقالات تھوڑی سی ترمیم کے بعد ایک مربوط مقالے کی صورت میں جنوری ۵۵ء کے معیار میں "مغربی ادب کے تین دور" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں جن کی افادیت آج بھی اسی طرح مسلم ہے جس طرح "انوار" کے دور اوّلین میں تھی۔ اس وقت ان کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی اور اس لئے کہ عابدی صاحب نے ایک ایسے موضوع پر اسلامی تنقید کے اصولوں کو منطبق کیا تھا جس پر پہلے اس قسم کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔

اس مقالے میں عابدی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے میرے خیال میں دوسرے حصوں سے زیادہ جاندار ہے۔ اور مقالہ نگار کی تاریخی واقفیت اور تحلیلی صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔

تھوڑی ہی عمر میں دنیا کافی دیکھ لی ہے۔ آبائی وطن بدایوں ہے جہاں سے حیدرآباد گئے۔ حیدرآباد سے لاہور اور رہتک، وہاں سے پھر حیدرآباد اور وہاں سے لکھنؤ آئے اور اب دہلی میں مقیم ہیں۔

"انوار" انہوں نے تقسیم ہند کے بعد نکالا تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے وہ لاہور میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز کے اخبار "کوثر" میں اور اخبار "ایمان" میں کام کر چکے تھے۔ "انوار" کی ترتیب اور مضامین میں اس صحافتی تجربہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ بعد کو یہی چیز "معیار" میں "نقش ثانی" سحر سے پہلے، اور نقش آخر کے مستقل عنوانات کے تحت ظاہر ہوئی۔ اور اب "دعوت" میں اس کے جوہر کھل رہے ہیں۔

"انوار" کا ادبیات نمبر عابدی صاحب نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔ یہ نمبر

پورے کا پورا ادبی تھا۔ اور اس زمانے میں تعمیر پسند ادبی تحریک کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں عابدی صاحب کے دو تنقیدی مقالات قابل قدر تھے۔ ایک کا نام میں بھول رہا ہوں۔ دوسرا "ادب میں تحریکیت" تھا۔ دونوں بہت پسند کئے گئے۔

پھر کچھ ایسے پیچ پڑ گئے کہ "انوار" کو حیدرآباد سے لکھنؤ لانا پڑا۔ اور عابدی صاحب لکھنؤ سے اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور "انوار" کو بند کر دینا پڑا۔

بالآخر ۱۹۵۰ء کے آخر میں دہلی آ گئے۔ یہاں کے ارباب نے "معیار" کا اجرا کیا۔ ادارت عابدی صاحب نے سنبھالی۔ جنوری ۱۹۵۱ء سے رسالہ کا آغاز ہوا مگر چھ ماہ کے بعد ہی مالیات کی دشواری نے حوصلے پست کر دیئے اور وہی ہوا جو اردو کے ادبی رسائل کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ تب آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے رسالہ کو میرٹھ لایا گیا۔ شکر ہے کہ یہاں ابھی تک چل رہا ہے۔

عابدی صاحب ادبی مشاغل سے ہٹ کر ایک بار پھر صحافتی میدان میں داخل ہوئے ہیں۔ آج کل دہلی سے محمد مسلم صاحب کے ساتھ سہ روزہ "دعوت" نکال رہے ہیں۔ اور اخبار میں اتنے مصروف ہیں کہ ادبی مشاغل سے کچھ کچھ دور نظر آتے ہیں۔ جو ہم جیسے ان کے بہت سے قدر دانوں کے لئے وجہ شکایت ہے۔

اب چند مقالات کا اجمالی ذکر کرتا ہوں جو عابدی صاحب کے اچھے تنقیدی مقالات میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

"ادب میں تحریکیت" کے بعد ان کا ایک عمدہ مقالہ "افسانہ کی بنیادی قدریں" ہے جو معیار میں دو قسطوں میں چھپا۔ پہلی قسط میں افسانہ کے تقریباً جملہ بنیادی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسانہ نگار اور سماج کے تعلق پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد دو نہایت جاندار اور معلوماتی حصے آتے ہیں۔ ایک میں ہندوستان کے قدیم افسانوی ادب سے لے کر مسلمان حکومتوں کے زوال تک کی ان قدروں کی تشریح کی گئی ہے جو افسانہ میں بسی رہی ہیں۔ اس قسط کے دوسرے حصہ میں مغربی ادب کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دوسری قسط میں جدید مغربی افسانوں کو سامنے رکھ کر بعض رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ افسانے ہندوستان ٹائمز میں چھپے تھے۔ اور عالمی مقابلے کے منتخب شدہ تھے۔ حالات اور تجربات کی کروٹیں انسان کی فکری قوتوں کو کن کن راستوں پر لے جا رہی ہیں۔ اور کتنی ایسی چیزیں ہیں جو بہتر امکانات پیدا کر رہی ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنے اور اندازہ لگانے کے لئے جتنی وسعت مطالعہ اور بالغ نظری کی ضرورت تھی اس کا مظاہرہ عابدی صاحب کے مقالہ میں ملتا ہے۔

دو طویل مقالات ایسے ہیں جو ادبی اجتماعات میں پڑھے گئے ہیں ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جامعہ ملیہ کی انجمن تعمیر پسند مصنفین کی نشست میں پڑھا گیا تھا۔ مجھے اس مقالے کو سننے کی نوبت نہیں آئی لیکن حفیط صاحب سُن کر آئے تھے اور اس کی بڑی تعریف کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تعریف بجا ہی ہوگی۔ البتہ عابدی صاحب اس کا روک لینا اب تک کیوں پسند رہا ہے۔؟ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے نظر ثانی کے لئے اٹھا رکھا ہو جس کا اہتمام عابدی صاحب کے یہاں معمول سے زیادہ ملتا ہے۔

دوسرا غیر مطبوعہ مقالہ اسلامی ادب کے موضوع پر ہے جو اُردو سمپوزیم علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا اور بہت کامیاب تھا۔ اسلامی ادب کی تشریح کی جہاں جہاں ضرورت تھی۔ کامیابی کے ساتھ کی گئی تھی اس کی افادیت کے پیش نظر ہمیں عابدی صاحب سے اس کی اشاعت کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

اب میں کچھ باتیں ان مضامین کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں جو عابدی صاحب نے ادبی موضوعات سے ہٹ کر لکھے ہیں۔ ایسے مضامین دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) اشتراکیت کے موضوع پر لکھے ہوئے مضامین۔
(۲) بھارت کی موجودہ تہذیبی اور سیاسی کشمکش پر مضامین۔

اشتراکیت کے موضوع پر عابدی صاحب شروع ہی سے پڑھ اور لکھ رہے ہیں۔ ایک کتاب "اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں" کے مولف بھی ہیں جس میں بیشتر تراجم اور کچھ ان کے اپنے اضافے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بگجر۔ رسائل میں بھی اس سلسلے کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

اب ان مضامین کو لیجئے جن میں بھارت کی موجودہ تہذیبی اور سیاسی کشمکش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور سے دو چیزیں پیش نظر رکھی جا سکتی ہیں۔ ایک تو مختصر سا کتابچہ "ہندوستانی سوشلزم"۔ دوسرے وہ مضامین جو وقتاً فوقتاً معیار میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کبھی "نقش ثانی" کے تحت کبھی نقش آخر کے تحت۔ ہندوستانی سوشلزم میں عابدی صاحب نے ایک ایسی مبنی برحقیقت بات کہی تھی۔ جو آج کے حالات پر حرف بحرف صادق آ رہی ہے۔ اگرچہ یہ کتابچہ اب سے کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد رہ گیا ہے اس میں سوشلرم کی اس بگڑی ہوئی صورت کا تجزیہ کیا گیا تھا جس کی طرف کانگریس چل رہی تھی۔ آج کانگریس کھل کر سوسلزم کا نعرہ لگا رہی ہے۔ اور یہ بات سچ نکل رہی ہے کہ کانگریس کمیونزم اور سوشلزم کی ماننے والی جماعتوں سے کہیں زیادہ جن سنگھ اور مہاسبھا سب کی نمائندگی کر رہی ہے۔

اسی طرح کی کئی باتیں ان مضامین میں ایسی ملتی ہیں۔ جو عابدی صاحب کے یہاں نئی بات کہنے کے سلیقے کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہیں۔ چند ایک مقالات میں ہندو فلسفہ و مذہب کا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ یہ موضوع آج کے دور میں بہت اہم ہے۔ اپنے ملک کے اکثریتی عوام کے رجحانات کو اچھی طرح سمجھے بغیر کوئی ذہنی جد وجہد اور بہتری کی کوشش اور انقلاب آفرینی ممکن نہیں، عابدی صاحب نے اس ضرورت کا احساس کیا۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ مگر ابھی اس کا حق ادا کرنا باقی ہے۔

سید مستفیض الحسن ۔ ایم ۔ اے

تخلیق سے تعمیر تک .....

فن فطرت کی عکاسی کرتا ہے چاہے وہ فطرتِ کائنات ہو یا فطرتِ انسانی اور سب فن کار اپنے مخصوص ذریعۂ تخلیق سے (Medium of Expression) فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مصور موئے قلم سے حسن کی تشکیل کرتا ہے اور یہ اس کی فنی تخلیق ہے۔ سنگ تراش پتھر کی تراش خراش کر کے مجسمہ تیار کرتا ہے اور یہ اس کی خلقت ہے، معمار گارے اور مٹی کے تودوں کو عمارت کی شکل میں ترتیب دیتا ہے اور یہ اس کی تعمیری کاوش ہے۔ شاعر اور ادیب اپنے داخلی احساسات اور خارجی تجربات کو الفاظ و بیان کے سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور یہ ان کا ادبی کارنامہ ہے، گویا فن اس تخلیق کو کہتے ہیں جو فن کار کے حساس ذہن کے کائنات پر ردعمل سے وجود پاتی ہے۔

تمام فن کار اپنی ذہنی صلاحیتوں سے حسنِ کائنات اور ماحول، مشاہدات، اور تجربات کی عکاسی کرتے ہیں اور ہر فن کار اس منصبِ تخلیق سے اپنی ذہنی یا قوتوں کی بنا پر عہدہ برآ ہوتا ہے، کیوں کہ کائنات کی مصوری ہو یا انسانی مشاہدات و تجربات کی عکاسی (Imitation) فن کار کی اپنی ذہنی صلاحیتوں اور اس کے نقطۂ نظر سے جلا پاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس کی تخلیقات فطرت کی واقعی حیثیت سے تو کم درجہ کی ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے پہلو سے فطرت کی واقعی حیثیت سے بلند تر بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسری حیثیت یہ ہے کہ فن کار فطرت کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ فطرت کے سادہ عناصر کو کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ فطرت کی پسندیدہ خصوصیات اجاگر ہو جائیں اور ناپسندیدہ عناصر پس منظر میں چلے جائیں۔ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق کائنات پر تنقید کرتا ہے اور اس انتخابیت کے مرحلے میں (Process of Selection) فطرت کی ہیئت کو بالکل بدل دیتا ہے۔ فطرت کی یہ نئی شکل (Form) فن کار کی اپنی تخلیق بن جاتی ہے۔ یوں تخلیق کے تمام تر مراحل میں تنقید فن کار کا ساتھ دیتی ہے اور تخلیق و تنقید کی یہ وابستگی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے ہم فن کا کوئی صحت مند تصور قائم نہیں کر سکتے۔ فن کار کی تمام کاوشیں خواہ وہ ذہنی و فکری ہوں یا کسبی اور جمالیاتی تنقید کے مباحث میں رونما نہیں ہوتیں۔ فن کار جس شاہدِ معنی کے جلوے سے لطف اندوز ہوتا ہے اس کو الفاظ کے جامے میں ملبوس کر کے منظرِ عام پر لانے کے لئے وہ تنقیدی

مقصد سے کام لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فن کار کے ہاتھوں میں فطرت ایک مواد خام ہے جس کو وہ اپنے وجدانی اور تخیلی عمل اور ردعمل سے نئی تراش کے جوہر میں بدل دیتا ہے۔

یہ بات ادب کے معاملے میں اور زیادہ صحیح ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کی محض عکاسی نہیں کرتا، بلکہ اپنی قوتِ متخیلہ سے حیات کی ایک نئی تعمیر کر کے اس کو نئے پیراؤں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ پھر ہر فن کی طرح ادب بھی بڑی حد تک مثالی (Idealistic) ہوتا ہے۔ وہ موجودہ اندازِ حیات کی جانچ پرکھ کے علاوہ حیات کے مستقبل کے خاکے بھی تیار کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے سماج میں نئی قدروں کے موتی بکھیرتا ہے۔ اپنے سماج کی برائیوں سے غیر مطمئن ہو کر وہ کسی ایسے نظامِ حیات کے تخیلی نقشے بناتا ہے جہاں زندگی سکون و بہجت کا پیام ہو گی۔ اس طرح ادیب قاری کے جمالیاتی ذوق کو ابھار کر حسِ تناسب (Sense of Proportion) کو بالیدگی عطا کرتا ہے اور یہ تعمیر ہے اور قاری کے ذوقِ حسن کی ارتقا (Sublimation of the sense of beauty) کی ضامن۔

حقیقتاً ہم کسی ایسے فن پارہ کا تصور نہیں کر سکتے جس میں فن کار کی حیثیت قطعی طور پر غیر جانبدارانہ ہو جس میں فن کار کا ذہن اور اس کی شخصیت جھلکتی نہ ہو۔ اصل میں فن کار کا نقطۂ نظر جس سے وہ اپنے احساس اور جذبات کو نئی نئی ادبی شکلوں میں پیش کرتا ہے اور جس سے وہ اپنے تجربات تجزیات اور تخیلات کی ترجمانی کرتا ہے فن کار کی روح ہے۔ اگر یہ روح مفقود ہے تو فن بے روح ہے اور وہ تخلیق نہیں بلکہ صرف نقالی ہے۔

ادیب کی ذہنی لیاقتیں اور اس کا نقطۂ نظر بڑی حد تک اس کے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ادیب چاہے کتنا ہی تخیل پسند ہو جائے وہ اپنے ماحول سے قطعی طور پر علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اور اس کی فنی تخلیقات بڑی حد تک اس کے ماحول کی اپج ہوتے ہیں۔ انسان بہرحال ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اسے مختلف نفسیاتی تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان مواقع پر ادیب

کی قوت تخلیق ان تجربات اور مشاہدات میں تنقید کی مدد سے رنگ آمیزی کرکے انہیں فن کے سانچوں میں ڈھال دیتی ہے۔ اس طرح وہ شے جو خارج میں احساسات کی محرک تھی ذہن میں ایک نیا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ حالانکہ خارجی محرکات اور ذہنی تخلیقات میں کسی نہ کسی نوع کی ہم آہنگی ضرور باقی رہتی ہے۔ ادیب کے افکار اور اس کے مقاصد بھی اس کے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور اس طرح زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ گویا ادب زندگی کی تعبیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ادبی تخلیقات ادیب کے نقطہ نظر کی حامل ہوتی ہیں اس میں مقصدیت کا کوئی پہلو ضرور مضمر ہوتا ہے۔ ادیب کی نگاہیں ایک مثالی مستقبل کے امکانات پر جمی ہوتی ہیں۔ آسکر وائلڈ کا قول ہے

"Literature always anticipates life. It does not copy it but moulds it to its purpose"

مگر نقطہ نظر اور مقصد دونوں مبہم سے الفاظ ہیں اور جب تک ان کو کسی صفت سے متصف نہ کیا جائے بامعنی نہیں ہوتے۔ نقطہ نظر اور مقصد اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ نقطہ نظر مقصد کا عکس ہوتا ہے۔ اس لئے مقصد کی برائی بھلائی نقطہ نظر کی تشکیل کرتی ہے۔ اگر مقصد بھلا ہے تو نقطہ نظر اور طرز فکر صحیح ہوتے ہیں اور اگر مقصد برا ہے تو نقطہ نظر اور طرز فکر بھی غلط ہوں گے۔

بہرکیف فن فن کے لئے ہو یا فن تعمیر کے لئے، کبھی بے مقصد نہیں ہو سکتا کیونکہ فن کار کے لئے نفسیاتی طور پر محال ہے کہ وہ معاشرہ میں رہے اور معاشرہ کے ان معاملات و مسائل سے بے تعلق رہے جنہوں نے اس کے احساسات کو جگا کر اس کے فن کے لئے ماحول مہیا کیا ہے۔ چنانچہ ادیب اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے ماحول کی عکاسی کچھ اس طرح کرتا ہے کہ قاری ادیب کے مقصد سے متفق ہو جائے اور اس مثالی مستقبل کی تکوین کے امکان پیدا ہو جائیں جس کا ایک دھندلا سا عکس فن کار کے ذہن میں موجود ہے۔ یہ نفسیاتی مقصد اعتدال پر بھی قائم رہ سکتا ہے اور انتہا پسندیوں کی بھینٹ بھی چڑھ سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب جنسی گھٹن کو زندگی کا بنیادی مسئلہ تصور کرے۔ جیسا کہ بقول اقبال ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب سمجھ لے کہ انسان کی زندگی معاشیاتی محور پر ناچ رہی ہے اور وہ اپنے موضوعات کسان اور مزدور، روٹی اور طبقاتی کشمکش تک محدود کر لے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ادیب ادب کو انسانی سماج کی بہتر تشکیل کے لئے استعمال کرے تعمیر اور اخلاقی اوصاف کی ترقی کے کام میں لائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب زندگی کی عکاسی وسیع اور بھلے مقاصد کے لئے بھی کرتا ہے اور تنگ اور برے مقاصد کے لئے بھی۔ کبھی ادب تعمیر کے لئے راہیں صاف کرتا ہے کبھی تعمیر کے نام پر تخریب کے [illegible] بیتا ہوا کبھی انسانیت کی زندہ اور اخلاقی قدروں کی طرف دعوت دینے لگتا ہے اور کبھی بہیمیت کی تاریک گھاٹیوں کی طرف بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ادیب معاشرہ کے رائج الوقت نظریات کی تائید کرتا ہے۔ ابن فرید نے کسی موقع پر کہا ہے "ادب نے ہر مرحلے میں غالب نظریے کا ساتھ دیا ہے۔ اور اسی کی ترجمانی کی ہے۔ تاریخ کے صفحات الٹ جائیے آپ دیکھیں گے کہ کبھی وہ دیومالائی رہا ہے۔ کبھی وہ جمالیاتی رہا ہے۔ کبھی درباری ہو گیا ہے اور کبھی عوامی۔ اس نے صداقتوں کی ضو باریاں بھی کی ہیں اور تاریکیوں کو بھی فروغ دیا ہے۔ اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کو بھی جلا دی ہے اور انہیں تعفن میں بھی غرق کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی بڑی قوت رکھنے کی بنا پر بذات خود منتہا اور مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔"

آج کا عالم سیکڑوں مختلف اجتماعات معاشروں میں منقسم ہے۔ ہر نظریے کے علمبردار ادیب اپنے نظریے کے حامیوں کی تعداد بڑھانے میں کوشاں ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی دنیا میں جتنے نظریات ہیں اتنے ہی ادب کے دھارے بھی ہیں۔ گویا جس طرح دنیا کے نظریات لذت پسندانہ، قوم پرستانہ، ترقی پسندانہ اور تعمیر پسندانہ ہیں، اسی طرح ادب بھی لذت پسندانہ، قوم پرستانہ، ترقی پسندانہ اور تعمیر پسندانہ ہوتا ہے۔ اور ہر ادب معاشرہ کی تشکیل اپنے محرک نظریے کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔ اپی کیور اور خیام کے پرستار چاہتے ہیں کہ ؎

عیش حاضر ہے ہر اک ذی ہوش ہم آغوش ہو

یہ لوگ تلاش مسرت کے نام پر عیش کوشی اور تسکین نفس کی خاطر لکھتے ہیں اور اخلاقی انارکی اور فحاشی پھیلانے کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ مگر یہ نظریہ خود اپنی موت مر رہا ہے۔ اور اب صرف چند ادیب انفرادیت پسندی کا لبادہ پہن کر اس نظریے کی حمایت کر رہے ہیں۔ مگر یہ بھی تابکے۔

قوم پرستانہ نظریے کے حامی لوگ دو گروہوں پر مشتمل ہیں — وطن پرست اور قوم پرست۔ وطن پرستی تو بڑھتے ہوئے بین الاقوامی نظریے نے فنا سی کر دی ہے اور جہاں کہیں باقی ہے [illegible] جائے گی۔ قوم پرستی کے ذیل میں مذہبی گروہ آتے ہیں اور قوم پرست ادیب [illegible] وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا [illegible]

اپنے گرد بھی معاشرہ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ آج کا ہندوستان اس قوم پرستی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ایک طرف ہندو قوم پرست ادیب ہیں جو تمام دُنیا کو کسی بھی قیمت پر ہندو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم قوم پرست ہیں جو بقول سجاد اللہ کے فریادی اور مذہبی ادب کی تخلیق کر رہے ہیں مگر یہ رجحان بھی اب پسپائیت کی طرف ہٹ رہا ہے۔

آج کل ترقی پسند نظریات بڑے مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ "ترقی پسندی" کے معنی اصلاً یہ ہیں کہ ہر نئی چیز کو خوش آمدید کہا جائے اور پرانی بات کو خیرباد کہا جائے۔ اور اس سعی میں اشیاء کی پسندیدہ صفات یا ناپسندیدہ خصوصیات سے قطع نظر کر لیا جائے۔

ترقی پسند ادب اپنا ایک فلسفہ بھی رکھتا ہے۔ اور اشتراکی نظام حیات برپا کرنا چاہتا ہے۔ اشتراکی نظام میں لذتیت اور عیش کوشی کی بڑی گنجائشیں ہیں لہٰذا آج کی غیر ذمہ دار عیش پسند دُنیا اُس کی طرف بڑھ رہی ہے اور ترقی پسندی کا طغرۂ امتیاز سمجھا جانے لگا ہے۔ مگر حال ہی میں تعمیر پسند نظریے نے جنم لیا ہے۔ وہ ایک صالح نظام حیات کا داعی ہے۔ یہ نقطۂ فکر اخلاقی قدروں کے قیام پر زور دیتا ہے اور زندگی کی تعمیر و تطہیر کا علمبردار ہے۔ بات ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں موخر الذکر مکاتیب فکر کی پیش کردہ ادب کی تعریف پر غور کیا جائے کہ کون مقصد انسانیت کی فلاح کا ضامن ہے۔

ترقی پسند ادیبوں میں احمد ندیم، ایک ادبی شخصیت کا مالک ہے۔ اُس کی زبانی ادب کی تعریف یہ ہے۔

"ہم ترقی پسند ادیب، ادب کو زندگی کا آئینہ ہی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ زندگی کو بدلنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بھی تصور کرتے ہیں۔ ہم زندگی برائے زندگی، ادب برائے جدوجہد، ادب برائے انقلاب کے نظریے کو اپنی تحریک کا سنگ بنیاد خیال کرتے ہیں ہماری فکری اساس اشتراکی حقیقت پسندی ہے۔"

اور ہندوستانی تعمیر پسند ادیبوں میں نجم الاسلام خاص مقام رکھتا ہے وہ ادب کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

"تعمیری ادب وہ ہے جس میں معروف اخلاقی رجحانات کا احترام ملتا ہو۔ اور اُس سے بھلائیوں کا جذبہ پرورش پاتا ہو۔"

اور پھر معروف اخلاق کی تصریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"تاریخی سرمایہ، تجربات کا ریکارڈ، خواہشات اور عقلی قوتیں، صحیح قوانین کی تحقیق و جستجو میں معاون

تو ثابت ہو سکتی ہے لیکن اُن کو فیصلہ کن اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد آخری چارہ کار یہی رہ جاتا ہے کہ ہم نظام اخلاق کا وہ تصور اپنائیں جس کی بنیاد خدا پرستی پر ہو۔"

ان دونوں تعریفوں پر تنقیدی نظر ڈالئے تو اول الذکر تعریف میں کچھ باتیں تشریح طلب نظر آتی ہیں۔ زندگی برائے زندگی اصطلاحاً بڑا جاذب نظر اور پُر معنی فقرہ معلوم ہوتا ہے مگر جب تک زندگی کا کوئی صحیح تصور نہ دیا جائے یہ تعریف قابل فہم نہیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی ایک معروف لفظ ہے اُس کی تفہیم چنداں دقیق نہیں۔ مگر مشکل تو یہی ہے کہ انسانی فکر صدیوں سے زندگی کی تفہیم کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس کوشش میں اُس نے سیکڑوں نظریات آزمائے۔ کئی مذاہب کو پرکھا۔ اور جب اس سعی میں حسب منشا کامیاب نہ ہوا تو علمی نقطۂ نظر (scientific outlook) کے نام پر مذہب سے بیزاری کا اعلان کر دیا گیا۔ زندگی کی تفہیم اس قدر آسان نہیں ہے جتنی ترقی پسند ادب کی تعریف میں محسوس ہوتی ہے۔ اس تعریف میں اشتراکی حقیقت پسندی بھی جو اس ادارہ فکر کی فکری اساس ہے۔ زندگی کا کوئی صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس تعریف کے تحت زندگی کا مقصد صرف انقلاب ہے۔ انقلاب کا نعرہ کتنا ہی خوش آئند ہو مگر انقلاب کا تصور کیا ہے جب زندگی کا صحیح تصور نہیں تو انقلاب کا صحیح تصور قائم ہونا محال ہے۔ اس لئے کہ انقلاب کا تصور اپنی وضاحت کے لئے زندگی کے تصور کا محتاج ہے۔ جب تک زندگی کا کوئی معقول تصور موجود نہ ہو نہ انقلاب کا کوئی تصور ہو سکتا ہے اور نہ اُس ادب کے خدوخال واضح ہو سکتے ہیں۔ جو اس مبہم تصور حیات کی بنیاد پر ایک انقلاب لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر بالفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انقلاب کا تصور معاشی ہمواری ہے تو بھی کوئی صحیح نظریہ مشکل سے ہاتھ آتا ہے کیونکہ آج یہ بات اشتراکیت کے روسی تجربے نے ظاہر کر دی ہے کہ زندگی صرف روٹی کے گرد مرکوز نہیں ہے بلکہ اُس کے کچھ اور لوازم بھی ہیں۔

نجم الاسلام نے ادب کی جو تعریف کی ہے جس میں دو باتیں تعمیری ادب کی خصوصیات کی حیثیت سے بیان کی گئی ہیں۔ اولاً معروف اخلاقی رجحانات کا احترام اور ثانیاً بھلائی کے جذبے کی پرورش۔ فی الواقعہ یہ دونوں باتیں ایک ہی بات کے دو رُخ ہیں جو دو انداز میں کہے گئے ہیں۔ مگر سوال یہاں بھی وہی ہے کہ معروف اخلاقی رجحانات ہیں کیا۔ اس بات پر غور کیا جائے

تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں کوئی ایسا حاسہ ہے جو برائی اور بھلائی کی تمیز کر لیتا ہے۔ اور یہ حس کسی قوم کے افراد یا کسی ملک کے لوگوں کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ یہ بنی نوع انسان کی مشترک ملکیت ہے۔ یہ انسانیت کے ضمیر کا ہی تو ہے جو ہمیشہ تمام حالات میں اور تمام ادوار ارتقا میں قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے من حیث جنس ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم بعض اخلاقی صفات کو مستحسن قرار دیا ہے۔ اور بعض اخلاقی برائیوں کو مذموم۔ پس اخلاق اُن ہمہ گیر انسانی قدروں کا نام ہے جو کبھی نہیں بدلتیں۔

مگر یہاں ایک اور سوال حل طلب پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر یہ اخلاقی قدریں قائم کیوں نہ رہ سکیں۔ آخر کیا وہ موانع تھے جنہوں نے اُن اخلاقی قدروں کی موجودگی میں دوسرے قوانین کی تدوین ممکن کر دی۔ اسی کا سبب صاحبانِ امر حکومت یا افراد کی خودغرضانہ مہمات تھیں۔ ان قدروں کے قیام کو یقینی بنانے اور پختگی دینے کے لئے آخری چارۂ کار یہ ہے کہ ہم نظام اخلاق کا وہ تصور اپنائیں جو خدا پرستی پر مبنی ہو۔

ادب کی اس تعریف میں ایک مقصد کی کماحقہٗ تصریح کر کے اس کے حصول کے لئے صحیح طریقوں کی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔ ادب کی اس تعریف میں زندگی کا مقصد بھلائی کا قیام یعنی "فلاح" بتایا گیا ہے اور فلاح کے لوازم (implications) یہ ہیں کہ زندگی معروف اخلاقی قدروں پر قائم رہ کر تخلیق کے الٰہی منصوبے کے ماتحت راہِ ارتقا میں گامزن رہے۔ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ ادب کی محرکِ اعلیٰ "توحید" ہی کیوں ہو؟ زندگی کیوں نہ ہو۔ مگر ذرا سے غور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعتراض قائم نہیں ہو سکتا، کیونکہ زندگی کی تفہیم براہ راست اور بلاواسطہ ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ انسانی تاریخ بتاتی ہے۔ توحید ہمیں زندگی کی تفہیم دیتی ہے۔ اس لئے دینی ضرورتوں سے قطع نظر بھی توحید کی ضرورت باقی رہتی ہے کیونکہ (Plan of creation) کی تفہیم کے لئے محرکِ اوّل (Prime Mover) کا تصور ضروری ہے۔

ادب کی ان تعریفوں کا موازنہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر نظریۂ ادب کے تحت جو ادب تخلیق پائے گا وہ وقتی اور انقلابی ہوگا۔ دوسرے نظریۂ ادب کے تحت جو ادب فروغ پائے گا وہ زندگی کو بقائے دوام کا پیغام دے گا۔ معروف اخلاقی قدروں کو اجاگر کر کے زندگی کو اس کی کھوئی عصمت دلائے گا اور معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایسے اصول دے گا جن سے بہتر اصول ممکن نہیں۔ یہ ادب زندگی کی راہ میں ایک توازن پیدا کرے گا۔ تعمیری ادب جن احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرے گا وہ متوازن ہوں گے اور ان میں بقول افتخار اعظمی پُر اضطراب ربودگی کے بجائے رُکا ہوا پُر وقار انداز فکر ہوگا۔ اس میں جذبات کی ہنگامہ آرائی نہ ہوگی جس اخلاق شر کے محرکات پر قابو پائے گا۔ یہ ادب اخلاقی بنیادوں پر ایک نظام حیات برپا کرنے کی سعی کرے گا۔

تصورِ خرد و جنوں عقل و عشق

شبنم سبحانی

اقبال سے پہلے دبستانِ شعر و ادب میں ان الفاظ کو کسی خاص اور وسیع مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا، اور ان کا کوئی خاص مقام نہ تھا مگر اقبال نے جو مستی کو دار اور عشق کا جذبہ پیش کرتے تھے، ان لفظوں میں معنی کا ایک سمندر پنہاں کر دیا اور ان کی بڑی جامع تفسیر بیان کی۔ ان کی شاعری بہت کچھ انہیں الفاظ کے محور کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے انہوں نے جگہ جگہ مختلف انداز بیان سے عشق و عقل اور خرد و جنوں کی تشریح کی ہے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ ان کے اس شعر سے ہم ان کی پوری زندگی اور پوری شاعری کا مقصد اور ماحد سمجھ سکتے ہیں۔

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

اقبال نے ہمیشہ عشق ہی کو اپنا امام بنایا اور عقل کو غلام، کیوں؟ اس کو مختلف مقامات پر انہوں نے واضح کیا ہے۔ آئیے ہم اس پر نظر ڈالیں۔ لکھتے ہیں۔

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیرِ کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

یہ شعر ان کے مافی الضمیر کو پوری طرح سے عیاں کر دیتا ہے اور اس میں اقبال نے بہت ہی جچا تلا فیصلہ عقل و عشق کے متعلق دیا ہے منزل دونوں کی ایک ہے۔ راستے جدا جدا، عشق تیز گام ہے اور عقل سست گام، عشق اپنے مقصود کی طرف کشاں کشاں چلتا ہے اور عقل ہزار حیلے ہزار بہانے کرتی ہوئی، قدم قدم پر ٹھٹھکتی ہوئی سوئے منزل چلتی ہے۔

عشق کی تعریف لامحدود ہے یہ دل کی وہ لگن، وہ جذبہ، وہ اسپرٹ، وہ جستجو، وہ جوش اور وہ شوق ہے جو انسان کے اعضا میں اپنے مقصود کے پالینے کی خاطر برقی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اسی عشق کی گرمی سے وہ اپنی منزل پالینے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک نامعلوم قوت کارفرما ہو جاتی ہے جو اسے فولاد سے بھی زیادہ مضبوط اور پہاڑ سے بھی زیادہ مستقل مزاج بنا دیتی ہے۔ عقل کسی چیز کو اپنی میزان پر تول کر پرکھتی ہے اس میں ہزار دو ترغیب نکالتی ہے اور اس لئے اپنے اندر لگن، جذبہ اور پیاس نہیں پیدا کر سکتی۔ عشق کی ایک ضربِ کلیمی کے سامنے عقل کے سیکڑوں وار بیکار نظر آتے ہیں، عقل اندیشہ ہائے دور و دراز میں گھری رہتی ہے، عشق ایک لمحہ میں سب کچھ کر گزرتا ہے۔ عقل کشتہ چون و چرا ہے۔ اور یہی عشق ہے جو جابر اور سائنس بنا دیتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

آگے چل کر علامہ نے اس کی وضاحت تفسیر بیان کی ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

خرد آنکھ کا نور ہے اور عشق دل کا نور اور قلب کی بینائی ہے۔ عشق کے بغیر انسان ایک تودہ خاک کے مانند رہ جاتا ہے۔ اس کی اسپرٹ اس کے رگ و پے میں روح دوڑا دیتی ہے۔ اقبال کے دو اور اشعار درج کرتا ہوں۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

راہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

جب ہم ان الفاظ کی تہ میں اترتے ہیں تو ان میں انسانی زندگی کو کامیاب بنانے والے اہم اجزا کارفرما نظر آتے ہیں۔ انسان کی عملی زندگی کا جسم تجزیہ کریں تو صاف صاف نظر آتا ہے کہ محض عقلی دلائل سے مطمئن ہو کر اپنائے گئے بہت کھوکھلی بنیادوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ہماری نظر پہلے ہی اس کی قوت سمجھ سکتی ہے مگر دل کی میزان پر آنے سے پہلے وہ مال کھوٹا ہی رہے گا۔ جو بات عقل کی منزلوں سے گزر کر دل میں اتر جاتی ہے اس پر ہم تن من دھن قربان کر سکتے ہیں۔ فلسفہ و منطق کبھی بھی ہم کو اس مقام پر نہیں پہنچا سکتے ہیں جہاں عشق کی ایک جست سے پہنچ جاتے ہیں جس مقصد سے ہم کو عشق ہو جاتا ہے وہی مقصد ہم پا لیتے ہیں

ہو سکتے ہیں۔ عشق ایک ایسی قوت لازوال پنہاں ہے جو مادی سائل و ذرائع سے بالکل منقطع ہو جانے پر بھی ہمارے حوصلوں کو بلند رکھتی ہے۔

یہ انسان کی وہ قوت ہے جو اس کو دنیا میں بڑے بڑے کارنامے کر ڈالنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ عقل کی بنیاد سراسر مادی قواعد پر رہتی ہے۔ مادی وسائل کی تنگدامنی کے مرحلے میں عقل کا ٹٹو بیکار ہو جاتا ہے۔ جس کا دل کا عالم یہ ہو کہ اپنی ہی مقام ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ہم اپنی قوتوں سے بڑھ کر نہ جانے کیا کیا کر سکتے ہیں۔ عقل کی عزت خرد کے پیچ و تاب میں الجھ کر ہمارے دماغ میں رہتی ہے۔ اس کیلئے سخت مرحلوں میں ہمارے قویٰ شل بھی ہو سکتے ہیں۔

اقبال نے عشق کو بہت بلند مرتبہ عنایت کیا ہے وہ مغرب کی عقل پرستی کے نتائج اور کھوکھلے پن سے اچھی طرح واقف تھے۔ مادیت کے سیلاب میں بہتے ہوئے مغربی تمدن کا انھوں نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے وہاں سود اندرون ملک میں عشق کا فقدان دیکھا۔ خرد کی گرم بازاری دیکھی۔ اور اس بازار میں متاع اخلاق، اخلاص اور محبت کم عیار سمجھی جانے لگی۔ انھوں نے انسانیت کی عظیم قدروں کو وہاں تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔ اپنے نفس اور اپنے شکم کو سب پر ترجیح دینے والے معاشی جانور بھی دیکھے۔ انسانیت کی معروف اخلاق قدروں کو اپنے زور بیان اور قوت استدلال کے پیچ و تاب میں الجھا کر ایک مکروہ رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے دیکھا۔

اور انھوں نے بلند بانگ ہو کر کہہ دیا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اور ________

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری

بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

انھوں نے دنیا کو عظمت انسانی سے آگاہ کیا اور عشق کو اس کے تمام شان سے انھوں نے دنیا کو آداب جنوں سکھلائے اور مستی کردار کا درس دیا۔ جوش عمل اور جوہر خودی کی قیمت سے آگاہ کیا۔ انبیاء کرام اور خدا کے دوسرے برگزیدہ بندوں نے آخر کس جذبے کے تحت اپنے مقصد کے لئے عظیم سے عظیم قربانیاں دیں۔ گرم سلاخوں، تپتی ہوئی نوکیلی صلیبوں، دہکتے ہوئے انگاروں اور خاردار راہوں سے آخر انھوں نے کیسے تجدید عشق کی۔ ان کے دامن میں ہی وہ متاع گراں بہا تھی جس نے ان کو اتنا سخت جان اور مستقل مزاج بنا دیا تھا۔ اور سرکار رسول عربی کی دعوت کو ہزاروں عیسائی، یہودی، کفار، مشرکین

اور حق سمجھتے ہوئے دل سے اور کے نقصان کے سبب ایمان نہ لا سکے۔ جارج برنارڈ شا اور دوسرے عمر بھر اسلام کی حقانیت، برتری، عظمت اور بلندی کا اقرار کرتے رہے۔ مگر عمل کی منزلوں پر ان کی ساری گرمی جذبات سرد پڑ گئی۔

اقبال عشق و جنون کی ان کششوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ عشق کے فقدان سے تحریکیں مٹ جاتی ہیں اور قومیں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اور ارادے ٹوٹ جاتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کی مظلومیت کا راز پا لیا تھا۔ اور عقل رندوں کی لائی ہوئی تباہیوں کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے تمام عالم اسلام کا غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ اور ہر جگہ عقل کی کارفرمائی دیکھی۔ زباں سے تو بڑے صداقتی نعرے ادا کئے جاتے ہیں اور بڑی بلند و بالا اداری کی قسمیں کھائی جاتی ہیں مگر عمل کے مرحلے پر رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اس مرض کی بنیاد پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔

بحر عشق اور جنوں کی بھی انھوں نے مخالفت کی، وہ اس کوری عقلیت کے بھی دشمن ہوئے جسے مغربی تہذیب نے میکانکیت کا روپ دیا تھا وہ بدمست صوفیوں اور حال و قال والے خانقاہیوں کے سخت خلاف تھے۔ جنہوں نے عشق کا کچھ اور مطلب سمجھ لیا ____ آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ "اقبال جانتے تھے کہ تخلیقی کاموں اور زندگی کے نازک موقعوں پر بڑے مقاصد کی گرمی، تھوڑی سی دیوانگی اور جوش و جذبے کی کیا اہمیت ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں عقل و عشق کا ملاپ ہے۔"

اقبال کے یہ اشعار ہمارے اس خیال کی وضاحت کرتے ہیں۔

عشق اب پیروی عقل خدا داد کرے

آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

کہنہ پیکر کو نئی روح میں آباد کرے

یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

اسلام کے بعد والوں نے تصوّر عقل و عشق اور خرد و جنوں کو اقبال سے پورا پورا اخذ کیا ہے۔ اور اسی کے مفہوم میں اسے اپنے شعر و ادب میں استعمال کیا ہے۔

حفیظؔ کا یہ شعر عشق کی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔

عشق جب تک روح رواں ہو دل بھی ہے بیکار نظر بھی

ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عقل کے احسانات کو بھی قبول کیا ہے لیکن مجرد عقل اور عقل پرستی کو غارتگر بتایا ہے۔ حفیظؔ لکھتے ہیں۔

عقل کے احسانات مسلّم عقل ہے لیکن غارتگر بھی

عشق کی گرمی، جنوں کی تابش نے انھیں اپنے مقصود کے لئے راہ کے تمام پیچ و خم اور دشواریوں کا خیر مقدم کرنے پر تیار کر دیا ہے۔ یہ معرود کے علمبرداروں کو

باطل کے ذریعہ پہونچائی گئی تمام مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا درس دیتے ہیں۔ دار و رسن کی منزلوں، خار دار وادیوں، زندان و سلاسل کے دشوار گذار مرحلوں کو طے کرنے کے لئے اسلام پسندوں میں عشق کی حرارت پیدا کرنا چاہتے ہیں ـــــ مغرب کی کوری عقلیت کے مخالف ہیں۔

زاہد لکھتے ہیں۔

جنوں تو دار پہ شوقِ طلب میں جا پہونچا
خرد پڑی ہے سرِ رہگذار ایک طرف
جنوں پہ اہلِ خرد ہیں جراغ پا اک سمت
نگاہِ رحمتِ پروردگار ایک طرف

برق کاکوری کا یہ مصرعہ

جنوں کی رہ میں پیچ و خم کوئی کیا راہ کے جائے

اور تسکین قریشی کا یہ شعر

عشق ہے آہ وہ غارتگرِ دل حس کے بغیر
مستیٔ ہوش نہیں لذتِ احساس نہیں

بھی اسی مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چند اور تعمیر پسند شعراء کے اشعار اسی موضوع پر ملاحظہ کیجئے۔

ساغر ہوشیارپوری ـــــ خیال و فکر کی سیمہ گری سے کیا ہوگا
گداز عشق ضروری ہے بندگی کے لئے

آغا صادق ـــــ عشق کا مدعا نہیں رکے
عقل کا مشورہ مقام مقام

احمد نسیم ـــــ عشق نے دیکھ لئے دونوں جہاں کے جلوے
اور ابھی اہلِ خرد شمس و قمر تک پہونچے

نشور ـــــ عقل بھی نبد میں سو ٹھوکریں کھا کر پہونچی
عشق گذرا تھا تری راہ گذر سے پہلے

شفیق ـــــ ابھی دیکھی نہیں عظمت ترے دیوانوں کی
فلسفی بھی ترے دیوانوں میں شامل ہو جائے

کوثر ـــــ جنوں بہ ظرف نہ کر جائے ہیٹھ گوشے میں
تو اے فقیہ محبت کے راز کیا جانے

انور ـــــ کتنی آساں تھی یہ رسم جنوں پہلے
کبھی اس دور میں آشفتہ سری مشکل ہے

شبنم ـــــ جسے دولتِ جنوں تو رسائی نہیں وہاں
اے دل مجھے متاعِ خرد پہ غرور ہے

ہمارے کچھ ساتھیوں نے رائج الوقت خرد اور جنون دونوں سے اظہار بیزاری کیا ہے وہ عقل پرستی کے بھی دشمن ہیں اور ہوش و حواس کو غارت کر دینے والے جنوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ ایسا جنوں نہیں چاہتے جو دیوانگی کی حد تک پہونچ جائے۔ وہ ایسی عقل سے نفرت کرتے ہیں جو کائنات کی ہر شئے اور اس کے ہر راز کو اپنی ترازو پر تولنے پر مجبور کرے۔ اکبر مرحوم نے کہا ہے۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

تو اس قسم کی فلسفیانہ کھود کرید اور خیال و فکر کی شیشہ گری ہمارے عظیم مسلک اور مقصد کی بنیاد پر ایک ضرب کاری ہے۔ اسی لئے عاصی ایک ایسے عشق کی تمنا کرتے ہیں جو ان دونوں سرحدوں سے باہر دونوں کے خمیر سے مل کر ایک نئی چیز ہو ـــــ لکھتے ہیں۔

عاصی ـــــ میں وہ عشق چاہتا ہوں جو حدوں سے ماورا ہو
نہ جنوں کا آستانہ، نہ خرد کی بارگاہ ہو

حفیظ ـــــ خیال کے دیوتا بھی چھوٹے عمل کے اندھے خدا بھی جھوٹے
خرد بھی برباد رس نہیں ہے جنوں بھی مشکل کشا نہیں ہے

سہیل احمد زیدی ـــــ جنوں کی گمرہی کو راہِ جاناں کون کہتا ہے
خرد کی قید کو جیب و گریباں کون کہتا ہے

شاکر ـــــ نہ ہستی کی مکمل کوئی تصویر نہیں
ہستی سنجیدہ نہیں عقل جنوں گیر نہیں

اسلام پسند ادیب اور شاعر کبھی مجرد جنوں یا مجرد خرد کی تلقین نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں کا ایک حسین امتزاج ضروری سمجھتا ہے۔ اور اس کے بغیر دونوں بیکار ہیں۔ الو۔ صدیقی کا یہ شعر میرے اس بیان کی صداقت عیاں کرتا ہے۔ اور کامیاب شعر ہے۔

میرے جنوں میں جلوہ گہ نور خرد بھی ہے ندیم
عشق تو بے خرد نہیں حسن ہے بے خبر تو کیا

ترقی پسندوں نے بھی ان الفاظ کو اقبال ہی کے تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اپنایا ہے ـــــ پھر بھی ان کے خیال و فکر میں یک رنگی نہیں ہے۔ ان کے تصورِ خرد و جنون میں بڑا اختلاف ہے ـــــ کچھ لوگ مغرب کی عقلیت سے اتنا زیادہ متاثر ہو گئے ہیں کہ ان کی نظر میں جنون کی کچھ وقعت

نہیں رہ گئی ہے ۔ جس کی ترجمانی اطہر سعید کا یہ شعر کرتا ہے ۔

خرد نے خفتہ حقائق کو کر دیا بیدار
جنوں کی خواب فروشانہ کوششوں سے کہو

اور کچھ حضرات عشق و جنوں کی بلندی و عظمت کا بڑے اچھے انداز میں اعتراف کرتے ہیں ——— ان کے اُن اشعار کو ہم سراہے بغیر نہیں رہ سکتے جن میں جنوں کی قیمت کو مانتے ہوئے خرد کی اہمیت جتائی گئی ہے ۔

یہاں جنون و خرد کا عمدہ امتزاج ملتا ہے ۔ اور ہم اس درمیانی راستے کو پسند کرتے ہیں ۔ اکبر حیدری کا یہ شعر اس معنی میں کامیاب شعر ہے ۔

جمالِ زیست تصویرِ جنونِ دل سہی لیکن
جمالِ زیست میں شامل خرد کا بانکپن بھی ہے

خرد اور جنوں آج یہ دونوں الفاظ موجودہ شاعری کے اہم محور بن گئے ہیں

اقبال نے کوری عقلیت اور عشق کا تقابلی مطالعہ کیا اور سب سے پہلے انھیں کی شاعری سے یہ صحت مند تعمیری سوتے پھوٹے اور ہم تک آتے آتے تغزل کی جان بن گئے ——— یہ بہت ہی معنی خیز الفاظ ہیں ۔ ان کے اشارات کے پیچھے ایک وسیع مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے ۔ آج یہ ہر چھوٹے بڑے کی زباں پر ہیں ۔ ہر کوئی ان کی تفسیر بیان کرتا ہے ۔ مگر ابھی تک زیادہ تر عشق و جنوں کو سراہا گیا ہے ۔ اور عقل سے لوگ متنفر رہے ہیں جو عقل بھی بہر حال اللہ کی بخشی ہوئی ایک قابل قدر قوت ہے ۔ اس کو ہم اس طرح ذلیل بھی نہیں سمجھ سکتے ۔

ہم نے عقل سے جو فیض حاصل کیا ہے اس کو بھی فراموش نہیں کر سکتے ۔ اس کے فائدوں سے آنکھیں بند کر کے ہم ایک غیر معمولی قوت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہمیں جس عقل سے اختلاف ہے وہ ہے خرد کا غلط استعمال وہ خرد جو زندگی کے ہر موڑ پر محض مصلحت پرستی میں اُلجھا کر ہماری راہ کا روڑا بنتی ہے ۔ ہمارے لئے یہ بالکل بے کار نہیں ہے ۔ مغرب کے اُس سیاہ پہلو کو جو عقل کے بُرے استعمال سے پیدا ہوا ہے ہم کاٹ پھینکیں گے اور اس کے تعمیری پہلو کو اپنا لیں گے ساتھ ہی ساتھ ہمیں عشق کی بھی اصلاح کرنی ہے ۔ عشق کو بھی قابل صحت مند بنانا ہے ۔ ہمارے شعراء خوش ہیں کہ ان الفاظ کے ساتھ بہک نہیں رہے ہیں اور بڑے شعور کے ساتھ عقل و عشق کی تفسیر و تشریح اپنے اشعار میں بیان کر رہے ہیں ۔ تعمیر پسندوں کے چند اشعار پیش کرتے ہیں قارئین [illegible] ۔

برق ——— خرد کی آنچ نے پگھلا دیئے احساس کے سانچے
مئے عرفاں سے خالی ہو چکے ہیں دل کے پیمانے

عنوان ——— خرد مند ہو کے مری کاش مجھ سے چھین لے وحشت
[illegible] انسانیت پر [illegible] کون دیکھے گا

جلیل ——— عقل رہزن بنی تھی راہِ عشق میں
بڑھ کے جوشِ جنوں پاسباں بن گیا

حفیظ ——— کوئی ہوش سے گریزاں، کوئی جوش سے گریزاں
وہ جنوں کی حیلہ سازی یہ خرد کی حیلہ سازی

حقی حزیں۔ ایم۔ اے

کس سے کہئے حالِ شبِ غم
کون ہے اے دل اپنا محرم

ان سے کوئی اب ربط نہیں ہے
ہائے وہ اُن کا وعدۂ محکم

شرحِ محبت توبہ توبہ
جتنی واضح اتنی ہی مبہم

ہاں اسے پھر آواز سنا دو
دل کی صدا پھر ہو گئی مدھم

چاندنی راتیں اُن کا تصوّر
ہو بہو جیسے خواب کا عالم

اس کے سوا کیا دل کی ہستی
سوزِ مکمل، دردِ مجسّم

کوئی نہ ہو جب سننے والا
دل کا دھڑکنا دل کا ماتم

یاد ہے اب تک وقتِ رخصت
آہ حزیںؔ وہ چشمِ پُرنم

حفیظ میرٹھی

سوز نہ ہو تو سازِ حیات
صرف اِک روکھی پھیکی بات

جل اُٹھ جل اُٹھ شمعِ یقیں
رات ہے اور اندھیری رات

آہ یہ حُسن کی نایابی
اُف یہ جلوؤں کی بہتات

اُن کا کھیل دلِ آزاری
اور مرے نازک جذبات

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچّی بات

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات

کوئی ہنسے کوئی روئے
یہ اپنے اپنے حالات

نامحکم بنیادِ ہوس
عشق سراپا صبر و ثبات

کیف نوگانوی

○

کوئی مونس کوئی غمخوار نہیں ہے نہ سہی
اب کہیں سایۂ دیوار نہیں ہے نہ سہی

صاحبِ دل ہی کوئی دار کو زینت بخشے
صاحبِ عقل سرِ دار نہیں ہے نہ سہی

حسنِ کردار تو ہے باعثِ تسخیرِ جہاں
تیرے قبضے میں جو تلوار نہیں ہے نہ سہی

تم جو چاہو سرِ ساحل ہی ڈبو دو کشتی
میری قسمت میں جو منجدھار نہیں ہے نہ سہی

آپ تو عقلِ جہاں سوز پہ قابو کیجے
میرے قابو میں دلِ زار نہیں ہے نہ سہی

کیف اپنا تو گریبان رفو کر لیجے
میرے دامن میں کوئی تار نہیں ہے نہ سہی

اختر کاظمی پوری

○

وہ تخیل جو رہِ حق پہ رواں ہوتا ہے
جامِ زہر اب ہی پی پی کے جواں ہوتا ہے

غم تری روح میں یوں رچ سا گیا ہے مطرب
تیرے گیتوں پہ بھی آہوں کا گماں ہوتا ہے

یاس انگیزیٔ ماحول الٰہی توبہ
ذکرِ گلشن بھی یہ تمہیدِ خزاں ہوتا ہے

دل سے سرگوشیاں کرتی ہیں جب اُن کی یادیں
ایک پُر کیف و سکوں خیز سماں ہوتا ہے

غم کے جانے پہ بھی رہتی ہیں خراشیں باقی
ختم کب سلسلۂ آہ و فغاں ہوتا ہے

کیوں سناتا ہے مجھے گیت کہ یہ دنیا ہے
ہر نفس عمر کا یاں مرثیہ خواں ہوتا ہے

سہیل احمد زیدی

○

جہلِ خرد کیا جانے کیوں
خاک ہوئے پروانے کیوں

شیشۂ دل جب چور ہوا
یاد آئے تم جانے کیوں

کس سے ہوا ایمانِ وفا
اپنے ہوئے بیگانے کیوں

کون حقیقت راز میں ہے
پھیلے ہیں افسانے کیوں

ان کی نظر کیا کم ہے ہمیں
ہم جائیں میخانے کیوں

کس کو غرض تم سے ہے سہیل
کوئی تمھیں پہچانے کیوں

عنوان چشتی ۔ منگلوری

○

سرنگوں ہو گیا تیرگی کا علم
مرحبا مرحبا اے چراغِ حرم

چونک اٹھوں کیوں نہ احباب کے نام پر
میں نے کھایا ہے اکثر فریبِ کرم

مصلحت ہے یہ آہستہ گامی نہیں
ورنہ آگے رہا ہے ہمارا قدم

بے خبر دشمنوں کو بتا دے کوئی
مٹنے والے نہیں ہیں زمانہ سے ہم

مسکرا کر پیامِ محبت نہ دے
میں نے اپنا لیا ہے زمانہ کا غم

غم نے عنوان اگرچہ سہارا دیا
لڑکھڑا ہی گئے زندگی کے قدم

محمد تاج الدین تاج اورنگ آبادی

تابانیِ فضائے زمان و مکاں بھی دیکھ
گلشن بھی دیکھ قلب کا اپنے جہاں بھی دیکھ

غم دیدہ بہار کا حسن بیاں بھی سن
اے بے خبر حقیقتِ آہ و فغاں بھی دیکھ

اے عیش کوش دامنِ عصمت کی لاج رکھ
تھرا رہا ہے عرشِ بریں آسماں بھی دیکھ

سمجھا ہوا ہے جس کو تو فانوسِ زندگی
تعبیرِ حق کی صورتِ خوابِ گراں بھی دیکھ

آئینۂ ازل میں ابد جلوہ بار ہے
فکر و نظر کا حاصلِ طرزِ بیاں بھی دیکھ

آثار ہیں تمام یہ عزم و ثبات کے
کیفِ عمل کا اپنے یقین و گماں بھی دیکھ

اے تاج زندگی کے سائر ہیں بے نہاں
باقی ابھی ہیں فکر و نظر کے جہاں بھی دیکھ

مضطر جبلی آبادی

جہانِ آرزو میں سعیِ قطعِ آرزو کب تک؟
اسیرِ پنجۂ غم ہو! خوشی کی جستجو کب تک

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ ہستی، غمِ دنیا!
کوئی پیتا رہے شام و سحر دل کا لہو کب تک!

یہ ہے بازی محبت کی نہیں بازیِ طفلانہ
یہ ہر اک گام پر تجھکو بہک جانے کی خو کب تک

حجابِ زندگانی کس لئے اٹھتا نہیں یارب!
یونہی کھاتا رہے کوئی فریبِ آرزو کب تک

یہ مانا ہیں بہت ہی دلنشیں محفل کے ہنگامے
مگر محفل میں یوں بیٹھے گا اے ناداں تو کب تک

کر اپنے پیکرِ خاکی میں کچھ سوزِ یقیں پیدا
کرے یگانگی از آئینہ لا تقنطو کب تک

تری وحشت کی غیرت کو ہوا آخر یہ کیا مضطر
رہے گا تیرے دامن پر یہ احسانِ رفو کب تک

تنگ کمرہ

مصنف: — آرتھر میچن
مترجم: — ابنِ فرید

(۱)

اور اُس نے خود کو انتہائی استعجاب میں پایا کہ وہ مقررہ جگہ پر ایک نمایاں اطمینان کے ساتھ پہونچ گیا ہے۔ یہ سچ تھا کہ دریچہ دیوار میں کسی قدر بلندی پر تھا۔ اور آتش زدگی کے حادثہ پر اس سے کسی طرح نکلنا ممکن نہ تھا کیونکہ لندن کے تہہ خانوں کے روشندانوں کی طرح اُس میں سلاخیں جڑ دی گئی تھیں لیکن دوسری حیثیتوں سے وہ انتہائی تنگ کمرہ تھا — اُس کی دیواروں پر خوشنما پھولدار کاغذ چسپاں تھا۔ ایک کتاب گیر — اگر وہ گرانی محسوس کرے — دریچہ کے نیچے ایک چھوٹی سی میز ایک تختہ اور مسودوں کے ساتھ دو تین خوبصورت تصاویر مذہبی اور عام نوعیت کی، اور وہ آدمی جو اس کا نگراں تھا، کمرہ کی وسطی میز پر چائے وغیرہ سجا رہا تھا۔ اور روشن آگ کے سامنے بید کی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ بہرحال وہ مکمل طور پر ایک خوشگوار کمرہ تھا حالانکہ اب اُسے کوٹھری ہی کہیں گے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ سب کچھ کسی نہ کسی طرح ختم ہو چکا تھا۔

(۲)

اسے ایک گھنٹہ پہلے تین ماہ تک بڑا دہشت انگیز زمانہ گذر رہا تھا سب سے پہلے وہ مصیبت شروع ہوئی اور ایک منٹ میں ختم ہو گئی۔ اور یہ سب ایک لڑکی کے واسطے ہوا جو اس کی مستحق بھی نہ تھی۔ لیکن اب اس کو کسی طرح قصبہ سے نکل بھاگنا تھا اُس نے پہلے سوچا کہ وہ اپنے معمول پر لگ جائے اور اس حادثہ کے بارے میں بالکل انجان بن جائے۔ وہ کیسے سمجھ سکتا تھا کہ کسی نے اُس کو ندی کے ساحل تک خوف کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیوں نہ وہ ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کرتا پھرے۔ اور اس کا نام ہی نہ لے۔ اور رنگ لیٹر آرمس میں صحت بوتل سے لطف اٹھائے وجہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے لاش کو جھاڑیوں کے پیچھے عرصہ ہوا تلاش کر لیا ہو اور اُس کے بارے میں تلاش و جستجو ہو رہی ہو۔ یہ بھی بہترین تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ باہر نکل آئے اور اگر پولیس اُس سے تفتیش کرے تو وہ اپنی زبان کو جنبش ہی نہ دے لیکن پھر بھی وہ اس شام کی اپنی مصروفیات کے بارے میں کیا بیان دے گا؟ وہ

کہہ سکتا ہے ملیڈن کے جنگلات تک چہل قدمی کرنے گیا تھا اور راستے میں کسی سے ملاقات کئے بغیر گھر واپس آ گیا۔ وہ جو کچھ سوچ رہا تھا اُس کی کوئی تردید کرنے والا ہی نہ تھا۔

اور اب خوش وضع کاغذ والی دیواروں سے تنگ کمرے میں تنگ کرسی پر آگ کے سامنے بیٹھا ہوا — کتنی متضاد روایات لوگ ان جنگلوں کے بارے میں بیان کرتے تھے — وہ خواہش کر رہا تھا کہ کاش اُس نے خود کو پیش کر دیا ہوتا۔ اور اس کو جھیل لیا ہوتا اور ان کو آنے دیا ہوتا اور وہ جو کچھ تلاش کر سکتے تلاش کر لیے دیا ہوتا لیکن پھر وہ خوف زدہ ہو گیا متعدد آدمیوں نے آ کر حلفیہ بیان کرتے ہوئے سنا تھا کہ یہ تفریح کے واسطے چہل قدمی ہی ہوتی اگر وہ اس لڑکی کو اکیلا نہ چھوڑ جاتا۔ اور اس نے اپنی ریوالور ڈک ہیڈن، ٹولسٹر کیری اور فنی میں اور دوسروں کو دکھایا ہوتا اور انھوں نے ریوالوروں میں گولیاں بھری ہوتیں اور قصہ ختم ہو جاتا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اور ہیبت سے کانپ گیا۔ اور اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ اب لیڈھم میں کبھی سکونت اختیار نہیں کر سکتا ایک گھنٹہ بھی نہیں۔

(۳)

مسٹر ریواتس، اُس کی مالکۂ مکان اپنی شادی شدہ لڑکی کے ساتھ قصبہ کے دوسرے حصہ میں شام گذار رہی تھی۔ اور گیارہ بجے رات سے قبل آنے والی نہ تھی۔ اُس نے اپنی گھنی داڑھی اور مونچھوں کو مونڈ ڈالا۔ اور اندھیرے میں قصبہ سے چھپتا چھپاتا نکل گیا۔ اور صبح ہی بیس میل دور ڈرالی پہونچ گیا تاکہ لندن کے سفر کے لئے سر وقت گاڑی پکڑ سکے۔ اُس وقت بے انتہا بھیڑ تھی اور جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا اس کا اپنی جان پہچان کا کوئی بھی نہ آتا تھا اور ڈرتے ڈرتے داخل ہوا۔ اس وڈ کے کپڑے والوں سے بھرے ہوئے تھے جو اپنے آپ میں مگن تھے اور اُس کی طرف توجہ ہی نہیں کر رہے تھے۔ وہ سب کے سب ہجوم کی شکل کر اس پر اتر گئے۔ اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ ٹہلنے لگا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جیسا کہ وہ کر رہے تھے اور سب کے ساتھ ایک

گلاس جو کی شراب پیر ہجوم شراب خانہ سے پی۔ وہ تو سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کیسے کوئی پتہ لگا لے گا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

(۴)

اُس نے گلڈ وبیہ کی سڑک کی ایک خاموش گلی میں ایک عقبی کمرہ حاصل کر لیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اُس رات شام کے اخبار میں کوئی خاص بات تھی جس سے آپ کوئی صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتے تھے۔ دوسرے دن جون کی لاش مل گئی۔ اور انہوں نے تحقیق کر لی کہ وہ قتل تھا ـــــ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ خودکشی ہو ہی نہیں سکتی ـ اور پھر اس کا نام منظرِ عام پر آ گیا۔ وہ لاپتہ تھا اور اس سے تقاضہ کیا گیا تھا کہ وہ خود کو پیش کر دے اور یہ قیاس کیا جا رہا تھا کہ وہ لندن جا چکا ہے۔ اور وہ خوف سے نیم جاں ہو گیا۔ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ کوئی چیز اُس کے حلق میں آ کر اٹک گئی اور اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اپنے کمرہ کو واپس جانے سے بھی خوف کھا رہا تھا کیونکہ اُسے گمان ہو رہا تھا وہ اب اُس میں قیام نہیں کر سکتا۔ وہ برابر فرش کو ایک وحشی درندہ کی طرح روندتا رہے گا۔ اور اُس کی مالکہ مکان حیرت میں گرفتار ہو جائے گی۔ وہ گلی پر پھرنے سے بھی خوف زدہ تھا۔ اُسے خطرہ تھا کہ کوئی پولیس کا سپاہی اُس کے پیچھے سے آ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے گا۔ وہاں ایک گوشہ میں ایک مربع تھا۔ وہ اُس کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے چہرے کے سامنے اخبار کر لیا۔ بچے اُس کے گرد شور مچاتے اور چیختے ہوئے دوڑتے بھاگتے رہے۔ انہوں نے اُس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ اور اس کے باوجود وہ اُس کی معیت میں تھے۔ یہ کمرے کی تنہائی سے کتنا مختلف ماحول تھا۔ لیکن جلد ہی رات بھیگنے لگی اور ملازم پھاٹکیں بند کرنے آ گیا۔

(۵)

اور اُس رات کے بعد متعدد راتیں اور متعدد دن خوف اور ہیبت کے اس طرح گذرے کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ ان کو جھیلے گا اور زندہ بھی رہے گا۔ وہ اپنے ساتھ کافی روپے لایا تھا کہ کچھ عرصہ بافراغت گذار سکے لیکن جب بھی وہ کوئی نوٹ ریزگاری میں تبدیل کراتا تھا تو خوف سے کانپ جاتا تھا کہ کہیں اُس کا پتہ نہ لگا لیا جائے۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ کہاں جا سکتا تھا؟ کیا ملک سے باہر جا سکتا تھا؟ لیکن اس کے لئے پاسپورٹ اور مختلف طرح کے کاغذات کا جھنجھٹ تھا۔ اور یہ وہ کبھی بھی نہ کرے گا۔ اُس نے اخبار میں دیکھا کہ پولیس کو پیڈہم کے قتل کے راز کا کچھ سراغ لگ گیا ہے اور وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی جائے سکونت کو پہونچا اور خود کو مقفل کر لیا اور شدّتِ غم اور اذیت سے کراہنے لگا۔ اور پھر اُس نے محسوس کیا کہ وہ بے ربط جملوں میں بغیر کسی معنی و مطلب کے بڑبڑا رہا ہے۔ کھلبلا رہا ہے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ . . .

. . . ہاں، ہاں، ہاں، ہاں . وہاں، وہاں، وہاں . . . . . .
اچھا، اچھا، اچھا . . . . محض اس وجہ سے کہ اُسے کچھ کہتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اذیت اُس کے دل میں شکوک پیدا کئے دے رہی تھی۔ وہ بے پناہ خوف اُس کی جان خشک کئے دے رہا تھا۔ ہیبت کا بوجھ اُس کے سینے کو کچلے دے رہا تھا لیکن پھر کچھ بھی نہ ہوا۔ اور ایک موہوم سی، دھندلی کپکپاتی ہوئی امید اُس کے دل میں چند لمحوں کے لئے ابھرنے لگی۔ اور دو ایک دنوں تک وہ محسوس کرتا رہا کہ شاید کوئی سنہری موقع میسر آ جائے۔

ایک رات وہ ایسی شگفتہ حالت میں تھا کہ وہ کونے پر کے مختصر پبلک ہاؤس چلا گیا۔ اور معمولی سی غیرت کے ساتھ ایک بوتل ہلکی نشہ آور بھوری شراب پی، اور سوچنے لگا کہ اب آیندہ کیسی زندگی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اگر کسی معجزہ کے ذریعہ ــــ اس نے اس کیفیت کے باوجود محسوس کیا کہ وہ ایک معجزہ ہی ہوگا ـــــ یہ سارا خوف و خطر فنا ہو جائے اور وہ ایک بار پھر دوسرے انسانوں جیسا ہو جائے، اور کسی چیز کا کھٹکا ڈر نہ رہ جائے۔ وہ بھوری ہلکی شراب سے لطف لے رہا تھا۔ اور ایک خیالی بادیہ پیمائی کر رہا تھا کہ بار کی طرف سے اتفاقیہ بلند ہونے والے جملے نے اُس کو چونکا دیا۔ "وہ اس کے تعاقب میں یہاں سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔" اُس نے شراب کے گلاس کو نصف بھرا ہوا چھوڑ دیا اور اس خواہش میں باہر نکل گیا کہ شاید اُس میں اتنی ہمت ہو کہ وہ اُس رات اپنا خاتمہ کر لے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بار میں لوگ ایک نئے اور متحیر کن قتل پکڑنے والے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن ایسے تمام فقرے اُس کی بدنصیبی کے لئے موت کا سا روح رکھتے تھے۔ اب آیندہ اور ہمیشہ وہ اپنے آپ کو خوف کے مقابلہ میں روکے گا۔ وہ تھرتھرائے اور گلیاں نئے پر قابو حاصل کرے گی۔ اور حیرت کے ساتھ دیکھا کرے گا کہ انسان کا دل اس قدر تلخ یاس اور شدید اذیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ جیسے اُس نے یہ تحقیق کر لیا تھا کہ تنہا وہی تمام انسانوں سے مختلف ایسی دنیا میں رہ رہا ہے جس کو کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا اور اگر کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کیا جائے جس پر کوئی یقین بھی نہ کرے گا۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی میں ایسے چند ایک ڈراؤنے خوابوں میں جا چکا تھا جن میں انسان اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اتنے خوفناک تھے۔ اتنے خوفناک کہ اُن میں سے دو تین نے اُسے برسوں مضطرب رکھا ہے لیکن اس کے مقابلے میں جو وہ اب جھیل رہا ہے۔ وہ محض راحت تھے۔ وہ اسے جھیل نہیں رہا تھا۔ بلکہ جلتی ہوئی آگ میں اینٹھتے ہوئے کرمان کی طرح ان سے دوہرایا جا رہا تھا۔

وہ گلیوں میں باہر نکل گیا۔ جن میں سے کچھ پُرسکون تھیں اور کچھ پُرشور اور وہ ہیبت زدہ ذہنی انتشار میں فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ کس کا

انتخاب کرے۔ وہ اس کی تلاش لندن کے اُس گوشہ میں بھی کر رہے تھے، وہاں ہر قدم پر موت کی دہشت ناکی کا خطرہ تھا۔ شاید وہ گلیاں محفوظ ہوں جن پر لوگ قہقہے لگاتے ہوئے اور خوش گپی کرتے ہوئے گذر رہے تھے، وہ ان کے ساتھ چہل قدمی کر سکتا ہے اور اُن میں سے ایک معلوم ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح اُن کی توجہ سے کافی حد تک بچ سکتا ہے جو اس کا تعاقب کر رہے ہیں ——

لیکن اس لمحہ طاقت ور برقی قمقموں نے ان گلیوں کو تقریباً دن کی طرح روشن کر دیا۔ اور راہ گیروں کا ایک ایک نقش نمایاں نظر آنے لگا۔ ٹھیک ہے کہ اُس کی داڑھی مونچھیں صفاچٹ ہیں، اور اخباروں میں اس کی تصویریں اُسے بارشیں ظاہر کرتی ہیں۔ اور اس کا چہرہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی ایسی آنکھیں بھی ہیں جو ان بہروپیوں کے اندر تک جھانک سکتی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے وہ لیڈھم سے کسی ایسے شخص کو دے آئے ہوں جو اس کو اچھی طرح پہچانتا ہو۔ اس کے چلنے کے انداز کو جانتا ہو۔ اور اس طرح اُسے کسی بھی لمحے للکارا جا سکتا ہے اور روکا جا سکتا ہے۔ وہ ہمت ہی نہ کر سکا کہ منور برقی قمقموں کے نیچے چل سکے۔ وہ خاموش اور اندھیری جگہوں میں ہی محفوظ رہے گا۔

وہ ایک نزدیکی خاموش گلی کا رخ کرنے کے لئے مڑنے ہی والا تھا کہ وہ جھجکا۔ یہ گلی بیشک کافی تاریک تھی۔ اور اس پر اچھی طرح روشنی بھی نہیں تھی۔ پھوری اور نیچی دو منزلہ عمارتوں والی گلی تھی جس کے ہر مکان میں تین چار خاندان گذر بسر کر رہے تھے تھکے ہوئے انسان دن بھر کی محنت کے بعد یہاں گھروں کو آ رہے تھے۔ انہوں نے قبل از وقت ہی پردے گرا دیئے تھے۔ اور جلد ہی بستروں پر چلے گئے تھے۔ اس گلی میں قدموں کے نشان شاذ و نادر تھے۔ اُن گلیوں میں بھی جن سے یہ ملتی تھی۔ اور برقی قمعیں چوڑی، اور مصروف شاہراہوں کے مقابلے میں کم اور دھندلی تھیں۔ اور اس کے باوجود کہ اس وقت چند ایک انسان ہی گذر رہے تھے۔ وہ کچھ اور توجہ کا مرکز بن گیا اور مشتبہ ہو گیا۔ پولیس کے سپاہی آہستگی کے ساتھ رکھوالی کے لئے تاریک گلیوں سے اسی طرح گزر رہے تھے جیسے وہ روشن گلیوں سے گذرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں آنکھیں تھوڑے آدمیوں پر ہی نظر رکھتی ہوتی ہے اس لئے وہ گلی کے کنارے وہاں پر گذرنے والوں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ اس کی دنیا میں اس جان لیوا دنیا میں جس کی تلاش اس نے تنہا کی تھی۔ اور جس میں وہ تنہا رہ رہا تھا اندھیرا دن سے زیادہ روشن تھا۔ اور خلوت زیادہ خطرناک تھی جلوت سے۔ وہ روشنی میں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اور سایوں سے خوف کھانے لگا۔ اور وہ تیزی سے ہوا اپنے کمرہ کو چلا گیا۔ اور کانپتا رہا۔ جیسے جیسے رات گذرتی رہی۔ کانپتا رہا اور چیخ چیخ کر اپنی فکر وہ مالا جپتا رہا۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے . . . .

عظیم الشان، عظیم الشان . . . . یہی طریقہ ہے، یہی طریقہ ہے، یہی طریقہ ہے، یہی طریقہ ہے . . . . ہاں، ہاں، ہاں، . . . . . اعلیٰ درجہ کی۔ اعلیٰ درجہ کی . . . بہت اچھا . . . ایک، ایک، ایک، ایک سے دھیمی آواز میں گلبلاتا رہا تاکہ خود کو وحشی درندے کی طرح چلانے سے باز رکھ سکے۔

(۶)

وہ ایک وحشی درندے کی طرح اپنی قسمت کے پنجرے سے خود کو ٹکرا رہا تھا اور جھنجھوڑ رہا تھا۔ اور وہ اُسے بار بار اس طرح چوٹ پہنچا رہی تھی جیسے وہ غیر معتبر ہو۔ وہ یقین نہیں کرتا تھا کہ یہ ایسا تھا، یہ کچھ اس طرح تھا کہ جیسے وہ جاگ پڑا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے وہ خوفناک خوابوں سے جاگا تھا جو اس کو یاد ہیں۔ کیونکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوا کرتا وہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقین نہیں کرتا تھا۔ یا یہ اگر اس طرح ہوا تو یہ تمام مصائب کسی اور شخص پر گذر رہے تھے۔ جس کی بدبختی میں وہ پُراسرار طور پر داخل ہو گیا تھا۔ یا پھر وہ ایک کتاب میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک کہانی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جس کو پڑھ کر انسان لرز جاتا ہے۔ لیکن اُس سے ایک لمحہ کے لئے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا ہے۔ محض ظن و قیاس، یقیناً۔ شاید پھر سب کچھ درست ہو جائے۔ اور تب حقیقت اُس کے دہکتے ہوئے غم کے انگاروں پر ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح آ پڑی۔

وہ بار بار خود سے استدلال کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو معقول بننے پر مجبور کر رہا تھا جیسا کہ وہ چاہتا تھا اور اتفاقات کو راہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال، تین ہفتے ہوئے جب وہ ڈرائلی کی مسافر گاڑی میں سوار ہوا۔ اور وہ اس وقت آزاد تھا۔ اور ہر آزادی کا دن اس کے لئے اتفاقات کی خوش کُن نوید تھا۔ ایسی واردات اکثر امتدادِ زمانہ کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ایسے متعدد واقعات ہیں کہ پولیس اس شخص کو پکڑ نہ سکی جس کے پیچھے لگی تھی۔ اس نے اپنا پائپ جلایا اور معاملات پر خاموشی سے غور کرنے لگا یہ ایک بہترین تدبیر ہو گی کہ وہ مالکِ مکان کو نوٹس دیدے اور ہفتہ کے اختتام پر مکان چھوڑ دے۔ اور جنوبی لندن میں کہیں سکونت اختیار کر لے، اور کسی طرح کا کوئی پیشہ اختیار کر لے، یہ اُن کو اُس کے تعاقب سے دُور ہٹا دے گا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اور دریچے سے باہر کچھ سوچتے ہوئے دیکھا اور اپنا سانس روک لی۔ سامنے اخبارات کی چھوٹی سی دوکان پر شام کے تازہ اخبار کا اشتہار آویزاں تھا۔ لیڈھم کے قتل کے راز کا انکشاف

آخری لمحہ آ گیا۔ اس کو وہ اصل طریقہ معلوم ہی نہ ہو سکا جس کے ذریعہ اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ درحقیقت، ایک عورت جو اس کو اچھی طرح جانتی تھی —

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

مصنف:— جان بنیان۔ (John Bunyan)
مترجم:— جادہ پیما۔

مُسافر

John Bunyan کی مشہور تصنیف Pilgrim's Progress کا ترجمہ اسلامی افکار کے پیرایہ میں۔

آبادی سے دور ایک دن چلتے چلتے میں ایک ایسی جگہ جا پہونچا جہاں ایک غار تھا۔ اور وہاں لیٹ گیا۔ لیٹ کر نیند آگئی۔ اور جب میں سویا ہوا تھا تو میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب میں مجھے بوسیدہ سے کپڑے پہنے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ منہ اس کا اپنے گھر کی طرف تھا۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور پشت پر بڑا بھاری بوجھ تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ کتاب کھول رہا تھا۔ پھر اس میں سے کچھ پڑھنے لگا۔ اور جیسے جیسے پڑھتا جاتا روتا جاتا اور کانپتا جاتا اور جب اس کی بھی تاب نہ رہی تو ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگے: "ہائے اب کیا کروں"۔

اس حالت میں آخر وہ گھر گیا۔ اور ایک گوشہ میں بیٹھ رہا۔ تاکہ بیوی اور بچوں کو اس کی مصیبت کا پتہ نہ لگ سکے۔ لیکن زیادہ دیر تک اس سے چپ نہ رہا گیا اس لئے کہ اس کی مصیبت بڑھ گئی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی ذہنی کیفیت کا سب حال بیوی بچوں پر کھول دیا۔ اور ان سے اس طرح کہنے لگا۔

"بیوی اور بچو! میں اس وقت ایک بھاری بوجھ کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ہمارا شہر آسمانی آگ میں جلا دیا جائے گا۔ اور اس بھیانک آگ سے میں اور بیوی بچے سب تباہی کی زد میں آجائیں گے بچنے کی صورت ایک یہی ہے کہ بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ مل جائے اور وہ نظر نہیں آتا۔ اس کے متعلقین بہت متعجب ہوئے۔ یہ نہیں کہ انہیں ان باتوں کا یقین آگیا تھا بلکہ انہیں خیال ہوا کہ اس کا ذہنی توازن متاثر ہو رہا ہے اس لئے رات نزدیک آ ہی رہی تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ نیند سے اس کے دماغ کو سکون مل جائے۔ جلد ہی اس کو لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ مگر رات بھی اس کے لئے اتنی ہی تکلیف دہ رہی جتنا تکلیف دہ دن گذرا تھا۔ بجائے سونے کے اس نے رات آنسو بہانے اور آہیں بھرنے میں کاٹ دی۔ پھر جب صبح ہوئی تو ان لوگوں کو اس کی خیر خبر لینے کا خیال آیا۔ اس نے بتایا۔ حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ اس نے پھر ان لوگوں سے بات چیت کرنی چاہی۔ مگر انہوں نے سختی سے کام لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس کے سر کا سودا سختی سے پیش آنے ہی سے مٹ سکتا ہے۔ کبھی وہ پھبتی کستے۔ کبھی برا بھلا کہتے۔ اور کبھی اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے۔

لہٰذا وہ خود کو زیادہ تر کمرے میں رکھنے لگا۔ وہاں بیٹھا ان لوگوں کے حق میں دعا کرتا اور ان کی حالت پر ترس کھاتا۔ اور اپنا غم بھی غلط کرنے کی کوشش کرتا۔ میدان میں تنہا ٹہلنے کو بھی نکل جاتا۔ کبھی کچھ پڑھتا ہوا کبھی خدا کے حضور میں دست بدعا۔ اور اس طرح چند دن تک وہ اپنا وقت گذارتا رہا۔

اب ایک وقت کے بعد میں نے دیکھا، جب وہ میدان میں ٹہل رہا تھا تو حسب معمول اپنی کتاب میں سے کچھ پڑھ رہا تھا اور بڑی ذہنی الجھن میں مبتلا تھا۔ اور جوں جوں پڑھتا جاتا پھوٹ پھوٹ کر روتا جاتا۔ اور پہلے کی طرح چلاتا جاتا "میں بچنے کے لئے کیا کروں"۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کبھی ادھر دیکھتا کبھی ادھر، جیسے وہ بھاگنے والا ہو مگر وہ وہیں کھڑا رہتا۔ کیونکہ جیسا میرا خیال ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ کدھر کو جانا چاہئے۔ تب میں نے نظر ڈالی اور دیکھا کہ ایک شخص جس کا نام خضر تھا۔ اس کی طرف چلا آرہا ہے۔ اس نے آکر پوچھا تو اس طرح کیوں چلا رہا ہے۔

اس نے جواب دیا۔ میرے ہاتھ میں یہ جو کتاب ہے اس سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ مجھے ایک دن مرنا ہے اور اس کے بعد حساب کتاب ہونا ہے اور میں اپنے آپ کو پہلی بات کے لئے تیار پاتا ہوں نہ دوسری کے لئے"۔

تب خضر نے کہا "تو مرنے پر تیار کیوں نہیں ہے جبکہ دنیا اتنی برائیوں سے بھری ہوئی ہے"

آدمی نے کہا "اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں۔ یہ بوجھ جو میری پشت پر ہے، مجھے قبر کی گہرائیوں سے بھی کہیں زیادہ نیچے پہونچا دیگا۔ اور میں دوزخ میں گر پڑوں گا۔ اور اگر میں حوالات جاؤں گا تو مجھے عدالت میں بھی پیش ہونا پڑے گا اور سزا بھی سہنی پڑے گی۔ اور انہی کا خیال مجھے رونے چلانے پر مجبور کر رہا ہے"

تب خضر نے کہا: "اگر تیری حالت یہی ہے تو پھر تو ایک جگہ کیوں کھڑا ہے"

اس نے جواب دیا "یوں کہ مجھے معلوم نہیں کدھر کو جاؤں"

تب اس نے اسے ایک گول لپٹا ہوا موم جامے کا کاغذ دیا۔ اور اس کے اندر یہ لکھا ہوا تھا "آنے والے غضب سے ڈرو"

پھر خضر نے اپنی انگلی سے ایک بہت وسیع میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تجھے سامنے چھوٹا سا دروازہ نظر آتا ہے؟"

آدمی نے کہا "نہیں"

اس پر خضر نے کہا "تجھے سامنے روشنی چمکتی نظر آتی ہے"

اس نے کہا "ہاں میرے خیال میں روشنی ہے"

تب خضر نے کہا "اس روشنی پر نظر جمائے رکھ اور اس کی طرف سیدھا چلا جا۔ اس طرح تجھے دروازہ نظر آ جائے گا۔ جس پر جب تو دستک دے گا، تجھ سے یہ کہا جائے گا کہ تجھے کیا کرنا ہوگا" پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ آدمی بھاگنے لگا۔ ابھی وہ اپنے گھر کے دروازہ سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ مگر بیوی بچوں نے یہ دیکھ کر اسے واپس لانے کے لئے شور مچانا شروع کر دیا۔ مگر آدمی نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور یہ چلاتا ہوا دوڑا۔ "زندگی! زندگی! غیر فانی زندگی!" پھر اس نے پیچھے پھر کر نہیں دیکھا بلکہ میدان کے وسطی حصہ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

پڑوسی بھی اسے دوڑتا دیکھنے نکل آئے۔ اور جوں جوں وہ دوڑتا کوئی مذاق اڑاتا۔ کوئی ڈراتا۔ کوئی واپس آنے کے لئے چلاتا۔ اور ان لوگوں میں جو اسے روک رہے تھے دو ایسے بھی تھے جنہوں نے بزبردستی اسے بھاگ کر پکڑ لانے کا ارادہ کیا۔ ایک کا نام اصرار تھا دوسرے کا نرم دل۔ اس وقت تک آدمی ان لوگوں سے خاصے فاصلہ پر پہونچ چکا تھا۔ لیکن بہرکیف انھوں نے اس کا پیچھا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور اس پر عمل بھی کیا۔ اور تھوڑی دیر میں اسے جا لیا۔ تب آدمی نے کہا "پڑوسیو! تم کس لئے آئے ہو؟"

انہوں نے کہا "تمھیں واپس ساتھ لے چلنے کے لئے"

لیکن اس نے کہا "ایسا کسی طرح نہیں ہو سکتا"

اس نے کہا "تم لوگ خراب آباد میں رہتے ہو جہاں میں بھی پیدا ہوا تھا۔ میں دیکھتا ہوں۔ اور وہاں مرنے کے بعد دیر سے یا سویر سے، تم قبر سے بھی زیادہ گہرائی میں پھینک دیئے جاؤگے۔ ایسی جگہ جو پتھر کے ایندھن سے جل رہی ہوگی۔ ذرا سوچو۔ اچھے پڑوسیو! اور تم بھی میرے ساتھ چلے آؤ"

اصرار نے کہا "اور اپنے دوستوں کو اپنی راحتوں کو پیچھے چھوڑ دیں؟"

محمد مسلم نے جو اس آدمی کا نام تھا کہا "ہاں۔ کیونکہ جو کچھ تم چھوڑ دوگے اس کی قدر و قیمت اس شے کے ادنیٰ سے حصے کے مقابلے میں بھی کچھ نہیں جس کا طالب میں ہوں۔ اور اگر تم میرے ساتھ آؤ گے تمھیں بھی اس سے نوازا جائے گا۔ اس لئے کہ جہاں میں جا رہا ہوں وہاں کسی شے کی کمی نہیں۔ آؤ اور میرے الفاظ کی سچائی کو آزما کر دیکھو"

اصرار نے کہا "وہ کیا چیزیں ہیں جن کے تم طالب ہو۔ اور ساری دنیا کو ان کے پیچھے چھوڑ رہے ہو؟"

مسلم نے کہا "میں ایسی شے کا طالب ہوں جو نہ خراب ہونے والی ہے۔ نہ گلنے سڑنے والی ہے۔ نہ کبھی مٹنے والی ہے۔ اور وہ جنت میں ہے۔ ایک مقررہ دن ان لوگوں کو عطا کی جائے گی۔ جو اس کے طالب ہیں۔ لو، اگر پڑھ سکو تو میری اس کتاب میں اسے پڑھ لو"

اصرار نے کہا "ہش! دفعان ہو اپنی کتاب کے ساتھ! ہمارے ساتھ تم واپس چلو گے یا نہیں؟"

مسلم نے کہا "نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ اب تو قدم اٹھ چکا ؎

ہوگا جو کچھ ہونا ہوگا، کر بھی چکے اب عزم سفر ہم
کانٹوں پر بھی سونا ہوگا، ہوں گے خاکِ راہ گذر ہم"

اصرار نے کہا "اچھا تو بھائی نرم دل آؤ۔ لوٹ چلیں۔ اور اس کے بغیر ہی گھر کی راہ لیں۔ سر پھروں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ جب ان کے دماغ میں ایک خیال گھس گیا تو پھر نکالے نہیں نکلتا۔ اور اپنے سوا کوئی عقلمند ہی نہیں رہتا ان کے نزدیک"

اس پر نرم دل بولا "برا بھلا کیوں کہتے ہو۔ اگر جو کچھ مسلم کہتا ہے۔ سچ ہے تو اس کی مطلوب شے ہماری چیزوں سے اچھی ہے۔ میرا دل تو اپنے

پڑوسی کے ساتھ جانے کو کہتا ہے؟"

اصرار نے جل کر کہا" کیا؟ تم ایک اور بیوقوف نکلے! میرا کہا مانو اور پیچھے لوٹ جاؤ۔ کون جانے یہ دماغی مریض تمھیں کدھر لے جائے۔ لوٹ جاؤ! لوٹ جاؤ! اور عقلمند بنو!"

مسلم بولا" نہیں بلکہ تم بھی اپنے پڑوسی نرم دل کے ساتھ ساتھ آؤ۔ وہاں ایسی ایسی چیزیں ملیں گی۔ میں نے ابھی تمھیں بتائی ہیں اور اس کے علاوہ اور کتنی ہی بہترین چیزیں۔ تمھیں مجھپر یقین نہ ہو تو لو اس کتاب میں پڑھ لو۔ اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر یقین کر کے دیکھو ان کے بنانے والے نے خود تصدیق کی ہے؟"

نرم دل نے کہا:" اچھا پڑوسی میاں اصرار، میں تو ایک نتیجے پر پہونچا ہوں۔ میرا ارادہ اِس بھلے آدمی کے ساتھ جانے کا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں۔ لیکن اچھے دوست کیا تمھیں اس جگہ کا راستہ بھی معلوم ہے؟"

مسلم نے کہا:" مجھے ایک آدمی نے راستہ بتایا ہے جس کا نام خضر ہے کہ اس سامنے والے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھنا چاہئے۔ جہاں ہمیں راستہ کے بارے میں بتایا جائے گا"

نرم دل نے کہا:" تب تو آؤ اچھے پڑوسی ہمیں چلنا چاہئے"

پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔

اصرار نے کہا:" اور میں اپنے گھر واپس چلتا ہوں ایسے گمراہ کُن جنونیوں کی دوستی سے بچنا ہی اچھا"

۔ پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ اصرار تو واپس جانے لگا اور مسلم اور نرم دل آپس میں باتیں کرتے ہوئے میدان کی طرف بڑھنے لگے۔ اور اس طرح گفتگو شروع کی۔

مُسلم۔ آؤ بھائی نرم دل۔ کہو کیسے مزاج ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ اگر اصرار بھی میری طرح آنے والی مصیبت کے خوف کو محسوس کر سکتے۔ تو یُوں کبھی پیچھے نہ لوٹتے۔"

نرم دل۔" آؤ بھائی مُسلم۔ اب مجھے اور تفصیل سے بتاؤ وہ چیزیں کیا ہیں۔ اور ہمیں کیسے مل سکتی ہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں"

مُسلم۔ میں ان کا تصور کچھ ذہن میں ہی زیادہ اچھا کر سکتا ہوں۔ زبان سے ادا ہونا مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی کیونکہ ہماری دونوں کی خواہش ہے اس لئے میں اپنی کتاب میں سے پڑھتا ہوں۔

نرم دل۔ اور تمھیں اس کا یقین ہے کہ کتاب میں حرف بحرف صحیح لکھا ہے؟

مُسلم۔ ہاں۔ بالکل۔ اِس لئے کہ کتاب اس کی ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

نرم دل۔ ٹھیک کہا۔ تو وہ چیزیں کیا ہیں؟

مُسلم۔ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی بادشاہت ہوگی جس میں ہم رہیں گے۔ اور ہمیں ابدی زندگی بخشی جائے گی۔ تاکہ ہم اسی بادشاہت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں۔

نرم دل۔ خوب۔ اور کیا؟

مسلم۔ ہمارے چہرے نیکی کے نُور سے منور ہوں گے۔ اور لباس سورج کی طرح چمکتا ہوا ہوگا۔

نرم دل۔ خوب اور کیا ہوگا؟

مُسلم۔ وہاں آہ وزاری نہیں ہوگی۔ نہ کوئی غم رہے گا کیونکہ وہ جو اس جگہ کا مالک ہے ہماری آنکھوں میں آنسو نہیں رہنے دے گا۔

نرم دل۔ اور وہاں کیسی صحبت ملے گی؟

مُسلم۔ وہاں فرشتے ہوں گے جو بہت اچھی مخلوق ہیں۔ اور ہم میں سے جو ہزاروں لوگ گذر چکے ہیں وہاں ملیں گے۔ ان میں سے کوئی شرپسند نہیں ہوگا۔ سب محبت اور نیکی کو پسند کرنے والے ہوں گے۔ ہر ایک خدا کے سامنے ہوگا اور اس کے جلوہ سے فیض یاب ہوگا۔ مختصر یہ کہ وہاں ہمارے بزرگ مردوں اور پاکباز عورتوں کو عزتیں بخشی جائیں گی۔ اور وہ لوگ جنہیں دنیا میں بڑی بڑی مصیبتیں اپنے حقیقی مالک کی محبت کی خاطر اٹھانی پڑی ہیں کبھی کبھی انھیں آرے سے چیرا گیا ہے۔ کبھی آگ میں ڈالے گئے ہیں۔ کبھی درندوں کی غذا بنائے گئے ہیں۔ کبھی سمندروں میں ڈبوئے گئے ہیں۔ ان سب پر خدا کی لازوال رحمتیں سایہ کئے ہوئے ہوں گی۔

نرم دل۔ اتنا ذکر ہی دل موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ مگر کیا ان چیزوں کو استعمال کرنے کا ہمیں حق ہوگا۔ ہم ان میں اپنا حصہ کیسے پائیں گے؟

مُسلم۔ اس جگہ کے حاکم نے اِس کتاب میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہمیں سچے دل سے ان چیزوں کی طلب ہوگی۔ تو بے حساب ہمیں بخشی جائیں گی۔

نرم دل۔ بہت خوب اچھے دوست۔ مجھے ان چیزوں کا حال سنکر خوشی ہوئی۔ آؤ۔ اپنے قدم ذرا تیز کر دیں۔

مُسلم۔ میں اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتا جتنا میں چل رہا ہوں۔ میری پیٹھ پر ایک بھاری بوجھ ہے۔

اب میں نے خواب میں دیکھا کہ ٹھیک جیسے ہی انھوں نے یہ بات چیت

ختم کی۔ وہ ایک بڑی دلدل کے قریب پہونچ گئے تھے۔ یہ دلدل میدان کے وسط میں تھی۔ اور بے خبری میں اچانک دونوں دلدل میں گر گئے۔ دلدل کا نام "بیدلی" تھا۔ یہاں ایک مدت تک وہ کیچڑ میں پڑے لڑھکتے رہے۔ اور مسلم اپنی پشت کے بھاری بوجھ کی وجہ سے اس میں دھنسنے لگا۔

تب نرم دل نے کہا۔ "آہ۔ پڑوسی میاں مسلم۔ اب تم کہاں ہو؟"

مسلم نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

اس پر نرم دل لڑنے کو تیار ہو گیا اور غصہ میں اپنے اس ساتھی سے کہا۔ "یہی وہ خوشی ہے جس کا تم ذکر کرتے چلے آئے ہو اگر ہمارے سفر کی ابتدا یہ ہے تو ابتدا سے انتہا تک ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اب کسی طرح میری زندگی بچ جائے تو وہ جگہ تم اکیلے ہی اپنے قبضہ میں رکھنا۔ میں باز آیا۔"

اور یہ کہہ کر ایک دو بار اس نے ناامیدی کے عالم میں سخت کوشش کی اور دلدل سے نکل کر اس کنارے پر پہونچ گیا جو اس کے گھر کی طرف تھا اور واپس چلا گیا۔

اس کے بعد مسلم "بیدلی" کی دلدل میں لڑھکتا اکیلا رہ گیا اور یہ شعر پڑھنے لگا

گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمرہاں سے ہم
اپنا سا عشق درد میں لائیں کہاں سے ہم

لیکن کوشش کا دامن اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا وہ برابر دلدل کے اس کنارے پر پہونچنے کی کوشش میں لگا رہا جو اس کے گھر سے دور اور خضر کے بتائے ہوئے چھوٹے دروازے کی طرف تھا۔ مگر وہ دلدل سے نکل نہیں سکا۔ کیونکہ اس کی پشت پر جو بوجھ تھا وہ مزاحم ہو رہا تھا۔

لیکن میں نے خواب میں دیکھا کہ اس کے پاس ایک آدمی جس کا نام نصرت تھا۔ آیا اور اس نے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

مسلم نے کہا "مجھے اس راستہ پر چلنے کو ایک آدمی نے کہا تھا جس کا نام خضر ہے۔ اسی نے سامنے والے دروازے کی طرف جانے کو کہا تھا تاکہ میں آنیوالے عذاب سے بچ سکوں اور میں ادھر ہی جا رہا تھا کہ یہاں اس دلدل میں گر پڑا"

نصرت نے کہا "لیکن تم دیکھکر نہیں چلے۔"

مسلم نے کہا "خوف میرا اس قدر پیچھا کر رہا تھا کہ میں دوسرے راستہ پر آگیا اور گر پڑا۔"

نصرت نے کہا "لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو۔"

اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ نصرت نے اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ اور پکی زمین پر لے آیا۔ اور پھر اس سے اپنی راہ لینے کو کہا۔

تب میں آگے قدم بڑھا کر اس آدمی کے پاس پہونچا جس نے اسے باہر نکالا تھا۔ اور کہا۔ "جناب! چونکہ خراب آباد سے سامنے والے دروازے تک جانے کا راستہ اس جگہ سے گذرتا ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دلدل پاٹ دی جائے تاکہ مسافر حفاظت سے گذر سکیں۔"

اس نے مجھ سے کہا "یہ دلدل پاٹنا ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ نشیبی علاقہ ہے جہاں گناہ کی ساری آلودگیاں مسلسل رہتی ہیں۔ اسی لئے اسے "بیدلی کی دلدل" کہا جاتا ہے۔ گناہگار کو جب اپنی پچھلی حالت کا احساس ہوتا ہے۔ تو اس کے دل میں بہت سے شکوک، خوف اور ہمت شکن خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اور یہ آلودگیاں مل کر اس جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جگہ اتنی خراب ہے۔

اس جگہ کو بادشاہ نہیں چاہتا کہ یہ جگہ ایسی ہی خراب رہے اس کے نوکروں نے اسے پاٹنے کی کوششیں کی ہیں اور ایسی کوششیں صدیوں سے ہزارہا برس سے ہو رہی ہیں مگر دلدل ٹھیک نہیں ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ خدا نے اس دلدل میں بھی گذرنے کا راستہ رکھا ہے۔ جو آج کل گندگی زیادہ ہونے اور موسم خراب ہونے کی وجہ سے مشکل ہی سے نظر آ سکتا ہے۔ لوگ ذرا گھبرائے اور ان کے قدم دلدل میں دھنسے۔ مگر جب وہ ایک بار پار کر کے نکل جاتے ہیں تو آگے زمین اچھی ملتی ہے۔

اب میں نے خواب میں دیکھا کہ اس وقت نرم دل واپس اپنے گھر پہونچ چکا تھا اور اس کے ہمسائے اسے دیکھنے آئے تھے۔ کسی نے اسے واپس آنے پر عقلمند کہا۔ کسی نے مسلم کے دھوکہ میں آجانے پر بیوقوف کہا۔ باقی کچھ لوگ اس کی بزدلی کا مذاق بھی اڑا رہے تھے کوئی کہتا "جب تم نے اس کے ساتھ جانے کی ہمت کی تھی تو لوٹے کیوں۔ میں ہوتا تو ہرگز مشکلات سے گھبرا کے ساتھ نہ چھوڑتا اور اتنی گراوٹ کا ثبوت نہ دیتا۔"

اس طرح نرم دل ان کے درمیان بیٹھا سنتا رہا لیکن آخرکار اس نے کچھ اعتماد حاصل کر لیا۔ سب لوگ بیٹھ گئے اور اسے چھوڑ کر بیچارے مسلم کو اس کی پیٹھ پیچھے برا بھلا کہنے لگے۔

اور اب جبکہ مسلم سیدھا اپنے راستہ پر چلا جا رہا تھا۔ اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو میدان پار کرتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ ذات شریف جو اس سے ملے عاقل صاحب نام کے تھے اور خواجہ دنیا پرست لقب تھا۔ اور جس شہر کے رہنے والے تھے۔ اس کا نام دنیا پرستی تھا۔ جو بہت بڑا اور شاندار شہر تھا۔ اور مزاج کی حالت یہ تھی ؎

الٰہی کونسی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے

یہ آدمی مسلم سے ملا۔ اور اس کے بارے میں اندازہ لگانا چاہا کیونکہ مسلم کے خراب آباد سے چلے آنے پر آس پاس کی بستیوں میں یہ خبر تیزی سے پھیل گئی تھی۔ اور ایک عجیب غلغلہ برپا تھا۔ خواجہ دنیا پرست نے اسے اتنی محنت اٹھا کر چلتے دیکھ کر اور اس کی آہ وزاری سے کچھ اندازہ لگایا کہ یہ وہی شخص ہے۔ اور اس سے بات چیت شروع کی۔

خواجہ دنیا پرست ۔ کہو اچھے دوست کہاں جا رہے ہو ان بوجھل قدموں کے ساتھ ۔

مسلم ۔ بوجھل قدموں کے ساتھ! تم نے ٹھیک کہا ۔ مگر یہ بوجھ تو جہاں تک میرا خیال ہے اس بے بس آدمی کے پیچھے ہمیشہ سے لگا رہا ہے۔ اور تم یہ جو پوچھتے ہو کہ کہاں چلا۔ تو میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں سامنے والے چھوٹے دروازے کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں جیسا مجھے بتایا گیا ہے۔ مجھے بوجھ سے چھٹکارا ملنے کا راستہ معلوم ہو جائے گا ۔

خواجہ دنیا پرست ۔ اگر میں تمھیں نصیحت کروں تو مانوگے؟

مسلم ۔ ہاں اچھی ہوئی تو مانوں گا۔ مجھے اچھی صلاح کی ضرورت ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ تب میں تمھیں صلاح دوں گا کہ جلد جلد اس بوجھ سے اپنا پیچھا چھڑاؤ ۔ اس وقت تک تمھارا ذہن کبھی یکسو نہیں ہو سکے گا۔ نہ تم خدا کی ان نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہو جو اس نے عطا کی ہیں ۔

مسلم ۔ یہی تو میں چاہتا ہوں اور بوجھ سے پیچھا چھڑانا بھی مگر خود کیسے چھڑاؤں۔ یہ بات میرے بس میں نہیں۔ اور نہ کوئی دوسرا کندھوں سے اسے اتار سکتا ہے ۔ یہ بوجھ ہی ایسا ہے اس لئے میں ادھر جا رہا ہوں جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تاکہ اس سے چھٹکارا پا سکوں۔

خواجہ دنیا پرست ۔ تمھیں کس نے بتایا ہے کہ ادھر جانے سے چھٹکارا مل جائے گا

مسلم ۔ ایک آدمی نے جو صورت سے بہت معزز اور بزرگ معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کا نام جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ خضر ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ برا ہو اس کا اور اس کی صلاح کا۔ تمھیں اس نے وہ خطرناک اور مصیبت بھرا راستہ بتایا ہے جس سے بڑھ کے دنیا میں کوئی راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تمھیں آپ پتہ چل جائے گا اگر تم نے اس کی بات پر عمل کیا۔ اور غالباً کوئی نہ کوئی واقعہ بھی تمھارے ساتھ ضرور پیش آ چکا ہے۔ اسلئے کہ تمھارے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیں۔ مگر یہ دلدل تو مصیبت کی ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ میری بات مانو میں تم سے بڑا ہوں اور زیادہ دنیا دیکھی ہے ۔ اس راستے میں جس پر تم جا رہے ہو۔ تمھیں تھکن۔ درد۔ فاقہ۔ کپڑوں کی تنگی، تلوار، شیر، اژدہے، اندھیرے، اور مختصر یہ کہ موت کا سامنا ہوگا۔ یہ چیزیں تمھیں ضرور ملیں گی۔ تم سے پہلے کتنے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ ایک اجنبی کے کہنے پر اتنی مصیبتوں کو دعوت دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔

مسلم ۔ کیسے؟ میں یہ بات کیسے مان سکتا ہوں۔ یہ بوجھ جو میری پشت پر ہے ان سب مصیبتوں سے زیادہ ہولناک ہے جو تم نے بتائی ہیں۔ نہیں نہیں۔ مجھے قطعی اس کی پروا نہیں کہ رستے میں کیا ملے گا۔ اور مجھے تو بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجھے سب گوارا ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ تمھیں اس بوجھ کا احساس کیسے ہوا؟

مسلم ۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے جو میرے ہاتھ میں ہے ۔

خواجہ دنیا پرست ۔ یہی میں سوچ رہا تھا۔ آخر تمھارے ساتھ وہی ہوا جو اور دوسرے کمزور طبیعت کے لوگوں کے ساتھ ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بساط سے کہیں زیادہ اونچی چیزوں کی طلب میں پھنس گئے اور ذہنی پراگندگی مول لے لی جس نے نہ صرف انسانی مقتضیات کو بھلا دیا۔ بلکہ ایسی موہوم امیدوں کے پیچھے دوڑایا جن کا انھیں ٹھیک علم بھی نہیں تھا۔

مسلم ۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا ملے گا۔ مجھے بوجھ کی تکلیف سے آرام ملے گا۔

خواجہ دنیا پرست ۔ لیکن تم آرام کی تلاش اس راہ میں کیوں کر رہے ہو جس میں اتنے بہت سے خطرے نظر آ رہے ہیں اگر تم صبر کے ساتھ میری بات سنتے تو میں تمھیں بتاتا کہ جو چیز تم حاصل کرنا چاہتے ہو وہ بغیر ان خطروں کے بھی حاصل ہو سکتی ہے ۔ بالکل آسان علاج ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ تمھیں خطروں کے بجائے میرے بتائے ہوئے راستہ میں حفاظت و آرام حاصل رہے گا۔

مسلم ۔ تو پھر مہربانی کر کے یہ بھید مجھ پر کھولو ۔

خواجہ دنیا پرست ۔ دیکھو سامنے والے گاؤں میں ـــــ گاؤں کا نام اخلاق آباد ہے ـــــ ایک شریف آدمی قانون پسند نام کا رہتا ہے ۔ جو بہت قانونی قسم کا ہے۔ اور نام بھی اچھا سا ہے۔ اور اسے ایسے بوجھ سے نجات دلانے میں مہارت بھی ہے جیسا تمھاری پیٹھ پر ہے ۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے اس راہ میں بڑی بہتری پیدا کی ہے اور اس کے علاوہ جن لوگوں کی پھانس بوجھ سے کھل جاتی ہے اور وہ خبطی ہو جاتے ہیں انھیں بھی اچھا کر دیتا ہے ۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے مدد لو۔ اس کا گھر یہاں سے کوئی میل بھر ہوگا۔ اتنا سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اور گھر پر اگر وہ نہیں ہوگا تو اس کا لڑکا ملے گا۔ جو ایک خوبصورت نوجوان ہے اور اس کا نام تہذیب پسند ہے۔ وہ بھی اپنے بوڑھے باپ کی طرح

ہماری مدد کرسکتا ہے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ وہاں تمھیں ضرور آرام ملے گا۔ اور رنج و غم کے اس بوجھ سے نجات حاصل کرلوگے۔ اور اگر تم اس کے بعد اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہو تو میری خواہش تو یہی ہے کہ مت جانا، تو ایسا ہو سکتا ہے کہ تم اپنے بیوی بچوں کو اس سامنے والے گاؤں میں بھیج دینا۔ جہاں بہت سے مکانات خالی پڑے ہیں۔ ایک نہ ایک تمھیں معقول کرایہ پر مل ہی جائے گی۔ ضروریات کا سامان وہاں سستا اور اچھا ملتا ہے۔ اس طرح تمھاری زندگی زیادہ خوشی سے کٹے گی اور یقیناً وہاں ایماندار اور نہایت مہذب اور معزز قسم کے پڑوسی ہوں گے۔

اب مسلم ٹھٹک کر سوچنے لگا تھا۔ لیکن فوراً وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ اگر یہ باتیں ٹھیک ہیں جو اس بھلے آدمی نے بتائیں تو عقلمندی اسی میں ہے کہ میں اس کی صلاح مان لوں۔ اور اس نے یہ سوچ کر اس آدمی سے کہا۔

"اس آدمی کے گھر کا راستہ کونسا ہے؟

خواجہ دنیا پرست ۔ سامنے والی پہاڑی دیکھ رہے ہو تم؟

مسلم ۔ ہاں، صاف نظر آرہی ہے۔

خواجہ دنیا پرست ۔ اس پہاڑی کی طرف چلے جاؤ اور سب سے پہلا گھر جو تمھیں ملے بس اسی کا ہے۔

پھر مسلم قانون پسند کے گھر مدد چاہنے کو جانے کے لئے اپنے راستہ سے مڑا اور چل دیا مگر دیکھو جب وہ پہاڑی کے بالکل نزدیک پہونچ گیا تو وہ اتنی اونچی معلوم ہوتی تھی اور جدھر کو راستہ جا رہا تھا۔ اس طرف ایسی آگے کو نکلی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اب گری۔ اب گری۔ مسلم کو آگے بڑھنے میں بہت خوف معلوم ہوا کہ کہیں پہاڑی اس کے سر پر نہ آگرے۔ تب وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ اور عجیب حیص بیص کی حالت میں پھنس گیا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس کا بوجھ بھی اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اور پہاڑی سے آگ کی لپٹیں بھی آرہی تھیں۔ جس سے مسلم کو ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں جل نہ جائے۔ یہاں وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور خوف سے تھرانے لگا۔

جہاں ذرا دل میں راہ پائی۔ خرد نے گمراہ کر کے چھوڑا
مسافرِ خستہ دل کو مصروفِ نالہ و آہ کر کے چھوڑا

(باقی)

تنگ کمرہ

بقیہ صفحہ ۴۰

ڈارنلی اسٹیشن کے باہر صبح کو تفریحی سفر کے دوران کھڑی ہوئی تھی۔ اور پولیس نے اس کے باوجود کہ اس کی مونچھ داڑھی صفاچٹ تھی اسکو پہچان لیا تھا اور ادھر دوسری طرف اس کی مالکہ مکان نے زینہ پر چڑھتے ہوئے اس کی بڑبڑاہٹ اور گنگناہٹ کو سن لیا تھا۔ حالانکہ اس کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اس کی جستجو میں پڑ گئی اور دلچسپی لینے لگی۔ اور کسی قدر خوفزدہ بھی ہو گئی۔ اور فطرتاً اس نے اپنے دوستوں سے تذکرہ کیا۔ اور اس طرح معاملہ پولیس کے کان تک پہونچ گیا۔ اور پولیس نے ساکن کے ورود کی تاریخ پوچھی۔ یوں پتہ لگ گیا۔ اور اب وہ گمنام شخص گرم چائے پیتے ہوئے، مکھن کو تست صاف کرتے ہوئے اور انڈوں سے اپنی معمولی اشتہا کو دور کرتے ہوئے یہاں تنگ کوٹھری میں خوشگوار کامد کی دیواروں کے درمیان موجود ہے۔ یا پھر یوں کہئے ذلیل قید خانہ میں۔

گناہ کسی نہ کسی صورت سے دل کو بے چین رکھتا ہے ——— عثمانؓ

اے، سی، وارڈ
مترجمہ ــــ ادارہ معیار

شا کے انقلاب انگیز ڈرامے

نصف صدی تک برطانیوں کا یہ طے شدہ خیال رہا کہ برنارڈ شا انقلاب پسند ہے لیکن کسی کو واضح طور سے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس میں وہ انقلاب لانا چاہتا تھا۔ اپنے زمانے کے سماجی اور سیاسی نظریات پر اس کا اثر یقیناً اہم تھا۔ اگرچہ اس کی گیرائی اور گہرائی کا اندازہ ممکن نہیں تھا اس لئے کہ اس کی سرحدیں بیسویں صدی کی ذہنی فضا میں گم ہو گئی تھیں اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس حد تک جدید عصری انقلابات کی تہہ میں شا کے اضافوں کی جھلکیاں موجود تھیں۔ یہاں مختصراً بحث و نظر کو ڈرامہ کی دو صورتوں تک محدود رکھا جا سکتا ہے۔ جو انقلاب انگیز اثرات کا سبب بنیں۔ ایک اسٹیج اور دوسرے کتابی صورت میں پیش کئے ہوئے ڈرامے۔

ادب کے طالب علموں کو اس فارمولے سے کبھی نہ کبھی واسطہ ضرور پڑتا ہے کہ "Drama is conflict" یعنی ڈرامہ کی حیات کشاکش اور ستیزہ کاری ہے۔ شا کے ڈراموں پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں سے بیشتر اسی مفروضہ پر مبنی ہیں کہ اس کے ڈرامے کشاکش سے خالی ہیں۔ اگر ڈرامہ میں کشاکش کا مطلب لازماً جسمانی عمل کا شدید اظہار اور گتھم گتھا ہونا یا جذباتی ہیجان ہی ہے۔ تب تو واقعی شا کے ڈرامے اس لحاظ سے کشاکش سے عموماً خالی ہیں۔ کشاکش کا یہ فقدان شا نے ارادتاً پیدا کیا ہے اور اس کی جگہ ذہنی عمل کو دی ہے۔ جو شا کی نظر میں زیادہ خیال انگیز تھا۔ جذباتی کشاکش کی جگہ شا نے خیال اور عقیدہ کی کشاکش کو رکھا ہے یا یوں کہئے کہ جسمانی اور حسی جذبات کی پرانی چودھراہٹ کو ختم کرنے کے لئے شا نے اخلاقی میلانات کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کا ڈرامہ ایک مفکر کا ڈرامہ ہے جو جنس پرستوں کے ڈرامے کو چیلنج کرتا ہے۔ جس صحیح قسم کے انقلاب کا سہرا شا کے سر ہے وہ جدید ڈرامہ میں جسمانی کشاکش کے بجائے ذہنی کشاکش کو جگہ دینے کا انقلاب ہے۔ بحث و نظر شا کے تمام ڈراموں کی اصل ہے۔ سامعین اس کی دلیلوں سے اس کی تیز طرار ذہانت اور بہت گہرے قسم کے مزاح سے مبہوت ہو کر اس ذہنی کشمکش میں گم ہو جاتے ہیں جو نظریوں اور انسانی قدروں کے عام معیاروں پر تنقید اور ان کے تضاد کے اظہار کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ یہی چیز ڈرامہ کے مواد کو مقبول ترین۔ جاذب توجہ اور تفریح آمیز بناتی ہے۔

دوسرے انقلابوں کی طرح یہ انقلاب بھی ایک ردِ عمل اور نشاۃ جدیدہ تھا۔ تمام اعلیٰ پایہ کے ڈراموں میں اور خصوصاً یونانی اور الزبتھ کے دور کے کلاسیکل ڈراموں میں خیالات کی باہم آویزش اہم ترین مقام رکھتی ہے۔ بہرکیف شا کے ڈراموں میں کوئی شدید قسم کا ایسا ٹکراؤ نہیں پایا جاتا جو المیہ شعری کارناموں کی طرح کلائمکس پیدا کر سکے۔ شا نے ایسے عہد میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی جبکہ یہ محسوس ہو چلا تھا کہ دلائل آدمی کا سب سے کامیاب ہتھیار بننے والے ہیں۔ اس وقت کسی برطانی کو اس کا یقین نہیں ہو سکتا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط تک "اینٹی گون" کے المیہ سانحے، کنڈیڈا کی گھریلو مصیبتوں سے زیادہ اس کے قریب آ جائیں گے۔

جب برنارڈ شا نے تھیٹر پر اپنی توجہ منعطف کی تو وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھا کہ اس کی تنگ نائیاں کس حد تک اس کے مقصد میں حائل ہوں گی۔ تھیٹر میں اسے سامعین کی اس تعداد سے زیادہ سابقہ پڑا جس سے وہ مقرر کی حیثیت سے پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ تاہم جیسا کہ چند برس بعد اس نے Unpleasant Plays کے دیباچہ میں کہا۔ اس وقت انگریز تھیٹر جانے کی عادت کو بھلا چکے تھے۔ اس وقت جو لوگ اس مشغلے کو جاری رکھے ہوئے تھے وہ کچھ زیادہ فکر انگیز اور سماجی شعور کے حامل نہیں تھے۔

اس عالم میں شا نے اپنے سامعین کی تعداد بڑھانے کی غرض سے اپنے ڈراموں کو کتابی شکل میں چھاپنا شروع کر دیا۔ لیکن پبلک صرف تھیٹر ہی سے کم دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ ڈرامے پڑھنے کی توفیق بھی نہیں تھی۔ کیا یہ پبلک کا قصور تھا؟ یا ایسا محض اس لئے تھا کہ ڈرامے اس وقت ایسے انداز میں

جاتے جاتے کر پڑھنے والے انھیں حوصلہ شکن سمجھنے پر مجبور ہوتے۔ شا نے دیکھا کہ قصور پبلک کی بہ نسبت، انداز ترتیب اور طرز طباعت کا زیادہ تھا۔ اسٹیج پر پیش کئے جانے والے ڈراموں میں وہ پہلے ہی ایک انقلاب لا چکا تھا۔ اب اس نے ڈراموں کی ترتیب اور انداز طباعت میں بھی ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس وقت تک ڈرامے کتابی شکل کے ڈراموں سے قطعاً مختلف تھے۔ پہلے پہل تو کاپی رائٹ محفوظ کرنے کی آسانیاں ہی نہیں تھیں بعد میں ہوئیں بھی تو لوگوں میں اس کی پابندی کم تھی۔ اس لئے مصنف اور ایکٹر اس خیال سے باضابطہ مسودے شائع کرنے پر رضامند نہیں ہوتے تھے کہ کہیں دوسرے لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھالیں یہ ممکن تھا کہ لوگ تھیٹر جانے کے بجائے ڈرامہ پڑھنے ہی پر اکتفا کر لیں۔ انیسویں صدی میں انگلینڈ میں بے شمار ڈرامے کتابی شکل میں نکلے لیکن اکثر و بیشتر بہت سستے اور بدنما تھے اور نہایت خراب کاغذ پر بھدے ٹائپ اور غیر موزوں کور کے ساتھ چھپتے تھے۔ علاوہ ازیں اس بات کی کوشش بہت کی جاتی تھی کہ پڑھنے والوں کو اسٹیج اور اداکاری کے سلسلے میں مصنف کا نظریہ معلوم ہو سکے۔

ڈرامہ پڑھنے کے لئے پڑھنے والوں کے اندر قوت فکر کی ضرورت ہے جس کی مدد سے اور ڈرامہ نگار کے بتائے ہوئے اشارات کے سہارے وہ اپنے ذہنوں میں ڈرامہ کو اسٹیج کر سکیں شیکسپیئر کے عہد سے ۱۸۹۵ء تک، انگریز مصنفوں کے چھپے ہوئے ڈراموں میں صرف اسٹیج کے غلط سلط مکالمے اور اسٹیج کی ہدایات محض اداکاروں کے لئے ہوتی تھیں جو EXIT اور ENTRANCE جیسے چند لفظوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ منظر کشی، روکلام یا کسی وقتی ضرورت کے لئے شاذ ہی کوئی لفظ بول دیا جاتا تھا۔ شا نے اپنے ڈراموں میں توضیحی اور تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا۔ منظر کشی کا بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ حق ادا کیا تاکہ ڈراموں کے پڑھنے والوں کو کردار اور ان کے عمل اور ماحول کو ذہن میں تازہ کرنے میں آسانی ہو سکے اور وہی تاثر اور فضائیت قائم ہو سکے جو مصنف چاہتا تھا۔

Unpleasant Plays کے دیباچہ میں شا خود لکھتا ہے "یہ طبع ایک نئے آرٹ کے اسکول کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دو کتابوں[5] کے چھپنے کے دس برس کے اندر ہی اندر وہ سب اعتراض جو ان پر کئے جاتے ہیں، کہیں پیچھے رہ جائیں گے"۔ یہ پیشگوئی بالکل ٹھیک نکلی J. M. Barrie نے جب اپنے ڈرامے ۱۹۱۰ء میں شائع کئے تو ان میں مکالمے اور توضیحی نوٹ ساتھ ساتھ پیش کئے گئے تھے۔ اسی دوران میں شا کے اس طرز کو ڈرامہ نگاروں نے اپنا لیا اور ڈرامے پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی۔ اگر PINERO کے ڈرامہ The Second Mrs. Tanqueray (شائع شدہ ۱۸۹۵ء) کے متن کا موازنہ شا کے ۱۸۹۸ء کے ڈراموں سے کیا جائے تو شا کے طرز کی امتیازی خصوصیتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ شا کا پہلا چھپا ہوا ڈرامہ "رنڈوؤں کی بستی" (Widowers Houses) ہیں جس کا انڈیپنڈنٹ تھیٹر ایڈیشن ۱۸۹۳ء میں نکلا تھا۔ کوئی ایسا توضیحی اور بیانیہ مواد نہیں ہے جیسا کہ پانچ برس بعد اس نے خود پیش کیا۔ "انسان اور فوق الانسان" (Man and Superman) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود شا نے ۱۹۰۳ء تک چھپے ہوئے ڈراموں میں انقلاب لانے کی کوششوں میں کہاں تک ترقی کی۔

آخر میں یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ شا نے شروع ہی سے اپنی کتابوں کے ٹائپ، کاغذ اور جلد پر گہری نظر رکھی جیمس شینڈ نے شا کی کتابوں کی چھپائی کی ایک پوری تاریخ تفصیل سے پیش کی ہے۔ اس کی کتابوں میں کہیں کہیں ذاتی رجحان کی مبالغہ آمیز شدت بھی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتابیں بہترین ترتیب اور تدوین کے سلیقے سے مزین ہیں۔

برنارڈ شا کی توافق پسند صلاحیتوں کا اظہار اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پرنٹروں کو ۱۸۹۵ء سے اور پبلشروں کو ۱۹۰۳ء سے موت کے وقت تک جو ۱۹۵۰ء میں ۲ نومبر کو ہوئی۔ ردوبدل کی تکلیف کبھی نہیں اٹھانی پڑی۔ یہ غالباً اپنی نوعیت کی ایک ہی مثال ہے۔

---

[1] Play Pleasant and Unpleasant (1898)

[2] ملاحظہ ہو۔ 'The Admirable Crichton' جو پہلے پہل ۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔

اُس پار

محمد الاحد اعظم آبادی

زندگی اور موت کے درمیان ایک اتھاہ سمندر حائل ہے ———
اور . . . .
اُمیدوں کی کشتی یکہ و تنہا طوفانی موجوں کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے ———
آگے . . . . .
عمیق سمندر کی نیلی چادر حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہے ———
کیا دُنیا کی وسعت یہیں ختم ہو جاتی ہے ؟
آسمان کے گہرے نیلگوں پردے پر لرزتے ہوئے ستاروں کے لاتعداد موتی چمک رہے ہیں ———
آندھی اور طوفان کے جھکڑ۔ بادل کی گرج ۔ بجلی کی چمک اور یہ بھیانک سیاہ رات ———
اِن سب کی تخلیق ہمارے اور صرف ہمارے لئے ہے ———
شمعِ حیات گُل کرنے کے لئے ———
سنو ! ہماری موت پر . . . . . .
دُور بہت دُور بانسری کے سینے پر پھیلے ہوئے لاتعداد ناسُوری زخموں سے ۔
باگیشوری راگ کے حزینہ بول فضا میں کراہ رہے ہیں ۔
گھٹائیں اشک بار ہو گئیں اور اُن کے سوگوار آنسو دُور تک پھیلی ہوئی زمین کے وسیع دامن پر ٹپک رہے ہیں ۔
کس نے محبت کا حسین کاجل ہماری آنکھوں سے چھین لیا ؟
کس کے دل نواز فریب کے خلد آفریں سایہ میں سُورج کی روشنی پہلی بار اچھی لگی تھی ۔
سیندور کے رنگ میں ڈوبے ہوئے چین کے موتیوں کا ہار نقلی معلوم ہوتا ہے ۔
خوشیوں سے بھری ہوئی رنگین اور تابناک دُنیا ہماری مایوس نگاہوں میں تاریک ہو گئی ہے ———
مٹی اور پانی کے خمیر سے تیار کیا ہوا رنگ رُوپ اور رس بھرا جسم دوسرے جنم کی یادگاریں ہیں ———
جوانی کی بیتی ہوئی یادیں "چتا" میں جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکی ہیں اور اب اُن کا نشان بھی نہیں ملتا ———
" اُس پار" دُور تک پھیلی ہوئی موت سے زیادہ بھیانک خاموشی کہہ رہی ہے ———
" جہاں حُسن و محبت کے خوش آیند نغمے فضا میں کروٹیں لیتے ہیں ۔ وہاں آرزو اور تمنّاؤں کا ماتم بھی ہوتا ہے ———
اے دُنیا ہم تجھے سلام کرتے ہیں ۔ آخری سلام ۔ ہمیں جلد رخصت کر ۔
تیرے بجلی کے قمقموں میں چھپے ہوئے شہد کے فوارے سے اپنی پیاس بُجھا چکے ———
موت مسکرا کر نذرِ عقیدت پیش کر رہی ہے ۔
جسم کانپ رہا ہے ۔ اور قلب سکون کی انتہائی گہرائی میں ڈوبتا جاتا ہے ۔
ہمارے کمزور بازو ڈانڈ چلاتے چلاتے تھک چکے ہیں اور . . .
کشتیٔ حیات ساحل سے ناآشنا موت کے بہاؤ پر چلی جا رہی ہے ———

(بنگالی نظم کا ترجمہ)

خطوط و نکات

وحید علی خاں

معیار کا تازہ شمارہ ملا مسرت کی بات ہے کہ اب معیار پابندی سے نکل رہا ہے۔ تخلیقات کے انتخاب میں آپ نے بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ شعری و نثری تخلیقات کافی جاندار ہیں بالخصوص غزل اور غزل گو مجھے بہت پسند آیا لیکن بھائی مجھے اس بات کی شکایت ہے کہ اس مرتبہ کے افسانے معیاری نہیں ہیں۔ تجمی کا افسانہ (؟) واقعی ایک سوال بن گیا ہے! اس افسانہ میں ہاشمی معاش کی وجہ سے پریشان و سرگرداں پھرتا ہے پر اسے کچھ نہیں ملتا۔ اور تین دن کا فاقہ ہوتا ہے! اس سلسلہ میں اسے مختلف واقعات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اب افسانہ نگار کے آخری الفاظ ہیں کہ "ایسی کشمکش میں ایسی حالت میں آپ کیا کرتے ؟ ہاشمی نے کیا کیا ہوگا ؟ ؟ آپ بتائیے !" ــــــ کوئی بتلائے کہ ہم کیا بتلائیں ؟ ! غالباً افسانہ نگار یہاں سماج کے ظلم کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہاشمی کوئی جرم بھی کر بیٹھے تو وہ اسے بھی سماج ہی کے سر تھوپیں گے۔ یہ انداز فکر ٹھیک نہیں ! اگر ، ایک حد تک ٹھیک ضرور ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے فرد پہلے ہے اور سماج بعد میں ! فرد کی خامی میں سماج کا حصہ ہوتا ضرور ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں سراسر قصور سماج ہی کا ہو اور فرد "بے گناہ" ہی ہو! یہ تو ہاشمی کی خامی ہے کہ وہ سماج کو اس طرح دیکھ کر ہمت توڑ بیٹھا۔ شاید جرم پر بھی اتر آیا ! اس طرح ہاشمی کا کردار تو یہاں کوئی اثر ہی پیدا نہیں کرتا۔

دوسرے افسانے "روشنی" کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ ہارون رشید صاحب نے اپنے مقصد کو ابھارنے کے لئے غیر فطری اور "جلدباز" طریقہ اختیار کیا ہے ! اچانک ماں کی علالت کا تار آنا اور جلنے پر یہ معلوم ہونا کہ وہ کسی کی دعا سے اچھی ہو گئی ہے ــــــ پھر آخر کی گھٹ گھٹ جبکہ ایک شخص اخبار بیچنے اور ایک برلا کے ملازم کی حیثیت سے ہوتی ہے اور اچانک اس کے قدم مسجد کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان باتوں سے شاید خداپرستی کے جذبہ کو ابھارنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوئی فکری اور استدلالی انداز نہیں ہے ! اس میں آمد سے زیادہ آورد معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو ایسے انداز سے بچنا چاہئے۔ یہ باتیں کسی کی تنقیص کے لئے نہیں عرض کر رہا ہوں بلکہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ تعمیری ادب کی تحریک پہلے ہی سے اپنی خامیوں کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔ اور طعنۂ اغیار سے محفوظ رہے ــــــ آئندہ اگر آپ افسانوی معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا۔

کیف نوگانوی

"معیار" کے دیرینہ کرمفرماؤں سے کہئے کہ غریب "معیار" کی حالت پر رحم کھائیں۔ آخر یہ بے رخی کیوں ؟ اگر "معیار" کو واقعی معیاری مواد مہیا کیا جاتا رہے تو نہ صرف یہ کہ لکھنے والوں کی صلاحیتیں نشو و نما پائیں گی۔ معیار کی اشاعت بڑھے گی جس سے اس کی بنیادیں مستحکم ہوں گی بلکہ ہم اپنے نوخیز ادیبوں کے سامنے بہتر نمونے پیش کرنے اور دیگر ادبی حلقوں پر اثر انداز ہونے کے قابل ہو سکیں گے۔ انور اعظمی، نجات اللہ صدیقی، شمسی رحمانی، حسان کلیمی، اقبال نسیم وغیرہ تو ادب سے جیسے کنارہ کش سے ہو گئے ہیں۔ انہیں جھنجوڑئیے۔ ابو المجاہد زاہد۔ حفیظ میرٹھی، منظر حسین، سہیل زیدی، افتخار اعظمی، ابو خالد ایم آر۔ عروج قادری، ماحی ضیائی۔ ظہیر بگھیروی۔ ثاقب عباسی، اصغر علی عابدی، طیب عثمانی، اور دیگر اہلِ قلم حضرات کو اپنی دوہری ذمہ داریوں کا احساس دلائیے تاکہ جمود و تعطل کی کیفیت ختم ہو۔

دوسری چیز جس کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ ہماری نوخیز ادبی تحریک میں عملی تنقید کا فقدان ہے۔ معیار کے تنقید نمبر میں اس ضمن میں جو کوششیں کی گئی ہیں وہ بہت تشنہ ہیں۔ ہمارے تنقید نگاروں کو اس موضوع کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر فوری توجہ دینا چاہئے۔

عبد المغنی

موجودہ ادبیات کے اندر تنگ نظری، فرقہ بندی، سطحیت اور فریب و فساد کی تاریک فضا میں آپ نے صالح و صحت مند ادب کی جو جوت جگائی ہے۔ وہ یقیناً آج کے اُبھرتے ہوئے ادیبوں کے لئے مشعل و معیار کا کام دے سکتی ہے۔ اس عظیم تاریخی کارنامے کے لئے ادارۂ معیار کی خدمت میں اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے میں اس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے آپ کو اس اہم ادبی و ملی خدمت کی توفیق دی۔

بہرکیف میں آپ کی تحریک سے نہایت متاثر ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی طرف پیش قدمی کی جرأت کر رہا ہوں۔

راہی فیض آبادی

آپ کا پرچہ "معیار" ماہ اپریل کا آج پہلی بار نظر سے گذرا یقین جانیئے پڑھکر دل بہت مسرور ہوا میں بے جا تعریف کا عادی نہیں۔ معیار جیسا نام آپ نے رکھا ہے۔ ویسا ہی ہے۔ آپ کا "نقش اول" تو میں نے ابھی پڑھا نہیں۔ صرف نظم "عورت" اور محمد عثمان رمز کا "غزل اور غزل گو" پڑھ سکا ہوں۔ چند اور پرچوں سے مقابلہ کرکے دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ آپ کی درازئ حیات کی دعا کرتا ہوں تاکہ زبان اُردو کی زلف سنورتی رہے۔ آمین۔

ظہور الحق صدیقی

معیار کے پچھلے شماروں میں رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں بہت کچھ کہا سنا گیا لیکن افسوس ہے کہ اسلام لپند حلقوں پر ایک اسلامی ادب کے علمبردار رسالے کا جتنا حق ہے وہ ادا نہیں ہوا۔ اگر کسی نے کچھ کوشش کر بھی دی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک دلوں میں اسلامی ادب کی خدمت کا حقیقی لگن موجود نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دُور دراز سے کسی کی مشکلات کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ اس سلسلے میں ہماری ایجنسیاں بھی بالکل اپاہج ثابت ہو رہی ہیں معاف کیجئے گا۔ اسلامی ادب کی خدمت سے زیادہ انہیں اپنے کاروبار سے مطلب ہوتا ہے۔ اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

ایم، احمد مظاہری

آج کل معیار پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ لیکن اس مسرت میں میرا بہت ہی کم حصہ ہے۔ میں نے تو صرف ایک ہی خریدار آپ کو دیا ہے، مزید خریداروں کے لئے کوشاں ہوں۔

اس بے سروسامانی کے عالم میں آپ معیار کے لئے جس ہمت و جرأت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حقیقتاً ہم سب لوگوں کے لئے باعث تقلید ہے۔

خیال اپنا اپنا

مسعود عالم نمبر

ماہنامہ چراغِ راہ - کراچی

یہ نمبر ہند و پاکستان کی ایک نہایت محترم ادبی شخصیت کی یاد میں نکالا گیا ہے جسے مسعود عالم ندوی مرحوم کے لائق و فائق شاگرد محمد عاصم صاحب نے نعیم صدیقی صاحب کے ساتھ ملکر ترتیب دیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دونوں صاحب اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ایک طرف اگر ایک ایسے واقف اور با خبر شخص کی آگہی اور دل سوزی ہے جو مسعود عالم مرحوم کے سفر اور حضر کا رفیق ایک مدت تک رہا ہے تو دوسری طرف نعیم صدیقی کی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال نظر آتے ہیں جس کا اولین اظہار اور اولیں ثبوت لفظی تصویر ہے جو نعیم صاحب کے خیال انگیز قلم کا رہینِ منت ہے۔

مسعود عالم ندوی کی ذات اپنے گہرے مطالعہ عربی ادب پر عبور اور شگفتہ اردو عربی تحریر کے ساتھ ساتھ جس خلوص اور دینی جذبہ کی حامل تھی وہ بلا شبہ اس لائق تھی کہ اس دورِ قحط الرجال میں دوسروں کے لئے ایک سبق کا کام کرتی۔ اس قابلِ قدر فرض کو انجام دینے کی سعادت چراغِ راہ کے حصہ میں آئی جس پر ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو عمر کے ہر حصہ میں اتنا سنبھالے رکھنا جتنا مسعود عالم ندوی نے سنبھالے رکھا۔ محنت سے تحریر پر اتنا عبور حاصل کر لینا کہ عربی اہلِ زبان کے ہم پلہ قرار پانا اور اس کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب اور سیاست میں اتنی گہری واقفیت حاصل کرنا ________ وہ خصوصیات ہیں جن سے مسعود عالم ندوی کی شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ یہ خصوصیات اس نمبر کے مقالوں سے بخوبی واضح ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور محمد عاصم صاحب کے مقالے دیگر مقالات سے زیادہ معلومات افزا ہیں۔ جن دیگر مقالات میں مسعود عالم مرحوم کے طرزِ تحریر کا جائزہ فنی نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے۔ وہ بھی خوب ہیں۔

مہ پارہ - (ناول) -

مصنف :- نسیم انہونوی -

ملنے کا پتہ :- ماہنامہ حریم لکھنؤ -

"مہ پارہ" ایک اصلاحی ناول ہے جس میں مصنف نے اسلامی معاشرے کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا موضوع اُونچ نیچ۔ عقدِ بیوگان۔ اور بازارِ حسن کی ہلاکت آفرینی ہے۔ اہم کردار۔ اسلامی اصولِ فکر کا چلتا پھرتا نمونہ نظر آتے ہیں۔ ایک شخص اسلامی افکار کو پھیلانا اپنا مشن قرار دیتا ہے اور زندگی بھر اس کے لئے طاغوتی اصولوں اور ہتھکنڈوں سے لڑتا رہتا ہے۔ ایک آن کو بھی اس کے پائے استقلال کو جنبش نہیں ہوتی۔ اور آزمائشوں کو خندہ پیشانی سے انگیز کئے چلا جاتا ہے۔

اس ناول میں جن لوگوں کو اسلام اپناتا دکھایا گیا ہے وہ اندر آکر خود اس معاشرہ میں بہت سی خرابیاں پاتے ہیں جو ان کو ایک بری راہ پر لے جاتی ہیں۔

آج کے معاشرہ کا یہ تجزیہ مصنف نے درست ہی کیا ہے۔ اس تجزیہ میں اگرچہ اسلام کی انقلابی اسپرٹ موجود ہے لیکن رواجی تصور سے دھندلی پڑ جاتی ہے۔ اگر اس کی ہمہ گیری اور اجتماعیت کو اور نکھار کر پیش کیا جاتا تو اصلاحی پہلو اور نمایاں ہو سکتا تھا۔ غرض کہ ہمیں اس ناول میں اصلاحی نقطۂ نظر کی جھلکیاں شروع سے آخر تک ملتی ہیں اور ساتھ ہی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔

ایک کردار البتہ ایسا ہے۔ جس کا تجزیہ مصنف نے پوری گیرائی سے کرنے پر توجہ نہیں دی اور وہ غلام رسول کا کردار ہے۔ جو ایک نو مسلم کی حیثیت سے مسلم معاشرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور جلد ہی بعض سماجی خرابیوں کے سبب سے انتقامی جذبہ بیدار ہو جانے پر قتل کے جرم میں کالے پانی چلا جاتا ہے۔ اور ناول ایک انقلاب پسند کردار کے پورے تجزیہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

مگر یہ محرومی ان چیزوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جو ناول اپنے پڑھنے والوں کو دیتا ہے۔

علمی — تحقیقی — اور — ادبی — کتابیں

بیان اللسان	عربی اردو ڈکشنری	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	قیمت مجلد	دس روپے
تدبر قرآن		مولانا امین احسن اصلاحی	"	ڈھائی روپے
خطبات		مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	"	سوا دو روپے
پردہ		" " "	"	تین روپے
حقیقت نفاق		مولانا صدرالدین اصلاحی	"	ایک روپیہ آٹھ آنے
اساس دین کی تعمیر		" " "	"	دو روپے آٹھ آنے
مسلمانانِ ہند کا لائحہ عمل		مولانا ابواللیث اصلاحی	"	تین روپے
تجدید تصوف و سلوک		مولانا عبد الباری	"	پانچ روپے
حقوق الزوجین		مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	"	ایک روپیہ آٹھ آنے
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں		سید اصغر علی عابدی	"	تین روپے
اشتراکیت اور اسلام		مظہرالدین صدیقی	"	چار روپے آٹھ آنے
سود		مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	"	دو روپے بارہ آنے
گلگونہ		محمد یٰسین تسکین قریشی	"	دو روپے آٹھ آنے
ابھرتی کرنیں	(افسانے)	مرتبہ۔ نجم الاسلام	"	" " "
عالمی امن	(نظمیں)	" ادارہ معیار	"	آٹھ آنے
کوثر و تسنیم	(مجموعہ کلام)	الم مظفر نگری	"	چار روپے
صحیفۂ ندرت	(" ")	ندرت میرٹھی	"	چار روپے آٹھ آنے
لوح و قلم	(" ")	" "	"	پانچ روپے
مکمل فائیل معیار ۱۹۵۲ء	(مجلد)		"	تین روپے آٹھ آنے
" " " ۱۹۵۳ء	(مجلد)		"	" "
" " " ۱۹۵۴ء	(مجلد)		"	دو روپے

اِن کتابوں کے علاوہ دیگر علمی، ادبی کتابیں اور دینی کتب۔ قرآن شریف، اور سپارے، وغیرہ بھی مل سکتے ہیں

مکتبۂ علم و ادب — شاہ پیر گیٹ میرٹھ

پرنٹر پبلشر محمد جمیل خاں نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ سے شائع کیا۔

MEYAR MONTHLY Meerut U. P. — Registered No. A441



Only Title Page Printed at Pilot Press, Churiwalan, Delhi.


The
Meyar
Monthly

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ـــــ ۵
نمبر ـــــ ۶

جون [illegible]

معیار

مدیر
نجم الاسلام

جملہ خط و کتابت، ترسیل زر اور تبادلہ زر کیلئے

دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب [illegible] جیکب آباد

زر تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترتیب

نقشِ اوّل

علوم و فنون کی بنیاد فکر پر ہے اور فکر کی بنیاد ادراک پر؟ — کائناتی حقائق و شواہد پر غور و فکر اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب ہم ادراک کے ذریعہ ان کے احاطہ پر قادر ہوں۔ ادراک اس طرح علوم و فنون کے ارتقا میں بنیادی قسم کا حصہ لیتا ہے۔ اس لئے اس کی تشریح تخلیقی تفکّر کے ضمن میں نہایت اہم ہے

ادراک کی جو حسی اور وجدانی قوتیں ان کو ودیعت کی گئی ہیں۔ ان کے حدود کار کے بارے میں ارباب فکر میں بیحد اختلاف رہا ہے۔ ہر صاحب فکر کے یہاں حسی اور وجدانی قوتوں کی اہمیت کا ایک مختلف تناسب ملتا ہے۔ یہ تناسب کیا چیز متعین کرتی ہے۔ اس کے بارے میں کائنات و حیات کے بنیادی تصورات، تہذیبی و تعلیمی ورثہ اور انفرادی تجربات سب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مفکرین اسلام کے طرز ادراک کا تعین کائنات و حیات کے بنیادی تصورات نے زیادہ کیا ہے۔ تہذیبی و تعلیمی ورثہ کے اثرات کی فراوانی کے لئے دَورِ وسطیٰ کے چند مغربی مصلحین کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً روسو وغیرہ اور انفرادی تجربات میں تو کتنے ہی ایسے ارباب فکر کا نام لیا جا سکتا ہے جو زندگی بھر حقائق و شواہد کی تلاش و تحقیق میں اپنے طرز ادراک کو انفرادی تجربات کے سہارے ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کرتے رہے مشرقی طرز ادراک اور مغربی طرز ادراک میں نمایاں فرق ملتا ہے۔ اسکا سبب کائنات و حیات کے بنیادی تصورات، تہذیبی و تعلیمی ورثہ اور افتاد مزاج کا اختلاف ہی تو ہے۔ ایک زمانے میں جب ہندوستانی زبانوں کے ادب پر مغربی ادب کے اثرات رونما ہو چلے تھے مغربی طرز ادراک میں فطرتیت کے عنصر کی خارجی علامات سے ہندوستانی ادیب بہت متأثر نظر آتے تھے۔ تتلی، پھول، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، گائے، بیل وغیرہ وغیرہ پر اس زمانے میں جو نظمیں لکھی گئیں ان میں مغربی طرز ادراک کو اپنانے کی سعی کی گئی۔ لیکن طرز ادراک محض انفرادی تجربہ ہی سے تو نہیں بنتا۔ اسمیں دیگر عناصر بھی ہوتے ہیں۔ یہ عناصر ہندوستانی ادیبوں میں مشرقی مزاج کے تھے چنانچہ ان کی نظمیں خالص مغربی طرز ادراک سے خالی رہیں، ان میں دو مزاجوں کا مجموعی اثر پیدا ہوا۔ ان دونوں مزاجوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ مغربی طرز ادراک میں سب سے زیادہ اہمیت دو چیزوں کو دی گئی

(۱) حسی تجربہ اور خارجی مطالعہ مادیت کے نقطہ نظر سے

(۲) داخلی مطالعہ مجرد فطرت پرستی کے نقطہ نظر سے

ان دونوں چیزوں کی تشریح سے پہلے یہ اعادہ ضروری ہوگا کہ ادراک طلب علم کا ایک طریقہ ہے۔ انگریزی فلسفے میں طلب علم کی کوششیں اکثر بلکہ ہمیشہ ثبوتین اور تجزیئین کے طریقہ پر کی گئی ہیں یعنی حسی تجربہ کے ذریعہ۔ ہابس اور لاک کے فلسفے اس سلسلے میں قابل ذکر کہے جا سکتے ہیں کیونکہ انمیں نسبتاً زیادہ حسی اظہار ملتا ہے۔ خارج کے مطالعہ کا یہ مادیت پرستانہ طریقہ ادراک کے اس تصور سے خالی رہا ہے جسمیں بصیرت اور نظر کا قرآنی مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس طرح علم کی بنیاد گویا محض حسی تجربہ اور خارجی مطالعہ تک محدود ہو جاتی ہے مگر چونکہ اسکی زد سے زندگی کا ایک قابل لحاظ اور اہم حصہ نکل جاتا ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی طرح حسّی تجربہ کیساتھ فطرتیت کی پیوندکاری بھی ضروری ہوئی۔ اور جب یہ پیوند لگایا گیا تو اسوقت فطرت کا مفہوم کیا تھا؟ اسکے لئے اواخر اٹھارویں صدی عیسوی کے نشیب و فراز کو دیکھنا چاہیے جو مغرب میں نمودار ہو رہے تھے اسوقت مذہب کا اثر منظم طریقے سے آہستہ آہستہ مٹایا جا رہا تھا اور خدا کا تصور متزلزل کیا جا رہا تھا۔ ایسی حالت میں خالق فطرت کے بجائے مجرد فطرت ہی کو جسمیت عطا کرنا ہی واحد راستہ تھا اور اسی کو اپنایا گیا۔ چنانچہ اس دَور کے انگریزی ادب اور خصوصاً انگریزی شاعری اسکا بیّن ثبوت بہم پہونچا رہی ہے۔ جسمیں حسّی تجربات اور خارجی مطالعات کے اظہار کے لئے فطرت کو ایک مجسّم ہستی کے طور پر اپنایا گیا۔ اسی زمانے میں فطرت، نفس، نفس مطلق، ذہن مطلق وغیرہ اصطلاحوں کے وہ مفہومات متعین کئے گئے جنھوں نے ایک غیر مذہبی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ تمام اصطلاحات مابعد الطبیعاتی لحاظ سے ایک ہی بنیاد رکھتی تھیں اس لئے ان کے مفہومات بڑی حد تک مل گئے۔ فطرت اور عقل کانٹ کے یہاں ایک چیز بن گئی فشٹے نے اسی کو نفس مطلق کہا اور ہیگل نے ذہن مطلق۔ پہلا اصطلاح ... ایک ... [illegible]

پایا جاتا تھا مگر اسکا رخ اب دوسری طرف پھیر دیا گیا۔ ان مفہومات کے گڈمڈ ہو جانے سے اجتماعیت کو زیادہ ہوا دی گئی۔ کیونکہ وجدان کا مفہوم بھی بدل
چکا تھا اور اسمیں سے وہ وصف ختم ہو چکا تھا جس نے انفرادیت کو اجتماعیت کش بنایا تھا۔ یہ بدلا ہوا تصور ہی دراصل وہ دوسری چیز تھی جسکا ذکر مغربی
طرز ادراک کے سلسلے میں اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی داخلی مطالعہ مجرد فطرت پرستی کے نقطۂ نظر سے۔
البتہ چونکہ نفسیاتی لحاظ سے ان اصطلاحات کی بنیادیں ایک نہیں تھیں۔ مفکر نفسیاتی لحاظ سے ایک مخصوص انفرادیت کا مالک تھا اسلئے ان اصطلاحات
کا ایک پہلو ایسا بھی رہا جو کم بینوں کو فریب دیتا رہا۔ اور ارباب فکر کے لئے الجھن بن گیا۔ اس تعریف کا مطالعہ بھی اہم ہے۔
اب طرز ادراک کے مشرقی تصور کو لیجئے۔ مشرقیت کی خصوصیت جو اسے مغرب جدید سے ممتاز کرتی ہے کئی اہم چیزوں پر مشتمل ہے مگر بنیادی چیز
خدا اور نظام مابعد الطبیعیات ہے۔ دوسرے نمبر پر تہذیبی و تعلیمی ورثہ آتا ہے۔ مشرقی تہذیب اور طریقۂ تعلیم میں دو چیزیں اہم رہی ہیں۔ ایک عرفان الٰہی
اور دوسرے عرفان نفس۔ عرفان نفس کی بنیاد جذبہ، ارادہ، جمالیاتی حس، داخلی احساس، وجدان وغیرہ پر سمجھی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ
پہلے انکا مقصد متعین کیا جائے مثلاً حقیقت اعلیٰ کی تلاش۔ مشرقی طرز ادراک میں یہ چیز موجود ہے۔ مگر اسمیں چونکہ داخلیت کے معاملے میں اس طبقہ کی طرف سے افراط
تفریط برتی گئی ہے جو تصوف کا علمبردار کہلاتا ہے اسلئے اسمیں پیچیدگیاں آ گئی ہیں۔ افلاطون نے اپنی زبان میں یہ کہا تھا کہ اعیان عالم بالا میں مجرد موجود ہیں انکا عکس
نفس انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے نفس انسانی کو ان اعیان کی طرف پھر دوبارہ متوجہ کر دینے سے علم حاصل ہو جاتا ہے۔ برگساں نے طلب علم کیلئے نظریۂ ترتیب قائم
کیا تھا یعنی وہ وجدان اشیاء کے منفردانہ اثرات کو ترتیب دیکر پیش کرتا ہے اور یہی علم کا آخری فعل ہے۔ مگر مشرقی طرز ادراک اس سے جدا ہے یعنی وجدان منفرد حسی تاثرات
کا پابند نہیں۔ بلکہ اسکی راہ استدلال و تجربات کی وادیوں سے پہلے نفس انسانی کی ایک خاص کیفیت سے گذرتی ہے جو شعوری نہیں ہے اور شاید کلی طور پر غیر شعوری بھی
نہیں۔ مغربی طرز ادراک کی طرح دراصل اسمیں بھی وجدان کا ایک پہلو ہی پیش نظر رہا ہے۔ ایک ثبوت اور حسی تجربہ کے ذریعہ خیال کو مستحکم کرنیکی کوشش کرتا ہے۔
ایک کہتا ہے کہ جذبہ ہی سب کچھ ہے ذہن انسانی کی فطری صلاحیت تجربہ کے بغیر علم حاصل کر سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کا تصور مشرق و مغرب کے اس تصور سے مختلف ہے
وہ اسکی نفی کرتا ہے کہ حقائق کا علم محض نفس انسانی کی فطری صلاحیت سے ہو سکتا ہے اور اسکی بھی کہ تجربہ کی مدد سے علم کی بنیاد عقل پر رکھی جا سکتی ہے نفس انسانی اور
عقل دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور اسکے بعد بھی زندگی کے بنیادی مسائل کی گرفت میں ناکامی ہوتی ہے۔ وہ علم کی دو حیثیتیں متعین کرتا ہے ایک وہ جو نفس
انسانی یا عقل کی گرفت سے باہر ہے دوسرا وہ جو باہر نہیں ہے۔ یہ مؤخر الذکر حیثیت نفس اور عقل کا میدان کار ہے مگر اسکے لئے بنا لئے استدلال کیا ہو؟ یقیناً اسکے لئے
پہلی حیثیت کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ اور یہ علم انبیائی علم ہے۔ جسکی طرف رجوع کیا جانا چاہیئے۔ اسکے علاوہ جن چیزوں سے ثبوتی و تجربی علوم بحث کرتے
ہیں انکے بارے میں قرآن کہتا ہے "وعلم الآدم کل اسماء" انسان کو شروع سے اشیاء اور انکے ناموں کا علم دیا گیا ہے اسکا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان علوم کی تحقیق
میں نفس اور عقل کو مناسب طریقہ سے استعمال کیا جا سکتا ہے بعض لوگ علم پر جا دی نہیں مگر بالکل بے بہرہ بھی نہیں کچھ مفید ثابت ہو سکتا ہے اسی طرح
اشیاء اور انکے ناموں کے علم کا ارتقا چونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے اور اسکی ارتقائی ماہیت کو سمجھنے کیلئے تجربہ اور عقلی استدلال ضروری ہے اسلئے عقل کی اہمیت بھی
کبھی کم نہ ہوگی۔ قرآن نے اشیاء اور انکے ناموں کے علم کو خدائی عطیہ کہکر علم کی بنیاد شک پر نہیں اٹھان پر رکھی ہے اور مطالعہ نفس و کائنات کے عقلی اور نفسی
کا توازن پیش کیا ہے جبکہ فلسفۂ جدید کی بنیاد شک پر رکھی گئی۔ چنانچہ ڈیکارٹ کہتا ہے کہ انسان ہر چیز میں شک کر سکتا ہے لیکن اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ وہ
شک کر رہا ہے۔ گویا یہ اسکی فطرت ہے۔ اسکے نزدیک خود تشکیک کا عمل نفس انسانی کے وجود کا ایک عقلی ثبوت ہے۔ مگر اس ثبوت سے آگے بڑھ کر وہ شک سے
یقین تک پہنچنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور علوم عقلی اور تصوف میں عجیب پیچیدگی رونما ہو جاتی ہے۔ کانٹ نے اپنی تصنیف "تنقید عقل محض" میں یہ بات
ثابت کی ہے کہ عقل صرف ایک حد تک انسان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ مابعد الطبیعاتی مسائل اسکی حدود سے باہر ہیں۔ ان مسائل میں اس نے نفس کے وجود اور اسکی ماہیت
سے بحث کی مگر وہ منزل تک نہ پہنچ سکا اور Catagoricae Imperative ایک مبہم اصطلاح بنکر رہ گئی۔ وہ ٹھیک ٹھیک بتانے سے قاصر رہا کہ غیر مشروط
واجب التسلیم قانون کسکا قانون ہو سکتا ہے اور کیوں؟ جیسا کہ ابوالاعلیٰ کی ایک مختصر تصنیف "اخلاقی نقطۂ نظر" میں جامعیت کیساتھ ثابت کیا گیا ہے
اگر اسکا مزاج مشرقی ہوتا تو شاید یہ بات پیش نہ آتی۔ مشرقی طرز ادراک میں فلسفیانہ تحقیق و تلاش سے پہلے نظریۂ علم کو اہمیت دیجاتی ہے۔ ہمارے علم کا سرچشمہ کیا ہے
ہمیں اپنے نفس اور خارجی اشیاء کا علم کس حد تک ہو سکتا ہے۔ علم کی ماہیت اصلی کیا ہے۔ نفس بالذات کیا ہے۔ کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں کس حد تک عقل کام کر سکتی
کہاں وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے انبیائی تعلیمات آتی ہیں یہ تعلیمات مشرقی مزاج پر گہرا اثر رکھتی ہیں۔ درحقیقت ان سوالات کا جواب صرف الٰہی تعلیمات

سہیل احمد زیدی

شہنشاہ

(۱)

دو قدم چلتا ہے کچھ سوچ کے رک جاتا ہے
چیختا ہے کسی راہی کو مخاطب کرتے
"میری تعظیم کرو، میں ہوں شہنشاہِ جہاں
دیکھتے کیا ہو ادھر، کیوں نہیں سجدہ کرتے"

(۲)

تو ہے ناچیز بھلا تیری حقیقت کیا ہے
میرے قبضہ میں یہ مخلوق جہاں ہے ساری
تیرے اجداد غلام، ابن غلام، ابن غلام
میری شریانوں میں شاہوں کا لہو ہے جاری

(۳)

ناک کی سیدھ میں محدودِ نظر ہے تیری
میری آنکھوں کے لئے کون و مکاں ہے روشن
شہر میرا ہے سڑک میری سپاہی میرے
خیر جا چھوڑ دیا پھر کبھی کرنا درشن

(۴)

موڑ دو ٹھہرو کہ سلطانِ زماں آتا ہے
آنکھ نیچی کرو، اے اہلِ زمانہ جھک جاؤ
چاند سورج کے سفیروں سے مجھے ملنا ہے
تم جہاں بھی ہو وہیں کیڑے مکوڑو رک جاؤ

(۵)

ہیٹ کے تاج پہ ہے مور کے پر کی کلغی
ہاتھ کے رول کو تلوار سمجھ کر تھامے
مٹھیاں بند ہیں، ماتھے پہ شکن، منہ میں سگار
جیب کی کور سے لٹکے ہوئے بیسوں تمغے

(۶)

دو قدم چلتا ہے رک جاتا ہے کچھ سوچ کے پھر
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہے سودائی ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ اس دور کے انساں کی ہوس
اک ذرا اس کے تخیل میں سمٹ آئی ہے

ترقی پسند شاعر

پروفیسر ظفر احمد صدیقی

شاعرِ آتش نوا اے مست جوشِ انقلاب
اپنے احساسات و رُجحانات کی تصویر دیکھ
تو یہ کہتا ہے ادب تقلید سے بیزار ہو
آہ خود تقلید میں جکڑی ہوئی ہے تیری ذات
یہ تجدّد ہے فقط مرعوبیت کا ایک نام
اشتراکیت ہے تیری بستۂ بندِ ہوس
کفر کے عرفاں کے قابل بھی تری ہستی نہیں
تیرا ذوقِ کفر ہے بس اک فریبِ حرص و آز
ایک حیلہ ہے یہ خواہش کی غلامی کے لئے
لے رہی ہے دل میں روحِ معصیت انگڑائیاں
میں نے مانا شاعری ہو زندگی سے بہرہ ور
زندگی لذّت پرستی سے عبارت تو نہیں!
ہستیٔ کُل ہم بہائے خار ہو سکتی نہیں
ہیں کچھ ایسے راز بھی جن کی نمائش برملا
آہ لیکن تیرے ستبدیزِ قلم کی شوخیاں
آرٹ کو عریاں نگاری کو سمجھتا ہے کمال
ہے اسیرِ لذّتِ کام و دہن مثلِ مگس
نوجوانوں کے لہو کو جوش میں لاتا ہے تو
اپنے ذوقِ معصیت کوشی کی رنگیں داستاں
سچ بتا یہ بھی تجھے اس وقت آتا ہے خیال
سوچ اس ذہنی تعیش کا نتیجہ ہو گا کیا
پرچم اپنا کھولے گا جب آنے والا انقلاب
جب مصافِ زیست میں ان کو کیا جائیگا یاد
کام ہی اصلاحِ ہستی ان نفوسِ پاک کا
فقر کی قوت سے حاصل جن کے قدموں کو ثبات
خود جنہوں نے پارۂ نانِ جویں پر کی بسر
جن کے سینے دولتِ توحید سے آباد ہیں
آہ تو اور چارۂ انسانیت کا اہتمام
دہر کو بدلے گا کیا جو خو بدل سکتا نہیں

دیکھ اس آئینہ میں اپنی حقیقت بے نقاب
اپنی ہستی کے پریشاں خواب کی تعبیر دیکھ
زیست کے عریاں حقائق کا علمبردار ہو
پوجتا ہے غرب کے ترشے ہوئے لات و منات
ہے تجھے اغیار کی بے مغز نقالی سے کام
ہے ترا الحاد ایک فیشن پرستی اور بس
کفر تیرا عقل و اندیشہ کی بدمستی نہیں
خود فراموشی کا پردہ خود فروشی کا جواز
اک بہانہ ہے ہوس کی بد لگامی کے لئے
نفس کی تسکین پر مذہب کی بندش ہی گراں
ہو ادب میں زندگی کے قلب کی دھڑکن مگر
زیست کی معراج روٹی اور عورت تو نہیں
ہر حقیقت قابلِ اظہار ہو سکتی نہیں
شرم اور تہذیبِ انساں کی نہیں رکھتی روا
دامنِ تہذیبِ انساں کی اُڑا دیں دھجیاں
ہے ترا گمراہ دل نامحرمِ ذوقِ جمال
حُسن کو پائے گی کیا تیری نگاہِ بوالہوس
کوچۂ عصیاں کی راہیں ان کو دکھلاتا ہے تو
جب مزے لے لے کے تو کرتا ہے محفل میں بیاں
تیرے اس درسِ اجل پرور کا کب ہو گا مآل
حیدر و خالد بنیں گے امیں یا اختر بیا
ہاتھ میں تلوار ہو گی ان کے یا چنگ و رباب
نشہ سے ہاتھوں میں رعشہ ہو گا یا زورِ جہاد
جن کو بخشا ہے خدا نے مرتبہ افلاک کا
جن کے قبضہ میں اجل جن کی نگاہوں میں حیات
اور دُنیا کو لُٹائے گنجہائے سیم و زر
پیروی سے نفسِ امّارہ کی جو آزاد ہیں
اپنی اس تخریب کو تعمیر کا دیتا ہے نام
راہبر کیا ہو گا جو خود راہ چل سکتا نہیں
[redacted]

اپنی عشرت گاہ میں ہوتا ہے جب وقفِ طرب
ذہن میں ہوتے ہیں تیرے زرد چہرے خشک لب؟

احترام آدمیت کا لبوں پر جب ہو ذکر
اپنے ماضی کی تلافی کی بھی کچھ ہوتی ہے فکر؟

کس قدر فرصت گنوائی شغلِ نائے و نوش میں
کتنے غنچوں کو مسل ڈالا ہوس کے جوش میں

کتنے معصوموں کی ہستی کو کیا تو نے تباہ
کتنے قوموں کو دکھائی کوچۂ عصیاں کی راہ

آہ وابستہ تھے تیری ذات سے کتنوں کے حق
کجروی سے اپنی کس کس دل کو پہنچایا قلق

سچ بتا کیا ہے یہی انسانیت کا احترام؟
کیا یہی ہے زندگی کے واسطے تیرا پیام؟

آہ غافل سخت ہے فطرت کا تعزیری نظام
لیتی ہے فطرت ہر اک لغزش کا آخر انتقام

ہو گئی عبرت کے قابل تیری حالت الاماں
الاماں فطرت کا اندازِ عقوبت الاماں

ہر گھڑی احساس پر ہیں تلخیاں چھائی ہوئی
زندگی روندی ہوئی مرجھائی کمھلائی ہوئی

یہ مشیت سے بغاوت سرکشی اللہ سے
کجروی تیری یہ صدق و راستی کی راہ سے

دین او ر اخلاق سے تیرا عنادِ بے سبب
اجتماعی بندشوں پر یہ ترا غیظ و غضب

شیخ و زاہد پر تبرا، صوفیوں کا احتساب
ذوق یہ تخریب کا یہ نعرہ ہائے انقلاب

ہے یہ تیری تلخیٔ احساس کا ردِّ عمل
مل رہا ہے زشتیٔ اعمال کا تجھ کو یہ پھل

کروٹیں لیتا ہے جب سینہ میں احساسِ گناہ
ڈھونڈھتا ہے دل ترا الزام سے بچنے کی راہ

جامۂ تقویٰ کو اپنے کر چکا تو چاک چاک
چاہتا ہے اور کیوں اس عیب سے رہ جائیں پاک

روح کی جنت سے نکلا ہے مثالِ اہرمن
چاہتا ہے ہر کوئی اس راہ پر ہو گامزن

اپنی اخلاقی تہی دستی کا یہ احساس ہے
جو مجھے حاصل نہیں کیوں دوسرے کے پاس ہے

تو سمجھتا ہے بدن کے ماورا کچھ بھی نہیں
اصل انساں ایک حیواں کے سوا کچھ بھی نہیں

آشنائے ذوقِ پستی ہے ابھی تیری نظر
روحِ انسانی کی رفعت کی نہیں تجھ کو خبر

اصل پر اپنی کبھی تو نے کیا ہے غور بھی
تیری فطرت میں ہے حیواں کے سوا کچھ اور بھی

حسن کا ادراک، اخلاقی تڑپ، حکمت کی پیاس
ہستیٔ کامل کا جذب، ایمان اور مذہب کا پاس

ان تقاضوں ہی میں ہے انساں کی عظمت کا راز
ہیں یہی انسان و حیواں میں بنائے امتیاز

آہ لیکن اس گہر سے تیرا دامن دور ہے
اور اس کم مائگی پر اپنی تو مسرور ہے

چن رہا ہے تو خزف ریزے کنارِ آب پر
بحر کی تہ میں جو گوہر ہیں نہیں ان کی خبر

شعر کو سمجھا ہے تو حیوانیت کا اک نقاب
ایک انگڑائی گنہ کی اک ہوس کا پیچ و تاب

شاعری کے راز سے آگاہ تیرا دل نہیں
شعر کی خلوت میں تجھ کو بار ابھی حاصل نہیں

شعر کیا ہے حسن کی ہر ایک شے میں جستجو
اک نگارِ حسن سے پردہ کے پیچھے گفتگو

اک امیدِ صبحِ نورانی اندھیری رات میں
مہرِ تابندہ کا جلوہ سینۂ ذرات میں

آرزوئے بحر کا قطرہ کے دل میں ارتعاش
اک ہم آہنگی کی فطرت کے مظاہر میں تلاش

بردۂ ہر لفظ میں پوشیدہ معنی کا شعور
بے نیازِ جام و ساغر ایک روحانی سرور

یہ لطافت مادّہ کا بار اٹھا سکتی نہیں
شعر کی عصمت ہوس کی تاب لا سکتی نہیں

ہارسنگھار

تنویر علوی ایم۔ اے

صبح کو بادِ صبا آکے ترے کنجوں میں
تجھے سوتے ہوئے گودی میں اُٹھا لیتی ہے
اور چپکے سے لبوں کو ترے بوسہ دیکر
تیرے انفاس کی خوشبو کو چُرا لیتی ہے

اور اِک شوخ کرن آکے بصد ناز تجھے
چھیڑتی ہے ترے دامن پہ بکھر جاتی ہے
مسکراتی ہے تری روح کی دوشیزہ کلی
اور رنگت ترے چہرے کی نِکھر جاتی ہے

زندگی ہے تری یا ایک حسیں تر لمحہ
جس میں تو شاخ پہ کِھلتا ہے مہک اُٹھتا ہے
تیری معصوم نگاہوں کا اشارہ پا کر
وقت کا طائرِ سیمیں بھی چہک اُٹھتا ہے

یہ ترا حُسن، یہ شوخی، یہ نزاکت، یہ جمال
ناز ہے جس پہ مصوّر کو وہ تصویر ہے تو
ہر نفس میں ترے مستور ہے فطرت کا پیام
یعنی ہستی کے حسیں خواب کی تعبیر ہے تو

یہ ترا روئے حسیں یہ تری خوشبوئے لطیف
یوں بنا دی گئی اِس محفلِ انساں کی چیز
تاکہ پا جائے یہ ہستی کے حسیں مقصد کو
تاکہ ہو جائے گُل و خار میں اس کو تمیز

اور یہ جنّت سے نکالا ہوا انسان کبھی
باغِ فردوس کو دُنیا میں بھلا ہی نہ سکے

محمود عالم

جھلکیاں

(۱)

پھر وہی فصلِ بہاراں وہی غنچے وہی گُل
ایکے اے دل ترا اندازِ جنوں کیسا ہوگا
نغمۂ شوق کی لَے پھر بھی جو مدھم ہی رہی
کوئی بتلاؤ مرا سوزِ دروں کیسا ہوگا

(۲)

ارمانوں کی بزم سجے گی
آشاؤں کے دیپ جلیں گے
اُجڑے دلوں میں دھیرے دھیرے
اُمیدوں کے پھول کھلیں گے

(۳)

میں ذکرِ غمِ فرقت کے لئے
آغازِ سخن ڈھونڈا ہی کیا
بھیگی ہوئی پلکوں سے تم نے
افسانۂ دل کہہ بھی ڈالا

(۴)

محو مشق ناز رہے گا
کب تک یونہی فتنۂ دوراں
کب تک یوں خاموش رہیں ہم
دل میں دبائے حشر کے طوفاں

(۵)

یہ چاندنی یہ ستارے یہ کہکشاں کی لکیر
میں سُن رہا ہوں دل کائنات کی دھڑکن
سکوتِ شب میں تری یاد آج یوں آئی
تڑپ کے جاگ اُٹھے جس طرح شعورِ چمن

نیل کا گودام

نجمی۔ بی۔ اے

جین پور سے اعظم گڈھ جانے والی پختہ سڑک پر دو آدمی چلے جا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک مرد تھا جس کا نام "ثابت تھا" دوسری اسکی بیوی رحیماں تھی۔ ثابت کی عمر لگ بھگ پچاس سال کی ہوگی مگر قد سے جھک گئی تھی ورنہ ویسے وہ کافی تندرست اور توانا لگتا تھا۔ اس کا نصف سے زیادہ چہرہ گھنے گل مچھوں اور داڑھی میں چُھپا ہوا تھا اور پکے ہوئے سیب کی طرح سُرخ نظر آتا تھا۔ سر پر اُس نے ململ کے کپڑے کی بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ چار خانے کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا کُرتا اور میلی سی دھوتی جو صرف گھٹنوں تک آئی تھی، پہنے تھا۔ اور پیر میں دیسی ساخت کے جوتے تھے جن پر جمی ہوئی سیاہی مائل گرد کی تہیں صاف بتا رہی تھیں کہ انہیں خوب اچھی طرح تیل میں چیڑا گیا ہے

اور قریبی مائل رحیماں اپنے شوہر سے تقریباً چار سال چھوٹی تھی ایک بہت کافی گھیر والا ایرانی وضع کا لہنگا پہنے ہوئے تھی جس پر لگے ہوئے مختلف رنگوں کے پیوند اسکی عجوبیت میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔ اور ایک "ملیم آستین" جس میں بجائے بٹن کے تاگے کی گھنڈیاں لگی تھیں اور گہرے گلابی رنگ کا دوپٹہ سر اور شانے سے ہوتا ہوا پیچھے کی طرف لٹک رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے اسے کبھی آگے کر دیتے اور کبھی پیچھے۔ پُشت پر ایک بڑی سی گٹھری تھی جس کے ایک سرے کو اُس نے گردن کے داہنی طرف شانے کے اوپر سے لیجا کر، اور دوسرے کو بائیں بغل کے نیچے سے لا کر خوب مضبوطی سے باندھ لیا تھا۔ اس بوجھ کی وجہ سے وہ کچھ جھکی ہوئی چل رہی تھی —— بظاہر اسمیں چیتھڑے ہی نظر آنے تھے مگر ذرا بھی غور سے دیکھنے پر معلوم ہو جاتا تھا کہ اس میں ان کی روز مرہ ضرورت کی ساری چیزیں تھیں ... کھانے پکانے کی چیزیں، المونیم کا چھوٹا سا لوٹا، کچھ کپڑے، چھوٹی سی ایک کلھاڑی، اور بہت سی چیزیں تھیں ——

"اب تو پیروں میں درد ہونے لگا" رحیماں نے اپنے شوہر سے کہا "شاید تھوڑی دیر میں پانی برسے" نیچے جھکے آتے ہوئے "آسمان" کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

اگست کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ دور شمال مشرق کی طرف سے تیز و تند ہوائیں بہت زور شور سے چل رہی تھیں۔ یہ ہوائیں گرد کے بگولوں کو شاید زبردستی اپنے ساتھ لیجانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں اور گرد و غبار تھوڑی دُور جا کر راہگیروں کے چہروں اور جسموں سے ٹکرا کر گر پڑتے تھے —— اور اتنی ہی تیزی سے گھرے آتے ہوئے سیاہی مائل بادل شاید ہواؤں کو انکی سرکشی کی سزا دینے کی فکر میں تھے —— اور یہ سب دیکھ کر بیچارا سورج جلدی سے چُھپ جانے کی سوچ رہا تھا۔

"تو اب رات کو ٹکنے کے لئے کیا ہوگا؟" رحیماں نے پوچھا۔

"ایک جگہ تو بنگٹ ہی ہے مگر یہاں سے پکا دو کوس ہے" اسکے شوہر نے جواب دیا۔

"باتیں نہ بناؤ، ابتک چھ سات کوس چل چکے ہیں اور پانی بھی آرہا ہے" اس نے کچھ غمگین آواز سے کہا۔

"تو پھر ادھر ہی کہیں رُک جائیں گے" ثابت نے بہت نرمی سے کہا "اچھا اب کچھ دیر سستالو۔

"ہاں کچھ دیر دم لے لوں"۔ اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر چلنے کے لئے کھڑی ہوئی۔ تو ثابت نے کہا۔ "لاؤ گٹھری میں باندھ لوں، تب جلدی چل سکوگی" اور رحیماں نے گٹھری کھول کر دیدی۔ اسکے بعد وہ خاموشی سے کچھ دیر چلتے رہے —— اور کچھ دیر بعد بارش کی اِکی دُکی بوندیں لگاتار زمین میں جذب ہونے لگیں۔ رحیماں نے چاروں طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے بولی "ہم لوگ شاید اس گودام کے نزدیک آگئے ہیں۔ ہے نا؟ دیکھو، کیا داہنی طرف گاؤں ہے اور پاس ہی نالہ۔ وہ کیا پانی چمک رہا ہے کیا نام گاؤں کا۔ ہاں۔ آں۔ اسے ٹھیک ہے" اسرف پور ——

پانچ برس پہلے تو وہیں تھا۔ جب ہم لوگ سارہ کے ساتھ جا رہے تھے اور اگر اس مدت میں پست نہ ہو گیا ہو تو اس میں دو گھر بھی ہیں رہنے قابل — اور ہاں، احاطے میں کنواں بھی ہے ——"

ثابت جیسے کچھ یاد کر رہا تھا۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے کہا۔ "ہاں سارہ کی ماں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بالکل ٹھیک۔ بس ہم ایک آدھ گھنٹہ میں پہنچتے ہیں۔" پانی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔ رحیماں کو اپنے پیروں میں درد کا شدید احساس ہو رہا تھا دراصل پہلے سے اسکا خیال تھا کہ وہ مسلسل بارہ میل کبھی نہیں چل سکتی۔ حالانکہ جوانی کے عالم میں اسکی دوگنی مسافت بھی اسکے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ اور پھر اس وقت تو اس کے پاس بچے رہتے تھے۔ ایک تو ہر وقت اس کے سینہ سے چمٹا رہتا اور دوسرا بھی اسکے ہی سہارا چلتا اور جب یکایک دور سڑک کے کنارے پر اسے ایک گری پڑی عمارت کے کونے نظر آئے تو وہ خوش ہو گئی۔

"بس یہی ہے" اس نے یکایک کہا۔ "یہی وہ نیل کا گودام ہے۔ مجھے یاد تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے۔ حالانکہ ہم اسی وقت آئے تھے جب سارہ اور اس کا آدمی ہمارے ساتھ تھے۔ یاد ہے نا۔ ہم لوگ ادھر بہٹ کر اسرف پور میں "ٹکے" تھے۔"

ثابت نے سر ہلا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سڑک سے جگہ کاٹ کر جانے کے بجائے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا کوئی راستہ مل جاتا تو رحیماں کو اور کم تکلیف ہوتی۔ جلد ہی اسے قدموں کے نشان، گودام کی طرف جاتے ہوئے مل گئے اور وہ دونوں آگے پیچھے چلنے لگے۔ اور چند منٹ کے بعد احاطے میں داخل ہو گئے۔

پکی اینٹوں کی بنی ہوئی متعدد کمروں کی یہ کھنڈر نما عمارت اس زمانے کی یادگار تھی جب اس طرف نیل کی کاشت زوروں پر تھی۔ اور جرمنی نے مصنوعی رنگ نہیں ایجاد کئے تھے۔ چنانچہ نیل اکٹھا کرنے کے لئے جگہ جگہ سرکاری گودام بنائے گئے تھے۔ پھر جب کاشت ختم ہو گئی تو یہ گودام بھی ویران ہوتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے — یہ عمارت بھی انہیں میں سے ایک تھی۔

"اس طرف وہ گھر ٹھیک رہے گا" رحیماں نے اپنے سامنے کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور وہ دو تین کمروں کے کھنڈروں سے گزرتے ہوئے دائیں طرف والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرہ سوکھی پتیوں، اور گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے پانی کی بوچھاریں آ رہی تھیں اور مکڑی کے جالوں کی ایک مصنوعی چھت مع جھالروں کے تیار ہو رہی تھی۔

"اچھا تو تم ٹھیک کر کے رہنے کے لائق بناؤ — لاؤ میں تھوڑا سا پانی لیتا آؤں۔" رحیماں نے چھوٹی سی بالٹی نکال کر دے دی۔ اور پھر کمرہ کو جھاڑ پونچھ کر سامان ٹھیک سے ادھر ادھر رکھنے میں مشغول ہو گئی —— بدنما سی سوزنی کو اس نے نئے ٹاٹ کے ایک بستر پر رکھ دیا۔ ایک طرف دیوار میں ایک الماری کی یادگار رہ گئی تھی۔ اس میں اس نے ٹین کی تشتریاں، المونیم کے پیالے اور ایک چھوٹا سا چاقو رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے فخریہ انداز میں گرد اور جالوں کے درمیان ہی کارنس پر ایک تصویر نکال کر رکھ دی۔ ان کاموں سے فراغت حاصل کر کے وہ ہاتھ پیر صاف کر کے اطمینان سے بیٹھنے جا رہی تھی کہ یکایک کچھ آہٹ پا کر چونک سی گئی۔

خالی عمارتیں اکثر اس قسم کی آوازوں سے بھری ہوتی ہیں۔ اور رحیماں کو اس کا اچھی طرح تجربہ تھا۔ محض چوہوں کی بھاگ دوڑ، جھینگروں کی آواز، چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ، یا ہوا کی سرسراہٹ اسے اس طرح نہیں چونکا سکتی تھی۔ اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ یہ آواز کسی انسان کی تھی۔ قدموں کی آواز —— انسانی قدموں کی آواز —— جو ساتھ کے کمرے میں حرکت کر رہے تھے۔ وہ سانس روک کر سننے لگی۔ دوسرے ہی لمحہ اسے صاف سنائی دینے لگا۔ یہ سرسراہٹ انسانی آوازیں تھیں تب اس نے کھڑکی کھولے بغیر تھوڑا سا جھانک کر ثابت کو اشارہ کیا جو پانی سے بھری ہوئی بالٹی لئے آ رہا تھا۔ اس اشارہ سے وہ اور بھی خاموش اور محتاط ہو کر تیز تیز چلنے لگا۔ یہ اس کا فوری قسم کا جواب تھا۔ آپس کی رفاقت کی اس طویل زندگی میں انہوں نے اکثر ایک دوسرے کی مدد کی تھی۔ چنانچہ جب تک وہ کمرہ میں واپس نہ آ گیا کچھ بولا نہیں

"کچھ لوگ ہیں۔" رحیماں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہاں کچھ لوگ اور ہیں۔" "کیسے معلوم؟ — کہاں — ؟؟"

"وہ اس طرف، ادھر کے کمرہ میں۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "میں نے آواز سنی ہے۔ سنو!!"

اور وہ دونوں سننے لگے۔ بغل کے کمرے سے چلنے کی آوازیں پھر

آرہی تھیں، اور باتیں کرنے کی بھی۔

"دو ہیں"۔ رحیماں نے کہا۔ "کون ہو سکتا ہے؟ ہماری ہی طرح کوئی راہی ہوگا اور کون یہاں ———"

"ہو سکتا ہے کہ کوئی اپنی ہی جان پہچان کا ہو۔ مانتی ہو آج کل رحمو اور اسکے گھر والے ادھر ہی ہیں۔"

"نہیں وہ نہیں ہوں گے۔" رحیماں نے یکا یک کہا کسی نے اس گھر کو لے لیا ہوگا اور مرمت کرنے آئے ہوں گے۔"

"کہیں فقیرا کے گھر والے نہ ہوں۔ سنا ہے آجکل وہ دال روٹی سے مزے میں ہیں۔"

ثابت نے جواب دیا۔ "جب ہم دوپہری سے چلے تھے تو انکے بارے میں خوب ہوا گرم تھی۔"

"مگر پھر راہی لوگوں کا ٹھکانہ ——— اونہہ ———" رحیماں نے کہا۔ "جاؤ جا کر دیکھو تو۔ کوئی بھی ہو۔ مگر اسے اُتار کر۔ ہاں! ٹھیک ہے ———"

ثابت نے جلدی سے جوتا اتارا اور انتہائی احتیاط سے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ اتنی آہستگی سے چل رہا تھا کہ صرف اسی قسم کے لوگ اس طرح چل سکتے ہیں۔

رحیماں اپنے کان لگائے سنتی رہی۔ آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن اس نے کچھ اور بھی معلوم کیا۔ اسے خیال ہوا کہ اس نے سسکیوں کی آواز بھی سنی ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ ثابت بہت خوبی سے لغزاہٹ کئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اور پھر اتنی خاموشی سے واپس آیا کہ خود بیچاری بوڑھی عورت بھی اُچھل پڑی۔

"ڈرو نہیں ———" ثابت نے بہت دھیمی آواز سے کہا۔ "دو ہیں۔ مگر بہت عجیب طرح کے آدمی۔"

"آئیں! یہ کیسے؟؟"

"لڑکی نے آنکھوں پر چشمہ لگا رکھا ہے۔ اور لڑکا بہت خوبصورت ہے ——— مگر نکال دیا جانا چاہیئے۔"

"نہیں، میں نہیں چاہتی۔ تیرے کپڑے مانگ ہیں مگر وہ کر کیا رہے ہیں؟"

"وہ جھگڑا کر رہے ہیں،" ثابت نے کہا۔ "لڑ رہے ہیں، چلا رہے ہیں۔"

"ہاں چلاہٹ میں نے بھی سنی تھی۔"

"لڑکی رو رہی ہے، منہ ایک رومال سے چھپائے ہے۔"

اس کے پاس ایک نیلا، سفید نیلا، رومال ہے ہلکا نیلا کنارا ہے۔"

"تو کیا وہ بڑے لوگ ہیں؟"

"ہاں ہاں، بڑے آدمی۔ ان کا کپڑا بہت اچھا ہے۔ لیکن وہ میرے خیال میں اس گھر کے بارے میں نہیں آئے۔"

"تب کیا کر رہے ہیں؟"

"ہماری ہی طرح پانی سے بچنے۔ اور میرے خیال میں انکے پاس کافی روپیہ پیسہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ لکھنؤ تک کے ٹکٹ کی بہت باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو کیا جھگڑا اسی بات پر ہے کیا؟"

"نہیں، جہاں تک میں جان پایا ہوں وہ یہ ہے کہ یا تو وہ لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتی۔ یا دونوں کا بیاہ ہو چکا ہے اور لڑکی چھٹکارا چاہتی ہے اور وہ نہیں دیتا۔"

"نہیں، نہیں، ہم کو ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔" رحیماں نے جلدی سے کہا۔

"اونہہ" ہو سکتا ہے کہ وہ میاں بیوی ہوں۔ یا ہو سکتا ہے کہ ——— مگر چُپ، چپ، وہ ادھر ہی آ رہے ہیں!!"

نیم پختہ فرش پر قدموں کی آواز قریب تر آتی جا رہی تھی۔ رحیماں نے جلدی جلدی سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ کہ چھپا دے، کون جانے کیسے لوگ۔ مگر ثابت نے اسے روک دیا۔

"نہیں، ڈرو نہیں، میں نے انہیں سمجھ لیا ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتے"

اور اسی لمحے دروازے میں ایک نوجوان نمودار ہوا۔ وہ لمبا اور اکہرے بدن کا نوجوان تھا اور عمدہ قسم کے سوٹ میں ملبوس۔ اسکے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ شاید اچھی طرح جوان نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیچھے تاریکی میں ایک لڑکی کا ترشا ہوا سا چہرہ اسکے اچھی طرح اور خوبصورتی سے سنوارے ہوئے بالوں کے بیچ میں جیسے فریم کر دیا گیا تھا۔ اسکے عزم صمیم کی حامل آنکھیں کچھ خوف زدہ سی تھیں۔

"ہوں" نوجوان نے سختی سے کہا۔ "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ثابت نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور کہا۔ "یہ جگہ جتنی تمہاری ہے اتنی ہماری بھی۔"

"بلکہ تم سے زیادہ ہی"۔ رحیماں نے حق رفاقت ادا کیا۔ "ہم لوگ تو سڑک پر ہی رہنے والے ہیں اور تم لوگ گھروں میں رہنے والے۔ ان کا

یہاں کیا کام ؟"

"ٹھیک" نوجوان نے قدرے مضبوطی سے کہا" مگر میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا یہاں کیا کام ہے ؟"

"ہمارا کام یہ ہے کہ اس پانی برستی رات میں یہیں ٹکیں گے، کھائیں گے، سوئیں گے اور اگر تم ادھر اُدھر کی باتیں نہ کرو تو کچھ نہ کہیں گے۔ یہاں ہم سب کے لئے کافی جگہ ہے"

"ٹھیک تو ہے شمو" لڑکی نے کہا" چلو واپس چلیں" اسکا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، آنکھیں شناک تھیں۔ اور پلکوں کے کنارے کچھ سوجے ہوئے سے تھے۔

اب رحیماں یکایک پیشہ ورانہ انداز اختیار کر گئی۔

"میں کسی بھی شریف آدمی کو اور بڑے آدمی کو نہیں ٹوکتی" اس نے اپنے مخصوص لہجہ میں جو صرف ایسے ہی خوش پوش لوگوں کے لئے وقف تھا کہنے لگی" میں جانتی ہوں کہ آپ بڑے گھر کی ہیں۔ اگر آپ ایک چونی دیں تو میں آپ دونوں کے بارے میں کچھ اچھی اور فائدہ کی باتیں بتاؤں ——اس سے زیادہ کہ آپ لکھنؤ کے ٹکٹ کی قیمت —— اور"

لڑکی نے ایک متعجبانہ اور چبھتی ہوئی نگاہ اپنے ساتھی پر ڈالی۔

"آئیے بی بی" رحیماں نے بڑے پیار سے کہا" میں آپکے شوہر کے بارے میں بھی بتاؤں گی"

لڑکی بڑھتی ہوئی تمتماہٹ اور غصہ کے ساتھ نوجوان کی طرف مڑ گئی—"میں یہ سب بیہودگی برداشت نہیں کر سکتی" اس نے ہولے سے کہا" چلو چلیں"

"یہ تو ٹھیک ہے" نوجوان نے کہا" مگر یہی کمرہ سب سے اچھا ہے ورنہ ہمارے والے میں تو چھت کی درازوں سے مسلسل پانی ٹپک رہا ہے"

آپ کو پہلے ہی اس میں آنا چاہئے تھا مگر اب ہم لوگ یہاں آگئے ہیں تو یہیں رہیں گے" ثابت نے کہا" میری بوڑھی عورت بھیگ گئی ہے اور اگر میرے ہوتے ہوئے بھی—— سوکھی جگہ نہ ملے تو——"

"بہت بہتر، آؤ !" نوجوان نے کہا" ہو سکتا ہے کہ رات سے پہلے بارش تھم جائے ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے"

وہ اور لڑکی واپس چلے گئے۔ ثابت اور رحیماں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"سڑکوں پر عجیب عجیب چیز ملتی ہے" رحیماں نے کہا" ٹھیک کیا ہے ہیں وہ لوگ۔ میں یہی سوچ رہی ہوں"

"تم بیوقوف ہو" ثابت نے جواباً کہا" ہر چیز کے پیچھے پڑ جاتی ہو، عورت ہو نا! میں اسکے بارے میں دوبارہ نہیں سوچتا۔ نہ تم کچھ سوچو، چلو آگ جلائیں۔ تمہارے کپڑے بھیگے ہیں"

وہ زنبیل نما گٹھری کی طرف مڑا اور اس کی گہرائیوں میں سے اسکا بقیہ خزانہ بھی نکال لیا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور سوکھی ٹہنیاں تھیں۔ یہ لوگ اس طرح کے گٹھے ہمیشہ ہی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ بڑھاپے میں ان کو اس سے بہت آرام ملتا تھا۔

جلد ہی آگ جلائی گئی اور پانی سے بھری ہوئی ایک "پتیلی" رکھ دی گئی، پہلے تو چمک دار شعلہ بھڑکا پھر جب اُنہوں نے باہر سے اکٹھا کی ہوئی نم لکڑیوں کو بھی رکھ دیا تو کچھ دُھواں اُٹھنے لگا۔ کمرہ گرم ہوتا گیا اور رحیماں کے کپڑوں سے بھاپ نکلنے لگی۔ اس کے شوہر نے اپنی چادر اُتار کر اسکے کندھے پر ڈال دی۔

"اسے اوڑھ لو سارہ کی ماں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ موسم تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہیں اپنی حفاظت کرنی چاہئے"

انہوں نے چائے بنائی اور دن میں پکائی ہوئی روٹی کے ساتھ پیٹ بھر کر کھایا۔ باہر بارش زوروں سے ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں اور پتیوں سے ٹکرا کر عجیب سا شور پیدا کر رہی تھی۔

"اُن کے کمرہ میں بہت ٹھنڈا ہوگا" رحیماں نے آہستہ سے کہا۔ آگ بجھتی جا رہی تھی مگر ثابت کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ باہر جا کر اور لکڑی لائے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلوں دیکھوں کوئی لکڑی گری پڑی اسی طرف مل جائے" اور باہر نکل وہ گرے ہوئے شہتیروں کے ٹکڑوں کو نکالنے ہی والا تھا کہ اس نے اس نوجوان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"اے" نوجوان نے اسے مخاطب کیا" ہم لوگ آدھے سے زیادہ بھیگ گئے ہیں۔ کمرے میں بہت زیادہ پانی جمع ہو گیا ہے۔ میں کہنے جا رہا تھا کہ بارش رُکنے تک تمہارے کمرے میں آ جائیں۔ پھر فوراً چلے جائیں گے"

"ہم لوگ "گریب" ہیں" ثابت نے جواب دیا" بنا پیسہ کے اپنی آگ سے فائدہ نہیں اُٹھانے دینگے"

"نہیں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس خاتون کو کسی خشک جگہ بیٹھ جانے دو۔ اتنے کے لئے شاید تم ایک کُتّے کو بھی اجازت دے دوگے؟"

"نہیں میں کسی کُتّے کو کبھی پاس نہیں بٹھا سکتا۔" ثابت نے فوراً جواب دیا۔ "میری عورت، ور میں کبھی کتوں کو پاس نہیں بٹھاتے ہم کو معلوم ہے کہ ان کے پِسّو ہوتے ہیں اور ایسی چیزوں سے ہمکو کیا مطلب ؟"

نوجوان شخص نے کچھ اس طرح ثابت کا جائزہ لیا جیسے وہ خود بھی اسی کیڑے کی قسم سے تعلق رکھتا ہو۔

"خیر اگر تم روپیہ ہی چاہتے ہو تو میں دوں گا۔" اس نے کہا۔ "ایک روپیہ کافی ہوگا نا ؟؟"

"ایک روپیہ بہت ہوگا۔" ثابت نے قدرے غرور سے کہا۔ "اور اسمیں آگ بھی شامل ہے۔ ہم نے بہت سی آگ جلا رکھی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" نوجوان نے باہر آتے ہوئے دھوئیں کے اثر سے کھانستے ہوئے کہا۔ لیکن ثابت اور رحیماں کا کمرہ حالانکہ دھوئیں اور پرانے چیتھڑوں کی بو سے بھرا ہوا تھا پھر بھی ان کے ٹپکتے ہوئے کمرے سے تو اچھا ہی تھا۔ جہاں وہ اور شاہدہ اشتر گھنٹوں سے کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اپنے کو خشک اور گرم رکھ سکیں۔ اور اب شاہدہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ رحیماں کے پاس آگ کے نزدیک احتیاط سے بیٹھی ہوئی تھی اسکا چہرہ اب گلابی نہ رہا تھا۔ بلکہ نیلا پڑ گیا تھا۔

"اچھی بی بی، میرے ہاتھ پر ایک چوّنی رکھو۔" رحیماں نے بغیر کسی شرمندگی کے کہا۔ "اور میں آپکی قسمت کا بہترین حال بتاتی ہوں"

"میں جھوٹی باتیں نہیں چاہتی"۔ اس نے غصّہ سے جیسے کچھ جھگڑتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ! بی بی، میں کبھی جھوٹ نہیں کہتی۔ اگر میں جھوٹ کہوں تو ابھی مر جاؤں۔"

"میری عورت بہت سچی ہے۔" ثابت نے کہا۔ "بہت اچھا ہوتا اگر آپ جھوٹا نہ کہتیں۔"

شاہدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اسے ملامت کی گئی ہے۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ خیر اگر تم کہتی ہو تو میرا ہاتھ دیکھ سکتی ہو۔ مگر میرے پاس صرف ایک دوّنی ہے۔"

"کوئی بات نہیں بی بی، خوش رہو، تمہاری عمر بڑی ہو۔ دوّنی میں تو کئی پُڑیہ چائے خریدوں گی، اور پھر آپکو دُعا دیکر پی لوں گی۔ مجھے چائے بہت پسند ہے بی بی۔"

شاہدہ نے اپنا نرم و خوبصورت ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"مجھے دھول لگے ہاتھ بہت پسند ہیں کیونکہ اسمیں لکیریں خوب دکھائی دیتی ہیں ——— تو اب جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ——— ہاں، میں ریل کی ایک پٹڑی دیکھ رہی ہوں اور اسپر ایک ریل گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے۔ اور آپ اور ایک اور شریف آدمی ساتھ بیٹھے ہیں۔ اور جب آپ لکھنؤ پہنچتے ہیں تو میں دیکھ رہی ہوں کہ بہت سے لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے اکٹھا ہیں۔ ایک مولوی صاحب ہیں جھو ہارے ہیں، اور خوب اچھے اچھے کھانے ہیں۔ پلاؤ، متنجن اور سب کچھ ہے۔ اور پھر ——— اس کے بعد آپ ہیں اور اتنی اچھی جیسے پری اور آپکے ساتھ ایک جوان آدمی بھی ہیں، پھولوں کے ہار پہنے، بڑی بڑی آنکھیں، اور نرم ملائم بال والے ———"

لڑکی نے اپنا ہاتھ غصّہ سے الگ کھینچ لیا۔ "مہربانی کرکے یہ ——— سب بیہودگی مت بکو۔ میں یہ سب نہیں سُن سکتی۔"

"آپ بیاہ کرنا نہیں چاہتیں ہے؟"

"نہیں میں نہیں چاہتی۔ گویا کہ میں چھو ہارے . مولوی صاحب . مہندی . " اُسکی آواز میں نفرت اُبھر آئی "اور پھر پھولوں کی بارش اور مبارک باد۔" رحیماں نے بہت بڑھائی "میں زیادہ سُننا نہیں چاہتی۔ دیکھو تم قسمت کا حال بتانے والی ہو۔ ہونا۔ میرے خیال میں میں پہلی لڑکی ہوں جس سے تم ملی ہو اور جس نے اپنی شادی کے بارے میں سُننا پسند نہیں کیا ؟؟"

"ہاں، اگر میں سچ سمجھ لوں۔" رحیماں نے کہا جو ایسی باتیں سُنکر اپنا مخصوص لہجہ بھول گئی تھی۔

"ہاں تم کو یقین کر لینا چاہیئے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتی میں شادی وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی ——— اور اس نے رحیماں پر نہیں بلکہ نوجوان شخص پر ایک ترچھی نگاہ ڈالی۔

"لیکن کوئی لڑکی اکیلے کیسے گزارا کر سکتی ہے۔ ایسا کیسے———

"اور یہ ٹھیک بھی تو نہیں" ثابت نے اضافہ کیا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ میری عورت کئی بار مصیبت میں پڑ گئی ہوتی اگر میں اس کی مدد نہ کرتا" یا تیار نہ رہتا اور صحیح راستہ نہ دکھاتا۔"

"میرا مطلب اکیلے رہنے کا نہیں" لڑکی نے کہا۔ "میں ان دونوں پر یقین نہیں رکھتی جس سے میں نفرت کرتی ہوں وہ شادی کی غلامی ہے اور ریاکاری ہے ——" اسکی آواز اونچی اور تیز ہوتی گئی۔ اور وہ قدرے تقریر کرنے کے انداز سے کہنے لگی —— "یہ اپنی آزادی کھو دینے کا سوال ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر صدیوں سے عورتیں غلام نہ رہی ہوتیں تو کوئی کبھی نہ کرتی جب میں اپنا ساتھی چنوں گی تو ہم دونوں ہی آزاد ہوں گے —— محبت کرنے اور الگ ہونے میں —— اندر کا گودا سڑ جائے پر ہم باہر کا چھلکا برقرار نہیں رکھیں گے۔"

ثابت اور رحیماں کھلے ہوئے منہ کے ساتھ خاموشی سے اسے تک رہے تھے۔ اور نوجوان شخص بے چین نظر آ رہا تھا۔

"تم میرے اس دوست کو دیکھتی ہو" شاہدہ نے تقریر جاری رکھی۔ "اور تم بھی جو ایک عورت ہو فوراً رائے قائم کر لیتی ہو کہ ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔ تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ ہم لوگ شادی کرنے والے ہوتے تو اس طرح بھاگ کر نہیں جاتے۔ بلکہ گھر بیٹھے شادی کے حقوں کا جائزہ لیتے ہوتے۔ ہم اپنی زندگیاں ساتھ گزارنے جا رہے ہیں مگر آزادی کے ساتھ کسی بندھن میں بندھ کر نہیں۔ ہم جب بھی چاہیں گے ایک دوسرے کو چھوڑ سکیں گے۔ آزادی سے کام کریں گے جو بھی چاہیں گے آزادی سے کر سکیں گے ——"

"اوہ!" رحیماں نے کہا۔ "میں الگ ہونا نہیں چاہتی۔" اور ان کی مرضی کے خلاف بھی نہیں چلنی۔ اسلئے تمہارے کہنے کا مطلب سمجھ رہی ہوں ہمارے بیاہ کو چالیس برس ہو گئے۔ اور ہماری بیٹی سارہ بیس برس ہوئے بہت اچھے آدمی سے بیاہی گئی تھی وہ اسوقت چمڑے کا بیوپار کرتا ہے۔ وہ بہت اچھے گھر میں رہتے ہیں۔ جس میں ایسی ہی کھڑکیاں ہیں چھوٹے بڑے پانچ بچے اور بڑا تو جوان ہو رہا ہوگا۔ ہمارا ایک لڑکا بھی ہے جس کی اسی شہر میں ایک بڑی سی چائے وائے کی دوکان ہے۔ وہ ایک کے بعد دوسرا بیاہ کر چکا ہے۔ ہمکو اپنے بچوں پر فخر ہے لیکن وہ ہم سے کافی دور ہو گئے اور اگر ہم دونوں نہ ہوتے تو بھلا کیسے گذرتی۔"

"یہ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتی ہے" ثابت نے کہا۔ "بڑی لڑکی سارہ اکثر ہمارے پاس آتی ہے مگر پھر ہم دونوں اکیلے رہ جاتے ہیں۔"

"اور پھر بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔" رحیماں نے کہا۔ "میں اب بوڑھی ہوں اور بہت سے کام نہیں کر سکتی۔ اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتی تو کون کرتا۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد اگر الگ ہو جائیں تو جینا دوبھر ہو جائے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہو" ثابت نے کہا۔ "اگر مجھے ان سڑکوں پر اکیلے چلنا پڑ جائے تو میں پریشان ہو جاؤں اور کچھ نہ کر سکوں۔"

"اور اگر میں تم کو ان سڑکوں پر کسی دوسرے کے ساتھ دیکھ لوں تو ——"

"نہیں بوڑھا! ایسا نہیں کر سکتا" ثابت نے محبت آمیز شوخی سے اسکی اوڑھنی اسکی آنکھوں پر سرکاتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے۔ ارے" اس نے کہا "یہ کیا۔" لیکن وہ خوش نظر آ رہی تھی اور قدرے متحیر بھی۔

بارش طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھی اور تیز اور پُرغضب ہواؤں کے جھونکے اس ریل کے گودام سے ٹکرا رہے تھے۔ سوکھی پتیاں اور ٹہنیاں تیزی سے ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ اور احاطے میں چھوٹا سا گڑھا جھیل کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن آگ کے نزدیک چاروں طرف گرمی بھی تھی اور خشکی بھی۔ بل کھا کر اٹھتا ہوا نیلگوں دھواں شاہدہ کا دم گھوٹے دے رہا تھا اسکی آنکھوں میں عجیب سے آنسو آ گئے —— واقعی وہ دھواں ہی تھا —— اسے فخر کا احساس ہوا اور پھر کانپ گئی۔ آخر کار وہ آزاد ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی شمو کو بھی بچا لیا تھا ورنہ وہ بھی غلاموں میں شامل ہو کر ان کی سب خصوصیات کا حامل ہو جاتا۔

"او۔ آ آ۔ اوں۔ آں۔ آ آ آ آ" ایک پُرشور جماہی نے اسے چونکا دیا۔ "میں مجھے نیند آ رہی ہے" ثابت نے بات کہتے ہوئے کہا "تو پھر سو کیوں نہیں جاتے۔ مجھے یہ سب پسند نہیں اور

میرے خیال میں یہ بی بی بھی اپنے سب خراب خیال کے ہوتے ہوئے پسند نہ کریں گی ـــــ سو جاؤ۔"

"ہاں اب سوؤں گا۔" ثابت نے جواب دیا۔

"تب یہ چادر لے لو میں تو اس کو اوڑھنے کی وجہ سے خوب گرم ہو گئی ہوں۔"

"نہیں مجھے چادر نہیں چاہئے۔ میں ویسے ہی سوکھی لکڑی کی طرح گرم ہوں۔"

"نہیں اوڑھ لو تمہیں جاڑا لگے گا۔" "لو اوڑھو۔"

اور پھر ایک دوستانہ قسم کی ہلکی سی ہاتھا پائی ہوئی اور ثابت نے چادر لے لی۔ اسکی بیوی نے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کے اونچے ٹھاٹ نما بستر اوڑھ لیا۔ انہوں نے پھر اس کے بعد شاہدہ اشرف اور شمیم ناصر کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اور جلد ہی بالکل ان جانوروں کی طرح جو اپنے دشمنوں میں گھرے ہوئے بھی اطمینان کی نیند سوتے ہیں خاموش اور متعجب کن نیند سو گئے۔

"عجیب بوڑھا جوڑا" شمیم نے ہلکی سی سانس لیکر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ سننے کے لئے آنا پڑا۔ شاہدہ۔ لیکن اس کمرے کے اندر میں رہنے سے تو یہ بہتر ہی تھا۔"

"اوہ وہ ٹھیک ہیں، بلکہ مجھے پسند ہیں۔ حالانکہ دراصل وہ دھوکہ دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لئے بہت اچھے ہیں جو غیر معمولی بات ہے۔ میں تو سوچا کرتی تھی کہ اس قسم کے لوگ اپنی بیویوں کو ٹھوکریں لگایا کرتے ہیں۔"

"مرد اتنے کم ظرف اور آوارہ گرد نہیں ہوتے جتنا تم سوچتی ہو" اس نے قدرے تنک مزاجی سے کہا۔ کیونکہ اس خطرناک سفر کے تلخ حصہ کا اسے اچھی طرح احساس ہو رہا تھا۔ باہر ویرانے میں طوفانی ہواؤں کے جھکڑ تھا اور موسلا دھار بارش اور اندر کمرے میں بھرا ہوا ماحول سلگوار دھواں ـــــ لیکن اسے تعجب ہوا کہ اسکے جیلیم کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی گوشے میں پڑا سوئے ہوئے جوڑے کو تک رہی تھی۔

"یہ محبت ہے جو دونوں کو جوڑے ہوئے ہے۔" اسکی مفرورانہ آواز سرگوشی کی سی آہستگی اختیار کر چکی تھی۔ "صرف شادی نہیں۔" اس کا جواب تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے سختی سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو وہ اس طرح اکٹھا نہ ہوتے ـــــ کم از کم، اس طرح جیسے یہاں۔"

"کیوں نہیں۔ محبت کرنے والے مخلص نہیں ہوتے؟"

میں تم سے سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں کہ یہ اس سے مختلف چیز ہے۔ خصوصاً اس وقت جب بڑھاپا آئے گا۔ جوانی اور ادھیڑ عمر کے متعلق میں نہیں کہتا مگر وہ بوڑھے ہیں اور بہت سے موقع آئے ہوں گے جبکہ وہ محنت کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے اور زندگی سے عاجز آ گئے ہوں گے، اور اگر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی اس طرح زندگی نہ گزارتے۔"

"نہ تو ٹھیک ہے ـــــ اس وجہ سے کہ وہ بندھن میں جکڑے ہوئے تھے۔"

"اور بندھن نے انہیں خراب موقعوں پر بھی جوڑے رکھا۔ یہ تو اس رسے سے بندھنے کی مانند ہے جو پہاڑ پر چڑھنے والے باندھے رہتے ہیں ـــــ جب ایک یا دوسرا گرنے لگا تو اس نے روکے رکھا اور پھر جب وہ کھڑے ہو گئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ جو لوگ شادی شدہ نہیں ہیں ـــ خواہ آپس میں کتنی ہی محبت کرتے ہوں ـــ کسی نہ کسی طرح آخر وقت میں ضرور ہی پریشان ہوتے ہیں۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اگر ان کی زندگی ٹھیک نہ گزرے تو فوراً الگ ہو جاتے ہیں۔ کیوں تم بھی تو کہتی ہو کہ تم تمام زندگی ایک آدمی کی ہو کر نہیں رہو گی۔ تم ایک خاص لمحہ چاہتی ہو اور بس۔ پھر اسے ہمیشہ ساتھ رکھ کر خراب نہیں کرنا چاہتیں۔ میرے خیال میں اس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے تم سے بیسیوں بار کہا ہوگا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں بیٹھا ہوا وہ بہت ہی کم عمر لگ رہا تھا۔ ورنہ وہ اسکے ساتھ نہ آیا ہوتا، کم از کم اس حالت میں۔ وہ نوجوان تھا مگر وہ بھی ثابت کی طرح بوڑھا ہو جائیگا۔ یہ سنہرے بالوں کا خوبصورت گچھا سفید ہو جائیگا۔ اسکا تروتازہ چہرہ سوکھ کر جھری دار ہو جائیگا۔ تو کیا وہ اسوقت بھی اسے پسند کرے گی۔ یا تب وہ الگ ہو کر اپنا راستہ لیں گے۔ پھر اسوقت وہ کیسے رہیگا۔ ثابت کی طرح مہربان، شفیق اور محافظ، اور اسوقت بھی محبت کرنیوالا؟ ساتھ ہی بوڑھی ہو جانا۔ ایک ساتھ نہ صرف آغاز میں بلکہ زندگی کی آخری منزل تک۔ لیکن بندھے ہوئے ایسے ہی جیسے ثابت اور رحیماں بندھے ہوئے تھے۔ جاں فشانیوں اور کشمکش کی یادوں میں بھی ساتھ، زندگی کی صعوبتوں

میں ہاتھ بٹاتے ہوئے؟ زندگی کے اس لمبے سفر میں ایک دوسرے کی رفاقت میں اپنے بچوں کی محبت اور پیار میں —

اس نے یکایک اپنا سر جھکا لیا۔ ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے گر کر بہنے لگے — "شاہدہ پیاری، یہ کیا؟ بتاؤ!!"

اور شاہدہ نے اپنا سر اسکے کندھے پر ٹکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"شمو، شمو — کیا تم مجھے ہمیشہ چاہو گے — جب ہم بوڑھے ہو جائینگے —؟"

"سچ مچ میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گا۔"

"اتنی زیادہ جتنی کہ وہ —؟" اس نے اپنا ہاتھ بے خبر پڑے ہوئے ناصت اور رحیماں کی طرف اٹھا دیا۔

"یقیناً۔ میں ایسی ہی امید کرتا ہوں۔" شمو نے قدرے اطمینان سے کہا۔

"تب۔ شمو — چلو واپس چلیں۔"

"واپس چلیں، کہاں؟"

"گھر — میں چاہتی ہوں کہ ہماری شادی ہو جائے۔"

"میری ننھی شاہدہ، لیکن تمنے تو کہا تھا کہ —"

"میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔ وہ کتنے خوش و خرم ہیں۔ وہ کتنے سچے ہیں۔ وہ گندے ہیں، بے شرم بوڑھے ہیں مگر وہ خوش ہیں۔ انکے پاس وہ سب کچھ ہے جو ہمارے پاس نہیں۔ اور جو ہم کبھی نہیں پا سکتے جب تک کہ شادی نہ کریں۔"

اس نے اتنی عقلمندی یہاں کی کہ شاہدہ کو اپنے سینے سے لپٹائے بغیر کچھ کہے سُنتا رہا۔

چلو گھر واپس چلیں۔ ابھی تو بھی نہیں بجے ہیں۔ ہم اُمی سے آسانی کہہ سکتے ہیں کہ راستہ میں بارش کی وجہ سے رُک گئے تھے اور بارش ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کچھ نہیں جانیں گی۔"

"اور ہم شادی کریں گے؟"

"ہاں — حالانکہ وہ ہم کو وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کرینگی — مہندی، نکاح، اور سب کچھ —"

"کوئی بات نہیں! یہ اس عورت کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ ثابت کر دے گی۔"

دونوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"ہم کب روانہ ہوں گے؟"

"اوہ، جلد ہی — ابھی۔"

"لیکن بارش ہو رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں — ہم گھر سے صرف ۴۵ منٹ کی مسافت پر ہیں۔ اور ہمکو اعظم گڈھ تک چلنا اور پھر لکھنؤ کے لئے روانہ تو ہونا نہیں ہے۔"

وہ کانپ اٹھی، اور شمیم نے اسکو جیسے کسی خطرناک چیز سے بچانے کے لئے اپنے سے قریب کر لیا۔

"مجھے تم کو نہیں آنے دینا چاہئے تھا۔ میں بیوقوف ہو گیا تھا میں اسپر یقین نہیں رکھتا تھا پھر بھی تمہیں روک نہ سکا۔ مجھے ڈر تھا کہ تمہیں کھو نہ دوں مجھے خود اپنے پر تو اس پر قابو رکھنا چاہئے تھا اور بجائے اسکے کہ تمہارے راستہ پر چلوں، تمکو ہی لے چلنا چاہئے تھا۔"

"تو یہی تم آئندہ کرنے جا رہے ہو؟"

"ہاں — کیونکہ تم ایک ننھی منی نادان ہو!"

وہ اپنا منہ اسکے قریب کر کے ہنس پڑی۔

اور پھر شمیم کو دوری عمل کا احساس ہوا۔

"آؤ چل دیں، ورنہ اتنی دیر ہو جائیگی کہ کچھ کہتے نہ بن پڑے گا۔ کیا تم تیار ہو؟"

"بالکل — میں خوش ہوں کہ ہم کوئی سامان نہیں لائے سوائے اوورکوٹ اور پرس کے ورنہ اسکے متعلق صفائی دینا بہت مشکل ہوتا کیونکہ ہم مع دو عدد سوٹ کیسوں کے ٹہلنے گئے تھے۔"

وہ خوشی سے ہنس پڑے اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ چلتے گئے مگر ابھی وہ گودام کے احاطے کے اندر ہی تھے کہ شاہدہ نے محسوس کیا کہ اسنے کوئی کام کئے بغیر چھوڑ دیا ہے۔

"شمو، ہمیں ان سے کہہ دینا چاہئے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ جان جائیں۔"

"خدا کے لئے واپس جا کر انہیں جگا دو مت۔ تم چاہتی کیا ہو؟"

"یہی کہ ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔"

"بھئی، تو اس سے ان سے کیا مطلب۔"

"اونہہ، کچھ نہیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ — ذرا اپنی پاکٹ بک میں سے ایک ورق تو دینا۔ ایک کام ہے۔"

اس نے دیدیا اور شاہدہ نے اسے گھسیٹ دیا۔ "ہم شادی کرنے جا رہے ہیں" اور پھر کمرے میں جاکر اس نے لڑکے اور لڑکی کی تصویر کے پاس رکھدیا۔

"اور ہاں دیکھو" اس نے پھر کہا۔ اب جبکہ ہم لکھ پڑھ نہیں جانتے ہیں۔ ہمیں اپنے ٹکٹ کی قیمت انہیں دیدینا چاہئے۔ ان کا بہت کام چلیگا۔"

"ممکن ہے اس سے فضول خرچی کریں"

"خیر کرنے دو۔ بس ایسے لوگوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جن کے پاس ڈھنگ کے جوتے بھی نہ ہوں"

آگ کی مدھم روشنی تاش کے پھٹے ہوئے گندے جوتے کے ساتھ بہت بدتمیزی سے کھیل رہی تھی۔

"ورنہ بس ہی۔ خیر یہ روپیہ ہے۔ جاگیں تو ان کے لئے بہت تعجب کی چیز ہو گی"

اس نے روپیہ کو کارنس پر رکھے ہوئے کاغذ پر رکھدیا۔ اور دونوں باہر چلے گئے

جب ناصر اور رحمان سو کر اٹھے تو دن اچھی طرح نکل آیا تھا۔ طوفان ختم ہو چکا تھا۔

"ارے وہ چلے گئے ہیں" ناصر نے کہا۔

"ہماری کوئی چیز تو نہیں لے گئے۔ کیوں؟" اسکی بیوی نے چاروں طرف بے چینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں کچھ نہیں گئے۔ وہ بڑے لوگ تھے اور بڑے آدمی غریبوں کی چیزیں بغیر کسی وکیل کی مدد کے نہیں لیتے ارے یہ کیا ہے!"

اسکے شوہر نے کارنس پر رکھا ہوا نوٹ پا لیا تھا۔

"اللہ جانے وہ اتنا روپیہ کیوں چھوڑ گئے۔ اتنے سارے نوٹ۔ اگر یہ ٹھیک ہو۔ ہماری تو خوش قسمتی ہے"

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ ورنہ اتنی بڑی رقم ہمارے صمد کی تصویر کے پاس نہ چھوڑ جاتے۔ یہ سچ مچ کی شرافت ہے"

میں بھی نہیں سمجھ پائی کہ یہ سب نوٹ چھوڑ سکتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، اور یہ ہمارے کام آوے گا ہی"

"اس سے ہم لوگ آدھ سیر بکری کا گوشت لیں گے اور—"

"ہاں اور کچھ میٹھا بھی اور چائے بھی اور تمہارے لئے ایک چپل بھی۔ یہ سب شہر پہونچ کر لیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن دیکھو اس کاغذ پر کچھ لکھا ہے"

"ہاں ہے تو مگر افسوس ہے کہ ہم پڑھے لکھے نہیں ہیں"

"ہو سکتا ہے کہ کچھ ہمارے لئے ہی ہو"

"ہاں ٹھیک ہے میرا بھی یہی خیال ہے"

اس نے کاغذ اٹھا لیا اور بہت احتیاط سے معائنہ کیا۔ اور اپنے شوہر کو دیدیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔

"بڑا افسوس ہے کہ ہم اسکول میں پڑھے لکھے نہیں"۔ رحمان نے کہا۔ "مجھے ضرورت نہ معلوم ہوئی"

"میں چاہتی ہوں کہ یہ لفظ جو وہ لکھ گئے ہیں کسی طرح پڑھ لوں"

"وہ اس لئے کہ تم عورت ہو۔ اور ہر چیز کی کرید لینے کی عادی۔ میں مرد ہوں اور کہتا ہوں کہ روپیہ لو اور سامان باندھ لو۔ اس بار قسمت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم لوگ" ٹکٹ" پہنچ کر ناشتہ کرینگے—"

("دی بگ بک آف گریٹ شارٹ اسٹوریز")
(ادارۂ ادب سلامی گورکھپور میں پیش کیا گیا)

موٹو

منظر حسین

" اُفوہ — یہ دُنیا ہے" موٹو نے نکلتے ہی سوچا اور سہم کر اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹ گئے۔

بہت دنوں سے وہ دُنیا کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اندھیرے سے اُجالے میں آنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے، انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی باہر سے آوازیں دے رہا ہے کہ "آؤ — جلدی آؤ۔ دُنیا کی بہاریں دیکھو۔ دُنیا کے مزے لوٹو" اور آخر کار وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے اور دُنیا کی شکل انہوں نے دیکھ ہی لی۔

لیکن موٹو کے ننھے دل میں اس شکل نے نہ جانے کیوں خوف سا طاری کر دیا — اور اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹ گئے — وہ چھاتی جسکے ساتھ ان کے دس بھائی بہن اور چمٹے ہوئے تھے۔

"کُڑک کُڑ کُڑ کُڑ کُڑ کُڑ" — ماں نے بچوں کو سمجھایا کہ یہ دُنیا ڈرنے کے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ رہنے کے لئے جینے کے لئے — کھانے کے لئے — اور

"چوں چوں چوں چوں چوں" — بچوں نے کہا کہ ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ ہمیں کھانا دو۔ ابھی اور اسی وقت۔

اور موٹو نے اپنی چونچ سے ماں کی چھاتی کو زخمی کرنے کی کوشش کی تاکہ سب سے پہلے انہیں کو کھلایا جائے۔ ان کی اس طفلانہ حرکت پر ماں دل ہی دل میں مسکرا دی — یہ گیارھواں بچہ بہت ہی شریر معلوم ہوتا ہے — ہوں — کُڑک —"

اور پھر ماں اپنی "پلٹون" کو لے کر میدان میں نکل پڑی۔ موٹو ہمک ہمک کر ماں کی چونچ سے نوالے لیکر نگل رہے تھے اور اپنے سے کمزور بھائی بہنوں کو دھکے دے دے کر ماں سے دُور بھگا رہے تھے۔

(۲)

میری بہن خوشی کے مارے اُچھل رہی تھی اور آٹے کی ننھی ننھی گولیاں بنا کر بچوں کو کھلا رہی تھی، خصوصی طور پر موٹو کو، جنہیں وہ سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔

(۳)

موٹو اور ان کے دس بھائی بہن رفتہ رفتہ اس عمر کو پہنچ گئے، جہاں ممتا کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں اور انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ "جاؤ — خدا کی اس وسیع دُنیا میں گھومو پھرو — اور اپنا رزق خود تلاش کرو"

چنانچہ سب اپنی اپنی فکروں میں لگ گئے — ماں اپنی فکر میں — بچے اپنی فکر میں — لیکن موٹو کو یہ آزادی پسند نہیں آئی اور انہوں نے اسکے خلاف احتجاج کر دیا۔

ماں نے ان کے اس احتجاج کی پروا نہیں کی — ماں ہی کیا کسی نے بھی نہیں کی۔

موٹو کو اس پر بڑا غصہ آیا اور انہوں نے دوڑ کر ماں کے دو چونچیں رسید کیں۔ ماں نے حیرت سے انکی طرف دیکھا اور پھر بولی "کون کون کون — تو کون ہے رے — کون ہے؟"

موٹو نے اسکا جواب یوں دیا کہ وہ ماں کی ٹانگوں میں دبک کر بیٹھ گئے — اور بھولی بسری ممتا نے انہیں کلیجے سے لگا لیا۔

(۴)

میری بہن یہ تماشہ دیکھ کر مسکرا دی — اور موٹو کو وہ اور زیادہ پسند کرنے لگی

(۵)

کچھ دن اور گذر گئے۔

موٹو نے ماں کی ٹانگوں میں گھسنا چھوڑ دیا۔ اب وہ کچھ آزادی پسند ہو چلے تھے۔

ان کے دس بھائی بہنوں میں سے اکثر و بیشتر اللہ میاں کو پیارے ہو چکے تھے۔ باقی جو رہ گئے تھے، ان سے اور موٹو سے اکثر دھینگا مشتی رہتی۔ کبھی پٹ رہے ہیں تو کبھی پیٹ رہے ہیں۔ چونچیں ہیں کہ چل رہی ہیں —

خنجر کی طرح — مگر انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی — کبھی کسی کے سامنے سر خم نہیں کیا۔

ان کے ایک برادر بزرگ تھے (کیونکہ وہ دنیا میں پہلے تشریف لائے تھے)، جن کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ سر کے بل گھنڈی کھایا کرتے تھے (یا ناچا کرتے تھے)۔ موٹو کچھ دنوں تک ان کے اس دلچسپ کھیل کو دیکھتے رہے اور شاید اس سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے لیکن وہ کھیل ہی کیا جو ہمیشہ یکساں رہے؟

موٹو کو اپنے بھائی سے نفرت ہوگئی اور انہوں نے — وقتاً فوقتاً — ان کی اتنی مرمت کی کہ وہ جلد ہی جنت کو سدھارے۔

اب میدان میں موٹو ہی موٹو تھے — موٹو۔ "رستم زماں" — موٹو — "صاحبقراں"۔

ان کے ہمجولیوں کو ان سے ٹکر لینے کی تو کیا، ان کے ساتھ کھیلنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

ایک دن انہوں نے اپنی ماں کو (جسے وہ اب تک نہیں بھلا سکے تھے) کسی سے لڑتے دیکھا۔ فوراً اس کی مدد کو دوڑے — "غیں غیں غیں غیں" اور تھوڑی ہی دیر میں حریف دُم دبا کر تو نہیں اُٹھا کر بھاگتا نظر آیا، کیونکہ وہ بیچارا ایک سے تو لڑ سکتا تھا مگر دو سے نہیں — جبکہ دوسرا "موٹو" جیسا "پہلوان" ہو۔

(۶)

میری بہن اب موٹو کو پسند ہی نہیں کرتی تھی، چاہنے بھی لگی تھی، جسکا مظاہرہ وہ موٹو کو سب سے زیادہ کھلا پلا کر کیا کرتی۔

(۷)

موٹو اب ذرا جوان ہو رہے تھے۔

ان کی کلغی کافی بڑی ہو چکی تھی اور داڑھی لمبی۔ ڈیل ڈول بھی ماشاءاللہ خوب نکل آیا تھا۔ نسل کے اعتبار سے تو وہ منارکا تھے ہی۔ خاندانی رنگ کے بھی وہ حامل نظر آتے تھے۔ خاندانی رنگ سے مراد وہ رنگ ہے جو ان کے باپ دادا کا رنگ تھا یعنی جاکلیٹی رنگ۔ انہیں دیکھ کر یہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ وہ پورے مُرغ بن چکے ہیں لیکن ان کے سینہ کی طرف دیکھنے سے یہ شبہ زائل ہو جاتا تھا کیونکہ وہ ابھی اتنا چوڑا نہیں ہو پایا تھا جیسا انہیں "مرغ" کہلانے کا فخر حاصل ہو۔ اصل بات وہی تھی کہ موٹو پہلوان "آدمی" تھے (اگر کسی کو آدمی کا استعمال یہاں ناجائز معلوم ہو تو وہ اسے نکال سکتا ہے) اور ان کا جسم ان کی عمر سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ یہ چیز ان کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔

اپنے سکندر اعظم جیسے مضبوط جسم کی بنا پر ہی موٹو نے اب ہمجولیوں (یا بھائی بہنوں) کو چھوڑ کر بڑی عمر کے ساتھیوں کی طرف "خطرناک" نگاہیں ڈالنی شروع کر دیں۔ انہوں نے اس بھیڑ میں سے ایک "ایفیچی" کو دریافت کیا، جو اگرچہ ان سے عمر میں ایک ماہ بڑا تھا لیکن جسم کے اعتبار سے چھوٹا تھا — اگر اسے انہوں نے مار لیا تو پھر میدان صاف نہیں، ہموار تو ضرور ہو جائیگا۔ اور اس مریل سے ایفیچی کا مار لینا کیا مشکل تھا؟

موٹو کی یہ "دریافت" سوجھ بوجھ پر مبنی تھی۔ ان کے انتخاب کی داد جسقدر بھی دی جائے کم ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایفیچی کے بجائے کسی اور کڑیل جوان سے جنگ مول لیتے تو شاید انکی ہمت ٹوٹ جاتی اور اُن کا کیریر تباہ ہو جاتا۔

موٹو موقع کا انتظار کرنے لگے۔

ایکدن ایفیچی آنکھیں بند کئے ہوئے ایک ٹانگ پر کھڑا سوچ رہا تھا — موٹو نے اسے حیرت سے دیکھا — "آخر یہ فلاسفر کیا سوچ رہا ہے؟" انہیں ایفیچی کی یہ ادا بہت پسند آئی اور وہ خود بھی ایک "ٹانگ پر کھڑے ہوگئے اور ...

دفعتاً ان کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا "اسے یوں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر، آنکھیں بند کرکے سوچنے کا کیا حق ہے؟ — کیا یہ حرکت "اینٹی مرغ" نہیں — اور اگر ہے تو پھر وہ ہماری قوم کا باغی ہے، دشمن ہے۔ غدار ہے"۔

موٹو کی آنکھوں سے چنگاریاں تو نہیں نکلیں لیکن انکی چونچ نے اس "غدارِ قوم" کو آنکھیں کھولنے اور زمین پر دوسرا پیر ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

ایفیچی نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ دوسری بار زمین کی طرف — اور پھر اپنی پہلی حالت پر آگیا۔

اب کے موٹو نے اسکے اتنی زور سے چونچ ماری کہ وہ بلبلا اُٹھا — اور بلبلا کر اُس نے موٹو کی گردن پکڑ لی۔

بس — جنگ چھڑ گئی۔

اور پہلوان جی پینترے بدل بدل کر ایفیچی کا حلیہ "ٹائٹ" کرنے لگے۔ اس جنگ کا حشر معلوم نہیں کیا ہوتا، اگر ایفیچی کا بھائی "بدمعاش" دوڑ کر دونوں کو علیحدہ نہ کر دیتا۔

(۸)

میری بہن اینچی کی مرمت سے بیحد خوش ہوئی اور وہ موٹو کو اور زیادہ چاہنے لگی۔ اس دن اس نے موٹو کو تھوڑا سا حلوہ دیا جسے انہوں نے گردن ہلا ہلا کر کھا یا۔

(۹)

ایک ہفتہ بعد اینچی کہیں غائب ہوگیا یا غائب کر دیا گیا — اور موٹو نئے شکار کی تلاش میں لگ گئے۔

ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں بدمعاش کی شکل ایک "واقعی بدمعاش" کی حیثیت سے محفوظ تھی — ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو دو شخصوں کی لڑائی میں اپنی ٹانگ خواہ مخواہ اڑا لے، بدمعاش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

موٹو نے بدمعاش کے "ہر کلین جسم" کی طرف دیکھ دیکھ کر اپنے کو تولنا شروع کر دیا — اور آخر ایک دن، جب انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ میں اگرچہ جسمانی لحاظ سے کمتر ہوں لیکن حوصلہ بلند رکھتا ہوں اور فن سے بھی بخوبی واقف ہوں، تو بدمعاش کی طرف گھور کر بولے "غنں"۔

بدمعاش نے سوچا۔ "بچہ ہے۔ غوغاں کرتا ہے تو کرنے دو — میرا کیا جاتا ہے"۔

"غیں، غیں، غیں"

بدمعاش کو اب یہ "غوں غاں" کچھ ناگوار معلوم ہوئی۔ اور اس نے جواب میں ایک زوردار "گگڑوں کوں" کہا یعنی "چپ رہو۔ نہیں تو پٹ جاؤ گے"۔

موٹو نے کوشش کی کہ وہ بھی اتنے ہی زور سے چلّا کر "ککڑوں کوں" کہیں، لیکن انکے منھ سے صرف یہی نکلا "غو۔ غیں۔ غوں" — "سور۔ نالائق۔ گدھے"۔

یہ اعلان جنگ تھا — بالکل کھلا ہوا۔

بدمعاش نے سب سے پہلے وار کیا (ظاہر ہے کہ پہلا وار بہادر کرتے نہیں، سہتے ہیں) موٹو نے اس وار کو سہکر، امیر حمزہ کی طرح بدمعاش کو دوا ور موقع دئے کہ "نکال لو اپنی حسرت — میری چونچ کا گر پڑیگا تو تمہاری کھوپڑی میں سے بھیجہ نکل کر بہہ جائیگا"۔

چوتھا وار موٹو کا تھا، جس نے بدمعاش کی گردن سے خون نکالدیا۔ لیکن بدمعاش بہر حال بدمعاش ٹھہرا۔ اس نے بھی موٹو کی گردن نا پی اور تھوڑا سا خون نکالدیا — موٹو نے جھٹکا دیکر اپنی گردن چھڑالی اور

اب کے بدمعاش کے کچھ قیمتی پر نوچ لئے۔

یہ سلسلہ کچھ دیر اور قائم رہتا لیکن چند امن پسند "لیڈرز" نے بیچ میں پڑکے "سیز فائر" کرا دیا۔

(۱۰)

میری بہن کے دل پر موٹو کی بہادری کا نقش بیٹھ گیا۔ اور اس نے اس "پہلوان اعظم" کی خدمت میں اپنے حصہ کا میوہ (کشمش۔ بادام وغیرہ) پیش کیا، جسے انہوں نے ہزاروں شکریہ کے بعد قبول کر لیا۔

(۱۱)

موٹو "سیز فائر" کے کچھ ایسے زیادہ قائل نہ تھے لیکن چونکہ بدمعاش کی طاقت کا انہیں صحیح صحیح اندازہ ہو چکا تھا، اسلئے اب وہ خواہ مخواہ اسے چھیڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی "پولیٹیکل حالات" خراب ہو رہے تھے اور شاہجہاں نے انکا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ یہ شاہجہاں ان کے "ہیڈ آف دی فیملی" تھے جو اپنی "نور جہاں" کے سوا کسی اور کو نہ دیکھ سکتے تھے نہ سنبھال سکتے تھے۔

موٹو کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ شاہجہاں کے خلاف ایک مضبوط مورچہ قائم کرنا چاہئے۔ لیکن اکیلے تو مورچہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے چند ساتھیوں کا ہونا ناگزیر ہے اور ان کا از قسم "مرد" ہونا بھی لازمی ہے لیڈرز کو توڑ کر "ففتھ کالم" بنانے کا کام بعد میں انجام دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ موٹو نے اس پہلو سے سوچنا شروع کیا — ان کے سامنے یہ دیکر دو ہی نام آتے۔ بدمعاش اور عالیجاہ، کیونکہ ان کے علاوہ کوئی اور "مرد" نظر نہیں آتا تھا۔ بیویوں میں سے اولاً تو کوئی اس قابل ہی نہیں تھا کہ ایسی خطرناک مہم میں حصہ لے سکے اور دوئم انکی صنف ابھی تک "نامعلوم" تھی۔ کہیں غلطی سے "صنف نازک" کو فوج میں بھرتی کر لیا تو ہو سکتا ہے کہ عین میدان جنگ میں وہ شاہجہاں کی نور جہاں بننے پر راضی ہو جائے اور موٹو کو شکست ہو جائے۔

تو موٹو کے ساتھی اگر بن سکتے تھے تو بدمعاش اور عالیجاہ لیکن بدمعاش سے ابھی ابھی جنگ ہو چکی تھی — اور عالیجاہ کو اُن سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا کیونکہ وہ "عالی جاہ" تھے اور مزاج شاہانہ پایا تھا۔ جنگ وجدال سے ہمیشہ گریز اختیار کرتے تھے بلکہ نفرت۔

موٹو نے فیصلہ کیا کہ عالیجاہ بالکل نکما ہے۔ اسے اسکے حال پہ

چھوڑ دیا جائے البتہ بدمعاش سے ہر قیمت پہ صلح کرلی جائے۔
یہ فیصلہ موٹو کے "ڈپلومیٹ" ہونے کا بیّن ثبوت تھا۔ پہلوانی اور ڈپلومیسی کو بہت کم یکجا دیکھا گیا ہے۔ موٹو اس اعتبار سے (الیگزانڈر ڈیوما کی ایک ناول PORTHOS اور ARAMIS) کے کردار کا مجموعہ تھے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ بدمعاش سے صلح کیونکر کی جائے۔ ظاہر ہے کہ بدمعاش تو ایک بدمعاش تھا، دوسرے موٹو سے لڑ کر ان کے خلاف ہو چکا تھا۔

موٹو نے اسکی ایک تدبیر نکالی۔

ایک دن بدمعاش جاڑے کی دھوپ میں لیٹا ہوا سو رہا تھا، موٹو چپکے سے اسکے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور بیٹھ کر اسکے پیروں کو اپنی چونچ سے کھجانے لگے۔ بدمعاش نے آنکھیں کھول کر موٹو کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ موٹو کو اپنی اسکیم کامیاب ہوتی نظر آئی اور انہوں نے اسکے پر کھجاتے ہوئے کہا "عیں" ــــ بھائی صاحب معاف کردو ــــ

"غیں" ــــ اب ایسی غلطی نہ ہوگی ــــ "غیں" ــــ تم تو ہمارے دوست ہو۔ بھائی ہو ــــ

موٹو کی اس "عس عیں" پہ پتھر کا دل ہوتا تو وہ بھی پسیج جاتا بدمعاش کا دل تو پھر گوشت کا تھا۔

"کک" ــــ معاف کردیا ــــ "کک" ــــ آج سے ہم تم دوست "کک" ــــ آؤ اس کمبخت شاہجہاں کو مل کو پیٹیں۔

"غیں۔ غوں۔ غاں" موٹو خوشی کے مارے اچھل کر دوڑنے لگے۔ اور پھر آکر بدمعاش کے جسم سے جسم ملا کر لیٹ گئے

(۱۲)

موٹو کی اس "چالبازی" کا اثر میری بہن پر یہ ہوا کہ وہ اسے میٹھے دودھ میں روٹی بھگو کر دینے کی تیاریاں کرنے لگی

(۱۳)

عالیجاہ ایک دعوت کی نذر ہو گئے، جسکا کسی کو افسوس نہیں ہوا بلکہ موٹو اور بدمعاش نے امیر خوشی کا اظہار کیا ــــ

یہ دونوں مچان پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ــــ اور اندر ہی اندر مسکرا رہے تھے ــــ "چلو ایک حریف تو کم ہوا" اگرچہ ممکن ہے ــــ کون جانے، شاہجہاں کے بعد وہ جہاں پناہ بن جاتا تو؟

یکایک بدمعاش نے مچان سے چھلانگ ماری ــــ موٹو نے دیکھا، وہ نور جہاں کے اوپر جا کے گرا ــــ نور جہاں جو شاہجہاں کی سب سے چہیتی بیوی تھی۔

اب کیا ہوگا؟ ــــ موٹو خوفزدہ ہو گئے۔ غالباً شاہجہاں بدمعاش کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دے گا۔

لیکن بدمعاش نے فوراً کہا "کک کک کک" ــــ معاف کرو میڈم ــــ غلطی ہوئی۔

"کوں کوں کوں" ــــ موئے تو اندھا ہے کیا؟۔

"کڑک کڑک کڑک" ــــ ٹھہر تو جا ــــ بدمعاش ــــ تیری کیسی درگت بناتا ہوں ــــ شاہجہاں نے دوڑتے ہوئے کہا۔

لیکن بدمعاش نے بھاگ کر ٹاپے میں پناہ لی۔

شاہجہاں کے چلے جانے کے بعد بدمعاش اپنی پناہ گاہ سے نکلا ــــ موٹو مچان سے نیچے اتر کر اسکے پاس کھڑے ہو گئے۔

"غیں" ــــ جان بچی لاکھوں پائے۔

"کک" ــــ یار نور جہاں بڑی اچھی ہے۔

"عیں عوں" ــــ توبہ کرو، توبہ ــــ دوسرے کی بیوی کو بُری نگاہ سے دیکھنا حرام ہے۔

"کک کک" ــــ جا بے چھوکرے ــــ تو کیا جانے ان باتوں کو۔

اور پھر بدمعاش کی نگاہ دوشیزۂ وقت، حسینۂ عالم، بدآمی پر پڑی ــــ اس نے دوڑ کر اس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "کک" ــــ مس۔ تم میری بیوی بن جاؤ ــــ میں بہت اچھا شوہر ثابت ہونگا۔

"کوں" ــــ چل ہٹ ــــ میں ابھی دیکھ چکی ہوں۔

"کک" ــــ کیا دیکھا ہے۔ مس۔

"کوں کوں" ــــ تیری پارسائی، تیری پاکبازی۔

"کک کک کر" ــــ میں قسم کھاتا ہوں ــــ شادی کے بعد تمہارے سوا کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔

"کوں" ــــ چل چل ــــ بڑا آیا ہے "وہ" ــــ

بدمعاش موٹو کے پاس مایوس لوٹ آیا۔

موٹو نے کہا "غیں" ــــ عشق سے بہتر روٹی ہے ــــ "غیں" ــــ چلو باورچی خانے کی طرف

اور بدمعاش نے باورچی خانے کے دروازے پہ کھڑے ہو کر

کہا "ککڑوں کوں" ــــ دروازہ کھولو ــــ کھانا دو۔

"غوغیں" ــــ ہم آگئے ــــ لاؤ کھانا ــــ میوہ وغیرہ۔

باورچی خانہ کا دروازہ کھلا اور روٹی کے چند حسین ٹکڑے سامنے آگئے۔ موٹو نے اپنی چونچ بڑھا کر ایک ٹکڑے کو حاصل کرنا چاہا تھا کہ حملا بچہ پڑا۔

"کک کک" ــــ میرے سامنے تمہاری یہ مجال چلے جاؤ یہاں سے۔

"غوں غوں" ــــ بھائی صاحب میں تو آپ کا غلام ہوں۔ آپ کا بچا کھچا کھا لوں گا۔

"کک" ــــ میں کچھ نہیں چھوڑوں گا ــــ "کک" ــــ ایسا کرنا گناہ ہے ــــ "کک" ــــ "چلے جاؤ۔ نہیں نوجوان سے مار دوں گا"۔

موٹو غریب اپنا سا منہ لیکر مچان کی طرف لوٹ آئے ــــ یہ کیسا درست ہے جو کھانے کے وقت دوستی کو بھول جاتا ہے؟

اب کیا کیا جائے؟ موٹو سوچنے لگے ــــ سوچتے سوچتے انہیں ایک راہ نظر آئی۔ ایک تدبیر سوجھی ــــ اور وہ شام کا انتظار کرنے لگے۔

شام کو جب تمام ساتھی دربے کی طرف ہنکائے جاتے تھے تو موٹو نے "نان کو آپریشن" کر دیا اور دربے میں جانے سے قطعی انکار کر دیا، بلکہ آنگن میں "ایک سو گز کی دوڑ" کا سا نقشہ پیش کر دیا ــــ اس غیر معمولی واقعہ کی وجہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ چنانچہ یہ تجویز کیا گیا کہ انہیں کچھ اور کھانے کو دیا جائے۔

موٹو کا مقصد پورا ہو گیا اور انہوں نے ڈٹ کر کھایا اور شام کے اس عمل کو اپنی گرہ میں باندھ لیا کہ اس طرح روزانہ بلا خوف شرکت کھانا کھایا جا سکتا ہے۔

کھانے سے سیر ہو کر وہ دربے میں از خود داخل ہو گئے۔ یہ دربہ دراصل پرانا باورچی خانہ تھا جس میں ایک مچان بنا ہوا تھا یہ وہی مچان تھا جس پر موٹو اور بدمعاش ایک ساتھ بیٹھتے تھے ــــ موٹو نے دیکھا بدمعاش ان کے ساتھ مچان کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ بدمعاش کو دیکھتے ہی موٹو کو باورچی خانہ والی بات یاد آ گئی ــــ اور انہیں غصہ آ گیا ــــ وہ غصہ میں اٹھ کر سیدھے بدمعاش کے سر پر گرے اور اس کے دم میں سے کچھ اور ہوش گم کر دیے۔

"کو کک کک" ــــ ارے کیا کرتا ہے ــــ کیا کرتا ہے؟

"غیں غوں" ــــ کچھ نہیں بھائی صاحب ــــ آپ کے دم کی مشق کر رہا ہوں۔

(۱۴)

میری بہن کو موٹو کی ان "مہمات" کی خبر نہ تھی ورنہ شاید وہ انہیں باجرہ کا ملیدہ کھلاتی جس میں بہت سے خالص گھی کا پڑا ہونا یقینی تھا۔

(۱۵)

موٹو اور بدمعاش کے درمیان اب "کولڈ وار" ہو رہی تھی۔

ایک دن باورچی خانہ کا دروازہ ذرا سا کھلا دیکھ کر موٹو اندر داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے بدمعاش آ رہا تھا ــ وہ بھی دروازہ کو کھلا دیکھ کر داخل ہو گیا۔ دونوں نے ملکر کھانے کی چیزیں تلاش کرنی شروع کر دیں مگر کوئی چیز ہاتھ نہیں لگ رہی تھی کیونکہ ہر ظرف "معاملہ" بند پڑا ہوا تھا۔ البتہ چند چھوٹے برتن تھے جن کے اوپر چڑھ چڑھ کر انہوں نے بچا کھچا کھایا۔ برتنوں کی کھڑ کھڑ نے انکی موجودگی کا بھانڈہ پھوڑ دیا اور باہر سے ایک ڈانٹ پڑی ــــ "لطو" ــــ موٹو اس "ٹلو" کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ وہ چپکے سے باہر نکل آئے لیکن بدمعاش ابھی بدمعاشی میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ کسی نے باورچی خانہ کا دروازہ کھول کر زور سے کہا "نکل بدمعاش یہاں سے" ــــ بدمعاش گھبرا گیا اور گھبرا کر باورچی خانہ میں دوڑنے لگا اور اسی دوڑ میں اس نے اپنا ایک پیر جلتے ہوئے توے پر رکھ دیا جو ابھی جانے کے لئے اوندھا پڑا ہوا تھا۔

"ککو کلا ککو" ــــ یہ جلتا ہوا کالا لوہا کیسا ہے ــــ "کک" ــــ مجھے راستہ دو ــــ اور اسے نکلنے کے لئے راستہ دیدیا گیا۔

باہر نکل کر بدمعاش نے اپنے پیر میں تکلیف محسوس کی اور اسے اوپر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اور جب اسکے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ایک ٹانگ سے چل کر اپنے دوست موٹو کے پاس پہنچا اور بولا "کک" ــــ دیکھو ــــ یہ کیا ہو گیا ہے؟

"غیں" ــــ تمہارے کئے کی سزا۔

"کک" ــــ چپ رہو۔

"غیں غوں" ــــ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ شریفوں کی طرح نکل چلو۔"

"کک" ــــ کب کہا تھا میں نے؟ ــــ "کڑ" ــــ جھوٹے کہیں کے ــــ

"کک" ــــ میں تمہیں اس جھوٹ کی سزا دوں گا ــــ

"کک" ــــ آ جاؤ ــــ مقابلہ میں۔

لیکن موٹو ٹال گئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ خود مر رہا ہے۔ اسے مارنے

سے کیا فائدہ؟

کئی دن تک بدمعاش کے پیر کی مرہم پٹی کی گئی اور اس دوران میں وہ اپنی بدمعاشی بھول گیا۔

موٹو بدمعاش کے اس عارضی "ریٹائرمنٹ" سے بہت خوش ہوئے تھے۔ لیکن جب وہ اچھا ہو کر دوبارہ بدمعاشیاں کرنے لگا، اور پہلے سے بھی زیادہ، تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ لیکن کھل کر وہ لڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ مصلحت کا تقاضہ یہی تھا ——— کون جانے، کب اور کس وقت شاہجہاں کے خلاف کارروائی کا موقع مل جائے۔ اس وقت بدمعاش کی مدد کی اشد ضرورت ہو گی!

موٹو کو اچانک بدمعاش کی گوشمالی کا ایک نادر موقعہ ہاتھ آیا۔ سامنے بدمعاش "غسل خاکی" میں مشغول تھا۔ یہ غسل خاکی ایک چھوٹے سے گڑھے میں ہو رہا تھا۔ بدمعاش اپنے پنجوں سے مٹی کرید کرید کر اپنے اوپر ڈال رہا تھا۔ اور جب کافی مٹی ڈال لیتا تو جسم کو زور زور سے ہلاتا اور مٹی نیچے گر پڑتی۔

موٹو بھی بظاہر غسل میں مصروف ہو گئے لیکن اس طرح کہ کبھی وہ بدمعاش کے اوپر چڑھ جاتے کبھی بدمعاش کو دھکے دیکر ہٹا دیتے کبھی اسکے پیٹ میں ٹھوکے دیتے۔ کبھی اس کی آنکھوں میں خاک ٹھونکتے کبھی اسکے پر نوچ لیتے اور کبھی اسکے کان کھینچ لیتے۔

بدمعاش غسل کرنا بھول گیا اور اس "بلا" سے دور بھاگ گیا۔

یہ موٹو کی فتح تھی۔ ——— موٹو نے "کولڈ وار" جیت لی۔

(۱۶)

میری بہن کھکھلا کر ہنس دی۔ بات ہی ایسی تھی۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔

(۱۷)

شاہجہاں، بدمعاش، نورجہاں اور بدنامی وغیرہ بیچ دیے گئے۔ صرف ایک موٹو اور موٹی رہ گئے۔ موٹی نام تھا ایک "مرغی" کا جو کھا کھا کر "حمیدہ پہلوان" ہو رہی تھی۔

موٹو کے لئے یہ حادثہ المناک ثابت ہوا کیونکہ اب وہ لڑیں تو کس سے لڑیں اور ڈریں تو کس سے ڈریں؟

"لیڈیز" کا وہ بہت احترام کرتے تھے ——— اس لئے ان سے لڑنے کا سوال تھا نہ ڈرنے کا۔

موٹو متفکر رہنے لگے۔

رات کو وہ اکثر موٹی سے سوال کرتے ——— "غیں۔ غاں۔ غوں" ——— یہ سب کہاں چلے گئے۔ ——— اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ ——— اور میں تمہارے ساتھ کیوں ہوں؟ ——

موٹی کہتی ——— "کوں کوں کوں" ——— میں کیا جانوں ——— اور میں جاننا بھی نہیں چاہتی ——— اور دیکھو آئندہ اس قسم کے سوالات مت کرنا۔

موٹو انہیں تفکرات میں یکبارگی جوان ہو گئے، اور "غیں غوں غاں" کی بجائے "ککوں کوں" کہنے لگے، جو آہستہ آہستہ "ککڑوں کوں" میں تبدیل ہو گیا۔

اور جب جوانی آتی ہے تو "مہ جبینوں" کا راز بھی کھلتا ہے چنانچہ موٹو پر بھی "موٹی" کی حقیقت آشکارا ہو گئی۔

لیکن موٹو تھے بہت ہی مہذب اور شائستہ ——— وہ کسی موٹی کی خاطر اپنی عزت و شرافت پر بٹہ نہیں لگا سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے موٹی کی خدمت میں خاموشی سے ایک عرضی پیش کی کہ "میڈم" اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو مجھے اپنا خادم بنا لیں۔ میں دُنیا کے تمام کیڑے مکوڑے پکڑ پکڑ کر آپ کو کھلاؤں گا" ——— مگر میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوئی توجہ نہیں کی۔ "کوئی لفٹ" نہیں دیا۔

موٹو نے سوچا، قول سے عمل بہتر ہے۔ اسلئے جہاں بھی انہیں کوئی کیڑا نظر آتا۔ اسے چونچ میں دباتے اور کڑ کڑا کڑ کڑا کر موٹی کو بلاتے اور جب وہ آجاتی تو اسکے سامنے یہ "پلاؤ" رکھ کر چند قدم ہٹ کر "دست بستہ" کھڑے ہو جاتے ——— اور موٹی کی طرف یوں دیکھتے گویا کہ پوچھ رہے ہوں کہ "حضور۔ اس خادم کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟"

موٹی پلاؤ چٹ کر کے چل دیتی ——— اور موٹو اسکا مُنہ دیکھتے رہ جاتے۔

موٹو اس "کورٹ شپ" سے تقریباً دستکش ہونے والے ہی تھے کہ انہیں ایک اور اُمید نظر آئی۔

انہوں نے دیکھا موٹی چھپنے کی کوشش کر رہی ہے مگر اسے چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں مل رہی ——— غالباً موٹی کی عقل بہت موٹی تھی۔ پھر کیوں نہ اسکی مدد کر کے اس سے "ہاں" کہلوایا جائے؟

موٹو نے فوراً دڑبے میں داخل ہو کر ٹاپے کی آڑ میں بیٹھ کر موٹی کو بلانا شروع کر دیا ——— موٹی نے آتے ہی پوچھا "کوں" ——— "مگر دوستے"

تو کیوں چھپ کر بیٹھا ہے؟ — "کوں" — کیا تجھے انڈا دینا ہے؟ — "کوں" — کیا تو میرے برابر ہو سکتا ہے؟ —

موٹو شرما کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "ککڑ دوں کوں" — میڈم میں نے تو آپکے بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کی ہے —

"کوں کوں" — کیا تو مجھے اب انڈا دینا سکھائیگا؟ کیا تو مجھے اتنا گیا گذرا سمجھتا ہے کہ میں اس کام کے لئے اپنی عقل بھی نہیں استعمال کر سکتی؟ — "کوں" — چل دور ہو — "کوں" — میرے پیٹ میں زور سے درد ہو رہا ہے —

موٹو دربے سے باہر نکل آئے اور غصہ اور شرم کے مارے انہوں نے اپنی چونچ اپنے پروں میں چھپا لی —

جب ذرا موڈ کچھ ٹھیک ہوا تو موٹو نے اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا — اور جتنا ہی وہ غور کرتے "انہیں" فرار سے بہتر کوئی راستہ نظر نہ آتا — تو کیا پھر فرار اختیار کروں؟ نہیں — تو کیا پھر فرار اختیار کروں؟ نہیں نہیں — تو کیا پھر میں بھاگ جاؤں؟ نہیں نہیں نہیں — تو کیا پھر میں چلا جاؤں؟ احمق کہیں کے سو بار نہیں — تو کیا پھر میں ہٹ جاؤں؟ گا وودی — نہیں — الو — نہیں — گدھے — نہیں —

اچانک موٹی کی زوردار آواز آئی — "کڑ کڑ کڑاک — کڑ کڑ کڑاک" — دیدیا انڈا — دیدیا انڈا — دیدیا انڈا —

موٹو کو جانے کیوں یہ خواہش ہوئی کہ چل کر موٹی کی خیریت معلوم کریں — اس خواہش کو وہ دبا نہ سکے اور دربے میں دوبارہ داخل ہو گئے انہوں نے دیکھا موٹی گردن فخر سے اونچی کئے ہوئے کہہ رہی ہے "دیدیا انڈا — دیدیا انڈا"

موٹو نے سینہ تان کر گردن پھلا کر حلق پھاڑ کر، پر پھٹ پھٹا کر کہا — "ککڑوں کوں" — خدا کا شکر ہے میڈم نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا — میڈم ہر روز زندہ رہیں اور ہر دن میں دوبار انڈا دیں — "ککڑوں کوں" — میڈم بہت اچھی ماں ہیں — "ککڑوں کوں" — میڈم کو اب ایک اچھی بیوی بننے کی ضرورت ہے —

مگر میڈم دربے سے نکل کر بھاگ چکی تھیں اور اپنی "اجرتِ مادرانہ" روٹی کے ٹکڑوں کی شکل میں وصول کر رہی تھیں —

موٹو کا جوش یکبارگی ٹھنڈا ہو گیا —

تو کیا میں یہاں سے چلا جاؤں؟ — آہ کیوپڈ! تو نے یہ کیا کیا؟ — تیری قسم میں یہی چونچ کا خنجر اپنے سینہ میں بھونک لوں گا — مجنوں کی قسم —

میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا — فرہاد —

دفعتاً موٹو کو موٹی کی آواز پھر سنائی دی — اُسکے اس آواز میں بلاوا تھا — "کوں کوں کو" — مجھے بچاؤ — مجھے بچاؤ —

موٹو دوڑ کر موٹی کے پاس پہونچے اور پہونچتے ہی انہوں نے اس ہاتھ پر ایک وار کیا جو موٹی کو پکڑے ہوئے تھا — لیکن گرفت اور مضبوط ہو گئی اس پر موٹی چلائے "کڑ کڑ کڑ — کوں" — چھوڑ ظالم — چھوڑ بھی دے —

اب کے موٹو نے ایسا وار کیا کہ موٹی "ظالم ہاتھ" سے چھوٹ کر بھاگ نکلی — موٹو موٹی کے پیچھے دوڑے — انہیں امید تھی کہ اس بہادری کا صلہ ملیگا — لیکن جب موٹی نے کہا "کوں کوں، کڑک" — میرے قریب مت آؤ — مت آؤ، تو موٹو کا منہ لٹک گیا اور وہ زمین پر جھک کر اپنی قسمت کو کوسنے لگے —

(۱۸)

اور میری بہن اپنے ہاتھ کو سہلا رہی تھی — اور موٹو کو پیار بھرے لہجہ میں برا بھلا کہہ رہی تھی —

(۱۹)

موٹو دن بدن دبلے ہونے لگے — انہیں غم عشق کھائے جا رہا تھا —

اور ایک دن وہ سخت بیمار ہو گئے — وہ آنکھیں بند کئے ہوئے ایک ہی جگہ پر گھنٹوں بیٹھے رہتے — اور جب کھانا دیا جاتا تو ایک آدھ دانہ ٹونگ کر رہ جاتے —

موٹو کا علاج شروع ہوا — جانوروں کے اسپتال سے انکے لئے دوائیں آئیں جو انکے منہ کو کھول کر کاسنہ ٹیل کے ذریعہ پیٹ میں اتاری جاتیں — لیکن علاج بیسود ثابت ہوا اور موٹو کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی — موٹو اکثر آنکھیں کھول کر ادھر ادھر کسی کو ڈھونڈتے اور اسے اپنے قریب نہ پا کر پھر آنکھیں بند کر لیتے —

انکی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی — اور آخر میں دوائیں اگلنا شروع کر دیں — اب ان کا وقت قریب آ چکا تھا — ہاں بالکل قریب —

اور ایک رات موٹو کی سانس اکھڑ گئی — اکھڑ کر بند ہو گئی — اور انکی روح انکی چونچ کی راہ نکل گئی — اور اس طرح دنیا کا ایک "عظیم پہلوان" — دنیا کا ایک "عظیم سیاست داں" — دنیا کا ایک "عظیم عاشق" دنیا سے رخصت ہو گیا —

(۲۰)

اور میری بہن نے اپنے پیارے موٹو کا ماتم پورے چالیس دن تک کیا — افسوس! موٹو کو اس "عظیم محبت" کا علم نہ ہو سکا، جو میری بہن کے دل میں موجزن تھی —

مصنّف :۔ جان بنیان (John Bunyan)
مترجم :۔ جادہ پیما

مُسَافِر

(John Bunyan کی مشہور تصنیف Pilgrim's Progress کا ترجمہ اسلامی افکار کے پیرایہ میں)۔

(۲)

اور اب وہ افسوس کرنے لگا کہ اس نے کیوں عاقل دنیا پرست کی نصیحت پر عمل کیا۔ اور افسوس اس نے دیکھا کہ خضر اس سے ملنے آ رہا ہے جس پر نظر پڑتے ہی شرم کے مارے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ آہستہ آہستہ خضر اس کے قریب آتا گیا اور آ کر اس نے مسلم کو دیکھا۔ خضر کے چہرہ پر سختی اور غضب کی علامات تھیں۔ اس نے مسلم سے اس طرح بحث شروع کی :۔

مسلم :۔ بالکل ٹھیک۔ میں وہی آدمی ہوں۔

خضر :۔ کیا میں نے تجھ سے سامنے والے چھوٹے دروازے کی طرف جانے کو نہیں کہا تھا ؟

مسلم :۔ کہا تھا۔

خضر :۔ تو پھر یہ کیسے ہوا کہ تو اسی جلد بھٹک گیا ؟

مسلم :۔ جب میں "بیدلی کی دلدل" سے نکل کر چلا تو مجھے جلد ہی ایک آدمی ملا جس نے صلاح دی کہ مجھے اس سامنے والے گاؤں میں ایک آدمی مل جائے گا جو مجھے بوجھ سے نجات دلا دے گا۔

خضر :۔ وہ کون تھا ؟

مسلم :۔ وہ صورت سے شریف آدمی لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت باتیں کیں اور آخر میں اس کے کہنے میں آ گیا اور ادھر چل پڑا۔ لیکن جب اس پہاڑی کے قریب پہنچا اور دیکھا کہ یہ تو میرے سر پر لٹک سی رہی ہے تو میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ کہ کہیں یہ میرے سر پر نہ گر جائے۔

خضر :۔ اس آدمی نے تم سے کیا کہا تھا ؟

مسلم :۔ ہاں ! اس نے پوچھا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میں نے اسے بتا دیا۔

خضر :۔ اور پھر اس نے کیا کہا ؟

مسلم :۔ اس نے پوچھا کیا میرے بیوی بچے ہیں اور میں نے بتا دیا لیکن میں نے کہہ دیا کہ میری پشت پر اتنا بوجھ ہے کہ میں پہلے کی طرح ان میں دلچسپی نہیں پاتا۔

خضر :۔ اور پھر وہ کیا بولا ؟

مسلم :۔ اس نے کہا کہ جلد از جلد تم اس بوجھ سے اپنا پیچھا چھڑاؤ اور میں نے کہا کہ یہ تو میں چاہتا ہی ہوں۔ اور اسی لئے سامنے والے دروازہ کی طرف جا رہا ہوں تاکہ وہاں سے نجات کا راستہ معلوم ہو سکے۔ اس نے یہ کہا کہ میں تمہیں اس سے بہتر راستہ بتاؤں گا۔ جو مختصر بھی ہے اور دوسرے اس میں دقتیں بھی نہیں ہیں۔ جتنی آپ کے بتائے ہوئے راستہ میں ہیں۔ سب اس نے راستہ معلوم کرنے کے لئے اس آدمی کی طرف بھیجا جو بوجھ سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور میں نے اس پر یقین کر لیا۔ اور اپنے راستہ سے مڑ کر ادھر آ گیا کہ شاید زیادہ جلد میں اس طرح بوجھ سے نجات پا جاؤں۔ لیکن جب میں یہاں پہنچا۔ اور چیزوں کو نزدیک سے دیکھ کر اصلیت پائی تب خوف کے مارے میرے قدم رک گئے۔ اور اب میں یہاں کھڑا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ تب کچھ دیر خضر خاموش رہا اور پھر بولا "آ میں تجھے کلام الٰہی دکھاؤں"۔ جس پر مسلم کھڑا کھڑا تھرتھراتا رہا۔

پھر خضر نے دکھایا۔ مفہوم کچھ ایسا تھا کہ سچے لوگ ایمان پر قائم رہیں گے لیکن اگر کوئی اس سے پھرے گا تو اس کے لئے نارِ جہنم ہے جہاں اُسے ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہو گا۔

تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے کتاب ہدایت عطا کی گئی ہے جو فلاح کی ضامن ہے۔ اسے ہرگز نہ جھٹلانا۔ ورنہ تو عذاب سے بچنے کی کوئی راہ نہیں پائے گا۔"

پھر اس نے اس طرح سمجھایا۔ "تو وہ شخص ہے جو اس مصیبت میں مبتلا ہو رہا ہے تو اپنے رب کے احکام سے منہ موڑنے لگا ہے اور سلامتی کے راستہ سے پیچھے پلٹنے لگا ہے اور تباہی کا خطرہ مول لے لیا ہے۔"

تب مسلم اس کے قدموں پہ بے حال ہو کر گر پڑا۔ اور چلانے لگا۔

"ہائے میں کتنا بدبخت ہوں، میں تباہ ہو گیا۔"

یہ دیکھ کر خضر نے یہ کہتے ہوئے اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیا۔ "توبہ کرنے سے آدمی کے گناہ اور خطائیں معاف کر دی جائیں گی۔ ایمان کا دامن نہ چھوڑ، ایمان پر مضبوطی سے جما رہ۔"

تب دوبارہ مسلم کی جان میں جان آئی۔ اور لرزتا کانپتا خضر کے سامنے پہلے کی طرح آ کر کھڑا ہو گیا۔

پھر خضر نے مزید کہنا شروع کیا:۔

"میری ان باتوں کو پوری توجہ سے سن جو کہنے والا ہوں۔ اب تجھے بتاؤں گا کہ وہ کون تھا جس نے تجھے گمراہ کر دیا۔ اور وہ کون شخص ہے جس کے پاس تجھے اس نے بھیجا تھا۔ وہ آدمی جو تجھ سے ملا تھا ایک شخص غافل نام کا ہے جس کا لقب خواجہ دنیا پرست ہے۔ اور یہ لقب اسے بالکل ٹھیک ہی ملا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ اس کی نظر اس دنیا تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسجد کا رخ بھی کرتا ہے تو اخلاق آباد جاتا ہے (یعنی ادب اور اخلاق کا یہی اصول اسے مسجد کی طرف آنے پر مجبور کرتا ہے) اور کچھ اس لئے کہ اس کی نظر ہی محدود نہیں بلکہ اس کا دل بھی اپنے اس اصول کی محبت میں سب سے زیادہ گرفتار ہے۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ یہ محبت اسے ان قربانیوں سے دور رکھتی ہے جو سچے ایمان والوں کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اسکے ذہن میں دنیا پرستی رس بس گئی ہے اس لئے وہ میرے بتائے ہوئے سیدھے راستے سے لوگوں کو گمراہ کر دینے کے حیلے تلاش کرتا رہتا ہے۔

اب دیکھ تین چیزیں اس آدمی کی ایسی ہیں جن سے تجھے نفرت کرنی چاہیئے۔

۱۔ اس کا راستہ سے بھٹکا دینا۔

۲۔ سیدھے راستے کو پُرپیچ ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔

۳۔ تیرے پاؤں اس راستے پر ڈال دینا جو تباہی کی قلمرو میں لے جاتا ہے۔ پہلے تجھے اس کے راستہ سے بھٹکا دینے پر نفرت کرنی چاہیئے اور اپنے صلاح لینے پر بھی۔ کیونکہ یہ تو خدا کے احکام پر ایک دنیا پرست کی صلاح کو ترجیح دینا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ صراط مستقیم پر چل کر اس کی مدد کا طالب ہو جس کی میں نے تجھے صلاح دی تھی۔ کیونکہ صراط مستقیم وہ ہے جو ابدی زندگی کی طرف لے جاتی ہے کم لوگ ہیں جو اسے پا لیتے ہیں۔ اس سامنے والے دروازے سے اور سیدھے راستہ سے تجھے اس شیطان صفت آدمی نے بھٹکا دیا تاکہ تو اپنی تباہی کو خود دعوت دے۔ لہذا تف ہے اس کے بھٹکانے پر اور تیرے بھٹکنے پر۔

دوسرے اس نے سیدھے راستے کو پُرپیچ ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے اس پر نفرین کرنا چاہیئے اس لئے کہ اسے تو تجھے قارون کے خزانے سے زیادہ عزیز رکھنا ہے۔ اسکے علاوہ ہادی اعظمؐ نے یہ جو کہا ہے کہ جو اپنے باپ، یا ماں اپنی بیوی، بچے، بھائی، بہن اور خود اپنے آپ سے زیادہ اُسے نہیں چاہے گا وہ اسکا سچا پیرو نہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ آدمی جو تجھے اس دلیل سے بہکانے کی کوشش کرتا ہے کہ اسمیں جان کا زیاں ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ موت کے بغیر تجھے ابدی زندگی نہیں مل سکتی ——اس نظریہ پر تجھے نفرین کرنی چاہیئے

تیسرے تجھے جادۂ حق سے قدم ہٹا کر اسکے ایسی راہ میں ڈال دینے پر لعنت بھیجنی چاہیئے جو تباہی کی قلمرو میں لے جاتا ہے۔ اور اس کے لئے تو اسی بات پر غور کر لے کہ اس نے تجھے کس کے پاس بھیجا۔ اور جس کے پاس بھیجا وہ خود کتنا بے بس ہے اس معاملے میں۔

وہ شخص جس کے پاس اس نے تجھے نجات و آرام کے لئے بھیجا تھا۔ قانون پسند اس کا نام ہے ایک لونڈی کا بیٹا ہے جو خود مع اپنی اولاد کے اس مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے۔ تجھے کیا نجات دلائے گی۔ اس لئے سمجھ لے کہ قانون پسند سے نجات دلانے کی توقع فضول ہے۔ کوئی آدمی اس کے ذریعہ سے بوجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ اور نہ پانے کی توقع ہے۔ تیرا اقدام قانون الہٰی کے مطابق نہیں۔ اس لئے کہ جیتے جی اس بوجھ سے کب چھٹکارا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

[illegible] کی آزمائشوں کے بیچ سے جدوجہد کا راستہ جاتا ہے یہی راستہ رضائے الٰہی کی طرف لے جائے گا۔

اس لئے خواجہ دُنیا پرست دھوکے باز ہے اور قانون پسند لگا رہی۔ اور اسکا لڑکا جسکے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ رہتی ہے دل درجہ کا ریاکار ہے۔ وہ بھی تجھے کوئی مدد نہیں دے سکتا۔ یہ یقین کر یہ جو شور و غوغا ہے اسکی حقیقت اندر سے کچھ نہیں۔ نشہ میں چور شرابیوں کی طرح ان لوگوں نے یہ جو شور مچا رکھا ہے اسکا مقصد تجھے دھوکا دیکر سیدھے بتلائے ہوئے راستے سے ہٹا دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس کے بعد خضر نے اپنی باتوں کی تصدیق کے لئے آسمان کی طرف مُنہ کرکے پکارا۔ اسپر غیب سے ایک ندا آتی ہوئی محسوس ہوئی اور پہاڑی میں سے شعلے نکلے جن کے درمیان مسلم کھڑا تھا۔ اس سے اسکا رونگٹا کھڑا ہوگیا۔ غیب کی ندا کچھ اس طرح کی تھی۔۔

"جس نے کتابِ ہدایت کے احکام سے روگردانی کی اور اس بغاوت پر قائم رہا اس کے لئے عذاب عظیم ہے اور دوزخ کی ہولناکیاں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔"

اب مسلم کو اپنی بیاہی کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ آہ وزاری کرنے اور چلانے لگا اس وقت کو بھی کوسنے لگا جب وہ جادۂ دیانت سے ہٹا تھا اور اسکی صلاح پر کان دھرنے کے فعل کی وجہ سے اپنے آپ کو بیوقوفوں کا بیوقوف کہنے لگا۔ اسے یہ خیال کرکے بھی بڑی شرم آرہی تھی کہ ان ذات شریف کے دلائل کا جو سراسر دُنیا پرستی پر مبنی ہوئے تھے وہ بھی قائل ہوگیا تھا جسکی وجہ سے وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا۔

اس کے بعد وہ خضر سے پھر مخاطب ہوا اسکے الفاظ اور ان کا مفہوم کچھ ایسا تھا۔

مسلم:۔ کیوں قبلہ آپ کا خیال کیا ہے؟ اب میرے لئے اُمید کی کوئی کرن ہے؟ کیا میں واپس جا سکتا ہوں اور آپ کے بتلائے ہوئے چھوٹے دروازے کی طرف پھر روانہ ہو سکتا ہوں؟ افسوس کہ میں نے اس آدمی کی صلاح پر کان دھرے۔ لیکن کیا میرا گناہ معاف ہو سکتا ہے؟

تب خضر نے اس آدمی سے اس طرح کہا:۔

خضر:۔ تیرا گناہ بہت بڑا ہے۔ اس لئے کہ تو ایک چھوڑ دو بُرائیوں میں ملوث ہوا ایک تو تو نے خیر کی راہ کو خیرباد کہا دوسرے اس راستہ پر چل نکلا جو ممنوعہ ہے۔ تاہم ربِ اعلیٰ بہت غفور اور رحیم ہے اگر تو سچے دل سے توبہ کریگا تو عجب نہیں کہ تیری خطا معاف ہوجائے۔ اس لئے دل سے توبہ کر اور عمل سے اسکا ثبوت دے اور سامنے والے دروازہ کی طرف روانہ ہوجا۔ وہاں تجھے ایک آدمی خوش آمدید کہے گا۔ وہ شخص آدمیوں کا بڑا خیرخواہ ہے۔ آئندہ سے خیال رکھنا کہ تو کہیں دوبارہ بھٹکنے پائے۔ ایسا نہ ہو کہ تو اپنا راستہ چھوڑ دے جبکہ ایک بار پہلے ہی اپنے رب کو ناراض کر چکا ہے۔

تب مسلم نے واپسی کے ارادہ سے خود اپنے دل کو مخاطب کیا اور خضر نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور متبسم ہوکر اس سے تیز تر روانہ ہوجانے کے لئے کہا۔ غرض وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا روانہ ہوگیا راستے میں اس نے کسی سے بات کرنے میں بھی وقت ضائع نہ کیا۔ اور کسی نے کرنی بھی چاہی تو کچھ جواب نہ دیا۔ اور وہاں سے اس طرح آیا جیسے کوئی کسی ممنوعہ علاقے میں تیزی سے گزر رہا ہو اور اپنے آپکو بالکل غیر محفوظ سمجھ رہا ہو۔ یہاں تک کہ دوبارہ وہ اسی راستے پر آگیا جہاں اس نے خواجہ دُنیا پرست کی صلاح پر چھوڑا تھا۔ اس طرح وہ ایک عرصہ کی مسافت کے بعد دروازے پر جا پہونچا۔ اب دیکھا تو دروازے پر یہ لکھا ہوا تھا۔

"دستک دو۔ اور یہ تمہارے لئے کھل جائے گا۔"

تب اُس نے یہ کہتے ہوئے دستک دی۔

. . . .

یہ عاجز ہے بلبس خطا وار سندہ ٭ بہترین مدد کا طلب گار بندہ
مصیبت میں تیرے کرم کا ہے طالب ٭ یہ کرب و بلا میں گرفتار بندہ
درِ فوز و نصرت کو اب باز فرما
اسے رحمتوں سے سرافراز فرما

بالآخر ایک متین شخص دروازے پر آیا۔ خیر خواہ اس کا نام تھا۔ اس نے پوچھا وہ کون ہے، اور کہاں سے آیا ہے، اور کیا چاہتا ہے۔

مسلم:۔ یہ عاجز ایک گنہگار ہے جو اپنی پشت کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے میں خراب آباد نام کے شہر سے آیا ہوں۔ مگر ایسی جگہ

جا رہا ہوں جہاں آنے والے عذاب سے محفوظ رہوں اس لئے چونکہ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ اس جگہ کا راستہ اس دروازے سے ہو کر جاتا ہے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں گے؟

خیر خواہ :- بخوشی۔ میں دل سے تیار ہوں۔

اور یہ کہکر اس نے دروازہ کھول دیا۔

پھر جب وہ اندر داخل ہونے لگا تو جیسے کسی نے اسے پیچھے کو دھکیلا۔ مسلم نے اس پر کہا۔ "یہ کیا ہوا؟"

دوسرے آدمی نے بتلایا کہ یہاں تھوڑے سے فاصلے پر ابلیس کے دست راست اور خاص الخاص چیلے نے ایک بہت مضبوط محل بنایا ہے جسکا کپتان وہ شیطان ہے وہاں سے وہ اور اس کے ساتھی ان لوگوں پر تیر پھینکا کرتے ہیں جو اس دروازے کی طرف آتے ہیں کہ شاید اندر داخل ہونے سے پہلے کوئی شکار بن جائے۔

مسلم کو اس سے خوف بھی ہوا اور بچ آنے کی خوشی بھی ہوئی۔ پھر جب وہ اندر داخل ہو گیا تو دروازے پر ملنے والے آدمی نے پوچھا۔

"تمہیں اس طرف آنے کے لئے کس نے کہا؟ کس نے رہنمائی کی؟"

مسلم :- خضر نے میری رہنمائی کی اور یہاں پہونچکر دستک دینے کو کہا۔ جس پر میں نے عمل کیا۔ اور اس بزرگ شخص نے مجھے یہ بتایا کہ آپ مجھے یہ بتا سکیں گے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

خیر خواہ : تمہارے سامنے دروازہ کھلا ہوا ہے اور کوئی اسے بند نہیں کر سکتا

مسلم :- اب مجھے دشواریوں کا صلہ ملنا شروع ہوا ہے۔

خیر خواہ :- لیکن یہ کیا بات ہے کہ تم تنہا آئے ہو؟

مسلم :- اس لئے کہ جو آنے والا خطرہ میں نے دیکھ لیا تھا وہ میرے پڑوسیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھا۔

خیر خواہ . کیا ان میں سے کسی کو تمہارے آنے کی خبر تھی؟

مسلم :- ہاں پہلے میری بیوی اور بچوں نے دیکھا۔ اور واپس لوٹ آنے کے لئے پکارا پھر کچھ پڑوسی بھی کھڑے چلانے لگے اور پکار پکار کر واپس بلانے لگے لیکن میں نے ان کی ایک نہیں سُنی اور پھر اپنے راستہ پر چل کھڑا ہوا۔

خیر خواہ . لیکن کیا کوئی تمہارے پیچھے پیچھے نہیں آیا تمہیں واپس لے جانے پر آمادہ کرنے کو؟

مسلم :- ہاں دو اشخاص آئے۔ آمرا اور نرم دل لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی بات چلنی محال ہے تو آمرا برا بھلا کہتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ لیکن نرم دل میرے ساتھ تھوڑی دور تک آیا۔

خیر خواہ :- لیکن وہ سیدھا یہاں کیوں نہیں پہونچا؟

مسلم :- ہم اصل میں ساتھ چلے تھے یہاں تک کہ سیلی کی دلدل پر پہونچ گئے جس میں اچانک گر بھی پڑے اور تب میرا پڑوسی نرم دل بہت دل برداشتہ ہوا اور آگے بڑھنے کا خیال ترک کر دیا۔ جسکے بعد وہ اس دلدل سے نکل کر اس کنارے پر آگیا جو اس کے گھر کی طرف تھا اور مجھ سے کہا کہ وہ جگہ تمہیں اکیلے ہی کو مبارک رہے جہاں جا رہے ہو۔

پھر وہ اپنے راستہ پر چل دیا اور میں اپنے راستہ پر۔ وہ آمرا کے پیچھے اور میں اس دروازے کی طرف۔

خیر خواہ .- افسوس اس آدمی پر۔ کیا باری تعالیٰ کی رضا اسکے نزدیک اتنی کم قیمت ہے کہ اسے حاصل کرنے کی خاطر مشکلات کے چند مرحلے طے کرنا بھی منظور نہیں؟

مسلم .- یقیناً۔ میں نے نرم دل کی حقیقت کھول دی۔ اور اگر میں اپنی حقیقت بھی کھول دوں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کے مقابلے میں مجھ میں بھی کوئی اچھائی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے گھر واپس لوٹ گیا لیکن میں بھی تو اپنے راستہ سے ہٹ کر تباہی کے راستہ پر چلا گیا تھا اور خواجہ دنیا پرست کے کے دنیا پرستانہ دلائل پر کان دھرے تھے۔

خیر خواہ :- اوہ! وہ تمہیں اتفاقاً راستہ میں مل گیا ہوگا؟ اور کہا کیا ہوگا اُسنے؟ اس نے تم سے قانون پسند کے ذریعہ سے سکون تلاش کرنے کو کہا ہوگا۔ دونوں کے دونوں پکے فریبی ہیں۔ لیکن کیا تم نے اسکی صلاح مان لی؟

مسلم :- ہاں۔ جہانتک مجھ میں ہمت تھی صلاح مان لی۔ میں قانون پسند کی تلاش میں چل پڑا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ جو پہاڑی اس کے گھر کے پاس ہے وہ تو میرے سر پر ہی گرنے کو ہے تو میں وہاں رُک جانے پر مجبور ہوا۔

خیر خواہ :- وہ پہاڑی بہتوں کی تباہی اور موت کا سبب بن چکی ہے اور بہتوں کی تباہی اور موت کا سبب بنے گی۔ غنیمت ہے کہ تم تباہی کے ٹھیک غار سے بچکر آگئے

مسلم :- سچ پوچھیئے تو نہیں معلوم میرا وہاں کیا حشر ہوتا وہ تو یہ کہیئے کہ خضر سے دوبارہ خوش قسمتی سے اسوقت ملاقات ہوگئی ۔
جب میں وہاں کھڑا آہ وزاری کررہا تھا۔ یہ خدا کی مہربانی تھی کہ خضر سے دوبارہ ملنا ہوگیا۔ ورنہ یہاں دروازے تک میں کبھی نہ پہونچتا۔ بہرکیف اب آگیا ہوں۔ جیسا کچھ بھی ہوں۔ ہوں تو اسی قابل کہ اس تباہی کا شکار ہوجاتا بجائے اس کے اس طرح کھڑا آپ سے باتیں کروں۔ لیکن اوہ! مجھے خدا نے کتنے فضل وکرم سے نوازا ہے کہ اس کے باوجود میں اس در فوز و نصرت میں داخل کرلیا گیا ۔

خیر خواہ :- ہم کسی کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ اس سے قطع نظر کہ لوگوں نے یہاں آنے سے پہلے کیا کیا ہے۔ اس لئے اچھے مسلم ! ذرا میرے ساتھ کچھ دُور آؤ اور میں تمہیں بتاؤں کہ تمہیں کدھر جانا چاہیئے۔ دیکھو سامنے دیکھو یہ تنگ راستہ تمہیں دکھائی دے رہا ہے ؟ یہی وہ راستہ ہے جس پر تمہیں جانا ہے ۔ یہ راستہ خدا کے سب برگزیدہ بندوں نے اختیار کیا ہے جسے صراط مستقیم کہتے ہیں ۔ خدا سے مدد طلب کرو

مسلم :- لیکن کیا اس راہ میں کہیں موڑ یا ایسے پیچ وخم تو نہیں ہیں جن میں ایک اجنبی راستہ بھول سکتا ہے ؟

خیر خواہ :- ہاں بہت سے راستے اسکے پاس سے گذرتے ہیں۔ جو چوڑے اور خمدار ہیں۔ لیکن اس طرح تم غلط اور صحیح میں امتیاز کرسکو گے، صرف صحیح راستہ ہی سیدھا، تنگ اور دشوار گذار ہوگا ۔

تب میں نے اپنے خواب میں دیکھا کہ مسلم نے اس شخص سے اتنا اور پوچھا کہ کیا وہ اس بوجھ سے چھٹکارا دلانے میں مدد نہیں کرسکتا جو اس کی کمر پر ہے ۔ اس لئے کہ اب تک وہ اس سے چھٹکارا نہیں پاسکا تھا اور نہ کسی طریقہ سے اسے بغیر کسی مدد کے گرا سکتا تھا ۔

اس نے کہا جہاں تک تمہارے بوجھ کا سوال ہے ، ذرا صبر سے کام لیکر اسے برداشت کرو یہاں تک کہ تم ایک ایسے مقام پر پہونچ گے جہاں یہ بوجھ آپ سے آپ تمہاری پیٹھ سے گر جائے گا ۔

اس کے بعد مسلم کمربستہ ہوکر سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کرنے لگا ۔ اس پر دوسرے آدمی نے اسے بتایا کہ جب تم دروازے سے تھوڑی دُور پہونچ گے تو تمہیں ترجمان نام کے ایک شخص کا مکان ملے گا ۔ اس کے دروازے پر پہونچکر دستک دینا وہ تمہیں بہت سی نفیس چیزیں دکھائے گا ۔

اور یہ مسافر چل دیا ۔

(باقی)

محبوب کا مراسلہ

اختر آراء آباں
ایم۔ ایس سی (علیگ)

مسٹر بھائی صاحب! تسلیم!

بعد ادائے آداب کے گزارش ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میرے علاوہ بھی سب لوگ خیریت سے ہیں اور غالباً آپ کی خیریت خدائے عزّوجل سے نیک چاہتے ہیں۔ مزید دیگر احوال یہ ہے کہ اس عرصے میں آپ کے خطوط بہت آئے۔ طبیعت پریشان ہے۔ خدا آپ کی پریشانیوں کو دُور کرے۔ روزانہ دو ہزار مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھ لیا کیجیے اور صبح صبح کسی بازار کا ایک چکر لگا لیا کیجیے۔ دل کو تقویت پہنچے گی۔ اور سڑک کی چہل پہل سے طبیعت کو سکون ملے گا۔

آپ جس دن گئے، دو ایک دن تو بہت آزردہ رہی لیکن اب دو چار روز سے رحیما بُوا کے کہنے پر مندرجہ بالا نسخے پر عمل کر رہی ہوں۔ تو افاقہ ہے۔ وظیفہ چاہے نہ کر سکوں لیکن ٹہلنے ضرور جاتی ہوں۔ کہتے ہیں اس سے صحت بن جاتی ہے اور بیماریاں سوچ سمجھ کر لگتی ہیں مگر آپ اطمینان رکھیے، جب آکر مجھے دیکھیں گے تو، بقول آپ کے، ضرورت سے زیادہ صحت مند نہیں پائیں گے۔ آپ کے پسندیدہ قمیص کی ناپ، دھوبی کی کاپی میں لکھی ہوئی بکس میں محفوظ رکھی ہے۔ آپ کب آرہے ہیں۔ میں کیلنڈر پر دن گن گن کر کاٹ رہی ہوں۔ آپ نے جانے کے بعد اتنے خط لکھے لیکن ایک میں بھی اپنے پہنچنے کی اطلاع نہیں دی۔ ادھر اُدھر کی تمام باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ آپ کو ریل میں جگہ مل گئی تھی یا نہیں۔ فکرمند ہوں۔

ہاں میں معافی چاہتی ہوں۔ اصل میں تصویر رکھتے وقت لفافے مل گئے تھے۔ امّی کے ڈر کی وجہ سے دوبارہ دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ بات یہ ہوئی کہ میری سہیلی صالحہ نے (بڑی جھوٹی لپاڑی ہے آپ آئیے تو اس کے قصے سناؤں) مجھ سے فرمائش کر کے مُرغابی کی تصویر بنوائی تھی۔ تو بس جلدی اور گھبراہٹ میں اپنی تصویر کے بجائے وہ تصویر آپ کو بھیج دی۔ یہ تصویر جواب لکھ رہی ہوں، بھائی جان نے کھینچی تھی۔ اطمینان رکھیے میں فوٹوگرافروں سے کھنچوانے کی قائل نہیں۔

یہ آپ نے کیا لکھا ہے کہ بہت دنوں سے شمشاد بیگم کے گانے نہیں سُنے تو طبیعت مکدر ہے، خدا نہ کرے، میں کیوں بدگمان ہوں۔ یہ آپ نے کیوں سوچ لیا۔ گانے، دُنیا میں سب کو پسند ہیں۔ کسی کو کسی کا کسی کو کسی کا۔ آپ نے اشعار کی کوئی نئی کتاب خریدی کہ نہیں۔ دیوانِ غالب تو ختم ہو گیا تھا۔ اب ادھر دو چار خطوں میں آپ ایک بھی شعر نہیں لکھ رہے ہے۔ بغیر اس کے خط سونا سونا سا معلوم دیتا ہے کچھ نہ ملے تو خود ہی بنا کر لکھ دیا کیجیے۔ کیا معلوم اسی بہانے آپ شاعر بن جائیں اور مشاعروں میں انٹر کلاس کا کرایہ ملنے لگے۔ پرسوں ریڈیو پر ایک گانا آرہا تھا۔ اس کا ایک شعر لکھ رہی ہوں تاکہ آپ کی شکایت رفع ہو جائے

بہن لڑ لو، لڑنے سے بڑا آرام آتا ہے
کہ عورت کو بجز لڑنے کے اور کیا کام آتا ہے

ویسے شعر تو اچھا ہے مگر اس کا مفہوم اچھا نہیں۔ یہ چھٹیاں کمبخت کاٹے نہیں کٹتیں۔ جب سے آپ گئے ہیں، تانگے پر بیٹھنے کا لطف جاتا رہا۔ عجیب بھی اب تانگہ اتنا آہستہ نہیں چلتا جتنا کہ آپ کی سائیکل کے ساتھ، اس لئے باہر کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، جب سے آپ گئے ہیں، میں نے کوئی سینما نہیں دیکھا (یہ کسی سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے) آپ کے ساتھ آپ کے بیسیوں سے دیکھنے میں کچھ اور ہی بات رہتی ہے۔ اپنے آنے کی تاریخ سے مطلع کیجیے۔ کل ہم لوگ شاہدہ کی سولہویں سالگرہ پر اس کے گھر گئے تھے۔ سولہ سال تک زندہ رہنے کی خوشی میں ایک شاندار پارٹی بھی تھی۔ آپ کے بغیر کچھ مزا نہیں آیا۔ ویسے آپ یہاں ہوتے بھی تو لڑکیوں کی محفل میں نہیں جا سکتے تھے یہ بات دوسری ہے۔ شاہدہ کہہ رہی تھی کہ

بہت جلد اپنی شادی کا اشتہار دینے والی ہے۔ مجھ پر بھی زور ڈال رہی تھی۔ سنا ہے آپ کی کہیں بات چیت چل رہی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی سوائے اسکے کہ میری منگنی دوبار چھوٹ چکی ہے۔ ایک کو اعتراض تھا کہ لڑکی کے رشتے کی جالی بہت باریک ہے۔ دوسری جگہ والوں کو شکایت تھی کہ صاحبزادی ایک سرے سے برقعہ ہی نہیں اوڑھتیں۔ پھر انہوں نے ایک صاحب کو جو آپ ہی کی طرح مجھے روزانہ اسکول چھوڑنے جایا کرتے تھے، دیکھ لیا تھا۔ ہاں یہ آپ سے بتانا بھول گئی تھی۔ وہ صاحب بہت سو فوٹ سے تھے دو سال تک یہی حرکت کرتے رہے۔ میں نے بھی کبھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی ان کی طرف دیکھ لیا کرتی تھی۔ یا اخیر زمانے میں تھوڑی بہت بات چیت ہو جایا کرتی تھی۔ یا ان کے دو ایک خطوں کا جواب دیدیا تھا۔ انہیں بھی آپ کی طرح خطوں کے بھرمار کرنے کا خبط تھا۔ بہرحال آپ صاف لکھئے تاکہ آئندہ کے لئے بات صاف ہو جائے۔ خدا کرے آپ کا اسکول وقت سے پہلے کھل جائے۔

خدا کرے اس سال آپ کنفرم ہو جائیں اور آپکو چھٹیوں کی تنخواہ مل جائے تو آپ کے ساتھ خریداری کی جائے۔ میرا دل کہتا ہے کہ لڑکوں کا نتیجہ صفر فیصدی ہونے کے باوجود آپ کو نوٹس نہیں ملے گا کیونکہ میں اپنے امتحاں کے سلسلے میں جو دعا مانگتی ہوں اسمیں آپ کے لئے بھی گنجائش نکال لیتی ہوں۔ کہتے ہیں کہ صدق دل سے جو مانگا جائے مل جاتا ہے نتیجے کی آپ بالکل پرواہ نہ کیجئے۔ ویسے اسمیں کچھ آپ کی بھی غلطی ہے۔ نتیجہ اچھا کرنا تو اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ امتحاں کے وقت لڑکوں کو تھوڑا بہت نقل کرا دیجئے گا۔ آپ مانتے ہی نہیں۔ آخر آپ کے اسکول میں ایمانداری کا اتنا کیوں زور ہے؟ نقل تو ہر طالب علم کا پیدائشی حق ہے۔ تعجب ہے کہ حکومت اسکی ٹریننگ کے لئے باقاعدہ کلاسیں کیوں نہیں کھولتی؟

اس سال اُمید ہے کہ اگر بھیا کو کوئی معقول ملازمت نہ ملی تو آپ کے اسکول کی کسی چیز میں کچھ ہو جائیں گے میں نے جو آپ سے باتیں کرنے کے لئے تانگے کے پردے میں سوراخ کر لیا تھا، کل ابّا کی نظر پڑ گئی تو نصیبًا بوا سے سلوا دیا۔ خیر آپ آ جائیے، میں اور کر لوں گی۔ میں نے پچھلے خط میں جن ماسٹرنی کا تذکرہ کیا تھا وہ شاہدہ کے اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ آپ نے ان کی تفصیل پوچھی ہے۔ بہت کالی سی ہیں جیسے بلا دودھ کی کافی یوں سمجھئے کہ آپ سے بہت زیادہ۔ بلکہ ان کے مقابلے میں آپ کا رنگ گیہواں معلوم دیتا ہے۔ آپ آئیے تو ان سے ملوا دوں۔ ان سے ملوا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے میں آپ کے مزاج کو خوب پہچانتی ہوں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ سائیکل کے مڈگارڈ بدلوا دیں گے۔ اتنا شور کرتے ہیں کہ تانگے کی آواز بھی دب جاتی ہے۔ بات کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اس خط کو دیکھتے ہی چلنے کی تیاریاں شروع کر دیجئے۔

اس خط پر اپنا غلط نام لکھ رہی ہوں تاکہ اگر ابّا کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ سمجھیں کسی اور لڑکی کا ہے۔ آپ بدستور چھوٹی بہن کے نام خط بھیجتے رہئے۔ ہاں ایک بات لکھنا بھول گئی۔ میرے دو ایک دوپٹے کافی پھٹ چکے ہیں۔ آپ کے لئے رومال تیار کر رکھوں گی۔ بھیا کی ایک پرانی چادر بھی ہاتھ لگ گئی ہے۔ بالکل تار تار ہے۔ میز پوش کا ناپ جلد بھجوا دیجئے ورنہ پھر اسکول کھل جائیں گے۔

جلدی میں ہوں کیونکہ امّی کے سر میں تیل ٹھونکنا ہے اس وجہ سے خط مختصر لکھ رہی ہوں۔ مفصّل حالات آئندہ لکھوں گی۔ اور کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے، ویسے ہیں بہت سی باتیں۔ جو کچھ اوپر لکھا اس کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔ اگر کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ناچیز کو معاف کر دیجئے گا۔ آتے وقت کھانے پینے کی کوئی اچھی چیز لیتے آئیے گا فقط

آپ کی کنیز۔ کنیز بانو (یہ نام صحیح نہیں ہے)

مصنف :۔ وسٹن ہیو آڈن

مترجم :۔
شمس الرحمٰن فاروقی
ایم - اے

چیخنے سے فائدہ ــــ؟

دورِ حاضر کے سب سے بڑے انگریز شعراء میں سے ایک کی یہ نظم ایک عجیب سا المناک Tragic تأثر پیدا کرتی ہے۔ اس کے خطیب (Protagonist) کی ناامیدی (Frustration) اور شکست آلود (Defeatist) ذہنیت قدرتی نتیجہ ہیں۔ ہمارے دور کی مادہ پرستی اور خدا بیزاری کا۔ اور یہی واضح کرنا اس نظم کا مقصد ہے۔ ہر بند کے آخری دو مصرعے (Refrain) اور تیسری بند قابلِ غور ہیں۔

ترجمہ قریب قریب ہر جگہ لفظی ہے، اور نہ نثر میں ہے۔ نہ نظم میں۔ بلکہ مخلوط ہے۔

(۱)

چیخنے سے فائدہ؟ چلانے سے فائدہ ــــ؟
نہیں میری جان۔ تم اپنی چیخیں فوراً بند کر سکو تو اچھا ہو۔
مجھے اب بوس و کنار کی بھی ضرورت نہیں ہے۔
مجھے تھوڑی سی چائے پلاؤ۔
اور اوڑھنے کے لئے کمبل لادو۔
یہاں میں ہوں، تم ہو،
لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

(۲)

بہت دن ہوگئے۔
میں نے اماں سے کہا تھا۔
میں ایک نیا گھر بناؤں گا ماں! میں یہ گھر چھوڑ رہا ہوں
جان شن، میں نے اس کے خطوں کا کبھی جواب نہ دیا لیکن
مجھے کوئی اچھا گھر بھی نہ مل سکا۔

یہاں میں ہوں، تم ہو؟
لیکن اس کا مطلب کیا ہے، ہمیں کیا کرنا ہے۔؟

(۳)

ایسا ہمیشہ تو نہیں تھا نا؟
شاید نہیں، ـــ مگر اب تو ہے۔
رکھ دو گاڑی کو ادھر، جب زندگی ناکام ہو۔
تو سیر سے فائدہ؟۔
یہاں میں ہوں، تم ہو،
لیکن اس کا مطلب کیا ہے، ہمیں کیا کرنا ہے؟

(۴)

میری رگوں میں ایک تمنّا ہے، ایک یاد ہے اور جب
میں فرش پر آنسو بہاتا ہوں
تو وہ کہتی ہے "تم نے اکثر
آنسو بھی بہائے ہیں"
یہاں میں ہوں، تم ہو۔
لیکن اس کا مطلب کیا ہے، ہمیں کیا کرنا ہے۔؟

(۵)

اس کنارے پر کبھی ایک پرندے کا بسیرا تھا مگر
اب وہ یہاں نہ آئے گا۔
میں نے ثابت کر دکھایا ہے
کہ نہ محبّت ہے کچھ نہ دُنیا ہے کچھ نہ انسان ہے کچھ۔
یہاں میں ہوں، تم ہو،
لیکن اس کا مطلب کیا ہے، ہمیں کیا کرنا ہے؟۔

حفیظ میرٹھی

اگر دل سوزِ الفت کا امانت دار ہو جائے
تو ہر آتشکدہ گلزار ہی گلزار ہو جائے
عجب کیا ہے اسی ہمّت شکن طوفاں کے پہلو سے
کوئی ایسی بھی موج اُٹھے کہ بیڑا پار ہو جائے
جفا کاروں کے اس طرزِ جفا کی داد دیتا ہوں
ستم ڈھانے لگے کوئی، کوئی غمخوار ہو جائے
مغنّی تیرے نغموں نے تو انساں کو سُلایا ہے
مری چیخوں سے شاید آدمی بیدار ہو جائے
نہ ہو جو معترض باطل خداؤں کی خدائی پہ
یہ مشکل ہی حفیظ اس قسم کا دیندار ہو جائے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جو گلوں ہی کو فقط جانِ گلستاں سمجھے
وہ حقیقت میں نہ معنئ بہاراں سمجھے
مجھکو اُس برق کی جرأت پہ ہنسی آتی ہے
جو گلستاں سے مٹانا مجھے آساں سمجھے
لاکھ آزادیاں اُس مردِ مجاہد پہ نثار
جو قفس ہی کو بہر طور گلستاں سمجھے
بچ کے طوفاں سے جو ساحل پہ کھڑے ہنستے ہیں
کیا عجب اُن کو کبھی شورشِ طوفاں سمجھے
اُس کو کیا فکر زمانے میں بھلا اے جوہر
اُن کو ہر حال میں جو اپنا نگہباں سمجھے

انورؔ صدیقی

مرغِ چمن زیرِ دام دیکھئے کب تک رہے
اپنی اُمیدوں پہ شام دیکھئے کب تک رہے
عشق ہوس کا غلام دیکھئے کب تک رہے
نغمۂ سودائے خام دیکھئے کب تک رہے
دیکھئے کب تک رہے دستِ خزاں میں بہار
برق کا رقصِ دوام دیکھئے کب تک رہے
دیکھئے کب تک بنے شعلہ ستارہ گداز
اپنا یہ حکمِ ناتمام دیکھئے کب تک رہے
موجۂ خوں اُٹھ پڑی چھا گئی افلاک پر
میکدہ آتش بجام دیکھئے کب تک رہے
بزمِ کہن میں مری شورشِ جنگِ حیات
مرگِ مسلسل کا نام دیکھئے کب تک رہے
دیکھئے کب تک رہے شوقِ اسیرِ تخیّل
کاہشِ دیوار و بام دیکھئے کب تک رہے
بات تو انورؔ ہے یہ جلوہ ہی مخصوص تھا
دعویِٔ دیدارِ عام دیکھئے کب تک رہے

احقرؔ کاشی پوری

یہ اہتمامِ فتنہ و شر سوچ رہا ہوں
آخر ہے کیا مآلِ بشر سوچ رہا ہوں
بربادیٔ چمن کے نظاروں کی آگ میں
کب تک یونہی جلے گی نظر سوچ رہا ہوں
ہر منظرِ حیات ہے تاریکیوں میں گم
سوئی ہوئی کدھر ہے سحر سوچ رہا ہوں
دیکھیں گی اور کتنے ابھی قافلوں کی موت
یہ ظلمتیں، یہ راہ گزر، سوچ رہا ہوں
فکر و نظر کی پست اُڑانوں کے باوجود
انسان، اور تنگ نظر، سوچ رہا ہوں
اِس زندگی کو خُلد بداماں کریں گے کیا
جن کو نہیں ہے، اپنی خبر، سوچ رہا ہوں
ذہنوں میں انقلاب آیا تو اے ندیم
گھُلتی رہے گی روحِ بشر سوچ رہا ہوں
احقرؔ غبارِ راہ تو ہمّت شکن نہیں
مفلوج خود ہے ذوقِ سفر سوچ رہا ہوں

شوق اثری

ہوئے جو خوگرِ غم غم نے ساتھ چھوڑ دیا
غضب کہ گردشِ پیہم نے ساتھ چھوڑ دیا
یہ کیا کیا کہ ترے غم نے ساتھ چھوڑ دیا
گمان ہوتا ہے عالم نے ساتھ چھوڑ دیا
نظر جب اُن سے ملی ہم جہاں کو بھول گئے
ملا غم اُن کا تو ہر غم نے ساتھ چھوڑ دیا
تمہاری بزم کو چھوڑا تو یہ ہوا محسوس
کہ جیسے اپنا ہی خود ہم نے ساتھ چھوڑ دیا
پہونچ رہے تھے مرے اشک اُن کے دامن تک
کہاں سے دیدۂ پُر نم نے ساتھ چھوڑ دیا
نظارۂ ظلمتِ گلشن پہ رات بھر رو کر
سحر کے ہوتے ہی شبنم نے ساتھ چھوڑ دیا
خوشی تو خیر مقدر ہی میں نہ تھی اے شوق
میں کیا کروں گا اگر غم نے ساتھ چھوڑ دیا؟

رشید کوثر فاروقی

کیوں سہم کے او راہی! آنکھ بند کرتا ہے
کوئی دم اندھیرا ہے پھر وہی اُجالا ہے
بات ہے یہ کل شب کی پہلوئے قمر میں تھا
آج ننھے تارے کیوں دُور دُور پھرتا ہے

تولتا ہے پر اپنے جب یہ بے خدا انساں
دُور ایک وادی میں قہقہہ سا لگتا ہے
یہ گھُٹی گھُٹی سانسیں یہ بجھے بجھے تیور
ہم جہاں کے باسی ہیں کیا یہی وہ دنیا ہے
ذوقِ سعیِ پیہم کا قدر ناشناس انساں
عیش کے تصور میں رنج بھول جاتا ہے

پاکبازِ الفت کی احتیاط کیا کہیے
دوست کی نگاہوں سے خود کو اس نے دیکھا ہے

دل نہ کر کبھی تھوڑا پھر سے راہ پر آجا
چاند صبح کا بھولا شام ہوتے پلٹا ہے
ہاں نشید و نغمہ سے انجمن کو رکھ بیدار
درسِ زندگی کوثرؔ وقت کا تقاضا ہے

صوفی چناروی

خونِ دل سے اِسے کیا سنوارا نہیں
کیسے کہدیں گلستاں ہمارا نہیں

اس نے طوفاں کو ساحل بنا ہی لیا
عیشِ ساحل نے جسکو پکارا نہیں

اس سفر میں ہر اِک غرقِ طوفاں ہوا
بحرِ اُلفت کا جیسے کنارا نہیں

راہزن ہی سے ہمکو شکایت ہو کیا
معتبر رہنما بھی ہمارا نہیں

محو تھے لوٹ میں کون سُنتا مری
میں نے گلشن میں کسکو پکارا نہیں

نکتہ چیں ہیں ہماری نگاہیں بہت
خیریت ہے کہ تیرا نظارا نہیں

ہنس نہ دے میری خوددار فطرت کہیں
ذکرِ غم مجھکو صوفی گوارا نہیں

راشد کیرانوی

اس کو خود اپنی حقیقت کی خبر کچھ بھی نہیں
آدمی کہنے کو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

سوچتا ہوں مرا انجامِ سفر کیا ہوگا
دُور جانا ہے مگر رختِ سفر کچھ بھی نہیں

آگ میں کود پڑیں دار پہ ہنس کر چڑھ جائیں
جاں نثاروں کیلئے خوف و خطر کچھ بھی نہیں

کیوں نہ ظلمت کا جگر چیر دیں خود ہی بڑھ کر
رات ہی رات ہے آثارِ سحر کچھ بھی نہیں

اس سے پہلے کہ انہیں وعدہ فراموش کہوں
کہتے ہیں تجھ پہ شبِ غم کا اثر کچھ بھی نہیں

کیا یہی عشق کی ہے آخری منزل راشد
اب فقط جلوہ ہی جلوہ ہے نظر کچھ بھی نہیں

مُصعبؔ خالدی

ادب کے ملفوظات

{ برائے حلقہ ادب اسلامی
فرحت نگر ـــــ حیدر آباد دکن

گذشتہ صدی کی ادبی تحریکوں میں روس کی یہ ادبی تحریک تھی کہ ادب کے ذریعہ نظریات کے پرچار کا بھی کام لیا جا سکتا ہے یہ بات ایک حد تک اگر غلط ہے تو ایک حد تک واجبی بھی ہے۔ اس سے یہ نقص پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں جانب داری پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا "حلقہ قبول" گھٹ جاتا ہے مگر یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ ادب انسانیت کی تربیت کا کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ مگر انسانیت کی تربیت کا بیڑا اٹھانا کوئی کھیل نہیں ہے اس کے لئے بڑی محنت درکار ہے۔ ادیب کا انسان کی سماجی اور انفرادی نفسیات اور اس کے مسائل سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ پھر وہ اپنے افکار کو جب ادب کے روپ میں انسانیت کے سامنے رکھے تو اس میں ادب کے شرائط کو ملحوظ رکھنا بھی ازبس ضروری ہے یہ ملفوظات کچھ تو عام، کچھ فنی نوعیت کے ہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ چند ملفوظات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ان باتوں کو اسلامی فن کار بھی اپنے ادب میں ملحوظ رکھیں تو ان کے ادب کو زیادہ سے زیادہ قبولیت عام حاصل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے کیونکہ ان کی وجہ سے ادب میں تابناکی پیدا ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ادیب کو اپنی تخلیقات میں "ایجادیت" یعنی (Originality) پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی تخلیق پیش کریں جو کم از کم آپ کے ماحول یا وسیع مفہوم میں دنیا کے لئے نئی ہو۔ یقیناً یہ بڑی مشکل بات ہے لیکن "بنیادیت" پیدا کرنا ہر ادیب کا فریضہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارا ادیب "اسلامی اقدار" کو اس انداز میں پیش کرے کہ ہر انسان مسلم ہو کہ غیر مسلم اس میں اپنے لئے دلچسپی اور حقیقت محسوس کرے۔ اس چیز کو اختیار کرنے میں ادیب کسی چیز کو تخلیق کرتے وقت اس بات کو گہرے شعور کے ساتھ پیش نظر رکھے کہ وہ ساری "انسانیت" کو کوئی پیغام سنانے والا ہے۔ مگر ادیب سے عام طور پر ایک غلطی سرزد ہوتی ہے یعنی اس کے چند عقائد ہوتے ہیں تخلیق کے وقت وہ عقائد اور فکر کو علیحدہ کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہتا ہے۔ گویا وہ "بنیادیت" پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ بنیادیت کے بعد آفاقیت (Universality) کی بڑی اہمیت ہے۔ آفاقیت کا مطلب یہ ہے کہ ادبی تخلیقات ہر "زمان و مکان" میں اپنا مقام قائم رکھ سکیں۔ یعنی ہندوستان کی ایک ادبی تخلیق چین۔ روس۔ امریکہ اور یوروپی ممالک کے لوگوں کی بھی دلچسپی کا سامان بن سکے۔ ساتھ ہی ساتھ بیسویں صدی کی تخلیق اس قابل بھی ہو کہ اکیسویں یا بائیسویں اور اس کے آگے کی صدیوں میں بھی زندہ رہ سکے۔ "زمان و مکان" کی یہ شرائط جس ادب میں یکجا ہو سکیں اس میں آفاقیت کی صفت ہو گی۔ ہومر کا ایلیاڈ۔ فردوسی کا شاہنامہ شیکسپیر کے ڈرامے۔ ہیوگو کے ناول۔ اور غالب کے نغمے سال ہا سال سے روئے زمین کے چپہ چپہ پر انسانیت کی دلچسپی کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ان میں بنیادیت اور آفاقیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ ادب کے واقعات زندگی ہی کے واقعات ہونے چاہئیں لیکن زندگی کا ہر واقعہ قابلِ ذکر نہیں ہوتا۔ زندگی کے سادہ واقعات میں "انوکھا پن" ڈھونڈھ نکالے یا "اچھوتا پن" پیدا کرنے کے لئے فکری اور تخیلی صلاحیتیں درکار ہیں ورنہ تخلیق سپاٹ ہو کر رہ جائے گی۔ اور ہر وہ شخص جو زندگی ... موٹے واقعات قلمبند کرے وہ ادیب کہلایا جانے ...

... خیال ہے کہ جذبہ و تخیل ادب کے اہم عناصر ہیں ... بھی ہے۔ اس سے ہم کو ادب میں تخیل کی اہمیت ... محض تخیل کو ادب سمجھ لینا بھی بڑی غلطی ...

فلسفہ میں کوئی خط فاصل ہی رہ جاتا۔

اوپر کی سطور سے تخیل کے ساتھ جذبہ کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ ادب کے ذریعہ انسانی تربیت میں جذبہ (Emotion) کو بڑا دخل ہے جذبہ اور تخیل دونوں عناصر ادب کی جان ہیں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جذبہ جذبہ کو ابھارتا ہے۔ گویا ادب میں تاثر پیدا کرنے کے لئے جذبہ کا امتزاج بے حد ضروری ہے۔ اس کی توضیح کے لئے زیادہ بحث درکار نہیں ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ اگر جذبہ ادبی تخلیقات کا لازمی عنصر نہ ہوتا تو معاشیات اور سیاسیات کے تصورات (Thoughts) سماجیات کے مباحث اور خصوصاً فلسفہ سب ہی کچھ ادب میں شامل ہو جاتے۔ (تخیل اور محض خیال) رائی دماغ پر بار ڈال کر اسے تھکا دیتے ہیں۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے جذبہ کی لطافت بہت اہم ہے۔ یہ جذبہ ہی ہے جو ادب کو تھکے ہوئے دماغ کی تسکین کا سامان بنا دیتا ہے۔ اگر جذبہ کو ادب سے نکال دیا جائے تو پھر ادب کو پڑھنے والا شاید کوئی فلسفی ہی رہ جائے گا۔ تخیل اور جذبہ کی مدد سے ادیب پڑھنے والے کے ذہن میں غیر شعوری طور پر وہ "تلازمات" (Associations) یعنی پیدا کر سکتا ہے جو اس کے نظریات کو قبول کرنے کے لئے اہم ہوں۔

ہر جذبہ ایک مخصوص حد تک کیف و سرور کا حامل ہوتا ہے لیکن جب وہ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو ادب اپنی سنجیدگی کھو دیتا ہے۔ جنس اور بھوک انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ادب حیات کا آئینہ دار ہے تو ان دونوں محرکات کے پیدا کئے ہوئے "جذبے" ادب میں پائے جائیں گے۔ تقاضا ہے کہ جنسی جذبات کا بیباکانہ اظہار ادب کو "جنسیات" بنا دے گا۔ اسی طرح غصہ و نفرت، سرور و مسرت کوئی بھی جذبہ ہو حد اعتدال سے گذر کر اپنا وقار کھو دیتا ہے۔ یہاں ہم کو ایک اہم ادبی شرط کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ تہذیب (Decency) ہے۔ جذبات اگر "تہذیب یافتہ" ہوں تو ادب کی رگوں میں "خون حیات" بنکر دوڑ سکتے ہیں مگر تہذیب کا تعلق صرف جذبہ ہی سے نہیں ہے۔ تہذیب کی اصطلاح انسانی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر ادیب کا تخیل مخالف انسانی ہو۔ یا ہو تو گویا تخیل کو مہذب بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر ادیب بلا لحاظ رنگ و نسل ملک و زمان۔ انسان کی اہمیت اور اس کے وقار کو اپنے پیش نظر رکھے تو وہ یہ شرط پوری کر سکتا ہے۔

بہت سے جذبات ایسے ہوتے ہیں جن کی "حد تہذیب" مقرر کرنا آسان ہے۔ انسانیت سے لبریز انسانی جذبات خلوص، ہمدردی اور غمگساری کسی قسم کی روک تھام درکار نہیں ہے۔ مگر ان کے بے روک

اور بھرپور بیان سے بات کی تاثیر زائل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے بیان سے وقتی طور پر تو طبیعت بہت متاثر ہوتی ہے مگر جلد تاثیر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ جذبات کی باتیں اتنی کہنی ہیں چاہئیں۔ جتنی سوچنے کے لئے گنجائش چھوڑ دینی چاہئے۔ اس قسم کی تخلیقات جن میں بات اتنی کہی نہ گئی ہو جتنی سوچنے کے لئے چھوڑ دی گئی ہو ان میں ضبط (Restraint) کی صفت پائی جاتی ہے۔ تخلیقات میں اس طرح "ضبط کئے ہوئے" جذبات و خیالات سامع کے احساس میں "لاوا" بنکر پھٹتے ہیں۔ اس طرح تخلیقات کا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جوش کی شاعری وقتی طور پر ہمیں بہت متاثر کرتی ہے مگر بہت جلد ہم اسے بھول بھی جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جوش کی شاعری میں نام کو بھی "ضبط" نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری ہمیں جوش کی طرح یک لخت نہیں بلکہ رفتہ رفتہ متاثر کرتی ہے۔ اس تاثر میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ تاثر کی یہی گہرائی اور گیرائی اقبال کے طالب علموں کے دماغ اور ان کے نظریہ ہائے حیات کو بدل دیتی ہے۔ اس معنی میں ہم اسے واحد اور یکتائے روزگار "اسلامی شاعر" کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی ادیبوں کو اقبال سے اکتساب کی بڑی گنجائش ہے۔

ادب میں احساسات کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کی غمگساری جذبات کی نہیں بلکہ احساسات کی ہوتی ہے۔ جذبات کو ایک حد تک نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے لیکن احساسات کو نظر انداز کرنے سے تکلیف دہ تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ادب میں غم، خوشی اور دوسرے جذبات کے پیدا کردہ احساسات شامل ہوں تو انہی کیفیتوں میں ادب اپنی نوعیت سے ہماری غمگساری کرے گا۔

اس طرح ادب حیات، اور حیات ادب سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ اس کے لئے ادیب کو اجتماعی اور انفرادی نفسیات کے گہرے شعور کی ضرورت ہے۔ یہ شعور تجربہ اور مشاہدہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان باتوں کے لئے ادیب کے دماغ کو "تجزیہ کار" ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ جذبات اور احساسات میں صحت مند تمیز کر سکے۔ صحت مند احساسات کو ادب میں جگہ دینے سے انسان میں زندگی کا صحیح شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی فن کار اپنی تخلیقات میں ان احساسات کو رچا بسا سکتے ہیں جنہیں انسان میں "اسلام" دیکھنا چاہتا ہے۔

ادیب کردار ساز ہوتا ہے مگر یہ "کردار سازی" کی صلاحیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اس نے انسان۔ اس کے مسائل۔ احساسات اور جذبات کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔ ورنہ وہ "انسان گر" نہیں بلکہ "نوا گر" ہو کر رہ جاتا ہے۔

نسان گر اور فنکار میں جو چیز فرق کرتی ہے وہ "خلوص" Sincerity
ہے۔ خلوص کا مطلب یہ ہے کہ ادیب اپنی تخلیق انسانیت کے پاکیزہ جذبے
سے متاثر ہو کر کر رہا ہے نہ کہ اپنی نفسانیت سے مغلوب ہو کر۔ مثلاً یہ بات پیش کرنی
ہے کہ ایک دوشیزہ افلاس سے مجبور ہو کر عصمت فروشی پر آمادہ ہو جاتی
ہے۔ اگر اس واقعہ کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی دوشیزگی اور جمال کا
رہم میں نفسانیت کو جگانے کے بجائے ہمدردی اور انسانیت کے جذبے
ابھارتا ہے اور انسانی درد پیدا کرتا ہے تو ایسی تخلیق میں خلوص
کی صفت پائی جاتی ہے۔ اور اگر ادیب نے اس واقعہ کو اس طرح ادب میں
پیش کیا ہو کہ ہم میں بجائے انسانیت کے نفسانیت جاگ جائے تو ایسا ادب
خلوص ادب نہیں ہو سکتا۔ یہ انسانیت کے لئے سم قاتل ہے۔

"نظریاتی ادب" میں یہ خصوصیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ
نظریہ محض معاشی یا سیاسی نہ ہو بلکہ پوری حیات پر محیط ہو۔ نظریہ
حیات میں یہ خصوصیت سب سے زیادہ "اسلام" میں پائی جاتی ہے کہ زندگی
کے گوشے گوشے میں یہ نظریہ انسانیت کے جذبے کو بے پناہ خلوص کے ساتھ
بیدار کرنا چاہتا ہے۔ اس نظریۂ حیات سے اکتساب کرنے والے ادیبوں کیلئے
ادب میں خلوص کی صفت پیدا کرنا بہت آسان بلکہ فطری ہے۔

انسان کے جذبے اور احساسات اس وقت بہت زیادہ پُر تاثیر
ہو جاتے ہیں۔ جب ان میں "برشتگی یا دل سوزی" Pathos
کی کیفیت موجود ہو۔ کیونکہ متاثر کرنے والے جذبوں میں سب سے زیادہ
ترغم کا جذبہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ رنگین نگار شعراء اتنے مقبول عام نہیں
ہوتے جتنے کہ وہ شعراء جن کے ہاں برشتگی کی خصوصیت پائی جاتی ہے مگر
برشتگی Pathos کا مطلب قنوطیت۔ انفعالیت یا پژمردگی
نہیں ہے۔ اس کے مفہوم کو صرف احساسات کے سوز تک ہی محدود رکھنا
چاہئے ورنہ اس کی تاثیر مہلک نتائج پیدا کرے گی۔

ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ ادب میں "رنگینی و رعنائی" "سرور و
انبساط" کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ رعنائی و دلکشی بڑی حد تک ادب کی فضیلت
function بلکہ غائت ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ۔

"شاعری کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی اور اس کی مسرتوں کا
احساس دلاتی رہے۔ حالات کا صحیح شعور پیدا کرتی رہے زندگی کو بسر کرنے
کے گر سکھاتی رہے۔ اس طرح اس کے ذریعہ ماحول میں زندگی کی "رمق" پیدا
ہوتی ہے۔ قنوطیت اور بیزاری کی تاریکیاں چھٹتی ہیں۔ اس کی جگہ
سرور و انبساط کا دور دورہ ہوتا ہے۔ جدید شاعری کے غلط رجحانات
نے ہمیں سرور و انبساط سے محروم کر دیا ہے۔ اب زندگی کا احساس بہت
کم باقی رہ گیا ہے اس سے ایک عام بیزاری پھیل گئی ہے۔ حالات کا شعور
اب نام کو بھی نظر نہیں آتا۔ ہر طرف قنوطیت کی تاریکیوں کا بسیرا ہے ان
حالات میں شعر و ادب سے دلچسپی بھلا کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ شاعری نے
چونکہ اس عام بیزاری کا ماحول پیدا کیا ہے اس لئے لوگ شاعری سے بیزار
ہو گئے ہیں۔ اب شاعری کے ساتھ دلکشی و دلآویزی کا خیال نہیں آتا۔
رنگینی و رعنائی کا خیال نہیں آتا۔ اُلجھن اور پیچیدگی کا خیال آتا ہے۔
اکتاہٹ اور اداسی کا خیال آتا ہے۔ یہ صورت حال کیسی عجیب و غریب
ہے۔ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔"

ڈاکٹر عبادت کا یہ کہنا حرف بحرف صداقت پر مبنی ہے۔ ان کی
یہ باتیں ادب کی صحت مند فعلیت function پر روشنی
ڈالتی ہیں۔

اِن ساری شرائط کو ملحوظ رکھنے کے بعد پڑھنے والے کو یہ محسوس ہونا
چاہئے کہ تخلیق میں غیر معمولی ذہانت یا فطانت کارفرما ہے۔ یہ احساس پڑھنے
والے کے "ذہن" کی اس ڈھنگ پر تربیت کرتا ہے جو ادیب کا مقصد ہے۔
لیکن فطانت پیدا کرنا کوئی سیدھا سادہ کام نہیں ہے۔ اس کے لئے خود ادیب
کو وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے، اور کافی تجربے کی ضرورت ہے۔ ادب
میں فطانت پیدا کرنے کے لئے ادیب کو اپنے اندر فطانت پیدا کرنے کی
کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ طرز بیان کی ندرت۔ اچھوتی مثالیں
اور دوسری ادبی موشگافیاں یہ کیفیت پیدا کر سکتی ہیں۔

یہ وہ ملحوظات ہیں جن کا ادیب کو گہرا شعور حاصل ہونا چاہئے۔
انھیں یہاں بڑے اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی
تخلیق میں جب یہ ساری باتیں یکجا ہو جائیں تو ادب میں وہ خصوصیت پیدا
ہو جاتی ہے جسے اصطلاح میں "ترفع" Sublimity کہتے ہیں
دنیا کے بہت کم ادیبوں کو یہ بات نصیب ہوتی ہے مگر جو لوگ اپنے
ادب میں ترفع پیدا کر سکے ہیں ان کی تخلیقات شہرۂ آفاق حاصل کر چکی
ہیں اور وہ رہتی دنیا تک یاد بھی رہیں گی۔

"شکستِ زنداں"

ظفر عالمگیر

"ایشیائی ممالک کی آزادی کی جد و جہد اس صدی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس نے ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ اردو میں مختلف ایشیائی ممالک کی تحریکوں کے متعلق خاصی تعداد میں نظمیں اور کہانیاں لکھی گئی ہیں۔"

چنانچہ مشہور ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں نے اس قسم کی کئی نظموں کو "شکستِ زنداں" کے نام سے ایک کتابی شکل عطا کی ہے۔ یہ ساری نظمیں ایشیا کے مختلف ممالک میں دھڑکتی ہوئی تحریکِ آزادی پر کہی گئی ہیں۔ مرتب کا کہنا ہے کہ

"یہ تخلیقات ہمارے ادیبوں کے نئے شعور کی غمازی کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ حضرات اس ادب کو لمحاتی کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کریں لیکن ان دوستوں سے میں عرض کروں گا کہ بقول الیہ اہرن برگ ایک ادیب کو صدیوں کے لئے ہی نہ لکھنا چاہئے اسے ایک مختصر سے ثانیہ کے لئے لکھنے کا اندازہ بھی آنا چاہئے۔ جس پر کسی قوم کی قسمت کا انحصار ہو۔"

یہاں میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ لمحاتی ادب باعثِ افادیت اور قابلِ قدر ہے یا نہیں بلکہ میں لمحاتی ادب کا حامی ہوں، ان نظموں کے ایک تاثراتی مطالعہ میں بعض چیزیں مجھے کھٹکی ہیں۔ جنہیں میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ نظمیں چوٹی کے ترقی پسند شعراء کی ہیں —

"نگارِ چین" ——— احمد راہی کی نظم ہے جو چار بند پر مشتمل ہے۔ نظم کا پس منظر انقلابِ چین ہے اور شاعر اس انقلاب پر نگارِ چین کو تحسین کے پھول پیش کرتا ہے۔ پہلے بند کا دوسرا شعر ہے ؎

وہ آرزو جو ابھی کل تک اک افسانہ تھی
وہ آج ایک حقیقت کے روپ میں آئی

"ابھی کے ساتھ کل تک" کا استعمال بے معنی ہے "ابھی تک" یا "کل تک" میں پورا مفہوم آ سکتا ہے۔ لیکن وزن کی تکمیل کے لئے مصرعہ میں ستم روا رکھا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "ایک" بھرتی کا لفظ ہے۔ شعر سے "کل" اور "ایک" نکالنے پر بھی مفہوم پورا ہو رہا ہے۔ تیسرے بند کا آخری مصرعہ ہے ؎

شگفتہ نغموں کی جھنکار بن کے گونجیں گے

"نغموں کی جھنکار" سے شاعر نے کیا مراد لی ہے۔ پتہ نہیں۔ نغمہ تو خود ایک جھنکار ہے۔ چوتھے بند کا پہلا مصرعہ ہے ؏

وہ دن بھی آ ہی گیا جس کی آس پر برسوں

یہاں "بھی" کا استعمال معمہ ہے۔ یعنی "اس دن" کے علاوہ "اور بھی" کوئی دن آیا ہے لیکن ایسے کسی دن کی شاعر نے کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ مصرعہ میں زور پیدا کرنے کو "آ ہی گیا" کافی ہے۔ "بھی" وزن کی تکمیل کے لئے بھرتی کا لفظ ہے۔ اسی نظم کا آخری مصرعہ ہے ؏

"ستیزہ کار رہے اجنبی لٹیروں سے"

"چین کے لٹیرے"۔ "اجنبی" نہ تھے بلکہ جانے پہچانے ہیں۔ صدیوں سے ہم انہیں جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے بند کے پہلے مصرعہ میں شاعر "نگارِ چین" سے مخاطب ہے۔ ؏

"نگارِ چین! یہ ساعت تجھے مبارک ہو!"

نظم جس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے وہ یہی ہے کہ "اجنبی لٹیرے" اس سرزمین کو تباہ کرتے رہے۔ چین کے اس طبقہ کا نظم میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جس کے خلاف انقلاب لایا گیا۔ اگر چین میں تباہ کاریوں کے ذمہ دار صرف یہ لٹیرے تھے تو وہاں کا وہ طبقہ قابلِ معافی ہے۔ جس کے خلاف انقلاب آیا اور جس پر لٹیروں سے ساز باز کا جرم عائد ہوتا ہے۔ ساری نظم میں جو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ راہی نے سطحی جذبات پیش کئے ہیں۔

"یہ ہو رہا تھا اب یہ ختم ہو چکا ہے"

ایسی نظمیں ترقی پسند ادب میں عام طور پر ملتی ہیں۔ ان کی کثرت ان کی جاذبیت اور اہمیت کو ہلاک کر چکی ہے۔

"نیا چین" ——— احمد ریاض کی نظم ہے جو آہی کی نظم کی طرح چار بند اور آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ تیسرا مصرعہ ہے۔

تیرہ بارود کی بو، پچھلے سکوں کے نقوش

"پچھلے سکوں کے نقوش" چیستاں بنے ہوئے ہیں جن کا مفہوم شاعر ہی جانتا ہے۔ چوتھا شعر ہے ؎

سال ہا سال سے دبکا ہوا انساں کا شکوہ
آج تاریخ کے ماتھے پہ نکھر آیا ہے

"ڈبکا ہوا شکوہ" بھی عجیب سی بات ہے۔ تیسرے بند کا پہلا مصرعہ ہے

سرد و مفلوج اندھیرے کا کہن سال وجود

"اندھیرا" جو مراد لیا گیا ہے اس قدر شدید اور ستم کار اور بھیانک تھا کہ صدیوں انسان اس میں سسکتا رہا اور پھر ایک منظم انقلاب کی طاقت ہی اس کے ڈیرے دل کی طنابیں اکھیڑ سکی۔ اس "اندھیرے" کو "سرد و مفلوج" کہنا حقیقت سے گریز ہے۔ اگر اندھیرا سرد اور مفلوج ہی تھا تو پھر چین کے انقلابیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی کیا ضرورت؟ مفلوج جیسے کا مقابلہ کوئی بہادری نہیں۔ "اندھیرے کا کہن سال وجود" بھی کھٹکنے کی بات ہے۔ آخری بند کا دوسرا مصرعہ ہے۔

"قصر و ایوان میں وہی آگ تپاں ہو کے رہی"

"قصر" کے معنی "ایوان" کے ہیں۔ صرف "قصر" یا "ایوان" کے استعمال سے مفہوم میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہو رہی۔ اس نظم کا طور اور انداز وہی ہے جو احمد آہی کی نظم کا ہے فرق یہی ہے کہ یہ نظمیں ایک دوسرے کی کاربن کاپی نہیں ہیں۔

"رات بیکراں تو نہیں" ——— احمد ندیم قاسمی کی نظم ہے جو سترہ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ آزاد نظم ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

"ستارے بجھتے رہیں تیرگی امڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنھیں اداس نہیں

دو اور مصرعے یوں ہیں۔

"وہ ایک اور ستارہ لرز کے ٹوٹ گیا
بجا کہ رات بھیانک ہے بیکراں تو نہیں"

شاعر ستاروں کے بجھنے اور ٹوٹنے کی اطلاع دے رہا ہے اور اس کا سبب تیرگی کا امڈنا اور رات کا بھیانک پن قرار دے رہا ہے۔ ہمارے ہاں طور پر تصور یہی ہے کہ ستارے اس وقت بجھتے اور ٹوٹتے ہیں۔ جب تاریکی پھیلتی ہے اور سحر انگڑائی لیتی ہے نہ کہ اس وقت جب کہ رات کی تیرگی بڑھ رہی ہو بلکہ جس قدر تاریک ہو گی، ستارے اسی قدر نمایاں ہوں گے۔ ہاں اگر شاعر نے ستاروں سے کچھ اور مراد لی ہے تو "ستارے" اس مفہوم کو پورا نہیں کرتے تاویل پیش تو کی جا سکتی ہے لیکن بات ایک طبعی حقیقت کے خلاف ہو گی

دو اور مصرعے ہیں۔

"افق دھڑک تو رہا ہے سجھائی دے کہ نہ دے
شفق اُبل تو رہی ہے دکھائی دے کہ نہ دے

پہلا مصرعہ پھر بھی کچھ مفہوم رکھتا ہے لیکن دوسرا مصرعہ سراپا پہیلی ہے۔ "افق دھڑکنا" میں کون سا مفہوم ہے اور شفق کا شاعر کے الفاظ میں "اُبلنے" کے بعد دکھائی نہ دینا آخر کیا بات ہے؟

میں نہیں سمجھتا کہ حقیقت پسند مورخ ادب اور انقلابِ ایشیا کی تاریخ میں اس نظم کو کوئی مقام بھی دے گا۔

"یانگ سی کو سلام" ——— پرویز شاہدی کی تخلیق ہے۔ یہ بڑی طویل نظم ہے جو (۱۲۰) مصرعوں (آٹھ بندوں آٹھ مصرعے) پر مشتمل ہے۔ پہلا بند بڑا اچھا ہے۔

غریب چین سو رہا تھا بے کسی کی گود میں
بہار تھی بجھی ہوئی فسردگی کی گود میں
سسک رہی تھیں نکہتیں کلی کلی کی گود میں
تڑپ رہی تھی رُوحِ نغمہ خامشی کی گود میں
رُخِ سحر چھپا ہوا تھا رات ہی کی گود میں
مگر ابال پل رہا تھا یانگ سی کی گود میں

"بہار" "نکہتیں" "روحِ نغمہ" "رخِ سحر" اور "ابال" کے ساتھ "غریب چین" کچھ اچھا نہیں۔ اگر مصرعہ یوں ہوتا کہ چین کی زندگی بیکسی کی گود میں سو رہی تھی تو بڑی نفاست پائی جاتی۔ دوسرا مصرعہ کس قدر عجیب ہے۔

"بہار تھی بجھی ہوئی فسردگی کی گود میں"

دوسرا بند میری بے علمی یا کور ذوقی ہے کہ مجھ سے بالاتر ہے مجھے اس بند میں مفہوم نہ ملا۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہاتھی دانت کا بڑا خوبصورت مینارہ ہے جس میں کچھ بھی نہیں ——— اسی بند کا آخری شعر ہے۔

نگاہِ وقت یانگ سی کی موجوں سے لپٹ گئی
"چیانگ" کی وہ کشتیٔ "ٹرومنی" الٹ گئی

شاعر نے "موجوں" کو "فاع" کے وزن پر باندھا ہے۔ "وقت کی نگاہ کا موجوں سے، اور وہ بھی دریا کی موجوں سے لپٹنا" اور "کشتی ٹرومنی" کے کیا معنی ہیں۔ کون جانے۔

"شاعر ٹرومنی کشتی" کا مفہوم پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن "کشتی ٹرومنی" سے "ٹرومنی کی کشتی" کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے جو مہمل سی بات ہے۔

تیسرے بند کا پہلا مصرعہ دوسرے بند کے آخری مصرعہ کی الٹ پھیر ہے اور وہی "کشتی ٹرومنی" موجود ہے۔ دوسرا مصرعہ ہے۔

ٹرومنوں کی دوستی لے کی عجیب دشمنی

یہ بھی مفہوم کے اعتبار سے کھٹک رہا ہے اسی طرح اس بند کا آخری مصرعہ کہ

"ہزار اسلحے لئے تھی پیسفک کی رہزنی"

"پیسفک کے رہزن ہزار اسلحے لئے ہوئے تھے"۔ شاعر یہ مطلب ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن "پیسفک کی رہزنی" نے مفہوم کو گم کر دیا ہے۔

مگر عوام ناؤ کو بڑھاتے ہی چلے گئے
اِک اِک مصور کو بلبلا بناتے ہی ۔۔ —

شاعر نے یہاں "بڑھاتے" اور "بناتے" کو "مفاعل" کے وزن پر باندھا ہے "مصور کا بلبلا بنانا" کتنی عجیب بات ہے نہ نفاست نہ شعریت، اسی طرح چوتھے بند میں شاعر نے "سوکھے" اور "گھاؤ" کو "فاع" کے وزن پر باندھا ہے۔ پانچویں بند میں "گرجتے" "مفاع" کے وزن پر ہے۔

"کڑک دھمک حریف کی فسانہ بن کے رہ گئی"

اسی بند کا مصرعہ ہے۔ "کڑک دھمک" مصرعہ کی شعریت پر بار ہے اور اس سے بہتر لفظ کا انتخاب مصرعہ کی قدر کو بڑھا سکتا تھا۔

چھٹا بند کافی اچھا ہے لیکن ایک مصرعہ میں شاعر نے "مزدوروں" کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے "محنتوں" باندھا ہے۔ ساتواں بند تو اس نظم کی جان ہے اسی کا مصرعہ ہے۔

"مہک رہا ہے آرزو کے گیسوؤں کا گلستاں"

اس مصرعہ میں "گیسوؤں" وزن کی تکمیل ہے اور بھرتی کے الفاظ ہیں۔ ان کے بغیر مفہوم مکمل ہے۔ یوں بھی "آرزو کے گیسو" کوئی بامعنی بات نہیں۔ اسی بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"حسین مانگ بن گئی ہے سجدہ گاہِ کہکشاں"

یہ مصرعہ بند میں بے معنی اور بے محل طور پر جڑا گیا ہے۔ بعد کے بند میں بھی ایک مصرعہ عجیب ہے۔

"کہ دھو رہی ہیں ہمتیں گناہِ ارضِ ایشیا"

"ارضِ ایشیا کا گناہ" کیا ہے؟ یہ ایک معمہ ہے بند کا کوئی اور مصرعہ اس پر روشنی نہیں ڈالتا۔

اس بند میں شاعر نے "گھاؤ" شاید "موڑ" کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو فصیح لفظ نہیں۔ دسویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"سفید نفع خوریوں کے دام میں نہ آئیں گے"

بحر اور وزن کی خاطر شاعر نے "نفع خوریوں" استعمال کیا ہے۔ ورنہ "نفع خوروں" کے استعمال سے مصرعہ میں مفہوم آتا ہے۔

"حریص ملک گیریوں کے حوصلے مٹائیں گے"

"ملک گیریوں" کا وہی حال ہے جو "نفع خوریوں" کا ہے۔ "ملک گیروں" ہونا چاہئے تھا۔

"کمینہ جنگ باریوں کی گردنیں جھکائیں گے"

"جنگ باریوں" کی بجائے "جنگ باروں" کا استعمال چاہئے تھا۔

اسی بند کا مصرعہ ہے۔

"ذلیل کتوں کو یہاں سے مار کر بھگائیں گے

"کتوں" کو "فاع" کے وزن پر باندھا گیا ہے۔ یہ مصرعہ کہ سارے بند کو گرا رہا ہے۔ شاعر نے بات کتنی رکیک کہی ہے۔

"نظام پیر و کہنہ کو جوانیاں مٹائیں گی"

گیارہویں بند کا یہ پہلا مصرعہ ہے۔ "نظام" کے ساتھ "کہنہ" کافی اور موزوں تھا لیکن وزن کی تکمیل کے لئے شاعر نے "پیر" جیسا غیر موزوں لفظ بھرتی کیا ہے۔

بارھویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"پہن کے کھدری لباس اکڑ رہے ہیں سیم و زر"

"سیم و زر" کیا خاک اکڑیں گے۔ "مالکانِ سیم و زر" یا "صاحبانِ سیم و زر" کا استعمال چاہئے تھا۔

"نہ اور وار ہو سکے سفید تخت و تاج پر
فرنگ نے بنائی ہے یہیں کے سونے کی سپر"

ان دونوں مصرعوں میں تعلق پیدا کرنے کے لئے حرفِ علت ضروری تھا جس کے بغیر مفہوم ہلاک ہو رہا ہے۔ تیرھویں بند کا دوسرا مصرعہ ہے۔

"جوان حافظوں میں کل کی ہمتیں جوان ہیں"

"حافظوں میں ہمت کا پایا جانا" ممکن ہے ہوتا ہو تو انقلابیوں میں ہوتا ہو ورنہ عام انسان کے حافظے میں نہیں۔ سینے یا دل میں ہمت ہوتی ہے۔ نظم کے آخری دو بند خیالات کے اعتبار سے بہت اچھے ہیں۔

"شمالی کوریا" ———— جاں نثار اختر کی

آزاد نظم ہے۔ جو چھبیس پچیس مصرعوں پر مشتمل ہے اور راہی ریاض اور دوسرے کئی شعرا کی تخلیقات سے زیادہ سلجھی ہوئی ہے اس کے تین مصرعے ہیں۔

"اب کہاں تیری سرحد پہ دشمنوں کی صف آرائیاں ہیں"
"شاندار کی پسپائیاں ہیں"
کوریا! جنگ کے دیوتاؤں سے کہہ دے"

پہلے دو مصرعوں میں "ہیں" غیر ضروری اور وزن کی تکمیل کے لئے لایا گیا ہے۔

"مراحل" ———— جاں نثار اختر کا قطعہ بند ہے جو

۳۲ مصرعوں پر مشتمل ہے اس کا ایک بند ہے۔

"آج ابھرتے ہیں وہ گھنگھور اندھیرے لیکن
جن میں ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں راہوں کا سراغ
وہ اندھیرے کہ نکلتے ہوئے ڈرتی ہے نگاہ
سامنے ہو تو نظر آئے نہ منزل کا چراغ

پہلے مصرعے میں "لیکن" غیر ضروری ہے اور باقی مصرعوں کے مفہوم کے اعتبار سے بے محل ہے۔ تیسرے مصرعے میں "نگاہ" کی مناسبت سے "نکلتے ہوئے" کی بجائے "گذرتے ہوئے" زیادہ واضح مفہوم پیدا کر سکتا تھا۔

"استقلالِ میکدہ" ———— حضرت

جوش ملیح آبادی کی نظم ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ نظم کے ابتدائی حصہ میں "وقت" کہتا ہے۔

"گردشوں کا شاہ ، صبح و شام کا سرخیل ہوں
حشتوں کا کارواں ، آوارگی کا سیل ہوں"

پہلے مصرعہ میں "گردشوں کا شاہ" اور "صبح و شام کا سرخیل" یعنی اسرِ اعلیٰ دوسرے مصرعہ میں "کارواں" اور "سیل" بن گیا ہے۔ "حشتوں کے کارواں کا امیر" کہا جاتا تو مناسب ہوتا اور "آوارگی کا سیل" کتنی عجیب بات ہے۔ یعنی وقت جو انتہائی پابند ہوتا ہے اسے "آوارگی کا سیل" قرار دینا شاعر کے لئے بھی جائز نہیں۔ وقت اگر آوارہ ہو تو پھر یہ صبح و شام اور روز و شب کا بندھن کہاں رہے گا اور نظامِ کائنات کا کیا حشر ہوگا! ایک اور مصرعہ ہے۔

"اب مرا عزم اور ہے میرے ارادے اور ہیں"

"عزم" اور "ارادے" ہم معنی الفاظ ہیں فرق یہی ہے کہ ایک واحد ہے اور دوسرا جمع۔ نصف مصرعہ محض وزن اور بحر کی تکمیل ہے ورنہ بے معنی! ایک شعر ہے۔

"آ کہ تیرے میخانۂ رنگیں میں اے جادو بیاں
رہ نہیں سکتا انگلستان اب پیرِ مغاں"

پہلے مصرعہ میں "آ" غیر ضروری ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "پیرِ مغاں" کی مناسبت سے "انگلستان" کی بجائے "انگریز" ہونا چاہیئے۔

دور تک گونجا ہوا ہے کشتہ قمقموں کا دھواں
مغبچوں کے جسم پر ہیں پارہ پارہ وردیاں

پہلے مصرعہ میں "دھواں گونجا ہوا ہے" میں کونسا مفہوم ہے۔ آواز گونجتی ہے نہ کہ دھواں اور دھواں پھیلتا ہے نہ کہ گونجتا ہے۔

آنسوؤں سے ہر سبو کی آنکھ ہے چھلکی ہوئی
گردنِ مینا ہے بارِ کرب سے ڈھلکی ہوئی

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں جوش صاحب نے ساغر و مینا کی آخر کونسی کیفیت باندھی ہے۔ ایک اور شعر ہے۔

کوثر و گنگا کے دھارو! ایک ہو مل کر بہو
موت کے غل کو نگل لو زندگی سے جی بچو

"موت کا غل" کیسا؟ موت تو بڑی خاموش اور سرد واقع ہوئی ہے۔ غل ہوتا ہے تو وہ زندگی کا ہوتا ہے جبکہ وہ موت سے ہم کنار ہوتی ہے اور تکلیف سے بلبلا اٹھتی ہے۔ شعر کے دونوں مصرعوں میں دو جدا جدا باتیں ہیں۔ جن کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔

سخت جانِ اخلاص! چھا جا نیم جانِ املاک پر
اے زمینِ سرد! بڑھ کر ہات ڈال افلاک پر

"نیم جانِ املاک" اور "زمینِ سرد" سے شاعر نے جو مراد لی ہے الفاظ وہ مفہوم پیدا نہ کر سکے۔

اے جواں ہمت ادیبو! خفتہ عزموں کو جگاؤ
اے تجلّی کے پیمبر شاعرو! شمعیں جلاؤ

اس شعر میں "عزموں" دراصل "عزم" کی جمع ہے جسے عزائم ہونا چاہئے تھا۔

بارگاہِ عید کے اے روزہ دارو! السلام
خشک میخانے کے پیاسے بادہ خوارو! السلام

"بارگاہِ عید" کا کیا مفہوم؟

اب کسے چھیڑیں؟ ربابِ مُردہ میں دم خم کہاں
اب وہ اگلا سا ہماری بزم کا عالم کہاں

دم خم نہیں رہا۔ رباب پہلے بھی مُردہ تھا اب بھی مُردہ ہے۔ یہاں دم خم کا سوال ہی غلط ہے۔ مصرعہ میں اگر "ربابِ مردہ" کی بجائے صرف "رباب" استعمال ہوتا تو وہ مفہوم پیدا ہو سکتا تھا جو شاعر نے پیدا کرنا چاہا ہے۔

ڈگمگا کر اب بہکیں گے ہم شرابِ گلفشاں
گائیں گے ناچیں گے جھومیں گے زمین و آسماں

شراب" ہم "پی رہے ہیں اور "اثر" ہو رہا ہے "زمین و آسمان" پر تب ہی تو وہ گانے ناچنے اور جھومنے لگے ہیں پھر شراب "ڈگمگا" کر پی جا رہی ہے۔

"حکم دے سرمایہ داری کو دکھائے اب نہ بھاؤ
صنعتو! محنت کشوں کے آستاں پر سر جھکاؤ"

اس شعر میں اگر کوئی واضح مفہوم ہے تو وہ شخص کو دہم ہے جو میری طرح نہ سمجھ سکے۔ اگر اس پر شاعر یا مرتب نے فٹ نوٹ دیا ہوتا تو ہر کسی کو سمجھنے میں مدد ملتی۔

خاک کو گرماؤ کہساروں پہ نیزے گاڑ کر
سُرخ کر لو! مسکراؤ بادلوں کو پھاڑ کر

"خاک کو کہساروں پہ نیزے گاڑ کر گرمانا" کیا مفہوم رکھتا ہے؟

آگ کے دھارو! دہکتے لوہے کے بیٹو غنغناؤ
ہاں مشینو! گھڑگھڑاؤ! بجلیو! جنبش میں آؤ

اس شعر میں بحر بدل گئی ہے۔ ساری نظم بحر رمل مثمن محذوف یعنی "فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" میں کہی گئی ہے اور مذکورہ شعر بحر رمل مثمن یعنی "فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن" میں ہے۔ پابند نظم میں بحر کی تبدیلی کبھی جائز نہیں۔

مسکرا تخریب پر، تخریب روتی ہے یوں ہی
دھوپ سے لڑ کر ابر کی تعمیر ہوتی ہے یوں ہی

یہ شعر تخریب اور تعمیر پر الجھ کر رہ گیا ہے۔ "دھوپ سے لڑنے کا ثمر" ابر کی تعمیر ہونا شاید کسی نئے جغرافیہ کی رُو سے ثابت ہو تو ہو یا پھر جوشؔ ملیح آبادی کی نئی تحقیق ہو۔

ہاں تن آسانی کی ڈائن کو پٹک دے اے وطن
دھوپ پر اپنے پسینے کو چھڑک دے اے وطن

"ہاں" وزن پورا کرنے کیلئے شعر میں بھرتی کیا گیا ہے۔ دھوپ مرئی ضرور ہے لیکن مادی نہیں، اس پر پسینہ کیوں کر چھڑکا جا سکتا ہے؟

ادس پڑ جائے گی خونی دھوپ سنولا جائے گی
جب چلے گا جھوم کر ساون کی رات آ جائے گی

آخری شعر ہے جس میں شاعر اطلاع دے رہا ہے کہ جھوم کر چلے گا تو ساون کی رات آ جائے گی لیکن کون چلے گا؟ یہ شاعر سے پوچھئے شعر میں اس کا کوئی پتہ نہیں چل رہا۔

(۴۶) اشعار کی اس نظم میں (۲۱) یا (۲۲) اشعار ایسے ہیں جن کا سقم پہلی نظر میں محسوس ہو رہا ہے۔ میں اسے جوشؔ کی نظم اس لئے ماننے پر مجبور ہوں کہ اس پر ان کا نام درج ہے ورنہ میں اسے کبھی ان کی نظم تسلیم نہ کرتا۔

"چین کو سلام" ــــــــــ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم ہے جو سلجھی ہوئی ہے۔ لیکن وہی طرز اور وہی انداز ہے جو تجزیہ کا ہے شاعر چین کے انقلابیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے وطن کے مستقبل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایک طویل آزاد نظم ہے جس کے بعض مصرعے ہیں:

"زخم جاگ اُٹھے مرے دیدۂ تر جاگ اُٹھے"
"صبح دم اب نئے انداز سے یہ موجِ صبا آئی ہے"
"ہے چھلکنے کو فضاؤں میں یہ صبوحی کا جام"

پہلے مصرعے میں "دیدہ" شاعر نے جمع استعمال کیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے یہ واحد ہے اور واحد سے جمع کا مفہوم لیا گیا ہے آخری دو مصرعوں "یہ" وزن کی تکمیل کے لئے بھرتی ہوا ہے۔

دوسرے کئی شعراء کے مقابلے میں خلیل کے ہاں کافی اُپج

"طلوع اشتراکیت" ——— ساحر لدھیانوی کی نظم ہے اور بڑی اچھی ہے۔ شاعر نے انقلاب کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ یہ نظم اس مجموعہ کی چند اچھی نظموں میں سے ہے

"احساسِ کامراں" ——— ساحر کی دوسری نظم ہے اس کا پہلا شعر ہے۔

افقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو
شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے

یہاں "تاریک جگر" کی بجائے "سیاہ جگر" ہونا چاہئے تھا جگر تاریک نہیں سیاہ ہوتا ہے اور رات تاریک ہوتی ہے۔ یہ نظم بھی اس مجموعہ کی بڑی پیاری نظم ہے "شکستِ زنداں" اور "آہنگِ انقلاب" بھی ساحر کی اچھی نظمیں ہیں جن کی بنا پر اس مجموعہ کی قدر میں اضافہ ہو رہا ہے مقصد سے اختلاف سہی، ساحر کی شعری صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں۔

"سیلابِ چین" ——— سردار جعفری کی تخلیق ہے آزاد ہے اور کوئی سوا دو سو مصرعوں پر مشتمل ہے نظم میں روانی بہت ہے الفاظ کے ساتھ ساتھ خیالات کی۔ روانی شاعری کو جان عطا کرتی ہے لیکن سردار کی دوسری نظم "حرفِ اول" اس قدر نفیس نہیں ۲۳ بندوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا بند ہے۔

ہم نے دیکھے ہیں بہت ظلم و ستم قہر و عتاب
نوچ لیں گے ہم تمہاری سلطنت کا آفتاب
ہم بھی دیں گے اب تمہیں جوتے سے جوتے کا جواب
ہاں بڑے آئے کہیں کے لاٹ صاحب جاؤ جاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

بند کے ابتدائی دو مصرعے کس قدر نفیس اور سلیس ہیں۔ ان میں ایک شان آگئی ہے لیکن آخری دو مصرعے اس پر غبار اڑا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ایک انقلابی شاعر نہیں بلکہ ایک عورت غصہ میں ابل پڑی ہے اور سلاست شوقیت سے جاتی ہے۔ تیسرا بند ہے۔

لد گئے وہ دن کہ جب آقا تھے تم اور ہم غلام
ہم وہ بیکس تھے کہ تم کو جھک کے کرتے تھے سلام
آج ہم ہیں بد دماغ و بدزبان و بدلگام
سر کا بدلہ ہے سر اور پاؤں کا بدلہ ہے پاؤں

شاعر نے ابتدائی دو مصرعوں میں جو بات جس انداز سے کہی وہ انداز آخری مصرعوں میں بدل گیا ہے۔ "بد دماغی" "بد زبانی" اور "بدلگامی" ایسے اوصاف ہیں جو قابلِ ستائش نہیں، اور ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جو احساس کہتری کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو جی میں آئے کہنے لگتا ہے۔ ایک منظم تحریک اور عالمگیر انقلاب جیسی سنجیدہ تحریک کے علمبردار ایسا کیوں کر سکتے ہیں۔

پانچواں بند ہے۔

آؤ استالن کا بھائی، لینن اعظم کا لال
مٹھیوں میں تتلیوں کی طرح روحِ ماہ و سال
نرم آنکھوں میں محبت، گرم ماتھے پر جلال
اس کے کھیتوں بار ہاتھ اور ایشیا والوں کی ناؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

اس بند کا دوسرا مصرعہ جو کچھ معنی رکھتا ہے واضح نہیں ہیں۔ "روحِ ماہ و سال" کا "مٹھیوں میں ہونا" سمجھ میں نہیں آتا۔ تیسرے مصرعے میں آنکھوں کے ساتھ "نرم" اور ماتھے کے ساتھ "گرم" ——— نہ جانے کیوں استعمال ہوئے۔ چھٹے بند کے دو مصرعے ہیں۔

ہم کو اپنی توپ اپنے ٹینک دکھلاتے ہو کیا
ہم نہیں ڈرنے کے جاکر اپنے بھوتوں کو ڈراؤ

"اپنی توپ" واحد ہے اور "اپنے ٹینک" جمع۔ دونوں واحد ہونا تھا یا دونوں جمع۔ آخری مصرعہ میں "اپنے بھوتوں" سے کون مراد ہیں۔ یہ بھوت معمہ بنے ہوئے ہیں اگر مصرعہ یوں ہوتا تو درست ہوتا کہ
"ہم نہیں ڈرنے کے تم سے جاؤ ہم کو مت ڈراؤ"

ساتواں بند ہے۔

یہ کمینے ملک کے غدار، ڈالر کے غلام
جن کے منہ میں تم نے ڈالی ہے حکومت کی لگام
یہ بغل بچے یہ پٹھو بھی نہیں آئیں گے کام
یہ تو ہیں بھاڑے کے ٹٹو ان پہ مت بازی لگاؤ

شاعر سنجیدہ باتوں سے تقریباً گالیوں پر اتر آیا ہے۔ ایک سنجیدہ نظم کے دامن پر شاعر کی یہ باتیں بدنما داغ بن رہی ہیں یہ باتیں سنجیدہ الفاظ میں کہیں زیادہ شعریت کے ساتھ کہی جا سکتی تھیں ———

اسی نظم میں شاعر نے اور کئی سیدھی سادھی باتیں شعری اور سنجیدہ انداز میں پیش کی ہیں۔ آٹھواں بند ہے۔

"تیوریاں بدلے ہوئے ہیں اب زمین و آسماں
بجلیاں لے کر اٹھا ہے دل کی آہوں کا دھواں
آنکھ سے آنسو کے بہتے ڈھل رہی ہیں گولیاں
بن گئے ہیں رائفل کی آنکھ اب سینے کے گھاؤ"

ابتدائی دو مصرعے کس قدر پاکیزہ اور نفیس ہیں اور آخری مصرعے اس بند میں بد نما نظر آ رہے ہیں۔ "سینے کے گھاؤ کس طرح رائفل کی آنکھ بنتے ہیں اور رائفل کی آنکھ کیا بلا ہے۔ کسی لغت سے اس پر روشنی نہیں پڑتی اور نہ دماغ ہی پتہ لگا سکتا ہے۔ نویں بند کے آخری دو مصرعے ہیں۔

ندیوں کے دل پہ چھاپہ مار قدموں کے نشان
دشمنوں کو گھیر لیتا ہے پہاڑوں کا گھماؤ

یہاں "ندیوں کا دل" اور "چھاپہ مار قدم" اور پھر "ندیوں کے دل پہ چھاپہ مار قدموں کے نشان" قطعی بے معنی ہیں۔ "ندیوں کا دل" میں "دل" جمع ہے اور دل واحد ہے۔ یوں بھی "ندیوں کے سینے" ہوتا تو معنی پیدا ہو جاتے۔ "چھاپہ ماروں کے قدموں کے نشان" شاعر کہنا چاہتا ہے اور "چھاپہ مار قدموں" سے یہ مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ قدم چھاپہ مار نہیں ہو سکتے۔ اور ندی پر کسی قسم کا نقش ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس طرح پہلا مصرعہ لایعنی ہے۔ اس بند میں شاعر چینی فوجوں کا قصیدہ گا رہا ہے۔ اور آخری مصرعہ میں وہ پہاڑوں کی مدح سرائی کر رہا ہے کہ

"دشمنوں کو گھیر لیتا ہے پہاڑوں کا گھماؤ"

دسویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"موج سرکش ہے کہ اڑتے ہیں اچھلتے ہیں پہاڑ"

پہاڑ اڑنا معنی رکھتا ہے لیکن پہاڑ اچھلنا کوئی بات نہیں۔ تیلیں اور اچھل کود بھاری بھرکم چیز کے بس کی بات نہیں ہے وہ اڑ سکتی ہے۔ اچھل کود نہیں کر سکتی۔ گیارھویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"گونجتے ہیں بادلوں کی طرح سے برما کے شیر"

"شیر گونجتے" کی بجائے "گرجنا" ہونا چاہئے۔ "بادلوں کی طرح سے" میں "سے" وزن کی تکمیل کے لئے بھرتی کیا گیا ہے۔

پندرہویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"تم کو کچھ مال کے بدلے ملے گی ایک لات"

یقین کیجئے ایک سنجیدہ موضوع پر کہتے ہوئے یہ الفاظ شاعر کی زبان سے نکلے ہیں اور وہ بدیسیوں اور غیر ملکیوں کو ایشیا سے بھاگ جانے کو کہہ رہا ہے کوئی دو عورتیں آپس میں نہیں لڑ رہی ہیں۔ سولھویں بند کا ایک مصرعہ ہے

"پھل رہے ہیں پیڑ کی شاخوں میں تلواروں کے پھل"

"تلواروں کے پھل" سے شاعر نے جو بھی مراد لی ہے وہ شاعر ہی جانتا ہے

سترویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"ایشیا میں ایشیا کا جشنِ آزادی ہے آج"

سردار جعفری کی یہ نظم خیالات کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے لیکن ان خیالات کو شاعر نے جس لباس میں پیش کیا ہے وہ خیالات کے حسن کو ہلاک کر رہا ہے۔

"جہاں میں طوفان آ رہا ہے"

سردار جعفری کی نظم ہے۔ اس کا پہلا بند ہے۔

پہاڑ اور ستاسی کے غاروں سے ان گنت آفتاب نکلے
بغاوتیں وادیوں سے نکلیں پہاڑوں سے انقلاب نکلے
سپاہی بن بن کے زرد دریا کے پہلوؤں سے حباب نکلے
اور ان حبابوں کے تند طوفاں میں چین کشتی چلا رہا ہے

دوسرے مصرعہ میں "پہاڑ سے آفتاب نکلے" کی بجائے پہاڑوں سے آفتاب نکلے ہونا چاہئے تھا۔ آخری مصرعہ سارے بند کے مفہوم کو خاک میں ملا رہا ہے۔ "آفتاب، بغاوتیں، انقلاب، سپاہی" ___ ان تمام طاقتوں کو شاعر نے اپنے مقصد کے پیش نظر ایک تائیدی رجحان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ ان آفتابوں کا، بغاوتوں اور انقلابوں کا اور بغاوت پر آمادہ سپاہی بن کے نکلے والے حبابوں کا حامی ہے۔ اور وہی شاعر اسی بند میں کہہ رہا ہے۔

"اور ان حبابوں کے تند طوفاں میں چین کشتی چلا رہا ہے"

یہاں مفہوم یہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ حباب مخالف ہیں اور ان کے طوفان سے لڑتے اور ٹکراتے چین کشتی چلا رہا ہے۔ یہاں بند میں تضاد آ گیا ہے اور بند ایک خاصی پہیلی ہے۔ جسے بوجھنا ممکن نہیں۔ دوسرا بند

"پرانی صدیوں کو نوکِ سنگین پر اٹھائے ہوئے ہیں دہقاں
دلوں سے بیتاب ہو کے باہر نکل پڑے ہیں دلوں کے ارماں

وہ فوج چلتی ہے جیسے آندھی وہ جھنڈے اڑتے ہیں جیسے طوفاں
زمین کو زلزلوں کا مضبوط ہاتھ جھولا جھلا رہا ہے"

"پرانی صدیوں کو نوکِ سنگین پر اٹھانا" انوکھی بات ضرور ہے لیکن پرانی صدیوں کو دہقاں نے کیوں اٹھایا۔ ان کو اٹھانے سے کیا حاصل ؟ اگر یہ کہا جاتا کہ "حال کو نوکِ سنگیں پر اٹھائے ہوئے ہے" تاکہ اس کو ٹیک مارے اور اس کا خاتمہ کر دے۔ تو ایک بات بھی تھی۔

دوسرے مصرعہ میں شاعر دل کے ارمان کے باہر نکل پڑنے کی اطلاع دے رہا ہے۔ ارمانوں کی بیتابی کی انتہا یہ قرار دینا کہ وہ دل سے باہر نکل پڑے ہیں لایعنی بات ہے "ارمان نکلنا" محاورہ ہے جس کے معنی ارمان کی تکمیل ہے۔ لیکن شاعر یہاں ارمان کو کوئی مادی چیز سمجھ رہا ہے۔ ممکن ہے مادیت کے جذبے کی شدت میں انسان ہر ایسی چیز کو مادی سمجھتا ہو جو غیر مادی اور غیر مرئی ہوتی ہے۔ تیسرے مصرعہ میں "وہ فوج" اور "وہ جھنڈے" میں "وہ" وزن کی تکمیل کے لئے بھرتی ہوا ہے۔ چوتھے مصرعہ میں شاعر کہتا ہے "زلزلوں کا مضبوط ہاتھ"۔ یعنی تمام زلزلوں کا ایک ہاتھ ہے۔ زلزلوں کے مضبوط ہاتھ یا زلزلہ کا مضبوط ہاتھ کہا جاتا تو سقم باقی نہ رہتا۔ شاعر نے یہاں واضح نہیں کیا کہ کون سے زلزلے ہیں۔ مفہوم تو یہی پیدا ہو رہا ہے کہ قدرتی زلزلے زمین کو جھلا رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ شاعر نے زلزلوں سے مراد انقلابی طاقت لی ہے لیکن مصرعہ سے یہ مفہوم متبادر نہیں۔

نکل گیا چین میں دیوالہ ہی ڈین اچی سن کی سازشوں کا
بنی ہے انجام چیانگ جیسے حرام خوروں کی کاوشوں کا

شعر جیسے نازک آبگینے میں "حرام خوروں" جیسی سنگلاخ چیز کتنی بے وضع ہے۔ پہلے مصرعہ میں "ہی" بھرتی کا لفظ ہے۔ پانچواں بند ہے۔

کہاں ہو امریکی بدمعاشو! یہ چین کا انقلاب دیکھو
تمہارا منہ ایک ہی طمانچے میں پھر گیا ہے جواب دیکھو
وہ کس طرح مسکرا رہے ہیں شہید روحوں کے خواب دیکھو
چمکتی کرنوں کی جوت پڑتی ہے ایشیا جگمگا رہا ہے

پہلے مصرعہ میں "یا" اور تیسرے میں "وہ" بھرتی کے الفاظ ہیں۔
پہلا مصرعہ "امریکی بدمعاشو!" کے استعمال کی بنا پر شعریت کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ترقی پسندوں کی یہ عام خصوصیت ہے کہ ایسے الفاظ کو شعر کے لطیف پیمانے میں سمو دیتے ہیں۔ اس کو سوقیت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ترقی پسندی ایسا مذہب ہے جس میں یہ سب کچھ جائز ہے۔ ان فن کاروں کو شاید یہ نہیں معلوم کہ "بدمعاشو!" یا "حرام خوروں" جیسے الفاظ کو لطیف انداز میں ان کی مکمل شعریت کے ساتھ ایک خوبصورت رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ طنز کا بڑا تیکھا اور پسندیدہ پہلو ابھر آتا ہے۔

"خواب مسکرانا" جتنی عجیب بات ہے اتنی ہی عجیب بات "شہید روحوں کے خواب" ہے۔ "شہید روحوں کے خواب" کی بجائے "شہیدوں کے خواب" ہونا چاہئے تھے۔ "روح" جب استعمال کر ہی رہے ہیں تو یہ تصور اس سے ضرور وابستہ رہے گا کہ وہ لافانی ہوتی ہے اسے شہید قرار دینا یا شہید قرار دے کر کچھ مراد لینا غلط قسم کی بات ہے۔ چھٹے بند کے دو مصرعے ہیں۔

پکار کر چین کہہ رہا ہے کہ ایشیا کی نجات ہوں میں
جو اسٹالن کے دل سے نکلی وہ ماؤ کے لب کی بات ہوں میں

پہلے مصرعہ میں "چین کہہ رہا ہے کہ میں ایشیا کی نجات ہوں"۔ لیکن چین غلطی کر رہا ہے۔ چین کو یہ کہنا چاہئے کہ میں ایشیا کے لئے باعث نجات ہوں۔ نجات ایک علیحدہ چیز ہے۔ خود چین کیسے 'نجات' ہوگا ؟

دوسرے مصرعہ میں شاعر یہ کہنا چاہتا تھا کہ "اسٹالن کے دل کی بات ہوں جو ماؤ کے لب سے ادا ہوئی"۔ مصرعہ سے یہ مفہوم متبادر نہیں۔ ساتویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"یہ وہ سخاوت ہے جس نے کھیتوں کو روٹیوں کی طرح سے بانٹا"

یہاں "سے" قطعی بھرتی کا لفظ ہے۔

دسویں بند کے دو مصرعے ہیں۔

لچکتا ابرو نگار جیں کا دلوں پہ جادو چلا رہا ہے
ہمالیہ پر کھڑا ہے ماؤ اور ایشیا کو بلا رہا ہے

"قدم بڑھا رہے ہیں ہم" ــــــ یہ نظم بھی سردار جعفری کی ہے۔ پہلے بند کے دو مصرعے ہیں۔

"یہ وقت وقتِ سرکشی ہے سر اٹھا رہے ہیں ہم
یہ صبح صبحِ انقلاب گیت گا رہے ہیں ہم

دوسرا مصرعہ تکمیل کے لئے "ہے" کا محتاج ہے۔ دوسرا بند ہے

"قدم بڑھاؤ راستوں کے پیچ و خم میں کچھ نہیں
گراؤ بجلیاں اب آنسوؤں کے نم میں کچھ نہیں
بس اک قدم کا فاصلہ ہے اک قدم میں کچھ نہیں
یہ منزلِ حیات لو ہے مسکرا رہے ہیں ہم

پہلے اور تیسرے مصرعے میں "میں" کا استعمال کوئی مفہوم نہیں رکھتا

"آنسوؤں کے نم میں کچھ نہیں" سے شاعر نے شاید یہ مراد لی ہے کہ آنسوؤں سے کچھ حاصل نہیں۔ یا آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہیں۔ مصرعہ سے یہ مفہوم بڑی حد تک ابھرتا نہیں۔ تیسرا بند ہے۔

ہمیں ہے فکر دامنوں کی اور نہ آستیں کی
ہمارے ساتھ چل رہی ہیں گردشیں زمین کی
بدل گئیں ہمارے واسطے ہوائیں چین کی
ہوائے چین ایشیا میں اب چلا رہے ہیں ہم

پہلے مصرعہ میں "دامنوں" کے ساتھ "آستینوں" چاہئے تھا۔ نہ کہ "آستین"۔ تیسرے مصرعہ میں شاعر اطلاع دے رہا ہے کہ "بدل گئیں ہمارے واسطے ہوائیں چین کی"۔۔۔ اس مصرعہ سے واضح طور پر یہی مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ کسی تیسری طاقت نے ان ہواؤں کو "ہمارے واسطے" بدلا یا یہ ہوائیں خود بخود بدل گئیں "ہمارا" اس تبدیلی میں کوئی ہاتھ نہ تھا اور چوتھے مصرعہ میں شاعر نے اطلاع دی ہے کہ "ہوائے چین ایشیا میں اب چلا رہے ہیں ہم"۔۔۔ ہوائے چین کو ایشیا میں چلانے والی کوئی تیسری طاقت نہیں اور نہ ہوا خود چل نکلی ہے بلکہ "ہم چلا رہے ہیں"۔۔۔ شاعر کو یا تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ "ہم نے چین کی ہوائیں بدلیں اور اب ان ہواؤں کو ایشیا میں چلا رہے ہیں"۔ یا یہ کہنا تھا کہ "چین کی ہوائیں بدلیں اور وہ ہوائیں ایشیا میں چل نکلی ہیں"۔۔۔ شاعر کے الفاظ اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ "چین کی ہوا ہمارے واسطے بدلی اور اس ہوا کو ہم ایشیا میں چلا رہے ہیں"۔۔۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ چین کی ہوائیں بھی اسی طاقت اور اسی تحریک نے بدلی ہیں جو ان ہواؤں کو آج ایشیا میں چلا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مصرعہ میں "ہوائیں چین کی" باندھا گیا ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں "ہوائے چین"۔۔۔ اور دونوں مصرعہ ایک ہی بند کے تیسرے اور چوتھے مصرعے ہیں۔

پانچواں بند ان دو مصرعوں پر ختم ہو رہا ہے

"دہل رہی ہے موت تو حیات تیز گام سے
نقوش پا سے کتنے مورچے بنا رہے ہیں ہم

پہلے مصرعہ میں اگر شاعر نے "موت تو" باندھا ہے اس کا کوئی مفہوم نہیں۔ اگر "تو حیات تیز گام" باندھا ہے تو "تو" کے استعمال سے شاعر ناواقف ہے۔ بلکہ وزن کی تکمیل کے لئے یہ لفظ مصرعہ میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ چھٹے مصرعہ کے دو بند ہیں۔

"کہیں گھٹا کی گھن گرج، کہیں یہ آبشار ہیں
کہیں خزاں کا روپ ہیں کہیں رخ بہار ہیں

انقلابی طاقتوں کو جن چیزوں سے شاعر نے تشبیہ دی ہے۔ ان میں مناسبت کا فقدان ہے۔ "گھٹا کی گھن گرج" کے ساتھ "آبشار" کی بجائے "آبشار کا بہاؤ" ہونا چاہئے تھا۔ "گھن گرج" غیر مادی ہے اور "آبشار" مادی ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی ایسا ہی ہے "خزاں کے روپ" کے ساتھ "بہار کے رخ" کی بجائے "بہار کا رنگ" مناسبت رکھتا ہے۔

"**ایشیا**"۔۔۔۔۔۔ ظہیر کاشمیری کی آزاد نظم ہے جو دو سو سے زیادہ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی تین مصرعے ہیں۔

"تیرے بیٹے چراغ تفکر لئے
قافلوں کو۔۔۔ جنہیں ظلمتوں میں بھٹکنا پڑا!
منزلوں کا اجالا دکھاتے رہے"

شاعر نے کہا ہے کہ "وہ قافلے جن کو اندھیروں میں بھٹکنا پڑا"۔ اس مفہوم کو دوسرے مصرعوں سے جوڑنے پر مفہوم یہ پیدا ہو رہا ہے کہ "ان قافلوں کو جنہیں تیرے بیٹے منزلوں کا اجالا دکھاتے ظلمتوں میں بھٹکنا پڑا"۔ شاعر نے کہنا یہ چاہا ہے کہ "ان قافلوں کو جو تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے تیرے بیٹے منزلوں کا اجالا دکھاتے رہے"۔ شاعر کے الفاظ سے یہ مفہوم متبادر نہیں۔ "منزلوں کا اجالا دکھانا" بھی کچھ عجیب سی بات ہے۔ اسی طرح بعد کے مصرعہ میں "ناتراشیدہ وقتوں" استعمال ہوا ہے۔ ایک اور جگہ شاعر نے یہ مفہوم پیدا کرنا چاہا کہ وہ انسان جن کے دلوں میں بصارت نہ تھی ان کو بصارت مل گئی۔ لیکن مصرعہ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ "بے بصر زیست کو روشنی مل گئی"

"ہند کی وادیوں میں ہر اک برہمن جب پروہت سے اوتار بننے لگا"

اس مصرعہ میں "ہر اک" غیر ضروری ہے۔ بعد کا مصرعہ ہے۔

"جب انسان ستودھر کے سانچے میں ڈھلنے لگا"

"ستودھر کا سانچہ"، کوئی بات نہیں۔ "ذات پات کا سانچہ" ہو سکتا ہے۔

ایک اور مصرعہ ہے۔

"اس گھڑی تیرے گوتم نے غاروں گپھاؤں میں نروان کا نور پھیلا دیا"

یہاں "غاروں گپھاؤں میں" غیر ضروری ہے۔ ان الفاظ کے بغیر مصرعہ ایک تاریخی حقیقت کی پوری دیانت کے ساتھ ترجمانی کر رہا ہے۔

(باقی آئندہ)

خطوط و نکات

انور صدیقی

اپریل ۱۹۵۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس مرتبہ "معیار" نے ایک جست لگائی ہے اور اپنی پچھلی منزل کو پہنچ گیا ہے۔ درمیان میں اسکا معیار افسوسناک حد تک گر گیا تھا۔ مگر اسکی ذمہ داری ہم سب پر یکساں ہے۔ ادارۂ "معیار" پر اس کی تمام تر ذمہ داریاں نہیں ڈالی جا سکتیں۔ جب ہمارے اچھے لکھنے والوں کے قلم تھک جائیں تو پھر معیار کی کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔

● فاروق بانسپاری کی نظم "عورت" نہایت ہی پاکیزہ ہے مگر بعض جگہوں پر نگاہیں صوری حُسن میں کھو کر رہ جاتی ہیں۔ بہرحال آنچل کو پرچم بنا لینے کے اس دور میں بھی کچھ غنیمت ہے۔

● محمد نیاز کی نظم "دیوانہ پن" اچھی ہے مگر اقبالیاتی اسلوب نے اسکی انفرادیت کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے۔ اسکا صوتی مآخذ اقبال کی مشہور فارسی نظم "نغمۂ ساربان" میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ بعض مدوں کی بے ساختگی میں کمی پیدا ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے کئی مصرعوں میں نثریت سی آگئی ہے۔ اگر نیاز حسن کے تناسب کو برقرار رکھ سکتا تو نظم زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی۔

● مقالوں کا حصّہ کافی معیاری ہے۔ محمد عثمان رمز کا مقالہ "غزل اور غزل گو" پسند آیا۔ رمز کے پچھلے مقالوں کو میں صرف "مجموعۂ اقوالِ آزاد" قسم کی چیز سمجھتا تھا مگر زیرِ نظر مقالہ کو دیکھ کر یہ رائے بدلنی پڑی۔ اس میں غزل کی نفسیاتی ماہیت پر بڑی فکر انگیز بحث ملتی ہے۔ بعض جگہوں پر قطعیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ تمام پچھلی غزلوں کو لاشعور کی پیداوار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ فیصلہ ذرا عاجلانہ معلوم ہوتا ہے۔ غالب کی ابتدائی غزلوں میں ثقالت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ لاشعور کی پیداوار ہیں۔ بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کا شعور اس وقت تک ناپختہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک اچھی غزل کی تخلیق نہ تو مکمل طور پر لاشعور کی رہینِ منت ہوتی ہے اور نہ شعور کی۔ اس کے لئے تو تیلے کی زبان میں ایک متوازن دیوانگی یعنی (Haronomious frenzy) کی ضرورت ہوتی ہے۔ رمز نے تعمیر پسند غزلوں کے لیے "معیار" کی بجا طور پر شکایت کی ہے۔ غزلیں بہت لکھی جا رہی ہیں مگر ان میں کم ہی ایسی ہوتی ہیں جنکو دوام نصیب ہو سکے۔ اکثر غزلیں تو ایسی ملی ہیں جنہیں میں "موت کی انجیل" کہا کرتا ہوں۔ احساس شدّت کے یہ ہرگز معنی نہیں ہیں کہ قاری کو دانتے (Dante) کی "Inferno" میں چھوڑ دیا جائے۔

بہت سے غزل گو شعرا روایت کی آڑ لیکر اپنی فکری کجی کو غزل کے دامن میں چھپانا چاہتے ہیں حالانکہ ایک اچھے نقاد کی تیز بیں نگاہیں اسکی کجی اور ناہمواری تک پہنچ جاتی ہیں۔ غزل کے اشاروں میں بھی نثر کی وضاحت پیدا کی جا سکتی ہے اگر غزل گو کا مقصدی شعور پوری طرح بیدار ہو۔ رمز کا یہ مقالہ تعمیر پسند تنقید میں ایک فکر انگیز رجحان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ رمز کو اسلوب نگارش کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

● سیّد انور علی کا مکتوب بھی اس شمارے کی ایک دلچسپ چیز ہے۔ خط کے اندر واقعتاً بعض اہم مسائل کو چھیڑا گیا ہے۔ مکتوب نگار نے عملی تنقید کی موجودہ روش کو غلط بتایا ہے۔ اگر اس سے مراد غیر استدلالی اور جذباتی انداز تنقید کی مذمت ہے تو اس سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے؟؟ مکتوب نگار نے تنقید نگاری کے لہجے کا بھی سوال اُٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے "اصلاحی تنقید" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایک اچھی عملی تنقید اصلاحی ہونے کے بجائے تخلیقی ہوتی ہے۔

تنقید نگار کی قوت فیصلہ اور (Detachment) سے کسی غلط فہمی میں پڑ جانا اور اُسے غیر تخلیقی سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ اسلامی تنقید تو انقلابی تنقید ہو گی۔ اصلاح پسندی (Reformism) کی مصلحت اندیشی اور پیوند کاری کی

اسلامی تنقید کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسکا لہجہ ہمیشہ بے لاگ ہوگا۔
ہمیں مولانا حالیؔ کی اصلاح پسندی کا احترام کرنا ہے۔ مولانا حالیؔ
بننا نہیں ہے۔ میرے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ میں
تنقید میں کسی قسم کی (Bohemianism) کو رائج کرنا چاہتا
ہوں۔ تنقید کا لہجہ ہمیشہ سنجیدہ اور باوقار ہونا چاہیئے۔ میتھو آرنالڈ
نے جب تنقید میں (Higher seriousness) پر زور دیا تھا تو
اسکی مراد اسی پُر وقار سنجیدگی سے تھی۔ تنقید میں میں تاثرات
(Impressionism) کا قائل نہیں ہوں۔ نقد کے لئے
بے لاگ خارجیت ضروری ہے۔ تنقید کی بڑھتی ہوئی دروں بینی اسے
شخصی معیار کا پابند بنا سکتی ہے۔ مکتوب نگار نے آخر میں ادیب
کے سماجی کردار پر زور دیا ہے۔ واقعی ہماری صفوں میں بھی کچھ ایسے
لوگ پائے جاتے ہیں جو اشراف پسندی اور High Brow
کلچر کے فریبوں میں اسیر ہیں۔ ادیب کے کچھ سماجی فرائض ہوتے ہیں
جنہیں اُسے حال میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ ان سماجی فرائض سے
چشم پوشی زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ اور اس فرار کو ذرا زندگی
مشکل ہی سے معاف کرتی ہے۔ اسوقت دبی زبان سے ہماری
ادبی تحریک میں بھی ادیب کی حیثیتوں پر بحث جاری ہے۔ مگر خدا
کا شکر ہے کہ ہماری صفوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو
خدمتِ لوح و قلم کے ساتھ زندگی اور آخرت کے بناؤ کی عملی
تحریک میں حصّہ لینا چاہتے ہیں۔ جہاں بھی ایسے فراری عناصر نظر
آئیں انہیں جلد ختم کر دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں ترقی پسندوں
کی طرح بعد میں تأسف نہ کرنا پڑے

منظر اعظمی

معیارؔ کی پابند اشاعت کے عزم بالجزم پر بڑی مسرت ہو رہی
ہے۔ خدا کرے آپ اسمیں اچھی طرح بامراد ہوں۔
اِس وقت ماہ مئی کا شمارہ سامنے ہے۔ اس سلسلے میں
کچھ عرض کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ شاید کسی قابل ہو۔
ٹائٹل کی تبدیلی بڑی خوش آئند ہے مگر خوش رنگ نہیں۔
رنگ کچھ اور شوخ کچھ اور جاذب توجہ اور مزید کچھ بھڑکتا ہوا ہونا
چاہئے تاکہ پہلی ہی نظر میں معیار کی صوری خوبی دلی نگاہوں کی
خیرگی کا باعث ہو اور پھر جب ہاتھ میں آجائے تو معنوی شکل
دل کو موہ لے گی ہی۔ مگر اس کو بھی کچھ اور فکر و نظر کی معیاری
آمیزی سے دو چند کرنا چاہیئے اور سہ چند کی طرف نظریں لگی رہنا
چاہئیں۔ کتابت اور کاغذ کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے
صفحہ اول پر جو نقوش آپ مرتسم کر رہے ہیں اس کے متعلق
لوگوں کو شکایتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ انداز بیان کی ژولیدگی اور
"ترقی پسندیت" مقصد کے اظہار کے لئے سنگِ گراں ہے۔
دہلی کی ایک ادبی بیٹھک میں ایک صاحب ذوق و شعر پسند عا
نے عجیب ڈرامائی انداز اور کچھ کچھ جھنجھلاہٹ (Frustration)
کے ساتھ فرمایا کہ "بھئی میں نے نقشِ اول کا پہلا جملہ پڑھا او
پھر پرچہ کو تہہ کر کے رکھ دیا۔ اس کی ابہام پسندی اور پیچیدگی
(سے کم میری سمجھ سے بالا ہے"
لیکن اسمیں شک نہیں کہ مواد کی مرئیگی آپ کے وسعت مطا
اور عالی فکری کی آئینہ دار ہے۔ اور ہمکو آپ کے ایک مخصوص اد
مقام کو حاصل کر لینے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس مرتبہ نظم
گو خاصی ہری معلوم ہوتی ہے۔ خدا کرے یہ گود ہمیشہ ہری ر
مضامین میں پہلا اور دوسرا مقالہ قابل قدر ہے۔ البتہ آپ کا مقا
"اصغر علی عابدی — ایک تعمیر پسند قلمکار" تشنۂ تکمیل معلوم ہو
ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ شخصیت کے تعارف کرانیوالے مضا
اس وقت وسیع اور ہمہ گیر ہو سکتے ہیں جبکہ شخصیت خود وسیع اور
ہمہ گیر ہو۔ مگر بہر حال عابدی صاحب کی ادبی شخصیت پر بہت
اور اعداد و شمار کے ساتھ لکھا جا سکتا تھا جسے آپنے نظر انداز کر
جگہ جگہ اپنے تأثرات ہی پر اکتفا کیا ہے۔ شبنم سبحانی صاحب کا
بے بہتی اور سطحی مطالعہ کا جگہ جگہ آئینہ دار ہے۔ نہ تو ہم خرد و جنو
کی پہنائیوں ہی میں ہم آتر پاتے ہیں اور نہ عقل و عشق کی سرحد
ہی کو چھو پاتے ہیں اشعار کی غلط اور بے محل پیوندکاری مضمو
کی ادبی شخصیت کو نقصان پہونچاتی ہے۔ شبنم سبحانی صاحب
بلاشبہ نو مشق ادیب اور نو خیز شاعر ہیں۔ مگر "معیار" کے معیا
انتخاب کو مجروح کرنا ایک کی ہمت افزائی کے لئے بہتوں کی
مایوسیوں کا پیش خیمہ ہے۔ جو ظاہر ہے قابل تحسین عمل نہیں
غزلوں کا حصّہ زیادہ زوردار ہے جس میں جگہ جگہ حسن کا

جا بجا دستی اور صناعانہ فن کاری کے نمونے ملتے ہیں۔ حفیظ۔ کیف۔ سہیل زیدی۔ اور عنوان چشتی کی غزلیں زیادہ جاندار ہیں۔ افسانوں کا پورشن بہت ہی گھٹیا ہے۔ کم سے کم مجھے کوئی افسانہ پسند نہیں آیا۔ اب اسمیں چاہے ترجمہ کی خامی کو دخل ہو۔ یا مصنفین کی تعمیر پسند تخلیقیت کی نا آگہی کو۔ "اُس پار" بنگالی نظم کا ترجمہ اچھا ہے۔ اور ادبی حسن لئے ہوئے ہے۔ اور بقیہ دوسرے مندرجات قابلِ قدر ہیں۔

ابوالمجاہد زاہد

مئی کا معیار ملا۔ اس مرتبہ سرورق بڑا ہیبت ناک ہے۔ اور طباعت نے اس کی وحشت میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے اس سے تو پہلے والا بلاک بہت غنیمت تھا۔ آپ سے مجھے ایک جائز شکایت ہے۔ معیار میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات بہت زیادہ استعمال ہوتی ہیں، اور بسا اوقات بھاری بھرکم عبارتیں بغیر ترجمہ کے نقل کردی جاتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو جعفری کی ترقی پسندی صفحہ ۲۴)

اور لطف یہ ہے کہ بہت سے ایسے الفاظ (بغیر ترجمہ کے) بے تکلف لکھ دئے جاتے ہیں۔ جن کے مترادفات انگریزی سے اُردو میں اچھے موجود ہیں۔

یہ معیار میں ایک بہت بڑی خامی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ورنہ جو لوگ انگریزی نہیں پڑھے ہیں۔ انہیں معیار سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

فاروق بانسپاری کی نظم " آفتاب اور شاعر" بہت پسند آئی۔

اپریل کے شمارے میں فاروق صاحب کی نظم "عورت" بھی کافی حسین تھی۔

ماہر القادری کے سفرِ حجاز کے تأثرات

"کاروانِ حجاز"

کتاب پڑھتے ہوئے آپ محسوس کرینگے کہ جیسے آپ خود بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اور روضۂ رسولؐ پر حاضر ہیں!

شعر و ادب، جوشِ بیان اور قوّتِ مشاہدہ کا خوشگوار امتزاج

خدا و رسولؐ کی محبّت ہر سطر میں جھلکتی ہوئی!

کتاب، ناول سے زیادہ دلچسپ

اور گل و گلزار سے زیادہ رنگین و پاکیزہ

سفرنامہ نہیں، دین و دانش کا منشور

دینی ولولوں کو پیامِ بیداری!

"کاروانِ حجاز" اور ماہر القادری

جیسے ادیب و شاعر کی حُدی خوانی! آپ کے دل کی دھڑکنیں گنگنائیں گی!

اور آپ کی آنکھوں سے خدا اور رسولؐ کی محبت کے آنسو رواں ہوں گے!

خوبصورت سرورق۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت

قیمت مجلّد۔ چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

مکتبہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ا

ہندستان میں ملنے کا پتہ: مکتبہ "تجلّی" دیوبند (یو۔پی)


بچوں کے لئے مزید طاقت
Naunehal
EXTRA GAINS FOR YOUR BABIES
• سالہا سال سے لوگ ہندوستان کے کونے کونے میں اپنے بچوں کو مضبوط اور توانا بنانے کے لئے نونہال کا استعمال کر رہے ہیں۔ اور دن بدن اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔
اب وٹامن اے۔ بی۔ ا بی۔ ۲۔ سی۔ ڈی اور کیلشیم وغیرہ کی آمیزش کے ساتھ اس کا اثر کئی گنا بڑھ گیا ہے۔
نونہال بچوں کو بے حد مضبوط بناتا ہے۔ دانت نکلنے میں مدد دیتا ہے۔ اور بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔
قیمت فی شیشی ایک روپیہ
رسالہ قوم کے نونہال مفت طلب فرمائیے۔
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔
Hamdard
DAWAKHANA (TRUST) DELHI



معیار
The
Maiyar
Monthly

صحتمند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

جلد ــــــ ۵

شمارہ ــــــ ۷

جولائی ۱۹۵۵ء

معیار

ترتیب دینے والے

نجم الاسلام　　　بدر فاروقی۔ ایم۔ اے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

ترتیب

نقشِ اوّل

فکرانگیزی، خوش فکری، اور بلند خیالی ہمیشہ سراہی جاتی رہی ہے۔ آدمی کے ہر کام میں دُنیا کے ہر علم میں ہر تخلیقی عمل میں اِس ذہنی وصف کو بنیادی مقام حاصل رہا ہے۔ عام ذہنی سطح رکھنے والوں کے مقابلے میں حکماء، فلاسفر، شعراء وغیرہ کو اسی لئے اچھی نظر سے دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے اختراعات و ایجاداتِ مضامین میں ذہنی بالیدگی اور فکری توانائی کا غیر معمولی مظاہرہ کیا ہے۔ عام آدمیوں کا ذہن اِتنی توانائی نہیں رکھتا کہ وہ فکرانگیزی کا غیر معمولی مظاہرہ کرسکیں۔ البتہ معمولی مظاہرہ اس شخص کے افعال و کردار اور خیالات و افکار سے بھی ہوسکتا ہے جو معمولی سمجھ ( ) رکھتا ہے۔ ذہنی لحاظ سے معمولی سمجھ وہی درجہ رکھتی ہے جو حسّی لحاظ سے معمولی قوتِ احساس کو حاصل ہے۔ یہ دونوں حسّی اور فکری قوتیں ہر آدمی کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن ہر ایک میں ان کا تناسب مختلف ہوتا ہے جس طرح حواس آدمی کے ہر عمل اور ہر فعل کیلئے ضروری ہیں۔ اِسی طرح فکری قوتیں ذہنی عمل کیلئے ضروری ہیں جسمانی عمل سے حسّی قوتیں ناپی جاسکتی ہیں۔ اِسی طرح سمجھ اور فہم کی قوت کا پیمانہ آدمی کے افکار و خیالات کی وہ توانائی ہوتی ہے جو پہلے تو ذہنی تخلیقات کی صورت میں اور پھر افعال و کردار کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

فکر و خیال کے نتائج افعال و کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس قدر توانا افکار ہوتے ہیں۔ اتنی ہی توانائی افعال و کردار سے ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ خیال ہی عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ فکر و خیال کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود خاص ہوتی ہے۔ کیونکہ خیال ہی عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ فکر و خیال کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود خاص اس امر کی تحقیق و جستجو بہت کم کی گئی ہے کہ یہ ذہنی عمل کیونکر شروع ہوتا ہے، کیسے انجام پذیر ہوتا ہے؟ کن اسباب و عوامل سے اس کو تحریک ہوتی ہے۔ ذہن کا حد عمل کیسے محدود پذیر ہوتا ہے۔ کن کن اصولوں اور پابندیوں کے تحت فکر کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اِس ذہنی عمل کا تعلق علوم و فنون سے کیا ہے۔ کیا اسے سمجھنے کے بعد فکر مزید جلا پا سکتی ہے؟ خام خیالی کسے کہتے ہیں؟ فکر سے عمل کا تعلق کیا ہے۔ اس کے بارے میں غیر متوازن نظریات کے مقابلے میں متوازن نظریہ کیا ہے۔ غرضکہ سوالات کی ایک رَو ہے جو اِس موضوع پر سوچتے ہی بہنا شروع کر دیتی ہے اور بہے چلی جاتی ہے۔

اِس موضوع پر یُوں تو نفسیات اور منطق کی کتابوں میں بھی کچھ نہ کچھ ملتا ہے اور تھوڑا بہت مواد حکماء کے اقوال کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر نفسیات اور منطق کی کتابیں جس مواد کی حامل ہیں اس میں شعبہ جاتی نظریۂ تحقیق کی بدولت بہت سی خامیاں ہیں۔ نفسیات اور منطق کے بیچ میں جو خلا رہ جاتا ہے اس کی حیثیت کی سی ہے۔ جسے کوئی پُورا کرنے پر زور نہیں دیتا۔ اور حکماء کے اقوال بے ترتیب اور نامکمل سے معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بڑے کمرے کے بے شمار، بے ترتیب سامان میں سے چند ایک چیزیں سلیقے سے لگانے کی کوشش کی گئی ہے اور باقی یُوں ہی چھوڑ دی گئی ہیں۔

اگر کوشش کی جائے تو تخلیقی تفکر پر حاصل ہونے والی معلومات کو اصول و ضوابط کا جامہ پہنا کر اسے ایک مرتب شُدہ علم کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ اور وہ جگہ پُر کی جاسکتی ہے جو منطق اور نفسیات کے درمیان خالی پڑی ہوئی ہے۔

جدید نفسیات میں خیال کے موضوع پر بحثیں موجود ہیں اور یقیناً وہ فلسفہ اور منطق کی اس بنیادی ضرورت سے غیر متعلق نہیں کہی جاسکتی لیکن اوّل تو ان میں اِنسان کے ذہنی عمل کا جو تصور کارفرما نظر آتا ہے۔ وہی ایسا ہے کہ اس پر اس عمل کی کج روی اور سلامت روی کا انحصار ہے اور اسی کی بدولت بہت سی اُلجھنیں پائی جاتی ہیں۔ پھر جدید نفسیات ابھی تک اس مرحلے سے دُور ہے جہاں مسلّمات اور مفروضات کی سرحدیں ایک دوسرے سے بالکل نمایاں ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں غیر مقصدی چھان بین سے اس میں ضرورت سے زیادہ پیچیدگی آگئی ہے۔ یہ پیچیدگی مسائل کی پیچیدگی بھی ہے اور طریقِ اظہار اور اندازِ تحقیق کی پیچیدگی بھی۔ جس سے تحقیق و تدقیق کا مدعا عنقا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسا اسلئے بھی ہوتا ہے کہ سعیٔ تحقیق میں ان لغزشوں کی آمیزش بھی شامل ہو جاتی ہے جو مادی وجود، شعور اور ماحول کے تعلق کی تخریب کُن نتائج توجیہات سے جدید نفسیات کے رگ و پے میں سما گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی مسئلہ کے نتائج کا انطباق علم و فن کی کسی عملی شاخ پر کیا جاتا ہے تو نہایت

...منفی اور مضر اثرات پیدا ہونے کا قوی امکان رہتا ہے۔ اس کے ثبوت میں مختلف ماہرین تعلیم کی رائیں سامنے رکھی جا سکتی ہیں۔

نجم الاسلام

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سالِ رواں کے آغاز سے "معیار" پابندیٔ وقت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ دشواریوں کا مقابلہ ...نے ہمت کا دامن تھامے رہیں اور کسی نہ کسی طرح پرچہ کو باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھیں لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر ہی خواہان ...سا "معیار" مشکلات سے نپٹنے کے لئے ادارۂ معیار کو تنہا چھوڑ دیں، ہماری انتہائی کوشش کے باوجود "معیار" ابھی تک اپنا خرچ پورا کرنے کے قابل نہیں ہو سکا ہے۔ ...یہ پرچہ خسارہ میں چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انداز سے پرچہ کو زیادہ دنوں تک جاری نہیں رکھا جا سکتا اس مرحلہ پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر آپ کو "معیار" کی ...زبوں حالی کی طرف متوجہ کریں۔ اگر آپ کے نزدیک "معیار" بہت سے دوسرے پرچوں کی طرح کا کوئی پرچہ ہے اور اس کے جاری رہنے میں آپ کوئی فائدہ نہیں دیکھتے ...س کی زندگی یا موت سے آپ کی دلچسپی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور آپ واقعی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنی چار ساڑھے چار سال کی زندگی میں ...نے تعمیری اور اسلامی ادب کے لئے کچھ کام کیا ہے اور فحش لٹریچر اور تخریبی ادب کے مقابلے میں صالح، پاکیزہ اور صحت مند ادب کو سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اگر آپ کا ...گواہی دیتا ہے کہ "معیار" کے ذریعہ تعمیری اور اسلامی ادب کے وقار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "معیار" نے تعمیر پسند فنکاروں کی تنظیم میں ہاتھ ...ہے اور بہت سے نئے ادیبوں اور شاعروں کی صلاحیتوں کو ابھارا ہے۔ اگر آپ کو اس کا اندازہ ہے کہ "معیار" اپنے بعض لکھنے والوں اور بہت سے پڑھنے والوں کا ...نظریہ بدلنے میں کامیاب ہوا ہے، اگر آپ کو معلوم ہے کہ "معیار" نے اپنا پیغام ان لوگوں تک خوش اسلوبی کے ساتھ اور موثر انداز میں پہنچایا ہے جو اس سے شدید ...بانی اختلاف رکھتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ درست ہے تو آپ کو یقیناً "معیار" کی بقا اور ترقی کی فکر ہونی چاہئے۔ "معیار" اگر آپ کو پسند ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ یہ ...رہے تو آپ کو اس کے لئے تھوڑی بہت جد و جہد کرنی ہی چاہئے۔ یہ اپیل محض ایک جذباتی اپیل نہیں ہے اور ہم خواہ مخواہ آپ سے وقت اور قوتوں کی قربانی ...مانگتے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی تجربہ اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دورِ حاضر میں تعمیرِ انسانیت اور اقامت دین کے لئے "معیار" ایسے پرچہ کی سخت ضرورت ہے اس کی افادیت سے کوئی کند ذہن ہی انکار کر سکتا ہے۔

"معیار" کی جن چند خدمات کی طرف ہم نے اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا ہے اس کی ضرورت کے جواز کے لئے وہی بہت کافی ہیں۔ اتنا کچھ تو انتہائی ...بے سروسامانی اور نہایت غیر اطمینان بخش حالات میں ہوا ہے۔ اس کی بقا کی طرف سے تھوڑا سا اطمینان ہو جائے تو پھر پوری یکسوئی اور کامل توجہ کے ساتھ ...ترقی کی طرف قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ خود پر بھی آپ "معیار" کا کچھ نہ کچھ حق تسلیم کریں۔ "معیار" کے سب ہی ...خواہ اگر اس طرف توجہ دیں اور توسیع اشاعت، اشتہارات کے حصول اور دوسرے جائز طریقوں سے "معیار" کی جڑوں کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں ...کوئی وجہ نہیں کہ مالی مشکلات پر قابو نہ پایا جا سکے۔ اس حوصلہ شکن دور میں بھی اردو کے مقبول عام ہی نہیں بلکہ سنجیدہ پرچے بھی آخر چل ہی رہے ہیں حالانکہ ان ...اخراجات "معیار" کے اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں۔ یقیناً یہ بڑی بد قسمتی ہوگی اگر ہم ایک واجبی خرچ رکھنے والے سنجیدہ ماہنامہ کو جاری نہ رکھ سکے۔

"معیار" کے بند ہو جانے سے اگر کوئی نقصان نہیں ہے تو واقعی یہ بے سود ہے کہ ہم اسے جاری رکھنے کی کوشش کریں۔ وقت اور قوتوں کے اور بہت سے مصرف ہو سکتے ...ہمارے چند احباب ہمیں یہ بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ "معیار" چونکہ اپنے اخراجات پورے نہیں کر پا رہا ہے اس لئے اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ ہم اس ...سے متفق نہیں ہیں۔ اول تو ایسے ماہنامہ کو خریدے گا کون جو خود کفیل بھی نہ ہو۔ اور اگر ایسا کوئی خریدار میسر بھی آ گیا تو وہ اسے تجارتی نقطۂ نظر سے کامیاب بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح وہ مقصد فوت ہو جائے گا جس کی تکمیل کے لئے "معیار" کا اجراء عمل میں آیا تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان حالات پر آپ سنجیدگی سے غور ...یں اور جلد از جلد کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ اس نازک مرحلہ پر آپ کی ذرا سی غفلت "معیار" کے لئے موت کا سبب بن سکتی ہے۔ اور توجہ حیاتِ نو کا پیغام۔

حفیظ میرٹھی

شمیم جاوید

میرے ہمنوا

○

یہ سڑکوں پہ فاقہ زدوں کی قطاریں — یہ مغموم چہرے، یہ اُجڑی بہاریں
یہ سینوں میں مستور ذوقِ شہادت — یہ محلوں میں لرزاں خدایانِ دولت
یہ غمگیں نگاہیں، یہ آنسو، یہ آہیں — محیطِ آرزو پہ آہن کی باہیں
جوانانِ ملت بدلنے لگے ہیں — حقیقت کے سانچوں میں ڈھلنے لگے ہیں

نگاہیں اُفق پر جمائے ہوئے ہیں
چمن میں مرے ہمنوا بڑھ رہے ہیں

○

یہ معصوم دوشیزگانِ سمن بر — نہیں جن کے سر ڈھانپنے کو بھی چادر
نگلتا ہے جن کو امارت کا اژدر — جو بکتی ہیں راتوں کو سکوں میں تل کر
جو کنواری بھی ہیں اور کنواری نہیں ہیں — جو نوری نہیں ہیں، جو ناری نہیں ہیں
جو اسلام کی مائیں ہیں بیٹیاں ہیں — جو تقدیس کے دل کا رازِ نہاں ہیں

کسی سوچ میں سر جھکائے ہوئے ہیں
چمن میں مرے ہمنوا بڑھ رہے ہیں

یہ مظلوم بیوائیں جو زرد رُو ہیں
یتیمانِ ملت جو بے آسرا ہیں
یہ دل جن سے اب تک لہو بہہ رہا ہے
یہ ذہنوں میں جو چل رہی ہیں ہوائیں

یہ اِنساں جو بے گھر ہیں، بے آبرو ہیں
جوانانِ ملت جو فاقہ زدہ ہیں
ہر اِک سانس اک داستاں کہہ رہا ہے
برستی ہوں جیسے لہو کی گھٹائیں

یہ سب ایک سے زخم کھائے ہوئے ہیں
چمن میں مرے ہمنوا بڑھ رہے ہیں

O

یہ خوں جوش میں لانے والے مقرّر
یہ اربابِ دیں کا جہادِ شریعت
خواتین ـــــ جو سربکف آ گئی ہیں
یہ معصوم اطفال ـ یہ شیرزادے

بغاوت کے پیکر یہ بے باک شاعر
یہ کالج کے لڑکوں میں قومی حمیت
نئی شان سے صف بہ صف آ گئی ہیں
بدل دیں گے جو زندگی کے لبادے

کسی خاص مقصد کو لے کر اُٹھے ہیں
چمن میں مرے ہمنوا بڑھ رہے ہیں

فاروق بالسپاری

سینما

دل دادگانِ علم و فن — سرگشتۂ تخمین و ظن
یہ پردۂ سیمیں نہیں — تخریب کا ہے پیرہن
دیتی ہے تابانی جسے — تاریکیٔ تہذیب و فن
عُریاں یہ تصویریں نہیں — پیشِ نظر جلوہ فگن
اہلِ خرد کا جہل ہے — رقصاں بہ اِذنِ اہرمن
سُرخی بہ لب، غازہ بہ رُخ — یہ شاہدانِ سیمتن
سینہ بہ سینہ لب بہ لب — یہ اختلاطِ مرد و زن
یہ محفلِ جام و سبو — یہ آبِ آتش پیرہن
تشریف فرما شیخ جی — محوِ نظارہ برہمن
بیٹھے ہیں شانہ جوڑ کر — مادر، پدر، بھائی بہن

سوچو تو کس منزل میں ہے
انساں کا یہ دیوانہ پن

لبریز صہبا جام ہے — ساقی کا فیضِ عام ہے
پیشِ نگاہِ آرزو — میخانۂ خیّام ہے
رقصاں مذاقِ معصیت — ہمراہِ دَورِ جام ہے
نغمہ بہ لب آغاز ہے — محوِ فغاں انجام ہے
دیکھو وہ پردے کی طرف — پردہ برائے نام ہے
ہر رند کی آغوش میں — اِک شاہدِ گلفام ہے

بوسوں کی لب پر مہر ہے　　نظروں میں اِک پیغام ہے
یہ پیار کے انداز ہیں　　یا بے حیائی عام ہے
اِنسانیت کی موت سے　　آفاق میں کہرام ہے
اِس دَور کے فن کار کو　　خرمستیوں سے کام ہے

تہذیب کی یہ صبح ہے
یا زندگی کی شام ہے

فطری تقاضوں کا اثر　　ہوتا ہے ہر ذی رُوح پر
تفریح کا قائل ہوں میں　　لیکن بہ مفہومِ دگر
تم کو فقط سودائے فن　　اخلاق سے قطعِ نظر
اخلاق ہی میرے لئے　　بالذّات مقصودِ ہنر
تم نفس کے ہو مقتدی　　میں نفس کا ہوں راہبر
آوارۂ منزل ہو تم　　منزل ہے میری ہم سفر
تم کو ترقی کا جنوں　　تعمیر پر میری نظر
میں آشنائے زندگی　　تم زندگی سے بے خبر
جلوہ گہِ ادراک میں　　میری بصیرت مُعتبر
لیکن تمہاری چشمِ وا　　نے حق نگر نے خودنگر
گردوں کی جانب پانوں ہیں　　بالائے فرشِ خاک سر

اِس اِرتقاء پر آفریں
اے مدّعیانِ ہنر

تنویر احسن علوی۔
ایم۔اے

اے مُغنّی!

وہ رُخِ وقت سے نقاب اُٹھا
اُٹھ مُغنّی، اُٹھا رباب اُٹھا
آج اِک رُوحِ اضطراب ہے تُو
آج اِک سازِ انقلاب ہے تُو

تُو نے تاروں کے گیت گائے ہیں
نَو بہاروں کے گیت گائے ہیں
جب بھی تارِ رباب چھیڑ دیا
جیسے ذکرِ شباب چھیڑ دیا

تیرے نغموں کا بولتا جادُو
جیسے کلیوں میں جاگتی خوشبو
اُنگلیوں پر جنُوں مچلتا تھا
ساز میں تیرے سحر ڈھلتا تھا

خانقاہوں کا تُو پُجاری تھا
جشن گاہوں کا تُو بھکاری تھا
ہاتھ غیروں کے مَن کو بیچ دیا
تُو نے سِکوں پہ فن کو بیچ دیا

تیرے اشکوں کی نرم موسیقی
تیرے نغموں میں حل ہوئی نہ کبھی
زندگی تیری راگ بن نہ سکی
تیری لے۔ دِل کی آگ بن نہ سکی

زندگی کا وہ چشمۂ مستور
جس سے ہوتا تھا تیرے فن کا ظہور
اُس پہ رہتا تھا ظلمتوں کا ہجوم
نہ وہاں تیرے پھول تھے نہ نجوم

اَب مُغنّی تو سَاز چھیڑ ایسا
نغمۂ جاں گداز چھیڑ ایسا
جس سے تاروں میں آگ لگ جائے
اِن بہاروں میں آگ لگ جائے
دل کے افسردہ دَاغ جَل اُٹھیں
غم کدوں کے چراغ جَل اُٹھیں

محمّد نیاز

اہرمن لرز اُٹھا

گروہِ سرو و سوسن و سمن لرز لرز اُٹھا
دلِ گلاب و قلبِ نسترن لرز لرز اُٹھا

نئی ہوا میں گلشنِ کہن لرز لرز اُٹھا
فغاں کہ ذرّہ ذرّۂ وطن لرز لرز اُٹھا

زمیں کی بے بسی پہ آسماں بھی کانپ کانپ اُٹھا
چمن کو دیکھ کر اُجاڑ، بن لرز لرز اُٹھا

بشر کی دھاندلی سے پرتھوی دہل دہل گئی
منش کی چال ڈھال سے گگن لرز لرز اُٹھا

یہ کون ہے کہ لوگ جس کو لے گئے تھے جیل میں
عروسِ معدلت کی جان و تن لرز لرز اُٹھا

چلا وہ اس طرح کہ رہگزر سمٹ سمٹ گئی
بڑھا وہ یوں کہ ظلم کا بدن لرز لرز اُٹھا

ہنسا کچھ اس طرح ستم کی دار و گیر دیکھ کر
کہ عضو عضوِ چوبک و رسن لرز لرز اُٹھا

یہ کون ہے کہ لوگ جس کو لے گئے تھے قتل کو
جھکا وہ اس طرح کہ تیغ زن لرز لرز اُٹھا

ہوا ہے یہ کہ جب پیمبرانِ امن آڑ گئے
تو ہر وجودِ شورش و فتن لرز لرز اُٹھا

جو ایک آبلہ بھی راہِ عاشقی میں رو پڑا
تمام خارزار ہی معاً لرز لرز اُٹھا

پیمبرانِ امن و آشتی کی اک نگاہ پر
فساد و شرِ قیصرِ زمن لرز لرز اُٹھا

یہ تن وہ تن ہے جس کے واسطے کفن سیا گیا
مگر نظر اُٹھا کے خود کفن لرز لرز اُٹھا

یہ میکشِ الست ہے، یہ مستِ حق پرست ہے
کہ جس کی ہر ادا پہ اہرمن لرز لرز اُٹھا

ثروت میرٹھی

رباعیات

آج کی حالت

بیکس مجبور کیوں نہ ہمت ہارے   فریاد اگر کرے تو حاکم مارے
سچائی پہ آجاؤ تو روٹی نہ ملے   مکاری پہ آجاؤ تو وارے نیارے

انجام

پائی نہ کسی نے آج تک عمر دوام   آخر میں تو ناکام رہے گا ناکام
کمزوروں پہ ظلم کرکے خوش ہے ظالم   انجام کو دیکھ اپنے کیا ہے انجام

نفس کے بندے

نگاہِ زہد میں لاکھوں فریب کے پھندے   لباس و جسم معطر ضمیر و دل گندے
خدا کا نام زباں پر مگر حقیقت میں   ہوا و حرص کے، دولت کے نفس کے بندے

کشمکش

ہم موت کے ڈر سے آہیں بھرتے بھی رہے   اور زندگیِ عیش پہ مرتے بھی رہے
اللہ اللہ ہماری فطرت کی لچک   ڈرتے بھی رہے گناہ کرتے بھی رہے

خدا کی معرفت

سائنس کی طاقت ہی کو سب کچھ جانا   اے رب تجھے آسانی سے کب رب مانا
جب ختم ہوئیں طاقتیں تجھ کو سمجھے   جب ٹوٹے ارادے تو تجھے پہچانا

سید شفیق احمد۔ ایم۔ اے

اسلوب کی اساسی ماہیت

گذشتہ مقالہ[1] میں اسلوب کی جو تعریف کی جا چکی ہے اُس میں اگر ذرا سی ترمیم کر دی جائے تو پھر اسلوب کی تعریف کچھ اِس انداز میں پیش کی جا سکے گی۔

"اسلوب زبان کی ایک ایسی کیفیت کو کہتے ہیں جو انشا پرداز کے مخصوص افکار و احساسات کی قطعی ترسیل کر دے۔ جہاں افکار غالب ہوں گے وہاں صیغۂ اظہار نثر ہوگا اور جب احساسات شدید طور پر تخیلی قسم کے ہوں گے تو ضروری ہوگا کہ اُن کی ادائیگی نظم ہی میں ہو۔ اسلوب تب ہی مکمل کہلائے گا جب وہ افکار و احساسات کی پوری پوری ترسیل کر دے لیکن اُس کی عظمت کا مدار افکار و احساسات کی اُس وسعت پر ہوگا جس کے حوالے اسلوب بیاں میں موجود ہوں۔"

اُسلوب کی کسی بھی تعریف میں چونکہ ابہام کا ہونا بالکل یقینی سا ہے اِسی بنا پر مذکورہ بالا الفاظ "زبان کی ایک ایسی کیفیت کو کہتے ہیں جو انشا پرداز کے مخصوص افکار و احساسات کی قطعی ترسیل کر دے" ذرا غیر واضح سے معلوم ہوتے ہیں اور احساس ہوتا ہے کہ اسلوب کا مسئلہ اِس تعریف کے باوجود تشریح طلب ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اِس وقت اِس ترسیل کے مسئلہ کو ہی صاف کر لیں کیونکہ اسلوب کی افہام و تفہیم کا سارا انحصار اسی پر ہے۔ افکار و احساسات کی قطعی ترسیل کو اگر نہ سمجھا گیا تو اسلوب کے مختلف محاسن کی تمیز دشوار ہو جائے گی۔ اور اگر ان محاسن کا ادراک نہ کیا گیا تو پھر ادب میں برتری اور فوقیت کا جو اہم نظریہ رائج ہے ممکن ہے کہ وہ بھی بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے۔ مجموعی حیثیت سے ادب میں جس طرح فوقیت کا یہ نظریہ رائج ہے اسی طرح یہ اسلوب میں بھی ہے۔ سب اسالیب بیان کو ایک ہی لحاظ سے جانچنا ایک بہت بڑی تنقیدی غلطی ہے اور اس غلطی کے ازالہ کی واحد شکل یہی ہے کہ ہمارے ذہن میں افکار و احساسات کی قطعی ترسیل کا معاملہ بالکل درست اور واضح ہو۔

افکار و احساسات کو قطعی طور پر دوسروں تک پہنچا دینا بظاہر بڑی سہل سی چیز معلوم ہوتی ہے اور واقعی ایک خاص حالت میں ہے بھی۔ افکار کو مِن وعَن دوسروں تک پہنچا دینے کے سلسلے میں ذرا اقلیدس کی سہولت کا اندازہ تو کیجئے۔ ہم وہاں مسئلہ اثباتی معلوم کرنے کے بعد اس مسئلہ کی ترسیل میں اقلیدس کو ذرا بھی دِقت پیش نہیں آئی ہوگی۔ اُس نے مسئلہ کو سوچا ہوگا اور جوں کا توں بیان کر دیا ہوگا۔ یہ کُل عمل کس قدر سیدھا سادا اور آسان ہے اور پھر ترسیل افکار بھی بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن ترسیل فکر کی یہ نوعیت دراصل ہمارے بحث سے بالکل خارج ہے۔ ادب سے اِس کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اِس قسم کے افکار و دلایل کی ضرورت بڑے بڑے تخلیقی کارناموں کی وضاحت میں تو کبھی کبھی ضرور پڑ جاتی ہے مثلاً افلاطون کی "جمہوریہ" میں تو وہ بنیادی حیثیت کے مالک ہیں لیکن فی نفسہٖ اس قسم کے افکار کا ادب میں کوئی درجہ نہیں ہے۔ اسلوب تو خیر ریاضی کے مسائل اور منطقی استدلال میں بھی موجود ہوتا ہے لیکن ادبی تجزیہ کا اس اسلوب سے کیا تعلق!

ادب میں افکارِ محض کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ ادب میں احساسات کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ اور فکرِ محض احساسات کے تابع رہ کر زندہ رہتا ہے۔ ہجو اور طربیہ ادب کی دو ایسی اصناف ہیں جن میں بظاہر فکر کارفرما اور غالب نظر آتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ان میں بھی احساسات پس منظر میں مستقل متحرک اور اثر انداز رہتے ہیں۔ ہجو اور طربیہ میں احساسات کو فنا نہیں کیا جاتا، وہ اِس میں پیہم جاری و ساری رہتے ہیں لیکن ہجو اور طربیہ کی تشکیل میں وہ جو کردار ادا کرتے ہیں دیگر اصناف سخن میں ان کی اثر اندازی سے وہ بہت کچھ مختلف ہوتا ہے ہجو اور طربیہ کی بنیاد چونکہ ایک رواجی اور رسمی معیار و تصور **Conventional Bias** پر ہوتی ہے۔ جو قطعاً ایک فکری چیز ہے اِس لئے احساسات کی بے لاگ تحریک پر تو طربیہ ایک قید و بند عاید کر لیتا ہے لیکن اُن کو ختم نہیں کرتا۔ احساسات سرگرم کار

---

[1] اسلوب کے موضوع پر اس اہم اور قابلِ قدر مقالہ کی پہلی قسط ماہنامہ "ایشیا" بمبئی میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری قسط اسی جگہ ایک مستقل مقالہ ہے لہذا امید ہے کہ قارئین "صبا" اس کو مکمل تصور نہیں کریں گے۔

سچتے ہیں البتہ ان کا فعل ضرور دبا دبا سا ہو جاتا ہے۔

ادب میں جس فکر کی ضرورت پڑتی ہے اور جو کبھی تو تخلیقی کارناموں میں مضمر رہ کر اور کبھی ظاہر ہو کر ادب میں ساری رہتا ہے وہ اس فکر سے بالکل ممتاز ہے جس کا تعلق سائنس داں، منطقی اور ریاضی کے ماہر سے ہے۔ فکر محض کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس قسم کے رموز اور اشاروں کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے جو مستقل اور اٹل حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک ادیب اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کے استعارات کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ الفاظ کے رموز و اشارات اُن علامتوں سے بالکل جدا اور مختلف ہوتے ہیں جن کا ذکر ابھی سائنس داں اور منطقی کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ الفاظ کی حیثیت اور اُن کا تلازم نہ تو ایک مستقل چیز کہلائی جا سکتی ہے اور نہ اٹل ہے۔ الفاظ کا کردار بے حد متلون اور غیر مستقل ہوتا ہے۔ ایک ہی لفظ ایک جگہ کسی طرح مستعمل ہوتا ہے اور دوسری جگہ کسی طرح۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مابعد الطبیعاتی کو جو اپنے جذبات کا اظہار الفاظ کی علامات کے ذریعہ کرتا ہے ہم ایک شاعر تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، اپنے ذہن کی ادائیگی اور اظہار کے لئے وہ بھی اُن ہی مراحل سے گذرتا ہے جو رومان اور بیاں کے سلسلے میں شاعر کو پیش رہتے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور بحث طلب ہے کہ اس مابعد الطبیعاتی کو ہم اچھے قسم کا شاعر شمار کریں یا بُرے قسم کا۔ کچھ لیجئے کہ افلاطون اور اسپنوزا اچھے قسم کے شاعر تھے اور ہیگل بُرے قسم کا۔

جس فکر کا ادب سے تعلق ہے وہ دراصل احساس ہی کی ایک منظم و مرتب شکل ہوتا ہے۔ جو احساس ایک مستقل شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی حیثیت ایک عقیدہ کی سی ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے ناول یا ڈرامہ میں جس قدر اساسی افکار پائے جاتے ہیں وہ اسی قسم کے "عقائد" ہوتے ہیں۔ جن کی ترتیب دلائل و براہین کے ذریعہ نہیں ہوتی ہے بلکہ جن کو احساسات کی ایک منقلب شکل کہنا چاہئے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ مقالہ نگار جو ماورائی موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اساسی طریقہ پر یہی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے احساسات کو رقم کر سکے حالانکہ اس کا منصب فنی طریقہ پر یہ ہونا چاہئے کہ وہ احساسات سے بچ کر محض افکار کی نشان دہی کرے۔ وہ افکار کی نشان دہی کرتا بھی ہے لیکن یہ اس کے احساسات کی ترجمانی ہو جاتی ہے کیونکہ رفتہ رفتہ اس کے افکار بھی تو اس کے احساسات ہی کی ایک منجمد شکل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ادب خواہ اس کی صنف کوئی بھی ہو احساس ہی کی ترسیل کرتا ہے۔ یہ ترسیل کس طرح انجام پاتی ہے۔ یہی ہمارے مقالہ کا موضوع ہے۔

فرض کیجئے کہ میں آپ سے کہتا ہوں "ان سطور کے لکھتے وقت مجھے اضمحلال سا محسوس ہو رہا ہے، مجھے یہ بھی یقین نہیں ہے کہ میں اپنے احساسات کو یکجا کرنے میں کامیاب بھی ہو سکوں گا یا نہیں۔ لوگ سوچتے ہوں گے کہ میں جہاں قیام پذیر ہوں وہ جگہ بڑی خوشگوار ہے لیکن کہاں۔ ما ہر باد و باراں کی قیامت برپا ہے آسمان پر بادل منڈلا رہے ہیں۔ سورج دو ہفتہ سے غایب ہے۔۔۔"

یہ سطور میں اگر اسی رو میں لکھتا چلا جاؤں تو مجھے یقین نہیں ہے کہ قاری ان کو پڑھ کر میرے احساسات کی صحیح نوعیت کا اندازہ کرے گا۔ اگر اس نے اپنے تخیل پر امکانی زور بھی دیا تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنے اوپر ایک ایسی حواسی کیفیت طاری کرے گا جو میری کیفیت سے کچھ مشابہ ہو گی۔ لیکن اس طرح میرے جذبات کی ترسیل تو نہ ہو سکے گی۔ اس لئے کہ احساسات کی ترسیل سے تو یہ مراد ہے کہ ہم اپنے احساسات کو دوسروں پر من و عن طاری کر دیں۔ میں اگر اپنی کیفیات کو دوسرے شخص پر طاری کرنا چاہتا ہوں تب مجھے چند ایسے اشارات کی ضرورت ہو گی جو پڑھنے والے پر وہی ردّعمل پیدا کر دیں جو میرا تھا جو کم از کم میرے ردّعمل سے مشابہ ہو۔ واوین میں دی ہوئی چند سطروں میں میں نے یہ کوشش کی تھی کہ میں اپنے گرد و پیش کے حالات کو کچھ اس طرح بیان کروں کہ بیان کئے ہوئے حالات قاری کے ذہن میں تاثرات کے ابھرنے میں پوری مدد دے سکیں لیکن فرض کیجئے کہ میری بیان کی ہوئی تفصیلات تو تاثرات کی دوبارہ تخلیق میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن میرے اور قاری کے مزاج میں فرق ہے۔ میرا مزاج ۵ قسم کا ہے اور قاری کا ب قسم کا تو ممکن ہے کہ مذکورہ بالا حالات قاری پر بالکل ہی دوسرا ردّعمل مرتب کریں اور وہ ان احساسات کا یکسر تجربہ ہی نہ کر سکے جن کو میں نے محسوس کیا ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ میرے اس احساس کا ٹھیک اسی طرح دوسروں پر بھی ایک سا ہو تو یہ صرف دو صورتوں میں ممکن ہے۔ یا تو میں ایک ناممکن بات کو مانتے ہوئے یہ سمجھ لوں کہ تمام مزاج اوسطاً ایک سے ہی ہیں اور نتیجتاً ایک ہی قسم کے حالات مختلف طبائع پر بھی ایک ہی قسم کا اثر پیدا کریں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پھر میں اپنے احساس ہی کو ان الفاظ میں محدود کر دوں کہ "میں مضمحل ہوں"۔ بہر کیف ہیں دونوں صورتیں مشکل اور مبہم۔ اس کے علاوہ میں اگر ان دونوں میں سے کوئی طریقہ اختیار بھی کر لوں تو یہ بالکل ممکن ہے کہ اس اختصار اور ابہام میں میرے احساس کی ندرت اور اس کی انفرادیت بالکل ضائع ہو جائے۔

اسلوب کا اساسی مسئلہ بس یہی ہے۔ انشاپرداز کو ہر لمحہ اسی دقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کو کس طرح مجبور کرے کہ وہ بھی مصنف کے احساس کے کردار اور اس کی نوعیت کا اسی طرح ادراک کریں جس طرح اس نے خود کیا ہے۔ واوین میں دی ہوئی عبارت میں جو احساس پیش کیا گیا ہے وہ بالکل سیدھا سادا ہے۔

نہ اس میں کوئی وسعت ہے اور نہ کوئی عمق۔ چنانچہ اس کی ترسیل بھی ایک بڑا ہی آسان فعل ہے لیکن یہی آسان سی چیز ایک دشوار مسئلہ جب بن جاتی ہے جب ترسیل کے لئے کسی بڑے انشا پرداز کے ایسے احساسات ہوں جو مربوط ہو کر ایک جامع نظام کی شکل اختیار کر چکے ہوں اور پھر اس موضوع میں ضم ہو کر رہ گئے ہوں۔ جس کی ترتیب انشاپرداز کے فکر نے کی ہو۔ جہاں احساس کا روپ بدل گیا ہو اور وہ فکر کے زیر اثر رہ کر فکر سے متاثر ہو کر بدلی ہوئی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں انشاپرداز کے لئے یہ ایک مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر احساس کی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے اپنے احساسات کو دوسروں تک اس طرح پہنچا سکے کہ دوسرے بھی حواسی تشبیہات کے اعتبار سے انہی کی تصویر بن جائیں۔ یہ ایک کارِ عظیم ہے اور اس پر عبور پانا اسلوب کو رام کرنے کے مترادف ہی سمجھنا چاہئے۔

اسلوب کے اساسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک مرتبہ پھر اسٹینڈ ہال کی کی ہوئی تعریف پر نگاہ ڈال لینی چاہئے۔ وہ کہتا ہے: "اسلوب کسی مخصوص فکر کو ان تمام کوائف سے لبریز کر دینے کی سعی کا نام ہے جو ایک کافی و شافی تصور پیدا کر سکیں۔ ایک ایسا تصور جو اس مخصوص فکر سے ناگزیر طور پر پیدا ہی ہونا چاہئے، ایک ایسا تصور جو ان کوائف کا لازمی نتیجہ بن سکے اور جس کی تخلیق پر پڑھنے والے کا ذہن مجبور رہو"۔ اس تعریف کے تجزیہ کے سلسلے میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہاں فکر سے مراد فکر محض نہیں ہے بلکہ ان عقائد، مشاہدات اور الہامی کیفیات سے ہے جو ابھی اظہار کے مرحلہ سے گذری بھی نہ ہوں اور صرف انشاپرداز کے ذہن ہی میں محفوظ ہوں۔ اسلوب کی اس تعریف میں "ایک ایسا تصور جو اس مخصوص فکر سے ناگزیر طور پر پیدا ہونا ہی چاہئے" والا پارہ کسی قدر عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ امر واقعہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشاہدہ، احساس یا فکر کا اظہار خود بخود ہی وہ اثر پیدا کرے گا جو ہونا چاہئے یا جو ادیب پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن حقیقت اس سے قطعاً مختلف ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے فکر کا اظہار کیجئے اور اس کا اثر پیدا ہو کے ہی رہے گا لیکن دراصل اثر کا پیدا ہونا ایک بالطبع فعل نہیں ہے بلکہ منحصر ہے اظہار کے احساس اور اس کی ترجمانی پر۔ مثلاً واوین میں دی ہوئی مثال میں "میں مضمحل ہوں" نے فکر اور بنیادی خیال کو تو ظاہر کر دیا لیکن اس نے وہ قطعی اثر پیدا نہیں کیا جو مضمحل شخص کے حواس پر طاری تھا۔ اگر اسی اضمحلال کو قطعی طور پر ظاہر کیا جائے تاکہ یہ اثر پیدا کر سکے تو پھر انشاپرداز کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اسٹینڈ ہال کے بتائے ہوئے طریقۂ کار کو استعمال کرے۔

مندرجہ بالا مثال میں بھی اسٹینڈ ہال کے مشورہ کے مطابق فکر کو ان تمام کوائف سے مملو کرنے کی کوشش کی گئی تھی جن کے اضافہ کے بغیر احساس کا قطعی رنگ ناممکن تھا۔ اضمحلال نفسیات کا ایک ابتدائی یا انتہائی تصور ہے۔ اگر میں صرف اضمحلال کہنے پر اکتفا کرتا تو قاری شاید سمجھ نہ پاتا۔ اپنے اضمحلال کے صحیح کردار کو واضح کرنے کے لئے میں نے چند صورتیں ایسی بہم پہنچانے کی کوشش کی جس سے قاری بھی اسی احساس کی تخلیق کر سکے جس کا میں اسیر تھا۔ میں نے جو کیا وہ اسٹینڈ ہال کے بتائے ہوئے عمل کے عین متوازی تھا۔

اپنے اضمحلال کو میں جس طور پر بیان کر رہا تھا اگر اس کو جاری رکھتا اور اضمحلال سے متعلق مزید کیفیات کا اپنے بیان میں اضافہ کر دیتا یا پھر اپنے ماحول رجحان اور افتادِ طبع کا ذکر بھی کر دیتا تو پھر شاید قاری میری صحیح کیفیت کا پورا اندازہ کر لیتا۔ ان سب فروعی سہاروں کے ذریعہ میرے احساس کی تشخیص اور میرے فکر کی وضاحت تو ہو جاتی مگر ایک نقصان بھی ہوتا۔ میرے بیان میں نہ تو تناسب باقی رہتا اور نہ وہ فکر کل جس میں اضمحلال کی کیفیت محض ایک جزو کی ہے۔ اضمحلال کے بیان میں الجھ کر میں اس بڑے احساس کو شاید بھول جاتا جو اس وقت میری طبیعت پر ایک کل کی طرح غالب تھا۔ اس کے علاوہ ان فروعی تفصیلات اور واقعات کے سیدھے سادے شمار سے ایک سوانح عمری میں تو مدد مل سکتی ہے لیکن لطیف احساسات کے ضمن میں اس کی گنجائش ہرگز نہیں ہے۔ اپنے احساس کے قطعی اظہار کو غیر ضروری تفصیلات سے بچانے کے لئے مجھے لازم ہے کہ میں ذکر کے لئے پھر چند ایسے چیدہ واقعات کا انتخاب کروں جو جامع ہوں اور انتہائی اہمیت کے حامل ہوں۔ مجھے "میں مضمحل ہوں" والی مثال میں ایسے حالات کا اضافہ کرنا لازم ہے جس سے میرا فکر اسی قدر اثر پیدا کر سکے جتنا اس سے متوقع ہے۔ ناقدین کہیں گے کہ فکر کو پُر کار بنانے کے لئے تفصیلات اور حالات کے اضافہ کے لئے مجھے انتخاب کے عمل سے کام لینا چاہئے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس کا فیصلہ ہی کیسر مشکل ہے کہ کیا چھانٹا جائے اور کیا نہیں۔ اسٹینڈ ہال کہتا ہے کہ واقعات کا اضافہ کر دو لیکن واقعات کے اضافہ کے لئے پہلے ان کا انتخاب ضروری ہے۔ یہاں بڑی مشکل درپیش ہو جاتی ہے۔ اگر تفصیلات کا اضافہ کیا جاتا ہے تو دی ہوئی مثال میں بہت سی کمزور تفصیلات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر تفصیلات پر نظر ثانی کی جاتی ہے تو میرا احساس ضائع ہو جاتا ہے چنانچہ اپنی طبیعت کو آزاد چھوڑ کر میں اپنی دی ہوئی مثال کو پھر کچھ اس طرح لکھ لیتا ہوں۔

"میں بہت مضمحل ہوں۔ سال بھر کا کام صرف تین ہفتوں میں نبٹانا ہے۔ میں ہوں گا اور مکان کی مستقل قید۔ نہ تازہ ہوا نہ روشنی۔ کھڑکی سے باہر ہوا گھات میں لگی ہوئی ہے۔ شفتالو کے نرم و نازک پھول اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ ننھے کھٹے بیر بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔ خود میرے اوپر بھی ایک

ناپختگی اور کرب کا عالم طاری ہے . . . "

اس مثال سے میرا مطلب اسلوب کی کسی سطحی شکل کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ابہام کو رفع کرنے کے لئے میں نے ضروری سمجھا کہ نکتہ کی وضاحت کسی مثال کے ذریعہ کر دی جائے۔ اصطلاحی طور پر میں اگر اپنی اس تحریر پر نظر ڈالوں تو کہہ سکتا ہوں کہ یہ پہلی مثال سے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ ٹھوس بھی ہے اور بہت سے معانی کو یک جا کر دینے کی وجہ سے جامع بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس میں جملوں کو مختصر کر کے ایک نئے انداز سے تشکیل بھی کیا گیا ہے باد و باراں کی قیامت کی جگہ ہوا کے گھات میں ہونے نے لے لی ہے۔ موسم کی ہیبت نے مجھے جس انداز سے تکلیف پہنچائی ہے وہ بھی اس سے واضح ہے۔ شفتالو کے پیڑ کی خارجی کیفیت کو میں نے اپنی زبوں حالی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا میں نے بہت سے ملزوم و متعلق واقعات میں سے چند ایسے کوائف کا انتخاب کر لیا ہے جس سے میں اپنے بیان میں تاثر پیدا کر سکوں لیکن واقعی امر یہ ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی شعوری انتخاب یکسر کیا ہی نہیں ہے۔ شفتالو کا پیڑ مجھے اپنے احساسات سے کچھ ہم رنگ سا نظر آیا اور جب میں نے اپنے احساسات کی ترسیل کرنی چاہی تو وہ خود بخود میرے تخیل پر چھا گیا۔ اس فوری مشابہت سے میں کچھ ایسا مطمئن ہوا کہ میں نے اپنے جذبات کو اس درخت سے منسوب کر دیا اور چنانچہ غیر شعوری طور پر میرے جذبات کے اس اظہار نے ایک استعارہ کی سی شکل اختیار کر لی تخلیق کا یہ فعل میں نے بالکل غیر ارادی طور پر ادا کیا اور انشا وجود میں آگئی۔ عزم اور ارادہ کا جذبہ تخلیق کی اس تحریک سے بالکل خارج رہا۔

اس مثال سے آپ کو شاید یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسٹینڈ ہال کا "کسی مخصوص فکر کو اُن تمام کوائف سے مملو کر دینے کی سعی کا نام ہے جو ایک کافی و شافی تصور پیدا کر سکیں، ایک ایسا تصور جو اس مخصوص فکر سے ناگزیر طور پر پیدا ہونا ہی چاہئے" سے کیا مطلب اور منشا ہے، اپنے بیان میں جب میں کوائف کا اضافہ کر رہا تھا تو بالکل نادانستہ طور پر میری انشا میں دو استعارے شامل ہو گئے۔ کھڑکی سے باہر باد و باراں کی قیامت کا برپا ہونا ایک استعارہ ضرور ہے لیکن اس کی استعاراتی کیفیت کو تو یوں ختم سمجھ لیجئے کہ یہ روزمرہ کا ایک جزو بن چکا ہے۔ دوسرا استعارہ ہوا کا گھات میں ہونا ہے۔ یہ استعارہ میں نے تحریر میں عمداً شامل کیا ہے۔ لکھتے وقت مجھے ایک زیادہ بہتر قسم کے بیانیہ لفظ کی تلاش ہوئی چنانچہ میں نے کرب اور ناپختگی کے لفظ استعمال کر دیئے۔ ننگے کھڑے درختوں کا منظر چونکہ تخریب و انتشار کی ایک دنیا پیش کرتا تھا اس لئے میرے ذہن میں یک لخت کرب کا لفظ ابھر آیا جس نے لفظ "مضمحل" سے کہیں بہتر میرے جذبات کی ترجمانی کر دی۔ ناگاہ میری رسائی ایک ایسے لفظ تک ہو گئی جس کی استعاراتی اہمیت تو زیادہ نہیں ہے لیکن جس کی استعاراتی تر و تازگی بدستور قایم ہے۔ اس لفظ کی یافت سے وہ دقتیں بالکل ختم ہو گئیں جو مجھے اپنے احساس کی ترسیل میں پیش آ رہی تھیں۔ "کرب" کے لفظ کو میں نے آزادانہ استعمال کر لیا اور میں اس بات میں کامیاب ہو گیا کہ قاری کو اپنی ہی طرح محسوس کرنے پر آمادہ کر سکوں۔

اس سلسلہ میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ استعارہ کی ماہیت کے متعلق بھی کچھ غور کر لیا جائے۔ یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ استعارہ کو محض ایک خارجی آرائش سمجھ لینے کا نظریہ سخت غلطی پر مبنی ہے۔ استعارہ دراصل ایک کوشش ہے ایک EPITHET کی تلاش و جستجو کی۔ اسلوب بیان میں استعارہ کی حیثیت اسی قدر فطری ہے جتنی نام و پتہ کی حیثیت کسی فرد واحد کے سلسلے میں۔ اگر نام کسی شخص کے لئے خارجی آرائش کا باعث ہو سکتا ہے تو پھر استعارہ کو آرائش کہنے کا جواز بھی ممکن ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی صحیح کیفیت اور ان سے ماخوذ تاثرات کو بیان کرنا ادیب کے پیش نظر ہوتا ہے لیکن اطمینان بخش EPITHETS نہ مل سکنے کی وجہ سے وہ اس کے قطعی بیان سے قاصر رہتا ہے۔ EPITHETS تک رسائی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ادیب چونکہ ہر شے کی خصوصیات اور کیفیات کا متلاشی رہتا ہے ایسی تراکیب اور توصیفی اصطلاحات اسے بڑی مشکل سے ملتی ہیں جو ان خصائص کا پورا پورا احاطہ کر لیں کیمیا داں کی طرح وہ بھی مجبور ہوتا ہے کہ وہ ان خصائص کی پوری طرح تشخیص بھی کر سکے اور علیحدہ علیحدہ نام سے موسوم بھی۔ مروج EPITHETS پر اگر غور کیا جائے تو اُن میں سے تین چوتھائی ایسے نکلیں گے جن کا شمار استعارات میں کرنا پڑے گا۔ کسی چیز کی تشخیص میں آپ ذرا قطعی ہو کر دیکھئے آپ فوراً استعارہ استعمال کرنے لگیں گے اور آپ کا تخیل بہت سی ایسی چیزوں کی طرف پرواز کرنے لگے گا جو مرئی بھی ہیں اور غیر مرئی بھی۔ قطعی انداز بیان اختیار کرتے وقت ناممکن ہے کہ آپ ذی حیات اور غیر ذی حیات اشیاء میں کوئی ربط اور تعلق قائم ہی نہ کریں۔ اس لئے کہ جس سیمابی جوہر کے تلون کو آپ قایم اور اسیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اشیاء کے خصائص سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک غیر مرئی شے۔ ایک ایسی اثیری شے ہے جس پر قابو پانا محال ہے۔ اس لطیف ترین خصوصیت کو پابند کرنے کے لئے آپ تشبیہات اور تمثیلیں استعمال کریں گے اور انتہائی جد و جہد کے بعد شاید آپ کا مسئلہ حل بھی ہو جائے گا۔ ارسطو کی رائے بھی استعارہ کے سلسلے میں تقریباً یہی ہے۔ استعارہ ہماری ایک شدید ضرورت ہے لیکن چونکہ انشاء کے

علیحدہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ انشا میں صرف اُسی وقت تک موجود رکھا جائے جب تک کہ وہ اظہارِ معنی اور بیان کی قطعیت میں مددگار اور معاون ثابت ہو۔

اب ہمیں ذرا پھر اسلوب کی تعریف پر لوٹ آنا چاہئے۔ یہ جملہ اب غالباً تشریح طلب نہیں رہ جاتی کہ وہ تمام کوائف جن کو ادیب اپنے فکر کو پُر اثر بنانے کے لئے اپنے تصورات سے متعلق کرتا ہے تخلیقی اور بیانیہ انداز ہی کے ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ کوائف زیادہ واضح اور مفصل نہیں ہوتے۔ ادیب ان کوائف کی بیانی قطعیت پر زیادہ نظر رکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اِن کا مقصد توضیحی اتنا نہیں ہے جتنا تخلیقی ہے۔ انشاپرداز اپنے بیان سے ہمیں فکر کرنے پر کبھی نہیں اُکساتا بلکہ محسوس کرنے پر اُکساتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم بس محسوس کریں اور ایک خاص انداز سے محسوس کریں۔ اگر یہ ادیب مشق و محنت کا عادی فنکار ہے تو پھر آپ میں احساس کے ایک خاص رُخ کو جگانے کے لئے وہ تمام ممکن ذرائع استعمال کرے گا۔ وہ اپنی سطور میں ایک ایسا سحر پیدا کرے گا جو نہ صرف احساس کو شدید کرے گا بلکہ اُس کی تخلیق میں بھی مدد دے گا۔ تمام مساعی کو یکجا کر کے وہ چاہے گا کہ وہ آپ میں بھی وہی احساس پیدا کر دے جو تخلیق کے وقت اُس پر طاری تھا۔ شکسپیر اور فلابرٹ کو لے لیجئے۔ ان دونوں کے یہاں آپ کو ایسے مواقع بے شمار مل جائیں گے جہاں فنکار سحر طرازی کے لئے اپنے تمام ذرائع کو یکجا کرنے میں لگانے میں مشغول ہے۔ ان تمام تدابیر کو بروئے کار لانے کے لئے ایک بات اور ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ احساس کی تخلیق میں یہ طریقے خواہ کتنے ہی مددگار ثابت ہوں اِن کی حیثیت ہمیشہ ضمنی اور ذیلی ہی ہونی چاہئے۔ اسلوب اِن کی رُو سے پُرکار تو ہو سکتا ہے لیکن اسلوب کے لئے اُن کی حیثیت مرکزی ہرگز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک کم مایہ ادیب کے لئے یہ تدابیر بڑی مخدوش بھی ہیں۔ کم درجہ کا فنکار اپنے فن کی نابختگی کی وجہ سے اسی قسم کے سجع اور آہنگ کی مسلسل یکسانیت میں اپنی نثر یا نظم کو اکثر بالکل ختم بھی کر دیتا ہے۔ آہنگ کا کیف اُسے اُن ذی حیات عناصر سے بھٹکا دیتا ہے جو اسلوب کی زندگی کے ضامن ہیں۔ الفاظ کے زیر و بم سے مسحور ہو کر وہ اسلوب کی ماہیت سے بے خبر ہو جاتا ہے، اس کا طرزِ نگارش مصنوعی ہو جاتا ہے اور بالآخر تقریباً بے جان۔ الفاظ میں احساسات کو متحرک کرنے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ لیکن معنی خیزی کی اِس قوت کو پرکھنے کا معیار کسی لفظ کا ذاتی آہنگ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ معیار اُس ذہنی تصور اور ادبی تلازم سے وابستہ ہے جو اُس لفظ کی آواز سے چونک کر جاگ اُٹھتا ہے، اُس بسیط نقش اور تخیل سے وابستہ ہے جو فہم پر چھا جاتا ہے اور ذہن کا احاطہ کر لیتا ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی موسیقی اور آہنگ کے اعتبار سے بڑی اہمیت ہے یہ احساسات کو متحرک تو ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے استعمال سے ذہن پر ایک معنوی تضاد بھی مسلط ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ کے آہنگ سے جو تصورات ذہن کے سامنے اُبھرتے ہیں وہ اکثر اُن تلازم سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جو عموماً اُن الفاظ کے معنی سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں لفظ کی غنائی اہمیت اُس کی معنی خیزی پر غالب آ جاتی ہے۔ لفظ کی موسیقی کچھ کہتی ہے اور لفظ کے معنی کچھ اور۔ اسلوب کا انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ آہنگ و معنی سے پیدا شدہ تصور ایسے تضاد کا حامل ہو جاتا ہے کہ اِنشاپرداز کے تخلیق کئے ہوئے تصور کی شکل مسخ نظر آنے لگتی ہے۔ محض آہنگ کی خاطر معنی کی قربانی اور اسلوب کے المناک انحطاط کی مثال سوئنبرن اور کونریڈ کی نگارشات ہیں۔ دونوں الفاظ کی غنائیت اور آہنگ پر زور دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی وہ قوت مطلق فنا ہو جاتی ہے جو اسلوب میں معنی خیزی اور تصورات کی تحریک کی ذمہ دار ہوا کرتی ہے۔

کیٹس کہا کرتا تھا: "اسلوب کی صراحت اور طرزِ ادا کی قطعیت ہی ادیب کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔" کیٹس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ انشاپرداز کی سب سے بڑی خصوصیت اُس کے اسلوب کی صراحت ہے۔ روایت اور ادبِ عالیہ کی طرف اُس پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن پاروں میں جہاں تک ممکن ہو اس قطعیت کو باقی رکھے اور اُس کے اسلوب پڑھنے والے کے ذہن میں صرف وہی معنی بیدار ہوں جو وہ چاہتا ہے اور جو اُس کا مافی الضمیر ہیں، ایک فیصد کا قطعیت کو قربان کرنے کے بعد سو فیصدی آہنگ کے اثرات سے معاملہ کرنا ہر چند کہ ادیب کے لئے ایک سود مند تبادلہ ہے لیکن بہت مخدوش ہے کیونکہ اسلوب کے تنزل کے اولیں آثار کا مخزن و منبع بھی دراصل یہی تبادلہ ہوتا ہے۔ اِس امر کا جواز ہمیں ایک بات کے سمجھ لینے سے بڑی آسانی سے مل جائے گا۔ ہر فن کے خصوصیات اور اُن کے کردار ہمیشہ جداگانہ اور ممتاز ہوتے ہیں۔ فن موسیقی کی خصوصیات مصوری سے اسی قدر علیحدہ ہیں جتنی مصوری کی سنگتراشی سے۔ اُس فنکار کے لئے جس کا تعلق نہ تو سُر سے ہے، نہ رنگ سے اور نہ سنگ سے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن کی تخلیق میں پہلے اُن تمام امکانات سے بہرہ ور ہو لے جن کا تعلق اظہارِ بیان اور اسلوب کی خصوصیت سے ہے اور پھر اِس طرف مائل ہو کہ اسلوبِ بیان میں وہ اور کن فنون کے خصائص کو جذب کرے جس سے اُس کا بیان زیادہ پُرکار ہو سکتا ہے۔ موسیقی ایک ارفع و اعلیٰ اور جامع قسم کا فن ہے۔ ناطقہ اس کے تمام امکانات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ نگارش کے دوران میں موسیقی کے امکانات کو اسیر کرنے کی کوشش ایک ایسا فعل ہے

جو موسیقی کے امکانات کو چھو کر پہنچا سکتا ہے زبان کی خصوصیات کے حصول سے بھی باز رکھتا ہے۔ لکھنے والے کی حیثیت کچھ اس کتے کی سی ہو جاتی ہے جس نے ہڈی کے مزید لالچ میں اپنے سایہ پر حملہ آور ہونے کے لئے اس ہڈی سے بھی ہاتھ دھو لئے جو بہر کیف اس کی دسترس میں تھی۔

جس طرح انشاپرداز کے لئے موسیقی کے امکانات کا احاطہ کرنا ایک سراب ہے اسی طرح فن مصوری کے امکانات کی طرف جھک کر ایسے شہ پاروں کو مالا مال کرنے کی سعی بھی محض لاحاصل کے برابر ہی سمجھنی چاہیے۔ جس طرح نثر یا نظم کا وہ پارہ جھوہار گزرتا ہے جس میں خواہ مخواہ موسیقی کے امکانات کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہو اسی طرح وہ ادب پارہ بھی بڑا ناگوار ہوتا ہے جس میں ادیب تصویر کشی کے فن کی طرف بہک کر ایک ایسی تشریح اور وضاحت پر اتر آئے جو صرف مصور کا حصہ ہے۔ مصوری یا موسیقی کے خصائص کو ادب میں جذب کرنے کی کوشش عموماً بڑی جلدی دلنشین ہو جاتی ہے اور اس طرف بہک جانے کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ اسلوب کی وہ عظمت فنا ہو جاتی ہے جو اس کی ابدیت کا راز ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تخلیقی ادب کی ایک بڑی خصوصیت مادی اظہار بیان بھی ہے ادیب اپنے بیان کو قطعی اور صریح کرنے کے لئے زندگی کے دوسرے شعبوں اور اس کے مختلف رخوں میں مشابہت تلاش کرتا ہے تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو ٹھیک ٹھیک بیان کر سکے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک مجرد تصور کو ایک غیر مجرد شکل دینا چاہتا ہے ایک ذہنی نقش کو ایک محسوس شے کا جسم عطا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ استعارہ استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کے لب و لہجہ میں مادیت آ جاتی ہے۔ مثلاً شکسپیر کے دو سانیٹ ہی جس قسم کے استعاروں کو لے لیجئے۔ جہاں اس نے کوشش کی ہے کہ وہ دماغ کی اس لطیف کیفیت کو بیان کر سکے جس کو انتہائی خاموشی کے ساتھ تفکر کرنا کہا جا سکتا ہے۔

When to the sessions of sweet silent thought
I summon up remembrance of things past

ان سطور میں ایک بالکل مادی قسم کے تصور کو ذہن کی سطح پر ابھارا گیا ہے تاکہ خاموشی سے تفکر کرنے کی کیفیت کی وضاحت کی جا سکے لیکن ان کے پڑھنے سے جو تصور ابھرتا ہے وہ محض ہمارے تخیل کے سامنے ابھرتا ہے نظر کے سامنے نہیں۔ یہاں ہم فکر کو خاموشی میں غرق بنچ پر بیٹھا ہوا ہرگز تصور نہیں کر سکیں گے بلکہ فکر کا جو تصور ہمارے تخیل کے سامنے رہے گا اس میں بھی وہی غیر مادی کیفیت موجود ہوگی۔ جس نے اصلاً شاعر کے ذہن میں اس تصور کی تخلیق کی تھی۔ ادیب نے اس جگہ

ایک غیر مادی اور غیر مرئی چیز کو مادی شکل دینے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ایک مادی چیز کو غیر مادی پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ غیر مادی دنیا کی ایک مبہم تصور کو ایک ایسی لاانتہائیت سے معمور کر دیا ہے کہ وہ مادی دنیا کے تنوعات کے آغوش میں رہ کر بھی غیر مادی فکر کی لطافت کو محو نہیں کر سکا ہے۔

احساسات کی یہ صحیح تجسیم (Crystallisation) ہی اسلوب کا مرکزی مسئلہ ہے۔ تجسیم کا یہ عمل مختلف ہیئتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ کسی استعارہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی کسی تصور یا تخیل کی شکل میں۔ مثلاً ذرا اس موقع کا خیال کیجئے۔ جب گلیور اپنے سفر کے ختم پر بیان کر رہا ہے کہ اس نے بادشاہ کی دی ہوئی تصویر کو خراب ہونے سے محفوظ کرنے کے لئے اپنے دستانہ میں چھپا کر رکھ لیا۔ محض چند الفاظ میں سوئفٹ نے گلیور اور للی پٹ کے لوگوں کے قدوں کا نہایت صحیح اندازہ متعین کر دیا ہے۔ ایک جنبشِ قلم سے اس نے تصویر کشی میں اس قدر قطعیت پیدا کر دی ہے کہ ابہام سے یکسر دور کر ہمیں کو لطف کا ایسا اندازہ ہو جاتا ہے گویا کہ حالات ہماری نظر کے سامنے رواں ہیں۔ تجسیم کا یہی عمل اور قطعیت کی یہی خوبی تخلیقی ادب میں ہمیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور مل جائے گی۔ کیونکہ بڑے ادیب کی شروع ہی سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے فکر کو پوری طرح بروئے کار لاتے کے لئے اپنے احساسات اور کیفیات کے اظہار کو قطعی بنا سکے اور پڑھنے والے اتنا ہی سمجھ سکیں جتنا وہ سمجھانا چاہتا ہے۔

استعارہ کے مزاج کے متعلق جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بات شاید واضح ہو گئی ہوگی کہ تجسیم کے عمل میں کسی عینی منظر یا مشاہداتی تصور کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اس عمل میں ہوتا یہ ہے کہ کسی ایک موجود شے کی کسی مخصوص کیفیت کا ادراک کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کیفیت کو کسی اور موجود شے کی کیفیت کی وضاحت کے لئے ادیب روبکار لے آتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کی پیچیدگیوں کو ادا کر دیتا ہے مثلاً شکسپیر سے دی ہوئی مثال میں اجلاس کا کوئی مشاہدہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ اجلاس کے بیان سے شاعر نے صرف اس قدر عینی پس منظر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے جس سے ہمیں اس کیفیت کا احساس ہو جائے جس کو شکسپیر نے ایک شے سے مستعار لے کر دوسری شے کی وضاحت کے لئے نقل کر دیا ہے۔

ایک بڑے ادیب کے پاس موجودات کے خصائص اور ان کے کوائف کے ادراک کا بڑا زبردست ذخیرہ ہوتا ہے جس کو وہ بآسانی جب چاہتا ہے صرف میں لے لیتا ہے۔ یہ ذخیرہ جتنا وسیع ہوگا ادیب کا بیان اتنا ہی قطعی ہوگا اور اتنی ہی قطعیت کے ساتھ وہ احساسات کی ترسیل بھی کر سکے گا اور قارئین میں متجانس احساسات کی تخلیق بھی بالفاظ دیگر ایک ادیب کی عظمت اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کے موجودات کے تجربات لامحدود ہوں لیکن یہاں بھی

ادیب کے جذباتی تجربات کو (جو احساسات ہی کی ایک منظم شکل ہوتے ہیں) اُس کے حواسی تجربات سے ممتاز سمجھنا چاہئے۔ تمام تر زندگی کی خصوصیات کا ادراک تخصیص میں تعمیم کو دیکھ لینے کی قوت اور پھر کسی مخصوص شے کو کائنات کی علامت ٹھہرا لینے کی بصیرت جو ہر بڑے ادیب اور بڑے اسلوب کا خاصہ ہیں حواسی تجربات سے ماخوذ نہیں ہوتی ہیں بلکہ احساساتی تجربات سے تعلق رکھتی ہیں۔ بایں ہمہ حواسی ادراک احساساتی تجربہ کے لئے ناگزیر بھی ہے۔ ایک بڑا ادیب یا عظیم انشاپرداز مادی مظاہر کو رُوحانی تجربات کی دُنیا میں اسی بصیرت کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور اسی تجسیم کے سہارے پھر ایسے بیان پر مائل ہو جاتا ہے جس سے منطق حیران رہ جاتا ہے اور حس پر الفاظ کو قدرت نہیں ہوتی۔ یہی ہے وہ عظیم منصب جو سائنس اور منطق کی دسترس سے باہر ہے۔ اسی منصب کی انجام دہی کے لئے حواسی تجربات کے ایسے ذخیرہ کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر مشاہدہ سے اخذ کی ہوئی صفات و کوائف سے مالا مال ہو اور جس کو فن کار دوسرے مشاہدات کے لطیف ترین رخوں کو بیان کرنے کے لئے آزادانہ صرف میں لا سکے تاکہ اس کے مافی الضمیر کی پوری طرح ادائیگی ہو جائے۔ زبان و بیان کی یہی ساحری نثر اور نظم میں اُن اسرار کی نقاب کشائی کرتی ہے جن کو سائنس منطق اور روزمانہ کی بول چال ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ سحر بدوش اس الہامی انداز بیان کا نہ تو اکتساب ممکن ہے اور نہ اس کی روایت سینہ بہ سینہ گردش کرتی ہے۔ بڑے انشاپردازنہ کارنامہ جاوید کارنامہ زبان پر منحصر ہے۔۔ ظفر بلکہ ایک کامل شعور اور قدرت کی بازی گری ہے۔ زبان و بیان میں اُن دی حیات اور حیات افروز مشاہدات کی جلوہ گری ہے۔ جن کے بغیر زبان بھی تشنہ ہے اور بیان بھی اور جن کی کارفرمائی سے الفاظ روشن نہ ہوں تو نہ زبان زبان ہے اور نہ بیان بیان۔

نجات اللہ صدیقی

اِسلامی ادب

(اسلامی ادب کے تعارف پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب اگر کوئی زیادہ محنت کرکے گہرائی میں نہ اتر سکے اور اب تک کے معیار سے بلند ہو کر نہ لکھ سکے تو آپ بیکار وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے۔ پیش نظر تحریر کوئی مقالہ نہیں بلکہ ایک سرسری تقریر ہے اور اس طرح محض تحصیل حاصل ہے، پھر بھی بعض تقاضوں سے مجبور ہو کر پیش خدمت ہے۔ معذرت کے ساتھ ——— صدیقی)

اسلامی ادب کیا ہے؟ اس پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ ہم خود "ادب" کے مفہوم پر غور کریں۔ ادب کی جتنی بھی تعریفیں کی گئی ہیں یا کی جا سکتی ہیں، ان کا حاصل یہی ہے کہ جب کوئی بات حسین انداز اور موثر پیرایہ میں کہی جاتی ہے تو اس کلام کو ادب کہتے ہیں۔ ادیب وہ ہے جو کسی فکر کو کسی احساس یا کسی خیال و تصور کو اس طرح پیش کرے کہ وہ سننے والے یا پڑھنے والے کو حسین معلوم ہو، بھلی معلوم ہو اور اس کو وہ مسرت اور وہ انبساط محسوس ہو جس کا پیدا کرنا حُسن کا اوّلین خاصّہ ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادیب یہ بات اس انداز میں کہے اور ایسا سلیقہ اختیار کرے کہ بات دل میں گھر کر جائے۔ سننے والے یا پڑھنے والے پر اثر ڈالے اور وہ اس بات کا وزن محسوس کرے۔

بس ادب وہی ہے جو حسین اور موثر ہو۔ البتہ صرف حُسن کاری یا تاثیر کا نام ادب نہیں۔ اور ایسا ہونا بھی کب ممکن ہے۔ مجرّد حُسن یا مجرّد اثر تو ناقابل تصور ہے۔ حُسن و تاثیر تو بمنزلہ لباس کے ہیں۔ ایک جامہ کو کوئی جسم درکار ہے۔ وہ بمنزلہ رنگ و بُو کے ہے جس کو کوئی پیکر محسوس درکار ہے۔ آپ قدرت کی وسعتوں سے تلاش کرکے بھی مجرّد حُسن یا مجرّد تاثیر کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ پس ادب دو عناصر سے مرکب ہے۔ فکر اور حُسن و تاثیر۔ حُسن و تاثیر کا لباس پہنا کر ادیب فکر و احساس کو سامنے لاتا ہے۔ بلا شبہ حُسن و تاثیر ادب کا جُزو لاینفک ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بھلے آدمی کا تصور بلا لباس کے نہیں کیا جا سکتا ادب کا تصور بلا حُسن اور تاثیر کے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب میں اصل اہمیت حُسن و تاثیر کو دے دی جائے۔ یہ اتنا ہی غلط ہو گا جتنا کسی بھلے آدمی کی بھلائی کا معیار محض اس کے لباس کو قرار دیا جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب حُسن و تاثیر جز و لاینفک ٹھہرے اور اس کے بغیر ادب ادب نہیں رہ جاتا تو ادب کی افادیت کا تمام تر معیار اس فکر ہی کو قرار دینا پڑے گا جس کا کوئی ادب حامل ہو۔ حُسن و تاثیر کے عنصر سے ادب کی بلندی اور پستی کا تعین ہو گا اور فکر کے صالح یا غیر صالح مفید یا غیر مفید ہونے پر ادب کے صالح یا غیر صالح اور مفید یا مُضر ہونے کا انحصار ہو گا۔ چنانچہ سماجی نقطۂ نظر سے اصل اہمیت اس فکر ہی کی قرار دی جائے گی جس کا ادب حامل ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے یہ زیادہ اہم ہے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ مفید ہے کہ مضر اور یہ بات اس کے مقابلہ میں کم اہم ہے کہ کہی جانے والی بات کتنے حُسن اور کتنے سلیقے کے ساتھ کہی جا رہی ہے اور اس میں کتنا اثر ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک مضر اور سماج دشمن فکر کو حُسن و تاثیر کا جامہ پہنا دیا جائے تو محض یہ لباس اس کی پسندیدگی کی وجہ نہیں بن سکتا بلکہ ایک حد تک اس سماج مجبور ہے کہ ایسے ادب سے زیادہ نفرت کرے اور اس سے اپنی حدود کو پاک کر دینے کی کوشش کرے۔ جب چور اور جیب کترا محض اپنی فن کاری اور چابک دستی کی وجہ سے محبوب نہیں بن جاتا تو کوئی وجہ نہیں کہ سماج دشمن نظریات کے حامل ادب کو محض اس کی ادبیت کی وجہ سے پسندیدہ قرار دیا جائے۔

سماج کس فکر کا طالب ہے۔ اس سوال کے جواب میں ابھی ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ لیکن اتنی بات تو سب کو ماننی چاہئے کہ سماج کو ایسے افکار مطلوب ہیں جو اس کی فلاح اور بہبود کے ضامن ہوں، اس کو ایسے خیالات کی اشاعت اور ایسے احساسات کا پیش کیا جانا پسند ہے جو اس کو بہتری کی طرف لے جانے والے ہوں۔ اسے خرابیوں سے پاک کرنا چاہتے ہوں اور اسے اچھی صفات سے مالا مال کرنا چاہتے ہوں۔ غور کیجئے کیا اتنی معقول بات میں بھی اختلاف کی کوئی گنجائش ہے۔ اختلاف اس میں تو ہو سکتا ہے کہ فلاح کیا ہے

بہتری اور بہبود کا کیا مطلب ہے۔ سماج کی بہتری کن افکار سے وابستہ ہے اور وہ کون سی قدریں ہیں جو سماجی فلاح کے نقطۂ نظر سے قابلِ اشاعت قرار پا سکتی ہیں لیکن اس اصول میں تو عقلاً کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ ادب کو سماج کی بہتری اور فلاح کی خاطر ہی کام کرنا چاہیئے۔ اس کے باوجود یہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ادب کی دنیا اس ابتدائی اور سیدھی سی بات پر بھی متفق نہیں۔ ادیبوں کا ایک گروہ یہ کہتا رہا ہے کہ ادب کی نزاکتیں ان پابندیوں کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ادیب اپنے افکار کو اس طرح ناپ تول کر نہیں پیش کر سکتا۔ ادب تو حُسن اور سلیقہ مندی کا نام ہے۔ ہم کو صرف اتنے کا مکلّف بناؤ کہ ہم جو بات کہیں بنا سنوار کر کہیں۔ حسین پیرایہ اور موثر انداز میں کہیں۔ اس سے آگے کی پابندیاں غلط ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حُسن اور سلیقہ ایک چھوئی مُوئی ہے جو فکری صالحیت کی پابندی کے ساتھ ہی مُرجھا جاتی ہے۔ اگر سماج کو حُسن اور سلیقہ مطلوب ہے تو اسے ان پابندیوں کو ہٹانا ہوگا۔ چاہے ادیب فلاح کی باتیں کریں چاہے ہلاکت کی۔ چاہے وہ معروف اخلاقی قدروں کو سراہیں چاہیں ان کو ڈھا دینے کی کوشش کریں۔ ان سے کوئی بازپرس نہ کی جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ حسن و سلیقہ کے ذریعہ سماج کو مسرت و انبساط کا تحفہ دے رہے ہیں۔ یہی خدمت کیا کم ہے۔

پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ فلاح اور بہبود تو مبہم اور اضافی اصطلاحات ہیں۔ یہ تو ہر آن متغیر معیار ہے۔ یہ تو سماج کے حسّاس طبقے یعنی ادیبوں کا کام ہے کہ وہ سماج کی بہبود اور بہتری کا نقشہ سوچیں۔ وہ جو سوچیں گے وہی بہتری کا معیار ٹھہرے گا۔ ان کو کسی دوسری چیز کا پابند کرنا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔

انہوں نے دعویٰ کیا اخلاقی قدریں بھی کوئی مستقل چیز نہیں۔ ہر آن تغیر اور تبدل والی اس دنیا میں کل جو بھلا تھا وہ آج بُرا ہو جاتا ہے اور جو آج بُرا ہے وہ کل بھلا ہو سکتا ہے۔ اور اس بات کا علم کہ آج کی قدریں کیا ہیں آج کی زندگی کے مشاہدے سے حاصل ہوگا۔ اور یہ ادیب ہی ہے جو زندگی کا عکاس اور اس کا ترجمان ہے۔ پس گھوم پھر کر یہ بات بھی وہیں آ پہنچی۔ ادیب ہی تم کو یہ بتائے گا کہ آج کی اخلاقی قدریں کیا ہیں۔ تم اُسے ان قدروں کا پابند کیسے کرو گے وہ تو ان کا خالق ہے؟

ان باتوں کی نامعقولیت کا ہم یہاں تفصیل سے جائزہ لینا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ یہ باتیں آپ ہی اپنی کمزوریوں کو نمایاں کر رہی ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ اب وقت ان باتوں کا بڑی حد تک فیصلہ کر چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل غیر معقول ہے کہ ادیب سے یہ مطالبہ نہ کیا جائے کہ وہ سماج پر بُرے اثرات ڈالنے والے ادب کی تخلیق سے پرہیز کرے۔ آخر سماج کیوں اپنے کو ہر ستمگر کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بننے دے۔ جب ادب ایک موثر چیز ہے اور سماج پر بے پناہ اثر ڈالتی ہے تو یقیناً ادیب کو ان اثرات کے سلسلہ کی پوری ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی بستی میں آگ لگانے والے کو اس بُری حرکت کا ذمہ دار قرار دیکر اسے سخت ترین سزا دی جائے اور اسی بستی کی سماجی و اخلاقی فضا کو عریانی اور جہالت نظریات سے گندہ اور زہر آلود بنانے والے ادیب کو نہ ان اثرات کا ذمہ دار سمجھا جائے نہ اس سے بازپرس کی جائے بلکہ اس کی حُسن کاری اور فن کاری کے صلہ میں الٹا اُسے سر چڑھایا جائے۔

پھر یہ منطق بھی الٹی ہے کہ صالحیت اور افادیت اور حُسن و سلیقہ میں تضاد اسطے کا بیر اور عناد ہے۔ یہ دعویٰ کائنات کی فطرت کے خلاف ہے۔ کائنات شاہد ہے کہ یہاں حُسن و سلیقہ اور افادیت و بہتری میں مناسبت ہے اور ان کا اجتماع نہ صرف ممکن بلکہ ان ہی کا اجتماع نظامِ قدرت کے موافق اور مطابق ہے . . . . .

. . . .

. . . جس کی آنکھیں کھلی ہوں وہ دیکھ سکتا ہے کہ مفید چیزیں ہی عموماً حسین ہوتی ہیں۔ گلاب کا پھول ہو چاہے سیب کا پھل۔ لہلہاتی ہوئی کھیتی ہو چاہے صاف اور شفاف پانی کا چشمہ جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے قدرت نے حُسن اور سلیقہ اور صالحیت و افادیت کو باہم جمع کر رکھا ہے۔ اس کے برعکس فضلات اور ناکارہ چیزیں عموماً بدصورت، بدبودار اور ذوقِ انسانی پر گراں گزرنے والی ہوتی ہیں۔ یہ بھی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ ایک تنبیہ جو ممکن ہے کہ منطق کی ترازو پر پوری نہ اتر سکے مگر ایک حسّاس شعور اور بیدار وجدان کے لئے اس میں بڑے دلائل پنہاں ہیں۔ اور اب تو یہ باتیں محض قدرت و فطرت کے مناظر ہی نہیں بلکہ افادی ادب کے وسیع ذخیرے کی شہادت سے بھی ثابت ہو چکی ہیں۔

اسی طرح فلاح و بہبود کو اضافی اور مبہم قرار دینا بھی ایک بلا دلیل دعویٰ ہے۔ انسان ہمیشہ سے جانتا ہے کہ ایک متوازن معاشی نظام جس میں سب کی ضرورتیں پوری ہوں۔ ایک معتدل سیاسی نظام جس میں سب کو ایک محدود آزادی حاصل ہو اور سب ایک دوسرے کے مفاد کے تقاضوں کی حد تک پابند ہوں۔ اور ایک ایسا معاشرتی نظام جس کی بنا معروف اخلاقی قدروں اور باہمی تعاون و مواسات پر قائم ہو۔ یہی اس کے فلاح کا نقشہ ہے۔ اور اسی میں اس کی بہتری اور بہبود مضمر ہے۔ اس بارے میں انسانیت کو محض دعوؤں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا اور جانی بوجھی حقیقتوں پر فلسفیانہ اینچ پیچ کے ذریعہ پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

یہی حال انسانیت کی جانی بوجھی اور معروف اخلاقی قدروں کا ہے۔ زنا۔ آزاد شہوت رانی، جھوٹ، اور دجل و فریب اور ان جیسی کتنی ہی برائیوں کو بُرا جاننا اور عفت۔ پاکدامنی۔ ہمدردی و مواساۃ اور صدق و صفا کو اچھا سمجھنا انسانوں کے نزدیک ایک مسلّم حقیقت ہے، یہ صفات آج بھی پسندیدہ ہیں اور کل بھی رہیں گی۔ ان قدروں کو بھی محض دعوؤں کے بل پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان

اخلاقی قدروں کی انسان عملاً کب کس حد تک پابندی کرتے ہیں۔ اس میں تغیر و تبدل ہونا ممکن ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ قدریں بدل گئیں۔ جو چیزیں کل انسانیت کے لئے ہلاکت تھیں وہ آج بھی ہلاک ہی ہیں اور کل بھی رہیں گی۔ انسانوں کی کوتاہ بینی اور قدر نا شناسی سے ان پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

پھر جب یہ باتیں غلط ٹھہریں تو "ادب برائے ادب" والوں کی ساری مفروضات لغو قرار پائیں گی اور یہی فیصلہ کیا جائے گا کہ جو ادب خود کو سماج کی فلاح و بہبود کے معیار پر پرکھ کر اپنی اصلاح نہ کرے اور غیر صالح عناصر سے خود کو پاک نہ کرے وہ سماج کا دشمن ہے۔

ان بے منزل کے ادیبوں کی تھوڑی تعداد کے علاوہ اب اکثریت انہی ادیبوں کی ہے۔ اور رہی ادب عام ہے جو سماجی فلاح و بہبود کا کوئی نہ کوئی معیار سامنے رکھتا ہے اور اس کو افادیت کا معیار بنا کر اس کے مطابق افکار و تصورات کو حسین اور موثر انداز میں پیش کرنا اس کا مقصد ہے۔ یوں تو اس طرح کے ادب میں مختلف رجحانات رکھنے والے متعدد گروہوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے لیکن ہم جس ادب کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کا ذکر کریں وہ اشتراکی ادب ہے جسے ترقی پسند ادب بھی کہا جاتا ہے۔

سماجی فلاح و بہبود کو مقصود قرار دینے والے کسی مکتب ادب کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نظام حیات کا تفصیل سے جائزہ لیں جس میں یہ ادب سماجی فلاح و بہبود کو مضمر سمجھتا ہے اور ان افکار و نظریات کا مطالعہ کریں جن کی اشاعت و ترویج اس ادب کا مقصود ہے۔ چنانچہ ترقی پسند ادب کے جائزہ لینے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم اشتراکیت کا جائزہ لیں جو فیصلہ ہم اشتراکی نظام حیات اور اشتراکی افکار و نظریات کے بارے میں کریں گے وہی ترقی پسند ادب کے فکری پہلو کے بارے میں بھی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ اس مختصر سے وقت میں یہ ممکن نہیں کہ ہم اشتراکی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کر سکیں اور یہ بات ہمارے موضوع سے باہر بھی ہے۔ اشتراکی نظام حیات انسانی زندگی کے لئے ایک غیر موزوں، نامناسب اور تباہ کن نظام حیات ہے۔ اشتراکی افکار و نظریات سے سماج کی فلاح و بہبود وابستہ نہیں۔ یہ اگر چند مسائل کو آلٹے سیدھے حل بھی کرتے ہیں تو زندگی کے بقیہ شعبوں پر وہ ستم ڈھاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اس رائے کی پشت پر ہم دلائل کا ایک انبار رکھتے ہیں جس کا مطالعہ آپ کسی وقت بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف اتنا عرض کرنا تھا کہ اشتراکی نظام حیات کے بارے میں ہمارا یہ فیصلہ خود بخود یہ طے کر دیتا ہے کہ ترقی پسند ادب سماجی فلاح و بہبود کا غلط نقشہ سامنے رکھتا ہے لہٰذا وہ سماج دشمن عناصر کا مجموعہ بن گیا ہے۔

ادب کا تعلق بلاشبہ پوری زندگی سے ہے لیکن ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ زندگی کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے کہیں زیادہ ادب نے زندگی کے معاشرتی پہلو سے تعرض کیا ہے اور یہی وہ پہلو ہے جہاں اخلاقی قدروں کا سوال سب سے زیادہ اہم سوال بن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی ادب کی افادیت کی جانچ آپ اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ معروف اخلاقی قدروں کے سلسلہ میں اس کا رویہ کیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ ترقی پسند ادیبوں کا جائزہ لیں تو یہ آپ کو بالکل اسی پوزیشن میں نظر آئیں گے۔ جس پوزیشن میں ادب برائے ادب کا قائل نظر آتا ہے یہ بھی اخلاقی قدروں کو اضافی سمجھتے ہیں۔ اور معروف اخلاقی قدروں کا مذاق اڑاتے ہوئے ان کو ڈھا دینے کے درپے ہیں۔ اس طور پر یہ سماج میں ایسے افکار و نظریات کی اشاعت کرنے والے بن گئے ہیں جو جنسی انارکی، نفرت، اور غیر ذمہ داریت پھیلاتے ہیں اور اس طرح سماج دشمن رجحانات کو پیدا کرتے اور تقویت پہنچاتے ہیں۔

سماجی فلاح و بہبود کا حقیقی ضامن دراصل اسلامی نظام ہے۔ یہ وہ نظام زندگی ہے جسے رب العالمین نے اپنے رسول کے ذریعہ ہمیں دیا ہے اور جس کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہی فطرت انسانی کی پکار کا حقیقی جواب ہے۔ سیاست میں حاکمیت رب العالمین کے زیر سایہ جمہوریت۔ معیشت میں عوام کی بنیادی ضرورتوں کی اجتماعی کفالت اور ایسی آزادی جسے جگہ جگہ اجتماعی مفاد کی خاطر پابند کر دیا گیا ہو۔ معاشرت میں عفت و پاکدامنی اور ہمدردی و مواسات کی بنیادوں پر استوار ہونے والے تعلقات۔ معروف اخلاقی قدروں کا احترام اور ایک بلند تر اخلاقی تعمیر کی منصوبہ بندی اور انسان کی روحانی پیاس کے بجھانے کے لئے متوازن اور معتدل نظام عبادات، یہ ہے وہ اسلامی نظام جس کا تفصیلی مطالعہ ہمیں بتا سکے گا کہ سماجی فلاح درحقیقت اسی سے وابستہ ہے۔ یہاں ہم تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ ہمیں تو صرف یہ بتانا ہے کہ اسلامی ادب وہ ادب ہے جو فرد و معاشرہ دونوں کی فلاح و بہبود کو اسلامی نظام زندگی سے وابستہ سمجھتا ہے۔ اور اسلامی ادیب وہ ہے جو حسن اور سلیقے کے ساتھ ایسے افکار و احساسات کو پیش کرے جو سماج کو اعلیٰ اسلامی صفات کی طرف متوجہ کریں۔ اسے اخلاقی قدروں کو اپنانے اور اخلاقی ضابطوں کی پابندی پر آمادہ کریں۔ جو تعاون ہمدردی، مواسات اور خیر خواہی پیدا کرائیں۔ جو عصمت و عفت اور پاکدامنی کی تلقین کریں۔ اسلامی ادب کا مقصد سماج کو اخلاقی صفات سے مالا مال کرنا ہے تاکہ زندگی کے ہر شعبہ میں سماج کے افراد اسلامی ضابطوں کے مطابق روش اختیار کریں۔

جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ افادی ادب کی جانچ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس نظام فکر و عمل کا مطالعہ کیا جائے جس کے ساتھ کوئی مکتب ادب فلاح و بہبود

کو وابستہ سمجھتا ہے۔ **اسلامی ادب** کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ اسلامی نظام حیات کے تفصیلی جائزے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مطالعہ ہی ہمارے ادب کے فکری پہلو کی بابت آپ کو کسی نتیجہ پر پہنچا سکے گا۔ رہا حسن و سلیقہ تو اس نقطۂ نظر سے بھی اسلامی ادب کا جائزہ لینا چاہئے لیکن اس سے اسلامی ادب کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ نہ ہوگا۔ بلکہ اسلامی ادب کے حسن و تاثیر کے اعتبار سے بلند یا پست ہونے کا فیصلہ ہوگا۔ سمجھدار آدمیوں کو کبھی ان دونوں پہلوؤں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ ہمارے بعض ناقدین کیا کرتے ہیں۔

اب ہم چند ان اعتراضات اور شبہات کا جائزہ لیں گے جو اسلامی ادب کے سلسلہ میں مختلف حلقوں سے پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اسلامی نظام تیرہ چودہ سو سال پہلے آج سے بالکل مختلف حالات میں پیش کیا گیا تھا۔ آج حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ ان حالات میں سماج کی فلاح و بہبود اس قدیم نظام کے ساتھ کیسے وابستہ رہ سکتی ہے اور ادب کا دامن اس نظام سے باندھ کر اس کو کس طرح سماج کے لئے مفید بنایا جاسکتا ہے۔

یہ اعتراض دراصل اسلامی نظام سے متعلق ہے اور اس کے جواب کا اصل موقع بھی یہ نہیں لیکن ہم اس کی عمومیت کے پیشِ نظر اس کے جواب کا ایک پہلو یہاں بھی سامنے لائیں گے۔ دراصل غلط فہمی یوں ہوتی ہے کہ اسلامی نظام کو لوگ قوانین و ضوابط کا کوئی مجموعہ سمجھتے ہیں جس میں ایک ایک سیاسی اور معاشی مسئلہ اور ہر ہر معاملہ میں قانون سازی کرکے رکھ دی گئی ہے۔۔ یہ ضوابط چونکہ ان حالات اور ان مسائل کے پیدا ہونے سے بہت پہلے کے ہیں، جن سے ہم آج دوچار ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بجا طور پر یہ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ ان قوانین و ضوابط پر مشتمل نظام حیات کو آج اپنانا سماج پر ظلم ہوگا۔ حالانکہ بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی نظام انسانی زندگی کے صرف ان ہی پہلوؤں سے متعلق ضابطہ بندی کرتا ہے جو زمانی و مکانی تغیر و تبدل سے آزاد ہیں۔ رہے زندگی کے وہ مسائل و معاملات جو آئے دن کے بدلتے رہنے والے حالات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں تو ان کو اسلام چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کے دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق اور اس کی کھینچی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے مصالح کی روشنی میں وقت کے وقت طے کرلئے جایا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ **عبادات** میں اسلام نے تفصیلی ضابطے دیئے ہیں لیکن معاشی و سیاسی مسائل کے سلسلہ میں صرف اصولی ہدایات اور چند ایسے ضابطے دیئے ہیں جو زمانی تغیر سے متاثر نہیں ہوتے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اسلامی ادب فرقہ پرست اور تنگ نظر ادب ہے جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھنا چاہتا ہے۔

اگر تنگ نظری کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ادب اپنے سامنے حق و باطل اور خیر و شر کا بہر حال ایک متعین معیار رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہے کہ بعض چیزوں کو بری اور سماج دشمن قرار دے اور صرف انہی چیزوں کو اچھا کہے جو اس کے فلاح و بہبود کے تصور سے میل کھاتی ہوں۔۔۔ تو اس حد تک تو اسلامی ادب **یقیناً تنگ نظر** ہے اور جو ادب بھی زندگی کے لئے ہوگا اور اپنے سامنے فلاح کا کوئی متعین تصور رکھتا ہوگا۔ وہ ایسا ہی ہوگا۔ یہ تو صرف **ادب برائے ادب** کے بس کی بات ہے کہ وہ حسن و سلیقے سے کہی گئی ہر بات کو برداشت کرلے چاہے وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا مطلب یہ ہو کہ اسلامی ادب کسی ایک فرقے یا قوم ہی سے دلچسپی رکھتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ اسلامی ادب کی جو تعریف میں نے ابھی کی ہے اس سے خود ہی واضح ہے کہ یہ ایک اصولی تحریک ہے تمام کے مسلمان اگر فلاح و بہبود کے ان تصورات اور اخلاقی اقدار سے انحراف کریں تو وہ ہمارے نہیں اور غیر مسلم اگر ان اصولوں سے اتفاق کرلیں تو وہ ہمارے ہیں اور ہم میں سے ہیں ——— کیا اسی کا نام تنگ نظری اور فرقہ پرستی ہے۔ اسلامی ادب تو ساری انسانیت کے لئے ہے اور تمام انسانوں سے خطاب کرتا ہے اس کے اصولوں میں کوئی بھی ایسا اصول نہیں جو اسے کسی خاص فرقے یا قوم تک محدود کردے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اسلامی ادب کے ذخیرے میں اکثر کہانیوں اور افسانوں کا ماحول مسلم معاشرہ ہی ہو لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا فرقہ پرستی سے تعلق جوڑا جاسکے۔ ہر ادیب اپنی بات کہنے کے لئے پیکر اور ڈھانچہ اپنے ماحول ہی سے حاصل کرے گا اور اس کی اپنی معاشرتی زندگی ہی اس کی زیادہ تر کہانیوں کی زمین بنے گی۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ہمارا ادب جن باتوں پر اکساتا اور ابھارتا ہے وہ کیسی ہیں۔ کیا وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی اور دوسرے گروہوں سے نفرت پر ابھارتا ہے۔ یا وہ اخلاقی صفات اور انسانی کردار پر ابھارتا ہے فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ وہ سماجی خرابیوں کی نشاندہی اور علاج کی طرف اشارہ کرتے وقت گروہی اور فرقہ وارانہ انداز سے سوچتا ہے یا وسیع النظری سے کام لیتا ہے۔ آپ ان معیارات کو لے کر اسلامی ادب کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ اس ادب کی دلچسپی کسی خاص فرقے ہی سے وابستہ ہے۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی ادب محاسن ادب سے عاری نرا پروپیگنڈا ہے۔

جہاں تک پروپیگنڈا ہونے کا سوال ہے بہت دنوں سے یہ الزام

افادی ادب کی ہر ہر قسم پر لگایا جا رہا ہے۔ نظریہ ادب برائے ادب کے حاملین جب یہ اعتراض کرتے ہیں تو ان کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ جب بھی ادب اپنے سامنے چند افکار و نظریات کی اشاعت کا مقصد لے کر آگے بڑھتا ہے تو اشاعت و تبلیغ حسن کاری پر غالب آجاتی ہے۔ بلا شبہ یہ ایک فنی مسئلہ ہے کہ حسن کاری کو ٹھیس نہ لگنے دی جائے۔ اور جو بات کہنی ہے وہ کہہ بھی دی جائے کوئی لاینحل مسئلہ نہیں۔ افادی ادب۔ چاہے وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی صالح ہو یا غیر صالح، ادب کے ایسے ان گنت شہ کار پیش کر چکا ہے۔ جن میں کمال درجے کا حسن و سلیقہ بھی موجود ہے اور اپنے فکر و احساس کی اشاعت بھی۔ اب یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں افادیت کے ساتھ حسن کاری کو نباہنا فنی اعتبار سے مشکل ہے۔ اور اگر کسی کا مطالعہ گواہی دے تو وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اکثر اسلامی ادیب اس نباہ میں کوتاہ دست ثابت ہوئے ہیں لیکن یہ ایک علمی اور تنقیدی مسئلہ ہوگا۔ کسی مکتب ادب کے خلاف اسے کسی اصولی اعتراض کی حیثیت نہیں دی جا سکتی لیکن شرارت پسندی کا برا ہو کہ ایک فنی اور تنقیدی رائے کو ہمارے خلاف ایک اصولی اعتراض کی حیثیت سے پیش کرنے میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی ہے۔

یہ تھے وہ چند اعتراضات جن سے تعرض کرنا ہم نے ضروری سمجھا۔ اسلامی ادب پر مختلف اوقات میں ہونے والے اعتراضات کے جواب ہم متعدد بار دے چکے ہیں اور خود اسلامی ادب کو بھی اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ متعدد مقالات میں متعارف کرا چکے ہیں۔ جو لوگ سماجی فلاح و بہبود کو ادب کی غرض و غایت مانتے ہیں ہم سے اتفاق کریں ان کے لئے یہ کوئی زحمت کی بات نہیں کہ وہ اسلامی ادب کا بے لاگ مطالعہ کر کے کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں۔

مظہر عالمگیر

شکستِ زنداں

(۲)

" تیرے بیٹے افق تا افق فلسفہ کے چراغوں کی لاٹیں اڑاتے رہے "

" چراغوں کی لاٹیں اڑانا " عجیب محاورہ استعمال ہوا ہے ۔ لاٹ کے معنی شعلہ یا لَو کے آتے ہیں ۔ شدید روشنی پھیلانے کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے یہ ثقیل محاورہ استعمال ہوا ہے ——— ایک اور مصرع ہے ۔

" تیرے بیٹے ضمیرِ بشر جگمگاتے رہے "

ضمیرِ بشر جگمگانا کی بجائے " جگانا " ہونا چاہئے تھا ۔ ضمیر جگمگانا کوئی بات نہیں ہوتی ۔

" جن کی تلوار کی کاٹ سے امن قسمہ بہ قسمہ بکھرنے لگا "

" قسمہ بہ قسمہ " کا استعمال اس وقت درست ہوتا جبکہ " امن " نارنگی کی قسم کی کوئی چیز ہوتی ۔

" در فشاں ساحلوں کا تجسّس انھیں جور و وحشت پہ مجبور کرتا رہا "

" وحشت " کے معنی " رمیدگی ، نفرت ، گھبراہٹ ، جنون ، دیوانگی " ، " دوری " وغیرہ ہیں اور " جور " کے معنی " ظلم و ستم " ۔ " جور و وحشت " سے شاعر نے کیا مراد لی ہے قطعاً واضح نہیں ۔ یوں بھی شاعر جن کے متعلق کہہ رہا ہے وہ پرتگالی جور و ستم پر کمر باندھے ہوئے تھے ۔ اگر شاعر نے یہ مراد لی ہے کہ پرتگالی ساحلوں کی خاطر آوارگی اور ظلم و ستم پر اُتر آئے تھے تو بھی حقیقت کے خلاف ہے ۔ پرتگالیوں کے بحری بیڑے آوارگی اختیار کئے ہوئے نہ تھے بلکہ وہ ایک منظم پلان کے تحت نکلے تھے ۔

ایک اور مصرع ہے ۔

" وہ نئی زندگی کے طلسمی تصوّر کی مشعل جلانے لگا "

شاعر کے نزدیک نئی زندگی کا تصوّر " طلسمی " ہے اور وہ اس انسان کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا ہے جو زندگی کا طلسمی تصوّر لئے اٹھا ہے ۔ طلسمی یعنی ڈراؤنا مہیب ، جادوئی ، عجیب و غریب ، حیرت ناک ——— شاعر ایک مقصد اور ایک تحریک سے وابستہ ہے اور ایسے شاعر کو ہر ہر لفظ پر غور کرنا چاہئے ۔ جس تصوّر کا وہ علمبردار ہے اسی تصوّر کی یہاں وہ توہین کر رہا ہے ۔ ممکن ہے شاعر یہ کہہ رہا ہو اور زندگی کا یہ تصوّر واقعی " طلسمی " ہو ———

● ——— " ایشیا کو چھوڑ دو " ——— عرش ملسیانی کی نظم ہے جو جگن ناتھ آزاد ، تاباں اور ساحر لدھیانوی کی نظموں کی طرح بڑی سلجھی ہوئی اور سلیس نظم ہے ۔ شاعر نے نہ پہیلیاں بوجھی ہیں اور نہ معمّے پیش کئے ہیں بلکہ ایشیا میں مغربی سامراج کی کارستانیوں کا خاکہ اڑایا ہے ۔

● ——— " نشاۃِ ثانیہ " ——— غلام ربانی تاباں کی بڑی اچھی نظم ہے جس کے بعض اشعار بڑے گراں قدر ہیں ۔ مثلاً

موت صیّاد بن تو سکتی ہے ——— زندگی صید ہو نہیں سکتی
سُرخ پرچم کے پھول کھلتے ہیں ——— خوں شہیدوں کا رنگ لایا ہے
قصر و ایواں ہیں بوم کا مسکن ——— جھونپڑوں پر ہُما کا سایا ہے
موت کے سرد و تیرہ سائے میں ——— دیکھو نقشِ بقا اُبھرتا ہے
چین اور کوریا کے کھنڈروں سے ——— اِک نیا ایشیا اُبھرتا ہے

" قصر و ایواں " اور " تاج " ، " تاراج " کی بجائے ، تاباں نے بھی باندھا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے یہ نظم بڑی پیاری نظم ہے ۔ تاباں کی شاعری میں ایک سلیقہ ہے جو ان کے اکثر معاصرین کے یہاں نہیں ۔

● ——— " ایران " ——— تاباں کی نظم ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں ——

بجا ہے میکدۂ خیّام کا طلسم مگر تو ——— بہار آئی ہے پھر بوستانِ سعدی میں
عوام جاگ اٹھے ہیں سیلاب پائیں گی ——— ہزار عزّہ و میناؔ کی لوریاں ان کو
نئے شعور نے گرما دیئے ہیں قلب و جگر ——— حریفِ اب نہ سکیں گی تجوریاں ان کو

ان اشعار میں بھی " تابانی " جھلک رہی ہے ۔ آج جو ٹی کے کئی ترقی پسند شعراء ایسے ہیں کہ ان کی کئی کئی نظمیں پڑھ کر بھی ان کی شاعری کا صحیح اندازہ لگانا محال نظر آتا ہے لیکن تاباں ان چند شعراء میں ہیں جن کی صرف ایک نظم پڑھ کر ان کی شعری صلاحیت کا پتہ چلایا جا سکتا ہے ۔ تاباں کو عثمانیہ یونیورسٹی میں

جگمگا رہی سڑکوں پر بارہا میں نے دیکھا ہے بستا ہے۔ پتہ ملا ہے۔ تاباں
شاعری میں جو تابانی ہے وہ تاباں کی شخصیت میں بھی موجود ہے لمبے لمبے
بال جن میں عمر کی بنا پر سفیدی اور سیاہی کا میل جول ہے لمبا قد، گورا رنگ
آنکھوں میں ایک گہرائی چہرہ پر متانت، چال میں سنجیدگی، آواز میں وقار۔
ان کے مقصد سے اختلاف کے باوجود تاباں کی شاعری کی عظمتوں کا اعتراف
کرنا پڑتا ہے۔

"ایران" بھی اچھی نظم ہے جس میں بعض چیزیں قابلِ گرفت ضرور ہیں۔ مثلاً

"عوام جاگ اٹھے ہیں ـــ بھلا نہ پلٹیں گی
ہزار وعدۂ و پیماں کی لوریاں ان کو"

ان "وعدہ" سے پورا مفہوم واضح ہے "پیماں" بھرتی کیا گیا ہے۔

"بھلا یہ رستم و سہراب کے جگر گوشے
رذیل گیدڑوں کی بھبکیوں میں آئیں گے"

یہ "شوقیانہ" قسم کی بات ہے۔ تاباں کے شعر میں اس کا استعمال برا لگتا ہے۔

"ابھی تو ایک بھی کانٹا نہیں ہے مگر"

اور "پیچھا چھوٹنا" ہے نہ کہ "پیچھا کٹنا" ـــ ایک اور مصرعہ ہے۔

"بجھانا چاہیں جو طوفان شمعِ آزادی"

"شمعِ آزادی کا طوفان" کوئی بات نہیں۔ "آزادی کا طوفان" کافی تھا۔ "شمع" ن کی تکمیل کے لئے آئی ہے اور سقم کا سبب بن رہی ہے۔

"مصر" بھی تاباں کی اچھی نظم ہے ـــ بلکہ اس مجموعے جاں نثار اختر۔ ن ناتھ آزاد۔ ساحر لدھیانوی۔ وجد، جوش اور تاباں کی منظومات نکال یجئے تو اس میں کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔

● ـــ اِنقلابِ چین اور امنِ عالم ـــ فراق گورکھپوری

نظم ہے۔ جس کے ابتدائی دو مصرعے ہیں۔

"منڈلائی کئی کروڑ ہاتھوں کی گھٹا
طوفاں کئی کروڑ بل کھا کے اٹھا"

اور شاعر مسلسل آٹھ مصرعوں تک "کروڑ" استعمال کرتا گیا۔ اور یہ تکرار ن مصرعوں کو بیزار کن بنا رہی ہے۔ "کروڑ" یوں بھی کوئی ایسا لفظ نہیں جس ں شعریت اور موسیقی ہو ـــ کوئی (۲۷) بندوں پر مشتمل اس نظم کے تیسرے بند کا مصرعہ ہے۔

"کھیتوں کی سہانی سانس مہکی مہکی"

کھیتوں کی سانس مہکی مہکی" میں مفہوم مکمل طور پر موجود ہے اور وہی مفہوم ہے جو شاعر مراد لے رہا ہے "سہانی سانس کا مہکنا" کوئی بات نہیں۔ صرف "سانس" استعمال کیا جائے تو یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سانس جو پہلے مہکی نہ تھی مہکی ہے۔ اس مفہوم کی بنا پر مصرعہ میں اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر سانس پہلے ہی سے "سہانی" تھی تو اس کے "مہکنے" کی اطلاع کو شاعر نے اس قدر اہمیت کیوں دی کہ اس کے ساتھ اسی بند میں، اس کے بعد ہی کے شعر میں "آتشِ انقلاب کے دہکنے کی اطلاع دی۔ شاعر کے نزدیک "سانس کے مہکنے" کی وہی اہمیت ہے جو آتش کے دہکنے کی" ـــ چوتھا بند ہے۔

"یہ ولولہ یہ اُمنگ دریا دریا
یہ شعلۂ بید رنگ صحرا صحرا
یہ پرتوِ انقلاب عالم عالم
یہ جلوۂ انقلاب دنیا دنیا"

آخری دو مصرعوں کے معنی اور مفہوم بالکل ایک ہیں۔ بند کی تکمیل کے لئے ایک ہی مفہوم کو الفاظ بدل کر دہرایا گیا ہے ـــ پانچویں بند کے دو مصرعے ہیں۔

"پیشانیِ چین جگمگاتی ہوئی آج
اٹھی ہے حیات گیت گاتی ہوئی آج"

مصرعۂ اولیٰ میں فعل نامکمل ہے اور مصرعہ "ہے" کا محتاج ہے ـــ آٹھویں بند کا ایک مصرعہ ہے۔

"برسیں گے آفتاب اس بادل سے"

"شرارے برسانا" "انگارے برسانا" سمجھ میں آتا ہے لیکن "آفتاب برسنا" عجیب سی بات ہے ـــ ایک اور مصرعہ ہے۔

"اگتے سورج کا جگمگاتا درپن"

"سورج اُگنا" ایسی ہی بات ہے جیسی "آفتاب برسنا" ـــ آخری شعر ہے۔

"اوہامِ نیم جاں نے دم توڑ دیا
رندہ نئے فکریات نے سانسیں لیں"

"اوہامِ نیم جاں" اگر دم توڑیں تو اس کو چین یا انقلاب پرستوں کا کارنامہ کیوں کہا جائے۔ نیم جاں اوہام خود ہی دم توڑ دیتے خواہ انقلابی ہوتے یا نہ ہوتے۔ "اوہامِ سخت جاں" اگر استعمال ہوتا تو بات سمجھ میں آتی۔ "فکریات" شاید "فکر" کی جمع ہے جو مونث ہے۔ اس کے ساتھ "نئے" کی بجائے "نئی" چاہئے تھا اور پھر دو صفت ایک ساتھ اس طرح آئی ہیں کہ مصرعہ کی ساری شعریت نے دم توڑ دیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے فراق کی یہ نظم موضوع پر قرض ہے۔ عام ترقی پسند دل

جیسی باتیں نظم کردی گئی ہیں۔

● ـــ "ایشیا چھوڑ دو" ـــ فکر تونسوی کی نظم ہے۔ آزاد ہے اور کوئی ۴۶ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ دو مصرعے ہیں۔

کون ہے جو بجھا دے اسے
آج جلتا ہے وقت کی آنکھ میں ایشیا کا چراغ"

"وقت کی آنکھ" کتنی لایعنی بات ہے۔ اور مصرعے بھی اسی قدر عجیب ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کو "استقام" نہیں تو مشقی کے مظاہرے" کہا جاتا ہے ـــ چند اور مصرعے ہیں۔

"آج تاریخ نے کاغذوں فائلوں دفتروں سے اُبھارے ہیں لاکھوں قلم"
"آج تاریخ لہراتی ہے زرد دریاؤں کی موج پر"
"آج تاریخ بہار کے پیڑوں ربڑ کی کھلی کھیتیوں میں ہے نغمہ خواں"
"آج تاریخ کا ہل سمندر کی چھاتی پہ ہے تیز دم تیز تر تیز رو"
"آج تاریخ یوسان و پیکنگ کی گودیوں میں ہے للکاریاں مارتی"
"آج تاریخ چائے کے باغات میں چُن رہی ہے حرارت بھری پتیاں"

"آج تاریخ" سے نظم کے چودہ مصرعوں کی ابتدا ہوئی ہے۔ ان میں سے چند درج ہیں۔

"تاریخ کا کاغذوں دفتروں سے قلم اُبھارنا"

"تاریخ کا ہل سمندر کی چھاتی پہ چلنا" "کراس ورڈز" کی طرح کا ایک معمہ ہے جس کا حل نہ جانے کس بنک میں محفوظ ہے۔ شاعر نے "ربڑ کی کھلی کھیتیوں" باندھا ہے شاید انقلابیوں نے "ربڑ" کی کاشت شروع کر دی ہو اور دھان اور گیہوں کی طرح اس کی بھی فصل کٹتی ہوں ورنہ ربڑ کے بڑے اُونچے درخت ہوتے ہیں اور ان درختوں کی کھیتیاں نہیں جنگل ہوتے ہیں۔

"للکاریاں مارنا" بے معنی ہے۔ "حرارت بھری پتیاں" بھی ایسی ہی چیز ہے ـــ اسی نظم کی اور اسی قسم کی چیزیں یہ ہیں۔ "آنسو بہاتی ہوئی کچھ نہ کہتی ہوئی ظلم سہتی ہوئی داستانیں" "ڈالر اگانا" "فورڈ کی موٹریں دندناتی" (نہ جانے شاعر نے تخصیص کیوں کی۔ فورڈ کے علاوہ اَن گنت کمپنیوں کی موٹریں دندناتی رہی ہیں) "حامیوں کے بڑے بوٹ بساونوں کی پھواریں چراتے رہے، دھان کا دانہ دانہ اٹھاتے رہے۔ تاج محلوں۔ اجنتا کے غاروں پہ پہرے بٹھاتے رہے دودھ کی مشکیں چھوڑ کر بوتلیں وہسکیوں کی سجاتے رہے"۔ (دیکھا آپ نے حامیوں کے بڑے بوٹوں کے کرشمے) "خون نچوڑنا" "ایشیا کی ہواؤں میں مٹھیاں ابھرنا" "مشعلوں کا روشنی پھینکنا" جیسی کئی اور بے معنی باتیں نظم کی گئی ہیں۔ بعض جگہ مصرعے بے ربط، اور بندش جھول دار ہے۔ آزاد شاعری میں اگر موسیقیت اور شعریت کا یوں جنازہ نکال دیا جائے تو وہ اس قدر روکھی پھیکی اور بے کیف ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلے میں سیدھی سادھی نثر اچھی لگتی ہے۔ فکر تونسوی کی یہ نظم نہیں بلکہ "نظم نما" کوئی چیز ہے۔ اور "صنعت شعر سازی" کی تخلیق ہے۔

● ـــ "ایرانی طلباء کے نام" ـــ فیض احمد فیض کی نظم اس مجموعہ کی اچھی نظم ہے

● ـــ "کوریا کا نعرہ" ـــ یہ کیفی اعظمی ہیں۔ نو بند کی مختصر نظم ہے۔ پہلے بند کے دو مصرعے ہیں۔

"اسپین نہیں یہ کوریا ہے
اس کو نہ جلا مٹا سکو گے تم"

"اسپین" کے بعد "نہیں" کے استعمال سے مصرعہ میں جو جھٹکا پڑ رہا ہے وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ دوسرا مصرعہ بلکہ پورا شعر بھرتی کا ہے اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

ہے فتح کا انتظار تم کو
اور موت تمہاری جستجو میں

آخری مصرعہ فعل کا محتاج رہ گیا ہے۔ کیفی کی نظم کے بعض اشعار اچھے ہیں اور پسند کئے جائیں گے۔

● ـــ "میری جانِ حیات" ـــ محمود جالندھری کی نظم ہے۔ اس کا ایک ابتدائی مصرعہ ہے۔

"خوشی بھی اپنی اِک گوالن ہے جسم مکھن تو دودھ جوبن"

اس میں "اک" غیر ضروری ہے اور یہ مصرعہ نظم میں غیر ضروری ہے۔ اس کا کوئی مفہوم ہی واضح نہیں ہو رہا ہے۔ اس آزاد نظم کے دو مصرعے ہیں۔

"یہ آج بھی ہے وفا نہیں ہے
یہ کل ملے وفا نہیں تھی"

"دوسرے مصرعہ میں "بھی" کا استعمال ضروری تھا۔ ایک مصرعہ ہے۔

"نگار خانے میں دل کے اور ذہن کے سمن زار مشک بو میں"

"دل کا نگار خانہ" ہو سکتا ہے۔ "ذہن کا سمن زار مشک بو" کیا چیز ہے؟

"شعور کے سب چراغ مدھم سے جل رہے ہیں"

"سب" غیر ضروری اور بھرتی کا لفظ ہے۔ ایک مصرعہ ہے۔

"یہ کل جو تاریخ کا جو انسان کا لڑکپن ہے بچپن پہ ہے

"تاریخ کا لرزتا کفن" پھر بھی معنی رکھتا ہے۔ تاریخ کا "معمولین" سے شاعر نے تاریخ کا کونسا دور مراد لیا ہے، یہ بعد کا مصرعہ ہے۔

"اسی شریر اور سانولے کل کے چھینٹے ہیں"

سانولا کل"——— کیا ہے۔ شاعر بھی اس کی وضاحت سے معذور ہے۔ خوشی کی اطہر گوالن "چاندنی راتوں میں" شاعر سے ملنے آتی ہے۔ اس واقعہ کو شاعر یوں پیش کر رہا ہے۔

"خوشی کی اطہر حسین گوالن
کھینچتی چاندی کے توڑ بندھن، مروڑ ریشم کی ڈوریوں کو
کبھی کبھی مجھ سے چاند راتوں میں ملنے آتی"———

دوسرے مصرعہ میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے وہ گوالن چاندی کے بندھن توڑ کر اور ریشم کی ڈوریاں مروڑ کر آتی ہے لیکن مصرعے سے یہ مفہوم متبادر نہیں بلکہ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ شاعر اس گوالن کو توڑنے اور مروڑنے کی دعوت دے رہا ہے۔

"رنگیلے چرخوں کی مست گھوں گھوں پہ تال دیتی"

یہاں شاعر نے نہ جانے "رنگیلے چرخوں" سے کون سے چرخے مراد لی ہے۔

"کپاس کے پھول چنتی شفاف انگلیوں میں تڑپ تڑپ اٹھتی جھلملاتی"

کپاس کے پھول چنتے وہ "تڑپ تڑپ اٹھتی جھلملاتی"۔ کیوں؟ اس کی وجہ نہیں معلوم اور نہ سمجھ میں آتی ہے۔ مزید برآں "جھلملانے" سے شاعر نے دوستیزگی کی کونسی کیفیت یا حالت مراد لی ہے۔

"ہری بھری کھیتیوں پہ چلتی ہوئی درانتی میں اپنے لہنگے کو سرسراتی"

"درانتی کھیتوں پر چل رہی ہے" اور اس درانتی میں وہ لہنگا سرسرا رہی ہے یعنی درانتی سے وہ ایک ساتھ دو کام انجام دے رہی ہے۔ کاش شاعر نے وہ منظر دیکھا ہوتا جبکہ گاؤں کی عورتیں فصلیں کاٹتی ہیں۔ تو وہ ایسی بے معنی بات نہ کرتا۔ ایک اور مصرعہ ہے

"دلہن کے گجرے دولھا کے سہرے میں مسکراتی"

یہ بھی شمع معنے کا کوئی اشارہ معلوم ہو رہا ہے———

"میں پا ہی لیتا
طویل گردن کے گرد بانہوں میں، گدیوں کی نمکتی معصومیت میں اسکو"

دوسرا مصرعہ سراسر لایعنی ہے۔ شاعر نے سیدھے سادھے مفہوم کو رنگین انداز میں پیش کرنے کی کوشش ضرور کی لیکن ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کے بعد کے دو مصرعے بھی مفہوم سے عاری ہیں۔ ایک جگہ شاعر نے "بے ہوشی" کو بے حسی بنا دیا ہے۔

"نگاہ فتنہ، جمال جادو تو بال الجھے"

نگاہ کو فتنہ اور جمال کو جادو کہنا صحیح ہے لیکن بالوں کا الجھے ہونے میں ایسی کونسی خصوصیت ہے جو قابلِ ذکر ہو۔

"ابھی کئی لندنوں میں نیو یارکوں میں روموں میں فارموسوں میں پیرسوں میں"

یہ کسی نظم کا مصرعہ ہے یا دو پیسے والے اخبار کے کسی اشتہار کی سرخی؟ اسی طرح شاعر ایک جگہ "موت" کی جمع "موتیں" استعمال کرتا ہے۔ ایک دو——— مصرعوں کا ذکر کیا۔ نظم ہی سرتاپا "مجموعۂ اغلاط" نظر آ رہی ہے۔ یہ نظم ان نظموں میں سے ہے جن کا وجود ترقی پسند شاعری کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔

ہمارے اکثر ترقی پسند شعراء زبان، محاورہ اور عروض کی پابندی نہیں کرتے۔ وہ خود کو ہر پابندی سے باغی بتاتے ہیں۔ لیکن دراصل اس طرح بغاوت کا نعرہ لگا کر وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ ڈال لیتے ہیں۔ اگر آپ عروض زبان اور محاورہ کی پابندیوں سے باغی ہیں تو پھر کیوں بحروں میں ردیفوں اور قافیوں میں نظم کہتے ہیں۔ نثر کو نظم کی شکل میں کیوں نہیں لکھتے؟ اگر واقعی آپ باغی ہیں تو قطعی طور پر ان چیزوں کو چھوڑ دیجئے۔ نثر کے چھوٹے چھوٹے جملے ایک پر ایک لکھ ڈالئے اور ان کو نظم کہہ لیجئے——— لیکن بغاوت کا نعرہ تو صرف پردہ ڈالنے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ نظم لکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے جذبات کو نظم کے مقررہ پیمانوں میں سمونا چاہتے ہیں لیکن لغزشیں کرتے ہیں۔ تو شستگی کے مظاہرے کرتے ہیں اور ان کو ٹوکا جاتا ہے تو سہارا "سرتاپا بغاوت" کا لیا جاتا ہے——— وہ فن پر توجہ نہیں دیتے۔ زبان اور محاورے کی باریکیوں کو سمجھنا نہیں چاہتے وہ اساتذہ کے کلام کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے لیکن شاعری کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری بے معنی اور عجیب سی ہو جاتی ہے۔ وہ بغاوت کا نعرہ لگا کر اپنا دامن اس وقت تو بچا سکتے ہیں لیکن بقول مجنوں گورکھپوری۔

"ہمارے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو اس حقیقت کا
اعتراف کرنا ہے چاہے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔"

اگر وہ زبان اور محاورے کی باریکیوں پر غور کریں اور جدت میں اپنی زبان کے مزاج کا خیال رکھیں۔ معنی اور مفہوم کو پیشِ نظر رکھیں تو ترقی پسند ادب اردو زبان کو چار چاند لگا سکتا ہے یوں بھی گزشتہ چند سالوں میں ترقی پسند ادیبوں نے اردو کے گلستاں میں جو گل بوٹے کھلائے ہیں ان میں کئی اردو کے دامن میں دیرپا اضافے ہیں۔ جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن آج کل ترقی پسندی کے لیبل کے ساتھ جو ادب پیش ہو رہا ہے اس کی قدر وہی رہے گی جو آج کے دن کل کے پرانے اخبار کی ہوتی ہے۔ جسے کوئی پڑھنا نہیں چاہتا بلکہ ردی والے کی نذر کر دیتا ہے۔

حفیظ میرٹھی

غزل

تیری مقدّس یاد بخیر لاکھ ہو دورِ حرص و آز
عہدِ وفا نے روک لیا جب بھی ہوس نے دی آواز

کوئی کہاں تک جائے گا، کوئی کہاں تک سمجھے گا
دُنیا کی محفل کا ہے ہر ذرّہ دُنیائے راز

لال نہیں ہے کس کا منہ اِس دَورِ خونخواری میں
جیسے جس کے بازو ہیں ویسی ہی اُس کی پرواز

بُلبُل کے نغموں پہ نہ جا گُل کی رنگینی مت دیکھ
میرا فسانہ مجھ سے سُن میں خود ہُوں اپنی آواز

بزمِ طرب میں آج ذرا ہم بھی ہوئے تھے نغمہ سرا
لیکن ایسی چیخوں کی سازِ سے کیا ملتی آواز

انور صدیقی

یاس دم توڑ چکی مطلعِ امکاں تو کھلا
زلفِ زنجیر تو بکھری درِ زنداں تو کھلا
کچھ دریدہ سا نظر آتا ہے دامانِ بہار
ہم پہ جو گزری مآلِ غمِ پنہاں تو کھلا
ذوقِ رم نام ہے اِک دردِ درماں کا نہیں
چلو اچھا ہوا یہ رازِ غزالاں تو کھلا
خیر سے خونِ جگر اپنا بہا ہم نفسو!
کچھ نہ کچھ رنگِ گلِ لالۂ ریحاں تو کھلا
کیوں نہ دیوانوں کے دل اور بھی دھڑکیں انور
بعد مدت کے درِ شہرِ نگاراں تو کھلا

جوہر ادیب

لاکھ تعارف سے بڑھ کر
ایک تبسم ایک نظر
ہم نے چھلکا چھلکا کر
آخر توڑ دیئے ساغر
پھول بہاروں کے محتاج
کانٹے ہر رُت کا زیور
میرے سفینے سے خائف
طوفاں طوفاں بھنور بھنور
وقت کی نبضوں کو پہچان
دیکھ زمانے کے تیور
جوہر کا عالم مت پوچھ
چاک گریباں خاک بسر

شاکر تسلیم

○

لب پہ مرے پیغام وہی ہیں
اپنے سر الزام وہی ہیں
عشق میں جن کو ہوش ہے اپنا
عشق میں بس ناکام وہی ہیں
کونسا ہم نے عہد نہ توڑا
پھر بھی ترے اکرام وہی ہیں
اُن کی خوشی ہو جن میں شامل
اپنی نظر میں کام وہی ہیں
کل تھے جو مدوح بادہ و ساغر
کیا یہ تشنہ کام وہی ہیں
فق ہے کیوں صیاد کا چہرہ
صید وہی ہیں دام وہی ہیں
سر تا پا جو خیر ہیں شاکر
اپنے دل آرام وہی ہیں

اسحاق اطہر صدیقی

○

نظر نظر میں لئے حسنِ داستانِ بہار
گزر گئے ہیں خزاں سے بھی پاسبانِ بہار
قدم قدم پہ نظر آئے آنسوؤں کے نشاں
کہاں کہاں نہ ہوا ذکرِ داستانِ بہار
یہ اور ہے کھلے شگوفے جلی جلی شاخیں
نئے جہاں نے دکھایا نیا جہانِ بہار
دلِ چمن پہ نجانے گزر گئی کیا کیا
کلی کلی نظر آئی ہے نوحہ خوانِ بہار
کیا ہوا کہ زمانہ گزر گیا لیکن
نہ ذکر و فکرِ چمن ہے نہ داستانِ بہار
جو ہو سکے تو کھلا دو روشِ روش غنچے
گزر نہ جائے دبے پاؤں کاروانِ بہار
ہزار دامن دل بھی تو چاک ہیں اطہر
فقط گلوں کا تبسم نہیں ہے جانِ بہار

سیّد مستفیض عنصر

○

مجھے شوقِ خونِ تمنّا نہیں ہے
میرا ذوقِ غم صرف سودا نہیں ہے
امیدوں سے مایوس ہو جانے والے
امیدوں کی بس ایک دنیا نہیں ہے
نہیں کچھ غرض ماسوائے محبّت
مجھے زندگی کا بھروسہ نہیں ہے
یہ مستی، یہ ہستی، تمام اِس کے جلوے
محبّت کوئی دل کا گوشہ نہیں ہے
تمنّائیں تھک کر کہیں سو گئی ہیں
مجھے جیسے اب اور جینا نہیں ہے
محبّت بہر حال تشنہ رہے گی
مگر یہ فسانا ادھورا نہیں ہے
کبھی اپنے عنصرؔ کو جینا سکھا دو
اسے زندگی کا قرینہ نہیں ہے

حسین عارفؔ

○

کب اپنی زباں سے ہم نے کہا ہم مُوردِ ہر الزام نہیں
جب حق کیلئے جینا ٹھہرا پھر ہم کو غمِ انجام نہیں
ہم اہلِ جنوں کا نقش پا اربابِ خرد کی منزل ہے
اس ہوش و خرد کی دنیا میں ہر چند جنوں خوش نام نہیں
اب اہلِ محبّت میں باقی وہ ربطِ نگاہ و دل نہ رہا
پھولوں کے تبسّم میں کوئی بلبل کیلئے پیغام نہیں
یہ میری وفاؤں کے شکوے اے دوست بجا تو ہیں لیکن
کچھ آپ کی نظریں بھی بدلیں مجھ پر ہی فقط الزام نہیں
یہ دور ہے کتنا غم آگیں انساں کیلئے اب جانے کیوں
فرحت کی کوئی صبح نہیں تسکین کی کوئی شام نہیں
ہر گام پہ منزل ہے عارفؔ مقصد کی طلب ہو دل میں اگر
اس راہ کا کوئی بھی راہی مایوس نہیں ناکام نہیں

منظر حسین

میاں بیچلر

(پلاٹ اور کردار فرضی ہیں)

میاں بیچلر نے جوں ہی دفتر میں قدم رکھا، بوڑھے کیشیر نے انہیں دبوچ لیا ــــ انہیں کیشیر کے اس اچانک حملہ پر پہلے حیرانی ہوئی، پھر خوشی ــ خوشی اس بات کی کہ "چلو اس کنجوس سے کچھ روپے ہی قرض مل جائیں گے اور مہینے کے یہ منحوس آخری دن کسی قدر اطمینان سے کٹ جائیں گے۔"

ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کیشیر نے کہا۔ "دیکھو میاں۔ آجکل زمانہ خراب ہے۔ اور شریف اور نیک لڑکی لڑکوں کا ملنا بہت دشوار ہے ــــ لیکن میں نے بڑی کوشش سے تمہارے لئے ایک نہایت ہی شریف، سلیقہ مند اور خوبصورت لڑکی ڈھونڈھ نکالی ہے۔ میں اسکی تعریف کیا کروں۔ میں نے ایسی لڑکی آجتک دیکھی ہی نہیں۔ کہنے کو وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی ہے۔ اور اس کی تعلیم بھی گھر ہی پر ہوئی ہے مگر اس کے سامنے دولتمند گھرانوں کی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیچ ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں ایسی لڑکی چراغ لیکر ڈھونڈھوگے تو بھی کہیں نہ ملے گی۔ ایسا چاند سا مکھڑا پایا ہے اس نے ایسی پیاری پیاری آنکھیں ہیں اور ایسی ...."

میاں بیچلر، جو اس تقریر کو سُنکر تقریباً بے ہوش سے ہو رہے تھے، یکبارگی بولے۔ "مجھے دس روپے دیدیجئے۔ تنخواہ سے کاٹ لیجئے گا۔"

کیشیر کو یہ مداخلت سخت ناگوار ہوئی اور وہ حسب عادت انکار کرنے والا ہی تھا کہ اسے اپنے "مشن" کا خیال آیا۔ اور اس نے کہا۔

"ہاں ہاں روپیہ لے لینا ــ مگر تم میری اس بات کا جواب تو دو۔"

"کونسی بات کا؟" میاں بیچلر نے انجان بنکر پوچھا۔

کیشیر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ "ہائے کس احمق سے پالا پڑا ہے۔ پوری داستان سُننے کے بعد پوچھتا ہے کہ لڑکی عورت تھی یا مرد؟" ــــ لیکن اس نے مسکرا کر کہا۔ "میاں تم بھی کیسے بھولے ہو۔ بات کیا ہے ــ یہی ناکہ تم اس لڑکی سے شادی کرنے پر تیار ہو یا نہیں؟"

میاں بیچلر شش و پنج میں پڑ گئے ــــ معاملہ دس روپے کا تھا۔

"دیکھئے ــ میں اس سلسلہ میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ والدین سے ذکر کردوں گا ــ اگر انہوں نے مناسب سمجھا تو"

"ہاں ہاں ــ تم اپنے والدین کی رضامندی حاصل کرلو۔ مگر جلدی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی ہاتھ سے نکل جائے۔ اور تم یوں ہی رہ جاؤ ــ ہاں خوب یاد آیا۔ لڑکی کی عمر چودہ برس سمجھئے؟"

"بہت خوب ــ وہ ــ وہ ذرا ــ دس روپیے عنایت فرمائیے گا۔"

دس روپے؟ میاں یہ کسی سیٹھ کی دوکان تھوڑی ہے سرکاری دفتر ہے دفتر ــ لیکن خیر، تمہیں ضرورت ہے تو میں اپنے پاس سے دئے دیتا ہوں۔" اور یہ کہکر کیشیر نے اپنی جیب سے دو روپے کے نوٹ نکال کر میاں بیچلر کے سامنے پیش کر دئے۔

"میں نے تو دس روپے مانگے تھے۔" میاں بیچلر نے اسے یاد دلایا۔

"میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ لینا ہے تو لے لو ــ ورنہ ..."

کیشیر نے نوٹ اپنی جیب میں ڈالنا چاہا ہی تھا کہ میاں بیچلر نے "ایں ہم غنیمت است" کہکر انہیں جھپٹ لیا۔

(۲)

میاں بیچلر اپنی کُرسی پر مشکل بیٹھے تھے کہ سامنے سے "بُڈھا میاں" معہ ایک عدد موٹے ڈنڈے کے تشریف لاتے ہوئے نظر آئے۔ میاں بیچلر کے اوسان خطا ہوگئے ــــ اور وہ جلدی سے اُٹھ کر

پاخانہ میں گھس گئے۔

تقریبًا دس منٹ کے بعد جب وہ واپس لوٹے (اور نہ لوٹتے تو ان کا دماغ یقینًا چل جاتا) تو پھوپھا میاں کو اپنی کرسی پر دراز پایا۔

"بیٹا وہ خالی کرسی لے لو اور ذرا میرے پاس بیٹھو ۔۔۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں"

"پھوپھا میاں ۔ آپکے لئے چائے منگواؤں؟" میاں بجلی نے رسمًا دریافت کیا۔

"ضرور ۔۔ جیتے رہو بیٹا ۔۔۔ اور ہاں ایک تمباکو والا پان بھی"۔

میاں بجلی کی جان نکل گئی ۔ مگر کرتے کیا؟ خود ہی پھنس گئے تھے لہٰذا خاموشی سے چپراسی کو بلا کر چائے اور پان لانے کے لئے کہا۔

"ذرا اور قریب آجاؤ نا"۔ پھوپھا میاں نے انکی کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا "ہاں تو مجھے کہنا یہ ہے کہ آخر تم کب تک اکیلے رہو گے ۔۔۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی ۔۔۔ ابھی کل ہی تمہارا دوست کہہ رہا تھا کہ تم سڑکوں پر رات کو بارہ ایک بجے تک گھومتے رہتے ہو اور جب گھومتے گھومتے تھک جاتے ہو تو پھر اپنے کمرے میں جاکر سو جاتے ہو ۔۔۔ اور یہی نہیں وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تم صبح اُٹھکر منہ ہاتھ مسجد میں دھوتے ہو، غسل وغیرہ کسی دوست کے ہاں کرتے ہو، کھانا وغیرہ ہوٹل میں کھاتے ہو ۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ خدا نخواستہ اگر تم بیمار پڑ جاؤ تو تمہاری دیکھ بھال کون کریگا؟ ۔۔۔ ہاں اس پھوپھا پر یاد آیا ۔ تمہاری پھوپھی کل کہہ رہی تھیں کہ تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے ۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا ۔ اور وہ تمہاری دیکھ بھال بھی اچھی طرح کر سکیں گی۔ انہیں تمہارے آنے سے بڑی خوشی ہوگی اور تمنا بھی بہت خوش ہوگا ۔۔۔ (تھوڑی دیر رک کر) تمنا بھی تمہیں اکثر پوچھتی رہتی ہے کل اس نے سیخ کباب بنائے تھے کہنے لگی "بیدر بھائی ہوتے تو بڑے شوق سے کھاتے"۔ واللہ ایسے کباب میں نے عمر بھر نہیں کھائے تھے کباب ہی کیا، تمام کھانے وہ اچھا پکاتی ہے۔ اس فن میں تو وہ ماہر ہے۔ اسکے ہاتھ میں تو

میاں بجلی نے دفعتًا چلا کر کہا "حاضر ہوا جناب"۔۔۔ اور یہ جا وہ جا۔

پھوپھا میاں کا منہ لٹک گیا ۔ وہ اس "بدتمیزی" پر سخت ناراض ہوئے اور اس ناراضگی کو انہوں نے چائے اور پان سے دُور کرنے کی کوشش کی ۔۔۔ اور پھر وہ میاں بجلی کا ایک گھنٹے انتظار کرنے کے بعد بادل ناخواستہ کوچ کر گئے۔

(۳)

میاں بجلی کے ایک "آزاد خیال" اسسٹنٹ نے ایک دن انکی دعوت اپنے گھر پر کی۔

اس دعوت میں میاں بجلی کا تعارف اسسٹنٹ کی بے پردہ جوان بہن سے ہوا، جس نے فورًا اپنا ہاتھ انکے ہاتھ کی طرف بڑھایا۔ میاں بجلی اُلجھن میں پڑ گئے کہ اب اس ہاتھ کو کیا کروں جو بڑھتا چلا آرہا ہے ۔۔۔ پکڑ لوں یا پیچھے دھکیل دوں؟ لیکن ان میں سے کسی کی بھی نوبت نہیں آئی، کیونکہ میاں بجلی کے تذبذب نے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو رُک جانے پر مجبور کردیا ۔ اور یہی نہیں، وہ آہستہ آہستہ نیچے بھی گرنے لگا۔

میاں بجلی نے اطمینان کی سانس لی ۔ لیکن ان کا اطمینان زیر و زبر ہو جاتا اگر وہ ہاتھ کے "مالک" کی نگاہیں دیکھ لیتے۔

"زوحی ۔ تم نے جو کل افسانہ لکھا تھا، اسکا عنوان کیا تھا؟" کھانا کھانے کے بعد اسسٹنٹ نے اپنی بہن سے پوچھا "میرا حافظہ ان دنوں بڑا کمزور ہوگیا ہے ۔۔۔ اوہ ۔ یاد آیا ۔۔۔ "تکیئے اور غلاف" ۔۔۔ تکیئے اور غلاف ۔۔۔ مسٹر حیدر، میں آپ سے کیا عرض کروں۔ اتنا اچھا افسانہ میں نے آج تک نہیں سنا تھا یوں تو زوحی کے تمام افسانے اچھے ہیں۔ لیکن تکیئے اور غلاف میں تو اس نے کمال ہی کردیا ہے ۔۔۔ ایسے اچھے کردار ۔ ایسی اچھی ٹیکنیک ۔ ایسا اچھا پلاٹ ۔ اور پھر سماج پر ایسی زبردست چوٹ ۔۔۔ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ زوحی نے اپنی جان نکال کر اس افسانے میں ڈالدی ہے ۔۔۔ زوحی ذرا وہ افسانہ مسٹر حیدر کو بھی سُناؤ"۔

اور زوحی نے، جو افسانہ کا مسودہ سامنے لئے بیٹھی ہوئی تھی، فورًا "تلاوت" شروع کردی۔

پندرہ منٹ بعد میاں بجلی جب "تکیئے اور غلاف" سے نکلے تو انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود "تکیہ" بنے ہوئے ہوں اور اس تکیہ پر زوحی کا "غلاف" چڑھا ہوا ہو۔

(۴)

عید کے دن میاں بجلی اپنے ایک دوست سے ملنے گئے ۔۔۔

دوست نے اور اس کی بیوی نے (جو پردہ نہیں کرتی تھی) ان کا خیر مقدم کیا۔

"آپ تو سچ مچ عید کا چاند ہوگئے" دوست کی بیوی نے مسکرا کر کہا "ان سے (شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اکثر آپکا تذکرہ رہتا ہے۔ معلوم نہیں آپ کہاں غائب رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ کہیں شادی وادی تو نہیں کرڈالی ـــ میرا مطلب ہے "خفیہ طور پر" ہم لوگوں سے چھپا کر ـــ لیکن میں جانتی ہوں، آپ ایسا ہرگز نہیں کرینگے۔ آپکی شادی ہمارے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں ٹھیک کہتی ہوں نا؟ (شوہر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) ـــ ہاں۔ بات آپڑی ہے تو میں کہتی ہوں کہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ـــ آخر آپ کب تک کنوارے رہیں گے؟ آپ نے سُنا ہوگا، شادی کے بغیر انسان مکمل ـــ "

میاں بیچلر نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا ـ مجھے ابھی دوسری جگہوں پر بھی جانا ہے"

دوست اور اسکی بیوی پر جیسے ایٹم بم گر پڑا ـــ پھر بھی بیوی نے سنبھلتے ہوئے کہا "اچھا اب کب آیئے گا؟ ـــ ارے ہاں۔ خوب یاد آیا ـــ زرینہ (دوست کی بہن) کہتی تھی کہ وہ میٹرک کا امتحان دیگی لیکن اسے کوئی پڑھانے والا نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آجکل اسکولوں کا ماحول بڑا خراب ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے اسے اسکول بھیجنا گوارا نہیں کیا ـــ اگر کوئی پڑھانے والا ـــ میرا مطلب ہے کہ قابل اعتبار یعنی کہ شریف اور سمجھدار ـــ "

"ہاں ہاں" میاں بیچلر نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا "میرے ایک بھلے سے دوست ہیں میں ان سے ذکر کروں گا"

دوست کی بیوی بولی "آپکو تو کافی فرصت رہتی ہو گی؟ ـ ہمیں آپ پر جتنا اعتماد ہے اتنا دوسروں پر کیسے ہو سکتا ہے؟"

لیکن ـــ زرینہ کا تو مجھ سے پردہ ہے نا؟" میاں بیچلر نے ایک تنکے کا سہارا لیا۔

"اٹھا جائیگا" دوست نے اعلان کیا "آخر دوسرا پڑھانے والا آتا تو پردہ اُٹھانا ہی پڑتا؟"

اس اعلان نے میاں بیچلر کے ساتھ وہی سلوک کیا جو 303 کی گولی کرتی ہے۔

اور جب وہ دوست کے گھر سے باہر نکل رہے تھے تو اندر سے ایک آواز آئی۔ "زرینہ سلام کہتی ہے"

میاں بیچلر کے قدم تیز ہوگئے اور ان کے کانوں میں بہت دیر تک یہ آواز گونجتی رہی کہ "زرینہ سلام کہتی ہے ـــ زرینہ سلام کہتی ہے ـــ زرینہ ـــ "

(۵)

میاں بیچلر کے دفتر میں ایک "بڑے میاں" تھے ـــ ایک دن لنچ ٹائم میں وہ ان کے پاس آئے اور بولے "آپکے لئے میں ایک خاص چیز لایا ہوں" اور یہ کہکر اُنہوں نے ایک کڑھا ہوا رومال شیروانی کی جیب سے نکالا اور میاں بیچلر کے سامنے رکھدیا۔

میں نے اسدن آپکا رومال دیکھا تھا جسے دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے تہیّہ کر لیا کہ آپکو ایک اچھا سا رومال لاکر دوں گا ـــ یہ رومال (وقفہ) میری لڑکی نے کاڑھا ہے۔ دیکھئے کتنا اچھا کاڑھتی ہے وہ ـــ کاڑھنے میں تو اسے کئی مرتبہ انعام بھی ملا ہے۔ صرف ایسا ہے کہ آدمی کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا ایک چادر۔ ایک ٹوپی ـ ایک رومال۔ غرضیکہ کوئی ایک چیز کاڑھکر بازار میں بھیجدیجئے۔ اتنے دام مل جائیں گے کہ آپکو کسی غیر کی غلامی کی حاجت نہ رہے گی اور پھر ـــ "

"رومال بہت اچھا ہے ـــ شکریہ" میاں بیچلر نے "بریک" لگا دیا ـــ بڑے میاں ہملا اُٹھے۔

اگر آپکو مزید رومال کی ضرورت ہو تو مجھ سے بلا تکلّف کہدیجیئے گا ـــ شرمایئے گا نہیں ـــ ہاں آپ ایک تکیہ کا غلاف لاکر دیجیئے اور ایک چادر بھی۔ انشاء اللہ دونوں چیزیں کڑھوا کر جلد از جلد واپس کردوں گا ـــ اور میز پوش بھی ـــ "

"بہت بہتر ـــ بہت بہتر"

بڑے میاں کے جانے کے بعد میاں بیچلر نے رومال کو غور سے دیکھا تو کاڑھنے والی کا نام نظر آیا ـــ "عائشہ"

تو یہ عائشہ بیگم ہیں؟ ـــ تو یہ عائشہ بیگم ہیں؟ ـــ تو یہ عائشہ

(۶)

اسی دفتر میں ایک "چھوٹے میاں" بھی تھے، جو ہمیشہ اپنی تنگدستی کا رونا رویا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اسی طرح رو رہے تھے کہ میاں بیچلر نے کہا "بھئی یہاں خوشحال کون ہے"

بس چھوٹے میاں کو میاں بچلر پر برسنے کا موقع مل گیا — اور وہ ان کے پاس پہنچکر لگے کہنے "میاں! تمہیں جو اتنی تنخواہ ملتی ہے، وہ کیا کرتے ہو، سوائے اسکے کہ کھاؤ۔ اڑاؤ اور ایک کی جگہ دس پھینکو۔ اگر تمہارے بھی بیوی بچے ہوتے اور تم پر بھی کوئی ذمہ داری ہوتی، کوئی بوجھ ہوتا تو آج تم بھی میری طرح روتے ہوتے (اچانک کچھ سوچکر) نہیں نہیں — میرا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کثیر اولاد ہونا بہت بڑا جرم ہے تم جانتے ہی ہو میرے چھ لڑکیاں ہیں اور چار لڑکے، جن میں سے دو لڑکیاں شادی کے قابل ہو چکی ہیں۔ انکی شادی کی فکر مجھے کھائے جا رہی ہے۔ اور حق حرام ہوا جا رہا ہے — سدا کے لئے کچھ سوچو۔ کچھ بتاؤ — میں کیا کروں — (طویل وقفہ) میں جانتا ہوں، تم بھلے لڑکے ہو اور ہمدرد بھی۔ اس لئے تم سے کہتا ہوں کہ مجھے کوئی راستہ دکھاؤ، مجھے اس مصیبت سے نکالو۔ مجھے بچاؤ — مجھے۔ "

"حیدر صاحب — آپکو صاحب نے سلام دیا ہے"۔ چپراسی نے آکر کہا اور "چھوٹے میاں" کا جی چاہا کہ وہ اس چپراسی کی وہیں مرمت کر دیں۔

میاں بچلر خوشی سے اچھل پڑے — اور کرسی سے اٹھکر جانے والے ہی تھے کہ چھوٹے میاں نے پان کا ڈبہ کھول کر ایک پان نکالا۔ اور بڑی نرمی سے کہا "یہ پان کھاتے جاؤ — یہ میری بڑی لڑکی نے بنایا ہے"۔

(۷)

میاں بچلر کے ایک دوست تھے، جو ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور انکی آئے دن دعوتیں کیا کرتے تھے — ایک شام کو وہ تشریف لائے اور بولے "ذرا میرے ساتھ چلیں"

"کہاں؟"

"گھر تک"

میاں بچلر ان کے ساتھ ہو لئے — گھر میں داخل ہوتے ہی دوست نے دروازہ میں چٹخنی لگا دی اور انہیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے؟" میاں بچلر نے قدرے حیران ہو کر پوچھا

"ابھی معلوم ہو جائیگا" دوست نے جواب دیا۔

میاں بچلر کی حیرانی میں اضافہ ہو گیا — تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ دو عورتیں، جن کی شکل انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی، آکر ان کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

"عابدہ" دوست نے کھنکار کر کہا: "تم باتیں کرو"

عابدہ نے کہا: "آپ میری آواز تو پہچانتے ہی ہوں گے؟"

"اچھا آپ ہیں" میاں بچلر نے کہا "بیگم —"

"جی — میں ہی آپ کے دوست کی بیوی ہوں" — اور اس بیوی نے آج پردہ اٹھا دیا تھا۔

"فرمائیے"

"آپ اس لڑکی کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے؟"

"میں؟" میاں بچلر نے آنکھیں پھاڑ کر دوسری عورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو انہیں آج ہی دیکھا ہے"

"کیسے بھولے بنتے ہیں آپ؟ انکار اور پھر ہمارے سامنے — ٹھیک ہے آجکل زمانہ ہی ایسا ہے کہ مطلب نکل جانے کے بعد کوئی کسی کو نہیں جانتا، کوئی کسی کو نہیں پہچانتا"

"کیا مطلب ہے آپکا؟" میاں بچلر نے چلا کر کہا۔

"چلائیے نہیں" عابدہ نے ڈانٹا "میرا مطلب آپ خوب سمجھتے ہیں — آخر آپکو ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر کے کیا ملیگا؟ کیا حاصل ہوگا؟"

میاں بچلر کا خون خشک ہو گیا — اور انہوں نے اپنے ڈیفنس میں کہا "خدا کی قسم میں نے اس لڑکی کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا — اور جب دیکھا نہیں تو اسکی زندگی بنانے یا بگاڑنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

"دیکھئے۔ قسم مت کھائیے — لڑکی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے آپ جانتے ہیں قانون کی نگاہ میں کسی لڑکی کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اس مرد نے "

"اُف میرے خدا" میاں بچلر گھبرا کر اٹھے اور اٹھکر بھاگنے والے ہی تھے کہ دوست نے انکے کندھے پر ہاتھ رکھکر انہیں بٹھا دیا۔

"آپ بھاگنا چاہتے ہیں تو بھاگ جائیے — بھاگ جائیے — مگر اپنے ساتھ اس لڑکی کو بھی بھگا لیجائیے جسکی عصمت."

"آپ لوگوں کو زبردست غلط فہمی ہو گئی ہے" میاں بچلر نے

روتی آواز میں کہا۔ "خدا گواہ ہے۔ میں اس الزام سے بالکل بری ہوں — بالکل پاک ہوں "

" دیکھئے پھر آپ اس معاملہ میں خدا کو گواہ بنا رہے ہیں۔ — اچھا خدا لگتی کہئے گا، اگر اس لڑکی کی جگہ آپکی بہن ہوتی تو آپ کیا کرتے؟ بولئے۔ کیا کرتے؟ "

میاں بچلر خاموش رہے — اب وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

" بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ ایک غیر محرم لڑکی سے ملتے وقت اپنی ماں بہن کو بھول جاتے ہیں اور "

" بس بس " میاں بچلر کو غصہ آگیا۔ " آپ اس لڑکی کو میرے ساتھ کر دیجئے — ابھی اور اسی وقت — میں اب اس گھر میں ایک پل کے لئے بھی ٹھہرنے کو تیار نہیں "۔

عابدہ نے مسکرا کر کہا " شاباش " اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر میاں بچلر کے ہاتھ میں دیدیا۔

اور دوست نے ایک زبردست قہقہہ لگا کر کہا " یار — یہ سب مذاق ہے۔ عابدہ کی سازش ہے — اسکی خواہش تھی کہ ساجدہ کی شادی تمہارے ساتھ ہو — خدا کا شکر ہے کہ تم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ کر لیا ہے — دیکھو! اب ساجدہ کا ہاتھ نہ چھوڑنا اور وعدہ سے نہ پھرنا — ورنہ — تم سمجھ لو پھر۔ "

ساجدہ (جو عابدہ کی بہن تھی) شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ اور عابدہ خوشی سے پھولی جا رہی تھی۔ اور میاں بچلر کا دوست مسلسل قہقہے لگا رہا تھا — اور میاں بچلر پاگلوں کی طرح ان کا منہ تک رہے تھے۔

(۸)

دوسرے ہی دن میاں بچلر نے اپنی والدہ کو خط لکھا کہ "اماں میری شادی کر دو — ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا —"

اور جب تک شادی نہ ہوئی انہوں نے فیصلہ کیا کسی دوست کے گھر نہ جائیں گے اور کسی سے دوستی نہ کریں گے — اور اگر اس کی ضرورت محسوس ہوتی تو پھر حسب ذیل سوال کا جواب حاصل کرنے کے بعد۔

"کیا آپ کی کوئی جوان بیٹی، بہن یا سالی تو نہیں؟ یعنی جو کہ کنواری، بیوہ یا مطلقہ ہو — یعنی جو کہ "

مصنف :- ایمبروز بیرڑی
مترجم :- نجمی بی۔ اے

آدمی اور سانپ

یہ بالکل سچی خبر ہے اور بہت سے عاقلوں اور عالموں نے اس کی تصدیق کی ہے کہ سانپ کی آنکھیں مقناطیسی خاصیت رکھتی ہیں، اور یہ کہ جو کوئی اُس کے اثر میں آجاتا ہے - وہ مرضی نہ ہوتے ہوئے بھی آگے کھنچا چلا جاتا ہے اور اس کیڑے کے کاٹنے سے بہت تکلیف کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے -

(۱)

گوؤن اور سلیپر پہنے، خوب اطمینان سے صوفہ پر دراز، ہارکر براٹن نے جب مورانسٹر کی "عجائبات سائنس" میں مندرجہ بالا جملہ پڑھا تو مسکرا پڑا - "اس معاملہ میں تعجب کرنے کی بات یہ ہے" اس نے سوچا "صرف یہ ہے کہ مورانسٹر کے دور میں دانشمند اور عقلمند بھی ان لغویات پر یقین رکھتے تھے جن کو آج کا انپڑھ آدمی بھی نہیں مان سکتا۔"

اور پھر خیالات کا سلسلہ بڑھ گیا کیونکہ براٹن بہت سوچنے والا شخص تھا - اس نے اپنی نظر کو ہٹائے بغیر بے خبری میں کتاب کو نیچے کر دیا۔ جیوں ہی کتاب نظروں سے نیچی ہوئی کمرہ کے تاریک گوشہ میں کسی چیز نے اس کی توجہ کو ہر طرف سے ہٹا کر اسی طرف مبذول کر لیا - اس نے دیکھا کہ اس کے بستر کے نیچے، اندھیرے میں روشنی کے دو چھوٹے چھوٹے نقطے ہیں جو آپس میں تقریباً ایک انچ کے فاصلہ پر تھے - یہ غالباً گیس میں لگی ہوئی پیتل کی کا ستوں کا عکس ہیں۔ اس نے سوچا اور پھر پڑھنے میں منہمک ہو گیا - ایک لمحہ بعد کسی غیر مرئی ایسے جذبے نے جس کا تجزیہ کرنا خود اس کے لئے مشکل تھا - اسے پھر کتاب نیچی کر کے پہلے دیکھی ہوئی چیز کے دیکھنے پر مجبور کر دیا - روشنی کے نقطے اب بھی وہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ چمکدار ہو گئے ہیں - یہ چمک کچھ سبزی مائل معلوم ہوتی۔ حالانکہ پہلے اسے خیال نہ ہوا تھا - اس نے محسوس کیا کہ وہ آگے، اسکی طرف کچھ حرکت بھی کر گئے ہیں۔ وہ اب بھی اندھیرے ہی میں تھے اور یوں ہی سرسری طور سے دیکھنے سے انکی حقیقت معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ وہ پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا - دفعتاً کتاب کے صفحوں سے کچھ اس طرح کی بات معلوم ہوئی کہ اس نے تیسری بار پھر کتاب کو صوفہ کے کنارے پر رکھ دیا کتاب اس کے ہاتھوں سے نکل کر کچھ اس طرح نیچے گر پڑی کہ اس کے کھلے اور پھیلے ہوئے اوراق نیچے کی طرف تھے - اور جلد اوپر کی طرف براٹن کچھ اٹھ کر بستر کے نیچے پوشیدہ سی جگہ کو بڑے غور اور پورے حواس سے تک رہا تھا - اسے محسوس ہوا کہ روشنی کے نقطے کچھ شعلہ بار ہو گئے ہیں - اس کا دھیان اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ نظر میں کاوش تھی اور مشتاقانہ تھی۔ قریب کی مسہری کے نچلی پٹی کے پاس ہی اس نے ایک بڑے سے سانپ کی کنڈلی کا انکشاف کیا - روشنی کے نقطے اس کی آنکھیں تھیں! اسکا خوفناک اندرون ترین کنڈلی سے نکل کر باہر والی پر لٹکا ہوا تھا اور رخ سیدھا اسی کی طرف تھا --- وہ آنکھیں اب محض چمکدار نقطے نہ رہی تھیں بلکہ اپنے مخصوص انداز میں ایک معنی لئے ہوئے تھیں --- ایک بڑا بدانداز معنی ہی -

(۲)

ایک جدید طرز کے شہر میں اور اونچے گھرانے کی خوابگاہ میں ایک سانپ کا ہونا کچھ اتنی عام بات نہیں، کہ اس کے اسباب پر روشنی ڈالنا غیر ضروری ہو - ہارکر براٹن بتیس سال کا کنوارا نوجوان، پڑھا لکھا، آرام طلب، امیر، اور مشہور شخص تھا، اسکا جسم ورزشی اور صحت کافی اچھی تھی - اور وہ تمام دور دراز ملکوں اور اجنبی دلیسوں کی سیر کے حال ہی میں سان فرانسسکو واپس آیا تھا،

اس کا مذاق شروع ہی سے قدرے تعیش پسندانہ رہا اور اب تو طویل تنہائیوں نے اسے اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اور اسی وجہ سے جب وہ "کنیسل ہوٹل" تک کی خدمات سے مطمئن نہ ہو سکا تو اسے مشہور سائنسداں دوست، ڈاکٹر ڈرونگ کی میزبانی بخوشی قبول کرنی تھیں ——— ڈاکٹر ڈرونگ کا مکان کافی بڑا اور پرانے طرز کا بنا ہوا تھا اور شہر کے الگ تھلگ سے پوشیدہ حصے میں تھا۔ باہر سے اسے مغرورانہ قسم کی سردمہری صاف برستی نظر آتی تھی۔ آس پاس کے بدلے ہوئے ماحول سے اسے کچھ نسبت نہ تھی۔ بلکہ اس طرح بالکل الگ طرز کا ہونے کی وجہ سے اس میں ایک طرح کا نرالا پن سا پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسکا ایک حصہ جو بظاہر فن تعمیر کے لحاظ سے بے تکا لگتا تھا اپنے مقصد کے اعتبار سے بھی باغیانہ تھا۔ کیونکہ یہ معمل گاہ، عجائب خانہ، اور چڑیا خانہ سب کا مجموعہ تھا۔ دراصل یہی وہ جگہ تھی جہاں ڈاکٹر اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جانوروں کی زندگیوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور اپنی فطرت کی علمی و تحقیقی حس کو تسکین دیتا تھا۔ حالانکہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ جانور عموماً چھوٹے قسم کے ہوتے تھے۔ اسکی اس قسم کی علمی و تحقیقی ہمدردیاں، رینگنے والے جانوروں کے لیے خصوصاً وقف تھیں وہ قدرت کی بھدی اور حقیر مخلوقات سے ہی محبت کرتا تھا۔ اور اپنے کو علم حیوانات کا دلدادہ کہتا تھا اس کی بیوی اور لڑکیوں کو اسکے اس قسم کے بدنصیب مخلوقات کے فعل و عمل، طور طریق وغیرہ کی کرید و تحقیق میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور سانپ خانہ سے الگ ہی رہتی تھیں حالانکہ اس نے انکی طبیعت کی سختی کو کم کرنے کے لئے اجازت دے رکھی تھی کہ اسکی بے شمار دولت میں سے جتنا چاہیں خرچ کریں یہانتک کہ اسکے ان جانوروں کے خرچ سے بھی سبقت لیجائیں۔ اور زیادہ شان و شوکت سے رہ سکیں۔

فن تعمیر اور سجاوٹ کے لحاظ سے "سانپ خانہ" میں رہنے والوں کے پست ماحول کے مطابق سادگی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کو بہت آزادی اور آرام بھی نہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ انہیں زندہ ہونیکی تکلیف وہ خصوصیت بھی تھی۔ بہرحال اپنے اپنے کمروں میں بھی ان کے مزاج کے مواقف ہی پابندی سی تھی۔ جو کہ ضروری بھی تھی۔ وہ ایکدوسرے کو نگل بھی جایا کرتے تھے۔ اور براؤٹن کو اکثر یہ فکرمندانہ اطلاع ملتی تھی کہ انمیں سے ایک کسی دوسرے کی جگہ پایا گیا ہے۔ ان کے اس حاضری کی وجہ جواز تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوتی تھی۔ اس سانپ خانہ اور اسکے خوفناک ساکھ کے باوجود ——— جسپر حقیقتاً اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی ——— براؤٹن نے ڈاکٹر ڈرونگ کے گھر کی زندگی کو کافی حدتک اپنے ذوق کے موافق پایا۔

(۳)

براؤٹن پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا سوائے اسکے کہ اسے کافی تعجب ہوا اور شاید تھوڑا سا صدمہ بھی۔ اور پھر اسکا جسم خوف و نفرت کے ملے جلے جذبات کے تحت تھرتھرا اٹھا۔ اسوقت پہلا خیال جو اسکے دلمیں آیا وہ یہی کہ گھنٹی بجا کر کسی ملازم کو بلائے۔ اگرچہ گھنٹی تک وہ باسانی پہنچ سکتا تھا۔ مگر اسکی طرف اسنے ذرا بھی حرکت نہیں کی۔ اسکے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ یہ حرکت کہیں اسمیں خوف کا شبہ نہ پیدا کر دے اور جسکے شائبہ تک کا اسے یقیناً احساس نہیں تھا۔ اس حالت کی خطرناکی سے متاثر ہونیکے بجائے اسے ایک ناموزونیت کا زیادہ احساس تھا۔ یہ ایک حقیقت بھی مگر (کتنی) لغو۔

یہ رینگنے والا جانور کچھ اس طرح کا تھا جس سے براؤٹن ناواقف تھا۔ اسکی لمبائی کا وہ صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ اور دھڑ تقریباً کلائی کے برابر موٹا نظر آتا تھا۔ یہ کس طرح خطرناک تھا؟ کیا کسی شکل میں ہو سکتا تھا؟ کیا یہ زہریلا تھا؟ کیا یہ CONSTC TOR تھا۔ اسکی علامات خطرات کی معلومات نے بھی اسے کچھ نہ کہنے دیا۔ اسکو کبھی بھی اس طرح کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

اگر خطرناک نہیں تو یہ جانور حملہ ضرور کر سکتا تھا۔ یا بہرحال اسکی ضرورت تھی کم از کم اس جگہ۔ یہ ہیرا اس جگہ کے لئے قطعی ناموزوں تھا۔ جہاں تک کہ ہمارے زمانے کے وحشی قسم کے ذوق تھی، جنہوں نے کمرے کی دیواروں کو تصویروں سے، فرش کو فرنیچر سے اور فرنیچر کو قدیم و جدید نقاشیوں سے پاٹ سا دیا ہے۔ اس قسم کی جنگلی و بیرحم چیزوں کو یہاں رکھنا پسند نہ کرتے علاوہ اسکے ——— ناقابل برداشت خیال ا——— اسکی نکلی ہوئی سانس اسی فضا میں تحلیل ہو رہی ہوگی جسمیں کہ وہ خود سانس لے رہا تھا!

ان خیالات نے براؤٹن کے دماغ پر کم و بیش کچھ اثر ڈالا اور عمل پر آمادہ کر دیا۔ یہی عمل ہے جسکو ہم سوچنے اور عمل کرنے کا نام دیتے ہیں۔ اور یہیں پر ہم عاقل یا احمق ہو جاتے ہیں۔ یہی پر موسم خزاں کی سوکھی ہوئی پتیاں ہزمین پر گر کر یا جھیل میں جا کر اپنی کم یا زیادہ عقلمندی کا ثبوت دیتی ہیں۔ عمل انسانی کا راز کوئی ڈھکا چھپا نہیں۔ کوئی چیز ہمارے عضلات کو متحرک کرتی ہے کیا پھر اسمیں کوئی حرج ہے اگر ہم ان ابتدائی ذاتی تبدیلیوں کو خواہش یا ارادہ کا نام دیں؟

ہوا۔ اٹھ کھڑا ہوگیا اور سانپ سے پرے اگر ممکن ہو تو بغیر چھیڑے ہوئے باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ بالکل اس طرح جیسے لوگ بڑی ہستیوں کے پاس سے واپس جاتے ہیں، کیونکہ عظمت طاقت ہے اور طاقت خطرناک ہوتی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اُلٹے قدموں چل سکتا تھا اور بغیر کسی غلطی کے دروازہ بھی پا سکتا تھا۔ کیا یہ خوفناک مخلوق پیچھا کریگی؟ جس ذوق سے دیواروں پر تصویروں کا پلاسترسا کر دیا تھا اسی نے ایک طرف کھونٹیوں پر جان لیوا مشرقی ہتھیاروں کا انبار بھی جمع کر رکھا تھا اور موقع کی مناسبت سے وہ بآسانی ایک استعمال کر سکتا تھا۔ اس دوران میں سانپ کی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ بے شمار اندازسے چمکنے لگی تھیں۔

اس نے پیچھے چلنے کے لئے اپنا دایاں پیر فرش سے آسانی اُٹھایا اس لمحہ اسے ایسا کرتے ہیں ایک طرح کی نفرت کا احساس ہوا۔

"میں بہادروں میں شمار ہوتا ہوں" وہ بڑبڑایا، "تو کیا یہی بہادری ہے؟ کیا بہادری قابلِ افتخار نہیں؟ محض اس لئے کہ یہاں کوئی اس شرمناک عمل کو دیکھنے والا نہیں۔ میں بھاگ جاؤں گا؟"

وہ اپنے دائیں ہاتھ کو ایک کرسی پر رکھے اپنے کو ثابت قدم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کا پیر معلق تھا۔

"واہیات!" اس نے بلند آواز سے کہا "میں اسا بزدل نہیں کہ اپنے کو ڈرتا ہوا محسوس کروں۔"

اس نے گھٹنے کو خفیف سا جھٹکا کر پیر کو ذرا اور اونچا اٹھایا۔

اور دوسرے پیر کے ایک انچ آگے ہی فرش پر رکھ دیا!

وہ نہیں سوچ سکا تھا کہ یہ کیسا ہوا۔ بائیں پیر کی ایک اور کوشش کا بھی وہی نتیجہ ہوا!۔ پھر دائیں پیر کے آگے تھا۔ کرسی کی پشت پر اسکا ہاتھ ابھی تک رکھا ہوا تھا۔ بازو سیدھا تھا اور قدرے پیچھے کی طرف کوئی بآسانی دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی گرفت چھوڑنے پر مائل سا تھا۔ سانپ کا موذی سر ابھی تک پہلے ہی کی طرح اندر دونوں کنڈلیوں سے نکلا ہوا تھا۔ گردن کی حد تک۔ اس نے حرکت نہیں کی تھی لیکن اسکی آنکھیں اب برقی چنگاریاں ہوگئی تھیں اور بے شمار روشن سوئیاں سی منتشر ہو رہی تھیں۔

وہ شخص اب راکھ کی طرح زردی مائل ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ایک قدم اُٹھایا اور پھر پیچھے کرسی کو گھسیٹتے ہوئے ایک اور۔ آخرکار کرسی جب گرفت سے بالکل آزاد ہوگئی تو ایک شور کے ساتھ فرش پر گر گئی۔ اس شخص نے ایک آہ بھری۔ سانپ نے نہ کوئی آواز ہی پیدا کی اور نہ کوئی حرکت ہی کی البتہ اسکی آنکھیں دو چوندھیا دینے والے سورج ہو رہی تھیں۔ وہ جانور خود ہی اسمیں اچھی طرح چھپ گیا تھا۔ بتدریج بڑھتے جاتے ہوئے عجیب و غریب اور گوناگوں رنگوں کے حلقے بن رہے تھے۔ اور پھر انتہائی پھیلاؤ پیدا کر لینے کے بعد دیگرے صابون کے بلبلوں کی طرح غائب ہوتے جاتے تھے۔ وہ خود اسکے چہرے تک پہنچتے معلوم ہوتے تھے۔ اور پھر جلد ہی بےحد دوری پر چلے جاتے تھے۔ اسکو کسی جگہ لگاتار ڈھول پیٹنے کی آواز سنائی دی جسمیں بے مقصد سی، دور سے آنے والی موسیقی تھی۔ اور ناقابلِ فہم مٹھاس جیسے فضائی بربط۔ وہ جانتا تھا کہ یہ طلوعِ سحر کے راگ ہیں جو بتِ ممنن کے لئے گائے جا رہے ہیں۔ اور اسکو محسوس ہوا کہ وہ ساحلِ نیل پر کھڑا، تھکے ہوئے احساس کے ساتھ صدیوں کی خاموشی میں غیرفانی نغمہ سن رہا ہے

موسیقی ختم ہوگئی۔ بلکہ یہ کافی حد تک ایک دور کے طوفانی گرج کی بازگشت بن گئی۔ اسکے سامنے ایک ایسا خطہ زمین آگیا جہاں سورج چمک رہا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور قوسِ قزح کی طرح کے رنگین محراب بنے ہوئے تھے جن کے عظیم الشان گھیرے میں متعدد شہر آباد تھے۔ بیچ کے حصہ پر ایک طویل سانپ تاج پہنے ہوئے اپنے بھاری بھرکم لپیٹ میں سے سر اُبھارے ہوئے تھا۔ اور اسکی طرف گھور رہا تھا۔ یکایک یہ خوبصورت خطۂ زمین تھیٹر کے ڈراپ سین کی طرح تیزی سے اوپر اُٹھتا ہوا محسوس ہوا اور خلا میں غائب ہوگیا۔ کسی چیز نے اس کے چہرے اور سینہ پر سخت قسم کا دھکا دیا۔ وہ فرش پر گر گیا تھا اور اسکی ناک اور کچلے ہوئے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تو وہ گھبرا کر صدمہ سے بیہوش سا ہوگیا اور آنکھیں بند کئے چہرے کو فرش پر ٹیکے پڑا رہا۔ چند لمحوں میں وہ سنبھل گیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ گر جانے کی وجہ سے نظروں کے ہٹ جانے نے سارے طلسم کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اس بار نظریں موڑے ہوئے وہ واپس جانے کے قابل ہو جائیگا۔ لیکن اسکے سر سے چند فٹ کے فاصلے پر سانپ کے موجود ہونے کے خیال اور شاید اسکے اوپر اُچھل کر اور اپنے بل اسکی گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے دیکھنے کا خیال۔۔ بہت ہی ڈراؤنا تھا۔ اسنے اپنا سر اُٹھایا، اُن مہلک آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ اور وہ پھر گرفت میں آگیا تھا۔

سانپ نے کوئی حرکت نہیں کی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ تخیل پر اثر انداز ہونے کی طاقت کھو چکا ہے چند تانیے پہلے کے مصنوعی دھوکے دُہرائے نہیں گئے۔ اس کے چوڑے بے دماغ ابروؤں کے نیچے اسکی آنکھیں پہلے کی طرح ناقابل بیان احساس بدخوئی لئے ہوئے صرف چمکتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی فتح پر یقین کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ اور زیادہ پُرکشش فریب کا شکار نہ بنائے گا۔

اب ایک خوفناک بات وقوع پذیر ہوئی۔ اپنے دشمن سے ایک گز کے فاصلے پہ اوندھے لیٹے ہوئے اس شخص نے، اپنی کہنیوں کا سہارا لیکر جسم کا اوپری حصّہ اوپر اُٹھایا۔ اسکا سر پیچھے کی طرف جُھکا ہوا تھا۔ ٹانگیں اپنی پوری لمبائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ خون رس رہا تھا چہرہ سفید تھا۔ اس کی آنکھیں کھنچاؤ کی سی حالت میں انتہائی وسعت تک پھیلی ہوئی تھیں ــــ اسکے ہونٹوں پہ جھاگ تھا جو گالوں کی شکل میں گر رہا تھا۔ شدید تشنّج کی ایک لہر سی تقریباً سانپ ہی کی طرح لہریادار تموّج پیدا کرتی ہوئی، اس کے جسم میں دوڑی اس نے پیروں کو ادھر اُدھر الگ الگ ہٹاتے ہوئے اپنے آپکو کمر پر جھکا دیا ــــ اور ہر لمحہ اسے سانپ کے قریب ہی کرتا گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ آگے کئے تاکہ اپنے کو پیچھے کھینچ سکے، پھر بھی کہنیوں کے سہارے وہ بڑھتا ہی گیا ــــ

(۴)

ڈاکٹر ڈرووننگ اور اس کی بیوی دارالمطالعہ میں بیٹھے تھے۔ سائنسداں کافی خوش نظر آ رہا تھا۔

"میں نے ابھی ہی ایک دوسرے جمع کرنے والے سے تبادلہ کر کے" اس نے کہا Ophiophagus کا ایک بے مثل نمونہ حاصل کیا ہے۔"

"اور وہ ہے کیا؟" عورت نے کچھ یوں ہی سا شوق ظاہر کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیوں، اُفوہ! کتنی بڑی جہالت ہے؟ عزیزہ جسکو شادی کے بعد یقین ہو جائے کہ اس کی بیوی یونانی زبان نہیں جانتی۔ اسے طلاق کا حق حاصل ہو جانا چاہیئے Ophiophagus ایک سانپ ہوتا ہے جو دوسرے سانپوں کو نگل جاتا ہے۔"

"پھر تو مجھے اُمید ہے کہ وہ تمہارے سب سانپ کھا جائیگا۔" اس نے یوں ہی لیمپ کو ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن یہ دوسرے سانپوں کو پاتا کس طرح ہے، انہیں مسحور کر کے! کیوں؟"

"پیاری، یہ بالکل تمہاری ہی طرح ہے۔" ڈاکٹر نے محبّت آمیز چڑچڑے پن سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ سانپوں کی قوت فریفتگی کے تو ہم سے میں کتنا جھلاّ جاتا ہوں۔"

ان کی اس بات چیت کے سلسلہ کو ایک تیز چیخ نے منقطع کر دیا۔ خاموش فضا میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی خبیث روح کسی بند مقبرے میں چیخ رہی ہو۔ پھر اور ایک بار پھر یہ آواز آئی۔ ہولناک اور غیر مبہم آواز۔ اور وہ اُچھل پڑے۔ مرد جیسے گھبرا گیا ہو اور عورت دہشت کی وجہ سے زرد اور خاموش تھی۔ غالباً ابھی آخری چیخ کی بازگشت ختم ہی ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر کمرے کے باہر جا چکا تھا۔ اور زینہ پر بیک وقت دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چڑھ رہا تھا۔ برائٹن کے کمرے کے سامنے دالان میں اس کو چند نوکر ملے جو اوپر سے آ رہے تھے۔ سب ساتھ مل کر بغیر دستک دیئے دروازے پر چل پڑے۔ دروازہ بند نہیں تھا راستہ مل گیا۔ برائٹن فرش پر پیٹ کے بل پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو اور سر کا کچھ حصّہ مسہری کی نچلی پٹیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے جسم کو پُشت کی طرف کرتے ہوئے باہر نکالا۔ چہرہ خون اور جھاگ سے لتھڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بالکل کھُلی ہوئی تھیں اور دہشتناک طریقہ سے ــــ گھور رہی تھیں۔

"دہشت سے مر گیا۔" سائنسداں نے اپنے گھٹنے موڑ کر اور ہاتھ اسکے دل پر رکھتے ہوئے کہا۔ اسی حالت میں اسکو بستر کے نیچے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ "راحم خدا!" اس نے پھر کہا۔ "یہ چیز یہاں کیسے آ گئی؟" وہ بستر کے نیچے گیا اور سانپ کو جو اب بھی کنڈلی مارے بیٹھا تھا کھینچ کر باہر لایا اور کمرے کے وسط میں پھینک دیا۔ جو سخت اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز پیدا کرتا ہوا پالش شدہ فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دیوار کے پاس جا کر رُک گیا جہاں وہ بغیر کسی حرکت کے پڑا رہا۔

یہ مصنوعی سانپ تھا اور اسکی آنکھیں دو چمکدار بٹن تھیں۔

تصنیف :- جان بنیان -
ترجمہ :- جادہ پیما -

مسافر

(قسط سوم)

(Pilgrim's Progress اسلامی افکار کے پیراہن جدید میں)

وہ ترجمان کے گھر پر پہونچ گیا جہاں پہونچکر کئی بار اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آخر ایک آدمی دروازے پر آیا اور پوچھا کون ہے۔

مسلم:- ایک مسافر۔ جو صاحب خانہ کے ایک دوست کی ہدایت پر یہاں اپنے بھلے کے لئے آیا ہے اور صاحب خانہ سے بات کرنا چاہتا ہے

تب اس نے مالک مکان تک یہ درخواست پہونچا دی اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد مالک مکان مسلم کے پاس آ پہونچا اور پوچھا "کیا چاہتے ہو تم"

مسلم:- میں خراب آباد سے آنے والا ایک آدمی ہوں اور ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں آنے والے عذاب سے بچ سکوں گا وہ شخص جو دروازے پر کھڑا رہتا ہے، اس راستہ کے سرے پر اس نے یہ بتایا اگر میں یہاں پہونچ کر آپ سے ملوں تو آپ مجھے نفیس چیزیں دکھائیں گے جو میرے سفر میں کارآمد ثابت ہوں گی۔

ترجمان:- اندر آ جاؤ۔ میں تمہیں ایسی چیزیں دکھاؤں گا جو تمہارے لئے کارآمد ہوں گی۔

پس اس نے اپنے آدمی کو شمع روشن کرنے کا حکم دیا اور مسلم سے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ اس طرح وہ اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ اندر اپنے آدمی کو ایک دروازہ کھولنے کا حکم دیا جسے کھول دینے کے بعد مسلم نے بعض عجیب حقائق کو منتقل پایا۔ اس نے چشم دل سے دیکھا کہ ایک نہایت سنجیدہ آدمی کے نقوش نمایاں تھے۔ اس کی نظریں اوپر آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور الکتاب اسکے ہاتھ میں تھی۔ اور اس کے لبوں پر احکام حق لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور دنیا کی جدوجہد سے گذرتا ہوا وہ اس جگہ آ پہونچا تھا کہ دنیا اسکے پیچھے دکھائی دے رہی تھی اور آخرت آگے۔ چہرہ یقین کے نور سے منور تھا۔ اور سر پر فوز و فلاح کا زریں تاج دمک رہا تھا۔

مسلم نے کہا "اسکا کیا مطلب ہے؟"

ترجمان:- اس عظیم ترین انسان نے جسے تم نے دیکھا سارے فرائض زندگی ادا کئے اسکی بیویاں بھی تھیں بچے بھی۔ بچوں کی پرورش بھی کی۔ اور اسکے باوجود ان فرائض کو بھی نہیں چھوڑا جو ان کے علاوہ بھی خدا نے آدمی پر فرض کئے ہیں۔ ہر مرحلہ اور ہر قدم پر خدا کی مرضی کو مقدم رکھا اور اسکی نظر احکم الحاکمین یعنی خدا کی طرف لگی رہی جیسا کہ آسمان کی طرف دیکھنے سے اور ہاتھ میں الکتاب کے ہونے سے اور لبوں پر احکام حق لکھے ہونے سے ظاہر ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خطاکاروں کو بری چیزوں سے آگاہ کرکے انہیں خسارے کی زندگی سے بچائے۔ دیکھو یہ بات اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اس طرح کھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں کو کوئی اچھی بات سنا رہا ہو۔ اور یہ جو تم دیکھتے ہو کہ دنیا اسکے پیچھے نظر آتی ہے اور سر پر فوز و فلاح کا تاج دمک رہا ہے۔ یہ تمہیں یہ دکھانے کے لئے ہے کہ سازو سامان زندگی کی کمی کے باوجود اس نے اپنے مالک حقیقی کی محبت کی خاطر ناجائز ذرائع کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور مال و دولت سے بھی زیادہ عزیز آخرت کی کامیابی کو سمجھا، وہ آخرت کی کامیابی کے یقین اور اس عظیم ترین انعام کی خوشی میں سرشار رہا اور تمہارے لئے بہترین نمونہ بنا۔ میں نے تمہیں یہ حال سب سے پہلے اس لئے بتایا ہے کہ یہ خدا کے محبوب بندوں میں سے سب سے محبوب بندہ کا حال ہے۔ یہ الکتاب کو

ہم تک پہونچانے کا ذریعہ بنا اور اس نے خدا کے احکام پر پہلے خود چل کر دکھایا۔ اور اس کے ہونٹوں سے ہمیشہ کلامِ حق اور کلمۂ خیر نکلا صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ اور اسی برگزیدہ بندے نے اس راستہ کے نشیب و فراز کو ہمیں بتایا جس پر تم جا رہے ہو۔ اور اسی کو خدا نے تمہارا رہنمائے اعلیٰ ٹھرایا ہے۔ اس لیئے خوب اچھی طرح ذہن نشیں کر لو اور جو کچھ دیکھا ہے اسے یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ راستہ میں کچھ ایسے رہزن ملیں جو رہنماؤں کا بھیس بھرے ہوئے ہوں اور تم انکے دھوکے میں آجاؤ۔ اگر دھوکے میں آ گئے تو ان کا راستہ تباہی اور موت کی طرف لے جائے گا۔

پھر اس نے مسافر کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک بہت بڑی نشست گاہ میں لے گیا جو گرد و غبار سے اَٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ اسمیں کبھی جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔ ایک لحہ اس پر نگاہ دوڑانے کے بعد ترجماں نے ایک آدمی کو جھاڑو دینے کے لیئے پکارا!

اب جبکہ وہ جھاڑو دینے لگا تو گرد اتنی زور سے اُڑی کہ مسلم کا دم اسمیں گھٹنے سا لگا۔ تب ترجمان نے ایک عورت سے جو قریب ہی کھڑی تھی کہا: "پانی لاؤ یہاں اور کمرے میں چھڑک دو۔"

جب وہ پانی چھڑک چکی اور دوبارہ جھاڑو دی گئی تو کمرہ صاف ہو گیا تھا اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔

تب مسلم نے کہا: "اسکا مطلب کیا ہے؟"

ترجمان:- یہ کمرہ اس آدمی کے دل کی مانند ہے۔ جو ہدایت کی سعادت سے ہمیشہ محروم رہا۔ غبار اسکی لغزشوں اور معصیتوں کا غبار ہے جس نے پورے آدمی کو بگاڑ دیا۔ وہ آدمی جس نے پہلے جھاڑو دی تھی قانون ہے لیکن وہ جو پانی لائی اور اسے چھڑکا، محبت الٰہی ہے۔ اب دیکھو کہ جیسا تم نے ابھی دیکھا جونہی پہلا والا آدمی جھاڑو دینے لگا گرد اسقدر اُڑنے لگی کہ کمرہ اس سے صاف نہیں ہو سکا۔ اور تمہارا دم گھٹنے لگا۔ یہ تمہیں یہ دکھانے کے لیئے ہے کہ قانون کا خارجی عمل بجائے دل کو گناہ سے صاف کرنے کے اُلٹا اسے تازہ کر دیتا ہے اور اسے تقویت دیتا ہے اور اسے قلب میں اور زیادہ کرتا ہے۔ جو خدا کے تصور سے دور رہ کر محض خارجی قانون اور جکڑ بندیوں سے آدمی کے قلب کو سدھارنا چاہتے ہیں ان کی کوششیں اسی قسم کی ہیں جیسی اُس جھاڑو دینے والے کی تھیں۔ اور آدمی سدھرنے کے بجائے بگڑتا چلا جاتا ہے۔

اب دوبارہ اسپر غور کرو۔ دیکھو ایک عورت کو تم نے پانی لاتے اور چھڑکتے دیکھا جسکے پانی چھڑکنے پر کمرہ صاف اور خوشگوار ہو گیا یہ تمہیں یہ دکھانے کے لئے ہے کہ جب دل میں خدا کی محبت اور اسکی رضا جاگزیں ہو جاتی ہے اور دل اثر پذیر ہونے لگتا ہے۔ تب میں کہتا ہوں کہ جس طرح کمرے کی گرد آلود فضا پانی چھڑکنے سے خوشگوار اور صاف ہو گئی اسی طرح گناہ قلب کے ہر گوشے سے کافور ہو جاتا ہے اور دل اسکے عقیدے سے معمور ہو کر صاف شفاف اور یادِ الٰہی کے شایاں شان بن جاتا ہے۔

مزید برآں میں نے اپنے خواب میں یہ دیکھا کہ ترجمان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسکے چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں دو بچے اپنی اپنی کرسی پر الگ بیٹھے تھے۔ سب سے بڑے کا نام خواہش تھا۔ دوسرے کا نام صبر۔ خواہش غیر مطمئن نظر آتا تھا لیکن صبر بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

تب مسلم نے پوچھا: "خواہش کی بے اطمینانی کا سبب کیا ہے؟"

ترجمان نے جواب دیا: "ان کے حاکم نے اسکو بہترین چیزیں حاصل کرنے کے لیئے اگلے سال تک ٹھرنے کو کہا تھا لیکن یہ چاہتا ہے کہ سب کی سب ابھی حاصل کر لوں۔ مگر صبر انتظار کرنے پر تیار اور راضی بہ رضا ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ ایک آدمی خواہش کی طرف آیا اور اس کے لئے خزانہ کا ایک تھیلا لایا۔ اور اسکے قدموں پر بکھیر دیا جسے اس نے لے لیا اور اسمیں مگن ہونے لگا۔ اور اسپر مزید یہ کہ صبر کو چڑانے کے لئے قہقہے لگانے لگا۔

لیکن ایک ہی لمحہ میں نے دیکھا ہو گا کہ وہ سب کو جلدی سے ٹھکانے بھی لگا چکا تھا اور اب اسکے پاس پھٹے چیتھڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

تب مسلم نے ترجمان سے کہا: "یہ معاملہ کیا ہے ذرا کھول کر مجھے بتایئے۔"

ترجمان اس طرح گویا ہوا: "یہ دو لڑکے "تشبیہ" پیش کئے گئے ہیں۔ خواہش ان لوگوں کی مثال ہے جو فقط اس دُنیا پر لٹو ہیں۔ صبر ان لوگوں کی مثال ہے جو آنیوالی زندگی یعنی حیاتِ اُخروی کے قائل

ہیں ۔اس لئے کہ جیسا کہ تمنے یہاں دیکھا ہے خواہش کو جو کچھ ملنا ہے اس سال کے اندر ہی مل جائیگا۔ مطلب یہ کہ اسی دُنیا کی زندگی میں۔ دُنیا پرستوں کا حال بھی ہوتا ہے۔ وہ ساری چیزیں اسی دُنیا میں پانے کے طالب ہوتے ہیں۔ اگلے سال تک یعنی حیات اُخروی تک انتظار کرنا ان کے بس کا نہیں۔ ان کا حال ایسا ہے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ایک کہاوت چلی آتی ہے کہ پکڑی ہوئی ایک چڑیا جھاڑی کی دو چڑیوں کے برابر ہے۔ تو یہ چیز انکے نزدیک حیاتِ اُخروی کے انعام و اکرام کے سارے وعدوں اور خدا اور اسکے پیغمبر کی بشارتوں سے زیادہ قابل قدر ہے۔ لیکن جیسا کہ تمنے دیکھا کہ اس نے جلدی ہی ساری چیزوں کو ٹھکانے لگا دیا اور اسکے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ یہی حال اس قسم کے لوگوں کا آخرت میں ہوگا۔

مسلم :۔ اب میں سمجھا کہ صبر سب سے زیادہ سمجھ رکھتا ہے۔ اور اس کے بہت سے وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ بہترین چیزوں کا طالب اور منتظر ہے دوسرے یہ بھی ہے کہ وہ خدا کے انعام و اکرام سے اس وقت مالا مال ہوگا جب دوسرے کے پاس پھٹے چیتھڑوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

ترجمان :۔ اتنا ہی نہیں تم یہ بھی کہہ سکتے ہو، غور کی بات ہے کہ آخرت کا انعام کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لیکن دُنیوی اعزاز مٹ جانیوالی چیز ہے۔ اس لئے خواہش کے پاس صبر پر قہقہہ لگانے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کیونکہ اُسے آخر میں بہترین چیزیں ملیں گی۔ پہلے کو آخر والے کے لئے جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔ کیونکہ آخر والے کا بھی وقت آتا ہے۔ مگر آخر والا کسی اور کے لئے جگہ خالی کرنے پر مجبور نہیں اس لئے کہ پیچھے اور کوئی جگہ لینے والا نہیں ہوتا۔ لہذا وہ جسے پہلے حصہ ملا ایک وقت کے اندر اندر اسے اُڑا دے گا لیکن وہ جسے بعد میں ملا۔ اس کے پاس بعد تک رہے گا۔ اور باقی رہنے والا حصہ ہوگا۔

مسلم :۔ تب میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اس دُنیا کی چیزوں پر لٹو ہونا اچھا نہیں بلکہ آخرت کی زندگی کے انعام کا منتظر رہنا چاہئے۔

ترجمان :۔ سچ کہتے ہو تم۔ دُنیا کی زندگی دراصل ایک امتحان کی حیثیت رکھتی ہے جس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا اور تب لافانی زندگی کا آغاز ہوگا۔ جو اس نتیجہ کو بھول گئے وہ یقیناً خسارے میں رہیں گے۔ اور دیکھو دُنیا کی چیزوں سے دل نہ لگانے کا مطلب رہبانیت نہیں۔ بس تندہی سے آخرت کے امتحان کی تیاری میں اتنا منہمک رہنا ہے کہ کوئی شے اس انہماک میں روڑا نہ اٹکائے۔ اور آخرت کی تیاری کیا ہے؟ خدا کے احکام کو بجا لانا اور انہیں دُنیا میں قائم کر دینا، تاکہ خیر کو پروان چڑھنے کا موقع ملے اور بُرائی مٹے۔ اور ہر آن خدا کی رضا کا طالب رہنا۔

اسکے بعد میں نے اپنے خواب میں دیکھا کہ ترجمان نے مسلم کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں ایک دیوار کے مقابل آگ جل رہی تھی اور ایک آدمی پاس ہی کھڑا برابر اس پر پانی پھینک رہا تھا آگ بجھانے کے لئے، اسکے باوجود آگ تھی کہ اور زیادہ بھڑکتی جاتی تھی اور شعلے اونچے ہونے جاتے تھے۔

تب مسلم نے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

ترجمان نے جواب دیا۔ "یہ آگ ایمان کی آگ ہے۔ آتش عشق ہے۔ جو دل میں روشن ہے۔ وہ جو اسے بجھانے اور سرد کرنے کو پانی پھینک رہا ہے۔ شیطان ہے۔ لیکن جیسا کہ تم دیکھتے ہو آگ بجھتی تو کیا ہے اور بڑھتی جاتی ہے اور شعلے تیز تر ہوتے جاتے ہیں۔ میں تمہیں اس کا سبب بتاؤں گا۔"

پھر اس نے کیا کیا کہ وہ اسے دیوار کے پیچھے لے گیا۔ جہاں اس نے ایک آدمی کو ہاتھ میں تیل کا برتن لئے ہوئے دیکھا جس میں سے وہ مسلسل مگر چپکے چپکے آگ میں تیل ڈال رہا تھا۔

پھر مسلم نے پوچھا۔ "اسکا کیا مطلب ہے؟"

ترجمان نے جواب میں کہا: "یہ خدا کی غیبی مدد اور اسکا فضل ہے جو دل کی آگ کو برابر روشن رکھتا ہے اور اسے تقویت پہونچاتا رہتا ہے جس کی مدد سے شیطان کی کوششوں کے باوجود دل ایمان اور عشق الٰہی سے معمور رہتا ہے۔ اور اس بات میں کہ تم نے اس آدمی کو دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر آگ بجھاتے دیکھا یہ نکتہ چھپا ہے کہ ظاہر بینوں کی نظر اس حقیقت تک کم ہی پہونچتی ہے کہ خدا اپنے بندوں کی مدد کن کن پوشیدہ راستوں سے کرتا ہے۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ ترجمان نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے

ب خوشگوار جگہ پر لے گیا جہاں ایک پُرشکوہ محل بنا ہوا تھا۔ نہایت دیدٔ
یب۔ جسے دیکھ کر مسلم بہت محظوظ ہوا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اسکی چھت
بہت سے آدمی زرق برق پوشاک پہنے پھر رہے ہیں۔

اس پر مسلم نے کہا "کیا ہم اندر جا سکتے ہیں؟"

تب ترجمان نے اسے ساتھ لیا اور محل کے دروازے کی طرف لے
ا۔ اور دیکھو دروازے پر آدمیوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو اندر جانے
ہلئے بیتاب تھی۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ دروازے پر ایک آدمی
ی میز بچھائے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک رجسٹر اور قلم دوات سامنے رکھے تھے۔
اندر داخل ہوتا وہ اس کا نام لکھ لیتا۔ اس نے یہ بھی دیکھا دروازے
ے راستے کو بہت سے مسلح آدمی کھڑے روکے ہوئے ہیں۔ اور یہ
ادہ ان کے چہروں سے جھلک رہا ہے کہ جو لوگ بھی داخل ہونا
ہیں گے انہیں ہر ممکن ایذا پہونچائیں گے اور شرارت میں کوئی دقیقہ
ٹھا نہیں رکھیں گے۔ اب مسلم کسی قدر تعجب میں پڑ گیا۔ آخرکار
لکہ ہر ایک آدمی ان مسلح آدمیوں کے خوف سے اُلٹے پاؤں پھر رہا
ا مسلم نے ایک آدمی کو اس آدمی کی طرف آتے دیکھا جو نام لکھ رہا
ا۔ اس کے چہرے پر استقلال کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ آکر کہنے لگا۔
یرا نام لکھ لیجئے جناب" جس پر اس نے لکھ لیا۔ لکھنے کے بعد سنے
یکھا کہ آدمی نے اپنی شمشیر نیام سے باہر کھینچ لی اور سر پر خود ٹھیک
ح جما لیا اور دروازہ کی طرف جھپٹ کر ان مسلح آدمیوں پر حملہ آور
ا یہ لوگ بھی اس پر بہت زور سے ٹوٹ پڑے۔ مگر کیا مجال جو ذرا
ں وہ آدمی ہمت ہارا ہو۔ بلکہ انکے ٹکڑے اُڑاتا کشتوں کے پشتے
اتا آگے بڑھتا گیا۔ آخرکار بہت سے زخم کھا لینے کے بعد وہ ان لوگوں
ے بیچ سے اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور آگے بڑھ کر
ل میں داخل ہوگیا جس پر ایک نہایت شیریں آواز کی گونج ان لوگوں
طرف سے آتی سنائی دی جو محل میں تھے اور ان لوگوں کی طرف
ے بھی جو محل کی چھت پر گھوم رہے تھے۔ آواز آرہی تھی۔

آؤ۔ آؤ لوگو آؤ
آؤ۔ آؤ آنے والو
مالک کے گُن گانے والو
جیسے تمہاری شان تمہاری
آن تمہاری بان تمہاری

آؤ آؤ لوگو آؤ
محنت کا انعام ملے گا
راحت اور آرام ملے گا
تم پہ خدا کی رحمت ہوگی
عزّت ہوگی عظمت ہوگی
آؤ آؤ لوگو آؤ

الغرض وہ اندر چلا گیا۔ اور ویسے ہی زرق برق کپڑے اسے بھی پہنائے گئے جیسے چھت پر ٹہلنے والوں کے تھے۔

تب مسلم مسکرایا اور بولا "میں سمجھتا ہوں اس کا مطلب میں جانتا ہوں۔"

اب مسلم نے کہا کہ مجھے چلنے کی اجازت دیجئے۔

"نہیں۔ ذرا ٹھہرو" ترجمان بولا "ابھی تمہیں میں کچھ چیزیں اور دکھاؤں گا۔ اس کے بعد تم چلے جانا۔"

پھر اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک کمرے میں لے گیا۔ جسمیں گھُپ اندھیرا چھایا تھا اور اسمیں ایک آدمی لوہے کے کٹہرے میں بند بیٹھا تھا۔

اب وہ آدمی دیکھنے پر بہت غمگین نظر آرہا تھا۔ اس کی نظریں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ ٹانگوں کے گرد گھیرے ہوئے بیٹھا ایسی دل دوز آہیں بھر رہا تھا کہ جیسے اب دم دے دے گا۔

تب مسلم نے کہا "اسکا کیا مطلب ہے؟"

جس پر ترجمان نے مسلم سے کہا کہ اس شخص سے بات چیت کرو۔

تب مسلم نے اس آدمی سے کہا "تو کون ہے؟"

آدمی نے جواب دیا "میں وہ ہوں جو کسی وقت میں نہیں تھا۔"

مسلم:۔ کسی وقت تو کیا تھا؟

آدمی:۔ میں کسی وقت نیک نام تھا اپنی نظر میں بھی اور دوسروں کی نظروں میں بھی۔ اور اپنے خیال میں کسی وقت میں خود کو جنت کا مستحق سمجھتا تھا اور اس خیال میں مگن تھا میں تو وہاں پہونچوں گا ہی۔

مسلم:۔ اچھا تو پھر یہاں کیوں ہو تم؟

آدمی:۔ اب تو میں سراپا نااُمیدی اور نامرادی ہوں۔ اور اسمیں اس طرح بند ہوں جیسا اس لوہے کے کٹہرے میں۔ میں باہر

ں نکل سکتا ۔ ہائے ۔ اب میں نہیں نکل سکتا ۔
لم :۔ لیکن تو اس حالت کو پہونچا کیونکر ؟
می :۔ میں نے احتساب اور نظم واحتیاط سے کام لینا چھوڑ دیا اور خود کو خواہشات کا غلام بنا لیا ۔ خدا کی ہدایت اور روشنی ــــــ واضح ہوتے ہوئے بھی گناہ پر قائم رہا ۔ میں شیطان کی طرف جھک گیا اور وہ مجھ پر مسلط ہو گیا ۔ میں نے خدا کے بتلائے ہوئے راستہ کو چھوڑ دیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا ۔ میں نے اپنا دل اتنا سخت کر لیا ہے کہ توبہ پر مائل ہی نہیں ہوتا ۔

ب مسلم نے ترجمان سے کہا ۔ "لیکن کیا اس شخص کے لئے کوئی بد کی کرن باقی نہیں ؟"

ترجمان نے کہا " اس کا جواب ذرا تفصیل سے دینا چاہتا ہوں ہو ۔ بدنصیب دو طرح کے ہیں ۔ ایک تو وہ جن کا حال " الکتاب " میں لکھا ہے کہ " خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ " یعنی جیسے ان کے دلوں پر لگ گئی ہو ، کان بند ہوں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہو ۔ جب کسی ل اتنا سخت ہو گیا ہو جیسا کہ اس آدمی نے خود کہا تو پھر اس کا ایت کو قبول کرنا معلوم ۔ اور ان کے علاوہ دوسری طرح کے لوگ ہیں جن کا ذکر الکتاب میں اس طرح آیا ہے : " فِيْ قُلُوْبِهِمْ رَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا " یعنی ان کے دلوں میں ری ہے جس کو اللہ نے اور بڑھا دیا ہے ۔ یہ لوگ وہ ہیں جو یت کو پانے کے بعد بھی اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے ۔ اور انہوں غلط روی اختیار کی ۔ ان عقل کے دشمنوں کی حالت کو الکتاب بہترین مثالوں سے سمجھاتی ہے ۔

پہلی مثال یہ ہے کہ ان کی حالت ایسے شخص کی سی ہے جس نے ھیری گھنگور رات میں آگ جلائی ۔ اور جب آگ نے آس پاس ، ماحول کو روشن کرنا شروع کیا تو آگ بجھا دی گئی اور اب وہ شخص ھیرے میں صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ کھڑا رہ گیا ۔ ایسے لوگ حق طرف پلٹنے والے ہیں ۔ پھر اُمید کی کرن بھلا انکے لئے کہاں ۔

دوسری مثال یہ ہے کہ جیسے زور سے مینہ پڑ رہا ہو اور آسمان ں شدید تاریکی کے ساتھ بجلی کے چمکنے اور گرجنے پر لوگ موت کے ولدا ، تصور سے کانوں میں انگلیاں دے رہے ہوں ۔ اور اس نازک وقت میں انکی بینائی بجلی کی نذر ہو جائے ۔ تب یہ آنکھوں کے اندھے روشنی ہوتے پر ذرا دور چلیں اور بجلی کی چمک ختم ہو جانے پر پھر اندھیرے میں رہ جائیں ۔ ایسے لوگوں کا سماعت اور بینائی ختم ہو جانے پر کیا عالم ہو گا تم سوچ سکتے ہو کہ خدا اس پر بھی قادر ہے " ۔

اسکے بعد ترجمان نے مسلم سے کہا " اچھا اب ذرا تم اس آدمی سے اور کچھ پوچھو " ۔

مسلم نے اس آدمی سے پوچھا " تو نے آخر کس لئے خدا کے احکام سے غفلت برتی اور ان حالوں کو کس چیز کی خاطر پہونچا ؟ "

آدمی :۔ کس چیز کی خاطر ؟ اپنی خواہشات کی خاطر ، اپنی راحت طلبی کی خاطر ۔ اس دُنیائے فانی کے فائدوں کی خاطر جنہیں اُس وقت میں اپنی مسرتوں کا بڑا سامان سمجھتا تھا مگر آج یہی چیزیں مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی ہیں ۔ اور میرا جسم انکی سوزش سے آبلہ آبلہ ہو رہا ہے ۔

مسلم :۔ لیکن کیا تو توبہ نہیں کر سکتا اور حق کی طرف رجوع نہیں کر سکتا ؟

آدمی :۔ اب جب کہ مجھے عذاب نے آپکڑا ہے میری توبہ کیا قبول ہو گی ۔ دوسرے میرا قلب اتنا سخت ہو گیا ہے کہ میرا تو حال ان لوگوں کا سا ہے جنہیں صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کہا گیا ہے ۔ اب میں اس لوہے کے کٹھرے میں بند ہوں دُنیا کا کوئی شخص مجھے اس سے نہیں نکال سکتا ۔ ہائے اب میں ابدی عذاب میں مبتلا رہوں گا ۔ ہائے ہائے ۔ پھر ترجمان مسلم کی طرف مخاطب ہوا ۔ اور اس طرح اس کو نصیحت کی :۔

" مصیبت سے ہمیشہ عبرت حاصل کرنا " ۔

مسلم بولا " اچھا ۔ کتنا بھیانک اور ہولناک ہے یہ منظر ۔ خدا مجھے ہمیشہ محتاط اور حق پر قائم رکھے ۔ اور ان چیزوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس بدنصیب آدمی پر عذاب نازل ہونے کا سبب بنی ہیں ۔ اچھا جناب اب تو مجھے چلنا چاہئے ما ۔ اجازت دیجئے " ۔

ترجمان :۔ ابھی رکو ۔ دو چیزیں تمہیں اور دکھا دوں ۔ پھر تم اپنی راہ لینا ۔

پھر اس نے دوبارہ مسلم کا ہاتھ پکڑا اور اسے بڑے کمرے میں لے گیا جہاں ایک آدمی اپنے بستر سے اُٹھ رہا تھا ۔ جیسے ہی اس نے لباس پہنا وہ کانپنے اور لرزنے لگا ۔

تب مسلم نے کہا " یہ شخص اس طرح کیوں کانپ رہا ہے رتبا قی پھر

نقیب بندیلوی

اپنے جہاں سے بے خبر......؟

آج اس کی انوری بیگم سے پھر چق چق ہو گئی وہ جھنجھلایا
"کس جاہل سے پالا پڑ گیا۔ دشمن کو بھی ایسی عورت کا ساتھ نصیب نہ ہو۔ سارا پلاٹ آؤٹ۔ ذرا بھی یکسوئی نہ رہی۔ کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟۔ ان سے دلچسپی بے وقوف۔ جاہل "۔

اس نے قلم میز پر پٹک دیا۔ پیڈ بند کر دیا۔ اور بڑبڑاتا ہوا پلنگ پر جا گرا۔ بےچینی اور اضطراب کا طوفان اس کے ذہن میں برپا ہو گیا۔ بات بھی معقول ہے۔ اہلیہ سے آئے دن کشمکش ہو تو کیسے۔۔۔ اسکی آنکھیں نم ہو گئیں۔ گرم گرم آنسوؤں کے چند قطرے آنکھوں سے ٹپکے اور کلیجے کی آگ سرد پڑی۔ دل کو سکون ہوا۔ غنودگی نے تھپک تھپکا اور شاہد کو جھپکی آ گئی۔

تم خاموش کیوں ہو؟ یہ چشمے صاف شفاف پانی پر چمکتے ہوئے ہلکے گلابی ریت کے تھوڑے تھوڑے تودے۔ یہ سر سبز و شاداب میدان۔ یہ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنیں گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہوئے پرندوں کا شور بہتے ہوئے پانی کے پُر اسرار ترانے۔ تمہارے دل کو گدگدا نہیں رہے ہیں۔ افسانہ نویس اور یہ خوشگوار منظر تمہارے جذبات کیا اب بھی بیدار نہ ہوں گے۔"

سلیم نے شاہد کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
"جس کا دل تلخیوں کی بھٹی میں جا پڑا ہو اس کے لئے دنیا کا ہر خوشگوار منظر زخم پر نمک ہے"۔ شاہد نے ایک آہ بھری اور نہایت متفکر لہجے میں جواب دیا۔

حلیم نے شاہد کو غور سے دیکھا۔ پھر مسکرایا اور بولا "افسانہ نویس کے لئے ایسا ہی ماحول درکار ہے۔ تم ترقی پسند ہوا اور تمہارا گرد و پیش دقیانوسیت کی زندہ تصویر۔ آخر معاملہ کیا ہے؟"
حلیم نے پوچھا۔
شاہد بولا۔ کل میں شمسی کے یہاں گیا۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہے۔ اخلاق سے پیش آتی ہے۔ میں نے اس کی اس ذلیل اور طوائفانہ زندگی کی وجہ دریافت کی۔ بڑی دلچسپ داستان ہے۔ پوائنٹس (points) نوٹ کرتے میں دیر ہو گئی۔ رات شاید ۱۲ بج گئے ہوں گے۔ گھر آیا۔ تو انوری منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا خیر تو ہے" جھلا کر بولی "خیریت کیا پوچھتے ہو۔ زہر لائے ہو تو دیدو۔ ایسی زندگی کا جلد ختم ہو جانا ہی اچھا ہے۔ یہی خیریت ہے کہ اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔ "تمہیں انصاف کرو حلیم۔ اگر میں سماج کے ٹھکرائے ہوئے مظلوموں کے پاس نہ جاؤں تو سماج کی خرابیوں پر روشنی کیسے ڈالوں۔ انوری رات تو چپ ہو گئی۔ مگر صبح کو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کہاں جاتے ہو؟ کیوں جاتے ہو؟ اتنی دیر کیوں لگتی ہے؟۔ میں نے بہترا سمجھایا کہ "افسانے کا پلاٹ لینے گیا تھا"۔ مگر اُف بیوقوف۔ جاہل۔ کچھ نہ سمجھیں۔۔۔

حلیم شاہد کی باتوں کو غور سے سنتا رہا۔ شاہد کی بات ختم ہو گئی لیکن وہ اب بھی کچھ سننے کا منتظر تھا۔۔۔ تھوڑی دیر تک خاموشی چھا گئی حلیم نے غمخوار دوست کی طرح افسوس کیا۔ پھر شاہد آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں"
"ضرور کہو" شاہد نے جواب دیا "شاید تم ہی میری بہتری کی صورت پیدا کر سکو"
حلیم نے کہا "تم اپنی عملی دنیا سے الگ شاید خیالی دنیا میں بستے ہو"۔۔۔

"اسکا مطلب"۔ شاہد نے پوچھا۔
"مطلب اگر سنو گے تو بُرا مانو گے"۔ حلیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"نہیں نہیں حلیم۔ تم ضرور کہو۔ کیا میں غلطی پر ہوں"۔ شاہد نے متعجب ہو کر کہا۔۔۔
"بات یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح سے پہلے دوسروں کو ٹھیک کرنے

چلے ہو۔ کیا یہ علم نہیں ہے؟ کہ انوری تمہارے انتظار میں ہلکان ہو جاتی ہے۔ دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ تم دفتر سے آؤ۔ کھانا کھاؤ، سیر و تفریح کو چلے جاؤ۔ اور پھر اتنی رات کو گھر لوٹو۔ تمہارے گھر کی چپقلش اسی بنیاد پر ہے۔ انوری جاہل سہی۔ مگر سینہ میں عورت کا دل رکھتی ہے۔ جو شوہر سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ سوچو اگر وہ بھی تمہاری طرح افسانہ نویس بن جائے۔ اس کی شکایت بجا ہے مگر تم غور نہیں کرتے . . . . "

شاہد نے حلیم کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مجسم سوالی صورت بن گیا۔ شاہد نے کہا تو اب کیا کروں؟۔

حلیم نے سمجھایا: "پہلے اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرو پھر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالو۔ شمسی سے ہمدردی کے بجائے اپنی ہمسایہ بڑھیا بیوہ کے پاس جاؤ جو زندگی کی تلخیوں کا زندہ نمونہ ہے"۔

"اوہ وہ گندی اور بدبودار جیتھڑے لگانے والی بڑھیا۔ اس کے قریب سے گذرنے ہی پر دماغ پھٹنے لگتا ہے۔

"حلیم تم کیا کہہ رہے ہو؟" شاہد نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"برا مت ماننا۔ تم دراصل سچے افسانہ نویس نہیں بلکہ شہرت طلب اور لذت پسند فن کار ہو۔ اپنی زندگی پر نظر ثانی کرو"۔ حلیم نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ ملاؤں کی باتیں مجھے پسند نہیں کیا تم یہ نہیں سمجھ رہے ہو کہ تم مجھے غیر ذمہ دار بنا رہے ہو۔ تم فن کار نہیں۔ تم یہ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ ایک فن کار اپنا پلاٹ کیسے تیار کرتا ہے۔ وہ بڑھیا جب میں اسکی بدبودار کوٹھڑی کے قریب سے گذرتا ہوں تو پیسہ مانگتی ہے۔ میں خاموشی سے سانس روک کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ مگر پیچھے سے میرے کانوں میں اسکی بڑبڑ سنائی دیتی ہے۔ "بڑا بابو بنتا ہے۔ مجاج نہیں ملتے۔ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں"۔ تمہیں بتلاؤ۔ میں ایسی بد اخلاق اور گندی بڑھیا سے جا کر کیا پوچھوں۔ اسے تو بس پیسہ چاہیئے"۔ شاہد نے تیز ہو کر کہا . . .

"انوری اور بڑی وسن بڑھیا کے ساتھ تمہارا برتاؤ افسانہ نویس کے لیئے بہترین پلاٹ ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں"۔

حلیم نے پھر بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بس حلیم بس کرو۔ تم میرے اعمال پر داروغہ نہیں۔ تم مجھے یہاں تنہا چھوڑ دو۔ تم جاؤ۔ تم جاؤ۔ حلیم تم جاؤ۔ شاہد زور سے چلایا۔

ارے ارے کیا ہوا۔ انوری نے شاہد کے ہاتھ کو ہلایا۔ اور وہ بستر پر پڑا چیخ رہا تھا۔ ہیں ہیں۔ ارے۔ پھر۔ تم . . . انوری۔ پھر مجھے مجھے مت چھیڑو۔ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ حلیم تو تین ماہ قبل ہی اس دنیا سے گذر چکا تھا۔ یہ خواب کیا تھا؟ یہ عجیب خواب۔

مگر اس خواب نے اسکو بہت متاثر کیا اور وہ اپنی زندگی پر غور کرنے لگا۔

چند خاکے

منظر حسین

تصادم!

سڑک کے موڑ پر پہنچتے ہی تصادم ہو گیا
"کتنا خوبصورت جانور ہے یہ؟" اس نے سوچا، لیکن کہا صرف "Sorry" — اس Sorry کے جواب میں اسے بھی ایک Sorry ملا، یعنی تصادم کی رپورٹ تھانے میں لکھوانے کی بجائے آنکھوں میں لکھ لی گئی۔
"خوبصورت جانور" چلا گیا لیکن اسکے "دل کا انجن" اسٹارٹ ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

وہ بہت دیر تک "تصادم کے مقام" پر کھڑا رہا اور اسے بڑے پیار سے دیکھتا رہا۔

"خوبصورت جانور" کے جسم کا ایک ایک عضو ابھر ابھر کر اسکی آنکھوں کے سامنے پھڑک رہا تھا ناچ رہا تھا۔ تھرک رہا تھا — اور اسکا دل بھی انکا ساتھ دینے پر مجبور تھا کیونکہ کوئی "ڈانس" بغیر ایک ساتھی کے "مکمل" ہوا ہے نہ آئندہ ہو گا؟

اچانک اس کے سامنے سے ایک "سیاہ برقعہ" بجلی کی سی رفتار کے ساتھ گذر گیا۔ اور اس کا ذہن دفعتاً اپنی بیوی کی طرف مڑ گیا۔

"لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ — اس خوبصورت بلا میں کونسی چیز ایسی ہے جو میری بیوی میں نہیں ہے؟" اس نے تصادم کے مقام پر تھوک دیا — اور تھوک کر وہ آگے بڑھ گیا۔

تصویروں کا البم

تصویر نمبر ۱

ایک مرد - ایک عورت — دونوں جوان ہیں اور خوبصورت — مرد کا لباس "لنگوٹی" ہے عورت کا لباس ایسا ہے جس سے اس کا پورا جسم ڈھکا ہوا ہے، صرف چہرہ، ہاتھ اور پیر کھلے ہوئے نظر آ رہے ہیں — مرد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ اور وہ اپنے داہنے ہاتھ سے عورت کی ایک کلائی تھامے ہوئے ہے اور بائیں ہاتھ سے اسکی آستین اوپر کی طرف سرکا رہا ہے — عورت کا انداز یوں ہے جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو، جیسے وہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے بنیاب ہو رہی ہو۔

تصویر نمبر ۲

مرد نے ناف سے گھٹنوں تک کا لباس پہن رکھا ہے — اور عورت نے اپنا وہی پرانا لباس، اس فرق کے ساتھ کہ اسمیں سے آستینیں غائب ہو گئی ہیں۔ مرد عورت کی ننگی باہوں پر نظریں جمائے ہوئے ہے اور عورت مرد کے چہرے پر، جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ "اب تو خوش ہو میرے آقا" — لیکن "آقا" کا ایک ہاتھ عورت کی پنڈلی پر ہے۔

تصویر نمبر ۳

مرد گردن سے گھٹنوں تک کا لباس پہنے ہوئے ہے اور عورت کے لباس کا نچلا حصہ یوں کٹ گیا ہے کہ اس میں سے "سفید چکنی" پنڈلیاں صاف نظر آ رہی ہیں — عورت مسکرا کر مرد کی طرف یوں دیکھ رہی ہے گویا کہ وہ پوچھ رہی ہو کہ اب تو خوش ہو میرے آقا" — لیکن "آقائے نامدار" کا ہاتھ عورت کی گردن سے کپڑا نوچنے میں مصروف ہے، اگرچہ آنکھیں پنڈلیوں پر جمی ہوئی ہیں۔

تصویر نمبر ۴

مرد کا لباس گردن سے ٹخنوں تک ہو گیا ہے اور عورت کا لباس

برائے نام رہ گیا ہے کیونکہ اب نہ صرف اسکی باہیں اور پنڈلیاں ننگی ہیں بلکہ اس کی پیٹھ اور چھاتیوں کا نصف حصہ بھی عریاں ہے — عورت مرد کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہی ہے جیسے پوچھ رہی ہو کہ "اب تو خوش ہو، میرے آقا!" — لیکن "آقائے مرد" کی نگاہیں عورت کا جائزہ لے رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔

تصویر نمبر ۵

مرد نے اپنے جسم کے اوپری حصہ کو ایک "اضافی" نمائش سے مزین کر رکھا ہے۔ عورت نے اسی مناسبت سے اپنے لباس کو تراش ڈالا ہے، جس میں سے اب اسکی کمر نظر آ رہی ہے پیٹ نظر آ رہا ہے اور رانیں بھی دکھائی دے رہی ہیں — یہ لباس کے پردہ میں عریانی کا مکمل نمونہ ہے — عورت مرد کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر رہی لیکن اس کی "بے زبانی کی زبان" پوچھ رہی ہے کہ "اب تو خوش ہو — میرے آقا!" — لیکن ظالم "آقا" اب بھی خوش نظر نہیں آتا۔ — اب بھی سوچ رہا ہے کہ۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

تصویر نمبر ۶

مرد نے اپنے سر کو بھی ڈھک لیا ہے پیر کو بھی چھپا لیا ہے۔ غرض یہ کہ پورے جسم کو یوں آراستہ کر لیا ہے کہ چہرے اور ہاتھ کے علاوہ کسی حصہ پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی — اور — اور عورت نے اپنے لباس کے بچے کھچے تار بھی نوچ کر پھینک دئے ہیں۔ اور وہ مادر زاد ننگی ہو گئی ہے — مرد مسکرا نہیں رہا ہے — عورت شرما نہیں رہی ہے، رو رہی ہے اور پوچھ رہی ہے کہ "اب تو خوش ہو۔ میرے آقا!"

تصویر نمبر ۷

مادر زاد ننگی عورت مرد کے قدموں میں پڑی سسک رہی ہے۔ — اور مرد ایک دوسری جوان اور خوبصورت عورت کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جو اپنے پورے جسم کو ڈھکے ہوئے ہے۔

داد خدا کی بیٹی

داد خدا بڑا "مذہبی" آدمی تھا۔

جس دن اسکے گھر بیٹی پیدا ہوئی، اس نے حلیتن بابا کے مزار پر گھی کا ایک چراغ جلایا اور منت مانی کہ اگر اس کی بیٹی زندہ رہی اور خوبصورت، تو وہ اس کی شادی کے دن حلیتن بابا کے نام پر ایک دنبہ ذبح کرے گا۔

حلیتن بابا نے اسکی سنی یا نہیں، اسکی بابت تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، البتہ اسکی بیٹی کے پیدا کرنے والے نے ضرور سن لیا۔ اور بیٹی دن بدن بڑھنے لگی اور اس کا حسن چمکنے لگا۔

جب وہ تین سال کی ہوئی تو داد خدا کے پاس "پیغامات" آنے لگے — کسی نے "پانچ سو" لگائے، کسی نے "سات سو" کسی نے "آٹھ سو" لگائے۔ کسی نے "نو سو" —

مگر داد خدا نے یہ کہہ کر تمام پیغامات ٹھکرا دئے کہ "میری بیٹی کی صرف آنکھیں ہی پانچ پانچ سو کی ہیں"۔

جب وہ سات سال کی ہوئی تو "بڑے بڑے" پیغامات آنے لگے — "ایک ہزار" "ڈیڑھ ہزار" — "دو ہزار" "ڈھائی ہزار" — مگر داد خدا نے یہ کہہ کر پیغامات ٹھکرا دئے کہ "میری بیٹی کی صرف آنکھیں ہی ایک ایک ہزار کی ہیں"۔

اور جب وہ چودہ[14] سال کی ہوئی تو "اونچے اونچے" پیغامات آنے لگے — "پانچ ہزار" "سات ہزار" — "نو ہزار" "دس ہزار" — مگر داد خدا نے یہ کہہ کر پیغامات ٹھکرا دئے کہ "میری بیٹی کی صرف آنکھیں ہی پانچ پانچ ہزار کی ہیں"۔

آخر جب وہ سولہ[16] سال کی ہوئی تو "بڑے اونچے۔ بڑے اونچے" پیغامات آنے لگے — "گیارہ ہزار" — "بارہ ہزار" — "تیرہ ہزار" — "چودہ ہزار" —

داد خدا نے بولی لگائی "پندرہ ہزار — ایک — پندرہ ہزار — دو — پندرہ ہزار...... — تین" — اور بیٹی ایک بوڑھے ملک کو دیدی — اور بازار سے ایک دنبہ خرید کر حلیتن بابا کو — اس "مقدس فریضہ" کی ادائیگی کے بعد داد خدا کو فوراً حج کا

خیال آیا اور وہ اسی سال حج کے لئے روانہ ہوگیا۔ حج کرکے جب وہ لوٹا تو اس نے اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوائی اور مسجد بنوا کر وہ "یادِ خدا" میں مصروف ہوگیا۔

اور اب وہ "زندہ پیر" "خان بابا" اور دیگر ناموں سے مشہور ہے اور لوگ اسکی زیارت کو اسی طرح آتے ہیں جس طرح جلیانی بابا کے مزار پر۔

ابنِ آدم کا مرض

ابنِ آدم سخت بیمار تھا — اور اس کے علاج کے لئے دنیا کے بہترین معالج اکٹھا تھے۔

ڈاکٹر دل نے، جو دلوں کا ماہر ( ) تھا، تجویز کیا کہ ابن آدم کا دل بے حد رنجیدہ معلوم ہوتا ہے اور اس رنج کی وجہ سے اسے "دورا" ہوگیا ہے، جس کا علاج بنتِ حوا کی رفاقت کے سوا اور کچھ نہیں۔

ڈاکٹر معدہ نے، جو معدوں کا ماہر تھا، کہا کہ اسے ڈاکٹر دل کی تجویز سے اتفاق نہیں کیونکہ ابن آدم کی اصلی شکایت یہ ہے کہ وہ بھوک اور فاقہ کا شکار رہا ہے جسکی وجہ سے وہ "فاقوجیہ" میں مبتلا ہوگیا ہے — اور اس مرض کا علاج روٹی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ڈاکٹر دماغ نے، جو دماغوں کا ماہر تھا، ان دونوں تجویزوں سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: "میری رائے میں ابن آدم کو "مالیخولیا" ہوگیا ہے اور اس کا علاج صرف دماغی امراض کے ہسپتال ہی میں ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر آنکھ نے، جو آنکھوں کا ماہر تھا، کہا: "یہ سب بکواس ہے۔ ابن آدم تو "یرقان" کا مریض ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں بے پناہ زردی موجود ہے اور اس کا علاج ....."

"ڈاکٹر ناک نے، جو ناکوں کا ماہر تھا، ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا: "سب غلط۔ ابن آدم کی ناک میں ایک بال بڑھ گیا ہے جسے کاٹ کر پھینک دیا جائے تو وہ ابھی اچھا ہو جائے گا۔"

اور ڈاکٹر کان نے، جو کانوں کا ماہر تھا، کان کھڑے کرتے ہوئے کہا Nonsense آپ لوگوں کو اتنا نظر نہیں آتا کہ ابن آدم کے کان میں ایک پھوڑا ہو گیا ہے، جس کا آپریشن بہت ضروری ہے۔"

ابن آدم نے ماہرین کی رائیں سنیں تو کہا۔ "حضرات آپ سے بڑھ کر قابل اور معتمد معالج اس دنیا میں موجود نہیں۔ خدا کے لئے آپ کسی ایک نتیجہ پر پہونچ کر میرا علاج کیجئے۔"

ماہرین نے ابن آدم کی اس اپیل پر ہمدردانہ غور کیا۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ چونکہ وہ کسی ایک تشخیص پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ابن آدم کا علاج ہر ڈاکٹر باری باری کرے اور انجام کا انتظار کرے۔

چنانچہ پہلے ڈاکٹر دل نے علاج شروع کیا — لیکن ابن آدم کی حالت اس سے اور خراب ہوگئی۔

پھر ڈاکٹر دل کو ہٹا کر ڈاکٹر معدہ نے علاج شروع کیا — ابن آدم کی حالت مزید خراب ہوگئی۔

ڈاکٹر معدہ کو دھکا دیکر ڈاکٹر دماغ آگے بڑھا — مگر انجام بُرا ہی نکلا۔

غرضیکہ ڈاکٹر آنکھ۔ ڈاکٹر ناک اور ڈاکٹر کان نے بھی اپنی اپنی قسمت آزمائی لیکن ابن آدم کو نہ اچھا ہونا تھا نہ وہ اچھا ہوا۔

ماہرین نے ایک بار پھر سر جوڑ کر ابن آدم کے بارے میں سوچنا شروع کیا — اور سوچتے سوچتے وہ پہلی بار اس متفقہ فیصلہ پر پہونچے کہ "ابن آدم کو ٹی۔بی ہوگئی ہے۔"

اور ابن آدم کو ایک "ٹی۔بی سینی ٹوریم" میں داخل کر دیا گیا۔

ابن آدم اب ٹی۔بی سینی ٹوریم کے ایک بستر پر پڑا ہوا سسک رہا ہے اور اس معالج کا انتظار کر رہا ہے جو اس کے مرض کی صحیح تشخیص کر سکے — ایسا معالج — ایسا معالج کون ہو سکتا ہے؟

خطوط و نکات

کیف نوگانوی

جون ۵۵ء کا "معیار" پیش نظر ہے۔ نیا ٹائیٹل سادہ ور دلکش ہے۔ بلند مینار دریچہ کے نام کے ساتھ کچھ معنوی ربط بھی رکھتا ہے۔

نقش اول کے متعلق میری رائے آج بھی وہی ہے جس کا اظہار ایک عرصہ ہوا میں نے ایک نجی خط میں آپ سے کیا تھا۔ عبارت کا الجھاؤ اور ابہام آج بھی مقصد کی راہ میں حائل ہے گو علمی معیار اس دوران میں کافی بلند ہوا ہے۔

حصۂ نظم میں سہیل زیدی کی "شہنشاہ" اس دور کے انسان کی "ہوس خداوندی" پر ایک کامیاب طنز کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی نظم "ترقی پسند شاعر" اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے خوب ہے۔ خاص طور سے نظم کے یہ آخری اشعار جن میں شعر کی تعریف کی گئی ہے بہت لطیف اور دل کش ہیں۔

شعر کیا ہے حُسن کی ہر ایک شے میں جستجو
اِک نگارِ حُسن سے پردے کے پیچھے گفتگو
اک اُمیدِ صبحِ نورانی اندھیری رات میں
مہرِ تابندہ کا جلوہ سینۂ ذرات میں
آرزوئے بحر کا قطرہ کے دل میں ارتعاش
اک ہم آہنگی کی فطرت کے مظاہر میں تلاش
پردۂ ہر لفظ میں پوشیدہ معنی کا شعور
بے نیازِ جام و ساغر ایک روحانی سرور
یہ لطافت مادہ کا بار اُٹھا سکتی نہیں
شعر کی عصمت ہوس کی تاب لا سکتی نہیں

تنویر علوی کی "ہارسنگھار" بھی کافی حسین ہے اور محمود عالم کی "جھلکیاں" بھی کچھ بُری نہیں۔

"چیخنے سے فائدہ —؟" کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی نے انگریزی نظم کا جو ترجمہ پیش کیا ہے گو وہ افادیت سے خالی نہیں لیکن اگر اس کا منظوم اور پابند ترجمہ کیا جاتا تو اسکی اثر انگیزی میں کئی گُنا اضافہ ہو سکتا تھا۔

افسانوں میں نجمی بی۔ اے کا انگریزی سے ترجمہ "نیل کا گودام" اس شمارہ کی جان ہے۔ یہ افسانہ عین مقصدی ہوتے ہوئے بھی فن کے معیار پر پورا اُترتا ہے اور تصنع سے یکسر پاک ہے۔ ترجمہ بھی معیاری ہے پورا افسانہ پڑھ جائیے کہیں "ترجمہ پن" کا احساس نہیں ہوتا بالکل Original معلوم ہوتا ہے، افسانہ کے آخر میں ثابت جیسے اَن پڑھ دیہاتی کی زبان سے یہ جملے "نہیں۔ کچھ لے نہیں گئے۔ وہ بڑے لوگ تھے اور بڑے آدمی غریبوں کی چیزیں بغیر کسی وکیل کی مدد کے نہیں لیتے۔" بہت کھٹکتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک کامیاب ترجمہ م۔ نسیم کے قلم سے "چاندی کے شمعدان" کے زیر عنوان "نئی نسلیں" کی کسی گذشتہ اشاعت میں نظر سے گذرا تھا۔ دیگر زبانوں بالخصوص انگریزی نظم و نثر میں ہمیں ایسی تخلیقات خاصی تعداد میں مل سکتی ہیں جو بڑی حد تک تعمیری نقطۂ نظر کی حامل بھی جا سکیں۔ تھوڑی توجہ اور محنت شرط ہے۔

"مسافر" کے عنوان سے John Bunyan کی Pilgrims Progress کا اسلامی نقطۂ نظر سے ترجمہ بہت طویل۔ بوجھل اور غیر دلچسپ ہے۔ جگہ جگہ خشک مقالے کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے اور واعظانہ رنگ جھلکتا ہے۔

حصۂ غزل میں حفیظ میرٹھی اور انور صدیقی کی غزلیں خاصی جاندار ہیں۔ اور مقصد و فن کا اچھا امتزاج پیش کرتی ہیں حفیظ

کی غزل کے یہ تین اشعار بہت پسند آئے :-

عجب کیا ہے اسی ہمت شکن طوفاں کے پہلو سے
کوئی ایسی بھی موج اُٹھے کہ بیڑا پار ہو جائے
جفا کاروں کے اس طرزِ جفا کی داد دیتا ہوں
ستم ڈھانے لگے کوئی، کوئی غم خوار ہو جائے
مغنی تیرے نغموں نے تو انساں کو سُلایا ہے
مری چیخوں سے شاید آدمی بیدار ہو جائے

ایشیائی ممالک کی آزادی بالخصوص سُرخ چین کی ولادت پر لکھی گئی نظموں کے مجموعے "شکستِ زنداں" کا ظفر عالمگیر نے فنی حیثیت سے کامیاب پوسٹ مارٹم کیا ہے، لکھنے والے چوٹی کے ترقی پسند شعراء ہیں۔ خصوصاً جوشؔ ملیح آبادی کی نظم "استقلالِ میکدہ کے ۴۶ اشعار میں سے بقول ظفر عالمگیر ۲۱ یا ۲۲ اشعار ایسے ہیں جن کا سقم پہلی نظر میں محسوس ہو جاتا ہے۔ اور ایک شعر کی تو بحر ہی بدل گئی ہے۔ اس تنقید کے پڑھنے سے زبان و فن کی حد تک ترقی پسندوں کی قلعی اچھی طرح کھل جاتی ہے۔ بہتر ہوتا اگر نظموں کے ظاہر سے پہلے ان کے باطن پر ٹھوس نظریاتی تنقید کر کے ان کا کھوکھلا پن واضح کر دیا جاتا۔

"ادب کے ملفوظات" میں مضطرب خالدی نے تعمیر پسند ادیبوں کو چند گراں قدر مشورے دئے ہیں۔ یہ مقالہ تعمیر پسند فن کاروں کی سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس شمارہ کا معیار حوصلہ افزا ہے۔

شبنم سبحانی!

"معیار" کا جون کا شمارہ ملا۔ آپکے "نقشِ اول" بالخصوص اس شمارے کا تو بالکل جیسا نظر آرہا ہے۔ براہ کرم اتنے دقیق موضوعات کی آماجگاہ اپنے اداریئے کو نہ بنائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اسکے علاوہ بہتر ہوگا کہ اسلامی شعر و ادب کے بہت سے اُلجھے ہوئے اور اختلافی مسائل کو سلجھانے اور حل کرنے میں یہ اہم صفحات صرف کریں۔ یا ادب کی جدید ادبی تحریکوں اور قدیم اہم ادبی رجحانات سے قارئین کو واقف کرائیں۔ علم و فن کے اقسام کو لے کر جس بال کی کھال آپ نکال رہے ہیں وہ میں نے اکثر لوگوں کو ناپسند کرتے ہوئے دیکھا ہے

پھر بھی ان مباحث کی افادیت کا کسی مقدار میں مجھے بھی اعتراف ہے۔

خطوط و نکات کا جو سلسلہ آپنے قائم کیا ہے اسکے لئے میں ہدیۂ تحسین و آفریں پیش کرتا ہوں۔ مگر ایسی خطوط جنہیں بے بنیاد تنقیدیں اور غیر مدلل باتیں ہوا کریں۔ براہ کرم نہ شائع فرمایا کریں اس شمارے میں منظر اعظمی صاحب نے جس کربہ اور بھونڈے انداز میں میرے مقالے پر خامہ فرسائی کی ہے۔ وہ بہت ہی اضطراب انگیز ہے۔ کسی کو نوخیز ادیب اور نومشق شاعر کہنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر ہمارے ناقدین کا قلم اسی طرح بے بنیاد اور غیر نفسیاتی باتوں کو اُچھالے گا تو وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

منظر حسین

ایک چیز مجھے "معیار" کی ناپسند ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات اس میں ایسے ترجمے شائع ہو جاتے ہیں جن کے مصنفوں کے نام "غائب" ہوتے ہیں اور مترجموں کے نام "نمایاں"۔ یہ مصنفوں کے ساتھ انصاف نہیں اور نہ ہی قاری کے ساتھ۔ "معیار" کی فہرست مضامین دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ کسی صاحب کا "اوریجنل افسانہ" یا مضمون شریک اشاعت ہے لیکن آخر میں پتہ چلتا ہے (بلکہ کبھی کبھی تو پہلا جملہ پڑھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے) کہ ترجمہ ہے۔ بہر صورت حال مناسب نہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ مصنف کو تصنیف کا "کریڈٹ" دیا جائے اور مترجم کو ترجمہ کا۔ دونوں کام اپنی جگہ اہم ہیں۔ اور دونوں کی قدر اسی میں ہے کہ ان کے کرنے والوں کا نام نمایاں طور پر شائع کیا جائے۔ محض "کتابوں" یا "رسالوں" کا حوالہ ناکافی ہے۔

اسی ترجمے کے سلسلے میں یہ بات بھی کہدینا چاہتا ہوں کہ ہر ترجمہ اس قابل نہیں ہوتا کہ چھپ سکے۔ مثال کے طور پر ابن فرید صاحب کا ترجمہ (جو مئی کے شمارے میں چھپا تھا) Hopeless تھا اور "مسافر" کے نام سے جو شائع ہو رہا ہے وہ بھی بس یوں ہی سا ہے — میرا خیال ہے کہ آپکو چھاپنے کے لئے مواد نہیں مل رہا ہے تب ہی آپ کانٹوں سے نباہ کئے جارہے ہیں۔ اگر یہی حال ہے تو پھر آپ مواد حاصل کرنے کیلئے کوشش کیجئے۔ عاصی ضیائی نجات اللہ صدیقی وغیرہ کہاں ہیں۔ ہاں عرشی بھوپالی کدھر ہیں۔

بیان اللسان

مکمل عربی، اردو ڈکشنری

تیس ہزار قدیم وجدید عربی لغات کا جامع و مستند ذخیرہ ــــ تالیف :- مولنا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
یہ لغت اب اہلِ علم اور اربابِ ذوق کے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں - اسکی بینظیر خصوصیات نے اسے مقبولِ خاص وعام کردیا ہے - علماء، طلباء، اور عام شائقین عربی سب ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں - صرف یہ ایک لغت دوسری ضخیم لغات سے مستغنی کر دیتی ہے -

صفحات نوسو، کاغذ چکنا، ٹائیٹل رنگین بلاک کا ــــــ قیمت - آٹھ روپے مجلد چرمی دس روپے

قاموس القرآن

قرآن حکیم کے الفاظ ومعانی کی مستند و محققانہ توضیح یعنی ــ قرآنی ڈکشنری

مرتبہ :- قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

صفحات ۸۰۰ ــــــ ٹائیٹل رنگین بلاک

قیمت ــــ غیر مجلد ــــ سات روپے ــــ مجلد ــــ آٹھ روپے

کلام عربی حصہ اول مصنفہ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی - قیمت ایک روپیہ

کلام عربی حصہ دوم " " " ایک روپیہ چار آنے

مکتبہ علم وادب - شاہ پیر گیٹ میرٹھ

علمی، تحقیقی ——— اور ——— ادبی کتابیں

بیان اللسان	(عربی اُردو ڈکشنری)	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	قیمت فی جلد دس روپے
تدبر قرآن		مولانا امین احسن اصلاحی	ڈھائی روپے
خطبات		مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	سوا دو روپے
پردہ		مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	تین روپے
حقیقت نفاق		مولانا صدر الدین اصلاحی	ایک روپیہ آٹھ آنے
اساس دین کی تعمیر		مولانا صدر الدین اصلاحی	دو روپے آٹھ آنے
مسلمانان ہند کا لائحہ عمل		مولانا ابو اللیث اصلاحی	تین روپے
کلام عربی	(حصہ اول)	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	ایک روپیہ
کلام عربی	(حصہ دوم)	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی	ایک روپیہ چار آنے
تجدید تصوف و سلوک		مولانا عبد الباری	پانچ روپے
حقوق الزوجین		مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	ایک روپیہ آٹھ آنے
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں		سید اصغر علی عابدی	تین روپے
اشتراکیت اور اسلام		مظہر الدین صدیقی	چار روپے آٹھ آنے
سود		مولانا ابو الاعلیٰ مودودی	دو روپیہ بارہ آنے
گلگونہ		محمد تسکین قریشی	دو روپیہ آٹھ آنے
اُبھرتی کرنیں	(افسانے)	مرتبہ نجم الاسلام	دو روپیہ آٹھ آنے
عالمی امن	(نظمیں)	مرتبہ۔ ادارۂ معیار	آٹھ آنے
شوہر کا روگ	(ناول)	نسیم انہونوی	ایک روپیہ چار آنے
شگفتہ	(ناول)	نسیم انہونوی	تین روپے
کوثر و تسنیم	(مجموعہ کلام)	الم مظفر نگری	چار روپے
صحیفۂ ندرت	(مجموعہ کلام)	ندرت میرٹھی	چار روپے آٹھ آنے
لوح و قلم	(مجموعہ کلام)	ندرت میرٹھی	پانچ روپے
مکمل فائل معیار ۱۹۵۲ء	(مجلد)		تین روپے آٹھ آنے
مکمل فائل معیار ۱۹۵۳ء	(مجلد)		تین روپے آٹھ آنے

ان کتابوں کے علاوہ دیگر علمی و ادبی کتابیں اور دینی کتب۔ قرآن شریف اور سیپارے وغیرہ بھی مل سکتے ہیں۔

مکتبہ علم و ادب۔ شاہ پیر گیٹ میرٹھ

[illegible] ۔ مقام اشاعت۔ خندق [illegible] میرٹھ

IYAR MONTHLY Meerut U.P. Regd. No. A. 441



نوٹ۔ نونہال ... فروری ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوگا صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

Only Title Page Printed at Pilot Press Churiwalan, Delhi


معیار
The Meyar Monthly
FIROZ

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہ نامہ

معیار

جلد — ۵
شمارہ — ۸

ستمبر ۱۹۵۵ء

ترتیب دینے والے

نجم الاسلام
بدر فاروقی۔ ایم، اے

دفتر ماہنامہ معیار خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

ترتیب

نظمیں

مقالہ

غزلیں

افسانے

متفرقات

خطوط و نکات

خیال اپنا اپنا

نقشِ اوّل

اردو ادب میں ڈراموں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے یا کم نسبت سے اگر تعمیری ادب کے دامن میں بھی ڈرامے کم ہوں تو ہمارے لئے کچھ بہت تشویش کی بات نہیں۔ لیکن کم کیا ابھی ڈرامے بہت ہی کم ہیں اور کوئی ایسا تیز رفتار اہلِ قلم بھی نظر نہیں آتا جو اس کمی کو تیزی سے پُورا کر سکے۔ یہ چیز تشویش کی ہے۔

ڈرامے ہمارے یہاں کیوں کم ہیں؟ اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ ابھی اچھے قسم کے ڈرامہ نگار ہمارے یہاں نہیں لیکن آخر ادبی تحریک کے آغاز میں اور دوسری اصناف کے لکھنے والے بھی تو خال خال نظر آتے تھے ایک مدت کے بعد ان کی تعداد میں ترقی ہو گئی اور اچھی خاصی تخلیقات پیش ہوئیں۔ بہت سے لوگوں کی چھپی ہوئی صلاحیت ابھر آئی۔ انھوں نے اپنی محنت سے کافی ترقی کر لی ——

یہی صورت ڈرامے کی صنف میں بھی رونما ہونی چاہئے تھی ایسا تو ہے نہیں کہ ہم لوگوں میں ڈرامے لکھنے کی صلاحیت ہی معدوم ہو صلاحیت ہے مگر اسے بروئے کار لانے کی کوشش نہیں ہوئی۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ڈرامہ نگار ہمارے یہاں سے کیوں نہیں؟

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اب سے دو برس پہلے ایک صاحب نے ذاتی طور پر راقم کو اس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ جسے اب تک پورا نہیں کیا جا سکا ہے جبکہ ان دو برس میں بھی ڈرامہ کی ترقی کی رفتار ہمارے یہاں وہی ہے جو تھی تو ظاہر ہے تشویش بڑھنی چاہئے۔

ڈرامہ نگاری کی ترقی پر غور کرتے ہی جو اہم سوال سامنے آتا ہے وہ اسٹیج کا ہے۔ کیا ڈرامہ اسٹیج کے بغیر ترقی کر سکتا ہے؟ کیا ہم اسٹیج کو اپنا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو اس کمی کو پورا کرنے کی ترکیب کیا ہو سکتی ہے؟

ان موضوعات پر اظہارِ خیال کی عام دعوت دیتے ہوئے میں یہاں مجملاً چند باتیں کہنی چاہتا ہوں۔

۱ —— ڈرامہ اور اسٹیج:- ڈرامے کی تاریخ بتاتی ہے کہ شروع سے اسٹیج اور اس کی وسعتِ عمل ڈرامہ کی صورت گری پر اثر انداز رہی ہے۔ مارلو اور شیکسپیر کے زمانے کا اسٹیج غیر ترقی یافتہ تھا۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن پر قابو پانا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ اس لئے اسٹیج کے اس کمزور پہلو پر قابو پانے کے لئے مارلو اور شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں کشاکش اور عمل کی غیر حقیقی صورتوں سے پیدا ہونے والی فنی کمزوری کی تلافی کا راستہ یہ نکالا کہ سامعین کو دوسری طرف متوجہ کرنے کے لئے دیگر فنی عناصر کا اضافہ کیا۔ یعنی ضرورت کے مطابق کچھ چھوڑا کچھ اپنایا۔

اب اس کے بعد دوسرے لوگ آئے۔ بن جانسن نے اسٹیج کی بہت سی غیر حقیقی چیزوں کو ترک کر دیا مگر اس کے ساتھ ہی ایک ایسے عنصر کو ڈرامے میں جگہ دی جس نے جمالی ہیجانی چیزوں اور ان کی پیدا کرنے والی کشاکش جسمانی کے بجائے ان کی طرف سامعین کی توجہ مبذول ہی نہ ہونے دی۔ یہاں بھی وہی اصول رہا کہ کچھ چھوڑا اور کچھ اپنایا۔

جذباتی اور طرب انگیز ڈراموں کے لکھنے والوں نے البتہ اسٹیج کی مانگ کو اوّلین اہمیت دی لیکن پھر آپ وقت کو دیکھئے کہ اس کے بعد عالم ہی بدل گیا۔ شا کے ڈرامے کتابی صورت میں زیادہ چلے۔ شا نے اپنے سامنے ذہنی کشاکش کو رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جانے سے پہلے دماغ میں اسٹیج کرنے کی ضرورت ہوئی۔ پڑھنے والا اپنے ذہن میں ان چیزوں کو تشکیل دے سکتا ہے۔ یہ شا کا مقصد تھا۔

اس تاریخی جائزہ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ڈرامہ اور اسٹیج کے تعلق کا معاملہ تغیر پذیر رہا ہے۔ یہ تعلق قدیم ہے۔ [illegible]

اس کو بجائے تام رکھکر بھی کامیابی حاصل کرلی۔

۲ ــــــــ **ڈرامے کی دو قسمیں:**۔ اس طرح ہمارے سامنے شا کے بعد ڈرامے کی دو قسمیں آئیں ایک وہ جس میں اصلی کشاکش جسمانی اور جذباتی ہو دوسری وہ جس میں کشاکش ذہنی ہو اور دلائل کے ہتھیاروں سے خیالات کی جنگ جیتی جائے۔ جسمانی اور جذباتی کشاکش والے ڈراموں کے لئے اسٹیج موزوں تھا۔ آج بھی اس کی جگہ فلم نے لے لی ہے۔ اور ذہنی کشاکش والے ڈراموں کے لئے کتابی صورت موزوں ہے۔ ہمارے سامنے چونکہ خیالات کی جنگ ہے اور ہم اسلامی افکار کو غالب کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس لئے ہمیں ایسے ڈراموں کی ضرورت ہے جو دلائل کے ہتھیاروں سے لیس ہوں اور ذہنی کشاکش سے بھرپور ہوں۔ اور ان کے لئے کتابی صورت ہی موزوں ہے۔ اسٹیج ضروری نہیں۔ کیونکہ ایسے ڈراموں کا لکھنے والا اور پڑھنے والا مناسب ہدایات کے بعد جو ڈرامے میں موجود ہونی چاہئیں ڈرامے کی تفصیلات اپنے ذہن میں مستحضر کر سکتا ہے۔

پس یہ خیال کہ اسٹیج کے بغیر ڈرامے کی ترقی ممکن نہیں ہمارے نئے فن کاروں کو اپنے دل سے دور کر دینا چاہئے اور ڈرامے کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ کیا عجب کہ ہم میں سے کوئی صاحب صلاحیت ترقی کر کے مدتوں زندہ رہنے والی تخلیقات پیش کر سکے اور تعمیری ادب کو ڈرامے سے مالا مال کر کے انسانیت کی خدمت کر سکے۔

۳ ــــــ **ڈرامائی عنصر**۔ ڈرامائی عنصر کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے تغزل کی۔ تغزل کا کیف ہر غزل میں نہیں ملتا۔ اور کبھی کبھی ملتا ہے تو بعض نظموں تک میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈرامائی عنصر کی بات ہے۔ یہ عنصر ڈرامے ہی کے ساتھ محدود نہیں ہماری زندگی کا گوشہ گوشہ ڈرامائی عنصر سے بھرا پڑا ہے۔ ہر وہ عمل جو حیرت افروز ہو جو اچانک ہو۔ غیر متوقع ہو اپنے اندر ڈرامائی عنصر رکھتا ہے۔ اور یہ بات کہ وہ اعمال جو ہماری زندگی میں غیر متوقع اور حیرت افروز ہوتے ہیں اکثر کتاب حیات میں نئے ابواب کا عنوان بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اس لئے ہمیں ڈرامائی عنصر کو، نئے ادب اور زندگی کی عکاسی میں پوری پوری اہمیت دینی چاہئے۔

افسوس کہ ڈرامہ تو ڈرامہ، ابھی ہمارے افسانوں میں بھی ڈرامائی عنصر کی اچھی مثالیں نہیں ملتیں۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے لکھنے والے ڈرامائی عنصر کو مناسب اہمیت نہیں دیتے۔

۴ ــــــــ **اسٹیج کا معاملہ**:۔ اسٹیج کی کامیابی اداکاری پر منحصر ہے۔ اور اداکاری کسب کمال کی بنا پر۔ گویا اس کے لئے ایک طبقہ کا وجود ضروری ہوا۔ اسی لئے ہمارے بعض ارباب فکر کا خیال ہے کہ چونکہ یہ طبقہ اپنی فطرت کو مسخ کر لیتا ہے۔ اس لئے ایک طرف تو خود اس کے لئے نقصان کی بات ہے دوسرے چونکہ معاملہ تجارت کا ہوتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ ہر قسم کی چیز پیش نہیں کی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو دیکھنے اور سننے والوں کے لئے انتہائی مضر ہوتی ہیں۔ پھر مسئلہ تصویر بھی اہم ہے اگرچہ تھیٹر سے اس کا تعلق نہیں لیکن بہر کیف آج کل تھیٹر کی جگہ فلم نے لے لی ہے۔ اس لئے ڈرامہ کے ساتھ فلم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور تصویر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ابوالمجاہد زاہد

رات

رات، برکھا رت کی پُرہول اور وحشت ناک رات
ہرطرف بوجھل اندھیرے کا فسوں چھایا ہوا
لُٹ گیا جیسے عروس ماہ و پرویں کا سہاگ
آسماں ہے ابر کی چادر میں یوں لپٹا ہوا
ہیں پپیہے کے ترانے اور نہ کویل کی صدا
غرق ہے جیسے تفکر کے سمندر میں فضا
میز پر لیٹی گھڑی کے دل کی دھڑکن کے سوا
ایک سناٹا سا میرے گھر پہ ہے چھایا ہوا
جانے کب سے کروٹوں پر کروٹیں لیتا ہوں میں
کوئی مونس ہے نہ ہمدم ہے نہ کوئی راز داں
منتظر آنکھوں کی خلوت میں کھٹکتی ہی نہیں
نیند کے جادوئی ہاتھوں کی طلسمی چوڑیاں

ایسی ظلمت میں مجھے رہ رہ کے آتا ہے خیال
ہے گرفتار مصائب نسل آدم کس لئے
کس لئے آنسو رواں ہیں دیدۂ اخلاق سے
زندگی بنتی ہی جاتی ہے جہنم کس لئے
یہ نئی تہذیب کا رنگ جمال دل فریب
آدمی پیچی مسرت کا مگر بھوکا ہے کیوں
عقل کے یہ معجزے سائنس کا یہ ارتقاء
امن عالم پھر بھی اِک شاعر کی مجذوبہ ہے کیوں
دانش و ادراکِ حاضر کو یہ آخر کیا ہوا؟
کس لئے اس کو نظر آتی نہیں راہِ نجات
آتشِ الحاد سے ہے گل فشانی کی امید
تیرگی سے مانگی جاتی ہے اجالے کی زکات

ہو کے احکام خدا کی روشنی سے بے نیاز
نوعِ انساں اپنی منزل پا بھی سکتی ہے بھلا؟
لیٹے لیٹے میں یوں ہی سوچا کیا سوچا کیا
رات کا رنگ اور گہرا اور گہرا ہو گیا

امیدؔ ڈبائیوی

زہراب

رُخصت اے میرے علی گڑھ اے مرے شہرِ نگار
اے مرے خوابوں کی تعبیر، محبت کے دیار
رُخصت اے میری تمناؤں کی رنگین بہار
چھوڑ کر میں تجھے با دیدۂ تر جاتا ہوں
مجھ کو جانا نہیں منظور مگر جاتا ہوں

رُخصت اے مرکزِ تہذیبِ دو عالم رُخصت
رُخصت اے علم کی تنویرِ مجسّم رُخصت
رُخصت اے وجہِ سکونِ دلِ پُرغم رُخصت
مُنہ کو آتا ہے کلیجہ کہ یہ کیا ہوتا ہے
پھول خود اپنے گلستاں سے جُدا ہوتا ہے

بہتر از صبحِ بنارس تری پاکیزہ سحر
تیری ہر شام بھی ہے شامِ اودھ سے بڑھ کر
اہلِ بینش کیلئے تیری فضا خُلدِ نظر
دوست تو دوست، ترے فیض کے دشمن قائل
تیرے در سے کبھی مایوس نہ پلٹا سائل

فلسفہ، شعر و سخن، نقد و نظر، علمِ بیاں
پیرڈائز[1] کا وہ ماحول وہ میرس[2] کا سماں
جس پہ ہر لحظہ ہوا کرتا تھا جنّت کا گماں
اب وہ سب کچھ مگر اک خواب ہوا جاتا ہے
جامِ مے ساغرِ زہراب ہوا جاتا ہے

[1] پیراڈائز ریسٹورنٹ
[2] میرس روڈ

میں کہ جانے پہ ہوں مجبور چلا جاؤں گا
لیکن اس دل کو بھلا کس طرح بہلاؤں گا
اب یہ ہمدردی یہ اخلاص کہاں پاؤں گا

اے مری تیرگیٔ زیست کی تابندہ سحر
تجھ سے چھٹ کر مجھے تسکین ملے گی کیونکر

دل کو تڑپائے گا ہر وقت ترے ہجر کا غم
تری سڑکوں، ترے کیفوں ترے کالج کی قسم
یاد آئیں گی مجھے تیری بہاریں پیہم

چین پاؤں گا نہیں تیری قسم آج کے بعد
ہر غزل ہوگی مری قصۂ غم آج کے بعد

تیری ہر یاد مری زیست کا سرمایہ ہے
تیرے کالج میں مرے دل نے سکوں پایا ہے
میں نے دل اپنا تری راہوں میں بہلایا ہے

یہ حقیقت مگر افسانہ ہوئی جاتی ہے
شمع سے رخصتِ پروانہ ہوئی جاتی ہے

یہ زمانہ کے خیالات الٰہی توبہ
زہر آلودہ عنایات الٰہی توبہ
میری مجبوریٔ حالات الٰہی توبہ

کیا قیامت ہے جدا جسم سے جاں ہوتی ہے
بوئے گل آج پریشانِ خزاں ہوتی ہے

؎ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اُف یہ لیڈر کہ سیاست کا بچھاتے ہیں جو دام
جن کے ہونٹوں پہ ہیں نفرت کے عداوت کے پیام
اُف یہ شہرت کے پرستار یہ دولت کے غلام
جُرم کرتے ہیں مگر جُرم کا احساس نہیں
عصمتِ مریم و سیتا کا انھیں پاس نہیں

تجھ میں اِن لوگوں نے بھڑکائی فسادات کی آگ
اُف یہ بہکے ہوئے بھٹکے ہوئے جذبات کی آگ
ہائے یہ شیخ و برہمن کے خیالات کی آگ
گلشنِ زیست کی ہر شاخ جلی جاتی ہے
ہر طرف آتشِ نمرود نظر آتی ہے

اب یہی آتشِ نمرود بجھانے کے لئے
نفرت و جنگ کو دُنیا سے مٹانے کے لئے
درس تیرا ہے مرے پاس زمانے کے لئے
بس اِسی درس کو اب عام بنانا ہے مجھے
امن کا سویا ہوا ذوق جگانا ہے مجھے

مُجھ کو مت روک کہ تیرے لئے جانا ہے مجھے
تُجھ سے جو سیکھا ہے دُنیا کو سکھانا ہے مجھے
اپنا غم کیا غمِ دوراں کو مٹانا ہے مجھے
ہاں میں پہنچاؤں گا دُنیا کو محبت کا پیام
اچھا رخصت اے مرے گلشنِ اُمید سلام

شمیم احمد زیدی

بے عمل

دن چڑھے خورشید کی طرار و رنگیں اک کرن
پرسشِ احوال کو روزن سے ہو کر آ گئی
نیند سے بوجھل پپوٹے احتراماً اٹھ گئے
رات کے خوابوں کی زنگار رنگ عمارت ڈھا گئی

لب پہ پھیکی سی سہی آخر ہنسی آئی تو کیوں
ذہن میں اس وقت کوئی بھی تو افسانہ نہیں
تلخیٔ ایام کو گذرے ہوئے آلام کو
زندگی بھر یاد رکھوں مجھ میں دیوانہ نہیں

روز کے معمول پر اٹھنے لگے خود ہی قدم
مل کے سگریٹ کے دھوئیں سے اڑ گیا شب کا خمار
دوستوں کی محفلیں، ہوٹل کے بل، موسم کی بات
بس کے اسٹینڈ پہ ٹھٹکی ہوئی لمبی قطار

صبح سے تا شام فکرِ رزق، ذکرِ مہ وشاں
عقل سی انمول شے اور فائلوں کا اژدہام
سنگِ درِ حاکم کا اب کعبہ بھی بت خانہ بھی ہے
چھوڑ دوں اس در کو لیکن ہے خیالِ ننگ و نام

موسموں کی دوڑ، برق و آشیاں کی کشمکش
یہ طلسمِ رنگ و بو، یہ گردشِ شام و سحر
یہ سبک ٹھنڈی ہوائیں، کوہ، وادی، آبشار
سوچتا میں بھی ہوں بالاتر ہے اک ہستی مگر

فلسفی مشغول ہیں مشاطگی میں رات دن
زلفِ گیتی اک نہ اک دن تو سنور ہی جائے گی
کیوں غمِ جاناں، غمِ دوراں کی الجھن میں پڑے دل
زندگی جیسے گذرتی ہے گذر ہی جائے گی

شام کیفے کی فضا میں تلملا کر رہ گئی
دن کے ہنگاموں سے چونکا ذہن اور پھر سو گیا
پھر وہی بے جان بستر، پھر وہی سنسان دل
زندگی کا اور اک دن وسوسوں میں کھو گیا

آصف عارفی

راہبہ

دوشیزۂ معصوم! گناہوں سے بہت دُور
آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی سرمستیٔ مجبور

پاکیزگیٔ دامنِ مریم کی امانت
آئینۂ تقدیس جمالِ رُخِ پُر نُور

انجیل کی آیاتِ مقدس کی طرح پاک
خاموش نگاہوں میں لئے ساعقۂ طور

افکار کی عظمت ترے کردار سے ظاہر
کردار پہ صدقے ترے پاکیزگیٔ حُور

اپنوں سے کہیں بڑھ کے ہے بیگانوں کی ہمدرد
دل خدمتِ بے لوث کے جذبات سے معمُور

دُکھ درد کے ماروں کے لئے صبر کی تلقین
زخمِ دلِ سوزاں کے لئے مرہم کافُور

مقصد ہے تری زیست کا مرگِ غمِ عالم
آلام کی دُنیا میں دوائے دلِ رنجور

فطرت کے تقاضوں کا مگر پاس نہیں ہے
مقصودِ بقا کا تجھے احساس نہیں ہے

برقی کاکوروی

تصویر خرد

آج انسانوں کی حالت ہے بہت زار و نزار
دے دیا شاید خرد نے سب ہوس کو اختیار

آج دنیا بھر میں حیوانوں کا جیسے راج ہے
کھو چکا ہے اشرف المخلوق سب اپنا وقار

آج عیاروں کے ہاتھوں میں زمام کار ہے
آج ذہنی پستیاں ہیں چار سو با اختیار

دِل کے ہر گوشہ میں اب تو پرورش کینوں کی ہے
انبساطِ روح کا پہلے تھا دل آئینہ دار

توڑ ڈالے دولت و ثروت نے رشتے خون کے
بھائی سے بھائی خفا ہے اُٹھ گیا ہے اعتبار

اپنے ہی لختِ جگر اب آستیں کے سانپ ہیں
غیر کیوں پُرساں ہوں جب اپنے نہیں ہیں غمگسار

ہر روش اُجڑی ہوئی اور ہر شجر ناشاد ہے
گلستانِ زیست پر طاری ہے دورِ انتشار

اڑ گیا پھولوں سے جیسے زندگی کا رنگ رُوپ
اِک دھواں سا بنکے اڑتی ہے شمیم عطر بار

دسترس جس کو ملی تھی کائناتِ علم پر
جہل کے سایہ میں سویا ہے وہ مرد ہوشیار

پردۂ ظلمت میں مخفی ہوگیا رازِ حیات
زندگانی ہوگئی بربادیوں سے ہمکنار

عقل کی گمراہیوں میں نورِ عرفاں کھو گیا
مادیت کی تہوں میں ذہن انساں سو گیا

احقر مبتلا گرکاشی پوری

جگر پارے

(۱)

پھر آج عشق فسردہ ہے ولولے خاموش
کوئی طلب نہ تمنا، کوئی خیال نہ خواب
جگر کے خوں سے جلایا تھا جن چراغوں کو
نہ ہے نصیب کہ وہ بھی نہ ہو سکے شب تاب

(۲)

کثرتِ غم میں جھپک جاتی ہیں آنکھیں تو ندیم
عہدِ ماضی کے چمن زار نظر آتے ہیں
آج بھی تیرے تصور کا سہارا ہے کہ
کتنے غم بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں

(۳)

تصور میں روئے صنم دیکھتے ہیں
کبھی زلف کے پیچ و خم دیکھتے ہیں
ابھی کتنے فن کار صنفِ ادب کے
حقیقی مسائل کو کم دیکھتے ہیں

(۴)

اپنے ہمراہ لئے جذبۂ تعمیرِ جہاں
قافلے امن کی راہوں سے گزر جائیں گے
اور یہ جنگ و تباہی کے شیاطین کہن
وقت کے نعرۂ بیباک سے مر جائیں گے

نجم الاسلام

تخلیقی تفکر

اسلامی دور کے مفکروں میں دو نام ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے تخلیقی تفکر کے موضوع پر اپنی تصانیف میں اظہارِ خیال کیا ہے ، اور بتایا ہے کہ غور و فکر کی قوت کیسے نشو و نما پا سکتی ہے ۔ کس طرح تفکر کیا جاتا ہے ۔ ان کے سامنے اس کی افادیت پوری طرح تھی کہ علم کے طالب علموں کو غور و فکر کی قوت سے کام لینے کے لئے ان مطالبوں کو سمجھنا ضروری ہے جو یہ قوت ذہنی افعال سے کرتی ہے ۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ ذہن کس طرح سوچتا ہے تو ہم زیادہ بہتر طور سے سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں ۔

یہ دو مفکر امام غزالی اور ابنِ خلدون ہیں ۔ امام غزالی نے اپنے افکار و خیالات کی ترتیب میں قربِ الٰہی کو اپنا مقصد بنایا ہے ۔ چنانچہ وہ تفکر کو عرفانِ الٰہی کے حصول کا سب سے بہتر ذریعہ سمجھ کر اپنے نتائجِ فکری کا اظہار کرتے ہیں ۔ ابنِ خلدون نے تعلیمی نفسیات پر گفتگو کرتے ہوئے تفکر کو حقائق و معارف اور علوم و فنون کے خزانے کا دروازہ کہا ہے ۔ اور طالب علموں کے لئے قوتِ غور و فکر کے کچھ مستقل اصولوں پر زور دیا ہے ۔

ان دونوں بزرگوں کے افکار کو سمجھنے کے لئے بعض اقتباسات مفید ہو سکتے ہیں ۔

اقتباسات

ابنِ خلدون طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔
" فکرِ انسانی بھی خدا کی مصنوعات میں سے ایک خاص مصنوع و مخلوق ہے ۔ باری تعالیٰ نے اس کو بعینہٖ اسی طرح سے پیدا کیا ہے جس طرح دیگر مخلوقات کو ۔ یہ فکر اس وقت ظہور میں آتی ہے جبکہ نفس کی حرکت دماغ کے درمیانی حصہ میں ہوتی ہے ۔ جب فکرِ انسانی کی حرکت عدم سے وجود میں آتی ہے تو افعالِ انسانی کی ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ صادر ہونے کا مبداء بنتی ہے اور کبھی کبھی ایسے علم کے حصول کا مبداء و ذریعہ بنتی ہے جس سے انسان ناواقف تھا ۔ اس وقت انسان مطلوب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس علمِ مطلوب کے فوائد اور نقصانات دونوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے حاصل کرنے یا ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے ۔ اثنائے غور و خوض میں اس پر وہ طریقہ چشم زدن میں منکشف ہوتا ہے جو اس علمِ مطلوب کے دونوں شعبوں میں اتحاد پیدا کر دیتا ہے اگر وہ علم واحد ہے یعنی دوسرے علوم و فنون کے مسائل اس میں مخلوط نہیں ہیں اور اگر دوسرے علم کے مسائل بھی اس میں مل جلے ہیں تو وہ انکشاف کے بعد اس کے دوسرے مبادی کی تحصیل شروع کرتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور یہ اس فکرِ انسانی کا کرشمہ ہے جو دیگر حیوانات سے انسان کو ممتاز کرتی ہے ۔ "

اس کے بعد ابنِ خلدون نے فکری عمل کے انفعالی اور تربیتی پہلو پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے ۔

" فنِ منطق بھی اس طبیعت فکری و نظری کے فعل کی ایک کیفیت ہے اور اس کا فن سے بہرہ مند ہونا اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ غلط اور صواب میں امتیاز کر سکے ۔ گو اصل فطرت کے اعتبار سے وہ خطاء سے پاک و صاف ہے لیکن کبھی قضایا کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے جو نظم و ترتیب ضروری ہے وہ غور و خوض کی کمی اور اشتباہ کی زیادتی کی وجہ سے پیدا نہیں ہو سکتی ۔ اس لئے اس تباہی کے گرداب سے بچانے کے لئے فنِ منطق کا جاننا ضروری ہے ۔ "

پھر اس خیال کے استثنائی گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی رائے میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش اس طرح کی گئی ہے ۔

" منطق ایک وضعی علم ہے جو فکر میں جودت اور تیزی پیدا کرتا ہے اور چونکہ مزاجِ فکرِ انسان کا فطری جوہر ہے ۔ اس لئے بسا اوقات فنِ منطق کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی ۔ اسی لئے تم بہت سے جلیل القدر ارباب نظر پاؤ گے کہ وہ فنِ منطق سے باوجود نابلد ہونے کے علوم و فنون میں صحیح مطا

تک پہونچتے ہیں خصوصاً جبکہ صدق نیت اور فیضان ایزدی بھی معین و مددگار ہو۔ نیز وہ طبیعت فکری کے ذریعہ سے علوم و فنون کے صحیح راستہ پر گامزن ہوتے اور طبیعت کی رہنمائی کے معتدل طریقہ اور میانہ روی تک پہنچ جاتے ہیں اور اس طرح ان کو مطلوب کا علم ویسے ہی حاصل ہو جاتا ہے جیسے کہ نفس الامر ہیں۔"

ابن خلدون نے چند ایک جگہ جہاں تخلیقی تفکر Creative thinking اور برجستگی Spontaneity کا تذکرہ بطور خاص کیا ہے۔ اس سے تخلیقی تفکر کے لئے کئی باتیں لازم قرار پاتی ہیں۔ مثلاً الفاظ اور معانی کا صحیح لحاظ جو منطقی اصول کے مطابق ہو۔ فکر طبعی کا بیرونی اوہام اور ماحول کے اثرات سے مبرا ہونا اور فیضان الٰہی پر اعتماد۔ ان باتوں کو نظر میں رکھنے کے بعد وہ درجہ بدرجہ ان عناصر کو گنواتے ہیں جو قانون تخلیق کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لئے ایک مفکر پر عاید ہوتے ہیں۔

ا ـــــــ آزادانہ غور و خوض کی دعوت

۲ ـــــــ ایک معتدل طرز فکر کی جستجو

۳ ـــــــ مطالب کی موزوں الفاظ میں آراستگی

کبھی کبھی ذہن شکوک و شبہات کے گھپ اندھیروں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ الفاظ کے حجابات اور شکوک و شبہات کے عوائق و موانع اور علوم بھی ان سب سے تخلیۃً بالطبع ہو کر آزادانہ غور و خوض کی دعوت دی جائے اور ذہن کو مقصود کی خواہش میں لگا دیا جائے۔ اس کے بعد مبداء فیاض کی جانب سے کامیابی کی روشنی جلوہ گر ہوتی ہے اور مطالب تک پہونچنے کا ایسا معتدل اور درمیانی راستہ ہاتھ آتا ہے جو اس فکر طبعی کے غور و خوض کے ضروری عناصر و نتائج میں سے ہے۔ اس معتدل طرز فکر کی جستجو کے بعد ہی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ مفکر اپنے مطالب تک پہونچ جائے گا۔ پھر آگے اتنا کام رہ جاتا ہے کہ وہ تخلیقی اصولوں کی پاسداری کرتا ہو مطالب تک پہونچ جائے اور انھیں موزوں الفاظ کا قالب عطا کرے۔ عام فہمی اور عام استفادہ کی نظر سے ابن خلدون کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ متکلمین اسے روزمرہ کی بول چال کے پیرایہ میں ظاہر کردیں۔ پہلے روزمرہ کی بول چال کا رواج اہل علم و اصحاب فکر کے یہاں نہیں تھا۔ مگر اب عام فہمی ایک ایسا لسانی وصف بن چکی ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں۔ آج کا مفکر مفکر ہی نہیں۔ متکلم بھی ہے۔ آسے عام فہمی کے لئے شارحین کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت نہیں۔

ابن خلدون نے برجستگی کا کیا تصور پیش کیا ہے؟ اور اس کی نشو و نما میں کن عوامل کا ہاتھ بتایا ہے؟ اس کے جواب میں اس کی کوئی تفصیلی تحریر بطور حوالہ پیش کی جانی ممکن نہیں لیکن نظریہ کو سمجھنے کے لئے وہ چند باتیں ہی کافی ہیں جو تادیب کے زیر عنوان کہی گئی ہیں۔ وہ تادیب کو افعال و کردار کی تعمیر کے لئے مضر سمجھتے ہیں اور اسے بداخلاقی، بزدلی اور خود فریبی کا سرچشمہ کہتے ہیں۔ اس کمزوری کے پودے کی شاخیں قوموں کے زوال و انحطاط سے ملی ہوئی ہیں مگر اس کی جڑیں ذہنی افعال میں پیوست ہیں۔ اس سے ذہنی انحطاط پیدا ہوتا ہے اور ذہنی انحطاط سے زیادہ بڑی کوئی برائی نہیں جو جذبات، قوت فکر اور اختراع کو ختم کرکے کند بنا دیتی ہو۔

برجستگی کی نشو و نما کے لئے وہ فطری ارتقائے ذہنی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور خود فطری کا ارتقائے ذہنی کیا ہے۔ اس کے لئے ان کے اس قول کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو کردار سازی کے سلسلے میں انہوں نے کہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں معاشرتی تادیب کا ذکر کرتے ہیں۔ غالباً اس سے اس کی مراد وہ اخلاقی اور سماجی آداب ہیں جو ایک اچھی اور فکری لحاظ سے بلند سوسائٹی کی نظر میں وقعت کے قابل قرار پاتے ہیں۔ ان سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور فکر اور اختراع کی قوتیں تقویت پاتی ہیں۔

مگر کیا اس سلسلے میں ابن خلدون کی باتیں تشفی بخش ہیں؟ سب سے پہلے بات تو یہی ہے کہ قوائے ذہنی کی جس تشریح کے سہارے جدید نفسیات اپنی تحقیقات کو آگے بڑھاتی ہے اور برجستگی کی تعریف کرتی ہے اگر وہ درست ہے تو ابن خلدون نے اسے کہاں تک نظر انداز کر دیا ہے۔ قوت فکر کی طرح برجستگی کا وصف بھی ہر انسان میں ودیعت کیا گیا ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ یہ وصف کسی حد تک نفسیات حیوانیہ کے ان اصولوں کا پابند بھی ہے جو قانون تجربہ اور قانون اثرات کے تحت پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر برجستگی کا موضوع کچھ ایسے مستثنیات بھی رکھتا ہے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے افعال ایسے ہوتے ہیں جو آدمی سے یک بیک صادر ہوتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ ان افعال کے پیچھے ذہنی عمل کی برجستگی لازمی ہے۔ مگر وقفہ عمل اتنا تھوڑا ہوتا ہے کہ اسے تسلیم مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف اس بنیاد پر برجستگی کا تصور ہی بدل دینے کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کے بیان میں ایک تضاد بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"سختی کرنے سے جذبات فنا ہو جاتے ہیں، جھوٹ اور تساہل کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جوش اور انبساط ختم ہو جاتے ہیں۔

انسانی اخلاق وحیثیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اخلاقی حالت غلاموں کی سی ہو جاتی ہے۔ جیسے یہودی کہ ظلم و استبداد کی وجہ سے چالاک ہو گئے ہیں "۔ . . .

کیا واقعی تادیب سے چالاکی پیدا ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ذہن کا کند ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ ممکن ہے یہاں چالاکی سے فریب کاری اور خود فریبی مراد ہو جس میں ظاہری طور سے تیزی، تیز طراری کے ساتھ برجستگی کا عنصر بھی نظر آتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ بہر ایں ہمہ ابن خلدون کی یہ بات کہ برجستگی کی نشوونما اساسی طور پر اخلاقی حالت سے متعلق ہے اپنی جگہ وزنی معلوم ہوتی ہے اس پر نتیجہ خیز مباحث کا آغاز ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات بھی یہاں ذکر کے قابل ہے اور وہ یہ کہ برجستگی سے متعلق جن خیالات کا اظہار ابنِ خلدون نے کیا ہے وہ سب ایسے طالب علموں سے وابستہ ہیں جو قوائے ذہنی کی کمزوری کے سبب سے معلموں کی نظر میں قابل تعزیر قرار پاتے ہیں جبکہ تخلیقی تفکر کے ضمن میں ایسے طلباء کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو اپنے ذہنی ارتقا کے وسیع امکانات لیکر آتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی طلباء کو سامنے رکھکر برجستگی کے اعلیٰ معیار پر رائے زنی کی جانی مناسب تھی۔

شروع میں ابن خلدون کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں ان سے بھی کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کی نوعیت تحقیقاتی کم ہے۔ توضیحی زیادہ ہے جس میں ہر ذہین کی انفرادیت بھی کچھ نہ کچھ شامل ہو جاتی ہے اس لئے تنقیدی گرفت کے بجائے اس کا جامع اختصار موزوں تر ہوگا۔

(۱) قوتِ فکر دوسری قوتوں کی طرح ایک نعمتِ الٰہی ہے جو دماغ کے درمیانی حصہ میں نفس کی حرکت کے سبب سے ظہور میں آتی ہے۔

(۲) کبھی یہ اپنے خیالات کی ترتیب و تنظیم تک اپنا دائرہ رکھتی ہے اور کبھی ایسے علم کے حصول کا مبدا رکھتی ہے جس سے انسان ناواقف تھا۔

(۳) ترتیب و تنظیم کی صلاحیتیں فنِ منطق سے بڑھتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جس نے اس فن کو بحیثیت فن نہ سیکھا ہو وہ تخلیقی تفکر سے محروم ہو۔

پہلی بات قوتِ فکر کی تعریف سے متعلق ہے یہاں نفسیات کی جدید تعریفات کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ قوت اپنے نتائج کس طرح پیدا کرتی ہے اور اس کا نظام تربیت کیا ہے۔ اصل یہ بات ابنِ خلدون کے مختصر بیان سے واضح ہوتی ہے۔ اب آیئے ابن خلدون سے کچھ اور آگے بڑھیں۔

شروع میں ابنِ خلدون کے ساتھ امام غزالی کا نام بھی لیا گیا ہے اس لحاظ سے امام غزالی کے افکار و خیالات کا مطالعہ ابن خلدون سے پہلے مناسب تھا مگر امام غزالی کے افکار و خیالات کا مرکزی نقطہ [illegible] ہے۔ جبکہ ابنِ خلدون نے تعلیمی نفسیات کو پیش نظر رکھا ہے۔ آج کا ذہن تعلیمی نفسیات کو سمجھنے کی طرف آسانی سے مائل ہو سکتا ہے۔ اور اس صورت میں جبکہ ابن خلدون کے خیالات ایک حد تک سامنے لائے جا چکے ہیں امام غزالی کے نقطۂ نظر کو سمجھنا پہلے سے زیادہ آسان بات ہوگا۔

امام غزالی کے یہاں قوتِ فکر کے سلسلے میں بحث و نظر کا انداز فلسفیانہ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ دلیل اور دریافت کا طرز سیدھا سادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کم سے کم ایک بات غزالی نے بڑی چونکا دینے والی کہی ہے تخلیقی تفکر کے عملی پہلو پر منطق کا ایک معروف اصول منطبق کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں وہ امام غزالی کی فلسفیانہ صلاحیتوں کو عجیب انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان باتوں کا جائزہ لیا جائے۔ ان نکات کا ذکر ضروری ہے جن کو غزالی نے ہر لمحہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ امام غزالی نے بحث و نظر کو ان نکات کا پابند بنایا ہے۔

(۱) فضیلتِ تفکر

(۲) حقیقتِ تفکر

(۳) اس کا مقصد، اور

(۴) میدانِ فکر

فضیلت کے سلسلے میں امام غزالی نے قرآن کریم کے ان احکامات کا ذکر کیا ہے جو بہت سی جگہوں پر تفکر، تدبر، نظر اور اعتبار کے الفاظ کی صورت میں دیئے گئے ہیں۔ رسولِ کریمؐ کا ارشاد بھی پیش کیا ہے۔ "تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ" ایک ساعت کا تفکر سال بھر کی عبادت سے زیادہ ہے۔ یہاں تفکر سے مراد باری تعالیٰ کی صفات خلقیہ میں تفکر کرنا ہے۔ ذات باری میں تفکر کرنے کو آپؐ نے ایک دوسرے ارشاد میں منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ وہ انسانی فکر کے دائرہ سے باہر ہے۔

پھر امام غزالی نے حضرت عائشہؓ کی زبانی رسول اکرمؐ کے یہ ارشادات نقل کئے ہیں۔

"ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول کریمؐ نماز پڑھتے تھے اور روتے تھے میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب گناہ تو بخش ہی دیئے پھر آپ کیوں روتے ہیں۔ فرمایا کہ میں کیوں نہ روؤں میرے اوپر یہ آیت

نازل ہوئی ہے۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔[1] پھر آپ نے فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر جو یہ آیت پڑھے اور ان چیزوں میں تفکر نہ کرے۔"

حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول بھی قابل ذکر ہے۔

"حضرت عیسیٰ سے لوگوں نے پوچھا کیا یا روح اللہ روئے زمین پر اور کوئی بھی آپ کے مثل ہے۔ فرمایا ہاں ہے جس شخص کا کلام بالکل ذکر ہو، خاموشی بالکل فکر ہو اور نظر بالکل عبرت ہو وہ میرے مثل ہے۔"

اس کے بعد ایک اور حدیث رسولؐ نقل کی گئی ہے۔ جس میں غور و فکر اور عجائباتِ عالم سے عبرت حاصل کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

ابو سلیمان دارانیؒ کا یہ قول بھی امام غزالی کے نزدیک کافی اہمیت رکھتا ہے

"دنیا میں تفکر کرنا حجابِ آخرت ہے اور آخرت میں تفکر کرنے کا ثمرہ حکمت اور دلوں کی زندگی ہے۔"

فضیلتِ تفکر کے اس بیان کے بعد امام غزالی کے خیالات دافکار کی قدر و قیمت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں تفکر کا بلند ترین مقصد پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی تخلیق عالم کے اسرار و رموز کی تحقیق اور حقائق کائنات کی قدرتوں کا عرفان جس کے دائرہ میں علوم و فنون کے وہ تمام بنیادی مسلّمات آجاتے ہیں جن کی بنا پر تمدنی حیاتیاتی اور طبعی معلومات کو ترتیب دے کر فلسفوں کی تشکیل ہوتی ہے اور نظام بنتے ہیں۔

امام غزالی کے نزدیک تفکر کی حقیقت کیا ہے۔ [illegible] سمجھنے کے لئے اس اقتباس کا مطالعہ اہم ہے۔

"طالب علم تفکر کے معنی ہیں اور جو علم فی البدیہہ نہ معلوم ہو اسے طلب کرنا چاہئے اور اسے جاننا اور دریافت کر لینا ممکن نہیں مگر اس طرح پر کہ اور دو معرفتوں کو جمع کریں، اور ان دونوں میں تالیف کریں تاکہ جدت ہو جائے۔ اور ان دونوں معرفتوں میں سے تیسری معرفت پیدا ہو جس طرح نر مادہ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ دونوں معرفتیں اس تیسری معرفت کی دو اصلوں کے مانند ہیں اس تیسری معرفت کو اور کسی معرفت کے ساتھ جمع کریں تاکہ اس سے چوتھی معرفت پیدا ہو اسی طرح ایک معرفت کو دوسری معرفت میں ملاتے جانا تسلسل علوم کو بے نہایت بڑھاتا ہے جو شخص اس طریقے سے علوم نہیں حاصل کر سکتا اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جو علوم اصل ہیں ان کی طرف وہ راہ نہیں پاتا۔ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص سرمایہ نہ رکھتا ہو تو وہ سوداگری کیونکر کریگا اور اگر اصل علوم تو جانتا ہے مگر ایک علم کو دوسرے کے ساتھ جمع کرنا نہیں جانتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سرمایہ تو رکھتا ہے مگر سوداگری نہیں کر سکتا۔"

یہاں طرزِ تحریر مطالب کی راہ میں کسی قدر رکاوٹ پیدا کرتا ہے شاید اس کا احساس صاحب تحریر کو بھی ہوا ہے۔ چنانچہ آگے لکھا ہے۔

"۔ اس کی حقیقت کی تفصیل دراز ہے اس ایک مثال میں ہم بیان کرتے ہیں کہ مثلاً کوئی شخص یا جاننا چاہے کہ دنیا سے آخرت بہتر ہے تو وہ یہ نہیں جان سکتا تاوقتیکہ دو باتیں نہ جانے [illegible] بات جان لے کہ باقی فانی سے بہتر ہے دوسری بات یہ جان لے کہ آخرت باقی ہے اور دنیا فانی ہے جب یہ دو باتیں معلوم ہو گئیں تو یہ تیسرا علم کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے خواہ مخواہ اس سے پیدا ہو جائے گا اس پیدا ہونے سے ہم وہ مضمون مراد نہیں لیتے جو معتزلہ کا مقصود ہے اس بات کی تفصیل بھی دراز ہے۔"

اس مثال کے بعد غزالی کا مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ اور منطقی ارتباط پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے پھر غزالی نے اپنے [illegible] کو اختصار کی خاطر اس جملے میں سمیٹ لیا ہے۔

"غرض کہ تفکر کی حقیقت اس علم کی طلب ہے جو دو علموں کو دل میں حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے مگر جس طرح گھوڑے کے جوڑے سے بکری نہیں پیدا ہوتی اسی طرح دو علموں سے جو [illegible] وہ نہ پیدا ہو گا بلکہ ہر نوع علم کی جدا جدا دو اصلیں ہیں ان دونوں اصلوں کو اپنے دل میں جب تک جمع نہ کیا جائے گا تب تک وہ فرع نہ ظاہر ہو گی۔"

ان سطور میں غزالی نے ایک درمیانی طریقۂ فکر کی نشان دہی کی ہے۔

---

[1] بلاشبہ اہل عقل کیلئے آسمان و زمین کی تخلیق اور اختلاف لیل و نہار میں کھلی نشانیاں ہیں۔

چل نکلتا ہے اسی طرح ان دونوں علموں کی مثال ہے جو اصل ہیں ان دونوں علموں کو تیسرا علم پیدا ہونے کے واسطے جمع کرنا ایسا ہے جیسے پتھر اور لوہا اور تفکر کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کو لوہے پر مارنا اور معرفت کی مثال ایسی ہے جیسے وہ نور جو پتھر کو لوہے پر مارنے سے پیدا ہوتا ہے تاکہ اس کے دل کی حالت بدل جائے اور بسبب حالِ دل بدل جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ معلوم کیا کہ آخرت بہتر ہے تو دنیا سے منہ پھیر کر آخرت کی طرف متوجہ ہوگا پس تفکر سے تین چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ معرفت، حالت، عمل، مگر عمل حالت کا تابع ہے اور حالت معرفت کی تابع ہے اور معرفت تفکر کی تابع ہے۔ پس تفکر سب نیکیوں کی اصل اور کنجی ہے اسی بات سے تفکر کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔"

ان سطور میں فکر اور عمل کے تعلق کی نوعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عملی قوتوں کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے فکر ضروری ہے ہر عمل کی بنیاد کسی خیال یا فکر پر ہوتی ہے۔ بنیاد کی کجی ہی اسے ٹیڑھا بنا دیتی ہے۔ اب بطور خلاصہ ان مراحل کا ذکر ضروری ہے جو فکر و عمل کے باب میں امام غزالی نے بیان کئے ہیں۔

۱۔ علوم کا استحضارِ ذہنی

۲۔ خیالات کی باہم آویزش و آمیزش

۳۔ تفکر نتائج کی ترتیب و تنظیم

۴۔ معرفت۔ ۵۔ حالت۔ ۶۔ عمل۔

فکر کی جولانگاہ کے بارے میں بھی امام غزالی کا قول سن لیجئے۔

"فکر کی جولانگاہ اور میدان کی نہایت نہیں اس واسطے علم کی انتہا ہے اور سب چیزوں میں فکر جاری ہے مگر جو چیز راہِ دین سے علاقہ نہیں رکھتی اس کی شرح کرنا ہمیں مقصود نہیں اور جو چیز راہِ دین سے تعلق رکھتی ہے اگرچہ اس کی تفصیل بے نہایت ہے مگر اس کے انواع کا بیان ہو سکتا ہے۔ یہاں راہِ دین سے ہم وہ معاملہ مراد لیتے ہیں جو بندہ اور خدا کے درمیان ہے"

اس کے بعد وہ انفرادی احوال کی حد تک تفکر کی تشریح کرتے گئے ہیں جس کی سرحدیں مسائل تصوف سے مل گئی ہیں۔ اجتماعیات میں بھی ان کے نزدیک تفکر خالی از فائدہ نہیں لیکن اپنی حد تک انہوں نے انسان کی انفرادی عبادت کو تفکر کی جولانگاہ بنایا ہے۔

انفرادی اصلاح کے سلسلے میں انہوں نے تفکر کو کس طرح اپنایا ہے یہ بیان انہوں نے سب سے زیادہ تفصیل سے پیش کیا ہے۔ وہ تفکر کو ایسا دیکھنا چاہتے ہیں ؎

ہرچہ آید در دلم غیر تو نیست

یا تو ئی یا بوئے تو یا خوئے تو

اگر اسے اصلاحی تفکر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انفرادی حیثیت سے تفکر کے مختلف طریقے ہیں۔ جن میں ایک تفکر ذاتی۔ یعنی آدمی اپنے اوپر غور کرے۔ اس سے باطنی نقائص کا ادراک ہوتا ہے۔ پھر مضر پہلوؤں سے بچنے کے لئے تفکر کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اعمال کا جائزہ کون سا عمل غلط ہے۔ کون سا درست ہے۔ دوسرے اپنا جائزہ یعنی غلط اعمال ہم سے کہاں تک سرزد ہوتے ہیں تیسرے تدارک کی تفکر یعنی غلط کاری سے بچنے کی صورتیں۔ اس تمام عمل کو احتساب و محاسبہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد متوازی انداز میں اس کے اثباتی پہلو پر روشنی ڈالی ہے بخل۔ تکبر، ریا، حسد، غصہ، حرص طعام، حرص سخن۔ دوستی مال۔ دوستی جاہ و عزت کو بھی اس سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ جس سے غالباً مراد یہ ہے کہ یہ جذبات بطور محرکات عملی اور فکری قوتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تفکر کا ایک وسیع میدان تفکرِ ذاتی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ذاتِ الٰہی اور صفاتِ الٰہی کے بارے میں سوچا جائے لیکن ذاتِ الٰہی کے بارے میں عام اجازت نہیں دی گئی ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کی حدیں مسلہ جبر و قدر سے مل جاتی ہیں۔ البتہ غزالی نے صفات کے بارے میں غور و فکر کے بہت سے نکات پیش کئے ہیں۔

امام غزالی کے ان خیالات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد جدید نفسیات کے رجحانات سے تقابل و تنقید بھی ضروری ہے۔ جو ایک ماہر[1] نفسیاتِ جدید ہی کر سکتا ہے۔

علوماتِ عامہ پر بھروسہ کر کے یہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں جبلتوں کا بہت ناقص تصور ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ ادراک اور تحت الشعور کا جو سب سے بڑا انکشاف ہے تو کبھی کبھی زندگی کے روزمرہ واقعات کو سمجھانے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ معلوم ہونے لگتا ہے کہ عقل، ادراک، شعور، تحت الشعور کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

---

[1] اگرچہ یہ بحث تحقیقی تفکر سے براہ راست متعلق نہیں لیکن تفکر کی عمومی خصوصیات پر روشنی ڈالتی ہے

ایک طرف تو مختلف خیالات کی باہم آویزش سے نئے خیال کی صورت گری ہوتی ہے دوسری طرف خذ ما صفا ودع ما کدر بھی پیش نظر رہتا ہے مگر اس تمام وقفۂ عمل میں نظریۂ توافق کا احترام کہیں کم نہیں ہوتا نہ منطقی اصولوں کے خلاف نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ طریقہ فکر استخراجی ہو ——————
یا استقرائی۔ یہ بات دونوں پر صادق آتی ہے۔

یہاں ایک بات تشریح طلب ہے۔ کیا امام غزالی نے افزائش نسل کے اصول کو ذہنی عمل پر منطبق کر کے صرف یہ بات ظاہر کی ہے کہ ذہنی عمل منطقی اصولوں کا پابند ہوتا ہے جیسا کہ مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ یا اس انطباق کی حقیقت اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔ کیا تحقیق کے نئے نتائج، دیگر حقائق بھی عاید ہوئے ہیں؟ اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

قوموں اور نسلوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی دو مختلف الخیال اور مختلف المزاج قومیں تاریخی حوادث کی بنا پر یا کسی اور سبب سے ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں ان کے میل جول سے تیسری نسل وجود میں آتی ہے تو یہ تیسری نسل جسمانی اور ذہنی لحاظ سے قوی تر ہوتی ہے۔ وہ تاریخی عوامل کیا ہوتے ہیں جو اس ذہنی قوت کا سبب بنتے ہیں؟ یہاں اس کا مطالعہ بھی موضوع سے خارج نہیں مگر آئیے اس اصول کو ذرا امام غزالی کے نظریہ فکر سے مربوط کر کے دیکھیں۔ کیا یہ اصول یہاں بھی صادق ہے یہ بھی کہا جا سکتا ہے؟ دو مختلف طرزہائے فکر کے نتائج کے مجموعہ کو کیا تیسری بہتر صورت کہا جائے گا؟

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے ارباب فکر کی ذہنی جد و جہد کا مطالعہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ارباب فکر کی بیشتر تعداد کا ذہنی ارتقا ایسے حالات کی پیداوار ہے جب دو مختلف تہذیبوں کی باہم آویزش شدید تر ہو گئی تھی۔

مزید ثبوت کے لئے واقعات کا منفی پہلو دیکھنا ہو تو آپ بعد کے ذہنی افلاس دیکھئے جو کافی حد تک مدرسوں اور تکیوں کی پیداوار ہے یہ پرانے طرز کے مدرسوں کے ایسے طلبا رہے ملتے جنہیں آج بھی علوم جدیدہ کی کوئی تیسر نہیں یہی وجہ ہے کہ دونوں طبقے کسی عظیم تر مقصد کے حصول سے محروم رہے۔

جہاں نظریات کی آویزش مطالعہ اجتماعی نقطۂ نظر سے اہم ہے وہاں ایک فرد کے ذہنی عمل کا مطالعہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس سلسلے میں کافی دلچسپ تجربات ہو سکتے ہیں۔

امام غزالی نے شرح احیا میں یہ کہا ہے کہ جو علم فی البدیہہ نہ معلوم ہوا سے طلب کرنا چاہئے یعنی غور و فکر کی مدد سے سمجھنا چاہئے۔ طلب علم تفکر کا دوسرا نام ہے۔ اس کے سوا اس علم کو جاننا ممکن نہیں۔ یہاں ایک سمجھنے کی بات یہ ہے

کہ ابن خلدون اور غزالی دونوں نے ایسے خیالات کے بارے میں جو فی البدیہہ نہیں معلوم ہوتے یا ان کا علم پہلے سے نہیں ہوتا۔ نہایت محتاط الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ فکر افعال انسانی کی ایک خاص ترتیب و نظام کے ماتحت صادر ہونے کا مبدا بنتی ہے اور کبھی کبھی ایسے علم کے حصول کا مبداء و ذریعہ بنتی ہے جس سے انسان ناواقف تھا۔ امام غزالی نے کہا ہے کہ
" تفکر کی حقیقت اس علم کی طلب ہے جو دو علموں کو دل میں حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے "

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر نتیجۂ فکر کی بنیاد کسی پچھلے خیال پر ہوتی ہے جسے ہم بنیاد کہتے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک ایسی ترتیب کو ہوتی ہے جس سے ذہن مانوس و متعارف نہیں ہوتا۔ ایسی سب صورتوں میں نتائج تک پہنچنے کا وہ راستہ اختیار کیا جاتا ہے جسے استخراجی کہا جاتا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان جس چیز سے واقف نہ ہو وہ اپنا وجود ہی نہ رکھتی ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفردات اور مرکبات کی آمیزش و ادل سے بے شمار تجربات کئے جاتے ہیں ان میں کوئی نتیجہ خیز بھی ہو سکتا ہے مگر بیشتر ناکامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض علوم میں صرف مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مفروضہ نتائج کی صحت و درستی کے لئے مشاہدات نہیں کئے جاتے۔ بہرحال یہ اختلافی بات ہے جو علوم و فنون کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے۔

تفکر کیوں ضروری ہے؟ اور کس لئے کرنا چاہئے؟ امام غزالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

"حق تعالیٰ نے آدمی کو ظلمت اور جہل میں پیدا کیا ہے اسے ایک نور کی حاجت ہے تاکہ اس ظلمت سے نکل کر اپنی راہ لے اور یہ جانے کہ مجھے کیا کام کرنا چاہئے اور کس طرف کو چلنا چاہئے۔ دنیا کی طرف سے یا آخرت کی طرف سے اور اپنے ساتھ مشغول رہنا چاہئے یا خدا کے ساتھ اور یہ نور معرفت کے بغیر معلوم نہیں ہوتا اور نور معرفت تفکر کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کوئی شخص تاریکی میں عاجز ہوتا ہے اور راہ نہیں چل سکتا تو پتھر کو لوہے پر مارتا ہے تاکہ اس سے آگ چمکے اور اس آگ سے یہ اپنا چراغ جلالے تو اس چراغ کے سبب سے اس کا حال بدل جاتا ہے حتیٰ کہ وہ دیکھنے لگتا ہے اور راہ کو بے راہی سے تمیز کر لیتا ہے اور

---

[1] مخلوق ایک ظلمت میں پیدا کی گئی اور پھر اس پر اپنا نور ڈالا گیا

بہر کیف اب برسرِ مطلب آئیے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے حسب ذیل باتیں قابلِ غور معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ ذہنی ارتقا پر ماحول کا اثر۔
۲۔ نفسیاتی اُلجھنوں کا اثر تفکر کے نتائج پر۔
۳۔ تخلیقی تفکر کے شرائطِ نفسی۔

ان عنوانات کے تحت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ نئے اصولوں اور قانونوں کی دریافت بھی ہو سکتی ہے۔ نفسیاتی اور ماحولی اثرات کی عملی تعبیرات قدیم مفکرین سے جدا ہیں۔ پہلے ان کی تعبیر خواہشات۔ جذبات، احساسات، تعلیم و تربیت۔ اکتسابات ذہنی، تجربات زندگی سے کی جاتی تھی۔ اب انہیں خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جس سے کافی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اسی لئے بہت سے ارباب فکر تحلیل نفسی کے ان نظریات کے خلاف ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ذہن کی بعض غیر معمولی حالتوں کے تجزیہ میں یہ اثرات خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کے بعد ہی ابہام سے بمدد ان سے نکل چکے ہیں۔ اس لئے ضروری نہیں ان تعبیرات کو [illegible] کیا جائے۔ جن میں نفسیاتی الجھنوں کو اعتدال پر قائم رہتے ہوئے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور انتہا پسندانہ تقلید سے گریز کیا گیا ہے۔

تفکر کی ان مختلف توضیحات کے بعد اس موضوع پر جتنا مواد ملتا ہے اور مزید مواد کے لئے جو جو نکات سامنے آتے ہیں ان کو ایک مجموعی انداز میں مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ آیندہ مجموعی ترتیب علم و فن کی ہر شاخ کے لئے بہت سی مفید معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ طالب علموں کے لئے اس سے تعلیم نفسیات کے اصول مل سکتے ہیں۔ معلمین کے لئے یہ اصلاحی سعی و جہد کا صحیح تصور فراہم کر سکتی ہے۔ فن کار اس سے فن کا ایک تصور دے سکتے ہیں جو فکر و فن میں صحیح تناسب رکھتا ہو۔ اور نقطۂ معنی کی گمراہ کن الجھنوں سے پاک ہو۔ نقاد اس سے ادب کے بہت سے مسائل کا متوازن حل پا سکتے ہیں۔ ——— اور اپنی قوت فکر کی گیرائی اور گہرائی میں ہر وہ شخص اضافہ کر سکتا ہے جو تخلیقی صلاحیتیں رکھتا ہو۔

تعاون کی راہیں

۱۔ علم دوست اور ذی استعداد اصحاب کو معیار سے متعارف کرائیے۔
۲۔ اپنے یہاں کے اسکول، لائبریریوں، اور دیانت دار نیوز ایجنٹوں کے پتے ارسال فرمائیے۔
۳۔ ایسی فرموں کے پتے ارسال کیجئے۔ جنہیں ہم اشتہار دینے کے لئے تیار کر سکیں۔
۴۔ اہل قلم حضرات دفتر کے تقاضوں کا انتظار کئے بغیر اپنی تخلیقات ارسال فرمائیں۔
۵۔ اپنے مفید مشوروں سے [illegible] نوازیں۔

ناظم ادارۂ معیار

ابو البیان حمّاد

○

ہر رنگ سے آئینۂ دل پاک ہوا ہے
پھر اس میں عیاں جوہرِ ادراک ہوا ہے
چشمۂ انوار ابل آئے گا ہر سو
مژدہ ہو کہ ظلمت کا جگر چاک ہوا ہے
عرفانِ خودی ہو تو ہے پھر خاک بھی اکسیر
فقدانِ خودی ہی سے گہر خاک ہوا ہے
کچھ دل کی بھڑاس اپنی نکل ہی گئی آخر
دامن مری ہیکل کا جو صد چاک ہوا ہے
خود حق کا پرستار تھا حق کا مخالف
یہ حادثہ کس درجہ المناک ہوا ہے
[illegible] راستہ
حمّاد ملا ہے شعور ادراک ہوا ہے

انور صدیقی

○

متاعِ آشیاں ابرقِ تپاں سے کچھ نہیں ہوتا
بہ فیضِ ابنِ آدم آسماں سے کچھ نہیں ہوتا
کٹھن کیا مرحلے آئے کہ رہرو کھو گئے سارے
چل اے ذوقِ سفر اب کارواں سے کچھ نہیں ہوتا
شعاعِ سیمِ انساں سے فروغِ بزمِ انجم ہے
کہا یہ کس نے اپنے خاکداں سے کچھ نہیں ہوتا
خرد ناکام ہوتی ہے تو تھک کر بیٹھ جاتی ہے
جنونِ دل کا سعیِ رائیگاں سے کچھ نہیں ہوتا
رہِ دار و رسن پر جانے والے رک نہیں سکتے
تمہارے آنسوؤں کی کہکشاں سے کچھ نہیں ہوتا
وہ اک شعلہ سا لو دیتا ہے انورؔ دامنِ شب میں
غلط تھا یہ کہ سوزِ جاوداں سے کچھ نہیں ہوتا

محمد نیاز

O

نظر میں داستاں ہے اور میں ہوں
ابھی ضبطِ فغاں ہے اور میں ہوں
یہ دستورِ زباں بندی کے جس پہ
مگر شوقِ اذاں ہے اور میں ہوں
بایں زنداں، بایں طوق و سلاسل
طریقِ عاشقاں ہے اور میں ہوں
تمہارا امتحاں ہے اور تم ہو
مرا عزمِ جواں ہے اور میں ہوں
پکارا ہے مری منزل نے مجھ کو
نیازؔ اِک کارواں ہے اور میں ہوں

سیلف نوگانوی

O

جوشِ جنوں نیا ہے گریباں نئے نئے
وحشت ہے تازہ تازہ بیاباں نئے نئے
ہے داستانِ زیست ازل سے وہی مگر
ہر روز رکھ لیے گئے عنواں نئے نئے
خود زندگی کے حق میں اِک آزار بن گئے
چارہ گرانِ دہر کے درماں نئے نئے
تعمیرِ نَو کے نام سے ہوتے ہیں رات دن
بربادیٔ حیات کے ساماں نئے نئے
فکرِ قدیم ہے بہ لباسِ بیانِ نو
کرتے ہیں جس کو پیش سخنداں نئے نئے

سیف خیرآبادی

وہ منزل کی طرف کیا بڑھ سکیں گے
جنھیں اندیشۂ سود و زیاں ہے
ابھی غافل نہ ہونا ہم صفیرو
ابھی صیاد زیرِ آشیاں ہے
رہیں گے پھول کب تک چاک داماں
چمن اپنا ہے اپنا باغباں ہے
بہ رنگِ بوئے گل حسنِ حقیقت
عیاں ہے اور نظروں سے نہاں ہے
محبت میں جو موت آئے تو بہتر
کہ یہ رازِ حیاتِ جاوداں ہے
حیاتِ عاشقی اے سیف توبہ
یہاں جو سانس ہے اک امتحاں ہے

بیدل میرٹھی

بزمِ جاناں میں نہیں دیدار کا سودا مجھے؛
یاد آجاتا ہے اُن کے سامنے کیا کیا مجھے
اپنی بربادی میں خود کوشاں ہوں اس انداز سے
جس طرح تعمیر کرنی ہے نئی دُنیا مجھے
کھل چکے ہیں اب مری وحشت پہ اسرارِ بہار
اب نہ ہوگا امتیازِ گلشن و صحرا مجھے
کر لیا میں نے یقیں ترکِ محبت کا مگر
جانے والے! دور تک مڑ مڑ کے کیوں دیکھا مجھے
ترجمانِ شورشِ دل ہے یہی گہرا سکوت
کیوں پسند آئے نہ ویرانوں کا سناٹا مجھے
میرے دل میں ایک تازہ آرزو پیدا ہوئی
تم نے جب بھی بے نیازِ آرزو پایا مجھے
دشمنوں کی کیا شکایت، دوستوں کا کیا گلہ
بیدل اپنے آپ سے ہے، ہے اگر شکوا مجھے

سید مستفیض عنصر

○

جنونِ خفتہ کو آخر جگا دیا تُو نے
ستا ستا کے تڑپنا سکھا دیا تُو نے
فراغِ فکر مجھے دے کے ظلمتِ شب میں
ورودِ صبح کا امکاں بڑھا دیا تُو نے
مرے مذاق کو تابندگی عطا کی ہے
غمِ حیات جو صبر آزما دیا تُو نے
حیات ہی تو ہے فہم و جنوں کی آویزش
حیات دے کے تماشہ بنا دیا تُو نے
عطائے فکر و نظر پہ غرور ہے مجھکو
خرابِ زیست کو شاعر بنا دیا تُو نے
تری تلاش میں نکلا تھا میں بھی دل لیکر
فریب دے کے مجھے کیوں گنوا دیا تُو نے
ابھی مزید نوازش کی آرزو ہے مجھے
غمِ حیات دیا بھی تو کیا دیا تُو نے

آحقر۔ ایم۔ اے

○

زندگی ہو بسر تو عزت سے
ورنہ بہتر ہے موت ذلت سے
کام بگڑا کیا عداوت سے
بات بنتی رہی محبت سے
وہ ہے مرعوب مارکسیت سے
جو ہے مایوس آدمیت سے
رہگذر میں اٹھا کریں طوفاں
ہم گذرتے رہیں متانت سے
عصمتِ باغ باغباں لوٹے
دیکھتے ہیں نگاہِ حسرت سے
جبر کے ساتھ اختیار بھی ہے
پھر شکایت ہی کیا مشیت سے
اُن پہ ہنستے ہیں ظلمتوں کے نقیب
جو نکل آئے قعرِ ظلمت سے

احمد نسیم مینانگری

○

صیاد تیری گھات ابھی ناتمام ہے
قیدِ قفس کی بات ابھی ناتمام ہے

انساں کی بے بسی پہ تڑپتا نہیں ہے دل
افسانۂ حیات ابھی ناتمام ہے

سعی و عمل میں اور ابھی حسن چاہئے
دار و رسن کی بات ابھی ناتمام ہے

قسمت سے چار تنکے ہیں محفوظ آج تک
برقِ تپاں کی گھات ابھی ناتمام ہے

کیوں چونکتا ہے خواب سے دیوانہ بار بار
کہہ دے کوئی کہ رات ابھی ناتمام ہے

اِک انقلاب لائیں گے دنیا میں ہم نسیم
عہدِ سکوں کی بات ابھی ناتمام ہے

مظہر نسیم۔ بی۔ اے۔

○

سوزِ غمِ حیات نے مجھ سے نہ پوچھ کیا دیا
ذوقِ عمل بڑھا دیا جینا مجھے سکھا دیا

وجد میں زیست آگئی موت بھی گنگنا اٹھی
میں نے جو سازِ عشق پر نغمۂ غم سنا دیا

لوگ نہ یہ سمجھ سکیں غم سے شکست کھا گیا
فرطِ ملال و یاس میں اِس لئے مسکرا دیا

حُسنِ فسوں طراز کی ہائے رے شوخ شعلگی
ایک ہی نرم آنچ میں خرمنِ دل جلا دیا

سچ تو یہ ہے کہ زندگی ساتھ نہ میرا دے سکی
ورنہ تمھاری یاد نے جینے کا حوصلا دیا

ایک زمانہ سے نسیم ہوش و خرد سے دور ہوں
ساغرِ بے خودیٔ عشق کس نے مجھے پلا دیا

قرار

مصنفہ :- ہف وآل پول
مترجمہ :- ابنِ فرید - بی - اے

جب فوسٹر غیر ارادی طور پر کمرے میں چل کر، کتابوں کی الماری تک آیا اور کسی قدر آگے کی طرف جھکتے ہوئے کبھی ایک کتاب پر اور کبھی دوسری کتاب پر نظرِ انتخاب ڈالنے لگا، تو اُس کا میزبان اُس کی لاغر و ناہموار گردن کے پٹھوں کو اُس کے تیسٹ فلالین کے کالر میں ایستادہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ کس قدر آسانی کے ساتھ وہ اُسکا گلا گھونٹ سکے گا اور یہ فعل اُسے کس قدر مسرت، جاں فزا مسرت فراہم کر سکے گا۔

نیست سفید چھت اور سفید دیواروں والا کمرہ لیک لینڈ کی ملیح و لطیف آفتابی کرنوں کے سیلاب سے بھرا ہوا تھا۔ برطانیہ کی جھیلوں کی سرزمین میں اکتوبر کا مہینہ رشک کے قابل ہوتا ہے شہری، دلفریب اور معطر کرنیں مست خوبانی کی طرح ناغدار آسمان پر آہستہ خرامی کرتی ہوئی یا قوتی شام کی سرنوں تک جا پہونچتی ہیں، تو اُس خوبصورت سلیٹی پر سائے گہرے ارغوانی دھبوں کی شکل میں، سیمابی جالی کے تانے بانے کی شکل میں، گہرے عنبری اور بھورے داغوں کی شکل میں پھیلنے لگتے ہیں، پہاڑوں پر سے بادل جنگی جہازوں کی طرح گذرنے لگتے ہیں، کبھی چھپتے ہوئے کبھی سامنے آتے ہوئے، کبھی دیودل کی سی نوح کے ساتھ میدانوں کے سینے پر اُترتے ہوئے، اور یا چانک لطیف نیلے آسمان کی وسعتوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے پژمردہ سے رنگ میں پھیل جاتے ہیں۔

فن وک کا چھوٹا سا مکان لوفلز سے نظر آتا تھا۔ اُس کے داہنی طرف دریچوں سے آلس واٹر کی پھیلی ہوئی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔

فن وک نے فوسٹر کی پشت دیکھی اور اچانک خود کو اس قدر بیمار سا محسوس کرنے لگا بیٹھ گیا، اور ایک لحظہ کے لئے اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھک لیا۔ فوسٹر لندن سے وہاں اپنی صفائی پیش کرنے کی غرض آیا تھا، اپنے تعلقات کو خوشگوار بنانے آیا تھا۔ وہ فوسٹر کو تقریباً بیس سال سے جانتا تھا۔ اور اس تمام عرصہ میں فوسٹر ہمیشہ اسکی کوشش کرتا رہا تھا کہ اُس کے تعلقات ہر ایک سے خوش گوار رہیں۔ وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا کہ لوگ اُس سے نفرت کریں۔ اُسے نفرت تھی کہ لوگ اُسکے بارے میں غلط انداز سے سوچیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر شخص اُس کا دوست بن جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فوسٹر اطمینان بخش اور کامیاب زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور ہاں! شاید فن وک کی ناکامی کی وجہ بھی یہی تھی۔

کیونکہ فن وک اس معاملہ میں فوسٹر کی ضد تھا۔ اُس کو دوستوں کی تمنا نہیں تھی۔ وہ قطعاً اس کی پروا نہیں کرتا تھا کہ لوگ اُسے پسند کریں — چنانچہ وہ کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کرکے لوگوں کو ذلیل سمجھا کرتا تھا — اور کتنے ہی لوگ اُس کی نگاہ میں قابلِ نفریں تھے۔

فن وک نے اُس لمبی، دُبلی خمیدہ پیٹھ کی طرف دیکھا اور اپنے گھٹنوں میں کپکپاہٹ محسوس کرنے لگا۔ جلد ہی فوسٹر اُس کی طرف مڑے گا اور کتابوں کے بارے میں سیٹی کی سی تیز آواز میں کچھ اُگل دیگا۔ "کسی دلچسپ کتابیں ہیں تمہاری فن وک!" کتنی ہی راتیں فن وک آنکھوں میں کاٹ چکا تھا جبکہ اُسے بالکل نیند نہیں آتی تھی، اُس نے اس سیٹی کی سی تیز آواز کو بالکل قریب سے سُنا تھا۔ ہاں بالکل اپنے بستر کے قریب، اور کتنی ہی بار اُس نے اُس آواز کا جواب بھی دیا تھا "میں تم سے نفرت کرتا ہوں! تم میری زندگی کی ناکامی کی وجہ ہو۔ تم ہمیشہ میرے راستہ میں آگئے ہو۔ ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ! میری حوصلہ افزائی کی اور میرے ساتھ ظاہر داری برتی۔ لیکن درحقیقت دوسروں پر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ میں کس قدر قابلِ رحم ہستی ہوں۔ میں کتنی عظیم ناکامی ہوں۔ کیسا مغرور بیوقوف ہوں! میں جانتا ہوں! تم مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے، میں تمہارے باطن میں جھانک سکتا ہوں!"

بیس سال سے فوسٹر نے دھیمی رفتار کے ساتھ فن وک کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا ... اُڑانا اور نعرے لگانا جبکہ وہ اس کو اپنے ناد

رسالہ "پارتھینن" کے لئے ایک نائب مدیر کی ضرورت تھی۔ فن وک اُس کے پاس گیا اور اُس سے بڑی امید افزا گفتگو کی۔ اُس نے اُس دن کتنی عمدگی کے ساتھ گفتگو کی تھی اور کتنے جوش و خروش کے ساتھ روبنس پر (جسے اُس نے اُسکی خود بینی کے ذریعہ اندھا کر دیا تھا)۔ ظاہر کر دیا کہ "پارتھینن" کیا رسالہ بن سکتا تھا۔ روبنس نے کس طرح اپنے جوش و خروش کو محسوس کیا تھا۔ اور کس طرح وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو کمرے میں گھسیٹتے ہوئے چلّایا تھا! "ہاں! ہاں! فن وک! یہ تو بہت عمدہ رہے گا۔ یہ تو یقیناً لاجواب ہو گا۔" اور بالآخر کیسے فوسٹر نے اُس اسامی کو اُچک لیا تھا۔

رسالہ صرف سال بھر یا اتنے ہی کچھ عرصے تک چلا تھا لیکن فوسٹر کو اُس کے ساتھ تعلق نے مشہور کر دیا، بالکل اُسی طرح جس طرح کہ فن وک ہو جاتا۔

پھر پانچ سال بعد فن وک کی ناول "تلخ ایلوا" —— جس کے لئے اُس نے تین سال تک خون پسینہ ایک کر دیا تھا —— منظر عام پر آئی۔ اور اُسی ہفتہ کے اندر فوسٹر نے اپنی ناول "سرکس" شائع کر دی جس نے اپنا نام پیدا کر لیا حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ ایک دم ناقص، جذباتی اور فحش تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ محض ایک ناول کسی کو تباہ و برباد نہیں کر سکتی —— لیکن غور کیجئے کیا نہیں کر سکتی؟ اگر "سرکس" شائع نہ ہوئی ہوتی تو کیا لندن کے ہر فن مولاؤں کا حلقہ —— خود بین، ناقص، نا فہم، پر خود غلط جھگڑتا ہوا اپنی بکواس سے بہت کچھ نوایک کتاب کی اچھی یا بُری قسمت پر اثر انداز ہو سکتا ہے —— "تلخ ایلوا" کے بارے میں مباحثے کرتا اور اس طرح اُسے شہرت سے ہمکنار کر دیتا۔ اور اب ایسا تھا کہ جیسے وہ کتاب پیدا ہی مردہ ہوئی تھی اور "سرکس" اپنی شہرت کی راہ پر کامیابی کے ساتھ اکڑتی ہوئی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اس کے بعد متعدد مواقع پر —— جن میں سے کچھ معمولی تھے اور کچھ اہم —— کس طرح فوسٹر کا وہ لاغر اور بھدا جسم فن وک کی مسرتوں سے اُلجھتا رہا۔

فن وک، بہرحال، وہاں ایک حصار میں پہونچ گیا تھا۔ خود کو چیونٹوں کی سرزمین کے جگر میں چھپائے ہوئے بغیر کسی دوست، غمخوار اور بغیر کسی سرمایہ کے وہ ہر وقت اپنی ناکامی کے بارے میں سوچا کرتا وہ بالکل ناکام تھا اور یہ اس کی اپنی غلطی نہیں تھی۔ اور یہ اُس کی ذہانت اور صلاحیتوں کی موجودگی میں ایسی غلطی کیوں کر ہو سکتی تھی؟ یہ موجودہ طرز زندگی کی غلطی تھی، اس تہذیب کی خام کاری کی غلطی تھی، اس مادہ پرستانہ بکھیڑے کی غلطی تھی جو انسانی ذہانت کا کارخانہ بن بیٹھا تھا اور یہ فوسٹر کی غلطی تھی۔

ہمیشہ فن وک یہ توقع کرتا رہا کہ فوسٹر اب خود کو اُس سے دُور رکھے گا۔ وہ تصور ہی نہیں کر پاتا تھا کہ وہ اُس شخص کو دیکھ کر کیا نہ کرے اور تب ایک دن وہ متحیر ہو گیا۔ جب اُسے ایک تار ملا:-

"ادھر سے گذرتے ہوئے، کیا میں تمہارے ساتھ دوشنبہ اور منگل کے دن ٹھہر سکتا ہوں۔
گائلز فوسٹر"

فن وک کو اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر —— تجسس، سنکی تحقیر، اور پنہاں دیرا سرار تحریک کے تحت جس کی وہ تشریح کرتے ہوئے خوف کھاتا تھا —— اُس نے تار دے دیا ——
"آجاؤ"

اور یوں وہ شخص وہاں موجود تھا۔ وہ آیا تھا —— چاہے آپ کو یقین نہ آئے —— اپنے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے۔ اُس نے ہملن ایڈرس سے سُنا تھا کہ فن وک کو اُس سے تکلیف پہونچی ہے۔ اور اُسے اُس سے کچھ شکایات بھی ہیں۔

"میں اِس احساس کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا، میرے بزرگ، چنانچہ میں نے سوچا کہ میں راستے میں رُک جاؤں۔ دیکھوں معاملہ کیا ہے اور اُسے سُلجھا لوں۔"

گذشتہ رات کھانے کے بعد فوسٹر نے مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ بے صبری کے ساتھ اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا، جیسے پالتو کتے کی آنکھیں بڑی پرُرحم جاتی ہیں اور وہ خود کو اس کا حقدار سمجھنے لگتا ہے، اور فن وک سے کہا تھا۔ "بتاؤ، کیا بات تھی؟"

فن وک نے صرف یہ کہا کہ کوئی بات ہی نہیں تھی، ہملن ایڈرس تو نرا احمق ہے۔

"اوہ، مجھے یہ سُنکر بڑی خوشی ہوئی۔" فوسٹر خوشی سے چیختے ہوئے اپنی کرسی پر اُچھل پڑا اور فن وک کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں بے انتہا خوش ہوں، میرے بزرگ، میں اسے کیسے برداشت

کرسکتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست نہ رہیں؟ ہم تو کتنے طویل عرصہ سے ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔"

بخدا۔ فن وِک اُس سے کس قدر نفرت کر رہا تھا

"کس قدر دلچسپ کتابوں کا ذخیرہ ہے تمہارے پاس" فوسٹر نے مڑتے ہوئے فن وِک کی طرف استعجاب اور تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا: "ہر کتاب دلکش معلوم ہوتی ہے۔ میں تو تمہارے ترتیب کے انداز کی بھی داد دیتا ہوں۔ اور یہ کھلی ہوئی کتاب گیر —— مجھے تو بڑی حقارت محسوس ہوتی ہے۔ کتابوں کو شیشوں کے پیچھے بند کرتے ہوئے!"

فوسٹر سامنے آگیا اور اپنے میزبان کے بالکل قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ کسی قدر آگے جھک گیا اور میزبان کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھدیا۔

"دیکھو! میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ لیکن میں بات پکی کرلینا چاہتا ہوں کیا ہمارے درمیان کوئی بدگمانی ہے؟ میرے بزرگ بتاؤ کیا ہے کوئی بدگمانی؟ میں جانتا ہوں کہ تم نے گزشتہ رات مجھے اطمینان دلایا تھا، لیکن میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ . . . . "

فن وِک نے اُس کی طرف دیکھا اور اُسے گھورتے ہوئے اچانک بڑی لطیف سی نفرت انگیز مسرت محسوس کی۔ اُس نے اُس شخص کے مس کو اپنے گھٹنے پر پسند کیا۔ وہ خود بھی قدرے آگے جھک گیا۔ اور سوچنے لگا، کتنا دل خوش کن ہوگا یہ، کہ وہ فوسٹر کی آنکھوں کو اُس کے اندر دھنسا دے، اُنہیں چُرمُرا دے، پاش پاش کردے کہ وہ اور پھٹ جائیں، اُن کے گڑھوں کو خون آلود اور خالی چھوڑ دے۔

اُس نے کہا۔

"کیوں، نہیں! بالکل نہیں۔ میں نے تم سے گذشتہ رات ہی کہا تھا۔ آخر بدگمانی ہو بھی کیا سکتی ہے؟"

اُس ہاتھ نے گھٹنے کو کسی قدر اور مضبوطی سے تھام لیا۔

"میں بے انتہا خوش ہوں۔ یہ بڑا ہی فرحت بخش ہے، فرحت بخش! مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے احمق تصور نہ کروگے، لیکن میرے دل میں تمہارے لئے ہمیشہ سے خلوص رہا ہے جب سے کہ مجھے یاد پڑتا ہے میں ہمیشہ تم کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے ہمیشہ تمہاری صلاحیتوں پر رشک کیا ہے۔ تمہاری ناول —— وہ —— وہ —— وہ جو کہ ایلوا کے بارے میں تھی ——"

"تلخ ایلوا۔"

"ارے ہاں! - وہی وہی - وہ لاجواب کتاب تھی۔ قنوطی ہونے کے باوجود وہ بڑی عمدہ تھی۔ اُسے کسی قدر اور بلند ہونا چاہئے تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے میری اُس زمانہ میں یہی رائے تھی۔"

"ہاں، اُسے کسی قدر اور بلند ہونا چاہئے تھا۔"

"تمہارا زمانہ بھی آئے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اچھی کوششوں کا بدلہ دیر سے ہی ملتا ہے۔"

"ہاں - میرا زمانہ بھی آئے گا۔"

وہ باریک سیٹی کی سی آواز جاری رہی!

"اب مجھے میری استعداد سے زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ ہاں ایسا ہی ہے۔ تم انکار نہیں کرسکتے۔ میں جھوٹی شرم کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں نہ ہی میرے باطن میں بھی ہے۔ میرے اندر یقیناً کچھ صلاحیتیں ہیں لیکن اتنی نہیں جتنی کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ اور تم! تمہارے اندر تو اُس سے کہیں زیادہ صلاحیتیں ہیں جتنی وہ قیاس کرتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں میرے بزرگ! تم بیشک ایسے ہی ہو لیکن مجھے اُمید ہے تم معاف کروگے اگر میں کہوں کہ تم نے کوئی ترقی نہیں کی ہے جیسی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ یہاں محبوس ہو، ہر طرف پہاڑوں میں محصور ہو، مرطوب آب و ہوا میں —— جہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے —— کیوں رہ رہے ہو؟ تمام دُنیا سے بیگانہ ہو۔ انسانوں سے تمہارا ملنا جلنا نہیں، اُن سے بات چیت کرکے تم یہ تیر لگانے سے بھی تو قاصر ہو کہ دُنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ کیوں؟ ذرا میری طرف تو دیکھو"

فن وِک نے مڑکر اُس کی طرف دیکھا۔

"اب میں نصف سال لندن میں رہتا ہوں۔ وہاں تمام بہترین چیزیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ بہترین مباحثے، بہترین موسیقی، بہترین تماشے اور پھر میں تین مہینے کے لئے سمندر پار اٹلی یا یونان یا کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ باقی تین مہینے دیہات میں گزار دیتا ہوں۔ اب بتاؤ یہ کتنا عمدہ پروگرام ہے۔ تم بھی اسی طرح رہو۔"

اٹلی یا یونان یا کہیں اور!

فن وِک کے سینے کے اندر کسی چیز نے حرکت کی۔ گھرڑ گھرڑ گھرڑ کس قدر تمنا تھی اس کو، کتنی بیتاب خواہش تھی اس کو کہ وہ صرف ایک ہفتہ یونان میں اور دو دن سسلی میں گزار سکے، کبھی کبھی تو

سوچنے لگتا تھا کہ بس بھاگ ہی جائے وہاں، لیکن جب جیب میں پیسوں کا سوال آتا تھا تو . . . . اور کیسے یہ بیوقوف، یہ خر مغز، یہ بر خود غلط، مغرور، سر پرستی دکھا رہا ہے کہ . . .

وہ، باہر سنہری دھوپ کی طرف دیکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا،

"کیا خیال ہے تمہارا تفریح کے بارے میں؟" اس نے مشورتاً کہا "سورج ابھی ایک گھنٹہ تک اور نہ ڈوبے گا۔"

جیسے ہی اُس کے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ جیسے کسی اور ہی نے اُس سے کہلائے ہیں۔ اُس نے اپنے رخ کو تقریباً نصف، پیچھے کی طرف گھما کر بھی دیکھا کہ شاید وہاں کوئی اور موجود ہو۔ یہ احساس اُس کے اندر اُسوقت سے ہی بیدار ہو گیا تھا جبکہ فوسٹر وہاں آیا۔ تفریح؟ آخر کیوں وہ فوسٹر کو تفریح کے لئے لے جائے، کیوں اُسے اپنی محبوب سرزمین کی سیر کرائے، کیوں اُس کے خطوط، خم اور خلا دکھائے، کیوں ایلس واٹر کی سیمیائی سیر دکھائے، کیوں ارغوانی بادلوں کی طرح ڈھکی ہوئی پہاڑیاں دکھائے جیسے کسی آرام طلب، دیو کے گھٹنوں کے نیچے کمبل اُڑھا ہوا ہو؟ کیوں؟ جیسے اُس نے کسی اور کی طرف رخ کر کے مڑتے ہوئے کہا ہو "کیوں اس میں تمہارا کچھ درہم مندوسہ چھپا ہوا ہے۔"

وہ دونوں روانہ ہو گئے۔ راستہ یکایک جھیل پر ختم ہو گیا۔ اور پھر درختوں کے درمیان جھیل کے کنارے کنارے بڑھتا گیا۔ جھیل کی دوسری طرف چمکدار پیلی روشنی پیلاہٹ پر چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑیاں تاریک ہو رہی تھیں۔

فوسٹر جس انداز سے گفتگو کر رہا تھا اُس سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ احکامات صادر کر رہا ہو۔ وہ اُس سے کسی قدر آگے ہی آگے چل رہا تھا، اپنے لاغر اور لمبوترے جسم کو پُرشوق جھکولوں کے ساتھ آگے بڑھا رہا تھا، جیسے وہ جلدی میں ہو کہ کہیں کوئی ایسی چیز اُس سے چھوٹ کر نہ رہ جائے جو اُس کے لئے انتہائی فائدہ بخش ہے، اپنے کندھوں پر سے فن وک کی طرف یوں الفاظ پھینکا رہا تھا، جیسے وہ سارس کے سامنے چارہ پھینک رہا ہو۔

حقیقتاً مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اور کیسے نہ ہوتی؟ بہرحال یہ سب نیا انعام ہے۔ انہوں نے اسے ابھی دو ہی ایک سال سے بنا شروع کیا ہے، لیکن یہ ہے بڑا مسرت بخش ——— سچ بڑا ہی مسرت بخش! ——— کہ اس کے حصول کی کوشش کی جائے۔ جب میں نے لفافہ کھولا اور اس میں چیک دیکھا ——— تو، اگر تم چاہتے تو اُس وقت مجھے ایک پَر سے ہلاک کر دیتے! سچ مچ تم ایسا کر سکتے تھے۔ یقین مانو نناوے پونڈ تھے۔ کیا یہ بڑی رقم نہیں؟ لیکن یہ اعزاز بھی تھا۔"

فوسٹر رک گیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"کون سی؟"

"تم ہنسے تھے۔"

"کسی بات نے ہنسا ہی دیا۔"

فوسٹر نے اپنا ہاتھ فن وک کے ہاتھ میں ڈالدیا۔

کتنا پسندیدہ ہے یہ کہ ہم دوستوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی کریں۔ میں ذرا وہمی قسم کا آدمی ہوں۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ زندگی بے انتہا مختصر ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم دوسروں کے ساتھ میل محبت کے ساتھ رہیں چاہے وہ کوئی ہو۔ تم بیحد الگ تھلگ رہتے ہو میرے بزرگ"۔ اُس نے فن وک کے ہاتھ کو دبایا۔ "تمہارے اندر یہی خرابی ہے۔"

یہ اذیت تھی، شدید آسمانی اذیت! اُس دُبلے ہڈیوں کے ڈھانچے سے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں محسوس کرنا کتنا فرحت بخش تھا۔ وہ تقریباً اُس کے دل کی حرکت کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اُس ہاتھ کو محسوس کرنا کتنا فرحت بخش تھا۔ جو اُس کے اندر لالچ پیدا کر رہا تھا کہ اُسے موڑ دے، اینٹھ دے اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنے، تڑ ... تڑ ... تڑ . اس لالچ کو اپنے اندر پرورش دیتے ہوئے وہ کتنی مسرت محسوس کر رہا تھا، جیسے اُس کے اندر پانی کھول رہا ہو لیکن پھر بھی وہ اس لالچ پر عمل کرنے سے قاصر تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے فوسٹر کے ہاتھ کو مَس کیا، پھر الگ ہٹ گیا

ہم گاؤں تک آپہنچے ہیں۔ یہی وہ ہوٹل ہے جہاں گرمیوں میں لوگ آتے ہیں یہاں سے ہم داہنی طرف مڑیں گے۔ چلو میں تم کو اپنا قرار دکھاؤں گا۔"

"تمہارا قرار؟" فوسٹر نے سوال کیا۔ "میں اپنی لاعلمی کی معافی

چاہتا ہوں، لیکن مجھے بتاؤ یہ قرار کیا ہوتا ہے؟"

"قرار ایک طرح کا چھوٹا چشمہ ہوتا ہے۔ پانی کی ایک مختصر جھیل پہاڑوں کی وادیوں کی گود میں! بیحد پُرسکون، حسین، خاموش، ان میں سے کچھ تو اتھاہ گہرے ہوتے ہیں۔"

"میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہیں، راستہ ناہموار ہے تمہیں تکلیف تو نہ ہوگی؟"

"نہیں ذرا بھی نہیں میرے پیر کافی لمبے ہیں۔"

"اُن میں سے کچھ اتھاہ گہرے ہیں — بے انتہا عمیق — کسی نے اُن کی تہہ کو نہیں چھوا ہے — لیکن ہیں بالکل پُرسکون، شیشہ کی طرح، اُن پر صرف سائے ہی پڑتے ہیں —"

"تمہیں معلوم ہے فن وِک؟ میں پانی سے ہمیشہ خوف کھاتا رہا ہوں — میں نے کبھی تیرنا نہیں سیکھا۔ میں اپنے قد سے زیادہ گہرائی میں نہیں گیا ہوں۔ کتنا عجیب ہے یہ؟ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عرصہ ہوا جب میں مدرسہ میں پڑھتا تھا اور بچہ ہی تھا؛ چند بڑے ساتھیوں نے مجھے پکڑ کر سر کے بل پانی میں ڈبو دیا، انہوں نے مجھے غرق ہی کر دیا تھا، سچ مچ! وہ مذاق کی حد سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ مجھے ابھی تک ان کے چہرے یاد ہیں۔"

فن وِک نے غور کیا۔ اُس کے ذہن میں تصویر کھنچ گئی وہ لڑکوں کو دیکھ سکتا تھا — لمبے تڑنگے، توانا و تندرست — اور یہ مینڈک کا سا بڈھی اور چیڑا۔ اُن کے مضبوط ہاتھ، اس کی گردن کے گرد، اس کے سرکنڈوں کے سے پیر پانی کے باہر ٹھوکریں سی مارتے ہوئے، اُن کے قہقہے، اور اچانک محسوس کرنا کہ بات بگڑ رہی ہے، لاغر جسم ایکدم نرم ہو کر بےحس . . .

اُس نے ایک گہری سانس لی۔

فوسٹر اس کے برابر ہی چل رہا تھا، آگے نہیں تھا، جیسے وہ کسی قدر خوفزدہ ہو اور تحفظ کا خواہشمند ہو۔ درحقیقت منظر ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ اُن کے آگے اور پیچھے عمودی پہاڑی راستہ پتھروں اور روڑوں سے بھرا ہوا پھیلا تھا۔ اُن کے داہنی طرف پہاڑی کے دامن میں ایک گہرے نشیب پر چند کانیں تھیں، تقریباً سنسان، لیکن شام کی دھندلائی ہوئی روشنی میں اور بھی ویران دکھائی پڑتی تھیں۔

حالانکہ وہاں تھوڑا بہت کام ہو رہا تھا۔ پتلی پتلی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا اور چٹانوں کو کاٹنے والی مشینوں کی آواز آرہی تھی پانی کی ایک دھار بڑی خشمگیں سی ایک جھیل میں گر رہی تھی۔ اور ایک سیاہ سایہ پہاڑیوں کے مقابل میں سوالیہ نشان بنا رہا تھا۔

اب ڈھلان کافی عمودی ہو گئی تھی، اور فوسٹر نے گہری سانس لے کر چھوڑی۔

فن وِک اُس کی اس حرکت پر اور بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ اتنا دُبلا پتلا ہوتے ہوئے بھی یہ اپنے آپکو قابو میں نہیں رکھ سکتا ہے۔ کانیں پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ بہتے ہوئے پانی کی دھار کے کنارے، جو کبھی کاہی اور سفید یا بھوری ہو جاتی تھی، پہاڑیوں کی طرف بڑھتے رہے۔

اب اُن کا رُخ ہلولین کی طرف تھا۔ وہ دریا پہاڑیوں کے پیالے کے گرد چکر لگاتا ہوا داہنی طرف مُڑ گیا تھا۔

"وہ رہا قرار!" فن وِک نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سورج اتنے عرصہ نہ رہے گا جتنی ہمیں اُمید تھی۔ اندھیرا ابھی سے بڑھ رہا ہے۔"

فوسٹر نے ٹھوکر کھائی، اور فن وِک کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اِس دُھندلکے نے تو پہاڑیوں کو بھیانک بنا دیا ہے۔ جیسے یہ زندہ انسان ہوں۔ مجھے راستہ بڑی مشکل سے نظر آرہا ہے۔"

"ہم یہاں بالکل اکیلے ہیں"۔ فن وِک نے کہا۔ "کیا تم سکوت کو محسوس نہیں کر رہے ہو؟ لوگ اب کانوں کو چھوڑ کر گھر جا چکے ہوں گے۔ اب یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر تم غور کرو تو بڑی عجیب سبز روشنی پہاڑیوں پر پھیلتی ہوئی دیکھو گے۔ یہ صرف لمحہ بھر رہے گی اور پھر تاریکی چھا جائے گی۔"

"آہ یہ ہے میرا قرار۔ فوسٹر! تم جانتے ہو میں اس جگہ سے کسقدر محبت کرتا ہوں؟ میں اسے بالکل اُسی طرح اپنی ملکیت سمجھتا ہوں۔ جس طرح تم اپنی تخلیقات، تمام مسرتوں، شہرت اور کامیابی کو سمجھتے ہو۔ میرے پاس یہ ہے اور تمہارے پاس وہ سب کچھ۔ شاید بالآخر ہم دونوں برابر ہیں۔ ہاں . . .

"لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں اس پانی کے ٹکڑے کا ہوں اور یہ میرا اور ہم دونوں کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ ہاں کیا یہ تاریک نہیں ہے؟

"یہ گہرے قراروں میں سے ایک ہے۔ کسی نے بھی آج تک اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے صرف ہلولین اس سے آگاہ ہے۔ اور میں قیاس کرتا ہوں کہ ایک دن یہ مجھے بھی اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ اور مجھے سرگوشیوں

میں اپنے راز بتا دے گا ـــــ"

فوسٹر کو چھینک آ گئی۔

"بہترین۔ بے حد خوبصورت ہے" فن وِک ۔۔۔ بہت دلکش! اور اب ہم کو لوٹ چلنا چاہیے۔ کالوں کے درمیان چلنا بڑا مشکل ہے جسکی بھی کافی بڑھ گئی ہے۔"

"وہ چھوٹا سا محراب دار ستون دیکھ رہے ہو تم؟" فن وِک نے فوسٹر کا ہاتھ پکڑ کر رہنمائی کی "یہ کسی نے اُسے پانی کے اندر تعمیر کرایا ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے اُس کے پاس کشتی ہوگی۔ آؤ ذرا نیچے جھانکو۔ اس چھوٹے سے محراب دار ستونوں کے قریب کتنی گہرائی محسوس ہوتی ہے اور پہاڑ بھی سمٹ آئے ہیں۔"

فن وِک، فوسٹر کو ہاتھ سے تھام کر محراب دار ستونوں کے قریب لے گیا۔ درحقیقت وہاں پانی کافی گہرا نظر آ رہا تھا۔ گہرا اور سیاہ! فوسٹر نے نیچے جھانکا پھر اوپر پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ بالکل جیسے وہ سب قریب سمٹ آئی تھیں۔ اُسکو پھر چھینک آئی۔

"مجھے خطرہ ہے، زکام ہو گیا ہے مجھے! ہم کو گھر واپس چلنا چاہیے فن وِک۔ ورنہ ہمیں راستہ بھی نہ ملے گا۔"

"گھر ہی سہی پھر!" فن وِک نے کہا، اور اس کے ہاتھ لاغر دُبلا ہوا گردن کے گرد جکڑنے لگے۔ ایک لمحہ کے لئے سر نصف مڑ گیا، اور دو خوف زدہ حیرت زدہ آنکھیں تکنے لگیں۔ پھر ایک دھکے کے ساتھ مسخر انگیز آسان ہو گئی، جسم آگے دھکا دیا گیا، اور ایک تیز چیخ پیدا ہوئی، پھر پانی کا چھپاکا ہوا، اور کسی سفید چیز بڑھتے ہوئے دھندلکے میں اُتھل پتھل کرنا شروع کیا۔ کئی بار ایسا ہی ہوا پھر دور تک بلبلے پھیل گئے اور خاموشی چھا گئی۔

خاموشی بڑھنے لگی۔ قرار کو اُس نے آغوش میں چھپا لیا۔ اور جیسے ساکت پہاڑیوں کے لبوں پر اُس نے انگلی رکھ دی۔ فن وِک خاموشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ سکون حاصل کر رہا تھا۔ اُس نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ وہ وہاں کھڑا ہوا قرار کے سیاہی مائل پانی کو گھورتا رہا۔ وہ اپنے ہاتھ باندھے ہوئے تھا جیسے کسی گہری سوچ میں پڑ گیا ہو۔ لیکن وہ سوچ نہیں رہا تھا۔ وہ صرف ایک فرحت بخش چٹکارے، ایک لطیف احساس سے محظوظ ہو رہا تھا جس کے بارے میں پہلے اُس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ فوسٹر جا چکا تھا ـــــ وہ عذابِ جان، فضول گو، خود میں،

پر خود غلط احمق! جا چکا تھا کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ قرار اُسے یقین دلا رہا تھا۔ وہ فن وِک کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جیسے وہ تابندہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہو۔ "تم نے بڑی عمدگی کے ساتھ کر ڈالا ـــ ایک ضروری جابکدستی کا کام۔ ہم دونوں ہی نے کیا ہے، میں نے اور تم نے۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔"

وہ اپنے آپ پر فخر کر رہا تھا آخر کار اُس نے اپنی زندگی کے لئے ایک واضح اقدام کیا تھا۔ خیالات، پُر شوق خیالات کا اب اس کے ذہن میں سیلاب آ گیا تھا۔ اتنے سالوں تک وہ اس جگہ پڑا رہا۔ اپنی رنجش اور کمزوری کو بغیر بڑھے کے بدن کی طرح پرورش کرتے ہوئے ــــ اور بالآخر عمل کا موقع مل گیا۔ اس نے خود کو حرکت دی۔ اور پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ اُسے فخر تھا ـــ اور وہ یخ بستہ تھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے۔ ہاں، وہ دھندلی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی، جو تاریکی پھیلنے سے پہلے چند لمحوں تک پہاڑیوں کے سائے سے اُلجھی رہتی تھی۔ دیر کافی ہو رہی تھی، اُسے لوٹنا چاہیے۔

راستے پر چلتے ہوئے وہ اسقدر کانپ رہا تھا کہ اُس کے دانت بجنے لگے۔ اور پھر جیسے اُسے احساس ہوا وہ قرار کو چھوڑنا نہیں چاہتا ہے۔ قرار سے اُسکو اُنس ہو گیا ـــ ساری دُنیا میں وہی ایک اُس کا رفیق تھا۔ جیسے ہی اُس نے راستہ میں ٹھوکر کھائی تنہائی کا یہ احساس اور بھی بڑھ گیا۔ وہ گھر جا رہا تھا، ایک خالی مکان میں! گذشتہ رات اُس میں ایک مہمان تھا۔ کون تھا وہ؟ کیوں فوسٹر، حقیقتاً ـــ فوسٹر اپنے احمقانہ قہقہوں اور اوسط درجہ کی پسندیدہ آنکھوں کے ساتھ۔ اب فوسٹر وہاں نہ ہوگا۔ نہیں، وہ اب وہاں کبھی بھی نہ ہوگا۔

اور اچانک فن وِک نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اُسے کیا معلوم تھا کیوں؟ علاوہ اسکے کہ اب وہ قرار چھوڑ چکا تھا، وہ اکیلا تھا۔ اُس نے خواہش کی کاش وہ وہاں رات بھر ٹھہر سکا ہوتا لیکن سردی ہو رہی تھی، اس لئے وہ نہیں ٹھہر سکتا تھا، اور اس لئے وہ اب دوڑ رہا تھا تاکہ وہ جلد ہی مانوس روشنی اور فرنیچر والے مکان میں پہونچ جائے ـــ اور وہ تمام چیزیں جنہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا اُس کو سہارا دیں۔

اُس کے دوڑنے سے روڑے اور پتھر اُس کے قدموں کے پیچھے بکھرنے لگے۔ اور اس کے پیچھے چھر چھر کی آواز پیدا کرنے لگے جیسے کوئی اور بھی اسکے پیچھے دوڑ رہا ہو۔ وہ رُک گیا ہوا اور دوسرا دوڑنے والا بھی رک گیا۔

اُس نے سکوت میں سانس لی۔ اس کے بدن میں اب کافی گرمی آگئی تھی۔ اُسکے رخساروں پر پسینہ کی دھاریاں بہنے لگی تھیں۔ اور ایک دھار ٹھوڑی سے بہہ کر قمیص کے اندر جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے گھٹنے لرز رہے تھے۔ اُسکا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف پہاڑیاں عجیب سکوت میں غرق تھیں، بادل اب دبیز ہو کے ایسے غلاف بن گئے تھے جن کو پہنا اور اُتارا جا سکتا ہو۔ اور وہ گہرے ارغوانی رنگ کے غلاف آسمان پر تیر رہے تھے اور ستارے سمندر میں تیرتی ہوئی کشتی کی جھلملاتی ہوئی آنکھوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔

اُس کے گھٹنے کسی قدر سنبھلے، اس کے دل کی دھڑکن میں کمی ہوئی، اور اُس نے دوبارہ دوڑنا شروع کر دیا، اچانک وہ ملڈ پر مڑا اور ہوٹل کے سامنے آگیا۔ ہوٹل کے چراغ روشن تھے اور اس کی ڈھارس بندھ رہے تھے۔ اب وہ جھیل کے کنارے راستہ پر آہستگی کے ساتھ چلنے لگا۔ اور اگر کوئی اسکا پیچھا نہ کر رہا ہوتا تو اُسے کافی اطمینان و سکون نصیب ہو جاتا۔ وہ دو ایک بار رُکا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور ایک بار اُس نے للکارا "ابھی کون ہے؟" مگر صرف پیڑوں کی سرسراہٹ ہی نے جواب دیا۔

اُس نے بڑی عجیب تدبیر نکالی تھی لیکن اُسکے ذہن میں اس شدت کے ساتھ خلش ہو رہی تھی کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کیا یہ قرار ہے جو اسکا پیچھا کر رہا ہے؟ قرار پھسلتا، سرکتا ہوا سڑک کے کنارے کنارے آرہا تھا تاکہ وہ تنہا نہ رہے۔ وہ قرار کو اپنے کان میں تقریباً سرگوشی کرتے ہوئے سن سکتا تھا۔ "ہم دونوں نے مل کر کیا ہے" اور اس لئے میں نہیں چاہتا کہ ذمہ داری کا سارا بوجھ اکیلے تم ہی پر پڑے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا تاکہ تم اکیلے نہ رہو۔"

وہ پہاڑی راستے سے گھر کی طرف اتر آیا۔ وہاں سے گھر کی روشنی نظر آرہی تھی۔ اُس نے اپنے پیچھے پھاٹک کی کھٹکھٹاہٹ سُنی جیسے وہ اسکو اندر قید کر رہا ہو۔ وہ بیٹھک میں چلا گیا جو روشنی سے منور ہو چکی تھی وہاں وہ سب کتابیں موجود تھیں جن کی فوسٹر نے تعریف کی تھی۔

بوڑھی عورت جو اس کی دیکھ بھال کرتی تھی نمودار ہوئی

"جناب کیا آپ چائے پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ ایمی۔"

"کیا دوسرے صاحب کو چاہیئے؟"

"نہیں، وہ صاحب رات کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

" ... کا کھانا۔ ملک ہی کے لئے چاہیئے؟"

" ... کے لئے چاہیئے۔"

وہ صوفے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور فوراً ہی گہری غنودگی میں ڈوب گیا۔

وہ اُس وقت سدار ہوا جب بوڑھی خادمہ نے اُس کے کندھے کو ہلایا اور کہا کہ رات کا کھانا تیار ہو گیا ہے۔ دو جھلملاتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی کے علاوہ کمرے میں بہت تاریکی تھی۔ وہ دو سُرخ موم بتیاں — جو اُس دیوارگیر پر رکھی ہوئی تھیں وہ اُن سے کتنی نفرت کرتا تھا۔ اُس نے ہمیشہ اُن سے نفرت کی تھی۔ اور اب وہ ایسی نظر آرہی تھیں جیسے اُن میں فوسٹر کی صفات ہوں — وہی باریک سیٹی کی سی تیز آواز۔

اُسے ہر لحظہ یہ خطرہ ہو رہا تھا کہ فوسٹر اب کمرے میں داخل ہوا کہ اب ہوا، حالانکہ وہ جانتا تھا وہ نہیں آئیگا۔ وہ مسلسل دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا رہا لیکن اس طرف اندھیرا تھا کہ کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ سارے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا علاوہ اُس دیوارگیر کے جہاں دو موم بتیاں فریاد آسا روشنی کے ساتھ رو رہی تھیں۔

وہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا اور کھانے بیٹھ گیا۔ لیکن اُس سے کچھ کھایا ہی نہیں جا رہا تھا میز کے کنارے جہاں فوسٹر کی کُرسی ہونی چاہیئے تھی بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ عجیب سا، خالی خالی، تنہائی کا احساس دلاتا ہوا۔

وہ ایک بار میز سے اُٹھ گیا اور کھڑکی تک گیا اور اُسے کھول کر باہر جھانکا۔ اُس نے کوئی آواز سُنی، خاموشی کے درمیان بہتے ہوئے پانی کی کھل کھل، گھل گھل جیسے کوئی تالاب لبالب بھرا جا رہا ہو۔ پیڑوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ ایک اُلو کھانک آواز میں چیخ۔ اچانک جیسے کسی نے اُس کے شانوں کے پیچھے سے اُس سے کچھ کہا۔ اُس نے کھڑکی بند کر دی اور اپنی گھنی بھوؤں کے درمیان کمرے میں گھورا بالآخر بستر پر سونے پہونچ گیا۔

کیا وہ سو رہا تھا یا لیٹے سدھ او گھتے ہوئے خالی دماغ لیٹا ہوا تھا؟ وہ پوری طرح جاگ رہا تھا، بالکل بیدار تھا اور اُس کا دل توہمات سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُس کو نام لیکر پکارا ہے

وہ ہمیشہ کھڑکی کو کسی قدر کھول کر اور پردے کو لپیٹ کر سویا کرتا تھا۔

اُس رات چاند کی روشنی بڑی بیمار سی کمرے کی چیزوں پر پڑ رہی تھی۔ نہ وہ روشنی کا سیلاب تھا اور نہ روشنی کی ایسی پھوار تھی کہ کہیں کسی دائرہ کو کسی مربع کو سیمابی بنا دے اور باقی اشیاء کو آبنوسی اندھیرے میں چھوڑ دے۔ روشنی کسی قدر مدھم تھی، سرمئی مائل، شاید اُس روشنی کی طرح جو پہاڑیوں پر اندھیرا چھانے سے نمودار ہوتی ہے۔

وہ کھڑکی کی طرف گھورنے لگا۔ اُسے ایسا نظر آ رہا تھا کہ جیسے وہاں کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔ کالی کھودی روشنی میں یا اُس سے باہر جیسے کوئی چاندی کے رنگ کی چیز چمک رہی تھی۔ فن وِک گھورنے لگا۔ وہ بالکل بہتے ہوئے پانی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

بہتا ہوا پانی ——— اور وہ اپنے سر کو اُٹھائے ہوئے سُن رہا تھا، جیسے کھڑکی کے اُس پار سے وہ پانی کے گرنے کی آواز سُن رہا تھا، جو بہہ نہ رہا ہو بلکہ انڈیلا جا رہا ہو۔ بھر رہا ہو، بھر رہا ہو، سر سر غور کرتا ہوا جیسے اب وہ لبالب بھر جائے گا، اب بھر جائے گا۔

وہ بستر میں کچھ اوپر اُٹھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اُس نے دیکھا کہ دیواری کاغذ اور کھڑکی کے درمیان سے پانی رس رہا تھا۔ وہ اُسے چوکھٹ کی اُبھری ہوئی لکڑی تک کروٹ لیکر بھرتے ہوئے، پھر رکتے ہوئے، پھر بھرتے ہوئے، بہتے ہوئے اور کروٹ لیتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اور عجیب چیز تو یہ تھی کہ وہ بغیر کسی آواز کے گر رہا تھا۔

کھڑکی کے اُس پار تو اُس کی غڑ غڑ سنائی دیتی تھی، لیکن کمرے میں کامل سکوت تھا۔ کہاں سے آ رہا ہے یہ؟ اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر پانی کی روپہلی دھار کو اُبھرتے، سمٹتے اور بہتے ہوئے دیکھ ... اُسے کھڑکی بند کر دی جانی چاہئے۔ اُس نے اپنے پیر چادر اور کمبل سے باہر نکال لئے اور نیچے دیکھا۔

اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ فرش پانی کی چمکدار سطح سے لبریز تھا، اور وہ سطح اونچی اُٹھ رہی تھی۔ اور اُس کے دیکھتے دیکھتے چارپائی کے آدھے پائے ڈوب گئے۔ وہ بغیر کسی لہر، بغیر کسی حرکت، بغیر کسی بلبلے کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اب وہ چوکھٹ سے اوپر بہہ رہا تھا، لیکن بے آواز!

فن وِک بستر میں سمٹ کر بیٹھ گیا، کپڑے اُس کی ٹھوڑی تک لپٹ گئے ——— اُس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ اُس کا گلا رندھ گیا جیسے اُس کے حلق میں کوئی ڈھکن لگ گیا ہو۔

لیکن اُسے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ اُسے اِسکو روکنا چاہئے۔ پانی اب کرسیوں کے آسن تک چڑھ آیا تھا؛ لیکن پھر بھی بے آواز تھا۔ کیا وہ دروازے تک پہنچ سکے گا؟

اُس نے اپنے ننگے پیر نیچے رکھے اور پھر چیخ اُٹھا۔ پانی برف کی طرح سرد تھا۔ یکایک جھکتے ہوئے وہ اُس کی تاریک چمکیلی اور یکساں سطح کو دیکھنے لگا۔ جیسے کسی نے اُسے آگے دھکا دیدیا۔ اُس کا چہرہ اُس کا سر برف کی طرح سرد سیال کے نیچے تھا۔ وہ چپچپا سا لگ رہا تھا، وہ سرد برفانی سیال پگھلے ہوئے موم کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے پیر پھینکنا شروع کئے پانی اُس کے سینے تک آگیا تھا۔ وہ بار بار چیخا۔ وہ صرف آئینہ، کتابوں کی قطار، ڈوئرر کے گھوڑے کی تصویر ہی دیکھ سکتا تھا۔ جو اس کی پہونچ سے باہر تھے۔ اُس نے پانی پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ اور جیسے اُس کے چھلکے سے مچھلی کے سفنوں کی طرح اُس کے چہرے پر چپکنے لگے، چپچپے سے! وہ اُسکے درمیاں اپنا راستہ بنانے کی جدوجہد کرتا رہا۔

پانی اب اُس کی گردن تک چڑھ آیا تھا۔ پھر کسی چیز نے اُسے نیچے سے پکڑ لیا۔ کسی چیز نے اُسے تھام لیا، وہ جدوجہد کرتا رہا اور چیختا رہا "مجھے جانے دو، مجھے جانے دو، میں تم سے کہتا ہوں مجھے جانے دو۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میں تمہارے پاس نہ آؤں گا۔ نہ آؤں گا———"

پانی نے اُس کے منہ کو ڈھانپ لیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُسکے دیدوں میں کسی نے انگلی ٹھونک دی ہو۔ ایک ننگے ہاتھ نے بڑھ کر اُس کی ران کو پکڑ لیا۔

صبح کے وقت غریب خادمہ نے دروازہ پر دستک دی۔ جواب نہ ملنے پر وہ حمام بنانے کیلئے پانی لے کر اندر داخل ہو گئی جیسا کہ اُس کا طریقہ تھا۔ اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ مالی کو بلانے دوڑ گئی۔

اُنہوں نے اُسکی لاش کو اُٹھا کر بستر پر رکھ دیا۔ جس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور بھینچے ہوئے دانتوں کے درمیان زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔

اس تمام ہنگامہ کا باعث صرف ایک اُلٹا ہوا پانی کا جگ تھا۔ پانی ایک چھوٹے سے دھبہ کی شکل میں دری پر جمع ہو گیا تھا۔

اسعد گیلانی

ماموں حسین علی

بس چھوٹ جانے میں چند منٹ باقی تھے۔ جب وہ بھاگم بھاگ اڈے پر پہنچے۔ ماموں اور بھانجا ---!

لیکن وہ اصلی ماموں بھانجا نہ تھے بلکہ سوتیلے تھے۔ سعید کے والد نے بہت دن تک گھر کے اُجڑنے کا رونا روتے روتے تنگ کر حال ہی میں دوسری شادی کی تھی اور حسین علی سعید کا سوتیلا ماموں تھا۔ حسین علی کی بڑی بہن۔ یعنی نئی خاتون جو خود بیوگی کا ایک سال گزار کر سعید کے باپ کے گھر میں دوسری بیوی بن کر آئی تھی۔ سعید سے زیادہ مانوس نہ تھی اسلئے کہ چھوٹے بچوں کی موجودگی میں نئی امّی لانے کے لئے ماسٹر صاحب کے پاس جو بہت سے شرعی۔ اخلاقی اور معاشرتی جواز مرتب شدہ موجود تھے ان میں سعید کا اصرار بھی تھا۔ جب سے نئی امّی کو سعید کی یہ کوالیفکیشن معلوم ہوئی تھی اس نے سعید کے ساتھ خصوصی رعایات برتنا شروع کر دی تھیں۔ وہ ذہین مانا جانے لگا تھا اس سے آئندہ بڑی بڑی توقعات وابستہ ہو گئی تھیں اور اس بڑا کے پات چکنے چکنے نظر آنے لگے تھے۔

اس لئے ماموں حسین علی جب شہر سے دُور گاؤں میں اپنی بہن سے اس کے نئے گھر میں ملاقات کے بعد واپس جا رہے تھے تو اُنہوں نے سعید کو بھی اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔

"سعید کی نانی اسے بہت یاد کر رہی تھی۔" اُنہوں نے کہا

چھوٹے سے گاؤں کا دیہاتی لڑکا جو بمشکل گیارہ برس کا تھا اپنے گاؤں سے باہر دور ایک شہر میں جانے کے تصوّر سے عجیب قسم کی تصوّری لذت محسوس کرنے لگا تھا۔ وہاں قسم قسم کی دوکانیں ہونگی اور گاڑیاں ہوں گی۔ نئی امی کے پُرانے گھر کو دیکھنے کا اشتیاق اسے بہت تھا۔ وہاں کی باتیں سُنتے سُنتے اس کا شوق اب اضطراب میں تبدیل ہوا جا رہا تھا۔

"وہاں تمہارے ماموں تمہیں دودھ میں ڈبل روٹی بھگو کر کھلائیں گے جو دودھ میں بالکل بالائی اور مکھن کی طرح ہو جاتی ہے۔" اس کی امی نے کہا۔

"اور پھر ٹاکی بھی تو دکھاؤں گا۔" ماموں نے مزید کہا۔

"ماموں جان ٹاکی کیا ہوتی ہے؟" سعید نے حیرت سے کہا

"ایک مکان میں پردے پر بڑی بڑی تصویریں آکر بولتی گاتی باتیں کرتی اور ناچتی ہیں۔" اسکے ماموں نے کہا۔

سعید کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ اسکی کتابوں میں کئی ایک تصویریں تھیں لیکن انمیں سے کوئی تصویر بھی نہ بولتی تھی نہ گاتی تھی اور نہ ناچتی تھی۔ آخر وہ تصویر ہی کیا ہوئی جو بولنے بھی لگے اسکا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ اس کے ذہن سے یہ بات بالکل ہی نکل گئی کہ ماموں نے بتایا تھا کہ وہاں جانے کے لئے انہیں علی الصبح سورج نکلنے سے بہت قبل روانہ ہونا پڑیگا۔ اور دوپہر تک دس میل پیدل چل کر کھڑیال کے مقام سے لاری ملے گی جو ۱۲ بجے وہاں سے روانہ ہوتی تھی۔ اس پر ایک روپیہ ماموں جان کا اور آٹھ آنے سعید کا کرایہ دے کر سرائے عالمگیر کے راستے جہلم کا پُل پار کرتے ہوئے انہیں چکوال کے اڈے پر عصر کے وقت جا کر اُترنا تھا۔ پھر وہاں سے تین میل پیدل چلکر انہیں جو تک جانا تھا جو شہر جہلم کے نواح میں ایک بستی تھی لیکن اسے بس جہلم کا ہی ایک حصّہ کہا جاتا تھا۔ اس بہت کے وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ماموں خالص شہری تھا اور بھانجا بالکل دیہاتی۔

ماسٹر صاحب سے اجازت باقی تھی۔

اسی شام نئی امّی نے جب حسین علی کی دوسرے دن واپسی کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی سعید کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

"سعید کی نانی اسے بہت یاد کر رہی تھی۔" حسین علی نے اپنی ٹھوس دلیل دُہرا دی۔

"اب تو لڑکے کا امتحان بھی ختم ہو گیا ہے۔ ذرا تفریح ہو جائیگی۔"

امی نے مزید کہا۔

"مجھے تو اعتراض نہیں۔ چلا جائے۔" ماسٹر صاحب نے ذرا بے دلی سے کہا۔ وہ سعید کا کچھ ضرورت سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اتنا کہ سعید کو اسکے ننہال سے کچھ الگ رکھنے کا جذبہ انکے تحت الشعور میں ضرور کہیں موجود تھا۔

بس سعید کے دل میں تو خوشی سے لڈو پھوٹ گئے۔ اسی وقت تیاریاں شروع ہو گئیں۔

دھوبی کا دُھلا ہوا پاجامہ اور قمیص جو اس کا بڑا بھائی کالج کی چھٹیوں میں تنگ ہونے کی بنا پر دے گیا تھا اس کے پاس موجود تھے۔ دھوبی کا دُھلا ہوا کپڑا ایسا صاف تھا کہ نیا معلوم ہوتا تھا اور چمڑے کا نوکدار جوتا جسے خوشی سے لئے ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا۔ یہ پہن کر تو سعید کی عید اس روز ہو گئی۔ لیکن اس کی امی نے کہا۔

"یہ کپڑے ایک تولئے میں لپیٹ کر ساتھ لے لو۔ وہیں جا کر پہننا۔ راستے میں میلے ہو جائیں گے۔"

سعید پر اگرچہ کچھ اوس سی پڑ گئی لیکن بات سچ تھی اسلئے کہ میلے کپڑے پہن کر پہلی بار اپنی نئی ننہال جانا اسے بھی پسند نہ تھا۔

"دیکھو بیٹا اپنی دو تین کتابیں ساتھ لے جاؤ جہاں موقعہ ملے پڑھتے رہنا۔ تفریح بھی ہو گی اور تعلیم بھی۔"

سعید کے ابا نے روانہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تم اپنا کرایہ تو ساتھ لائے ہونا سعید۔" اچانک، چلتے چلتے ماموں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" سعید نے جھجک کر کہا۔ "اتا جی نے چلتے ہوئے اٹھ آنے صرف خرچ کے لئے دئے تھے۔"

اس نے مٹھی کھول کر دکھا دی۔ ایک سفید اٹھنی مٹھی میں چمک رہی تھی۔

"نہیں یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اسے محفوظ رکھو جیب میں ڈال لو۔" ماموں نے کہا۔

سعید کا دل ٹھک گیا۔ اس نے یہ اٹھنی خرچ کرنے کے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔

دس میل کا وہ سفر تو بڑا ہی دلچسپ رہا۔ ایک لمبے اور نہ ختم ہونے والے دیہاتی راستے کا کھیتوں۔ دیہاتی بستیوں، خشک ندی نالوں اور نغمہ الاپتے ہوئے رہٹوں کے قریب سے بل کھاتے ہوئے گزرتے چلے جانا ایک پیہم سفر، پیچھے کا گھر سب پیچھے اور آنے کی منزل کا دور ہی دور ہوتے چلے جانا ایک عجیب تجربہ تھا۔ روانہ ہوتے ہوئے وہ یوں صاف ستھرا تھا کہ جیسے گھر سے ایک قدم باہر نکلے گا تو دوسرا انہماک کی چوکھٹ پر ہو گا لیکن وہاں تو پہلے سر سے ٹوپی اتر کر پوٹلی میں آ گئی۔ پھر جوتا اتر کر ہاتھ میں پھر پوٹلی میں چلا گیا۔ پھر پاجامہ کھینچ کر ٹخنوں اور گھٹنوں تک آ گیا۔ لیکن سفر جاری رہا۔ سورج نکلنے سے بہت پہلے وہ روانہ ہوئے تھے لیکن اسکا کوئی آخری سرا نہ تھا۔ وہ افق جسے وہ زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلہ پر ختم دیکھتا تھا وہ اس کی رفتار سے اسکے آگے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ دائرہ اسکی رفتار پر۔ اسکی بے بسی پر۔ اسکی تکان پر اسکے اس نئے سفر کے عزم پر اور اس کی بھولی بھالی امیدوں اور آرزوؤں پر اسکے گرد رقص تضحیک کرتا رہا۔ گویا کہہ رہا تھا۔

"زندگی کے ننھے مسافر میری گرفت سے بچ کر کہاں جاؤ گے جہاں تم جاؤ گے وہیں تم میرے گھیرے میں رہو گے۔ مجھے تم پھلانگ نہیں سکتے۔ مجھے تم چھو نہیں سکتے تم عمر بھر چلو اور میں عمر بھر وسیع ہوتا اور تمہارے گرد رقص کرتا رہوں گا۔ تم یونہی میرے حلقے میں چلتے چلتے بڑھو گے۔ پھیلو پھولو گے اور پھر اسی راہ حیات میں کسی پوشیدہ مقام پر تمہارے لئے ایک گڑھا کھدا ہوا ہے جسمیں تم سما جاؤ گے۔ لیکن میری وسعت کو اپنے قدموں سے ناپ نہ سکو گے۔"

لیکن سعید تھا کہ حوادث زمانہ کی اس خاموش بولی سے بے نیاز ہر مسافر کی طرح بڑھے جا رہا تھا۔ آگے آگے حسین علی اور پیچھے پیچھے سعید۔ سورج ابھرا پھر گرم ہوا۔ پھر تپنے لگا۔ کبھی حسین علی اور وہ دوڑ لگاتے۔ کبھی ڈویت سے پھر آہستہ لئے سر راہ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنے ساتھ پوٹلی میں بندھا ہوا کھانا کھانے کے لئے طے کرتے اور جب وہ درخت قریب آ جاتا تو حسین علی اس سے اگلا درخت مقرر کر دیتا۔ کبھی دل ہی دل میں اپنے سے آگے جانیوالے راہیوں کے ساتھ مقابلہ طے ہو جاتا اور دونوں تیز رفتاری سے ان کے قریب سے گزر کر آگے نکل جاتے۔

جب سورج کافی گرم ہو گیا تو ایک رہٹ کے پاس نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ بیٹھے۔ بیل سعید کی طرح ایک نا ختم ہونے والی منزل کے لئے ایک گول دائرے میں گردش کر رہے تھے۔ رہٹ کی ٹنڈیں پانی سے

بھر کر آتی تھیں۔ اور ایک بڑے سے برنالے میں دامن جھاڑ کر خالی ہاتھ کنوئیں میں لوٹ جاتی تھیں جیسے انسان اپنی قسمت کے پیمانے میں انواع و اقسام کے اسباب زندگی لیکر آتا ہے اور پھر ایک دن دُنیا کی تر و تازگی اور ساز و سامان میں ایک رتی بھر کمی کئے بغیر دامن جھاڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ شلشلاتا ہوا پانی ٹین کی صاف ستھری نالی میں سے بہتا ہوا اولو میں گر رہا تھا۔ چمکتا۔ چھلکتا۔ لہریں لیتا۔ پھسلتا۔ خنک پانی جیسے پارہ بہ رہا تھا۔ نیم کی چھاؤں کے نیچے رہٹ کا اولو جہاں سورج کی بادشاہی کا اثر نہ تھا گویا اس صحرائے حرارت میں خنکی کا ایک نخلستان پڑا تھا جس میں شگفتگی اور تازگی جھلک رہی تھی۔ ہر جھونکا جو گرم زمین کی چھاتی پر سے تپتا۔ سر پٹختا اور بلبلاتا ہوا آتا وہ اس فضا میں پہنچتے ہی بادِ صبا کی رفتار اختیار کر لیتا۔

اُنہوں نے نہا [illegible] سعید نے عجیب محسوس کی اور حسین علی اچھی طرح جانتا تھا کہ لاری کی بے قاعدگی۔ بدانتظامی اور بے وقت روانگی پوری طرح قابل اعتماد تھی۔ وہ کسی طرح بھی دو بجے کی گاڑی سے آنے والی سواریاں لئے بغیر روانہ نہ ہوگی۔ کھڑیال سے چکوال کا اڈہ چند گھنٹے کا سفر تھا۔ وہ فٹ بورڈ بلکہ لاری کی چھت پر بھی بیٹھ کر جانے کی ہمت رکھتا تھا اور پنجاب کی قصباتی لاریوں میں اس کے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا۔ خصوصاً گجرات سے جہلم جانے والی لاری پر تو اس نے بارہا چھت پر بیٹھ کر سفر کیا تھا۔ ایک بار کا حادثہ تو اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا جب اس کی پگڑی ایک ببول کی ٹہنی سے اُلجھ کر اڑتی ہوئی مرغابی کی طرح ہوا میں معلق رہ گئی تھی۔ اس نے لاری رکوانے کے لئے کتنا شور مچایا تھا لیکن ڈرائیور نے لاری روکی نہیں تھی اور وہ سڑک کے کنارے ببول کے اونچے درخت کی شاخوں میں اپنی اُلجھی ہوئی پھڑپھڑاتی پگڑی سے لحظہ بہ لحظہ دور ہوتا چلا گیا تھا۔ آج تک اس پگڑی کا رنج اسکے سینے میں کسمساتا تھا۔ اس کا انتقام اس نے اس طرح لیا تھا کہ دولت نگر کے اڈے پر اُترتے ہوئے اس نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ لاری کے پھٹے ہوئے گدے میں مونج کے چھلکوں کے درمیان رکھ دیا تھا۔ اس خیال نے ایک انتقامی مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر پھیلا دی۔

"ان کی ایسی کی تیسی" حسین علی کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

سعید نے حیرت سے ماموں کی طرف دیکھا

"ماموں جان نے کیا کہا؟" سعید نے پوچھا۔

"چلو اُٹھو، نہائیں گے۔ ابھی بہت ٹیم ہے" حسین علی نے کہا اور تھوڑی دیر بعد اولو کا پانی پارے کے چھینٹوں کی طرح ان پر اُچھل رہا تھا۔

خوب دل بھر کر وہ نہائے۔ خنک پانی کا سرسراتے ہوئے نیچے سے گزرنا سعید کو بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ بارہا وہ اپنے گاؤں میں رہٹ کے اولوؤں میں نہایا تھا۔ چھینٹے اُڑائے تھے۔ سر جھکا جھکا کر نالی کے بہتے ہوئے پانی کو اپنے اوپر سے گزارا تھا۔ اولو میں لیٹ کر پانی کا سارا بہاؤ اپنے اوپر بہایا تھا۔ کھیت کی طرف جاتی ہوئی نالی بند کر کے اور اولو کی ریت نکال کر اسے چھوٹے سے حوض کی طرح بنا کر اس میں چھوٹی چھوٹی ڈبکیاں لگائی تھیں لیکن اس رہٹ کے اولو میں نہانے کا لطف کچھ اور ہی تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ پانی کے پہلے ہی ریلے میں اسکی ساری تکان اسکے جسم پر سے گرد کی طرح ڈھل گئی تھی اور وہ اس طرح ترو تازہ تھا جیسے روانگی کے وقت تھا۔ اسکی مرجھائی ہوئی مسرت عود کر آئی۔ سوئے ہوئے خواب بیدار ہو گئے اور تھکا ہوا ذہن بوسنگ کے بازار میں دودھ میں بالائی کی طرح نرم ڈبل روٹی اور ربڑی کے گرد گھومنے لگا۔

کچھ مویشیوں کو پانی پینے کے لئے کنوئیں کی طرف آتے دیکھ کر بادلِ ناخواستہ وہ اولو سے باہر نکلے اور جب سعید نے موٹے موٹے پراٹھے آم کے اچار کے ساتھ کھائے تو اسے محسوس ہوا کہ اتنا لذیذ کھانا اس سے پہلے اس نے کبھی نہ کھایا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد پھر وہ رُکے نہیں۔ چل پڑے۔ ترو تازہ اور میلوں چل لینے کے عزم کے ساتھ۔ لیکن اب وہ جلد ہی تھک گئے خصوصاً سعید تو پیچھے رہنے لگا۔ حسین علی نے اسے بتایا کہ اب کھڑیال قریب ہی تھا۔ ایک لمبی سیٹی کی آواز سنائی دی تو حسین علی نے کہا کہ یہ گاڑی کی وسل تھی۔ دور درختوں کے اوپر دھوئیں کی ایک دُھندلی سی نیلی لکیر اُٹھتی نظر آئی تو اس نے بتایا کہ یہ انجن کا دُھواں تھا اور اب کھڑیال نزدیک آگیا تھا۔ بس سامنے کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ایک گاڈر پنڈی تھا جس سے ذرا گزر کر ایک خشک نالہ تھا۔ اس سے آگے اینٹوں کا ایک بھٹہ تھا جو کھڑیال کے ایک خوجے کا تھا۔ اس سے آگے سنگتروں کا ایک باغ تھا۔ باغ سے پرلی طرف ایک مدرسہ تھا۔ اس سے ہٹ کر ایک خانقاہ تھی اور خانقاہ سے آگے صرف آدھ کوس

پر گھڑیال تھا۔ حسین علی نے اسے بتایا کہ انہیں بازار میں سے گزرنا ہوگا۔ اور وہ اسے ریوڑیاں لیکر دے گا۔ اس خیال نے سعید کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ راستے میں خربوزوں کا ایک کھیت آیا جو راستے کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلا گیا تھا۔ حسین علی کی رفتار کم ہوگئی وہ آہستہ آہستہ کھیت کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

"سعید وہ دیکھو کتنا بڑا خربوزہ ہے۔ پک کر بالکل زرد ہو رہا ہے"۔ حسین علی نے ایک بیل کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر چاروں طرف دیکھ کر دوسرے لمحے ایک چھلانگ کے ساتھ حسین علی اس بیل پر جھکا ہوا تھا اور وہ خربوزہ اسکے ہاتھ میں تھا۔ سعید کا دل ایک نامعلوم خوف سے دھک دھک کرنے لگا وہ حیرت سے ماموں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے تو رٹا تھا کہ یہ چوری ہے جو بُری چیز ہے لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسکے سامنے کوئی حادثہ ہوگیا تھا جس کا وہ گواہ تھا۔ چلتے ہوئے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کھیت سے آگے گزر کر حسین علی نے وہ خربوزہ دونوں ہاتھوں میں دبا کر توڑا۔ انگلیوں سے بیج نکال کر پھینک دئے اور نصف حصّے کا ایک ٹکڑا توڑ کر سعید کو دیا۔

"لو سعید کھاؤ۔ میٹھا معلوم ہوتا ہے"۔ حسین علی نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں — میں" سعید کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں ہاں اور بھی دوں گا۔ یہ لو لو"۔ ماموں نے کہا۔

"میرا جی نہیں چاہ رہا"۔ سعید نے بہ مشکل کہا۔

"کھا کم کھانے نا — تم بھی بڑے مولوی ہو"۔ حسین علی نے کہا اور خربوزے کا ٹکڑا اطمینان سے کھانے لگا۔ چند لمحے میں اس نے خربوزے کے بڑے بڑے لقمے نگل کر چھلکے پھینک دئے۔ اور وہ دونوں چلتے رہے۔

بالآخر درختوں کا جھنڈ آیا۔ اس سے گزر کر پگڈنڈی آیا۔ پھر خشک نالہ۔ پھر اینٹوں کا بھٹّہ۔ پھر سنگتروں کا باغ۔ پھر مدرسہ۔ پھر خانقاہ۔ حسین علی کے بتائے ہوئے نشانِ منزل ایک ایک کرکے آتے اور گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ سعید کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اسکی ایڑیاں شدید درد کرنے لگیں۔ اسکی پنڈلیاں شل ہونے لگیں۔ وہ اپنے جسم کو صرف قوتِ ارادی کے بل پر ماموں حسین علی کے پیچھے پیچھے گھسیٹنے لگا۔ اچانک اسکے سامنے پختہ مکانوں کی اونچی اونچی برجیاں اُفق پر اُبھرتی ہوئی نظر آئیں۔ گھڑیال آگیا تھا۔

بازار میں سے گزرتے ہوئے سعید نے دبی زبان سے ماموں کو ریوڑیوں کا وعدہ یاد دلایا۔

"اب موٹر کا ٹیم ہوگیا ہے۔ چھوٹ گئی تو سب ریوڑیاں دھری رہ جائیں گی نہ آگے کے رہیں گے نہ پیچھے کے"۔ حسین علی نے بے توجہی سے کہا

اور سعید دل شکستگی کے ساتھ بازار میں مٹھائیوں کی بھری ہوئی دوکانوں کے پاس سے گزر کر اڈّے کی طرف مڑ گیا۔

"آؤ — یارو — دو سواریاں جہلم کی — لاری تیار ہے۔ آ — او بھائی گٹھڑی والا"۔ موٹر کا کلینر چلّا رہا تھا۔

اور حسین علی لاری کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"دیکھنے کیا ہو۔ چلنا ہو تو بیٹھو موٹر تیار ہے"۔ کلینر نے کہا جو بیک وقت کلینر اور کنڈکٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔

وہ کوئی کشمیری تھا جو اپنی بدعنوانیوں پر پٹتے پٹتے اب عادی سا بن گیا تھا۔ لمبی لمبی لٹکتی ہوئی مونچھیں۔ ململ کا میلا کرتا اور میلے رنگ کا تہہ بند جو ٹخنوں سے بہت نیچے لٹک کر زمین صاف کرتا جاتا تھا اسکے ہاتھ میں لاری کا لمبا لوہے کا ہینڈل تھا جو اس نے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ یہ بتانے کے لئے کہ لاری چلنے میں اب صرف ہینڈل مارنے کی دیر ہے۔

"لیکن جگہ کہاں ہے؟" حسین علی نے کلینر سے پوچھا۔

"بادشاہو جگہ نہ ہوگی تو ہم آپکو اپنے سر پر بٹھا کر لے جائینگے"۔ اور کلینر نے موٹر کی چھت کی طرف اشارہ کیا "بس پولیس چوکی کے پاس تمہیں ذرا اتر کر تھوڑا پیدل چلنا ہوگا۔ اس سے آگے نکل کر تو پوری لاری تمہاری ہے"۔

سعید کو ایک مسافر نے ذرا تنگ ہو کر اپنے سامنے پڑی ہوئی ایک گٹھڑی پر بٹھا لیا اور حسین علی چھت پر چڑھ گیا۔

اور کلینر نے پھر ہانک لگائی۔

"آؤ بھائی لاری کے مسافرو۔ لاری تیار ہے۔ بس دو سواری کی کسر ہے"۔

پھر اس نے کرتے کی جیب سے تار کی چُرمُڑ ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ "اوا چھے۔ چل یار ہینڈل مار"

ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سواریاں واقعی بالکل پوری ہو گئی تھیں۔ اس لئے کہ گاڑی کے اندر مسافر تنگی کے سبب پسینے سے نہائے ہوئے تھے۔ پسینہ اور تمباکو کا دھواں جس میں حقے کا حلق سوز نغمۂ آتشیں بھی شامل تھا۔ سیٹوں پر ہر مسافر دوسرے پر نصف لدا ہوا تھا۔ درمیانی خالی جگہ سامان پڑا تھا۔ جس پر لوگ بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کے پہلو میں بھی تین مسافر بیٹھے تھے۔ چھت پر سامان اور مسافر دونوں پڑے تھے۔

پولیس چوکی کے پاس سے لاری بخیریت گزر گئی۔ اترنا نہیں پڑا۔ صرف ڈرائیور اُتر کر چوکی کے سنتری سے مل گیا۔ اس سے ایک بات کی۔ مصافحہ کیا۔ دونوں مسکرائے اور پھر ڈرائیور نے آکر لاری اسٹارٹ کر دی۔ پھر چوکی سے آگے گزر کر ڈرائیور نے ایک طویل قصیدۂ دشنامیہ پولیس والوں کی تمام نسلوں کی خدمت میں پیش کیا جس کی تائید پیچھے دروازے میں معلق کلینر نے کی۔ ملکہ اسمیں کچھ گرہ بھی لگائی اور لاری فراٹے بھرتی پتھریلی خشک اور بے رونق پہاڑیوں کے درمیان اونچے نیچے راستے پر پستی اور بلندی کا لطف اُٹھاتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔ سعید کے لئے یہ مناظر بڑے دلکش تھے یہاں پہاڑی کی ڈھلانوں پر تکونے کھیت، گہرے کھڈ، اور اونچے پل کہیں ریلوے لائن سڑک سے بہت نیچے ساتھ ساتھ جا رہی تھی اور کہیں سڑک لائن کے پل کے نیچے سے گزر گئی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بھیڑ بکریوں کے چرتے ہوئے ریوڑ بہت دلکش معلوم ہوتے تھے۔ کہیں کہیں اونچی چٹانوں پر ایک آدھ تنہا درخت قلعے کی بُرجی پر کسی مستعد سپاہی کی طرح تنا ہوا کھڑا فضا میں ایک خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو اونچی پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے زمین کے ایک سرسبز قطعے پر سعید کو ایک مکان نظر آیا جہاں چند ایک بکریاں اور کچھ مرغیاں چر چُگ رہی تھیں۔ چھوٹا سا پختہ مکان اور اس کے سامنے ایک رہٹ لگا تھا۔ اس خشک علاقے میں وہ جگہ نخلستان بنی ہوئی تھی۔ سعید کا جی چاہا کاش وہ اس مکان میں رہ سکتا۔

دو تین مقامات پر رُک کر لاری چلتی رہی۔ پھر کلینر جو دروازے میں معلق تھا چند مسافروں کی گردنیں پھلانگ کر لاری کے اندر آگیا۔

"سرائے عالمگیر کے سب مسافر اپنا اپنا کرایہ نکالیں" اور کلینر نے سب سے کرایہ وصول کر کے جیب میں ڈال لیا۔ بالآخر لہریں لیتے ہوئے پانی سے بھرپور ایک نہر کو پار کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے سامنے سے گزرتے ہوئے لاری سرائے عالمگیر کے بازار میں آکر ٹھہر گئی۔ سرائے کے مسافر اُتر گئے کچھ جہلم کے مسافر بھی اُتر کر سگریٹ سلگانے اور گرم گرم پکوڑے خرید کر کھانے لگے۔ سعید ذرا پھیل کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ماموں حسین علی سامنے سگریٹ کی دوکان کے پاس کھڑا تھا۔

"آؤ سعید پکوڑے کھا لو" حسین علی نے اسے بلایا اور وہ اُتر کر حسین علی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور پھر حسین علی ذرا کھسک کر دوسری دوکان کے پاس چلا گیا۔

"ادھر آؤ یہ دیکھو" حسین علی نے عجیب سرگوشی کے سے انداز میں سعید کو دوسری طرف بلایا اور سعید حیران سا ہو کر وہاں چلا گیا۔

"ادھر آؤ، تمہیں ایک دوست سے ملائیں" حسین علی نے سعید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے گلی کی طرف اشارہ کیا۔

سعید مبہوت سا ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ادھر چلا گیا۔ اب لاری ان کی نظروں سے اوجھل تھی اور وہ ایک تنگ سی گلی میں کھڑے تھے۔ جو محلے کے اندر مکانات کی قطار کے درمیان دور تک پیچ و تاب کھاتی چلی گئی تھی۔

"دوڑو" حسین علی نے تحکمانہ سرگوشی سے کہا اور اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ سعید حیران و پریشان تھا۔ لیکن اس کے سامنے دوسری کوئی راہ نہ تھی۔

وہ بھی دوڑنے لگا۔ وہ دوڑتے۔ گلیوں میں سے گزرتے۔ جگہ جگہ مڑتے آبادی ختم کر کے جرنیلی سڑک سے دور کھیتوں کی طرف آگئے۔

لیکن ان سے زیادہ سعید کے خیالات کا دھارا تیز دوڑ رہا تھا۔ سعید کی رفتار سست تھی اور اس کے خیالات کی رَو تیز تھی۔ یہ سارا معاملہ اسکے ذہن میں ایک گتھی بن کر گڈمڈ ہو رہا تھا۔ پریشانی سے بڑھ کر حیرانی تھی اور حیرانی سے بڑھ کر خوف اور اضطراب تھا۔ اچانک اسکا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ حسین علی اس لئے بھاگ رہا تھا کہ وہ لاری کا کرایہ بچانا چاہتا تھا۔ سامنے جہلم کا پُل تھا۔ پُل کے پار شہر تھا اور شہر سے صرف دو تین میل کے فاصلے پر چونک تھا جہاں انہیں جانا تھا۔ اس خیال کے آنے ہی اسے محسوس ہوا کہ ایک چوری ہو رہی تھی۔ ایک نقب لگ رہی تھی اور وہ چوری اور نقب زنی میں حسین علی کے ساتھ شریک تھا۔ وہ چوروں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے

کرایہ بچانے کے لئے یہ دوڑ لگائی تھی۔ گویا انہوں نے لاری کا پٹرول چرالیا تھا ایک روپیہ آٹھ آنے چرالئے تھے۔ اور چوری کے اس مال کا ایک تہائی حصہ سعید کی مٹھی میں بھی تھا۔ وہ چمکیلی ہوئی اٹھنّی۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک انگارہ اس کی مٹھی میں گھس آیا۔ ایک بچھو نے اس کی مٹھی میں کاٹنا شروع کردیا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ جھٹک دیا اور وہ بچھو۔ وہ انگارہ دور جا پڑے۔ اسے محسوس ہوا اسکے ابا کہہ رہے تھے "سعید تم کیوں بھاگے جا رہے ہو" اسے محسوس ہوا اسے چاروں طرف سے دیکھا جا رہا تھا بے شمار آنکھیں آگے پیچھے دائیں بائیں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسکا جی چاہ رہا تھا کہ وہ واپس لاری والے کے پاس جا کر اسے اٹھنّی دے آئے اور اس سے معافی مانگے — لیکن اس کی ٹانگوں میں دم نہ رہا تھا۔ اسکے پاؤں کے ساتھ گویا ایک ایک من وزن بندھا ہوا تھا اور کسی کا خوفناک ہاتھ اسے اپنی گردن پر محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے لاری کا کلینر اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ اب اس کے قدم بھی نہ اُٹھ سکتے تھے جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا تھا۔

"اے سعید اٹھنّی کہاں ہے؟" اس نے حسین علی کی آواز سُنی جو اسے کندھے سے پکڑ کر اس کی جیب ٹٹول رہا تھا۔

"میں نے پھینک دی" سعید نے افسردگی سے کہا۔

ایک زنّاٹے کا چانٹا اس کے گال پر پڑا۔

"بڑا آیا حاجی کا بچہ" حسین علی نے کہا اور چل دیا۔

موٹے موٹے آنسو سعید کی آنکھوں سے ٹپک کر اس کے دل و دماغ کی ساری خلش کو دھو گئے۔

منظر حسین

اس کا حسین چہرہ

بس آنکھیں، گھورتی ہوئی آنکھیں، جلتی ہوئی آنکھیں، للچائی ہوئی آنکھیں، اس کے حسین چہرہ کے رنگ کو اڑائے دے رہی تھیں وہ ان آنکھوں کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا، پسا جا رہا تھا، مرا جا رہا تھا — اور اس کے حسن کا غرور جھینپ رہا تھا، لجا رہا تھا، شرما رہا تھا، اس کا جی چاہا کہ وہ اسٹور ہاؤس سے نکل کر بھاگ جائے۔

آج ہی اس کا تقرر ہوا تھا اور اس نے اسٹور ہاؤس سے تمام مزدوروں کو بلا کر کچھ کام کی باتیں کہنی چاہی تھیں، لیکن جب وہ اکٹھا ہو کر اس کی طرف گھورنے لگے تھے، دیکھنے لگے تھے، تاکنے لگے تھے، تو اسے اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی معلوم ہوئی اور آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ دائرہ سا ابھرتا نظر آیا۔ اسکے حلق میں سورش سی ہونے لگی اور اسکا دل سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دھڑکنے لگا۔

"میں   " اسے اپنی آواز بہت ہی عجیب سی معلوم ہوئی کیا یہ اس کی اپنی آواز تھی؟ کیا یہ سچ تھا کہ وہ بول رہا ہے؟ نہیں نہیں میں نہیں بولوں گا۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں کچھ نہیں بول سکتا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرے پاس بولنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں میرے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں — لیکن یہ مزدور جو مجھے یوں دیکھ رہے ہیں گویا کہ موقع ملتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ہاں یہ مزدور — "بھوکے" مزدور یوں نہیں مانیں گے — دیکھو نا۔ وہ میری طرف کیسے دیکھ رہے ہیں؟ جیسے میں کوئی کھلونا ہوں، جیسے میں دل بہلانے کا کوئی سامان ہوں، جیسے میں

میں آپ کا نیا اسٹور کیپر ہوں، اس نے مزدوروں کے سر پر ایک بڑے موٹے سے ٹائر کو دیکھتے ہوئے، [illegible] چلا کر کہا۔ اور پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

مزدور مسکرانے لگا — حد تو یہ ہے کہ پاس ہی کھڑا ہوا اسسٹنٹ اسٹور کیپر بھی مسکرانے لگا۔

اسے اسٹور ہاؤس گھومتا ہوا محسوس ہوا — اسٹور ہاؤس کی ہر چیز گھوم رہی تھی، ناچ رہی تھی، ٹائر اور ٹیوب کا ایک سمندر تھا جس میں وہ غوطے کھا رہا تھا اور کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لئے جا رہا تھا۔

— ٹائر ٹیوب۔ ٹیوب ٹائر — ٹائر ٹائر۔ ٹیوب ٹیوب — ٹائر ٹائر ٹائر ٹائر ٹائر ٹائر۔ ٹیوب ٹیوب ٹیوب ٹیوب ٹیوب ٹیوب

اچانک اسے یہ معلوم ہوا جیسے کسی نے گولف (Golf) کھیلنے کی اسٹک اسکے کندھے پر مار دی ہو۔ وہ درد سے تلملا اٹھا۔ اور اس نے اسٹک کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسٹک پکڑتے ہی وہ ہوش میں آ گیا یہ اس کے اسسٹنٹ اسٹور کیپر کا ہاتھ تھا۔

"یار ... جی" اس نے اسسٹنٹ اسٹور کیپر کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک مزدور نے بڑھ کر صراحی پر رکھے ہوئے گلاس کو اٹھایا اور اسے دھو کر اور صاف چمکتے ہوئے پانی سے بھر کر اسٹور کیپر کے سامنے بڑے ادب سے پیش کیا۔

اس نے مزدور کی شکل کو دیکھا اور پھر ہتھیلی پر رکھے ہوئے گلاس کو — اس نے گلاس لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی پیاس بجھ چکی تھی۔

مزدور نے گلاس اسکی میز پر رکھ دیا اور پھر جا کر اپنے ساتھیوں میں مل گیا۔

"تم لوگ اب کیوں کھڑے ہوئے ہو" اس نے اسسٹنٹ اسٹور کیپر سے دریافت کیا۔

"کام پر واپس جاؤ" اسسٹنٹ اسٹور کیپر نے حکم دیا اور مزدور فوراً اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔

وہ سوچنے لگا، مجھ سے بہتر تو میرا اسسٹنٹ ہے۔ اسکا کنٹرول کتنا اچھا ہے ۔۔ ایک حکم، اور تمام مزدور غائب ۔

دفعتاً اس نے اپنے کو حسد کی آگ میں جلتے ہوئے پایا۔ وہ اپنے اسسٹنٹ سے حسد کرنے لگا تھا۔

یہ اسسٹنٹ جس کے چہرے پر بڑے بڑے مہاسے نکلے ہوئے ہیں جسکی ناک کے نتھنے پھیلے ہوئے ہیں، جسکے گال پچکے ہوئے ہیں جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں اور جس کی پیشانی چھوٹی سی ہے ۔۔ ہاں یہ بدصورت اسسٹنٹ مجھ سے بہتر ہے ۔۔ کیونکہ وہ مزدوروں کو کنٹرول کرنا جانتا ہے۔ لیکن میں ۔۔ میں جو اتنا خوبصورت ہوں اور شاید عمر اور تجربہ میں بھی کم نہیں ہوں ۔۔ ہاں میں پہلے ہی روز انکی نظروں میں گر گیا۔ میں نے ابتدا ہی میں ٹھوکر کھائی۔ اور اب یہ مزدور ہمیشہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ ہمیشہ مجھے کھلونا سمجھیں گے ہمیشہ مجھے "واہیات" نظروں سے دیکھیں گے۔ ہمیشہ

اس کی پیشانی پر پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں ۔۔ اور بجلی کے پنکھے کی ہوا کے باوجود اسے شدید گرمی معلوم ہونے لگی۔

وہ اٹھکر اسٹور ہاؤس میں ٹہلنے لگا۔ لیکن گرمی اور بڑھ گئی اور اس نے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس کیا۔

"مسٹر عامر"

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کس نے آواز دی؟ کون ہے جو اس وقت مجھے آواز دے سکتا ہے اور کیوں؟

"مسٹر عامر ۔۔ کیا آپ مجھ سے چارج لینے کے لئے تیار ہیں؟" اسسٹنٹ اسٹورکیپر نے آہستہ سے کہا

وہ ۔۔ یہ میرا اسسٹنٹ ہے، بدصورت اسسٹنٹ جس کا کنٹرول

"نہیں" اس نے بے ساختہ کہا۔

"نہیں؟" اسسٹنٹ نے حیران ہوکر اسکی طرف دیکھا۔

"نہیں ۔۔ میرا مطلب ہے۔ ابھی نہیں۔"

"بہت اچھا"

"بہت اچھے کا بچہ" اس نے زیرلب کہا ۔۔ کیا میں چارج لیکر تمہیں گھومنے پھرنے کے لئے آزاد چھوڑ سکتا ہوں؟ کیا میں تمہیں مزدوروں سے پینگیں بڑھانے کی اجازت دے سکتا ہوں؟ ہرگز نہیں ۔۔ تم کام کروگے اور میں گھوموں گا ۔۔ میں گھوموں گا اور ان مزدوروں کو دکھاؤں گا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتے ہیں ۔۔ میں ایک ایک مزدور سے نپٹوں گا۔ ایک ایک کی کھال اتار دوں گا ۔۔ میں کیوں نہ ابھی سے اس پر عمل شروع کردوں۔

"مسٹر بالفرے ۔۔ میں اسٹور ہاؤس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر"

اور وہ بالفرے کے ساتھ پہلی گیلری میں داخل ہوا، جہاں اس کی مڈبھیڑ اس مزدور سے ہوئی جس نے پانی کا گلاس اسکے سامنے پیش کیا تھا۔

مزدور اسے دیکھ کر مسکرانے لگا ۔۔ اچھا، تو تم مجھے دیکھ کر مسکراتے ہو؟ بدمعاش کہیں کے ۔۔ اور اس نے ایک تھپڑ رسید کیا۔

مزدور سناٹے میں آگیا ۔۔ لیکن فوراً ہی اس کی مسکراہٹ واپس آگئی اور اس نے اپنے مضبوط شانوں کو جھٹکا دیکر کہا "سرکار۔ میرا دوسرا گال بھی حاضر ہے۔"

وہ کٹ گیا ۔۔ اور اسکا جی چاہا کہ وہ وہیں زمین میں دفن ہوجائے ۔۔ کیا میں اتنا بے شرم ہوں؟ کیا میں اتنا پاگل ہوں؟ کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں؟ ۔۔ معافی مانگ لو ۔۔ معافی مانگ لو ۔۔ نہیں نہیں ۔۔ وہ مزدور ہے۔ وہ مزدور ہے ۔۔ وہ مزدور ہے ۔۔ میں اسٹورکیپر ہوں میں اسٹورکیپر ہوں۔ میں اسٹورکیپر

اور وہ جلدی جلدی چل کر دوسری گیلری میں داخل ہوگیا۔ یہاں پھر اسے ایک مسکراہٹ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے گھبرا کر اپنے اسسٹنٹ بالفرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ کیا میں واپس اپنی سیٹ پر چلا جاؤں؟ نہیں۔ بالفرے کیا سمجھے گا۔ بالفرے، جس سے اس نے تھوڑی دیر قبل بڑی شان سے کہا تھا کہ "میں اسٹور ہاؤس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اور وہ تیسری گیلری میں داخل ہوگیا۔ پھر مسکراہٹ ۔۔ چوتھی گیلری میں مسکراہٹ۔ پانچویں گیلری میں مسکراہٹ۔ چھٹی گیلری میں مسکراہٹ ۔۔ اسے یوں جان پڑا جیسے آج ہر طرف مسکراہٹ کا مہیب دیو اسے چبانے کے لئے تیار ہے۔ اسکی ہمت پست ہوگئی اور وہ معائنہ مکمل کئے بغیر واپس آگیا۔

سیٹ پر بیٹھ کر وہ سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر بڑی دیر تک

سوچتا رہا — اور اچانک اسکی مایوس آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اس نے سر اُٹھا کر پالفرے کو دیکھا، جو اسکے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں کی چمک اور تیز ہوگئی بلکہ خوفناک — اس نے اپنے دانتوں کو بھینچ کر سفید کاغذ کا ایک ٹکڑا اُٹھایا۔ اور اسے سامنے میز پہ رکھ کر پھر پالفرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے۔ مسٹر عامر؟"

— بات؟ پوچھتا ہے بات کیا ہے؟ — حرامزادہ پوچھتا ہے بات — کیا ہے؟ کیا اِن مزدوروں کی مسکراہٹ کا باعث بھی کمینہ نہیں ہے؟ کیا اسی سور نے مجھے آج یہ دن دیکھنے پر مجبور نہیں کیا؟۔

بات ہے — تیری کی . . . .

اس نے قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کیا۔ اور چند سطریں گھسیٹ کر، کاغذ کا ٹکڑا پالفرے کے سامنے رکھدیا۔

"کیا؟ — استعفیٰ" پالفرے نے بوکھلا کر کہا۔ "آپ پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

"مسٹر پالفرے — آپ مجھ پر پاگل ہونے کا الزام لگانے کی بجائے فوراً اس مزدور کو بلائیے۔ جس نے . جو جوہیلی گیلری ..؟

پالفرے نے مزدور کو آواز دی اور وہ سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

اس نے مزدور کو سر سے پیر تک ایک بار دیکھا۔ پھر بار بار دیکھا۔ — وہ مسکرا رہا تھا۔ وہی مسکراہٹ — خوفناک مسکراہٹ — مہیب مسکراہٹ، —

اور اس نے میز سے "پیپر ویٹ" اُٹھا کر اسکے چہرے پہ دے مارا۔ مزدور کی پیشانی پر ایک بڑا سا گول گول نشان اُبھر آیا۔ لیکن اس کے ہونٹ برابر مسکرا رہے تھے۔

اس نے اس نشان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا — اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، جنہیں اس نے رومال سے صاف کر ڈالا — آنسو صاف کرکے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپیہ نکال کر مزدور کو اشارہ کیا — لیکن مزدور اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

"لے لو" پالفرے نے اپنی رعب دار آواز میں کہا۔

"نہیں صاحب — مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔

مزدور کے اس جواب پر وہ ہکا بکا رہ گیا — اسے روپیہ نہیں چاہیئے — پھر کیا چاہیئے؟

یکبارگی اسے میز پر رکھا ہوا گلاس نظر آیا، جس میں پانی ابھی تک بھرا ہوا تھا۔ اس نے مزدور کی طرف دیکھا، گویا پوچھ رہا ہو کہ تمہیں اسکی تو ضرورت نہیں؟ پھر اس نے گلاس اُٹھا کر پانی پی لیا — پانی پیتے ہی اسکا دماغ کچھ ٹھنڈا ہوگیا۔

"مسٹر پالفرے — میں جا رہا ہوں — منیجر کے پاس"۔

اور وہ میز سے استعفیٰ لیکر دروازے تک پہنچ گیا — دروازہ پر پہنچکر اس نے پلٹ کر مزدور کی طرف دیکھا — مزدور حسب سابق مسکرا رہا تھا۔

وہ لوٹ آیا اور اس نے مزدور کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا۔

"دوست، اب جی بھر کر مسکراؤ — میں جانتا ہوں، تمہاری مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے؟"

اور وہ پھر دروازہ کی طرف جانے لگا — جاتے جاتے وہ ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا — اور اس نے مڑکر دھیرے سے کہا "مجھے معاف کردو" اور پھر وہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح دروازہ سے باہر نکل گیا۔

(۲)

منیجر نے اس کے استعفیٰ کو منظور کرنے کی بجائے اسے اپنے دفتر میں ایک کلرک کی حیثیت سے لے لیا۔

اور اس دفتر میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ تھی — عورتیں، جوجوان، خوبصورت، شوخ، اور چنچل تھیں۔

اس نے گھبرا کر اس ماحول کو دیکھا — اور پھر وہ اپنی نظریں نیچی کرکے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کی سیٹ پوری طرح "صنف نازک" کے نرغے میں تھی۔

اسے محسوس ہوا جیسے یہ تمام عورتیں اسکی طرف اسی طرح گھور رہی ہیں جس طرح وہ مزدور اسے گھور رہے تھے — ہاں بالکل وہی بھوکی نظریں، وہی للچائی ہوئی نظریں، وہی جلتی ہوئی نظریں،

اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس دفتر سے نکل کر بھاگ جائے۔

"مسٹر عامر — پلیز"

اس نے ایک زنانی آواز سُنی — یہ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی مس ایملی کی تھی — اس نے کوئی توجہ نہ دی۔

ایملی نے پھر کہا — "عامر۔ پلیز"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" عامر نے سر جھکاتے ہوئے دریافت کیا
"یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ ان کی طرف دیکھئے" بغل سے آواز آئی
یہ مس روزی کی تھی
"روزی کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایملی کی بجائے ان کی طرف دیکھئے"
تیسری آواز مس باٹلی کی تھی۔
"اور باٹلی کا مطلب یہ ہے کہ آپ . . . " چوتھی آواز نے اسے بوکھلا دیا اور وہ اپنی سیٹ پر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ تھوڑی دیر تک وہ یونہی کھڑا سوچتا رہا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ چل کر وہ چیف کلرک کی میز کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔
"کیا میں اس سیٹ پر بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے اس سیٹ کی طرف اشارہ کیا، جو چیف کلرک کے پاس ہی خالی پڑی تھی۔
"کیوں؟ آپ کو اپنی سیٹ پسند نہیں آئی؟"
"جی نہیں"
چیف کلرک نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اچھا اس خالی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہو۔
جیوں ہی وہ اس سیٹ پر بیٹھا، ایملی نے کچھ کاغذات اس کے سامنے لاکر رکھ دئے۔
"یہ آپ سے تعلق رکھتے ہیں"
اُس نے کاغذات پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی —— اور پھر ایملی پر: مسکراہٹ — خطرناک مسکراہٹ۔ خوفناک مسکراہٹ —— مہیب مسکراہٹ —— اور اس نے اپنا منہ دائیں طرف پھیر لیا۔
پھر مسکراہٹ —— وہی مسکراہٹ روزی کے لبوں پر تھی۔
—— اس نے اپنا منہ بائیں طرف پھیر لیا —— اور اس کا ادھر بھی ایک مسکراہٹ نے خیر مقدم کیا، جیسے باٹلی برسا رہی تھی۔
اس نے اب کے اپنا منہ پیچھے کی طرف گھما لیا —— اور وہاں بھی اس ذلیل مسکراہٹ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔
اُف میرے خدا —— اسکا سر چکر لینے لگا اور وہ سیٹ چھوڑ کر باہر برآمدے میں چلا گیا
برآمدے میں پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر اس نے کچھ دیر آرام کیا —— اور جب اس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی تو واپس اپنی سیٹ پر آ گیا۔
اس نے کاغذات کو اُلٹنا پلٹنا شروع کر دیا —— اسے ہر کاغذ پر ایک مسکراہٹ نظر آرہی تھی — ذلیل، کمینی، گھٹیا۔
اچانک اسکی نظر ایک نیلے رنگ کے کاغذ پر پڑی؛ جس پر کچھ الفاظ ٹائپ کئے ہوئے تھے۔ "How are you baby.
I hope, not bad."
وہ تلملا اُٹھا — یہ کس نابکار نے لکھا ہے؟ یہ کس نے ٹائپ کرکے میرے کاغذات میں رکھا ہے؟ —— اور اسے معاً یاد آیا۔ ایملی نے اسے کچھ کاغذات لاکر دئے تھے۔
ایملی —— ایملی —— اور اس نے اس نیلے کاغذ کو مروڑ مروڑ کر مٹھی میں دبا لیا اور دبا کر وہ ایملی کی طرف دیکھنے لگا۔
مسکراہٹ —— مسکراہٹ —— مسکراہٹ۔
اور اس نے مٹھی میں دبے ہوئے کاغذ کی گولی بنا کر ایملی کے منہ پر کھینچ مارا — لیکن مسکراہٹ ایملی کے لبوں پر ویسے ہی ناچتی رہی۔
اس نے شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں — کیا میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں؟ کیا میں ایسی ذلیل حرکت بھی کر سکتا ہوں؟ کیا میں اتنا گر گیا ہوں؟۔
"مسٹر عامر — آپکو منیجر بلا رہا ہے" روزی نے آکر اس کے کان کے پاس کہا۔
اسے یہ کان کے پاس والی بات سخت ناگوار ہوئی اور اس نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ دیا۔
روزی نے اب کے اپنا منہ اسکے منہ کے بالکل قریب لاکر کہا۔
"آپ کو منیجر بلا رہا ہے"
"بھاڑ میں جائے تمہارا منیجر" اسکی زبان سے بے ساختہ نکل گیا
"میرا مطلب ہے تم جاؤ" "منیجر کے پاس؟"
"نہیں —— بھاڑ میں"
روزی مسکرانے لگی —— اور اس کی مسکراہٹ خوفناک تھی۔
اس نے اپنی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تاکہ وہ اس مسکراہٹ کے چنگل سے نجات حاصل کر سکے۔ لیکن اسے نجات مل کیسے سکتی تھی جبکہ یہ مسکراہٹ اسکے ذہن میں پوری طرح رچی بسی ہوئی تھی۔
وہ جلدی سے اُٹھ کر منیجر کے کمرے میں چلا گیا۔
"ہلو عامر۔ تمہیں یہ جگہ پسند آئی"

"نہیں"

"نہیں؟"

"جی بالکل نہیں"۔

"کیا تمہارا مطلب واقعی یہی ہے؟"

"جی"

"کیوں نہیں پسند آئی"؟

وہ سوچنے لگا، کیا جواب دوں۔

"کیوں نہیں پسند آئی؟" منیجر نے سوال دُھرایا۔ "کیا تم عورتوں سے بھی ....؟"

اس نے خاموشی ہی میں اپنی بہتری سمجھی۔

"دیکھو عامر ــــ اس دُنیا کا کام یوں نہیں چل سکتا۔ یہ مانتا ہوں کہ تم بہت ہی ــــ کیا کہنا چاہیئے ــــ خوبصورت اور پاکدامن ہو ــــ لیکن خوبصورتی اور پاکدامنی ہی ساری چیز نہیں ــــ یہاں جینے کے لئے Tact درکار ہے۔ انسان کو Tactfull ہونا چاہیئے۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ تم بُرے کام کرنے لگ جاؤ۔ نہیں، اسکا مطلب یہ ہے کہ تم بُرے وقت کو ہنسی خوشی اور میل ملاپ کے ساتھ کاٹ دو۔ اگر تم میں کوئی جوہر قابل ہے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی قوت بھی، تو تم بُرے لوگوں کو اچھا بنا سکتے ہو، اور انھیں اپنے ساتھ لے سکتے ہو۔ غرضکہ جو چاہو کر سکتے ہو۔ یہ صرف تم پر منحصر ہے ــــ اچھا جاؤ۔ کام کرو۔"

وہ لوٹ کر اپنی سیٹ پر آگیا ــــ اس فقرے نے اسے بہت رنجیدہ کر دیا تھا ــــ "جوہر قابل" "متاثر کرنے کی قوت" ــــ افسوس مجھ میں نہیں۔ پھر میں اس گندگی میں رہ کر گندگی کو کیونکر صاف کر سکتا ہوں؟ صاف کرنا تو بڑی بات ہے، اس سے بچ کر کیسے رہ سکتا ہوں؟ ایک طرف لوطؑ کی قوم ہے تو دوسری طرف شیطان کی بیٹیاں ــــ "خوبصورتی اور پاکدامنی" کے ان دشمنوں سے بچ کر رہنا کیسے ممکن ہے جبکہ مجھے کوئی بچانے والا بھی نہیں؟

یکبارگی اسکا دل بیٹھنے لگا۔ دُنیا سے بیزار ہونے لگا۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ کاش میں پیدا ہوتے ہی مرجاتا۔ کاش میں بدصورت ہوتا۔ کاش میرے چہرے پر بھی بڑے بڑے مہاسے ہوتے۔ کاش میری آنکھیں بھی اندر کو دھنسی ہوتیں۔ کاش میرے گال بھی پچکے ہوتے۔ کاش . . . .

دفعتاً اسے اپنے جسم میں بجلی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ یہ بجلی کہاں سے آرہی ہے؟ اس نے دیکھا، ایملی کا ہاتھ اسکے بائیں ہاتھ پر ہے ــــ تو اس بجلی کا سرچشمہ یہ ہے؟ کرنٹ یہاں سے نکل کر میرے جسم میں جارہا ہے؟ لیکن ــــ لیکن کیا یہ درست ہے؟ کیا ایسا ہونا چاہیئے؟ کیا ایملی میرے ہاتھ کو پکڑ سکتی ہے؟ کیا ایملی شیطان کی بیٹی نہیں؟ . . . . .

اور شیطان آدم کا ازلی دشمن ہے۔ سب سے بڑا دشمن ہے سب سے مکار دشمن ہے۔ سب سے کینہ دشمن ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے قلم سے ہولڈر لیکر ایملی کے ہاتھ میں پوری طاقت سے نب چبھو دی۔

ایملی اچھل پڑی ــــ مگر اس نے اپنی چیخ کا گلا گھونٹ دیا ــــ اور پھر وہ مسکرانے لگی، اور اپنی خوفناک مسکراہٹ بکھیرا کرنے لگی۔

اس نے ہولڈر کی نب کھینچ کر نکالی۔ ایملی کے ہاتھ سے خون جاری ہوگیا۔ اس نے ڈر کر ایملی کے چہرے کو دیکھا ــــ وہ مسکرا رہی تھی۔

اسکی آنکھیں بھر آئیں ــــ اور اس نے اپنا رومال نکال کر ایملی کے زخم کو باندھ دیا۔ اب زخم باندھ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ کا نوٹ نکالکر، ہتھیلی پر رکھ کر پیش کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"نقصان کی قیمت"۔

"بہت تھوڑی ہے"۔

"پھر کتنی؟"

"پھر بتاؤں گی"۔

اس نے نوٹ کو جیب میں رکھ لیا ــــ اور پھر اٹھ کر منیجر کے کمرے میں جانے کا ارادہ کیا۔

"اُدھر نہیں" ایملی نے راستہ روک کر کہا۔ "ادھر" اس نے چیف کلرک کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں؟"

"چھٹی ادھر سے ملے گی"۔

"کب؟"

"ہاں چھٹی لیکر جائیے ــــ اور سوچیئے"

"کیا؟ کیا سوچوں؟"

"آج کے حالات پر سوچیئے"

وہ سوچ میں پڑگیا ـــــ ٹھیک ہی تو کہتی ہے ـــ مجھے سوچنا چاہیئے۔

(۳)

اور گھنٹوں کی مسلسل سوچ نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔

اور پھر اس نے دیکھا، ایملی اس کے کمرے کے دروازہ میں کھڑی ہوئی ہے ـــ اور ـــ اور اس کے پیچھے وہ مزدور کھڑا ہوا ہے جس کی پیشانی پر بڑا سا گول گول نشان تھا۔

ایملی اور مزدور ـــ رات کے وقت ـــ میرے کمرے میں ـــ اوہ میرے خدا۔

ایملی آگے بڑھنے لگی۔ مزدور بھی بڑھنے لگا۔

اسے اپنی روح نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس نے چلا کر کہا "میرے قریب مت آؤ ـــ مجھے مت چومو ـــ مجھے مت چومو۔"

یکایک ایملی کی چیخ نکل گئی ـــ "بندر" ـــ اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ مزدور بھی چلا کر بھاگا۔

تو میری شکل بندر جیسی ہوگئی ہے؟ میں بندر ـــ بندر؟ ـــ

اور وہ چیخ کر بیدار ہوا۔

اسکا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ پلنگ پر سے کود کر آئینہ کے سامنے پہنچا۔ اور اس نے بجلی کی روشنی میں دیکھا، اسکا چہرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلے ـــ اس نے اطمینان کی سانس لی اور پلنگ پر آکر دوبارہ سونے کی کوشش کی۔

ایک گھنٹے بعد اسے پھر نیند آ گئی۔

اور اب کے اس نے دیکھا، وہ اپنے ماں باپ اور دوسرے اعزا واقارب کے جھرمٹ میں ہے، جو اسکے گالوں کو، اسکی آنکھوں کو، اسکی پیشانی کو بار بار چوم رہے ہیں، چاٹ رہے ہیں ـــ اس نے رو کر اپنے باپ سے کہا "مجھے مت چومئے"۔ باپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے اپنی ماں سے کہا "مجھے مت چومئے"۔ ماں نے کوئی توجہ نہ دی اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا "مجھے مت چومئے" بڑے بھائی نے بھی کوئی توجہ نہ دی ـــ غرضیکہ اس نے ہر ایک سے رو رو کر یہی کہا مگر کسی نے اس کی بات نہ سُنی۔

اسے غصہ آگیا اور اس نے چاقو لیکر اپنی ناک کاٹ ڈالی ـــ وہ پھر چلا کر بیدار ہوا۔ اس نے جلدی سے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا ـــ وہ اپنی جگہ پر موجود تھی۔

صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ پھر لگ گئی۔

اور اس بار اسنے دیکھا، اسکا ماموں ـــ مرحوم ماموں ـــ اسکے سرہانے بیٹھا، اسکے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ اس نے رو کر کہا۔ "ماموں۔ جب سے آپ چلے گئے مجھے بچانیوالا کوئی نہیں رہا"۔ ماموں نے کہا "خدا بچانیوالا ہے"۔ اس نے پھر کہا "آپنے مجھے پاکیزگی کا درس دیا تھا لیکن میں اب اپنے کو پاک نہیں رکھ سکتا کیونکہ دُنیا مجھے ناپاک بنانے پر تُلی ہوئی ہے"۔ ماموں نے کہا "بیٹے خدا پر بھروسہ رکھو"۔ اس نے پھر عرض کیا "آپکے بعد میرا کوئی سرپرست نہیں رہا"۔ ماموں نے کہا "بیٹے۔ خدا سرپرست ہے"ـــ اس نے گڑگڑا کر کہا "ماموں پھر آجایئے اور میری حفاظت کیجیئے"۔ ماموں نے کہا "خدا حافظ ہے"۔

اور اس کے بعد ماموں چلے گئے ـــ اور اسکی آنکھ کھل گئی ـــ اسے محسوس ہوا، اسکے دل کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں اور دماغ کی بھی۔

اور پھر اسے اچانک میجر کا یہ فقرہ یاد آیا "بُرے وقت کو ہنسی خوشی اور میل ملاپ کے ساتھ کاٹ دو" ہاں کاٹ دو۔

(۴)

"ہیلو سسٹر ـــ تمہارا ہاتھ کیسا ہے؟"

ایملی اس کی مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"یہی کہ رات بھر میں آپ بدل گئے"۔

"ہاں۔ آج میں دوسرا آدمی ہوں ـــ اور آج کا آدمی کل کے آدمی کے جُرم کی معافی مانگتا ہے"۔

"مجھے نقصان کی قیمت مل گئی ہے اسلئے معافی کا سوال ہی نہیں"۔

"قیمت؟"

"ہاں ـــ آپکی مسکراہٹ"۔ ایملی یہ کہکر مسکرانے لگی۔ وہی خطرناک مسکراہٹ، خوفناک مسکراہٹ، مہیب مسکراہٹ۔

اس نے زیر لب کہا "میاں محافظ ـــ تم ہو کہ نہیں ـــ ہاں تم ہر جگہ ہو، اگرچہ نظر نہیں آتے ـــ اچھا ہے کہ تم نظروں سے اوجھل رہتے ہو ـــ ورنہ یہ دُنیا تمہیں بھی اپنی بُری نظروں کا ہدف بنا دیتی کیونکہ سُنتے ہیں تم سے زیادہ خوبصورت آج تک کوئی ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔

اور پھر وہ اپنے اسٹور ہاؤس کے "دستوں" سے ملنے چلا گیا۔

حفیظ قیصر

"ہڑتال نہیں ہوگی"

"سیٹھ صاحب!"

"ہوں"

"کل ہڑتال ہونے والی ہے۔"

"ایں" — سیٹھ گردھاری لعل نے چونک کر یوں کہا جیسے کسی نے اُنکی بڑھتی ہوئی توند پر ہاتھ پھیر دیا ہو۔

"کیا بک رہے ہو۔"

"بک نہیں رہا ہوں سیٹھ جی" ابھی ابھی میں نے بڑی مشکل سے یہ راز معلوم کر لیا ہے۔"

"آج نشاط افزا" میں موہن نے بھری میٹنگ میں یہ اعلان کیا کہ کل گردھاری لعل جی کی مل میں ہڑتال ہوگی۔ اگر سیٹھ جی — بھگوان نہ کرے اگر ہڑتال ہو گئی تو سیٹھ جی ایسی لٹیا ہی ڈوب جائیگی — ہری داس مل کی تالہ بندی کا حشر آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لیا ہے — اسلئے سیٹھ جی ذرا سوچ سمجھ کر چال چلئے" — گردھاری لعل کے قدیم نمک خوار ملازم پرتھو نے زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ان دو ٹکے کے مزدوروں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے" "عجیب زمانہ آگیا ہے۔ اِن کمینوں میں یہ جرأت۔ ہو نہ ہو یہ سُرخوں ہی کی کارستانیاں ہیں۔ اِن کی وجہ تو مزدور مزدور نہیں مالک بن بیٹھے ہیں۔" اور گردھاری لعل کے غصہ کا پارہ درجہ بدرجہ بڑھتا گیا۔

پرتھو نے کسی عیّار شخص کی مانند آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی!"

"کیا ہے؟"

"ایک بات کہوں"

"کہو!"

"دو کتے کے سامنے کیوں نہ ہڈی پھینک دی جائے۔"

"کیا مطلب"؟

"یہی کہ اگر آپ چاہیں تو روپیوں کی کھنک میں مزدوروں کے مطالبات کو یوں دبا سکتے ہیں۔" پرتھو نے چٹکی بجاتے ہوئے سیٹھ جی کو مشورہ دیا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں پرتھو — کیا موہن پارٹی سے غداری کر سکے گا؟"

"سیٹھ جی آپ کالڑ کا روپیوں کے لئے اپنے چچا کو ختم کر سکتا ہے تو کیا موہن پارٹی سے غداری نہیں کر سکتا —؟

پرتھو نے سیٹھ جی کی دکھتی رگ پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پرتھو ایک کام کرو"

"کیا سیٹھ جی"

"یہی کہ آج شام موہن کو یہاں بلالاؤ۔ — سمجھے"

"جی، اچھا —؟"

موہن دراصل پونہ کا باشندہ تھا۔ گو وہ بمبئی میں ایک کامریڈ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کے آئیڈیل میں ابھی اختلاف ہے۔ کسی زمانے میں وہ عوامی تحریکوں کا سخت مخالف تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کے آئیڈیل میں تبدیلی آتی گئی اور جب وہ پوری طور سے کامریڈ بن چکا تھا — اُسنے تمام دوسری فرقہ وارانہ تحریکوں سے کٹ کر ٹریڈ یونین کانگریس کی آغوش میں پناہ لے لی۔ اِن تمام باتوں کے باوجود موہن اب بھی گردھاری لعل مل کے بعض ذہین ورکروں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ چونکہ وہ مزدوروں کا روح رواں تھا۔ اِس لئے کسی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ اُسکے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پاس کر سکے۔

ایک شام جبکہ ڈوبتے سورج کی کرنیں سسکیاں بھر رہی تھیں گردھاری لعل کی سہ منزلہ کوٹھی ایک معصوم بچہ کی طرح جانے والوں کو درس عبرت دی رہی تھی — گردھاری لعل کا ندبان

پھاٹک کو ٹیک لگائے او نگھ رہا تھا۔ اور قریب ایک کتا دربان کی روٹی کھانے میں ہمہ تن مصروف تھا ـــــ سامنے شہر کے پُر رونق مقام سے نکلنے والی سڑک ایک کالی ناگن کی طرح بل کھاتی ـــــ صاحب لوگوں کی خاموش آبادی میں گم ہو گئی تھی ـــــ کبھی کبھی صاحب لوگوں کے موٹروں کی آواز اس خاموش فضا میں ایک ارتعاش سا کرتی گزر جاتی ـــــ رات کی دیوی اپنی سیاہ زلفیں پھیلائے سورج دیوتا کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے۔ دور سے ایک دودھیا رنگ کی کار ایک پُراسرار ہاتھی کی طرح خراماں خراماں گودھاری لعل کے گیٹ کے قریب رُک کر چیخ اُٹھی ـــــ پوں ـــــ پوں ـــــ پوں ـــــ اور دربان ایکدم اس طرح چونک پڑا جیسے کسی نے آنکھ میچ کر دودھ پیتی بلی کے سامنے تالی بجادی ہو ـــــ جی سرکار ـــــ دربان نے ادھوری نیند سے چونک کر کہا۔ "سیٹھ جی ہیں ـــ ؟"

موٹر میں سے ایک منحنی سی آواز آئی "جی ہاں سرکار" ـــــ دربان جواب دیکر پھاٹک کو کھولنے کے لئے آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسکی نگاہ کُتے پر پڑی جو تیزی سے روٹی لئے بھاگ رہا تھا۔

ہائیں ہشت کی آوازوں کے ساتھ اُس نے ایک پتھر دے مارا۔

لیکن کتا یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو چکا تھا ـــــ اور دربان حسرت سے کھڑا کتے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا ہو ـــــ "اے بھگوان تو نے اُدھار لائی ہوئی روٹی بھی چھین لی۔"

"گیٹ کھولو" ـــــ کی نادرشاہی آواز نے اُسکو ایکدم چونکا دیا اور وہ گیٹ کھول کر ایک طرف شطرنج کے مہرہ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

کار اندر داخل ہوئی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ رُک سی گئی۔

اندر سے ایک نوجوان اُلجھے ہوئے بال اور ایک میلی سی شرٹ میں ملبوس باہر نکلا اور خرگوش کی رفتار کے ساتھ سیڑھیوں کو پھلانگتا دیوان خانے کے قریب پہنچ کر سوچ رہا ہی تھا کہ ایک ملازم کی آواز آئی۔

"جی سرکار"

"سیٹھ جی ہیں"؟

"جی!"

"کہو کے موہن نامی کوئی صاحب ملنے آئے ہیں"

"کون کا مریڈ موہن ؟"

"ہاں!"

اور نوکر اندر چلا گیا۔

موہن کمرے کا جائزہ لے رہا تھا ـــــ سامنے ایک قدآدم تصویر جو شاید سیٹھ جی کے پردادا اور دائیں بازو سیٹھ جی کے دادا اور بائیں بازو سیٹھ جی کے باپ کی تصویریں آویزاں تھیں ـــــ بازو کے کونے کی میز پر سیٹھ جی اور سیٹھانی کی تصویریں بڑے قرینے سے سجائی گئی تھیں۔

فرش پر قالین اور صوفہ سیٹ کمرے کی رونق کو دوبالا کر رہے تھے۔

اس خاموش اور پُرسکون فضا میں دَھم دَھم قدموں کی آواز نے موہن کو ایکدم چونکا دیا پلٹ کر دیکھا تو سیٹھ جی داخل ہو رہے تھے۔

چھوٹی چھوٹی آنکھیں ـــــ تنگ پیشانی ـــــ اور ـــــ اور ـــــ بڑی گنبد نما توند جس میں نہ معلوم کتنے غریبوں کی آوازیں آوازِ ناتواں کی طرح گم ہیں ـــــ ایک دھوتی اور ایک ڈوپٹہ جو اُن کی گردن کے قریب سے نکل کر اُن کی دھوتی میں غائب ہو چکا تھا ـــــ اور پھر اُس پر ایک تولیہ ڈالے سیٹھ جی ایک دم صوفے میں دھنس گئے

"نمستے سیٹھ جی"! موہن نے سیٹھ جی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا

"نمستے" ـــــ

"کہو بھائی خیر تو ہے ـــــ کدھر آنا ہوا؟"

"بس یوں نکلا کہ چلو سیٹھ جی کے درشن کرتے چلیں یوں بھی ملے بہت دن ہوئے تھے ـــــ اور سوچا کہ یوں ہی ہڑتال کی اطلاع بھی کرنا چلوں سو آگیا؟"

"اچھا، اچھا" ـــــ سیٹھ جی نے مشکل تلخ گھونٹ نگلتے ہوئے کہا

"شاید آپ کو اسکی اطلاع ہو چکی"

"ہاں" ـــــ ؟

"تو پھر" ـــــ ؟

"تو پھر کیا ـــــ اب بس ایک سہارا ہے اور صرف ایک اور وہ ـــــ اور وہ تم ہو موہن"

"میں سیٹھ جی ؟"

"ہاں موہن صرف تم اگر چاہو تو تم ان کو اپنی مٹھی میں کر سکتے ہو ـــــ کیا تم ایک کام کر سکو گے"

"وہ کیا سیٹھ جی!"

"ذرا ادھر آؤ — یہ بات کوئی دوسرا نہ سُن پائے؟"

"نہیں" — نہیں سیٹھ جی یہ ناممکن ہے — میں اور" پارٹی سے غداری کروں یہ ناممکن ہے سیٹھ جی"۔

اور پھر سیٹھ جی کے ذہنی اُفق پر ہڑتالیوں کے چہرے ناچ رہے تھے — کالے — گورے — سانولے — ڈھیلے — سوکھے — مرجھائے چہرے اُنکی جانب آہنی عزائم کے ساتھ بڑھتے نظر آ رہے تھے جیسے اب اُنکی کوٹھیوں کی بنیادیں ہل رہی ہیں — اب سیٹھ جی کے سامنے وہ مزدور اور بیوائیں اور وہ کنواریاں بھی چیخ رہی تھیں جنکے گھروندوں کے محل کو مسمار کر کے سیٹھ جی نے اپنے محل کی بنیاد رکھدی تھی۔ اب وہ ہاتھوں میں کدال، درانتی اور ہتھوڑا لیئے بڑھ رہے تھے اور اُنہوں نے دیکھا کہ جیسے تمام سُرخ سُرخ انگارے لیئے اُن کی جانب بڑھ رہے ہیں سیٹھ جی یکدم چیخ اُٹھے۔

"بچاؤ" اور سامنے کھڑے پربھو نے کہا۔

"جی حضور"؟

"تم یہاں ہو پربھو" سیٹھ جی نے اپنی پھولتی سانس کو اپنے قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں سیٹھ جی ہم آپ کے سامنے ہیں" موہن نے کہا۔

"اچھا — اچھا — ہاں — ؟" سیٹھ جی ہانپ رہے تھے

"کیوں سیٹھ جی کیا کچھ طبیعت ناساز ہے"۔ موہن مزاج پُرسی کے سے انداز میں سیٹھ جی سے مخاطب ہوا۔

"ہائے پربھو دیا کرو" سیٹھ جی نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "جی سیٹھ جی" — پربھو نے سیٹھ جی کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو تو نہیں" — سیٹھ جی نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھگوان کو آواز دی ہے"۔

"بھگوان — " ہوں — ہاں ٹھیک ہے آپ کو بھگوان ہی چاہیں نہ بنائے تو کیا انسان بنائے گا"

"چل نکل یہاں سے" سیٹھ جی نے پربھو پر برہم ہوتے ہوئے کہا اور پربھو خاموش کمرے کے باہر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے کھڑکی کو کان لگا کر سُنا تو اندر سے کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"دس ہزار"

"جی نہیں سیٹھ جی"

"میری مانو!"

"ناممکن"؟

"خیر بارہ ہزار بس"

"نہیں سیٹھ جی آپ نہیں سمجھتے۔

"وہ کیا؟"

"یہ پارٹی کے لوگ بہت جیوٹ ہوتے ہیں"

"تو پھر"؟

"میں صرف، کیونکہ پارٹی سے اختلاف رکھتا ہوں۔ اس لیئے" . . . . .

"اچھا سمجھا — لیکن؟"

"لیکن کیا"

"تمہارا اثر و رسوخ تو ہے"۔

"ہاں — ہے تو — لیکن —"

"لیکن — ؟"

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ با اصول جماعت کو میری وجہ سے نقصان ہو سکے"

"نہیں موہن اگر تم نے ساتھ دیا تو سمجھو کہ مزدور اپنے ہیں — مل اپنی ہے اور تم ہم سب اپنے ہیں سمجھے"

"اچھا خیر سیٹھ جی آپ کے اصرار پر لے لیتا ہوں۔ لیکن بیس ہزار سے کم نہیں"

"پھر بھی"

"نہیں سیٹھ جی!"

"اچھا لو؟"

"لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے"

"تم اطمینان رکھو"

"اچھا چلتا ہوں سیٹھ جی"

"پرنام"

"پرنام"

اور پربھو ایک طرف کو سرک گیا۔

پھر ایک کار کے اسٹارٹ ہونے اور چلے جانے کی آواز سُنائی دی - جب پربھو نے اندر داخل ہو کر سیٹھ جی سے پوچھا

"سیٹھ جی"

"کیا ہے؟"

"کیا ہوا؟"

"کیا ہونا جو ہونا تھا سو ہوا"

"یعنی"

"یعنی کیا، موہن کے ہاتھ میں مزدور تھے اور موہن ہمارے ہاتھ میں"۔

"ٹھیک ہے سیٹھ جی" پربھو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا اور واپس چلا آیا -

دوسرے روز ایک دودھیا کار فراٹے بھرتی شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں پر گھوم رہی تھی -

اور مل کے بڑے گیٹ پر جلی حروف ناچ رہے تھے -

"آج ہڑتال نہیں ہوگی"

مصنف: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ
مترجم: شمسی فاروقی، ایم۔ اے

پیرمرد

آڈن کی ایک نظم "دیکھنے سے فائدہ" کے بعد اس عہد کے عظیم ترین انگریزی شاعر ایلیٹ کی ایک نظم پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ ایلیٹ ELICT مشکل پسندوں کا بادشاہ ہے۔ اور اس کی یہ نظم اس کی مشکل ترین نظموں میں سے ایک مانی جاتی ہے۔ اس کی پوری تشریح کرنا ناممکن ہے۔ میں نے شروع میں جو اشارات دیئے ہیں ان کی روشنی میں اس کا سمجھنا کچھ آسان ہو جائیگا۔ ترجمہ حسب سابق مخلوط ہے۔

اشارات

م ۱ - "پیرمرد" کی تشریح مختلف کی گئی ہے۔ میری رائے میں "پیرمرد" تمثیل ہے ایک انسانیت نواز بوڑھے کی اور اس طرح تمام انسانیت کی یعنی "پیرمرد" تمام انسانیت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔

م ۸ تا ۱۰ - [illegible] شاعر کا مفہوم لفظ "یہودی" سے واضح [illegible] ہے۔

م ۱۱ - بکری شہوت [illegible] Symbol [illegible] ہے۔

م ۱۳ - [illegible]

م ۱۵ - [illegible] کی [illegible]

م ۲۲ تا ۲۹ - [illegible] حضرت عیسیٰ [illegible] یورپ [illegible] Silvero [illegible] Symbol ہے [illegible] رنگ [illegible] کا [illegible]

م ۳۵ تا ۴۷ - [illegible] کری [illegible]

م ۶۹ [illegible]

م ۷۲ [illegible] Symbol ہے

[illegible]

[illegible]

پیرمرد

[illegible]
بلکہ تو ایک خواب نوشیں کی مانند ہے
جس میں بڑھاپے کے خواب بھی ہوں وہ جوانی کے بھی"

یہاں ہوں میں ایک خشک مہینے میں ایک پیر مرد
ایک بچہ مجھے کتاب پڑھ کر سنا رہا ہے اور میں بارش کا منتظر ہوں۔
میں نہ گرم راہوں سے گذرا۔
اور نہ سرد بارش سے،
نہ گھنٹوں تک کھاری دلدل میں پھنس کر تلوار بازی کی،
جہاں مکھیاں کاٹتی ہیں اور جہاں جنگ کرنی پڑتی ہے۔
میرا مکان ایک منہدم شدہ عمارت ہے،
اور کھڑکی پر یہودی کا مسکن ہے، وہ اس مکان کا مالک ہے،
وہ اینٹ ورپ کی گلیوں میں کلبلاتا ہے اور
بروسلز میں اس کی کھال کھینچی جاتی ہے اور لندن میں
کبھی اس کو پیوند لگائے جاتے ہیں کبھی چھلکے چھیلے جاتے ہیں
رات کو سامنے کے میدان میں بکری کھانستی رہتی ہے۔
وہاں چٹانیں ہیں، لوہا ہے، پتھر کے کھیت ہیں، کائی ہے اور
دلدل ہے۔
ایک عورت باورچی خانے میں چائے بناتی ہے، نالی صاف
کرتی ہے، اور میں ایک پیر مرد ہوں۔
طوفانی میدانوں میں ایک شوریدہ سر

(۲)

یہاں الٰہی نشانیاں بجو بہ روزگار مانی جاتی ہیں۔ "ہم ایک
نشان دیکھیں گے"!
الفاظ کے اندر والے الفاظ گونگے ہیں۔
تاریکی سے گھرے ہوئے۔ سال کے شروع میں
عیسیٰؑ کا ظہور ہوا پلنگ تڑیاں کی مانند۔
مگر فصلِ بہار سڑ گئی تھی، یہوداہ پھل پھول رہے تھے،
اور عیسیٰؑ کو لوگوں نے چپکے چپکے۔
بانٹ لیا، کھا لیا، پی لیا۔
مسٹر سلورو نے بڑے پیار سے اسے بانٹا،
رات بھر کمرے میں ٹہل کر،
ہاکاگاوا نے، جو جہلا کے سامنے جھک گیا اور
مادام دے تورنکست نے ایک تنگ و تاریک کمرے میں،
روشنیاں بجھا کر، اور فراڈلین فان کلپ نے بھی،
جس نے دروازہ اسے دیکھ کر بند کر لیا۔
خالی ڈھول۔
ہوا میں تانے بانے بنتے ہیں میں جھوٹے بھوت نہیں دیکھتا،
میں ایک خشک مکان میں رہنے والا پیر مرد ہوں۔
جہاں طوفان ہیں اور گرج۔

(۳)

یہ سب جان کر
کون معاف کر سکتا ہے، کس کو معاف کر سکتا ہے۔ سوچو،
اب بھی سوچو،
کہ تواریخ کتنی ہوشیار ہے، اس میں جھوٹے راستے ہیں،
وہ سرگوشی کرنے والے ارمان اور جھوٹے خواب دیتی ہے اور
جھوٹے غرور سے ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اب بھی سوچو
کہ ہمیں اس وقت ملتا ہے جب ہماری توجہ منتشر ہو جاتی ہے۔
اور جو کچھ ملتا ہے وہ الجھا الجھا یا ہوا۔
اتنا الجھا ہوا کہ
ملنے کے بعد لینے کی تمنا خاک میں مل جاتی ہے بہت دیر بعد وہ ملتا ہے۔
جس میں ہم یقین نہیں کرتے اور یا اگر کرتے بھی ہیں۔
تو محض اپنے حافظہ میں، بھولی باتیں۔ ہاں بہت جلد۔
کمزوروں اور نااہلوں کو مل جاتا ہے، اور تب
ہم کو جو ملتا ہے ہم اس سے، انکار نہیں کر سکتے۔
یہاں تک کہ
انکار برابر ہوتا ہے خوف کے۔ سوچو۔
نہ ہم بچ سکتے ہیں خوف سے اور نہ ہمت سے۔ جھوٹی باتیں
اور جھوٹی برائیاں
پیدا کی جاتی ہیں ہماری بے خوف وطن پرستی سے۔ ہمارے جرائم
نیک کام کہہ کر ہم پر ٹھونسے جاتے ہیں۔
ہمارے آنسو تباہی کے درخت سے گرتے ہیں
سالِ نو میں پلنگ خوں خوار
ہم کو غم ختم کر دے گا
اب بھی سوچو کہ
ہم اختتام تک نہیں پہونچے ہیں، اور میں

ایک کرائے کے مکان میں دم توڑ رہا تھا ذرا سوچو
یہ سب میں نے بے وجہ نہیں کہا ہے اور نہ میں نے
شیطان کی مدد سے یہ تصویریں تمہیں دکھائی ہیں۔
میں جو کہتا ہوں ایمانداری سے
میں تمہارے دل کے نزدیک تھا مگر وہاں سے مجھے
ہٹا دیا اور
میرا حسن خوف سے مرجھا گیا، اور
خوف موت سے۔
میرے جذبات کھو گئے ہیں، میں انھیں کیوں رکھوں
جب ہر چیز آلودہ ہو جاتی ہے۔؟
میں نے اپنی آنکھیں، اپنی زبان، اپنے کان، اپنے ہاتھ
کھو دئے ہیں۔
میں تمہارے پاس کیسے آؤں۔؟

(۴)

ہزاروں جھوٹی باتیں
ان کے سردبذیان کو تیزی بخشتی ہیں۔
جب احساس مرجاتا ہے تو لوگ ذائقہ تیز کرنے کے لئے۔
چٹ پٹی چیزیں کھاتے ہیں، (ویسے بھی یہ لوگ ہیں)۔
یہاں انتشار آئینوں کی زیادتی سے اور بڑھ گیا ہے۔
لیکن مکڑی کیا۔
اپنے کام روک دے گی، کیا آدم خور کیڑے
رُک جائیں گے؟ سب کے سب دُور پھینک
دئے گئے ہیں۔
وہاں، جہاں کانپتے ہوئے ریچھ بھی نہیں ہیں اور
وہ ذرہ ذرہ ہو گئے ہیں۔ وہ ہواؤں سے ٹکراتے ہیں'
طوفانی آب نائے میں، یا پھر
برف پر سفید پروں کی مانند پڑے ہیں۔ خلیج انہیں
لے لیتی ہے۔
اور ایک پیر مرد تجارتی ہواؤں سے ڈر کر۔
ایک کونے میں سو جاتا ہے۔
مکان کے مکیں۔
جیسے کسی ذہنِ خشک کے خیالات
ماہ خشک میں۔

ایک طنز

شاعر کی محبوبہ کا ایک خط

محمد ارشاد خاں

عزیزمن سلامت رہو۔

تمہارے پانچ منظوم خطوط موصول ہوئے۔ جواب دینے میں اس لئے تاخیر ہوگئی کہ میں پندرہ بیس روز سے اس بات کی متواتر کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح سے میں بھی آپ کی طرح اپنے خیالات کا اظہار نظم میں کروں لیکن نہ تو آپ جیسی تشبیہات و استعارات استعمال کر سکی اور نہ آپ جیسی سلاست اور روانی پیدا کر سکی۔ آخر بے انتہا مایوس ہو کر نثر میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی ہوں۔ اگرچہ آپ نے پچھلے کئی خطوط میں اپنے اس ارادے کا کنایتاً اشارہ فرمایا ہے کہ میں آپ سے تلمذ حاصل کرنے کے بعد بہت بڑی شاعرہ بن سکتی ہوں۔ اور آپ نے کئی مرتبہ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ میری نثر پڑھنے میں بھی نظم کی سی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اور شاید آپ نے اس وجہ سے مجھے "شیریں بیاں" جیسے میٹھے لفظ سے مخاطب کیا ہے۔

لیکن میرے رفیق! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ میری طبیعت کا رجحان شعر کہنے کی طرف راغب ہی کیوں سمجھتے ہیں۔ میں کیسے شعر کہہ سکتی ہوں؟ میں نے تو جہاں تک مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ شعر میں اس شخص کو قدم رکھنا چاہئے جو موزوں طبع ہو۔ اگر تلمذ حاصل کرنے سے ہی ہر کوئی شاعر بن جاتا تو غالباً اپنے صاحبزادے کو ہرگز یہ نصیحت نہ کرتے کہ

"در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل" (?)

لیکن میں نہیں سمجھ سکی کہ آپ شاعر ہونے کے باوجود بھی شعر کی نفسیات سے ناواقف ہیں۔

اور اس پر طرہ یہ کہ مجھے "شاعرہ" بننے کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی ہر نظم اور غزل میں میرے حسن کی تعریف میں اتنی مبالغہ آمیزی فرماتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے بے وقوف بنا رہے ہوں۔ کبھی میری صورت کو حور سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کبھی پری سے اور کبھی چاند سورج و گل لالہ سے۔ کبھی میرے بالوں کو سنبل مشک اور عنبر کی طرح بیان کیا جاتا ہے اور کبھی ظلمات، دام اور زنجیر سے اور اگر کبھی زلف کی درازی بیان کرنے کے "موڈ" میں آگئے تو اسے عمرِ خضر سے بھی زیادہ لمبا کر دیا۔ اور اگر کمر کی نزاکت بیان کرنے بیٹھے تو اسے بال سے بھی زیادہ باریک بیان کر دیا۔ کیا اس صریح جھوٹ بولنے کا ہی نام شاعری ہے؟ اور کیا اب شاعری صرف عشق فرمانے ہی کیلئے رہ گئی ہے۔ آپ نے جتنی بھی غزلیں مجھے بھیجی ہیں ان میں ایک غزل بھی ایسی نہیں جس میں اظہارِ عشق نہ فرمایا گیا ہو۔ کسی غزل میں تو اپنے دیوانے ہونے کا امکان ظاہر فرمایا گیا ہے اور کسی میں جدائی کے غم سے سوکھ سوکھ کر مر جانے کے خطرہ سے آگاہ کیا ہے۔ اور اگر کبھی مجھے خط بھیجنے میں دیر ہوگئی تو آپ نے اپنی غزل میں مجھے بیوفا، بیرحم، ظالم اور جلاد قرار دیا۔ اچھا اگر آپ کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا ہے تو سچ سچ بتا دیجئے کہ میرا خط دیر میں پہنچنا کیا مجھے بیرحم اور ظالم ٹھہرا سکتا ہے؟ جی ہاں آپ تو فرما دیں گے "بالکل"۔ لیکن حضور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں آپ کی طرح ہر وقت لکھتے بیٹھتے سوتے جاگتے شعر گوئی کیلئے نہیں بیٹھی رہتی ہوں۔ مجھے دن بھر گھر میں کھانا پکانا پڑتا ہے کپڑے دھونے پڑتے ہیں گھر کی صفائی کرنا ہوتی ہے۔ اور اسکے بعد اگر وقت ملتی ہے تو کچھ رسائل و کتب کا مطالعہ کرتی ہوں۔ آپ کی طرح تھوڑی رکھ کر دن رات شعر گوئی نہیں کرتی۔ آپ سے چار ملاقاتوں کا اثر دن کے میل سے اس قدر کالا ہو گیا ہے کہ آپ کو اپنی ہی مہندی بھی اس سے زیادہ صاف ہوگی۔ بال کھڑے کھڑے اور ہاتھوں پر زرد رنگ کر کے چوڑیاں کھڑی ہیں۔ نہ آپ کو کھانے کی فکر ہے نہ کمانے کی فکر۔ بس شام ہوئی اور آپ سنبھل کر ٹیپ ٹاپ ہو کر چل دیے۔ ادھر ادھر سے دو تین دوست جمع کئے اور ایک ہوٹل میں لے کر بیٹھ گئے۔ اور شروع کر دئے اپنے شعر سنانا۔ دوست بیچارے خوشامد کر رہے ہیں لیکن حضرت شاعر شراب کے سرور میں بیٹھے اپنا کلام سنا رہے ہیں اور زبردستی داد وصول کر رہے ہیں۔ اور اگر "موڈ" میں آ کر ذرا زیادہ پی گئے تو اپنے آپ کو حافظ، سعدی اور انوری سے بھی افضل سمجھنے لگے۔ غالب، مومن اور ذوق کو گالیاں دی جانے لگیں۔

خطوط و نکات

ابنِ فرید

جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ اس بار دو تخلیقات نے خاص طور سے متوجہ کیا۔ حصۂ نظم میں "سینما" اور حصۂ مضامین میں "اسلوب کی اساسی ہیئت" فاروق بانسپاری صاحب اِس دور میں فاضل قدر تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اُن کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھا تھا۔ "آپ کے دوست کا مجموعۂ کلام میں نے دیکھا ہے۔ ان کے اشعار اچھے ہیں۔ امید کہ ایک دن اس سے بہتر کہیں گے۔ فی الحال ان کے کلام میں ناپختگی ہے"۔ یہ ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ آج سترہ برس بعد علامہ کی اُمید پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔ خدا کرے فاروق صاحب اسلامی ادب کو گراں قدر سرمایہ سے مالامال کر سکیں۔

آپ نے سید شفیق احمد ایم اے کو معیار کی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ ابتدا میں اُن کے مضامین کا سلسلہ دیکھ رہا ہوں۔ ان کے مضامین سے اُس زمانہ میں بھی استفادہ کرتا ہے۔ اب دوبارہ اس سلسلہ سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے گا۔ ان پر اُن کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ اگر وہ کم از کم اس طرح کے اصولی مضامین سے معیار کو نوازتے رہیں تو یہ سلسلہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ شفیق صاحب سے ایک شکایت بڑی پرانی ہے اپنے مضمون میں وہ اُردو ادب سے اس قدر بے تعلق رہتے ہیں کہ اُن کے اصل مخاطب کے بارے میں اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا جب وہ مضمون اُردو میں لکھ رہے ہیں تو اُن کو اتنی تکلیف اور گوارا کر لی چاہیئے کہ اُردو ادب سے اُن کو جو مفید مطلب مواد ملتا جائے اُسے بھی ساتھ ساتھ پیش کرتے جائیں کیونکہ اُردو داں طبقہ کے لیئے یہ ضروری نہیں کہ وہ انگریزی ادب سے بھی کما حقہٗ واقف ہو۔

بہرحال اگر معیار میں صرف یہی دو چیزیں ہوتیں تو بھی معیار گرانقدر تھا۔ ورنہ حفیظ بھائی اور شاکر تسلیم صاحب کی غزلیں اور شمیم جاوید کی نظم بھی خوب سے خوب تر تھیں۔ معیار اس بار طباعتی لحاظ سے بھی بہتر ہے۔ البتہ غزلوں کے نیچے ختم شد کی دو سطریں ذوقِ سلیم پر گراں گذرتی ہیں۔

نقشِ اول میں حفیظ بھائی کا شذرہ ہمارے لئے باعثِ عبرت ہے۔ معیار ایسے جریدہ کا بے اعتنائی کی موت مر جانا ہمارے لئے شرمندگی کا موجب ہے۔ ساڑھے چار سال میں معیار نے ادیبوں کا جو قافلہ تیار کر دیا ہے وہ اُسکی افادیت اور تو قیر پر دال ہے۔ میرے ایسے بہت سے لکھنے والے ہیں جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز معیار سے کیا ہے اسلئے اُن پر فرض ہے کہ وہ اسکے استحکام کیلئے پوری پوری کوشش کریں۔ معیار کے احسان کا بدلہ احسان سے چکانے کا یہی وقت ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں ہمیشہ کی طرح معیار کے لئے کرتا رہوں گا لیکن حسبِ معمول یہ بھی نہ کہوں گا کہ میں نے یہ کیا!

خطوط و نکات کا سلسلہ خدا کا شکر ہے مسدیا جارہا ہے اور قارئین کی ترجمانی کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ابھی اسمیں کسی قدر ارتقا کی ضرورت ہے۔ اسے صرف معیار ہی سے متعلق ہونا چاہیئے بعض وقت ایسے ادبی مذاکرات کا بھی اِنمیں چھیڑا جانا ضروری ہے جو ہماری پوری توجہ کے مستحق ہوں۔ کسی گذشتہ شمارے میں سید انور علی عباس (علیگ) نے اس طرح کا ایک مسئلہ اُٹھایا تھا لیکن شاید وہ ہماری سہل پسندی کی نذر ہو گیا۔

اِس بار خطوط و نکات میں ایک دلچسپ بحث چھڑ گئی ہے۔ لوگ ابھی سے پختہ کاری کا دعویٰ کرنے لگے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ صرف شمیم صاحب ہی نہیں ہم سب ہی تو مشق و ابھرتے ہوئے فن کار ہیں ہم میں سے کوئی بھی ہمہ دانی اور پختہ کاری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مسٹر اعظمی صاحب نے تنقید کا جو اندازِ اختیار کیا تھا وہ درست ضرور تھا لیکن شمیم صاحب کے ایک اسلامی ادیب ہونے کی بنا پر اُسے انگیز کرنا چاہیئے تھا۔ اگر ہم میں تلخ و تند تنقید برداشت کرنے کا مادہ نہیں تو پھر ہم اپنی فنی اور مقصدی اصلاح کر سکیں گے مجھے خطرہ ہے کہیں شمیم صاحب میری ان دلی معروضات پر بھی برہم نہ ہو جائیں لیکن اسوقت میں ان کی شخصی واقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن سے پُرخلوص توجہ اور عذر کا طالب ہوں۔ لوگ آپکے حق اور اپنی مخالفت میں بھی نہیں کہیں گے۔ یہ مسٹر اعظمی تو آپکے حلقے کے فرد ہیں۔ وہ آپکے بارے میں اس طرح کی رائے کے اظہار کا حق بھی رکھتے ہیں۔

اس بار پھر میں نے ایک ترجمہ روانہ کیا ہے۔ یہ افسانہ ہف والپول کے The TARN کا ترجمہ ہے۔

خیال اپنا اپنا

ادارہ

ماہنامہ "تعمیر انسانیت" لاہور

ادارہ :- کوثر نیازی، عبدالحمید

قیمت سالانہ :- چھ روپیہ - فی پرچہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :- ماہنامہ "تعمیر انسانیت" موچی دروازہ لاہور -

یہ ماہنامہ حال ہی میں سامنے آیا ہے۔ چند پرچوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارباب نظم و ترتیب کے پیش نظر وہ کون سے مقاصد ہیں جن کے حصول کیلئے وہ ادب کی اس کساد بازاری کے دور میں بھی رسالہ نکالنے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ مقاصد ہیں ادب کو انسانیت کی تعمیر کی راہ پہ لے جانا، تعمیری نظریات اور صالح افکار کو پھیلانا، پاکیزہ لٹریچر پسند کرنیوالوں کی پیاس بجھانا۔ یقیناً یہ مقاصد مبارک ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کیلئے پوری قوت سے جدوجہد کی جائے - اور جو لوگ اس کام کو کسی صورت میں انجام دے رہے ہیں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اس لحاظ سے ماہنامہ "تعمیر انسانیت" ہر طرح اس قابل ہے کہ لوگ اس کی بقا کی جدوجہد میں ہاتھ بٹائیں -

یہ تو رہا معاملہ مقاصد کا - اور ایک اچھے مقصد کیلئے کام کرنیوالوں سے تعاون کا - اسکے ساتھ ہی کچھ فرائض "تعمیر انسانیت" کے کارکنوں پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ رسالہ کا معیار طباعت و کتابت بہتر کرنا اور اچھے مضامین نظم و نثر کا جمع کرنا ادارۂ "تعمیر انسانیت" کا کام ہے - کوثر نیازی اور عبدالحمید دونوں صاحبان تعمیر پسند حلقوں میں متعارف ہیں ہمیں امید ہے کہ ان حضرات کی موجودگی میں رسالہ خوب ترقی کرے گا -

"Fighting communism by oppression"

مصنف نعیم صدیقی - قیمت چھ آنے -

ملنے کا پتہ :- جماعت اسلامی پبلیکیشنز کراچی

اس کتابچہ میں پاکستانی حکومت کے اس اقدام پر تنقید کی گئی ہے جو حکومت نے پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دیکر اسکے دفتروں کو مقفل کرکے اور اسکے تمام بڑے کارکنوں کو جیل بھیجکر کیا ہے۔ مصنف اس کا معترف ہے کہ کمیونسٹ تحریک اسلامی افکار و حالات کی دشمن ہے اور ملک کے لئے مضر، اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ پاکستان کا حکمران طبقہ اس تحریک کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد کوئی صحیح قدم اُٹھائے -

نعیم صدیقی نے اس مقالہ میں بتایا ہے کہ جبر و تشدد کے ذریعہ کمیونزم کو نہیں روکا جا سکتا چونکہ کوئی بھی حکومت کمیونسٹوں کے حق میں زار روس سے بڑھ کر جابر نہیں ہو سکتی۔ لیکن زار کا تجربہ بری طرح ناکام ہوا امریکہ کی اقتصادی اور فوجی امداد بھی اس مقصد کے لئے قطعی کارآمد نہیں ہے چین میں بیرونی امداد کے ذریعہ کمیونزم کو پسپا کرنے کی انتہائی کوشش کی جا چکی ہے نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے -

پاکستان کے حکمران اسلام کے نعرہ کو بھی کمیونزم کے خلاف بطور ایک ہتھیار کے استعمال کرنا چاہتے ہیں - اسمیں شک نہیں کہ اقتصادی بدحالی کے باوجود پاکستان کا کمیونزم سے اتنی دور رہنا وہاں کے عوام کے مذہبی جذبہ ہی کی وجہ سے ہے لیکن یہ مسئلہ کا کوئی مستقل حل نہیں ہے چونکہ پاکستانی حکمرانوں کا رویہ اسلام کیساتھ غیر مخلصانہ ہے - وہ خود کو اسلام کے مطابق ڈھالنے اور ملک کے نظم و نسق کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام انکی محلسرا کے دروازہ پر اُن کا باڈی گارڈ بنا کھڑا رہے اور اُن کی جاگیرداریوں، زمینداریوں، سیاسی جوڑ توڑ عیاشانہ اخراجات، اور معاشی ناہمواریوں کی حفاظت کرتا رہے - پاکستانی حکمرانوں کی خواہش ہے کہ وہ خود امیر بخارا بنے بیٹھے رہیں اور اسلام کو غیر اسلامی طرز زندگی کی مدافعت کیلئے محاذ جنگ پر روانہ کر دیں - .

مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اس قسم کی تدبیریں کمیونسٹ خطرہ کا توڑ نہیں ہو سکتیں اور اسکے ساتھ ہی کچھ ٹھوس اور قابل عمل تجاویز پیش کی ہیں جن سے پاکستان میں کمیونزم کا حقیقی سدباب کیا جا سکتا ہے - کتابچہ معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے عمدہ اور قابل مطالعہ ہے -

تعمیری اور اسلامی ادب کا مفہوم
اس کی بنیادی قدریں
اس کا تنقیدی نقطۂ نظر ——— معلوم کرنے کے لئے

ماہنامہ معیار کے
تنقید نمبر

کا مطالعہ فرمائیے

نظریاتی اور عملی تنقید پر ٹھوس مقالات رکھنے والی پونے دو سو صفحات کی بیش قیمت پیش کش
[illegible] صرف ایک روپیہ [illegible] حاصل کیجیے

ملنے کا پتہ — **مکتبۂ معیار میرٹھ**

ماہنامہ "زندگی" رامپور یو۔پی

اس دور میں جبکہ الحاد و بے دینی کی [illegible] علی الاعلان [illegible]
جبکہ مادیت کو سنوارنے والی [illegible] کی جانب [illegible]
جبکہ دنیا خدا کے [illegible] ہوئے دین [illegible] سے بیزار ملک نا آشنا ہو گئی ہے
ضرورت ہے کہ دنیا کو [illegible] ہوئے اس نظام زندگی سے روشناس کرایا جائے جو تمام پیچیدہ
مسائل کا واحد حل ہے اور جو خدا [illegible] ماہنامہ زندگی یہی ضرورت پوری کر رہا ہے
آپ انہیں ہر ماہ سنجیدہ علمی مضامین ملیں گے ، اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے والے مقالے
پڑھیں گے ، انسانی زندگی [illegible] ٹھوس علمی و دینی [illegible] مطالعہ کر سکیں گے اور اس طرح اسلامی نظام
سے کافی حد تک واقفیت حاصل کر سکیں گے ۔ یہ ماہنامہ [illegible] سال سے یہ خدمت انجام دے رہا ہے ۔

سالانہ چندہ : پانچ روپے
منیجر رسالہ "زندگی" دفتر رسالہ "زندگی" رام پور یو۔پی

(پرنٹر پبلیشر محمد جمیل خاں نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ سے شائع کیا)


معیار
The
Meyar
Monthly
FIROZI
54

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ـــــ ۵
شمارہ ـــــ ۹

اکتوبر ۱۹۵۵ء

ترتیب دینے والے

نجم الاسلام
بدر فاروقی ۔ایم۔اے

دفتر ماہنامہ "معیار" خندق اسٹریٹ میرٹھ

زرِ تعاون

سالانہ	پانچ روپے
ششماہی	تین روپے
فی پرچہ	آٹھ آنے

ترسیلِ زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب سلی لائن جیکب آباد

ترتیب

نظمیں

مقالے اور مضامین

غزلیں

افسانے

خطوط و نکات

خیال اپنا اپنا

نقشِ اوّل

تعمیری ادب کی تحریک نے عالمی ادب کو کئی نئی اصطلاحیں دی ہیں۔ یا اگر وہ پہلے سے موجود تھیں تو ان میں نئے اور جاندار معانی ڈال کر انہیں نئی زندگی بخشی ہے ان کی صحیح حیثیت کو نکھارا ہے۔ ان کے دھندلے پس منظر کو ایک صاف شفاف تعبیر تاریخ سے جگمگا یا ہے۔ ان کے فلسفیانہ پہلوؤں کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اب یہ ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا کہ جو شخص تعمیری ادب اور اسلامی ادب سے واقف ہو چکا ہے وہ ان اصطلاحوں کو سکران کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ رہے اور اس تحریک کو نظر انداز کر دے جو انہیں تعمیری ادب کی تحریک کے اثر سے حاصل ہو گئی ہے۔ ابھی تک اس تحریک کا دائرہ اُردو تک محدود ہے۔ اس لئے مغربی ادیبوں اور نقادوں کو تو چھوڑ دیجئے ہاں کم سے کم اردو داں حلقہ میں ان اصطلاحات کی اہمیت واضح ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ آگے چل کر جب ہمیں مختلف زبانوں میں کام کرنے کے مواقع ملیں گے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہومات عالمگیر پیمانے پر بھی مقبول ہو جائیں۔

"تعمیر پسندی" ہی کو لیجئے۔ یہ اصطلاح اسلامی ادب کی تحریک سے پہلے موجود ضرور تھی لیکن اُردو میں نہیں مغربی ادب میں۔ اُردو میں اس کا استعمال ایک بالکل معمولی لفظ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ عموماً یہ معنی وابستہ سمجھے جاتے تھے کہ یہ فقط تخریبی عمل، توڑ پھوڑ، اکھاڑ پچھاڑ کی ضد ہے۔ اس میں اصلاحی پہلو ہے اور بس۔ اور معانی بھی صرف لفظ تعمیر کے ساتھ وابستہ تھے۔ ترقی پسندوں نے ہمیشہ ترقی پر اکتفا کیا۔ اس لفظ کے استعمال پر زور نہیں دیا دراصل یہ لفظ ان کے طرزِ عمل سے زیادہ مناسبت بھی نہیں رکھتا تھا۔

مغربی ادب و تنقید میں یہ لفظ البتہ ضرور پایا جاتا ہے۔ 'CONSTRUCTIVISM' کے نام سے ہمیں ایک اصطلاح مغربی بالخصوص روسی ادب میں ملتی ہے۔ دراصل یہ اصطلاح بعض روسی ادیبوں نے ۱۹۲۲ء میں استعمال کرنی چاہی تھی لیکن انہیں اس لفظ کو عام کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کے نظریاتی پہلو پر تمام زور دینے کے بجائے اسے بعض ایسے پہلوؤں سے متعلق کر دیا جو فنی تھے اور اسٹیج کی ترقی سے وابستہ تھے۔

سوویت ادبی فنکاروں کا اس محدود گروپ نے جس کی تشکیل ۱۹۲۲ء میں ہوئی تھی اس اصطلاح کے تحت ادبی تخلیقات کے نظریاتی پہلو کو جدید ترقی پذیر فنی پہلوؤں سے آمیز کرنے کی کوشش کی۔ نظریاتی پہلو کا تخم شاید اس لئے دینا ضروری سمجھا گیا کہ اس وقت بھی آج کی طرح ہر چیز کو سوویٹ رنگ میں رنگنے کی کوشش زوروں پر تھی اور اصل مقصد جو تھا وہ یہ تھا کہ فنی پہلوؤں پر زور دیا جائے بالخصوص روانی۔ اختصار اور گنجائش پر۔ یہ تحریک یعنی CONSTRUCTIVISM اس وقت اس دعوے کے ساتھ اٹھی کہ یہ موضوع کے انتہائی ارتقا کا ایک پورا نظام ہے۔ مگر اس کی تطبیق زیادہ تر اسٹیج کی ترقی سے متعلق رہی جس سے واضح ہے کہ اس اصطلاح کے واضعین کے سامنے کوئی وسیع تر مقصد نہ تھا۔ اس ادبی گروپ نے فقط اتنا کیا کہ ترتیب غیر نمایندہ قسم کی رکھی۔ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائے جا سکنے والے پلیٹ فارموں سیڑھیوں اور ڈھانچوں کو رواج دینا چاہا۔ جو گھر، فیکٹری یا اسٹیج کے نئے سطح کا کام دے سکیں۔ [DICT OF LIT. TERMS BY Shipley]

ظاہر ہے کہ اگر اس اصطلاح کے ساتھ اتنا ہی مفہوم وابستہ ہو تو یہ کوئی اونچی چیز نہیں اس تاریخی حوالے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعمیری ادب کی تحریک سے پہلے جن معنوں میں بھی تعمیر پسندی یا CONSTRUCTIVISM کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ نہایت محدود رہے ان میں نظریات و رجحانات کے وسیع تر مفہوم کو پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں دی گئی۔ یہ تعمیری ادب کی تحریک ہے جس نے اس کے حدود کو وسعت دے کر اس میں ادبی نظریہ کی ایک نئی دنیا آباد کر دی۔ ایک نئے عالم کی طرح ڈال دی۔ یہ طرح نو اسلام کا آفاقی نظریہ ہے۔ اس طرح نو پر ادب اور تنقید کی جو عمارت تعمیر پسند جن کا رہنا رہے ہیں وہ یقیناً پائیدار ثابت ہو گی۔ اور ایک مثال کا کام دے گی۔ ادیبوں اور فن کاروں میں ایک نئی زندگی کا احساس پیدا کرے گی۔ انہیں اسلام کے نظریہ ادب سے قریب تر لا کر تخلیقی قوتوں کو صحیح راہ پر لگا دے گی۔ ان خوشگوار تبدیلیوں کو جو سماج کی نئی تعمیر کے لئے ضروری ہیں ــــ ان تمام اخلاقی پابندیوں کو جن کا اسلامی افکار ہم سے مطالبہ کرتے ہیں ــــ اور ان سب اصلاحی اور زندگی بخش جذباتِ عمل کو جو اسلام کی بنیاد ہیں اور ہمیں ایک انسانی رجحان دیتے ہیں ــــ ہم اگر ایک لفظ سے تعبیر کرنا چاہیں تو "تعمیر پسندی" پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ اصطلاح اب اپنے نئے معانی کے لحاظ سے فنی نہیں بلکہ نظریاتی ہے۔ اور ایک پوری تحریک کی نمایندگی کرتی ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعمیر پسندی کے لغوی معنی اسلامی فکر کے مفہوم سے خالی ہیں وہ بے شک اپنی جگہ ایسا ہی سمجھتے رہیں کیونکہ ان کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے آخر وہ پس منظر کیسے مٹ جائے گا جسے سیکڑوں دماغ اپنی تمام تر تخلیقی اور تعمیری قوتوں سے واضح طور پر بنا چکے ہیں اور بنا رہے ہیں۔

اسلامی ادب کی اصطلاح بھی ادبی حلقوں کے لئے نئی ہے۔ بعض لوگ جو اسلامی ادب کی تحریک سے اب تک بالکل نا آشنا ہیں۔ اس کو مذہبی مسائل سے متعلق سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کا دار و مدار اسلام کے اس تصور پر ہے جو وہ اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں۔ جو لوگ اسلام کو فرقہ پرستوں کا مذہب سمجھتے ہیں وہ اسلامی ادب کو شاید اس سے بھی زیادہ تنگ نظری کے ساتھ دیکھیں لیکن جو لوگ جانتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی نظریہ کا نام ہے۔ ایک وسیع نظامِ فکر ہے۔ وہ چاہے اسلام سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن کبھی اسلامی ادب کے نام سے چونکیں گے نہیں، اس کی مثال اقبال سے دی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ اقبال کو فرقہ پرست ادیب بھی کہتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اسلام سے اختلاف رکھنے کے باوجود نہایت واضح طور سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اقبال نے اسلام کا جو نظریہ اپنے کلام میں پیش کیا ہے وہ آفاقی ہے اور اگر وہ ہندی مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنانے کے بجائے صرف اپنے محلہ کے لوگوں کو اپنا مخاطب سمجھ کر بھی شعر کی تخلیق کرتے۔ تب بھی صرف مخاطبت کی وجہ سے پیغام محدود نہ ہوتا بلکہ آفاقی ہی رہتا۔

غرض اسلامی ادب کے مفہوم کا سارا دار و مدار اسلام کے تصور پر ہے۔ اسلامی ادیبوں نے اقبال کی طرح اسلام کے آفاقی تصور کو اپنایا ہے بلکہ ایک حالت تو وہ نظریاتی وضاحت کے معاملے میں اقبال سے آگے ہیں کیونکہ وہ کسی طرح کی ایسی ذہنی الجھن سے دوچار نہیں ہیں جیسی الجھن سے اقبال کو وطنیت سے اسلام کے آفاقی تصور تک آنے میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان کا فکری مقام واضح ہے۔ اس لئے جس اصطلاح کو یہ ادیب عام کر رہے ہیں وہ اپنے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے رہے گی۔ جو لوگ ابھی اس اصطلاح سے چونکتے ہیں کل وہی جب اس کے وسیع مفہوم سے متعارف ہو چکے ہوں گے تو ان کے چونکنے کا موقع پیش نہ آئے گا۔ اب بھی ادبی حلقوں میں یہ لفظ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ اور آگے چل کر اس کے مفہوم سے سب آشنا ہو جائیں گے۔ اس وقت یہی لفظ ہوگا جو اپنے اندر ایک پوری ادبی تاریخ ایک پوری ادبی تحریک ایک پورا فلسفہ سمیٹے ہوئے زبانوں پر آیا کرے گا۔ اور عام لوگ تک اس کی اہمیت کو سمجھ جائیں گے۔

اس مرتبہ معیار میں کلام غالب کی ایک نئی شرح شائع کی جا رہی ہے۔ یہ شرح منظور احسن صاحب عباسی کے قلم کی رہین منت اور موصوف کے طویل تعلیمی تجربہ کا حاصل ہے۔ اس کی خصوصیت خاصہ اس کا اختصار ہے۔ جس نے کہیں بھی ابہام کی صورت اختیار نہیں کی ہے۔ اختصار کے باوجود شرح اپنی جگہ واضح ہے۔ اور شارح کے شیوۂ کار آگہی کو ظاہر کرتی ہے

امید ہے کہ عام حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ اہلِ نظر اس کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ شارح کا منشا بھی یہی ہے کہ اس کے بارے میں اہل نقد و بصر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اس لئے قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی رائے سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔

رہی اس کی عام افادیت تو ہم اس کی طرف سے بھی مطمئن ہیں۔ غالب کی شرحوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ ایک رسالہ میں کسی ایسی شرح کی اشاعت، جو اپنے اندازِ اظہار بیان کا مشاقانہ رنگ لئے ہوئے ہے یقیناً مفید رہے گی۔ ایسی کوشش ایک عظیم کلاسیکی شاعر کو یاد دلا کر عام ادبی حلقوں اور نئے آنے والوں کے لئے رہنمائی کا بہت سا سامان بہم پہونچائے گی۔ خصوصاً آج کے دور میں تو اس کی افادیت بہت زیادہ ہے جبکہ بعض غیر متوازن ادبی تحریکوں کے اثر سے کلاسیکل ادب سے ہماری واقفیت اور ہماری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے اس میں اس بات کو بھی دخل ہو کہ ہمارا معیارِ تعلیم دن بدن گر رہا ہے۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات غالب کو اپنی ذہنی سطح سے کہیں زیادہ اونچا سمجھ کر محض اس کی گاہ بگاہ تعریف پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور خود کو گہرے مطالعہ سے بے نیاز کر لیتے ہیں۔ ایسے میں شرح کچھ نہ کچھ مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

تنویر احمد علوی

آئین سٹائن

یہ تیرے فکر و نظر کی بلندیوں کا شکوہ
زمیں پہ جس نے نئے آسماں بنائے ہیں
یہ تیرے ہوش و خرد جن کی رہنمائی نے
نئے طریق نئے کارواں بنائے ہیں

ترے خیال کا فانوس جب ہوا روشن
نظامِ کہنۂ عالم میں وہ کشش نہ رہی
تری نگاہ سے بدلا یہ میکدے کا نظام
کہ دورِ ساغر و مینا کی وہ روش نہ رہی

یہ تیرا فکر ہستی کے ساز کے پردے
کہ جو ہیں تار بھی مضراب بھی ترنم بھی
یہ نظریاتِ اضافیت و مسافتِ وقت
کہ جن کی زد میں ہیں ذرّہ بھی ماہ و انجم بھی

ترے نفس سے فسونِ آب و گِل کا ٹوٹ گیا
بدل گئی یہ فضا زلیست کے فسانے کی
یہ تیری روشنیٔ طبع یہ نئی تحقیق
کلید کہئے جسے ایٹمی زمانے کی

یہ جزوِ لاتیجزا یہ ذرّۂ ناچیز
ہیں بجلیوں کے نشیمن اس آبگینے میں
محیطِ زیست کا یہ قطرۂ تنک مایہ
کسے خبر تھی کہ طوفاں ہیں اس کے سینہ میں

بھری ہے شیشۂ شبنم میں آتشِ سیال
شرار و شعلہ ہیں پنہاں گل و سمن میں بھی
تری نگاہ نے ثابت کیا زمانے پر
کہ آفتاب ہیں ذرّوں کے پیرہن میں بھی

یہ انکشافِ حقیقت عظیم تر ہی سہی
مگر حقیقتِ اعلیٰ کو کس نے دیکھا ہے
نظارہ سوز ہے بیشک یہ جلوۂ صورت
جمالِ شاہدِ معنیٰ کو کس نے دیکھا ہے

یہ مادّہ یہ انرجی یہ برق و کاہ ربا
یہ زندگی کہ بہر نوع پیچ و تاب میں ہے
یہ خود ہے کوزہ و کوزہ گر و گلِ کوزہ
کہ پردہ گیر کوئی اور اس نقاب میں ہے

خلوص تھا ترے علم و یقیں کی دنیا میں
رہی ہمیشہ صداقت کی جستجو تجھ کو
تری نگاہ سے ٹوٹا طلسم رنگِ مجاز
کہ تھی مشاہدۂ حق کی آرزو تجھ کو

وہ علم جس سے فروزاں ہوں زندگی کے چراغ
قیاس و وہم و گماں کے سوا کچھ اور بھی ہے
یہ کائنات یہ تنظیم ثابت و سیار
فقط زمین و زماں کے سوا کچھ اور بھی ہے

رہینِ شانہ کو مشاطگی بھی ہے درکار
عروس فکر کی زلفیں سنوارنے کیلئے
صبا کو صبح کے جلوؤں کی بھی ضرورت ہے
چمن کے پھولوں کی رنگت نکھارنے کیلئے

تو آج ایک حقیقت بھی ہے فسانہ بھی
کہ حق سے دور ہے، حق کی تجھے تلاش بھی ہے
ہے تیرا معجزۂ فکر ایک سحرِ حلال
کہ بت شکن بھی ہے تو اور بت تراش بھی ہے

شمع

فاروق بانسپاری

شمع سوزاں تیرے دل میں اضطرابِ غم ہے کیوں　　محفلِ عشرت میں وقفِ گریۂ پیہم ہے کیوں
پیکرِ غم مجھ کو وجہِ اشک افشانی بتا　　گر رہا ہے آگ کے شعلے سے کیوں پانی بتا
تیری خاموشی میں پنہاں اِک جہانِ آہ ہے　　کیا مآلِ زندگی سے دل ترا آگاہ ہے
کہہ رہا ہے اضطرابِ دود تیرے دل کا راز　　منکشف پردے کی پرچھائیں سے ہے محمل کا راز
موجبِ ہنگامۂ محفل ہے خاموشی تری　　دیدنی ہے بزم میں شانِ وفا کوشی تری

کیا خبر اُس کو جو رمزِ عشق سے بیگانہ ہے
لَو تری لرزاں ہے یا مضطر دلِ پروانہ ہے

فخرِ شرکت دے مجھے بھی اس غمِ جانکاہ میں　　ہمسفر ہوں میں بھی تیرا زندگی کی راہ میں
تجھ کو قدرت نے ہے تاجِ شعلۂ مضطر دیا　　چشمِ پُرنم کو مری گنجینۂ گوہر دیا
تیری پیشانی ہے روشن تیرگیٔ شام سے　　روشنی ملتی ہے مجھ کو ظلمتِ ایام سے
خونِ دل کے فیض سے محفل میں ہے تو سرخرو　　داغِ ناکامی ہے میرے آئینے کی آبرو
گُل ترے شعلے میں ہو جاتا ہے پیدا دود سے　　پھول کھل اُٹھتے ہیں میرے آتشِ نمرود سے

کوہِ غم سر پر اٹھائے تو بحالِ زار ہے
میرے دوشِ ناتواں پر دو جہاں کا بار ہے

ایک ہے ہر چند ہم دونوں کی راہِ زندگی　　مختلف لیکن ہے مقصودِ نگاہِ زندگی
جائے شاہیں اور ہے کرگس کی منزل اور ہے　　جس کے اندر ہے مری لیلیٰ وہ محمل اور ہے
چل رہی ہے تو مگر واقف نہیں اِس راز سے　　میں سمجھ لیتا ہوں ہر انجام کو آغاز سے
موت اِس محفل میں تیری زندگی کا ہے مآل　　میرے جلوے غیر فانی میری ہستی لازوال
دل ترا محرومِ سوز و امتیازِ زندگی　　میرے سوز و ساز میں مضمر ہے رازِ زندگی
تُو چراغِ راہ ہے نا آشنائے بام ہے　　میں مُسلماں ہوں مجھے دونوں جہاں سے کام ہے*
دینے والے نے دیا دل کو ترے سوزِ نمود　　میرے ذمہ کاروبارِ احتسابِ ہست و بُود
میری فطرت کی تجلّی خاص بھی ہے عام بھی　　آفتابِ صبح بھی میں ہوں چراغِ شام بھی
کام جب لیتا ہے باطل قوتِ شمشیر سے　　زلزلے اُٹھتے ہیں میرے نعرۂ تکبیر سے
سختیٔ راہِ وفا پر نرم ہو جاتا ہوں میں　　حق کی آہِ سر و سُن کر گرم ہو جاتا ہوں میں

میرا شیوہ ہے یہی میرے لئے وجہِ شرف
برمحل سر در گریباں، سر بسجدہ، سر بکف

شفیق فتحپوری

شاعری

شاعری برائے ادب ہے یا برائے زندگی
آج کرنی ہے شفیقؔ اِس راز کی پردہ دری

ذہنِ انسانی پہ کرنا ہے حقائق آشکار
دُور کرنا ہے افق سے جاہلیت کا غبار

مدّتیں گذریں ہمارے شاعر و مضمون نگار
ہیں اسیرِ کاکل و گیسوئے جاناں کے شکار

صنفِ نازک پر کسی کی شاعری کا انحصار
کوئی شیدائی لبوں کا کوئی عارض کا شکار

جی رہے ہیں آج تک کچھ وامق و عذرا پر
کر رہے ہیں فخر کچھ پس ماندۂ اجداد پر

آج تک غالب ہے ان پر عیشِ رفتہ کا اثر
کرتے نہیں پاسِ گل و بلبل سے یہ اب تک حذر

ان کو ورثہ میں ملا ہے صرف لفظی داؤ پیچ
ان کے نغموں میں حقائق کی گہرباری ہے ہیچ

شاعری ہے گر اصولِ قافیہ بندی کا نام
تُف ہے ایسے فن کو ایسی شعر گوئی کو سلام

یہ حقیقت ہے مجھے اِس میں نہیں ہرگز کلام
شاعری میں ہے جمالیات کا بھی اِک مقام

لیکن اے عاقل رفیقو، اہلِ دانش دوستو
کیا ضرورت ہے فقط جام و سبو کی وقت کو

کیا شمیمِ سنبل و سوسن ہے دردِ دل کا علاج
کیا سنور جائے گا اِس سے نظمِ عالم کا مزاج

کیا مداوائے جہاں ہے مستِ شیریں داستاں
کیا سکوں پرور ہیں حُسن و عشق کی رعنائیاں

کیا پلٹ سکتے ہیں طوفاں غمزہ ہائے ہوشاں
خال و خد کی دلکشی ہے کیا تقاضائے جہاں

زندگی کا کونسا گوشہ ہے جو محفوظ ہے
کھا رہا ہے ابنِ آدم آج ٹھوکر پے بپے

مفلسوں کی آہ سے معمور ہے ایوانِ عدل
بک رہے ہیں کوڑیوں کے مول پھر انصاف و عقل

پردۂ جمہوریت میں خود پرستی کا نمود
اشتراکی بطن میں سرمایہ داری کا وجود

آمریت کا عَلَم لہرا رہا ہے چار سُو
بڑھ رہا ہے یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

بڑھ رہی ہیں شورشیں لمحہ بہ لمحہ پل بہ پل
کیا تمہاری شاعری ہے چاک دامانی کا حل

آؤ کہ ڈالیں بنائے نو پہ تعمیرِ ادب
روزِ روشن میں کریں تبدیل یہ تاریک شب

ماہ پاروں کے خمار آگیں فسوں کو توڑ دیں
نازنینانِ سمن بر کی کلائی چھوڑ دیں

توڑ دیں ہاں توڑ دیں یہ حلقۂ جام و سبو
خاک کے ذرات میں پیدا کریں ذوقِ نمو

نوجوانوں کو بتا دیں آج رمزِ شاعری
شاعری وہ ہے جو ہو ہمرشتۂ پیغمبری

شاعری وہ ہے جو دیتی ہو پیامِ زندگی
جس کے آگے ماند ہو خورشید کی رخشندگی

شاعری وہ ہے جو ہو مجموعۂ فکر و عمل
جس سے کھل اُٹھتا ہو قلبِ آدمیت کا کنول

شاعری وہ ہے جو فطرت کے دریچے کھول دے
اپنے نغموں سے نئی فکروں کے موتی رول دے

شاعری وہ ہے کہ جس کی خاک میں ہو کیمیا
وسعتوں میں جس کی گم ہو وسعتِ ارض و سما

شاعری وہ ہے جو دیتی ہو سبق کردار کا
فرق واضح کر دے جو عالم پہ نور و نار کا

شاعری وہ ہے جو ہو مستغنیٔ فردا و دوش
جس کی ہر ہر لے میں پوشیدہ ہو پیغامِ سروش

شاعری وہ ہے عیاں ہو جس سے رازِ کائنات
جس کی ضو سے جگمگا جائے چمن زارِ حیات

شاعری وہ ہے جو بخشے آہنی قلب و جگر
نظمِ عالم میں کرے پیدا نئے شام و سحر

شاعری وہ ہے نہاں ہو جس میں ذوقِ انقلاب
تیغ و شمشیر و سناں ہوں جس کے طاؤس و رباب

جس کا پرچم اُڑ رہا ہو قصرِ استبداد پر
ضرب جس کی ہو فسادِ عالمِ ایجاد پر

جو نہ ہو حلقہ بگوشِ فرقہ و قوم و وطن
عالمِ انسانیت ہو جس کا موضوعِ سخن

پیکرِ خاکی کو بخشے جو حیاتِ جاوداں
جس کے نغموں سے اُبل پڑتا ہے بحرِ بیکراں

جس کی آنکھوں میں ہو ماضی کے درخشاں واقعات
جس سے حل ہوں عہدِ مستقبل کے پیچیدہ نکات

جس کے ابرو کے اشاروں پر ہو رقصاں کائنات
جھوم اُٹھے نغمات پر جس کے چمن زارِ حیات

جس کے سینے میں ہو روشن زندگی کا آفتاب
جس کے ہاتھوں میں کڑکتی ہو کمانِ انقلاب

گیسوؤں کے پیچ و خم میں زندگی ممکن نہیں
لوریوں کے زیر و بم میں زندگی ممکن نہیں"

نظم

برق علوی کاکوروی

نور و ظلمت

کون پوری کر رہا ہے سنّتِ فرعون آج　　　کس کے دم سے رُوئے ہستی پہ ہے ظلمت کا حصار
سر کو انسانوں کے اونچا کر رہا ہے کون آج　　　کس کے دم سے آدمیت کا بھرم ہے برقرار

ننگِ تہذیب و شرافت کون ہے۔ بولے کوئی
داعیِ خلق و مروّت کون ہے۔ بولے کوئی

کون ہے نخچیرِ باطل، کون ظلمت کا اسیر　　　کون "مشرق" کا شکاری، کون "مغرب" کا شکار
کس نے بیچے ہیں سیاست کی دکانوں پر ضمیر　　　کس نے پھیلایا ہے مصری زندگی میں انتشار

بانیِ ظلم و شقاوت کون ہے۔ بولے کوئی
پیکرِ حق و صداقت کون ہے۔ بولے کوئی

کون ظلم و بربریت پر ہے نازاں آج بھی　　　کون دھمکاتا ہے فوجی قوتوں سے بار بار
کون ہے "انسانیت" پر اپنی شاداں آج بھی　　　کس پہ رازِ زندگی ہو گیا ہے آشکار

نیل کی وادی یہ کس کے خوں سے لالہ زار ہے
مصر کی غیرت پہ افرنگی کا مہلک وار ہے

ظلم کے ہاتھوں میں کب تک زندگی کی باگ ہے　　　تا بہ کے برپا رہے گا فتنۂ زندان و دار
یہ نظامِ بربریت خاک میں ملنے کو ہے　　　ٹوٹ جائے گا طلسمِ قید و بند و اختیار

سامری ہاتھوں سے چھن جائے گی جادو کی چھڑی
ختم ہو جائے گا یہ افسونِ زور و اقتدار

(پروفیسر) منظور احسن عباسی

مُرادِ غالب

یعنی

دیوانِ غالبؔ کی شرح

ا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

شوخی بمعنی بے پروائی۔ کس کنایہ از ذاتِ حق۔ کاغذی پیرہن ہونا بمعنی تباہی ہونا یعنی ہر شخص کو شکایت ہے کہ نقاشِ ازل نے اُسے ایسا کیوں بنایا۔ (قلیلٌ من عبادی الشکور)

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پُوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا

کاوکاو بمعنی کوفت و کاوش یعنی تعب تنہائی کی کوفت میں رات کاٹنا۔ اور دن کرنا ایسا ہی دشوار ہے۔ جیسا کوہکن کو پہاڑ کاٹ کر جُوئے شیر کا لانا دشوار تھا۔ (درازیِ شبِ ہجراں)

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یعنی اہلِ عشق قتل ہونے کے اس قدر مشتاق ہوتے ہیں کہ جذبۂ شوقِ قتل تلوار کی دھار کو، تلوار سے باہر کھینچ لیتا ہے۔ (شوقِ جاں نثاری)

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آگہی بمعنی ادراک۔ عنقا بمعنی عسیر الحصول۔ یعنی اگر ادراک چاہے کہ بحسرا استماع میری تقریر کا مدعا پائے۔ تو یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اُس کا مدعا پانا عنقا کی طرح سخت دشوار ہے۔ (دشواریِ فہمِ مطالبِ غالب)

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

آتش زیرِ پا بمعنی بے قرار یعنی قید میں بھی۔ شدتِ اضطراب کا یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے پیر کی بیڑیاں جلے ہوئے بال کی طرح بودی ثابت ہوتی ہیں۔ (مبالغۂ اضطراب)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

بروئے کار نہ آیا یعنی منظرِ عام پر نہ آیا یعنی صحرائے عشق شاید چشم حاسد کی طرح تنگ تھا۔ کہ قیس کے سوا کوئی اور مردِ میدان اُس میں نہ آیا۔ اشارہ یہ ہے کہ جنونِ عشق ہر شخص کا بہرہ نہیں۔ بقول۔
نہ ہر ہوسناکے سزاوار جام و سندان باختن
(کمیابیِ عشقِ صادق)

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

نقش درست کرنا بمعنی معرضِ وجود میں لانا۔ دود کنایہ از آشفتہ حالی۔ یعنی سویدائے دل دراصل ایک داغ ہے۔ جو دودِ آہِ آشفتگی سے پیدا ہوا۔ (دردمندیِ دلِ عاشق)

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

یعنی سودائے عشق میں سود و زیاں کا خیال جبھی تک ہے کہ انسان خوابِ غفلت میں ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد محبوبِ حقیقی کے تعلق میں سود و زیاں کا خیال ختم ہو جاتا ہے۔ بقول ؎ عشق تا تمام است پابستہ ناموس و ننگ

تختہ مشقِ جنوں گر کیا زنجیر پاست

(اخلاصِ عشق)

لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یعنی میں مکتبِ عشق کا ہنوز مبتدی ہوں کہ ابتدائی سبق مثلاً رفت معنی گیا اور بود معنی تھا کے سوا نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ صرف اتنا جانتا ہوں کہ دل جو کبھی تھا۔ اب جاتا رہا باقی ہیچ۔ (زیاں کاریٔ عشق)

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

یعنی جب تک زندہ رہا ہر جامہ میں ننگا ہی رہا کہ میرے عیب عیاں تھے۔ اس برہنگی کو کفن نے ڈھانپ لیا۔ مطلب یہ کہ صرف موت تھی۔ جس نے میرا پردہ ڈھک لیا (پردہ پوشیٔ مرگ)

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یعنی کوہکن زخمِ تیشہ سے مرا تو کیا ہوا۔ اس طرح تو سبھی مرتے ہیں۔ مردِ آزاد تو وہ ہے کہ مرنے کیلئے بھی آلاتِ مرگ کا محتاج نہ ہو۔ (مرگِ عاشق)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

مدعی معنی مالِ مسروقہ یعنی تمہارے اس طرح کہنے سے کہ اگر کوئی دل پڑا ملا تو نہ دیں گے۔ میرے دل کا پتہ چل گیا کہ ضرور تم نے چرایا ہے۔ کیونکہ میرا دل گم ہے۔ اور ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جسے پتہ ہو (اظہارِ عشق)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

دردِ لا دوا بمعنی عشق یعنی میری طبیعت سقیم تھی کہ لطفِ زیست سے خالی تھا۔ اسی درد کا علاج دردِ لا دوا (عشق) تھا۔ سو مل گیا اور زندگی کا مزہ آ گیا۔ (ذوقِ عاشقی)

دوست دارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دشمن کنایہ از معشوق یعنی دل معشوق کو دوست رکھتا ہے۔ وہ کب چاہے گا کہ دوست کے خلافِ مرضی ہو۔ جبھی تو اس کے نالہ و فریاد میں اثر نہیں۔ (بے اثریٔ آہ و نالہ)

سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

یعنی معشوق بے پروا کو بے خبر اور سادہ لوح مت سمجھو وہ تو غضب کی نکادٹ اور ہوشیار رکھا ہے کہ اس طرح عاشق کی جرأتِ شوق کو آزمانا چاہتا ہے۔ (عیاریٔ معشوق)

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

یعنی کھلتی کلی کو کیا دیکھا۔ گویا خون شدہ اور گم گشتہ دل مل گیا۔ مطلب یہ کہ بہار کے آغاز نے غمہائے عشق کو پھر تازہ کر دیا۔ (فتنہ انگیزیٔ بہار)

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

یعنی میں کئی بار دل باختہ ہوا اور تم نے ہر بار دلبری کی۔ بس دل کے باب میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔ مطلب یہ کہ اہلِ عشق وارداتِ قلب کے سود و زیاں اور کیف و کم سے بیخبر ہوتا ہے۔ (سادگیٔ عشق)

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

یعنی پندِ ناصح سے بجز تلخیٔ الم میں اضافہ ہونے کے دردِ عشق کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ (تلخیٔ پند در بابِ عشق)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

سوزِ نہاں کنایہ از تپشِ عشق بے محابا بمعنی بجوشی خاطر۔ بے دھڑک۔ یعنی میرا دل عشق کی آتشِ پنہاں میں نالہ و فریاد کے بغیر جل گیا۔ گویا اس کا جلنا ایسا تھا جیسے بے شعلہ کی آگ سلگتی رہی اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ (بیانِ غمِ پنہانِ عشق)

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یعنی مایوسی اور افسردہ خاطری کا یہ عالم ہے کہ دل میں جو شوق وصال تھا یا یادِ یار باقی تھی وہ بھی ختم ہے۔ گویا اس گھر میں ایسی آگ لگی کہ متاعِ خانہ میں سے جو باقی تھا وہ سب جل گیا۔ (سوختہ سامانیٔ عشق)

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

یعنی اے مقامِ فنا سے غافل انسان! وہ جو ملکِ عدم میں عنقا کا وجود باقی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب میں فنا کے ایسے مقام پر ہوں جو عدم سے بھی آگے ہے ورنہ ملکِ عدم میں تو عنقا کے پر میری آہِ آتشیں سے کئی بار جل چکے تھے۔ اگر میرا مقام عنقا کے ہی ہم رتبہ ہوتا تو اب تک وہ کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ (مبالغہ بے حقیقتیِ وجود)

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

یعنی میرا تخیل اتنا تابناک ہے کہ وحشت کو خیال میں لاتے ہی صحرا (جسے وحشت کا ٹھکانا کہتے ہیں) جل گیا۔ (مبالغۂ گرمیِ اندیشہ)

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

یعنی داغہائے دل سوزناک و پُربہار تھے۔ لیکن دل جس میں داغ کی یہ شمعیں روشن تھیں وہ خود سوزِ عشق سے جل گیا۔ اب دل ہی نہ رہا تو داغِ دل کی بہار کہاں؟ (مبالغۂ افسردہ خاطری)

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

یعنی دوستوں کی کھوکھلی گرمجوشی سے دل ایسا جلا ہے کہ اب چاہتا ہوں کہ دوستی کا ولولہ ہی نہ رہے (شکوۂ تصنع و سخن سازیِ احباب)

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یعنی اہلِ عشق ہر حال میں بے سروسامان ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ قیس تصویر کے پردے میں بھی بے پردہ یا بے لباس ہی نظر آیا (بے سروسامانیِ اہلِ عشق)

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

یعنی میں ایسا دل تنگ ہوں کہ زخم بھی دل کی تنگی کو نہ کھول سکا چنانچہ تیر بھی سینے میں چبھ کر اس طرح نکلا جیسے بھنچا ہوا پرندہ پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا نکلتا ہے۔ (دل تنگیِ عاشق)

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

یعنی تیری محفل سے جو آتا ہے وحشت جنونِ عشق میں سرپھرا ہوتا ہے (وحشت انگیزیٔ حسن)

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

یعنی میرا غمگیں دل دردِ عشق کا ایک دسترخوان ہے کہ اس سے اشعارِ درد انگیز نکلتے ہیں اور ہر شخص کو بقدرِ صلاحیت لذت آشنائے درد کر دیتا ہے۔ (سوزِ بیان)

ہے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

یعنی مشکل یہ ہے کہ درسِ فنا بھی جب ہمتِ مشکل پسند کو آسان معلوم ہو تو اب اس کی مشکل پسندی کی تسکین کس طرح ہو؟ (مقامِ ہمت بلند)

دل میں پھر گریہ نے اِک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

یعنی میں نے رونا ضبط کیا تھا لیکن ضبط سے دل طوفان کی طرح اُمنڈا آ رہا ہے۔ گویا آنسو کے جو قطرے نہ نکلے تھے وہ طوفان بن گئے۔ (اضطرابِ ضبطِ گریہ)

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

بابِ نبرد بمعنی مقابلہ کی اہلیت رکھنے والا۔ نبرد پیشہ بمعنی جنگ جو یعنی عشق کی چوٹ وہی جھیلتا ہے جو بہادر ہو۔ نااہل تو عشق کی پہلی ہی دھمکی میں مر جاتا ہے۔ (دشواریِ تحملِ شدائدِ عشق)

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
مرنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

یعنی مرنے سے پہلے بھی خوفِ مرگ سے مجھ پر مُردنی چھائی ہوئی تھی مطلب یہ کہ زندگی جس کا انجام موت ہے موت سے کچھ مختلف نہیں (بے حقیقیِ حیاتِ دنیا)

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یعنی ابتدا ہی سے جبکہ ہنوز قوت متخیلہ کی تہذیب نہ ہوئی تھی۔ میں وفا کی کتابیں تصنیف کرنے لگا تھا مطلب یہ کہ ابتدا ہی میں عشق میں کامل تھا۔ (عشق آمادگی فطری)

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یعنی ایک وقت تھا کہ میری طبیعت کی رنگینی و بہار آفرینی کے آگے پھول کی تازگی بے حقیقت تھی لیکن اب دل و جگر کا تمام راستہ دریائے خوں کا ساحل بنا ہوا ہے۔ (جگر افگاری غم عشق)

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

یعنی دل ہے تو غم عشق میں مبتلا اور دل گیا تو غم دل کا ابتلا غرض غم سے کسی حال میں نجات نہیں۔ (دوام غم)

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یعنی زنداں۔ وحشتِ دل کا علاج نہیں ہے کیونکہ خیال تو اب بھی بیابانوں میں پڑا ہوا ہے۔ (بے درمانی جنون عشق)

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مطلب یہ ہے کہ اسد خستہ جان کی لاش بے کفن کو دیکھکر لوگ کہتے ہیں کہ وہ کیا مرد آزاد تھا کہ مرنے کے بعد بھی قید کفن گوارا نہ کی۔ (آزاد مرگی شاعر)

ستمار ستمہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یعنی محبوب کو دانۂ تسبیح کا شمار کرنا مرغوب نظر ہے۔ کیونکہ اس کی طبیعت مشکل پسند ہے اور تسبیح پھیرنا گویا ایک ہاتھ میں سیکڑوں کا لے لینا یا بیک وقت سینکڑوں کو اپنا دلدادہ بنا لینا ایک مشکل کھیل ہے جو اسے مرغوب ہے۔ (ذوق دلربائی محبوب)

بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

یعنی کشاکش کو یہ بات پسند آئی کہ ہماری مشکل ناقابل حل ہے۔ کیونکہ اس سے دل ٹوٹ جائے گا اور ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو جائے گی تو پھر مشکل نہیں رہے گی اور آسانی ہو جائے گی۔ بقول ؎

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے (سکون یاس)

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

یعنی پھولوں کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی بسمل خون میں تھڑا ہوا ہو معشوق قاتل کی بے مہری اس سے ظاہر ہے کہ وہ سیر گل کا شائق ہے۔ گویا ایسے نظارہ کو پسند کرتا ہے۔ (بے مہریٔ معشوق)

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوار جان دردمند آیا

غمخوار جان دردمند طنزاً مراد از عشق یعنی مبارک ہو ہمارا غمخوار عشق آگیا ہے۔ اور زخم ہیرے کی کنی اور داغ جگر سامان غم دہلا کر تحفہ لایا ہے۔ (بیان عواقب عشق)

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

یعنی دنیا میں وفا ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہی کچھ نہ نکلے اور کوئی مطمئن نہ ہوا۔ (شکوۂ بے وفائی اہل دہر)

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

یعنی زمرد کے سامنے افعی کا زہر کام نہیں کرتا لیکن تیرا سبزۂ خط کیسا زمرد ہے کہ افعی کاکل کو بے قابو نہ کر سکا۔ مطلب یہ کہ سبزۂ رخسار کے باوجود کاکل کی جاں ستانی میں فرق نہیں آیا۔ (بے پیریٔ حسن محبوب)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

چاہتا تھا کہ مر کر وفا کے غم سے نجات پاؤں لیکن معشوق ایسا ظالم ہے کہ وہ اس پر بھی راضی نہیں اور وہ یہی چاہتا ہے کہ خواہ کتنی ہی تلخ کامیاں ہوں وفا برقرار رہے۔ (ستم کوشی معشوق)

(باقی آئندہ)

سید مستفیض الحسن، ایم۔ اے۔

ادیب اور کردار

ادب کی دنیا ایک رنگین سا طلسم ہے۔ یہاں عجیب عجیب باتیں لکھی اور کہی جاتی ہیں۔ ان باتوں کے کہنے اور لکھنے کے انداز بھی نوع نوع کے ہوتے ہیں اور ان کے محرک مقاصد بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں۔

کچھ باتیں اس لئے لکھی یا کہی جاتی ہیں کہ ان کے لکھنے یا کہنے والے کو لکھنے یا سنانے کی خارش ہوتی ہے اس لئے جب تک وہ لکھ نہیں لیتے خارش باقی رہتی ہے JUNEVAL نے صحیح کہا ہے۔

THE INCURABLE ITCH OF WRITING POSSESSES MANY

ایسے لوگ صرف لکھنے کے لئے لکھتے ہیں اور ان کی خلقتِ ادب کا اگر کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنے احساسات، جذبات، اور ذہنی ترغیبات کو مجتمع کرکے اپنی قوتِ تخلیق (CREATIVE URGE) کی تسکین کرلیں۔

یہ ادیب اپنی ادبی تخلیقات کے خاکے تو اپنے گرد وپیش کی دنیا سے ہی مستعار لیتے ہیں مگر اس آرٹسٹ کی طرح جو اعضا کی ہم آہنگی کی کھوج میں ایسے فن پارہ کی تخلیق کرے جس کی ٹانگیں اور دھڑ بکری کا ہو اور سر انسان کا۔ یا عورت کا ہو اور باقی جسم مچھلی کا اور اس طرح اپنے مشاہدات کو اپنی ذہنی ترغیبات سے خلط ملط کرکے اپنی ادبی تخلیق کو عجیب الخلقت بنا دیتے ہیں۔ یہ ادیب نقشہ کائنات کو بچوں کا ایک کھیل سمجھتے ہیں اور زندگی کی تشکیل کے ہر امکانات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے تمام مشاہدات اور تجربات کو اپنی ذہنیت کے تحت قلمبند کرتے ہیں اور کبھی تصورات کی جنت تعمیر کرتے ہیں۔ اور کبھی اپنے ماحول میں تلذذ کی گنجائش نہ پاکر ذہنی تلذذ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور حقیقتوں کی دنیا سے اس حد تک تعلق رکھتے ہیں جہاں تک زندگی ان کے ذوقِ تصوریت Idealism کے منافی نہ ہو۔ اگر زندگی کے حقائق ان کی تصوریت کے آڑے آتے ہیں تو وہ ان حقیقتوں سے اعراض کرتے ہیں اور فراریت اختیار کرتے ہیں۔

اس طرح کی ذہنیت رکھنے والے ادیب اپنی تخلیقات کو طلسماتی روپ دیتے ہیں۔ جو واقعاتی حیثیت سے بہت دور ہوتا ہے۔ ادب کے اعلیٰ مقاصد سے بھی ان کو کوئی لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ اگر کوئی لگاؤ رہتا بھی ہے تو وہ غیر فطری ہے اور صرف اس فردِ واحد کی تسکین کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ جس نے اس کو تخلیق کیا ہے۔ مگر زندگی کی تعمیر، ردِ عمل کی اس شکل سے نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ادیب، کائنات کی موجودہ ہیئت سے ماورا ایک تخیلی ہیئت دیتا ہے جو کائنات کے اصول تطابق کی ضد بن جاتی ہے۔

ایسے ادیب ذہنی طور پر اپنے ماحول سے کٹتے ہی جیسے ہیں حالانکہ ان کی زندگیاں اس ماحول ہی کی پیداوار ہوتی ہیں اور اس لئے ان کی تمام زندگی ایک ذہنی تنازعہ (MENTAL CONFLICT) بن کے رہ جاتی ہے۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو وہ خود نہیں کرتے اور نہیں کرسکتے۔ قول وفعل کی یہ دوئی ان کے قارئین کو بھی سوائے الجھن کے زندگی کی کوئی صالح تفہیم نہیں دے سکتی۔ اور یہ ادیب اور ان کے قاری لاشعوری طور پر زندگی پر عمل تخریب شروع کر دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو زندگی سے ماورا رکھ کر کوئی ایسا فلسفہ وضع نہیں کیا جا سکتا جو قابلِ عمل ہو۔ تصورات کی جنتوں کو جامد شکلوں میں تعمیر کرنا محال ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ذہنیتیں جو تصوریت کے فریب میں آکر زندگی کی از سرِ نو تشکیل کی متمنی ہوتی ہیں مستقل فریبِ نفس میں مبتلا رہتی ہیں اور اپنی نفسیاتی کیفیات کو اپنے کردار میں منتقل نہ کر سکنے کی بنا پر معاشرہ کے اجتماعی ذہن پر وہ اثر کرتے ہیں جو آکاش بیل (PARASITES) اُن درختوں پر کرتی ہے جو اُسے سامانِ حیات دیتے ہیں۔

کچھ ادیب نام و نمود کی خواہش سے لکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوامی ادب کے نام سے دنیا کے پست ذوق کی تشکیل کے لئے ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور

نے سستی نمود کے لئے بیچ دیتے ہیں۔ وہ ادب کو ایک شے سمجھتے ہیں اور معاشیاتی اصول طلب و فراہمی کے مطابق اُس کی تجارت کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کے نزدیک تمام دنیا ایک تجارتی منڈی ہے اور اُن کے نظریے کے مطابق ادب کی تخلیق کا مقصد سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ عوام کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

عوام عموماً بہت سطح پسند ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر حقائق تک پہنچنے سے پہلے رنگ کے خس و خاشاک میں اُلجھ جاتی ہے۔ اُن کے تصورات کامل طور پر خارجی وجود رکھتے ہیں اور وہ مادہ پرست ہوتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح زندگی رنگین ہو جائے۔ اُس میں کچھ لذتیت کے پہلو نکل آئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے عوام کے لئے جو ادب تخلیق ہوگا۔ وہ صرف ظاہر کی عکاسی کرے گا۔ اور یہ ظواہر عموماً ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کی پشت پناہی کے لئے کردار اور حسن عمل کی پشتیبانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ سطح پسند عوام کو ان خارجی موجودات کے داخلی وجود کے بارے میں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔

ایسے ادیب جو عوام کے لئے لکھتے ہیں، روحانی یا اخلاقی حدود سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ایک بھانڈ کی طرح وہ عوام کے پست ذوق کے مطابق ناچتے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو انہیں کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس کا مقصد نہ زندگی کی تعمیر ہوتا ہے نہ تطہیر۔ یہ ادب محض خارجی محسوسات و مشاہدات کی ترجمانی کرتا ہے۔ معاشرہ کی تمام خرابیوں میں لذتیت کے پہلو اجاگر کر کے پیش کرنا اس مکتب ادب کا کمال ہے۔ یہ حضرات معاشرہ کی برائیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور ان گھناؤنے پہلوؤں کی عکاسی میں لذت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً یہ لذت پسندی بیماری کے جراثیموں کی طرح سماج کے جسم میں پھیل کر اُسے اخلاقی طور پر بے حس بنا دیتی ہے۔ لذتیت فروغ پاتی ہے اخلاقی دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں اور سارا سماج گھناؤنا ہو جاتا ہے۔

گندے دھاروں کے رُخ پر بہنے والے ادیب زندگی کے سرچشموں کو صاف نہیں کر سکتے۔ اُن کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ وہ بے اصولے ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ اِن سے زندگی کو صالح اقدار نہیں مل سکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی خارجی وجود نہیں رکھتی۔ اُس کے کچھ باطنی محرک بھی ہوتے ہیں۔ اور ان باطنی محرکات سے علیحدہ ہو کر زندگی نہیں رہتی۔ زندگی کے اِن باطنی محرکات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کردار کی ضرورت ہے۔ مگر اِن نام نہاد حقیقت پسند ادیبوں نے رمزیت۔ اثریت اور اظہاریت۔ حسن پرستوں کا سہارا لیا اور حقیقت پسندی کے نام پر رمزیت نے لذتیت کو اُبھارا۔ اثریت نے ذہنوں کو جرم پسند بنایا اور اظہاریت نے جنس پرستی کو ہوا دی۔ اس طرح اخلاقی اور روحانی قدروں کا جنازہ نکل گیا۔ اِسی حقیقت پسندی نے طبقاتی کشمکش کے شعلوں کو بھڑکایا اور انسانوں کو انسانوں کے خلاف مشتعل کر کے ساری فضاؤں کو مسموم کر دیا۔ اور الٰہی منصوبۂ تخلیق میں جو توافق پایا جاتا تھا اُس کو نظر انداز کر کے جہد للبقاء کے نظریہ کی ترویج کی۔ نتیجہ ظاہر تھا جوں جوں علم و فن بڑھتے گئے۔ انسانیت کا دم گھٹتا گیا۔

"کہاں سے بڑھ کے پہونچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی، نہ من ساقی"

نظریات اور زندگی کی حقیقتوں میں کوئی تعلق نہ رہا اور ادب زندگی سے بے نیاز ہو کر صرف ادب برائے ادب بن گیا۔ کیونکہ ان ادیبوں کی بوالہوسانہ روش کے لئے اظہار کا موقع اسی طرح ممکن تھا۔ یہ ادیب بھیڑ کی کھالوں میں ملبوس بھیڑیئے تھے جنہوں نے معصوم بھیڑوں کے گلوں میں گھس کر اُن کو خاک و خون میں لٹایا۔ اور زندگی کو ایک لاشۂ بے گور و کفن بنا دیا۔

ادیبوں کا تیسرا گروہ تعمیر پسند ادیبوں کا گروہ ہے۔ جو ادب برائے تعمیر و تطہیر کا قائل و داعی ہے۔ یہ گروہ زندگی کا من حیث کل مطالعہ کر کے توافق کے پہلوؤں کو ڈھونڈتا ہے۔ خارجی اور باطنی معاملات کو اُن کا جائز مقام دیتا ہے تاکہ انسان کے احساس تاثر اور طرز فکر میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ اور توافق للبقاء کا الٰہی منصوبہ تخلیق فہم کے حدود میں آ جائے۔ یہ ادیب اپنے احساس کی تربیت کرتے ہیں اور ماحول کی کشمکش سے مرعوب ہونے کے بجائے اُسے متاثر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

ستم یہ ہے کہ اندھیروں کے درمیاں رہ کر
نمود صبح کے جلوؤں کی بات کرتا ہوں

وہ اخلاق کی معروف قدروں کو اُجاگر کر کے انسانوں کو زندگی کی صالح تعمیر اور اس کے امکانات کے تدبر پر آمادہ کرتے ہیں تاکہ وہ یہ محسوس کریں کہ جب بھی انسان نے خدائے واحد کی عبودیت کے فطری تقاضے سے منحرف ہو کر نفس امارہ کی عبادت شروع کی۔ وہ ذہنی انتشار میں گھر گیا اور انسانیت سکون نا آشنا ہو گئی۔ بقول کسے

تم نے سوچا بھی ہے انسان پریشاں کیوں ہے
قافلہ منزل و مقصد سے گریزاں کیوں ہے
ہم نے فطرت کے تقاضوں کو دبا رکھا ہے
نفس امارہ کو معبود بنا رکھا ہے

خلق گردش میں ہے لیکن کوئی محور ہی نہیں
مقصد زیست حقیقت کا مستخر ہی نہیں
آؤ اسرار الٰہی کو نمایاں کر دیں
خاک کے ذرّوں کو خورشید درخشاں کر دیں

ادب کی اِس تعمیری تحریک میں اوّل الذکر ادبی تحریکات کی طرح ادیب کی شخصیت اگر تصوریت، گریز یا فرار کی جھلملیوں میں پوشیدہ ہو تو ادیب کا مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ شر بڑی حد تک متعدی ہوتا ہے اور بغیر کسی خاص سعی کے بھی اپنی ابلیسانہ کشش کے سہارے پرورش پاتا رہتا ہے۔ خیر اور صلاح کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس منزل میں نفس کی سرکشی کو کچلنا پڑتا ہے اور دوسروں کو اس تقویٰ کی طرف بلانے کے لئے جب تک اُن فوائد کا عملی مظاہرہ نہ ہو۔ جو اِس طرز حیات سے حاصل ہوں گے صرف دعوت و تبلیغ ناکافی ہوں گے۔ جب تک ادیب کا کردار طمانیت و سکون کا مرقع نہ بن جائے۔ جب تک وہ اخلاقی معیار جن کے برپا کرنے کا وہ داعی ہے اس کی زندگی میں پاکیزگی اور تسکین کے عناصر نہ سمو دیں۔ مجرد تبلیغ سے یہ امید عبث ہے کہ دنیا متوجہ ہو گی اور اس طرز فکر کو اپنائے گی۔

تعمیر پسند ادیبوں کے اس گروہ کو ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی سعی بھی کرنی پڑے گی جس کا نظریاتی عکس وہ اپنی ادبی تخلیقات میں پیش کر رہے ہیں۔ معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے لہذا تعمیر پسندی کے لوازم میں سے ایک اہم لازمہ یہ ہوگا کہ ادیب اپنے کردار کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال کر دنیا کے سامنے مثال بن کر آئے۔

اس سے قطع نظر یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ تعمیر پسند ادیب زندگی کی سطح پسندانہ روش سے ہٹ کر اُسے حقائق کی اساس پر استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اِس لئے اُن کو بے پناہ خلوص کی ضرورت ہو گی۔ نام و نمود کے چھوٹے بتوں کو شکست کرنا ہوگا۔ ورنہ ان کی کاوشیں بے سود ہوں گی کیونکہ ایسے حالات میں ارتقائے حیات کی کیا اُمید جبکہ ؎

بانگِ جرس ہے قافلے والوں کی ہر صدا
اور دور دور دوق سفر کا پتہ نہیں

اگر یہ ادیب اپنے کردار کی تعمیر اور ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب نہ ہوئے تو ان کی ادبی تخلیقات بھی تصوریت کے ذیل میں شمار ہوں گی۔ اور ان کا مقصد فنا ہو جائے گا۔

لہذا جاہلیت کے ادب کی طرح تعمیر پسند ادیبوں کے قول و فعل میں تضاد نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ توافق اور ہم آہنگی ہونی چاہئے۔ وہ جو بات کہیں وہ شعری فنی ضرورتوں کی بھینٹ نہ چڑھ جائے یا اُس پر تمام تر لطافت کے باوجود دبیز پردے نہ پڑ جائیں کہ وہ اپنا واقعی رنگ دروپ کھو بیٹھے۔ وہ جو کچھ کہیں اُس کو نہ صرف ایمان کی حد تک تسلیم کرتے ہوں بلکہ ضروری ہے کہ وہ اُس کو زندگی کا مطمح نظر سمجھے ہوئے ہوں اور اُس پر عامل بھی ہوں۔ اُن کے اشعار زندگی کی ہم آہنگی کے ترجمان ہوں جو کائنات کے رگ و ریشہ میں رواں دواں ہے۔ اُنکی تخلیقات میں وہ ماحول نمایاں ہو جس کی تعمیر و تکمیل کے وہ خواب دیکھ رہے ہیں اور جس کی ایک چھوٹی سی تمثیل انہوں نے اپنی زندگی میں تعمیر کی ہے۔ اُنکے مضامین فطرت و توافق کی تشریح کریں اور اس توافق کا مظہر خود ان کا کردار ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۳

اشعار کہلانے کے مستحق ہیں۔ تفصیل کا تو موقع نہیں ورنہ اشعار بھی پیش کر دیئے جاتے۔ حالی کی غزل اپنا منفرد رنگ رکھتی ہے۔ اس میں تمام اساتذہ سے استفادہ کر کے اپنی طبیعت اور جدت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہی حالی کا تغزل ہے۔

بہر حال مختصراً عرض یہ ہے کہ حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے یاد رکھنا اُردو ادب کیلئے فالِ نیک ہوگا۔ اور حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے فراموش کر دینا علمی بے بصری ہو گی۔ حالی اُردو کا قابل قدر غزل گو تھا۔ اس کی شاعری زندہ ہے۔ اور شاید جب تک دنیا قائم ہے وہ زندہ رہے گی۔ خواہ زمانے میں کتنا ہی تغیر و تبدل کیوں نہ ہو جائے۔

کبیر احمد جائسی

غزل اور حالی

عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ حالی ایک اچھے غزل گو بھی تھے۔ وہ زیادہ تر اپنی مسدس کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ حالی کی غزلیں سنجیدہ ادب کا بہترین نمونہ ہیں نہ تو ان میں وہ بے دردی اور سرمستی ہے جو اس دور کے شعراء کے یہاں بکثرت ملتی ہے اور نہ ان کے اشعار میں مبالغہ یا ابتذال ہے۔ حالی کے یہاں ہم کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو نصیحت کے خلاف ہو۔ اُن کی زبان میر کی طرح صاف اور شستہ ہے۔ اور میر ہی کا سا انداز بیان ہے۔ حالی بھی میر ہی کی طرح فرسودہ مضامین میں ایک نئی جان ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ وہ سیدھی اور صاف بات کہتے ہیں اور انہیں باتوں میں ایک نیا پہلو جو دلوں کو موہ لیتا ہے نکال لیتے ہیں۔ آل احمد سرور نے حالی کے بابت یوں لکھا ہے

"حالی کے اسلوب میں خون جگر کی جھلک ملتی ہے۔ یہ ساحری نہیں کرتا وجد میں نہیں لاتا۔ اپنے خیال کو ادا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اچھی اچھی تشبیہوں، محاوروں کے استعمال سے اپنی دکان نہیں سجاتا۔ یہ محض دریچے کی آرائش کا قائل نہیں ہے۔ اپنے خلوص اپنی سچائی۔ اپنی سادگی سے ایک ایسا اثر چھوڑتا ہے۔ جو عمر بھر محو نہیں ہوتا۔" (تنقید کیا ہے۔ ص ۳۵)

حالی صرف نظم جدید کے بانی ہونے کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ نظم جدید میں انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو اس کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن حالی کا تغزل نظر انداز کی جانے والی چیز نہیں۔ حالی کا تغزل پتہ دیتا ہے کہ اگر انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ عوام کے دکھ درد سے آشنا ہوتا ہے۔ اور ان کے دکھ درد کو اپنا سمجھتا ہے۔ حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے یاد رکھنا حالی کے لئے نہیں بلکہ اردو ادب کے لئے نیک فال ہوگا۔

ہم اپنی آسانی کے لئے حالی کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کرینگے اول وہ غزلیں ہیں جو عہد شباب کی یادگار ہیں۔ جب ان کا اپنا کوئی مستقل رنگ نہ تھا۔ اس زمانے کی تمام غزلیں چوٹی، انگیا، سرمہ، مسی، دھینگا مشتی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ حالی کی بھی غزلیں اس زمانے کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ مگر حالی کی ان غزلوں میں بھی مبالغہ، ابتذال، عریانی، سوقیت، بدی نہیں ملتی۔ گو کہ یہ غزلیں پرانے طرز پر لکھی گئی ہیں۔ اس میں ہجر و وصال کا تذکرہ آیا ہے۔ مگر یہ ہجر ایک شریف عاشق کا ہے۔ اور محبوب بھی ایک شریف پردہ نشین ہے۔ عاشق عشق کو بر سر بازار رسوا نہیں کرتا۔ اور نہ محبوب ہی ہرجائی ہے۔ نہ وہ بر سر بام جلوہ افروز ہوتا ہے۔ حالی کی یہ غزلیں بھی صفائی و شستگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ دوم وہ غزلیں جو ناصحانہ اور حکیمانہ طرز پر لکھی گئی ہیں۔ یہ غزلیں اس زمانہ کی یادگار ہیں جب قدیم شاعری کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور جدید شاعری آفتاب نو کی طرح ابھر رہی تھی۔ اب جھوٹی باتیں کرنے اور سننے میں لوگوں کا دل نہ لگتا تھا۔ عشاق آوارگی بھرتے بھرتے خاموش ہو گئے تھے اور مہ جبین درخشاں کی جلوہ سامانیوں میں تو بجھ گئے تھے۔ احساس رکھنے والے حضرات دل پر ہاتھ رکھے عمر گذشتہ پر ماتم کر رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف جدید رجحانات پھیل رہے تھے۔ ایک تہذیب روشن ہو چکی تھی اور دوسری دم توڑ رہی تھی۔ حالی نے اس زمانے میں جتنی بھی غزلیں کہیں وہ قومی درد لئے ہوئے ہیں جن کے اندر نصیحت ہے تجربہ ہے اور پیغام بیداری ہے۔ یہی وہ میدان ہے جس میں حالی اپنے تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ تیسری قسم کی وہ غزلیں ہیں جب آفتاب جوانی پیری میں غروب ہو گیا تھا اور صبح پیری ایک نئے انداز میں دل پر حکمرانی کر رہی تھی۔ اب وہ جوش و ولولہ رخصت ہو چکا تھا۔ سوچ اور بچار کی قوت بڑھ گئی تھی اب پیری کی وجہ سے ان کے کلام میں اور پختہ کاری کا رواج تھا۔ وہ ہر بات پر سوچ اور پھر بھی پھول ملائے دیتے تھے۔ لیکن یہ غزلیں دور اول کی غزلوں سے ذرہ کی بھی مشابہت نہیں رکھتیں کیونکہ حالی نے خود ہی کہا ہے۔ ؎

راگنی بے وقت کی اب ہے کا کام کیا

حالی نے ہماری شاعری میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ حالی سے پہلے ہماری شاعری کا زیادہ حصہ سفلی جذبات سے بھرا تھا غزل کا ۔ ماحول حیات ۔

ہجر و وصال کے جھگڑے۔ گلہ چرخ کبود۔ گل و بلبل کی حکایت۔ ناز و ادا کے تذکرے۔ چھرہ۔ مقتل۔ گور و کفن۔ لاش۔ کنگھی چوٹی کی داستانیں۔ عاشق کی وفائیں۔ ہجر و فراق کا اضطراب۔ شیخ و واعظ کی مذمت اور پھبتیاں۔ بس یہی تھا۔ حالی نے غزل کو ان تمام پستیوں سے نکال کر اس کو عرش کا مکین بنایا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو حیات و کائنات کے مطالعے کے لئے وقف کر دیا۔ اور جو کچھ بھی مشاہدے اور تجربے میں ہاتھ آیا اس کو بے کم و کاست نظم کر دیا۔

مولانا حالی اپنی مشہور تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری میں رقم طراز ہیں
"تخیل سب سے مقدم اور ضروری چیز ہے۔ جو شاعر کو غیر شاعر سے ممیز کرتی ہے۔ قوتِ متخیلہ یا تخیل جس کو انگریزی میں IMAGINATION کہتے ہیں۔ یہ قوت شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجے کی ہو گی۔ اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہو گی۔ اور جس قدر ادنیٰ درجے کی ہو گی۔ اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہو گی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے۔ اور باقی شرطوں میں جو شاعری کیلئے ضروری ہیں۔ کچھ کمی ہے۔ تو وہ اس کمی کا تدارک اس ملکہ سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکۂ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اسکے قبضے میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے اور ماضی و مستقبل کو زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے۔ گویا اس نے تمام واقعات اپنی ہی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہئے۔ اس میں وہ طاقت ہے کہ وہ جن اور پری۔ عنقا اور آبِ حیوان۔ جیسی فرضی چیزوں کو ایسے ثبوتوں اور اوصاف کے ساتھ متصف کرتا ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو نتیجے وہ نکالتا ہے۔ گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب دل اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔" حالی کی شاعری کا بھی ہم اس روشنی میں مطالعہ کر سکتے ہیں دیکھئے ان اشعار میں صرف قوتِ متخیلہ کی وجہ سے کتنی جان آگئی ہے اور شعر کس پایہ کا ہو گیا ہے۔ حالی کی قوتِ متخیلہ ان ویران صحراؤں سے نقاطِ حُسن ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ جہاں پر عقل جا کر سرگرداں حیران و پریشاں پھرنے لگتی ہے کہ یہاں سے کیا ملے گا۔ ہم کس اجاڑ بن میں آ گئے ہیں۔ مگر حالی کی قوتِ متخیلہ اس اجاڑ بن میں غنچۂ شاداب ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں ؎

عشق سنتے ہیں جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا

چُپ چھپاتے آ رہے آپ دل اِک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چُکایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پُوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

ملتے ہی ان سے بھُول گئے کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی دل میں تو چُبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اِک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

کھو دیا پاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اِک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

مقدمۂ شعر و شاعری میں کائنات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "اگرچہ قوتِ متخیلہ اس حالت میں جبکہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو اسی معمولی ذخیرے سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات اور اس میں خاص کر نسخۂ فطرت کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو عمیق نگاہوں سے دیکھنا۔ جو اُمور مشاہدہ میں آویں اُن کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی۔ کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنی جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متحد چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے۔ اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے" ان الفاظ کی روشنی میں حالی کی شاعری کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ حالی کے اشعار دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کی نگاہ کتنی دُور رس ہے۔ ان کا مطالعۂ فطرت کتنا زبردست ہے۔ وہ سمجھ کے دیئے ہوئے خزانے سے اپنا دامن بھرتے ہیں۔ اور اس کو اپنے قلب میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اس مطالعۂ فطرت کی وجہ سے اشعار میں جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ صرف تخیل سے نہیں پیدا ہوتی۔ تخیل کے ساتھ ساتھ مشاہدۂ قدرت

بھی ضروری ہے بغیر مطالعۂ فطرت کے قبل ازیں صحیح کام نہیں کر سکتا۔ اس کو ہر گام پر ٹھوکر لگے گی اور وہ بیٹھ جانے پر مجبور ہوگا مگر جب مطالعۂ فطرت اس کا رہبر بنے گا تو وہ بآسانی منزلِ مقصود کو پا جائے گا۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں ؎

قلق اور دل میں سوا ہو گیا　　دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا　　وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت　　وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
ہوا رکتے رکتے دمِ آخر فنا　　مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں
یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں

شعر جذبات سے معمور ہونا چاہئے۔ اور ایسی انوکھی بات کہنی چاہئے جو دلوں میں نشتر کی طرح اتر جائے۔ زبان ایسی فصیح اور سادہ ہونی چاہئے کہ ہر شخص سمجھ لے اور لطف اندوز ہو سکے۔ جب انسان کا دل جذبۂ الفت سے معمور نہ ہوگا۔ وہ الفت کو ہرگز محسوس نہیں کر سکتا۔ صرف تخیل کے زور پر عشقیہ اشعار لکھنا ایک ناکام کوشش ہوگی۔ اور وہ شعر سوز و گداز۔ درد و اثر سے محروم ہوگا۔ حالی کے اکثر اشعار ایسے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے سامنے سے روزانہ گزرتے ہیں۔ مگر وہ ان میں کچھ ایسا رنگ بھر کر پیش کرتے ہیں کہ واہ کرتے ہی بنتی ہے۔ حالی نے اکثر جگہ دردؔ و میرؔ کا تتبع کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ یہ غزلیں اس دور کی یادگار ہیں جب اردو شاعری پر عریانی اور فحاشی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ حالی نے اپنے ماحول سے بغاوت کی۔ یہ ان کے جذبۂ اجتہاد کی زندہ مثال ہے۔ ایک ماہر مشاطہ کی طرح سے اردو شاعری کی زلفِ برہم کو انہوں نے اس انداز سے سنوارا کہ سب ہی داد دینے لگے۔ حالی کے معاصرین یوں نغمہ سرا تھے ؎

آپ دکھلاتے ہو، جو بن بھی دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے　　(داغؔ)

لیکن یہ صرف حالی ہی کی کرامت ہے کہ آج اردو شاعری میں ہم کو اس طرح کے نغمے سنائی دیتے ہیں ؎

پھر اب منتظر ہے ہنگامۂ برق
پھر اب قصدِ بنائے آشیاں ہے　　(فانیؔ)

تبسم میں چھپاتا ہوں متاعِ سینہ چاکی کو
مرا یوسف کہیں رسوائے سرِ بازار ہو جائے　　(تحسینؔ)

انہیں بھی کاش اس حسنِ محبت کی خبر ہوتی
جھلکتی ہے مرے ان آنسوؤں میں آبرو کس کی　　(یحییٰ اعظمی)

اب حالی کی چند غزلیں دیکھئے۔ اور متذکرہ بالا سطور پر خود فیصلہ فرمائیے۔ حالی کا یہ رنگ ابھی دنیا تک نہیں مٹایا جا سکتا اور نہ ہی فراموش کیا جا سکتا ہے۔ یہ غزلیں اردو ادب کے لئے گراں بہا سرمایہ ہیں۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح　　لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا　　بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا　　اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو　　وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی　　کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے
وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک　　دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی　　کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

ابتدائے وفا ہے سر دینا　　میری دیکھی نہ انتہا تو نے
ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ　　کیا کیا چشمِ آشنا تو نے

وفا اغیار کی اغیار سے سن　　مری الفت در و دیوار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق　　ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ
قید خانے میں گیا دل جن کا لگ　　ان اسیروں کی رہائی ہم سے پوچھ

مضمون کی طوالت کا ڈر ہے ورنہ طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ ان پھولوں سے اپنا دامن بھرتے رہیئے۔ حالی کی غزلوں میں زیادہ تر اشعار قابلِ انتخاب نکل آتے ہیں۔ یہ خوبی صرف چند اساتذہ کے مقدر ہے۔ ان اشعار کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہوگی۔ اس کے بعد میں صالحہ عابد حسین کی تصنیف یادگارِ حالی سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں مولانا کی شاعری کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "دلی کی ہموار زندگی زمانے کا اثر اور پھر جوش و ولولہ۔ حالی جن کی فطرت انفرادیت اور اصلیت سے کوسوں دور تھی سوائے عام غزل گو اور انفرادی شاعری کے چکر میں پڑ گئے۔ جو عشق و عاشقی اور اظہارِ خودی تک محدود تھی۔ حالی نے بھی دیگر شعرا کی طرح اپنا میدانِ سخن غزل ہی کو قرار دیا۔ اور اس میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ لیکن

ری صلاحیت میر اور سعدی جیسے شاعروں کے، دوسرا فیض اور غالب و شیفتہ جیسے صاحبِ ذوق شعراء کی صحبت اور تربیت کی بدولت حالی اس میدان میں بڑی حد تک سنبھلتے رہے۔ چنانچہ ان کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے جن کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے۔ اور نہ معاملہ بندی اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر ہے جو اس وقت کے بیشتر شاعروں کا موضوع تھا۔ وہ تخیل کی ان غیر قدرتی رفعتوں پر بھی نہیں اڑتے۔ جس سے شعر ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ نہ دور از کار تشبیہوں، مبہم استعاروں کا جال بنتے ہیں جس میں الجھ کر شعر کا مطلب خبط ہو جائے۔ انہوں نے اپنے روحانی استادوں اور معنوی استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ حاصل کیا تھا۔ میر سے درد دل لیا۔ درد سے تصوف کی چاشنی۔ غالب سے حسنِ تخیل، ندرتِ فکر اور شوخیِ گفتار سیکھی۔ اور سعدی سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی۔ و شیفتہ سے سیدھی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کا فن۔ ان سب ترکیبوں سے حالی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔ (دیباچہ کارِ حالی صفحہ ۱۳۱ اور ۱۳۲)

ان اساتذہ کے استفادوں نے حالی کو ایک منفرد رنگ کا مالک بنایا۔ حالی کے ہاں میں سعدی، غالب، میر، درد و شیفتہ کے نغمے ملتے ہیں۔ یہ ساز طرح طرح کے نغموں سے معمور ہے۔ حالی کے زمزمے سب ہی استادوں کے نغمے سے ملتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کو تمام ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ حالی نے اس زمانے میں بھی اپنی زبان کو ہجو یا واسوخت سے کبھی آلودہ نہیں کیا۔ ان کی زبان تا دمِ حیات آبِ کوثر سے دھلی رہی۔ ان کے اس پاک تغزل میں ان کی ذاتی خوبیاں بھی پنہاں ہیں۔ ان کا کیرکٹر ایک عظیم انسان کا سا تھا یہی وجہ ہے ان کے یہاں وہ بازاری پستی اور بوالہوسی نہ آنے پائی جو اس دور کے شعراء کا طرۂ امتیاز رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے حالی کا ایک واقعہ اپنے دوست کی زبانی نقل کیا ہے "دہلی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ ردیف کہاں اور قافیہ نظر، جگر وغیرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں داغ اور حالی دونوں شریک تھے۔ مشاعرہ میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور انہوں نے اپنی غزل پڑھی۔ ...... سائل اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے کہ غزل پورے مشاعرہ پر چھا گئی۔ اور مدح و تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا کہ اب داغ مرحوم کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ خود داغ نے اس غزل کو سننے کے بعد کہا کہ میری غزل خود میری نگاہوں سے گر گئی۔ جی چاہتا ہے کہ پرچہ چاک کر دوں۔"

حالی کو صرف نظمِ جدید کے بانی کی حیثیت سے جاننے والے لوگ آئیں اور دیکھیں کہ حالی نے غزل کو کس طرح سنوارا ہے۔ استادِ ریختہ، ٹکسالی زبان بولنے والا، محاوروں سے دل موہ لینے والا داغ بھی حالی کی غزل سننے کے بعد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب میری غزل خود میری نگاہوں سے گر گئی۔ حالی نے جس راہ میں قدم رکھا اس میں ہی فاتحانہ شان سے داخل ہوئے۔ یہ ہم لوگوں کی نظر کی خامی ہے کہ ہم حالی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے فراموش کر دیں۔

حالی کے بہ حیثیت غزل گو مشہور نہ ہونے میں خود حالی کا کافی بڑا حصہ ہے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں "یہ ظلم کہئے یا انتہائی چالاکی کی دیجئے یا کچھ اور مگر حالی نے مسدس اور دوسرے قسم کے پندنامے لکھ کر عوام کے ساتھ وہی کیا ہے جو ایک شاطر جواری پاسوں کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی اس کو غلط سراغ پر لگا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اب بے چارہ سراغ رساں بھٹکتا پھر رہا ہے اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ سب جانتے ہیں کہ حالی کا رنگِ شاعری سرسید کی صحبت اور ان کے اثر سے بدلا۔ خود حالی جا بجا اس کا کھلے الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔ مسدس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سالہ پیرے بردش بیک نگاہے

بعض وقت بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش اس دل کو اس دیرینہ سال پیر سے کبھی سابقہ نہ پڑتا اور اس کو چھوڑ دیا جاتا کہ وہ خوبرو جوانوں میں رم کرتا رہے اس وقت اس کی بیدردگی بھی کیفیت سے خالی نہ ہوتی۔"

(تنقیدی حاشیے۔ صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸)

حالی جب جدید رنگ کی طرف مائل ہوئے تو ان کی غزلوں میں وہ لطف نہ رہا جو قدیم غزلوں میں تھا۔ اب شعریت پر نیچرل حضرات غالب آ گئے تھے۔ وہ غزلیں پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ جدید لوگوں نے اس دور کی غزلوں پر کافی اعتراض کیا ہے۔ حالی ہی کی عبارت اس اعتراض کا جواب بنے گی۔ یہ عبارت حالی کی مشہور تصنیف یادگارِ غالب سے نقل کی جا رہی ہے۔ "یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی کثرت و قلت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اس لئے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے، بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اسے ریختہ کے تمام شاعروں کا سرتاج بنا دیا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ تمام شعراء کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا۔"

حالی کے تغزل پر فیصلہ دینے سے پہلے اس بیان کو سامنے رکھنا چاہئے اور تب حالی پر تنقید کرنی چاہئے۔ حالی کے نہ جانے کتنے اشعار ایسے ہیں جو اردو کے بہترین
(ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۹)

متین طارق

مسئلہ زبان

زبان کے مسئلے کا تعلق اگرچہ لسانیات سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا پھیلاؤ اور دائرہ بڑا عظیم ہے۔ انسانی تمدن، انسانی مذہب اور سیاست حتیٰ کہ بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اسی لئے زبان کی اشاعت ہر اس قوم کے لئے ضروری ہے جو دنیا میں فروغ چاہتی ہے یوں بھی انسان کے لئے اشرف المخلوقات ہونے کا سب سے بڑا شرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زبان جیسی نعمت سے نوازا ہے جس سے دوسری مخلوق نا آشنا ہے۔

زبان کی قوتیں بے پایاں ہیں اس کے حدود ایک طرف روحانیت سے ملتے ہیں اور دوسری طرف زندگی کی کشمکش سے یہ اظہارِ خیال کا ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ انسانی جذبات و احساسات کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ روحانی علم و عرفاں کو بیاں کیا جا سکتا ہے باطنی حق و ادراک کو دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ نیز اس کی ترویج سے ادب جیسا جوہر ظہور میں آتا ہے جو بذاتِ خود تحلیل نفسی کی اساس اور لطافتِ تہذیب لسانی کو مدت العمر تک محفوظ رکھنے کا وسیلہ بھی ہے

اسی لئے ماہرینِ علم الانسان کا کہنا ہے کہ زبان کے ذریعہ کسی بھی قوم کی اخلاقی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور اجتماعی زندگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ہر قوم کی زبان میں ان تمام اعمال کا عکس ہوتا ہے جو اس نے ماضی میں انجام دئے ہیں اگر کسی زبان میں طاقت، قوت اور عقلمندی ہوگی تو اس کے بولنے والے بھی مضبوط کیریکٹر کے ہوں گے۔ لیکن اگر کسی زبان میں پیچیدگی اور تکلف ہوگا تو وہ اس کے قلبی الجھاؤ کا پتہ دیتی ہے۔

اس کی تحقیق پرانی زبانوں کا لٹریچر دیکھنے سے بھلی بھانتی ہو سکتی ہے کہ وہ کس طرح نہ صرف اپنی اپنی قوم کی خصوصیات و روایات کا حامل ہے بلکہ اپنے ماحول کے دوسرے واقعات کو بھی اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین زبانیں عبرانی و سنسکرت ہیں آج ان کا سمجھنا گو کیسا ہی دشوار ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بھی وہ اپنے بولنے والوں کے شوکتِ کلام اور اندرونی محاسن کی آئینہ دار ہیں اور اگر اس عہدِ عتیق کے لوگوں کے کردار و حالات کا کچھ ہمیں پتہ لگ سکتا ہے تو اسی دفترِ زبان کے وسیلے سے۔ چنانچہ جس قوم نے اپنی زبان کے ادب کو محفوظ رکھا اس کی روایات ہمیشہ محفوظ رہیں اور جس نے اس کی طرف سے بے اعتنائی برتی اس کا نام بھی صفحۂ روزگار پر باقی نہ رہا۔

مختلف زبانوں کی کھوج کے بعد محققین نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ تمام زبانیں مستقل طور پر بیک وقت ایجاد نہیں ہوئیں بلکہ یکے بعد دیگرے ایک ہی زبان سے نکلی بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہی ہیں زبانوں کی لفظی مشابہت اس تحقیق پر دلالت کرتی ہے آج گو بہت سی زبانیں اپنا مستقل وجود اور وقار رکھتی ہیں۔ ان کے بولنے والے اپنی اپنی زبان کو الہامی سمجھتے ہیں کسی دوسری سے بے میل کہتے ہیں مگر کبھی کبھی مشابہ الفاظ اس کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ ایک ہی جڑ سے نکلی ہوئی مختلف شاخیں ہیں جو امتدادِ زمانہ سے اپنی اصلیت کھو کر موجودہ صورت اختیار کر چکی ہیں۔ ان کے بولنے والے کبھی ایک جگہ رہتے سہتے ہوں گے مگر ضرورتِ وقت سے وہ الگ ہو گئے ماحول اور آب و ہوا کے باعث زبان میں کچھ صوتی اور صورتی تبدیلیاں ہوئیں جن کو آج الگ الگ وجود دیدیا گیا ہے

مگر یہ امر واقعہ ہے کہ جب مختلف قومیں مختلف زبانوں اور تمدنوں کے ساتھ کہیں پھر ملتی ہیں تو بعید ترین اشتراک ان کے احساسات کو ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ انہیں باہم اشتراک پر مجبور کرتا ہے اور کم از کم اظہارِ خیال کے لئے تو راہ ہموار کر ہی دیتا ہے۔

اس خونی رشتہ اور نسلی اتحاد کے علاوہ کبھی کبھی پڑوسی زبانوں کے ایک ساتھ رہنے سہنے کے سبب آپ سے آپ بھی شکست و ریخت اور تعمیر و قبول کا عمل ہوتا رہتا ہے آپس کے میل جول سے کبھی کچھ لفظ قبول کئے جاتے ہیں کبھی کچھ اسلوب اپنائے جاتے ہیں۔ ہاں انہیں جو زبانیں ذرا

[redacted]

زیادہ قوی ہوتی ہیں ان کی چھاپ بہت گہری ہوتی ہے یز اکثر کمزور زبانیں چالو زبانوں کا سہارا لیکر اپنے آپ کو جینے کے قابل بناتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ باہمی اختلاط اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ایک نئی زبان کی تخلیق شروع ہو جاتی ہے جس کا ابتدا میں احساس بھی نہیں ہوتا مگر فطرت کا ہاتھ چپکے چپکے اپنا کام کرتا رہتا ہے اس کی ظاہر ہئیت سے خوف کھا کر اہل علم پہلے پہلے الگ ہی رہتے ہیں اور اپنے خیال میں اس کو غیر زبان سمجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔ اپنی بولی اور اپنی زبان کو اس کی چھوت سے بچاتے ہیں مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بالکل نرالا ہے۔ ضرورت کے وقت بن بولے بن نہیں پڑتا، منہ پر تالا نہیں لگایا جا سکتا چپ سادھ کے نہیں بیٹھا جاتا آخر بولنا ہی پڑتا ہے۔ اپنی بات کو سمجھانا اور دوسروں کے مطلب کو سمجھنا ہی پڑتا ہے اس مجبوری کے صاحب آبحیات نے کئی سبب بیان کئے ہیں جو معلومات و دلچسپی سے خالی نہیں، فرماتے ہیں :۔

۱۔ اول تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

۲۔ اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں اُن ہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے پھر بھی تو وہ لطف آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئین زبان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔

۳۔ جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس لطف کو جانتے ہیں کہ جب دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے ہیں تو کبھی کام کاج کی شدت اور مصروفیت کبھی اُسی عالم میں ضروری بات جلد کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اُس کے گزارہ نہیں۔

۴۔ پھر جب ایک جگہ رہتے سہتے لوگ باہم شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش کرتے ہیں جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح اُن کی زبان اپنے مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔

۵۔ بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات بات کو لباس، دستار، گفتار، رفتار کو بھی اُسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں پھر اُسمیں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

(آبحیات)

اس تحقیقات سے زبانوں کے بارے میں بہت سے تعصب ختم ہو جاتے ہیں اور ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کوئی بھی نئی پرانی، دیسی بدیسی، اپنی پرائی زبان نفرت کے قابل نہیں۔ ان میں ماں بیٹی بہن کا سا تعلق ہے یہ تعلق کسی طرح بھی کاٹا نہیں جا سکتا جو لوگ زبانوں کو الگ الگ ثابت کرنے کے خبط میں مبتلا ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ زبان کی زندگی میں نئے الفاظ نئے معانی اور نئے اسالیب برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں ایک زندہ زبان انہیں اپنانے سے نہیں ڈرتی جو زبان اپنی سالمیت ختم ہو جانے کے ڈر سے انہیں اپنانے سے پرہیز کرتی ہے یا پابند رسوم ہے وہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو آکاش بانی سمجھتی ہے وہ جوان سے جلد ایا ہج ہو کر بیٹھتی ہے اس کو ہم شیشہ کے مکان سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کو دور سے دیکھا تو جا سکتا ہے مگر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

زبان کے پاس سب سے بڑی سند قبول عام کی ہوتی ہے نہ کہ بھاری بھرکم الفاظ کے ذخیرے اور پیچیدہ طرز کی۔ کسی زبان کا جتنا زیادہ استعمال ہو رہا ہے اتنی ہی ہمہ گیری سے وہ زندہ ہے جتنے محدود حلقے میں وہ بولی جاتی ہے اتنی ہی وہ مردہ ہے بے سکت ہے۔ اور بے مصرف ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ سے موٹی سی لغت تو تیار ہو جاتی ہے مگر زبان کا حُسن و وقار خاک میں مل جاتا ہے۔ سادگی، آسان فہمی اور لچک ہی کسی زبان کی ترقی کی ضمانت ہیں۔

اس سے اس بات کی نفی بھی ہو جاتی ہے کہ قانون کے ذریعہ کوئی زبان عوام پر ٹھونی جا سکتی ہے بلکہ برعکس اسکے عوام جس زبان کو چاہیں اُسے اپنا سکتے ہیں۔ ہر زبان اپنے ماحول میں ڈھلتی ہے۔

پروان چڑھتی ہے آگے بڑھتی ہے۔ عوام اُسے بولتے ہیں نکھارتے ہیں، اور برگ و بار لانے کے قابل بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر طریقہ غیر فطری ہے۔ بیجا دباؤ ہے، ایک تشدید ہے ایک تلخ گوئی ہے جس سے منہ خراب تو ہو سکتا ہے۔ لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ زبان کے مسئلے میں اگر شدت اختیار کی جاتی ہے تو فرقہ پرستی کی خلیج نمودار ہو جاتی ہے کسی بھی ایک گروہ کی ٹھیکیداری زبان کی لچک کو ختم کر دیتی ہے اُس کی ترقی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور بہاؤ کے رُک جانے سے تعفن ناگزیر ہے۔

ظاہر بات ہے کہ زبان قانون پاس کرنے یا ریزولیوشن بنانے سے نہیں بلکہ اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کرتی ہے اگر اس میں اثر پذیری، لچک اور قوت انجذاب موجود ہے تو پھر وہ آگے بڑھے گی ورنہ دب دبا کر پیچھے پڑی رہ جائے گی۔ اس وقت نہ انتہائی قوم پرستانہ زاویۂ نگاہ کام دے گا نہ کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع۔ اس کے لئے تو سب سے ضروری چیز یہی ہے کہ ہم دوسروں پر حکم و عقدہ کئے بغیر زبان کی بنیادی صلاحیتوں کو سمجھ کر اسے زیادہ سے زیادہ قابل استعمال بنائیں۔

یہ کچھ نئی باتیں نہیں کہی گئی ہیں بلکہ یہ زبانوں کی تاریخ کے بناؤ بگاڑ کی وہ حقیقتیں ہیں جو آج بھی بڑے بڑے کتب خانوں کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں۔

ابوالمجاھد زاھد

○

آرزوؤں کی یہ شام دیکھئے کب تک رہے
زندگی ناشادکام دیکھئے کب تک رہے
سوزِ یقیں ناتمام دیکھئے کب تک رہے
آتشِ نمرود عام دیکھئے کب تک رہے
دیکھئے کب تک رہے قید مقام و وطن
نکہتِ گُل زیر دام دیکھئے کب تک رہے
اہلِ نظر کے لئے دار و رسن، قید و بند
ظلم کا یہ اہتمام دیکھئے کب تک رہے
دیکھئے کب تک رہیں مصلحت اندیشیاں
عقل جنوں کی امام دیکھئے کب تک رہے
اہلِ خرد ہیں مصر سوزِ غمِ عشق پر
بحث حلال و حرام دیکھئے کب تک رہے
دیکھئے کب عام ہو جلوۂ حُسنِ حیات
ابر میں ماہِ تمام دیکھئے کب تک رہے
زندگی زاہدِ غم زدہ تیرے بغیر
ایک شکستہ سا جام دیکھئے کب تک رہے

سردار جلیل ایم۔اے

○

بھرے جہان میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش میں ہوں مگر روشنی نہیں ملتی
یہ کیا اندھیر ہے یارب بہار میں بھی یہاں
گلوں کے رُخ پہ ذرا تازگی نہیں ملتی
مذاقِ فطرتِ آدم بدل گیا شاید!؟
تکلّفات بہت۔ سادگی نہیں ملتی
ہمارا مقصدِ تخلیق، آخرش کیا تھا
اس ایک راز سے بھی آگہی نہیں ملتی
تجلّیوں سے جو خیرہ نہ ہو سکے اے دوست
مری نظر کو وہ تابندگی نہیں ملتی
نہ خُلق و لطف و عنایت نہ وہ رواداری
تمہاری پہلی سی اک بات بھی نہیں ملتی
تجلّیات بہر گام، صاعقے پیہم
مگر غضب ہے کہیں روشنی نہیں ملتی
تمہارے کلبۂ احزاں کا ذکر کیا اے جلیل
صنم کدوں میں بھی اب دلکشی نہیں ملتی

عرشی بھوپالی

ہر کفِ پا میں آبلے ہوں گے
رات بھر قافلے چلے ہوں گے

جب اسیرِ قفس چلے ہوں گے
ہاتھ صیاد نے ملے ہوں گے

کتنے کانٹے نہ چبھے ہیں راہوں میں
کس طرح راہرو چلے ہوں گے

قیس و فرہاد بن سکیں گے وہی
جو محبت میں دل جلے ہوں گے

دیکھ رندوں کو مت حقارت سے
ان میں کتنے ہی منچلے ہوں گے

جو اجل سے ملا رہے ہیں آنکھ
عشق کی گود میں پلے ہوں گے

جانے کیا مجلس ہو رہی ہیں ندیم
اپنی قسمت کے فیصلے ہوں گے

نجم الاسلام

آغاز ہی جن کا ٹھیک نہیں ان کا نہ ہو کیوں انجام غلط
اُنکی نہ ہو کیوں ہر بات غلط، انکا نہ ہو کیوں ہر کام غلط

رستے میں کوئی سوتا جو ملا کی ہیں نے ملامت اور کہا
منزل پہ پہونچنے سے پہلے او ننگِ سفر آرام غلط

میخانہ سے لیکر مسجد تک ہر گوشۂ ہستی ہے ابتر
تنظیمِ حرم درہم برہم، تقسیمِ شراب و جام غلط

اے اہلِ خرد سبحان اللہ کیا کہنا تمہاری منطق کا
اک عقل کی لغزش کے آگے موقوف وحی؟ الہام غلط؟

کہنا تو بہت کچھ ہے لیکن اُس شوخ سے کس حکمت سے کہوں
توضیح بھی کچھ برمحل نہیں اور اس سے سوا ابہام غلط

ناقد! تری ہر تنقید بجا، کچھ کر کے تو نہ بھی تو دکھا
کہنا تو سبھی کو آتا ہے یہ کام غلط، وہ کام غلط

ہر رنگ مناسب اپنی جگہ اور اک حد تک ہر طرز بجا
یکسر نہ تو رنگ خاص غلط اور نجم، نہ رنگِ عام غلط

محمد نیاز

○

ذرا سی بات لے کر سر گراں ہونا قیامت ہے
موافق دوستوں سے بدگماں ہونا قیامت ہے

سلام اے ضبط اے بندِ تکلّف، اے ادب رخصت
زباں رکھتے ہوئے تو بے زباں ہونا قیامت ہے

مجھے پھر وحشتِ غربت نے پکارا میزباں میرے
اب ایسے میں کسی کا میہماں ہونا قیامت ہے

مصیبت میں تمہی ناکامیاں ہی نوجواں لیکن
فقط، ناکامیوں پہ نوحہ خواں ہونا قیامت ہے

نشیمن پھونک دو رکھ دو قفس میں لا کے بلبل کو
مگر اس شوخ کا محوِ فغاں ہونا قیامت ہے

مسافر تیری منزل تیرے پیچھے رہ گئی شاید
بایں وحشت امیرِ کارواں ہونا قیامت ہے

منظر اعظمی

○

نہ زلفِ منتشر نے چشمِ نم کی بات کرتے ہیں
فقط اک پیکرِ حُسن و کرم کی بات کرتے ہیں

ہمیں طاؤس و بربط کی فسوں زائی نہیں بھاتی
مگر ہم نغمۂ لوح و قلم کی بات کرتے ہیں

خدایانِ خرد بھی علم کی اِن خانقاہوں میں
لب و رخسار و دندانِ صنم کی بات کرتے ہیں

"جہانِ پیر" کی مردہ نگاہی خود بتائے گی
کہ ہم "سوئے نیلئے الطاف و کرم" کی بات کرتے ہیں

خدا معلوم یہ دادِ سخن کیا گُل کھلائے گی!
سُنا ہے وہ مرے زورِ قلم کی بات کرتے ہیں

حیاتِ مبتلا اک شیوۂ محبوب ہے منظرؔ
وہ احمق ہیں جو اندوہ و الم کی بات کرتے ہیں

کیفی امروہوی

○

ہائے یہ شورشِ الم ہائے یہ گردشِ حیات
بھٹکے ہوئے ہیں کارواں سہمی ہوئی ہے کائنات
تو ہے امیرِ کارواں، تو ہے امینِ زندگی
تو ہے جہاں کے واسطے تیرے لئے ہے کائنات
یادِ حبیبِ زندگی! تو ہے جوان آج بھی
کتنے گذر گئے مقام، کتنے ہوئے تغیرات،
عشق جمالِ زندگی، عقل جلالِ زندگی
اُس کا مقام با ثبات، اِس کا مقام بے ثبات
میں کہ امامِ زندگی، تو کہ اسیرِ زندگی
تیری نظر میں تو ہی تو، میری نظر میں کائنات
سدرہ نشین طائرو! اور بھی کچھ مقام ہیں
رفعتِ منزلت نہیں تنہا ہی مقصدِ حیات
کیفی رہِ حیات میں ایسے بھی کچھ مقام ہیں
روح ملول ہو زندگی، خام ہوں گر تصورات

مضطر مرزاپوری

○

میں اس جہاں کو جو چھوڑوں تو کس جہاں کے لئے
کوئی بتلائے تو گوشہ کہیں اماں کے لئے
مکیں مکاں کے لئے راز راز داں کے لئے
تمہارا غم ہے ضروری بقائے جاں کے لئے
کسی کے نقشِ کفِ پا کا نور کیا کہئے
ہر ایک گام پہ رہبر ہے کارواں کے لئے
تمہاری راہگذر کی سمجھ کے اِک تصویر
نظر نے بوسے بصد شوق کہکشاں کے لئے
یہ بندشیں مری نظروں پہ تا بہ کے آخر
تڑپتا ہے مرا دل حُسنِ لامکاں کے لئے
بہارِ لالہ و گُل ہے چمن چمن لیکن!
ترس رہا ہوں گلستاں میں آشیاں کے لئے
شکایتیں غمِ دوراں کی تا بہ کے مضطر
زباں دہن میں ہے رنگینیٔ بیاں کے لئے

محمد عزیز، ایم۔ اے

اُف یہ کُتّے

"ارے یہ تمہیں نیند آنے لگی؟" مُشٹنڈے نوجوان نے مُنہ سے پان کی پیک پونچھتے ہوئے ساتھ والی سہمی ہوئی مگر بظاہر خوش نوجوان عورت سے پوچھا۔

سکنڈ شو ختم ہونے کے بعد جب مجمع نکل چکا تو یہ تین آدمی بھی آہستہ آہستہ چل رہے تھے، سفید لباس میں ملبوس، ایک عورت کے ساتھ دو مرد تھے۔

سینما بلڈنگ کے آس پاس بیٹھنے والے خوانچہ فروش بھی اونگھ اونگھ کر بچا کھچا سامان بیچ رہے تھے۔

"نہیں جی، ٹھیک تو ہوں۔" عورت نے صفائی پیش کی اور مضبوط قدم کے ساتھ چلنے لگی۔

"گلستان" کی حدود سے نکل کر انہوں نے ریلوے کراسنگ عبور کی اور اب نواب پور روڈ پر آ چکے تھے۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر کیچڑ ہو گئی تھی اور یہ لوگ سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ سڑک پر سناٹا ہو گیا تھا، کتّے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ رکشہ اسٹینڈ بھی خالی ہی تھا، دو ایک رکشہ والے سڑک پر خالی رکشہ دوڑا رہے تھے، پولیس پوسٹ پر ٹریفک کے سپاہی کی جگہ ایک پاگل بیٹھا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ دوا کی دوکانیں اب بند ہو رہی تھیں صرف ڈے اینڈ نائٹ فارمیسی پوری طرح کھلی تھی اور یہ لوگ آہستہ آہستہ چل رہے تھے، خاموش خاموش سے کہ یکا یک دوسرے مرد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے پوچھا،

"ہاں تو کہو کیسا لگا سینما" پھر خود ہی بولنے لگا۔ "گلستان میں کھیل اچھے ہی آتے ہیں ڈھاکہ کی ناک ہے؟"

"ہاں، اچھا لگا" عورت نے بے اعتنائی سے یوں ہی جواب دیا۔ "کتنی جلدی جلدی شکلیں نظر آتی ہیں۔"

"یہ بیگ ایسے سٹائل تھوڑا ہی چلتے ہیں" مُشٹنڈے مرد نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر کے کہا کہ کوئی راہ گیر سُن تو نہیں رہا ہے۔ "تمہیں اس دن میں نے بتایا نہیں تھا جس دن ہم لوگ ڈھاکہ کلب کی طرف سے گذر رہے تھے"۔

"بڑے بڑے افسروں کی بیگمات کس طرح بیگ لے کر چلتی ہیں۔"

"اونہہ، ہو گا بھی" عورت نے ایک پان کی دوکان پر گذر کر آہستہ سے کہا۔ "تم تو بس کسرت ہی کرانا چاہتے ہو"

"ہی ہی ہی" مرد اپنے دوست سے یہ فقرہ سُن کر بہت خوش ہوا۔

"یہ تم اُدھر کیا دیکھ رہی ہو؟"

عورت کی نظر ایک طرف پر جم رہی تھی، ایک عورت اپنے بچے کو چُپ کرا رہی تھی۔ "ارے میری بچی بھی گھر میں اکیلی ہو گی۔ میں بھی کیا ـــ" عورت پر کچھ گھبراہٹ اور تشویش کے آثار پیدا ہو رہے تھے

"عصمت کو یاد کر رہی کیا؟" دُبلا والا مرد بولا۔ "چھوڑو بھی، ذرا بیگ تو ٹھیک کر لو"

"لو" اور عورت نے سچ مچ اپنے ہاتھ کو موڑ کر جسم پر زاویہ قائمہ سا بنایا اور بیگ کو سامنے کی طرف نمایاں کر کے لٹکایا۔

سفید لباس پر سیاہ مخمل کا بٹوا خاصا نمایاں تھا، "اب تو خوش ہو" وہ کچھ جھنجھلاتی ہوئی بولی، جیسے متضاد جذبات کام کر رہے ہوں۔

"ہاں! شاباش" دُبلے مرد نے داہنی طرف آ کر کہا۔ "اب تم کو دیکھ کر کوئی یہ تھوڑا ہی کہہ سکتا ہے کہ تم ایک بڑے افسر کی بیگم نہیں ہو"

"اچھا! اب بس کرو بیکار کی باتیں ہیں" عورت کچھ نادم

سی ہوئی اور اس نقل پر داد ملنے سے اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" چلو اب واپس، بہت دیر ہو چکی ہے۔"

" واپس ؟" دُبلے مرد نے تعجب سے پوچھا" اتنا جلدی"

" اونہہ، اور کیا "عصمت کی ماں نے کہا۔" تمہارے کہنے سے پہلی بار یہ غلطی کی کہ رات کو گھر سے نکلی اور وہ بھی بچّی کو چھوڑ کر"

" ابھی سے، ہا ہا ہا" مسٹنڈا مرد بولا۔" ابھی اتنی جلدی کیسے کسی شریف بیگم کو آجکل دو بجے سے پہلے گھر واپس ہوتے ہوئے دیکھا ہے ؟

" ہی ہی" دوسرے مرد نے کہا۔" اُس دن ہی تو سکریٹری صاحب کا ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ صاحب تو ڈیڑھ بجے سے پہلے گھر آتے ہی نہیں اور بیگم صاحب بھی دو ڈھائی سے پہلے کبھی نہیں آتی ہیں "

"ہاں تو اب کدھر چلیں ؟" سنگم کے پاس سے راہ پر پہونچکر مسٹنڈے مرد نے اپنے دوسرے ساتھی سے پوچھا۔

" کاش ہم لوگ بھی افسر ہوتے تو کلب کے اندر جاکر مزے کرتے "

"یار کیا بنائیں انگلش بھی تو نہیں آتی" دوسرا بولا" ورنہ کس بات کی کمی ہے۔ دکان چلتی ہے پیسہ کی کمی نہیں "

" ہاں استاد"

"کیا بکواس کر رہے ہو" عورت نے ان تمام باتوں سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا " چلو، واپس چلو " اور وہ آنچل برابر کرتے ہوئے بولی جو بار بار سرک جاتا تھا۔

"یہ کیا پگلی" مرد نے اس کا ہاتھ پکڑا۔" ارے اب بار بار آنچل درست کرنا کوئی ضروری ہے کیا، جانی نہیں ہو، اب بیگمات ایسا نہیں کیا کرتی ہیں "

اب تو بھائی بہت تھک گئی ہوں، عورت کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں " جلدی چلو"

"ارے کچھ سستا نہیں " دُبلے مرد نے بڑی عیّاری سے مشورہ دیا، چلیں، " ممتاز محل" میں چائے نہ پی لیں "

" ہاں کلب نہیں تو یہی سہی " دوسرے نے شہ دی " یہ بات کہی ہے اُستاد، فسٹ کلاس" اب" چلو اندر چلو عصمت کی ماں "

" سنو بھائی یہاں عورتیں وورتیں نہیں آنے پاتیں"۔ ہوٹل کے بیرے نے تیزی سے دروازہ پر آکر کہا۔ اور وہ بھی رات میں، ایسی ویسی عورتیں "

عصمت کی ماں کا دل بھر آیا اور وہ مجسمہ بنی کھڑی تھی، اُس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جائے لیکن دلدل میں قدم رکھنے کے بعد مزید دھنسنا ہی ممکن ہے نکلنا نہیں۔

" ارے کیا سوچ رہی ہو آؤ اندر" مرد داخل ہو گیا اور پانچ کا نوٹ بیرے کے ہاتھ میں پہونچ چکا تھا۔

اور اب تینوں بیٹھے ہوئے تھے۔

" چائے دیں صاحب ؟ "

" ہاں اور تم لوگوں کے پاس ہے ہی کیا" مرد نے گویا تحقیر کرتے ہوئے کہا " وہ پانی ہے۔

" کون پانی صاحب ؟ " بیرے نے پوچھا " سوڈا واٹر"

" ہشت بدھو" مرد نے جواب دیا" تم لوگ نئے شہر سے دور رہتے ہو" جاؤ چائے لاؤ اور ساتھ میں کچھ مٹھائی بھی سموسہ تو ہوگا نہیں ؟"

"جی نہیں صاحب" اور تھوڑی دیر بعد تین گرم گرم پیالیاں میز پر رکھی تھیں اور ساتھ میں ایک پلیٹ میں تین چار مٹھائیاں

" ٹن ٹن ٹن، بارہ بار گھڑیال بولا۔

" ارے تم نے چائے نہیں لی" دُبلے مرد نے عورت سے پوچھا

" بس چلو" عورت نے پریشان ہو کر کہا اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی " اب میں جلد گھر جاؤں گی۔" اُسے بار بار کچھ بدگمانیاں اور اندیشے ہو رہے تھے۔

آخر کار سب اُٹھے۔

" ارے گجب"۔ سامنے دوکان کو بند کرتا ہوا ایک کمسن لڑکا بڑی دیر سے ادھر گھور رہا تھا۔ فلورسنٹ ٹیوب کی روشنی پر سفید جارجٹ کی ساڑھی اور سفید ساٹن کے بلاؤز کے ساتھ چہرے کا پاؤڈر خوب چمک رہا تھا بے ساختہ وہ گانے لگا " یہ تو" مگر کچھ سوچ کر رُک گیا۔

"عورت" یہ سُنکر اور بھی گھبرائی۔ مصیبت زدہ اور خا

عورت ہی تھی۔ اُسے ہمسایوں کی ہمدردی اور دور کی رشتہ داری کی یہ انوکھی قیمت نہ معلوم تھی۔ البتہ وہ بیوگی کے خلاء کو ان لوگوں کے ساتھ ربط ضبط کے ذریعہ پُر کرتی رہی تھی۔

"ارے سُنتے ہو میں اب فوراً جاؤں گی۔" عورت کے اندر بالآخر حیا کا جذبہ عود کر آیا۔ "تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں؟"

"ہی ہی ہی"

"یہ آخر اتنے پیسے جو اتنے دنوں سے خرچ کر رہا ہوں" مرد کے اندر سے شیطان بولا۔ "کیا میں محض امداد کر رہا ہوں۔ یا کوئی خلیفہ عمرؓ ہوں کہ ایک بیوہ کی خواہ مخواہ مدد کروں۔"

"اچھا یہ بات ہے" عصمت کی ماں سٹ پٹائی ہوئی بولی، "تو تم نے شادی ہی کر لی ہوتی۔"

"دوسری شادی" مرد نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ تو گورنمنٹ نے منع کر دیا ہے، سکریٹری صاحب کا ڈرائیور کہہ رہا تھا۔"

"ہو نہ شادی" دوسرے مرد نے کہا۔ "تو ہمیں کہ بیٹھیں۔ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوئے جب علیم الدین بھائی کا انتقال ہوا۔"

اُسے ایک دھکا سا محسوس ہوا کہ وہ کیوں تحائف قبول کرتی رہی اور معصومی سے دور کے چچازاد بھائی کی ہمدردی کا شکار ہوتی رہی اور ٹیڑھے راستہ سے اپنی زندگی کے پیدا شدہ خلاء کو پُر کرتی رہی۔

وہ آگے بڑھ کر رکشہ والے کو پکارنے لگی، اب اُسے مزید انتظار منظور نہ تھا، وہ بالکل تھک چکی تھی۔

"اچھا یہ ٹھاٹھ ہیں۔" مرد نے کہا "آپ چلیں۔"

"ہم لوگ تاجر ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "پیسہ لگا کر نقصان تھوڑا ہی سہہ سکتے ہیں۔"

وہ تیز چل کر رکشہ پر سوار ہو جانا چاہتی تھی، جو اتفاق سے قریب ہی موجود تھا۔

"پیں پیں، بھوں بھوں"۔ رکشہ کے قریب وہ لڑکھڑاتی ہوئی پہونچی، وہ پائیدان پر پاؤں رکھنا ہی چاہتی تھی کہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہی، پاس ہی ایک کتیا کے ساتھ دو کتے کھڑے تھے۔ عصمت کی ماں نے اُن سے ٹھوکر کھائی اور وہ "پیں پیں" کرتے ہوئے ادھر اُدھر بھاگے۔

فوراً ہی ایک کار تیزی سے گذر گئی جس سے مردانہ زنانہ دونوں آوازیں آ رہی تھیں۔ کتے دور کھڑے بھونک رہے تھے۔

وہ [illegible] رکشہ میں سوار ہونا ہی چاہتی تھی کہ وہ دونوں مرد [illegible] وہ اب دو مضبوط [illegible]

"اُف یہ کتے!" بے بس عورت کے منہ سے نکلا۔

سامنے پان کی دوکان پر کھڑا پولیس کا سپاہی بیڑی کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا اور ایک کمسن لڑکا گاتا ہوا چلا جا رہا تھا: "جائیں تو جائیں کہاں۔"

تعمیر پسند
افسانوں ——— اور ——— ڈراموں ——— کا ——— مجموعہ

اُبھرتی کرنیں

قیمت = دو روپے آٹھ آنے

ناشر = مکتبۂ معیار میرٹھ

منظر حسین

یہ دفتر ہے

فرض کیجئے آپ کسی دفتر میں کلرکی کے "اُمیدوار" ہیں۔ اب آپ سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ اس دفتر میں اپنے کسی رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست کو تلاش کریں گے۔ آپ کی زبردست خواہش یہ ہوگی کہ "صاحب" کا چپراسی کسی صورت سے آپ کا قریبی عزیز نکل آئے اور اس کے لئے آپ ایسا توڑ جوڑ کریں گے اور ایسے داؤں پیچ ماریں گے کہ بے چارہ چپراسی واقعی آپ کو اپنا سب سے بڑا عزیز سمجھنے لگے گا اور اگر یہ نہ سمجھے گا تو کم از کم یہ تو ضرور سوچنے لگے گا کہ آپ بھی اسی آدمؑ کی اولاد ہیں جس کی وہ خود ہے۔ لیکن خدانخواستہ آپ کو اس میں ناکامی ہوئی تو پھر آپ سپرنٹنڈنٹ یا کسی ماتحت افسر سے رشتہ گانٹھنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ادھر سے بھی آپ دھتکار دیے گئے تو پھر آپ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر کلرکوں کے درمیان ہی "رشتہ داری" ڈھونڈھیں گے۔ رشتہ داری نہ سہی دوستی۔ دوستی نہ سہی 'دوست کی دوستی'۔۔۔ یعنی آپ اپنی اورینجنل پالیسی پر آجائیں گے۔ اب ظاہر ہے کہ اتنے بڑے دفتر میں ایک آدھ آدمی آپ کا رشتہ دار، دوست یا دوست کا دوست بننے پر تیار ہو بھی جائیگا۔ آپ اس کے پاس جائیں گے اور کہیں گے۔ "بھائی صاحب۔ السلام علیکم" وہ جواب دے گا۔ "وعلیکم السلام"۔ آپ کہیں گے: "بہت دنوں سے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہوا۔ کدھر رہتے ہیں آپ آجکل؟" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہے گا: "یہاں دفتری زندگی میں پھنسکر آدمی کہیں کا نہیں رہتا"۔ آپ بھی ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہیں گے: "سچ ہے بھئی — سچ ہے"۔ اور پھر آپ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہیں گے۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی اس دفتری زندگی کو میں بھی دیکھوں"۔ وہ بولے گا "خبردار۔ ادھر بھولے سے بھی قدم نہ رکھئے گا"۔ آپ کہیں گے "بھئی۔ قدم تو میں نے رکھ دیا ہے"۔ وہ پوچھے گا۔ "کیا مطلب؟" آپ جواب دیں گے: "مطلب یہ کہ میں نے کلرکی کے لئے درخواست بھیجی ہے"۔ وہ حیران ہو کر کہے گا۔ "درخواست؟" آپ مسکرا کر کہیں گے۔ "جی ہاں۔ میں نے ایک ہفتہ ہوا ایک درخواست بھیجی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کے دفتر میں کچھ جگہیں خالی ہوئی ہیں لیکن اس درخواست کا حشر کیا ہوا۔ یہ مجھے نہیں معلوم"۔ وہ آپ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولے گا۔ "خالی درخواست؟" آپ اسے ایک عدد سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہیں گے۔ "جی بالکل خالی۔ لیکن میں اسکا پیٹ بھرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ۔ ۔ ۔ ۔" آپ یہ کہتے کہتے رُک جائیں گے اور وہ سوچنے لگے گا اور پھر سوچ کر کہیگا "اچھا۔ آپ مجھ سے گھر پر ملیں۔ آج شام کو سات بجے — اور ایک نئی درخواست لکھ کر ساتھ لیتے آئیں کیونکہ پُرانی درخواست کا ملنا مشکل نظر آتا ہے"۔ آپ اسکا شکریہ ادا کرکے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ اور پھر اپنے گھر سے وقت مقررہ پر اس کے گھر — وہ بڑے تپاک سے ملیگا اور کہے گا۔ "درخواست دکھائیے"۔ آپ درخواست پیش کرتے ہوئے کہیں گے۔ "دیکھئے میں الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں اور چھ سال کا تجربہ بھی رکھتا ہوں"۔ وہ مسکرا کر کہے گا۔ "اچھا؟" اور پھر درخواست پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر کہے گا۔ "آپکی کامیابی مشکل ہی نظر آتی ہے"۔ آپ کا مُنہ لٹک جائیگا اور الہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ ہونے کا غرہ اور چھ سال کا تجربہ رکھنے کا فخر مٹی میں مل جائیگا۔ وہ آگے کہیگا۔ "مشکل اسلئے کہہ رہا ہوں کہ جگہیں صرف تین ۳ ہیں اور اُمیدوار تین سو ۳۰۰ اور ان تین سو ۳۰۰ میں تقریباً تین ۳ اُمیدوار وزیروں، سیکریٹریوں، ڈپٹی سکریٹریوں، اسسٹنٹ سیکریٹریوں، افسروں، اور ایم۔ ایل۔ اے حضرات کے آدمی ہیں"۔ آپ کے مُنہ سے بے ساختہ "ارے باپ" نکل جائے گا۔ لیکن وہ پھر مسکرائیگا اور مسکرا کر کہیگا۔ "آپ مایوس نہ ہوں۔ کوشش کریں۔ ممکن ہے آپ کامیاب ہو جائیں"۔ آپکی باچھیں کھل جائیں گی اور آپ اس کی طرف یوں دیکھیں گے گویا کہ وہ فرشتۂ رحمت ہے۔ اد

پھر کہیں گے: "آپ جو حکم دیں میں کرنے کو تیار ہوں۔" وہ آپ کے قریب جھک کر تقریباً آپ کے کان میں کہے گا: "کیا آپ پانچ سو روپیہ کا فوری بندوبست کر سکتے ہیں؟" آپ کہیں گے۔ باپ رے باپ۔ پانچ سو؟" وہ کہے گا: "پانچسو نہ سہی، چار ہی سو سے کام چل جائیگا۔" آپ پھر کہیں گے: "باپ رے باپ چار سو؟" وہ کہے گا: "چار سو نہ سہی، تین ہی سو دیدیجئے۔" آپ پھر کہیں گے: "باپ رے باپ۔ تین سو؟" وہ کہے گا۔ "تین سو نہ سہی، دو سو سہی" آپ پھر کہیں گے۔ "باپ رے باپ . . ." وہ جھنجلا کر آخری بولی بولے گا۔ "ڈیڑھ سو روپیہ اس سے کم میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پچاس روپیہ Estab. Clerk لے گا اور پچاس . . . ." آپ مجبور ہو کر کہیں گے "منظور ہے منظور" وہ پوچھے گا "کب دیں گے؟" آپ کہیں گے "کل شام کو میں اپنے دوستوں سے قرض لیکر آپ کی خدمت میں یہ رقم پیش کروں گا۔" وہ کہے گا: "کل شام کو ضرور لائیے۔ ورنہ آپ کا کام مشکل . . . . ." آپ کہیں گے: "بہت بہتر۔ بہت بہتر۔" اور پھر دوسری شام کو آپ ڈیڑھ سو روپیہ اس کے حوالے کر کے کہیں گے: "کیا میں اس کی امید رکھوں کہ آپ . . ."

وہ آپ کی بات کاٹ کر کہے گا: "قول مرداں جان دارد۔ آپ مطمئن رہیئے تین جگہوں میں سے ایک جگہ آپکو الاٹ ہو چکی ہے۔" آپ اسکا شکریہ ادا کر کے چلنے والے ہی ہوں گے کہ وہ پوچھے گا: "آپ کے پاس ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا تعارفی کارڈ تو ہوگا ہی؟" آپ کہیں گے: "نہیں میں ادھر گیا ہی نہیں۔" وہ کہے گا: "تو کل صبح جائیے اور وہاں سے تعارفی کارڈ لیکر آئیے۔ ورنہ سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائیگا۔" آپ قدرے حیران ہو کر دریافت کریں گے "اس کی کیا ضرورت ہے جبکہ میری درخواست موجود ہے؟" وہ جواباً عرض کرینگے: "بھئی یہ تمام درخواستیں بیکار ہیں سرکاری نقطۂ نظر سے۔ جب تک کہ . . ." آپ کہیں گے۔ "اچھا تو میں کارڈ لے لوں گا۔"

اور دوسری صبح کو جب آپ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دروازہ پر لگی ہوئی "لمبی کیو" میں جا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد آپکو ایک بابو دفتی کا بنا ہوا ایک ٹکٹ دیگا جس پر ۳۹۹ نمبر پڑا ہوگا۔ آپ اس ٹکٹ کو لے کر محسوس کرینگے جیسے آپ کو بہت بڑی دولت مل گئی ہو کیونکہ یہ ٹکٹ اس بات کا ضامن ہوگا کہ آپ کو ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کسی سُرخ یا سفید لفافہ میں بند کرکے "کلرکوں کے خزانے" میں ڈالدیجئے۔ ہاں تو جب آپ اس ٹکٹ کی افادیت پر غور کر رہے ہوں گے تو اسوقت آپکی "کیو" چیونٹی کی رفتار سے چل رہی ہوگی۔ اور اسی رفتار سے شام آجائیگی۔ اور آپ سے کہا جائیگا "دوسرے دن آؤ۔" غرضکہ آپ کئی صبحیں، کئی شامیں گذارنے کے بعد اس کمرے میں داخل ہوں گے۔ جہاں ٹکٹ والا بابو بیٹھا ہوگا۔ وہ آپ کے ہاتھ میں ایک سُرخ یا سفید لفافہ تھما کر کہے گا: "اسے بھرو۔" اور آپ اسے بھرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ اچانک آپ کا ایک ساتھی آپ سے پوچھے گا: "سطر نمبر ۳ کا جواب کیا لکھا جائے؟" آپ کہیں گے "پہلے یہ بتائیے کہ میری مستقل جائے سکونت کیا ہے؟" آپکا ساتھی آپکی طرف گھور کر کہے گا: "آپ کے سوا اسے کون بتا سکتا ہے؟" آپ کہیں گے: "میں رفیوجی ہوں۔ اس لئے یہ دقت پیش آئی۔" وہ بولے گا۔ "یہیں کا پتہ لکھدیجئے۔" آپ کہیں گے "میرا پتہ روزانہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور یہاں مستقل درکار ہے۔" وہ کہے گا۔ "کچھ لکھ بھی دیجئے۔ آپکو تو صرف کاغذ کا پیٹ بھرنا ہے۔" آپ اس کی بات مان لیں گے۔ اور انٹ سنٹ لکھ کر لفافہ بابو کو واپس کر دیں گے۔ بابو آپ سے ٹکٹ بھی واپس مانگ لے گا۔ اور پھر آپ سے اس بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہے گا جو منیجر کے پاس جانے والے لوگوں کے لئے محفوظ ہوگی۔ آپ ابھی بینچ پر بیٹھے ہی ہوں گے کہ بابو آپکو بلا کر کہے گا۔ "مسٹر اس سطر کا جواب آپ نے غلط لکھا ہے۔" آپ دریافت کرینگے "کونسی سطر کا؟" وہ بولے گا: "ذات والی"۔ آپ کہیں گے۔ "بھئی۔ اپنی تو کوئی ذات نہیں۔ اسلئے مسلمان لکھدیا۔" وہ کہیگا: "نہیں۔ آپ کی ذات ضرور ہوگی؟ ___ کیا ہے؟" آپ کہیں گے۔ میں نے عرض کیا نا کہ میری ذات کچھ نہیں ہے۔" وہ بگڑ کر کہے گا۔ "اے مسٹر تمہیں ملازمت حاصل کرنی ہے یا نہیں؟" آپ اس شیر کی آنکھیں دیکھ کر سہم جائیں گے اور کہیں گے: "آپکا جو جی چاہے لکھ دیجئے۔ میں تسلیم کر لوں گا کہ میں وہی ہوں۔" وہ قلم اُٹھا کر "مسلمان کی جگہ" "سید" لکھ دیگا اور آپکو دکھا کر کہے گا۔ "جائیے اس بینچ پر بیٹھ کر انتظار کیجئے۔" ___ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد چپراسی آپ کا نمبر پکاریگا اور آپ "اندر" داخل ہو جائیں گے۔ اندر داخل ہوتے ہی آپ کا سابقہ ایک "زنانی کم مردانی" آواز سے پڑیگا: "بیٹھ جائیے۔ آپکے پاس سرٹیفکٹس ہیں؟" آپ جواب دینگے۔ "جی۔ میڈم" اور فوراً ہی اپنی ذاتی فائل میڈم کے سامنے پیش کر دیں گے۔ میڈم پوچھیں گی۔ "آپ

ملازمت جانتے ہیں؟ آپ کہیں گے "تھوڑا تھوڑا!" وہ کہیں گی "تھوڑا تھوڑا کیا — صاف کہئے کہ نہیں جانتے" آپ کہیں گے "تقریباً نہیں کے برابر" وہ بولیں گی "تو پھر ہمیں افسوس ہے کہ اسوقت آپکو کوئی ملازمت نہیں دی جاسکتی" آپ کے دل پر برچھیاں سی چلنے لگیں گی اور آپ رو کر کہیں گے "میڈم — دفتر میں تین جگہیں خالی ہیں — مجھے وہاں بھیجکر ممنون کیجئے" وہ کہیں گی "ہمیں اسکی کوئی اطلاع نہیں — چپراسی دوسرے آدمی کو بلاؤ۔" آپ چلتے چلتے میڈم سے کہیں گے۔ "میڈم پلیز میں بہت ضرورت مند ہوں۔ مجھے وہاں بھیجدیجئے — آگے میری قسمت ہے" وہ خفا ہو کر کہیں گی "میں نے کہدیا نا کہ وہاں کوئی جگہ خالی نہیں" اور آپ اپنا سا منہ لیکر کمرہ سے باہر نکل آئیں گے۔ باہر نکل کر آپ افسردہ دلی سے کہیں گے "ہائے میرے ڈیڑھ سو روپئے" اور آپ سے چلا نہیں جائیگا اور آپ امپلائمنٹ کے دروازہ سے ملی ہوئی نچلی دیوار پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگیں گے — سگریٹ کا دھواں آپکے منہ سے آہوں کی طرح نکل نکل کر فضا میں پھیلنے لگے گا اور آپ کا دماغ "میڈم کی بچی کی" مرمت کی اسکیمیں سوچنے لگے گا — آپ اسکیمیں سوچتے رہیں گے کہ میڈم کے گھر جانے کا وقت آجائیگا اور وہ اپنے کمرہ سے نکل کر کار میں، اور کار سے نکل کر گھر میں داخل ہوجائیں گی۔ اچانک آپکو ایک چپراسی کی آواز چونکا دے گی "گھر نہیں جانا ہے کیا آپکو؟" آپ چپراسی کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ وہ میڈم کا چپراسی ہے اور آپ اس سے بڑی نرمی سے پوچھیں گے۔ "بھائی یہ جو منیجر صاحبہ ہیں آپکی وہ کہاں رہتی ہیں؟" چپراسی آپکو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہے گا۔ "مجھے نہیں معلوم" آپ جھٹ ایک روپیہ کا نوٹ (اور ظاہر ہے کہ یہ روپیہ آپ نے کسی سے قرض لیا ہوگا) نکال کر چپراسی کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہیں گے۔ "بھیا مجھے ملازمت کی بہت سخت ضرورت ہے۔ منیجر صاحبہ کا پتہ معلوم ہوجائے تو میں ان کے گھر پر جاکر ان سے ملوں اور...." چپراسی مسکرا کر کہے گا "منیجر صاحبہ گھر پر کسی سے نہیں ملتیں" آپ کہیں گے "تو پھر کیسے ملا جائے؟ اور کہاں ملا جائے؟" وہ بولے گا "اس کی بالکل سیدھی سی ترکیب ہے۔ آپ اُن سے ملنے کی بجائے ان کے بھتیجی (Fiancee) سے ملئے چلئے میں ان سے ملا دوں مگر...." وہ اپنی بتیسی دکھا کر آپ سے مزید "اُجرت" طلب کریگا۔ اور آپ اسے کام ہوجانے پر "پانچ روپیہ" دینے کا وعدہ کرلیں گے — پندرہ منٹ کے بعد آپ "بھتیجی صاحب" کے گھر پہنچ جائینگے اور آپ کا چپراسی "بھتیجی صاحب" کے خانساماں سے کچھ سرگوشی کریگا اور آپکو اس کے حوالے کرکے چل دیگا۔ خانساماں موقع و محل دیکھ کر آپ کا ذکر صاحب سے کریگا اور پھر آپکو ان کے دربار میں پیش کریگا۔ آپ اپنی مصیبتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرینگے اور دو تین موٹے موٹے آنسو بھی گرائیں گے، جس سے صاحب کے دل میں رحم پیدا ہوگا اور وہ آخرکار یہ کہیں گے کہ "اچھا مسٹر میں تمہاری سفارش کردوں گا" اور آپ صاحب کا صدق دل سے شکریہ ادا کرکے باہر نکلیں گے اور خانساماں کے ہاتھ میں اپنی بچی کچھی پونجی دیکر گھر کا راستہ لیں گے۔

— اور پھر آپ دوسرے دن، میڈم کے چپراسی کو مبلغ پانچ روپیہ دیکر "لیلائے کارڈ" کو سینہ سے لپٹائے، اپنے محبوب "دفتر" کے "محبوب" رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست سے ملیں گے اور وہ خوش ہوکر کہے گا "کارڈ مجھے دیجئے۔ اب آپ ۲۷ تاریخ کو انٹرویو کے لئے آئیے۔" آپ اس خوشخبری سے خوش ہوکر اسے کارڈ کے ساتھ ساتھ ایک سگریٹ دیں گے اور ایک خود پئیں گے — اور پھر ۲۷ تاریخ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگیں گے۔

۲۷ تاریخ کو آپ مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھیں گے اور اُٹھ کر اپنے دانتوں کو برش سے مانجھ مانجھ کر خوب چمکائیں گے اور منہ کو صابون سے مل مل کر دھوئیں گے۔ اور پھر شیو کرکے آپ غسل کرینگے۔ غسل کرکے آپ اپنا بہترین سوٹ یا شیروانی پاجامہ صندوق سے نکال کر پہنیں گے — اور پہن کر آپ قریب ترین ہوٹل میں اچھا سا "مقوی" ناشتہ کرینگے۔ اور ناشتہ کرکے آپ تھوڑی دیر سیٹی بجائینگے اور سیٹی بجاکر آپ ملازمت کے حسین تصور سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور پھر آپ گھر جاکر اپنی فائل لیں گے اور ایک گھنٹہ قبل ہی دفتر پہنچ جائینگے۔ جہاں آپ سے پہلے ہی کچھ لوگ آئے ہوئے ہوں گے۔ آپ ان لوگوں میں گھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرینگے۔ اور ہر ایک سے پوچھیں گے۔ "کیا آپکو کامیابی کی توقع ہے؟" اور جب آپ باتیں کرتے کرتے تھک جائیں گے تو ایک بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پئیں گے اور "ممکنہ سوالات" کے بارے میں سوچیں گے آپ سوچتے رہیں گے کہ ایک کار دندناتی ہوئی آئے گی جس میں سے "صاحب" بڑی شان سے اُترے گا اور آپ اسے اُترتے دیکھ کر بنچ سے اُٹھ کر احتراماً

کھڑے ہوجائیں گے۔ اور جب وہ گذر جائیگا تو آپ پھر اسپر بیٹھ جائیں گے آپ کا دل صاحب کے دیدار سے باغ باغ ہوجائیگا اور آپ دل سے چپکے چپکے دل میں دعائیں دینگے۔ اور پھر جوں جوں وقت گذرتا جائیگا آپ کی دعائیں، بددعاؤں میں، بددعائیں، گالیوں میں بدلتی جائیں گی۔ اور آپ انٹرویو کی طرف سے مایوس ہونے لگیں گے — جب آپ مایوس ہونے لگیں گے تو پھر ایک چپراسی صاحب کے کمرے سے نکلے گا اور پکارے گا "فضل الٰہی حاضر ہے" فضل الٰہی سے انٹرویو شروع ہوجائے گا اور محمد مشکور پر ختم ہوجائیگا۔ غرضکہ "فضل الٰہیوں" اور "محمد مشکوروں" کے شروع اور ختم ہونے کے بعد آپکا نام "دوسرے یا تیسرے" دن پکارا جائیگا۔ اور آپ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے چہرے پر نہ تو پہلے دن جیسی چمک ہوگی نہ خوشی۔ بلکہ اسپر گھبراہٹ کے آثار ہی ہوں گے — آپ کے پہنچتے ہی صاحب ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر آپ سے کہیں گے "دنیا کے سب سے اونچے مقام کا نام بتاؤ" اور ابھی آپکا جواب آپکے منہ کے اندر ہی ہوگا کہ دوسرا سوال ہوگا "ٹمبکٹو کہاں واقع ہے؟" اور پھر تیسرا "*Precis* کسے کہتے ہیں"؟ اور پھر چوتھا "آئین سٹائن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اور پھر پانچواں "تم گدھے ہو گٹ آؤٹ —" آپ اپنے گدھے پن پر کڑھتے ہوئے باہر نکل آئیں گے اور نکل کر اپنے رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست سے ملیں گے اور اپنے گدھے ہونے کا ذکر کریں گے وہ ہنسے گا اور کہے گا "بھئی یہاں گدھے ہی چل سکتے ہیں اور کوئی نہیں — آپ مطمئن رہئے۔ ایک جگہ آپ کے لئے مخصوص ہوچکی ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "لیکن انٹرویو —" وہ بولے گا "انٹرویو کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ کامیابی آپکے حصہ میں آچکی ہے"۔ آپ اس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھیں گے اور سوچیں گے "یہ بڑا گھٹا ہوا آدمی ہے۔ دیکھیں یہ کس طرح ملازم رکھواتا ہے"۔ اور پھر کہیں گے "تقرر کب تک ہوگا؟" وہ جواب دیگا "ایک ہفتہ کے اندر" آپ اسکا ہاتھ دباکر کہیں گے۔ "شکریہ" اور پھر اپنے گھر کی راہ لینے والے ہی ہوں گے کہ وہ کہے گا "آپ نے ڈومیسائل سرٹیفکٹ (Domicile — Certificate) تو لے لیا ہوگا؟" آپ کہیں گے۔ "نہیں" وہ کہے گا "تو پھر تقرر سے پہلے ہی لے لیجئے ورنہ سب کئے کرائے پر......" آپ کہیں گے۔ "بہتر ہے لے لوں گا۔"

اور آپ "D. C." کے چکر میں پڑجائیں گے، اور اس چکر میں کچھ ایسے چکرائیں گے اور رستم طائی کی طرح "یا اللہ مدد۔ یا اللہ مدد" پکاریں گے۔ آخر میں آپکو ایک "خضر راہ" بتلائے گا کہ جاؤ .D.M کے دفتر — .D.C وہاں سے ملے گا۔ آپ .D.M کے دفتر کی عمارت تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن اندر قدم رکھنے کی جرأت آپ میں نہ ہوگی آپ باہر ہی باہر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرینگے۔ لیکن معاملہ سلجھنے کی بجائے اور الجھنے لگے گا۔ آخر آپ ایک بابو نما چپراسی یا چپراسی نما بابو کو (جو کسی کام سے جا رہا ہوگا) روک کر کہیں گے "بھیا مجھے .D.C حاصل کرنا ہے"۔ وہ کہے گا "تو؟" آپ کہیں گے "تو سوال یہ ہے کہ وہ کیسے حاصل کیا جائے؟" وہ کہے گا "جیسے سب حاصل کرتے ہیں" آپ کہیں گے "سب کیسے حاصل کرتے ہیں؟" وہ کہے گا "وہاں سے (اشارہ کرکے) فارم لے لیجئے اور اسے بھر کر یہاں (اشارہ کرکے) مع فیس داخل کردیجئے"۔ آپ کہیں گے "بس؟" وہ کہے گا "بس" آپ کہیں گے "اور کچھ نہیں؟" وہ کہے گا "میرا مغز نہ کھائیے۔ اور کچھ بھی نہیں"۔ وہ چلنے کے لئے پرتول رہا ہوگا (جیسے کہ اسکے واقعی پر ہوں گے) کہ آپ مبلغ ایک روپیہ نکالکر چپکے سے اسکی نذر کرتے ہوئے کہیں گے "بھئی۔ میں بہت غریب آدمی ہوں یہ بتائیے کہ کب تک مل جائیگا؟" وہ مسکرا کر کہے گا "میں کوشش کروں گا کہ آپکو دو ماہ کے اندر ہی مل جائے"۔ آپکا ہارٹ فیل ہونے لگیگا اور آپکے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل جائے گی۔ "دو ماہ؟" وہ کہے گا۔ "اس سے بھی زیادہ وقت لگتا ہے لیکن......" آپ کہیں گے۔ "دو ماہ تک کیا ہوتا ہے؟" وہ کہے گا "پولیس انکوائری" آپ کہیں گے "تب تو اپنا بیڑہ غرق ہوجائیگا"۔ وہ پوچھے گا "کیوں؟" آپ کہیں گے "ایک ہفتہ کے اندر مجھے ملازمت پر جانا ہے"۔ وہ کہے گا "اچھا — یہ معاملہ ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "جی ہاں — یہی معاملہ ہے"۔ وہ سوچ کر کہے گا "تو پھر شارٹ کٹ اختیار کیجئے"۔ آپ کہیں گے "مطلب؟" وہ کہے گا "مطلب یہ کہ کچھ روپیہ خرچ کیجئے"۔ آپ کہیں گے "میں بہت غریب ہوں۔ لیکن آپ بتائیں کتنے روپیہ سے کام چل جائیگا تاکہ میں اسکا بندوبست کروں"۔ وہ کہے گا۔ "یہی بیس تیس روپے" آپ کہیں گے "ٹھیک ٹھیک بتائیے"۔ وہ کہے گا "تیس" آپ کہیں گے "کس کو دئے جائیں اور کس طرح؟" وہ کہے گا "مجھے" آپ

کہیں گے "کب اور کہاں؟" وہ کہے گا "ہوٹل میں ٹاٹ میں۔ رات کو ۹ بجے" آپ کہیں گے "اچھا۔ شکریہ" ــــ اور رات کو نو بجے جب آپ ہوٹل میں اس سے ملیں گے تو وہ کہے گا۔ "آئیے آئیے ــــ چائے پیجئے" اور وہ آپ کے لئے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہے گا "میری چیز لائیے؟" آپ کہیں گے "ہاں" وہ کہے گا "اس اخبار کے نیچے رکھ دیجئے" آپ اس کے حکم کی تعمیل کرینگے۔ وہ اخبار معہ روپیہ کے اپنی جیب میں رکھ کر کہے گا۔ "دیکھئے میں نے آپ کے لئے ایک سارٹیفکٹ حاصل کر لیا ہے جو تقریباً .D.C کے برابر ہے" آپ حیران ہو کر کہیں گے۔ "تقریباً .D.C کے برابر؟" وہ کہے گا "جیسا کہ میں آپکو بتا چکا ہوں .D.C بغیر پولیس انکوائری کے نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے میں نے ایک انجمن مہاجرین سے ایک رفیوجی سارٹیفکٹ حاصل کر لیا ہے جسے ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سے Attest کروا لیجئے اور یہ کہکر وہ آپ کے سامنے سارٹیفکٹ رکھ دیگا۔ آپ اس سارٹیفکٹ کو غور سے دیکھیں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ "ریڈی میڈ (Ready Made) سارٹیفکٹ ہر شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے، سیکا شی... اس پر لکھ دیا جائے۔ وہ کہے گا "اپنا نام اور ولدیت بتا دیجئے" آپ اسے اپنا نام اور ولدیت بتا دیں گے۔ وہ آپ کا اور آپ کے والد کا نام سارٹیفکٹ کی خالی جگہ میں لکھ کر کہے گا۔ "یہ آپ کے نئے اور پرانے یعنی Settled رفیوجی ہونے کا ثبوت ہے" آپ کہیں گے "کیا یہ چل جائیگا ــــ مان لیا جائیگا؟" وہ کہے گا "کیوں نہیں؟" ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے Attest کر دینے کے بعد کون ہے جو اس پر شک کر سکتا ہے؟" آپ پھر کہیں گے "کیے دفتر والے مان..." وہ کہے گا "ان کے باپ کو بھی ماننا پڑیگا اگر نہیں مانیں گے تو میں آپکے روپئے واپس کر دوں گا" آپ کہیں گے۔ "تب تو ٹھیک ہے۔ مگر فرسٹ کلاس مجسٹریٹ ..." وہ کہے گا "ہاں کسی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سے Attest کروا لیجئے اسے" آپ کہیں گے "میں تو کسی کو نہیں جانتا" وہ آپکی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہیگا۔ "تو آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام بھی میں ہی کر دوں؟" آپ کہیں گے "اگر آپ اسے کرا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی" وہ رُک رُک کر کہے گا "تو پھر دس ..." آپ کہیں گے "اس وقت تو نہیں ہے۔ جب آپ کرا دینگے تو ــــ" وہ کہے گا "اچھا۔ کل یہاں پھر ملئے" ــــ اور دوسرے دن آپ مبلغ دس روپے دیکر Attested سارٹیفکٹ حاصل کر کے اطمینان کی سانس لیں گے اور اپنے تقرر کے خط کی راہ تکنے لگیں گے۔

ایک ہفتہ "بعد" آپ کو تقرر کا خط ملے گا۔ آپ اسے جادو کا کرشمہ سمجھیں گے اور یقین نہیں کرینگے کہ یہ واقعی آپ کے نام ہے بہرحال آپ اس خط کو لے کر دفتر پہنچیں گے اور اپنے رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست کو دکھائیں گے اور دکھا کر اسے اپنی جیب میں رکھ لیں گے۔ وہ مسکرا کر کہے گا "مبارک ہو" آپ پوچھیں گے "کیا یہ ٹھیک ہے؟" وہ بولے گا "بالکل ٹھیک" آپ کہیں گے "آپ مذاق کر رہے ہیں" وہ کہے گا "مذاق نہیں چلئے آپکو Estate کلرک کے پاس لے چلوں" اور پھر آپ کا تعارف Estate کلرک سے ہوگا، جو آپ کو ہیڈ کلرک کے پاس لے جائیگا اور ہیڈ کلرک آپکو سپرنٹنڈنٹ (.O.S) کے پاس۔ .O.S ہیڈ کلرک سے کہے گا "انہیں کرانی کی جگہ لگا دیجئے" اور آپ .D.C وغیرہ کی چند رسموں سے فارغ ہو کر کرانی کی سیٹ پر آ کر بیٹھ جائینگے۔ اب آپ کو کچھ کچھ اپنے تقرر کا یقین ہونے لگے گا ــ آپ کو بیٹھے ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ کہ ہیڈ کلرک آپکو اپنے پاس بلا کر کہے گا "ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ نیا آدمی اسٹاف کو چائے پلاتا ہے" آپ کہیں گے۔ "میں خوشی سے پلانے کے لئے تیار ہوں لیکن ــــ" وہ کہے گا۔ "پیسے کی فکر نہ کیجئے۔ کینٹین میں اکاؤنٹ کھل جائے گا۔" آپ کہیں گے "تو پھر ابھی منگوا لیجئے ــــ اور نہ صرف چائے بلکہ کیک پیسٹری وغیرہ بھی" وہ ہنسنے لگے گا اور ہنستے ہوئے کہے گا۔ "آپ بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔ آپ مسکرا کر مگر جھینپتے ہوئے کہیں گے "کبھی تھا" وہ آپ کے اس جواب سے خوش ہو کر پوچھے گا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" آپ جواب دیں گے "کانپور کا لیکن اب تو ــــ" وہ کہے گا۔ "اخاہ کانپور۔ آپ خان بہادر سکندر علی خاں سے واقف ہیں جن کے چمڑے کے کئی کارخانے ہیں"

آپ سوچیں گے کون سکندر علی خاں؟ لیکن کہیں گے "جی ہاں" وہ بولے گا "وہ میرے چچا کے سالے کے سالے ہیں۔ آپ اسے حیرت سے دیکھیں گے۔ وہ پھر کہے گا "میرے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ دراصل میری شادی ان کی بہن سے طے ہوئی تھی لیکن میں ایک دوسری لڑکی یعنی نواب زادی یعنی نواب حیرت علی لکھپتی کی چھوٹی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگیا اور شادی کا معاملہ غتربود ہوگیا۔ اب بھی ان سے خط و کتابت رہتی ہے۔ ابھی کل ہی ان کا خط آیا تھا، جسمیں انہوں نے اپنی بہن کی بری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور درخواست کی ہے کہ میں آکر اُسے دیکھ جاؤں۔ آپ سمجھتے ہیں؟ اسکا کیا مطلب ہے؟۔ یہی کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ میرے پاس ایک قانونی بیوی موجود ہے اور درجنوں غیر قانونی ——" آپ اس تقریر کو دلچسپی سے سُنیں گے اور پھر کہیں گے "آپکی کل کتنی بیویاں ہیں؟" وہ اس سوال سے جوش میں آکر کہے گا "اسوقت تعداد چالیس ہے" آپ کہیں گے "ماشاءاللہ چشم بد دور" وہ خوشی سے پھول جائیگا اور اپنی کرسی سے اُٹھکر آپکے سامنے کھڑا ہوجائیگا اور آپ کے شانوں کو دباتے ہوئے کہے گا "یہ چالیس تو صرف وہ ہیں جن سے میں مستقل وابستہ ہوں — ورنہ انکی تعداد اتنی ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا۔" آپ کہیں گے "آپ تو راجہ اندر یا واجد علی شاہ معلوم ہوتے ہیں" وہ خوشی سے تقریباً پاگل ہوکر کہے گا "کرامت جاؤ۔ کینٹین سے چائے لے آؤ — دو آدمیوں کے لئے" اور پھر آپ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہے گا۔ "یہ چائے میری طرف سے ہے آپ کی آمد کی خوشی میں" آپ کہیں گے "مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہے اور اس چائے کے بعد میری چائے ——" وہ کہے گا "ہاں ہاں وہ بھی پیئیں گے —— لیکن آپ یہ بتائیے کہ آپ میری عمر کا کیا اندازہ کرتے ہیں؟" آپ کہیں گے "زیادہ سے زیادہ تیس برس" وہ ایک بار پھر آپ کے کندھوں کو دباکر فخریہ کہے گا "میری عمر اسوقت ۴۵ سال ہے" آپ تعجب سے کہیں گے "اچھا؟ لیکن دیکھنے میں تو آپ ......" وہ بات کاٹ کر کہے گا۔ "میری جوانی کا راز یہ ہے کہ میں سانپ کا ڈسا ہوا ہوں"۔ آپ کہیں گے "سانپ کا ڈسا ہوا؟" وہ کہے گا "جی ہاں۔ میں بچ گیا۔ یہ واقعہ مصر کا ہے جبکہ میں وہاں انڈین ایمبسی (Embassy.) میں فرسٹ سکریٹری لگا ہوا تھا۔ مصر میں بھی میری ایک بیوی موجود ہے جس سے تین بچے ہوئے تھے۔ میرا مطلب ہے قانونی بیوی — ورنہ غیر قانونی بیویوں کے بچوں کی تعداد مجھے نہیں معلوم —— ہاں تو مصر کے ایک ریگستانی علاقہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں ایک بہت بڑے اژدہے کو میں نے پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اُسے فوراً اپنے ریوالور کا نشانہ بنالیا۔ لیکن اژدہا، اژدہا تھا۔ وہ تڑپ کر میرے قریب آیا اور آکر اس نے میرے پیر میں ڈس لیا۔ میں بیہوش ہوگیا۔ اور جب ہوش میں آیا تو دیکھا، میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے پلنگ کے پاس ایک مصری نازنین کھڑی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت ہوگیا اور میں نے انگریزی میں پوچھا "میں کہاں ہوں"۔ مصری نازنین نے جواب دیا "دوست کے گھر میں — مگر آپ بولئے نہیں" میں چپ ہوگیا۔ میں نے اشارہ سے پوچھا "میں یہاں کیسے آیا؟" مصری نازنین نے بتایا "میں نے آپکو اژدہے کا شکار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپکی بہادری سے متأثر ہوکر میں آپکو یہاں اُٹھا لائی۔ مگر اب فکر نہیں آپ اچھے ہوجائیں گے۔ کیونکہ میں نے سانپ کا زہر چوس کر تھوک دیا ہے۔" میں اس انکشاف سے دنگ رہ گیا۔ اور جب کئی دن بعد اچھا ہوا تو اس کو ایسا صلہ دیا کہ وہ بھی یاد کرتی رہی —— اس عرصہ میں کرامت چائے لاکر رکھ دیگا اور آپ چائے کا ایک گھونٹ لیکر کہیں گے۔

"خوب۔ جبھی تو آپ میں بڑی قوت نظر آتی ہے" وہ ہنسکر بولے گا "آپ مذاق کرتے ہیں"۔ آپ کہیں گے۔ "نہیں سچ کہہ رہا ہوں" —— اچانک وہ اندر بلا لیا جائیگا اور آپ چائے پی کر اپنی کرسی پر جاکے بیٹھ جائیں گے — جب وہ لوٹکر آئیگا تو آپکو پھر بلائیگا اور پوچھے گا۔ "آپ کس یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں؟" آپ کہیں گے "الہ آباد یونیورسٹی" وہ اُچھل سا پڑیگا اور کہیگا "میں بھی وہیں کا گریجوٹ ہوں۔ کیا آپ نوازش کو جانتے ہیں جو کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا" آپ جھوٹ موٹ کہدینگے "ہاں"۔ وہ بولے گا "اور چندر موہن کو جو یونین کا سکریٹری تھا؟" آپ پھر کہیں گے "ہاں"۔ وہ اور گرما کر کہیگا "آپ جانتے ہیں یہ دونوں میرے کلاس فیلو تھے اور میری بڑی عزت کرتے تھے، کیونکہ درحقیقت میں ان کا استاد تھا۔ میں نے نوازش کو کرکٹ کھیلنا سکھایا تھا اور چندر موہن کو یونین کا سکریٹری

بنوایا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے بڑی زبردست جنگ لڑنی پڑی تھی اپوزیشن کے چند غنڈے میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور میری جان خطرہ میں تھی۔ راستہ چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور تن تنہا آیا جایا کرتا تھا —— ایک دن میں یونیورسٹی کے پھاٹک پر کھڑا مس نسیمہ صادق سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ بھی میری کلاس فیلو تھی۔ اور مجھ پر عاشق تھی۔ ہاں تو میں باتیں کر رہا تھا کہ اچانک یہ غنڈے لاٹھیاں لیکر مجھ پر ٹوٹ پڑے —— آپ جانتے ہیں میں جوڈو کا ماہر ہوں۔ میں نے ایک رومال سے ان سب کی لاٹھیاں چھین لیں غنڈے میرے قدموں پر گر پڑے اور گڑگڑا کر انہوں نے معافی مانگی اور کہا: "آج سے آپ ہمارے استاد ہیں اور ہم آپکے اشارہ پر جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے غنڈوں کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا اور کہا "دیکھو۔ چندر موہن کو سکریٹری بنوانا ہے۔ جو شخص مخالفت کرے، اس کی مرمت کر دو۔" غنڈوں نے کہا: "استاد ایسا ہی ہوگا۔" اور چندر موہن سکریٹری بن گیا —— "آپ استاد کے پتلے دُبلے جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہیں گے: "اچھا۔ جبھی تو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کا جسم پہلوانوں جیسا لگتا ہے۔" وہ یکبارگی اپنی آستینیں اوپر چڑھا کر اپنے دائیں ہاتھ سے سات کی شکل بناتے ہوئے کہیگا۔ "دیکھئے۔ میرے پٹھے آج بھی سخت ہیں۔ فولاد کی طرح" وہ آپکا ہاتھ پکڑ کر اپنے پٹھے پر رکھتے ہوئے پوچھے گا: "سخت ہے نا؟" آپ کہیں گے "بالکل فولاد کی طرح" وہ کہے گا "ذرا دیکھئے۔ یہ نشان خنجر کا ہے"۔ آپ کہیں گے "خنجر کا؟" وہ اکڑ کر کہے گا "جی۔ خنجر کا۔ آپ جانتے ہیں یہ خنجر ایک لڑکی نے مارا تھا جس کا نام تہمری تھا۔ میری ایک بڑی مغرور لڑکی تھی اور میری کلاس فیلو بھی تھی۔ ایک دن میں نے اس کی دعوت کی اور اس دعوت میں اظہار محبت کر دیا —— وہ چراغ پا ہو گئی اور اس نے اپنی جیب سے خنجر نکال کر مجھ پر وار کر دیا میں نے اس وار کو اپنے فولادی پٹھے پر لیا اور بائیں ہاتھ سے اسکا خنجر چھین لیا۔ اور خنجر چھین کر میں نے اس سے کہا "بتاؤ۔ اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟" وہ بولی

"I am entirely in your hands" میں نے کہا

'Darling, you are free.' وہ اس محبت آمیز سلوک سے اتنی متأثر ہوئی کہ رو کر کہنے لگی۔

"Pardon, Pardon." میں نے کہا

'will you be mine?' اس نے سر ہلا کر کہا 'Yes – Yes – Yes.' اور پھر آپ جانتے ہیں ——" اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجے گی۔ اور وہ "ہیلو۔ ہیلو" کرنے لگے گا اور آپ اُٹھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جائینگے۔

آپ سیٹ پر بیٹھ جائیں گے اور ہیڈ کلرک اپنی ٹوپی وغیرہ پہن کر باہر چلا جائیگا۔ اب آپ کلرک بھائیوں کے درمیان ہوں گے اور یوں محسوس کرینگے جیسے کوئی جنگلی جانور پالتو جانوروں کے بیچ میں آگیا ہو۔ پالتو جانور آپکی طرف گھور گھور کر دیکھیں گے اور مسکرائیں گے اور آپ بھی انکی طرف دیکھیں گے اور مسکرائیں گے۔ آخر کار ان میں سے ایک اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر۔ ذرا اس ڈرافٹ کی نقل کر دیجئے" آپ نقل کر دیں گے۔ پھر دوسرا اُٹھے گا اور کہے گا "مسٹر۔ ذرا آپ اسکا فائل کو بدل دیں" آپ فائل کو بدل دیں گے۔ پھر تیسرا اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر۔ ذرا یہ ٹوٹل کر دیجئے" آپ ٹوٹل کر دیں گے۔ پھر چوتھا اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر۔ ذرا آپ اسے فلیگ کر دیں" آپ فلیگ کر دینگے۔ پھر پانچواں اُٹھے گا اور کہیگا "مسٹر ذرا آپ اسکی چیکنگ کر دیں" آپ چیکنگ کر دیں گے۔ غرضکہ باری باری ہر کلرک اپنے کام کا کچھ حصہ کرنے کو دیگا اور آپ اسے خندہ پیشانی سے کر دینگے۔ کیونکہ آپکو بہرحال کام سیکھنا یا سمجھنا ہے۔ اور جب آپ کام سیکھ یا سمجھ لیں گے تو پھر ظاہر ہے کہ آپ ان کلرکوں کو "ٹھینگے" پر ماریں گے۔ اور آپ زیادہ چالاک ہوں گے تو پھر اُلٹا انہیں سے کام لینا شروع کر دینگے۔

دفعتاً آپکو D.S بُلا بھیجے گا۔ آپ وہاں پہنچکر دیکھیں گے کہ Estab کلرک کھڑا ہوا ہے۔ D.S. آپکو اور اس کلرک کو ساتھ لیکر "صاحب" کے کمرہ میں داخل ہوگا۔ D.S. صاحب سے کہیگا: "یہ ہے وہ آدمی جو آج آیا ہے" صاحب پوچھے گا: "تمہارا appointment کیسے ہوا؟" آپ کہیں گے "خط کے ذریعہ" وہ پوچھے گا: "خط کہاں ہے" آپ کہیں گے "میرے پاس ہے" وہ حکم دیگا "خط پیش کرو" آپ جیب سے خط نکالکر پیش کر دیں گے۔ وہ اسے بغور دیکھ کر کہے گا: "دستخط تو میری ہی معلوم ہوتی ہے" D.S. کہیگا "یقیناً آپ ہی کی ہے" وہ کہیگا "میں نے اسپر دستخط کیسے کیا؟" Estab کلرک کہیگا

"آپ نے اس پر اس لئے دستخط کیا کہ آپ نے اس آدمی کو کیا تھا" صاحب چیخ کر کہے گا۔" میں نے اسے کب سلیکٹ کیا تھا؟ میں نے تو ڈپٹی صاحب (ڈپٹی سکریٹری) کے آدمی کو سلیکٹ کیا تھا۔ اب میں انہیں کیا جواب دوں۔ بولو کیا جواب دوں؟" وہ غصّہ سے میز بجانے لگے گا اور آپ کے تقرر کا خط پھینک دے گا، جسے آپ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیں گے پھر Estab. کلرک آپکی سرکاری فائل اس کے سامنے رکھ کر کہے گا۔ "دیکھئے۔ آپ نے اسے ۱۰۰ میں سے ۹۰ نمبر دئے ہیں یعنی سب سے زیادہ مارکس (Marks) جنرل نالج میں 50۔ انگلش اسپیکنگ پاور میں 20۔ پرسنالٹی میں 15۔ اور ہینڈ رائٹنگ (جسکا اندازہ درخواست سے بخوبی کیا جا سکتا تھا) میں 5— اور پھر آپکا یہ ریمارک کہ یہ شخص Above Average ہے۔" صاحب ان نمبروں کو غور سے دیکھے گا اور اس ریمارک کو بھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئیگا اور وہ کہیگا۔" ڈپٹی صاحب کے آدمی کے مارکس کتنے ہیں؟" Estab. کلرک فوراً ایک کاغذ نکال کر پیش کرتے ہوئے کہیگا۔ "دیکھئے۔ جنرل نالج میں ۵۔ انگلش اسپیکنگ پاور میں ۵۔ پرسنالٹی میں ۱۔ اور ہینڈ رائٹنگ میں 5۔ کوئی ریمارک نہیں" O.S کہے گا۔" ریمارک کی ضرورت ہی نہیں۔ صاحب سناٹے میں آجائیگا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہے گا۔" بولو اب میں کیا کروں؟ ڈپٹی صاحب کو کیا جواب دوں؟ ان کا ٹیلیفون پر ٹیلیفون چلا آرہا ہے۔ O.S. کہیگا "آپ اُن سے کہدیں کہ next Vacancy میں ان کے آدمی کو لے لیا جائیگا۔" وہ کہے گا۔ "ڈپٹی صاحب ناراض ہو جائیں گے۔" Estab. کلرک کہیگا "آپ ان سے کہدیں کہ بڑے صاحب نے اس آدمی کو لینے کا زبانی حکم دیا تھا اور چونکہ جگہیں تین تھیں۔ اس لئے ایک آنریبل منسٹر کا آدمی۔ ایک سیکریٹری صاحب کا آدمی اور ایک بڑے صاحب کا آدمی لے لیا گیا۔" صاحب اس جواب سے خوش ہو کر کہے گا۔ "بائی گاڈ۔ یہ مجھے کبھی نہ سوجھتی — اچھا ہے سارا وبال بڑے صاحب کے سر پر ہوگا — چپراسی"۔ وہ گھنٹی بجا کر کہے گا۔ "چائے لاؤ۔" اور آپ معہ O.S. اور Estab. کلرک کے کمرے سے باہر ہونگے اور جب O.S. اپنے کمرہ میں چلا جائیگا تو آپ Estab. کلرک کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کہیں گے۔" میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے دماغ کا بوسہ لے لوں"۔ وہ مسکرا کر کہیگا۔" یہ تو بہت معمولی سی بات تھی۔ اس سے بڑے بڑے معاملات چٹکی بجاتے طے ہو جاتے ہیں۔" آپ اسکی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہیں گے۔" مجھے یقین ہے، آپ اسکی اہلیت رکھتے ہیں"— اور پھر آپ Estab. کلرک کا ساتھ چھوڑ کر اپنے رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست سے ملیں گے اور اسے یہ داستان سنا کر پوچھیں گے۔" بھئی وہ جو میں نے آپکو روپئے دئے تھے نا۔ اس میں سے پچاس تو Estab. کلرک نے لئے ہوں گے۔ باقی کس نے لئے؟" وہ کہے گا۔" یہ صیغۂ راز میں ہے۔" آپ کہیں گے۔" اب ایسا بھی پردہ کیا؟ میں کسی سے کہنے تھوڑے ہی چلا جاؤں گا۔ اور پھر اگر کسی سے کہوں گا بھی تو وہ مجھ پر یقین کب کریگا؟" وہ سوچکر کہیگا۔" اچھا سنئے پچاس روپئے Estab. کلرک نے لئے۔ پچاس ہیڈ کلرک نے اور پچاس میں نے مجھے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ میری بیوی بیمار ہے اور بچے بھی اور — "آپ فوراً کہیں گے۔" کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ نے لیا، اچھا کیا، مجھے خوشی ہے کہ میرا روپیہ آپکے کام آیا — ہاں تو پچاس ہیڈ کلرک نے بھی لیئے؟" وہ کہے گا۔" ہاں۔ اس کے بغیر آپ کا تقرر نہیں ہو سکتا تھا۔" اور پھر بات بدل کر کہیگا "آپ نے ناشتہ واشتہ کیا یا نہیں؟— نہ کیا ہو تو چلئے میرے ساتھ کینٹن"۔ آپ کہیں گے۔" بھئی میں نے ناشتہ کر لیا ہے اور تھوڑی دیر قبل چائے بھی پی لی ہے — لیکن چلئے کینٹن میں میرا اکاؤنٹ کھلوا دیجئے۔" اور آپ اس کے ساتھ کینٹن پہنچ جائیں گے۔

(باقی آئندہ)

افضال اللہ

مداری

ڈگ۔ ڈگ۔ ڈگ!! ـــــ ڈگڈگی بج رہی تھی۔" ایک۔ دو۔ تین" بس اب کام شروع۔" نوجوان مداری کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو مضبوط رسّی سے اچھی طرح جکڑ لیا تھا اور برابر گرہیں لگاتا چلا جا رہا تھا۔ دو آدمی رسّی کے دونوں سرے تھامے ہوئے تھے۔ تماشائیوں کا ٹھٹھ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ پچھلی قطار کے لوگ ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر اُچک رہے تھے۔ آگے کھڑے ہوئے لوگ باوجود متعدد آوازوں اور درخواستوں کے کھڑے رہنے پر مصر تھے۔

"یا اُستاد!" مداری ایک کرخت لہجہ میں چیخا۔ "نکل جاؤں اس پھندے سے بغیر کھولے ہوئے! ضرور نکل جاؤں گا!! کس کے نہ مانا" دونوں آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے۔" ارے یارو کھینچ کر دم گھونٹ دو گے۔"

مداری کا سارا جسم بُری طرح جکڑ گیا تھا اور تماشائی متحیر تھے کچھ لوگوں کے دلوں میں جذبۂ ترحم جاگ اُٹھا تھا۔ وہ بالکل بے بس اور مظلوم معلوم ہو رہا تھا حالانکہ اس نے خود ایسا کیا تھا۔ لوگ بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ اس کھیل کو دیکھ رہے تھے اور بڑی ہی بےچینی کے ساتھ نتیجہ کے منتظر تھے۔

مداری نے بیسیوں دفعہ "نکل جاؤں" کہا ہوگا۔ لیکن ایک بار بھی نہ نکلا اور اسی شکل میں پورے مجمع کے سامنے چکر لگاتا رہا اور گا ٹھیں دکھاتا رہا کہ کہیں سے کھلنے یا کھولنے کی گنجائش تو نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد قبل اس کے کہ وہ اپنا پہلا اور آخری کرتب دکھائے۔ مجمع کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے لگا

"ہندو بھائی کو رام کی قسم اور مسلمان کو خدا کی اگر وہ بغیر تماشہ دیکھے چلے جائیں اور جیب میں کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک پیسہ نہ دیں۔ دیکھئے بھائیو! آپ سب لوگ دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور اس جگہ بھی کسی نہ کسی کام سے آئے ہوئے ہیں یہ سب کس لئے؟"

"پیٹ کے لئے" (ملی جلی آوازیں)

"ہاں پیٹ کے لئے۔ ایسے ہی یہ مداری جو آپ کے سامنے کھڑا ہے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر آپ کو تماشہ دکھا رہا ہے۔ یہ سب کس لئے؟ پیٹ کے لئے۔ ہائے رے پیٹ!!

ہے کوئی مائی کا لال جو روپیہ آٹھ آنہ چار آنہ اس بھگوان۔ اس خدا کے نام پہ مداری کے۔ . . . .

اچھا اب دیکھئے گھبرایئے نہیں آپکو یہ تماشہ دیکھنا ہے۔ اور اب یہ کام شروع۔ ایک۔ دو۔ اور پھر دو ایک کام اور دیکھنے ہیں۔ اچھا دیتے جائیے۔"

مداری کہتا رہا اور چاروں طرف گھومتا رہا اور یہ یقین دلاتا رہا کہ وہ پھندے سے نکلنے کا کرتب دکھلانے ہی والا ہے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ متجسّس ہوتے گئے۔ مداری کی پُرسوز تقریر کا اثر یہ ہوا کہ ایک پیسوں کا تھا سا ڈھیر اسکی چادر پر لگ گیا۔ اب تک لوگ کافی انتظار کر چکے تھے اور جلد سے جلد اس کرتب کا نتیجہ دیکھنا چاہتے تھے۔ مداری کرتبوں کے نام گنا تا رہا اور اسی دوران میں اس نے ایک گولا اپنے جھولے سے غائب کر کے اور پھر اوپر ہاتھ کر کے واپس بلا لیا۔ اور یہ بھی کہا کہ اسی طرح میں بھی اوپر اُڑ سکتا ہوں، دیکھتے جایئے کافی دیر ہو جانے کی وجہ سے اکثر تماشائی اپنے اپنے کام کو روانہ ہو گئے

مداری نے پھر کہا۔" ابھی دکھاتا ہوں"

دیکھتے دیکھتے میدان صاف ہو گیا اور سب لوگ چلے گئے مداری پیسے سمیٹ کر جھولی میں رکھ کے جانے لگا۔

جمال اس طلسمی ماحول کا جیسے ایک فرد ہو اسے یہ احساس بالکل نہ ہوا کہ وہ سڑک کے کنارے اور اجنبی مداری کے قریب اب تک کھڑا سگریٹ کے کش لگاتا چلا جا رہا تھا۔

"سرکار!"

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ مداری پیسے مانگ رہا تھا۔ کتنا خوش آئند تھا اس کا وہ لہجہ اور کیسا عجز تھا۔ اس کے انداز میں۔ اسنے بالکل غیر ارادی طور پر اسکے ہاتھ پر وہ اکنی رکھدی جسے وہ پینٹ کی جیب میں جانے کتنی دیر سے توڑ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں کچھ جلتی محسوس ہوئیں اسوقت جاکے اسے خیال آیا کہ سگریٹ کا آخری سرا بھی جل جانے کو ہے۔ اس نے جلدی سے جلتی ہوئی سگریٹ پھینکی اور اپنی کوتاہ اندیشی پر افسوس کرتا ہوا ایک طرف کو چلدیا۔ آدھی سگریٹ سے ابھی کتنا وقت گزارنا تھا لیکن وہ موقع ہی نکل چکا تھا

مراری اور کشور سائیکلوں پر آتے دکھائی دیئے اور ایک پھیکے انداز میں انہوں نے سلام کا جواب دیا اور گذر گئے۔ اس کے چار سال کے ساتھی اور دوست اب سے چند ماہ قبل دفتر کی ملازمت میں بھی ساتھ تھے اور کیسے ہی رزق رساں شہروں کے سفر میں بھی۔ لیکن آج وہ مخالف سمت میں جا رہے تھے اپنے دفتر لیکن چند دنوں اگر نہیں مہینوں کے بعد ہی وہ بھی ان کے ساتھ ہو گا آخر حامد اور سیشل بھی تو آٹھ نو مہینے تک سرگرداں رہے اور پھر انہیں مرکزی دفتر میں جگہ مل ہی گئی۔ لیکن انہوں نے دو دو سو روپئے کوشش و پیروی میں صرف کئے تھے۔

دو سو روپئے! ایک عظیم سدراہ، ایک بلند فصیل کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

وہ چلتے چلتے سڑک کے کنارے رک گیا اور ایک سوکھا پتا اٹھاتے وقت چیونٹیوں کی ان گنت تعداد پر نظر دوڑانے لگا۔ یہ ننھی ننھی روحیں کتنی جفاکش اور مستقل مزاج ہیں اس کے ذہن کے پردے پر لاتعداد اقوال، مثالیں اور قصے امیدوں کے کنول بنکر چھا گئے۔

اس نے اپنے غیر شعوری سفر کو دفتر ملازمت کی طرف موڑ دیا اب وہ سنسان اور چکنی سڑک پر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے خیالات کے شہپر فضا میں پرواز کر رہے تھے آج بھی اس ساتھ کے امیدواروں کا نام نکلنے والا تھا۔ پہنچتے ہی اس نے فہرست پر نظر دوڑائی۔ فلپس، گورکھ سنگھ، پھیکو دوس، سرنیدر پرتاپ سنگھ۔ ایک طویل فہرست تھی اس نے دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جمال جیسا نام ضرور نظر پڑا تھا۔ یکایک اس کی نظریں رکیں اور شکستہ حروف پر غور کیا صاف جمال لال اہوجا لکھا ہوا تھا ایک یاس انگیز جمائی لے کر وہ پاس کی بینچ پر گر گیا۔

کالج چھوڑے ہوئے اب قریب ایک سال سے کچھ زائد ہی ہو رہے تھے۔ زندگی کا ایک سال جو کبھی بہت قیمتی ہوا کرتا ہے وہ وقت جو ایک قوم و ملک کی زندگی اور موت کا ضامن ہوتا ہے۔ زندگی، ہاں وہی بیش بہا زندگی جو اس دنیا میں صرف ایک بار نصیب ہوتی ہے پھر وہ بھی جوان زندگی۔ اس مدت میں تو ایک عرصہ تک بھٹکتی ہوئی زندگی جو شاہراہ کو چھوڑ کر خارزاروں میں ماری پھرتی پھر سیدھی راہ پاسکتی ہے وہ راہ جو ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔ ہوا اور پانی کی طرح عام۔ یہ عرصہ اور وقت صرف سرکاری دفتروں کے طواف اور خداوندان مجازی کی آستاں بوسی میں صرف ہو گیا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب کے پھٹے ہوئے کناروں کو ہاتھ سے چھپانے کی کوشش کی اور بینچ سے اٹھ کر باہر لان پر ٹہلنے لگا۔ وہ زیر لب بڑبڑانے کی کوشش کر رہا تھا "آخر تین چار پتلونوں پر آدمی کب تک گزر کر سکتا ہے۔ گھر کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مستقل شکست جا رہی ہے۔ اب تو کیچر جانا بھی بند ہو گیا ایک ہفتہ دو ہفتہ آخر مہینوں کیسے برداشت ہوا اور اب تو مراری، کشور، حامد، اعظم، سرلا۔ کوئی بھی تو نہیں ملتا۔ اور اگر خود بھی ملنے کو جی نہیں چاہتا۔ جیسے سوسائٹی ہی ختم ہو گئی ہو۔ کل شب کو فلک پیما " میں حامد، کشور، اور کئی ملنے والے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بڑی عجلت کے ساتھ سلام کا جواب دیا اور بگیر کے لئے پوچھا بھی نہیں ہو سکتا ہے کسی مہمان کے ساتھ رہے ہوں۔"

وہ سوچتے سوچتے کچھ تھک سا گیا اور بار بار خواہش کے باوجود سگریٹ نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور جھلا گیا۔ "اف یہ ظالم نظام!" یہ الفاظ کچھ زور سے نکل گئے۔

ساتھی ہریش جی منہ سے دھوئیں کا بادل نکالتے ہوئے کہہ رہے تھے اور قلیوں اور مزدوروں کی ایک بھیڑ سی جمع ہو گئی تھی۔ جمال بھی ان کے قریب کھڑا ہو گیا اس کی حریص نگاہیں بار بار سگریٹ پر جاکر جم جائیں۔ ساتھی نے قینچی کی ڈبیہ نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ اس کی ایک مراد تو بر آئی۔

" ارے یہ سب دھوکا ہے ان کے پاس کام کہاں۔ ہر مل اور بیکار خانے

میں چھٹنی ہو رہی ہے۔ کھیت مزدور بیکار، بنکروں کا کوئی دھندا نہیں اور روز بروز یہ بیکاری بڑھ رہی ہے۔ کام مانگے سے نہیں ملتا ہے۔ لینے سے ملتا ہے۔ یہ لڑائی ہے لڑائی۔ روٹی کی لڑائی۔ اور آپ کو یہ ٹکر لینی ہے آج نہیں تو کل۔"

گھڑی پندرہ منٹ سُست تھی پھر بھی ایک بجا رہی تھی۔ وہ قدم تیز تیز اُٹھاتا ہوا مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ "کیا نام بدل دیا جائے آخر کشور اور مرلدی کو سروس مل گئی ہے کیا ہرج ہے لیکن سرٹیفکٹ کا کیا ہوگا۔ روٹی کی لڑائی۔ پیٹ کے لئے، کیا یہ ساری دُنیا انہیں کے گرد گھوم رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ لیکن اسے تو سگریٹ کی ضرورت تھی، پتلون کی، پکچر دیکھنے کی ہاں سلمیٰ کے لئے آویزوں کی اس کا چہرہ قدرے سُرخ ہو گیا۔۔ ۔۔روٹی تو بُری بھلی مل رہی تھی۔"

یکایک اس کے ہوائی قلعے مسمار ہو گئے۔ اور مائیکروفون کی کرخت آواز اسکے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔" ساتھیو! آج شام کو مزدوروں کے مہان نیتا، محنت کشوں کے عظیم رہنما کی انقلابی تقریر ہوگی۔ اگر سماج کے مسائل کا حل اور ملک کی فلاح اور بہبودی کا فارمولا معلوم کرنا ہو تو بڑی سے بڑی تعداد میں گاندھی میدان میں تشریف لائیے۔"

لال جھنڈوں کے جلوس میں ایک نوجوان اعلان کر رہا تھا ملکر چھوٹی موٹی تقریر کرتا جا رہا تھا۔

وہ کھانا کھاکر بستر پر آنکھیں بند کرکے لیٹ گیا۔ اس کمرے سے جہاں کوئی جاذبیت نہ تھی اسے ایک عجیب اُنس ہو گیا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے کم سے کم ایک پناہ گاہ تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ آخر یہ کمرہ بھی کب چھوٹ جائے۔ کمرے کی دیواروں کی جا بجا اُکھڑی ہوئی سفیدی ایک افسردہ منظر پیش کرتی اور باہر کی متعفن فضا اس پر ایک اضافہ تھی۔ الماریوں کے کواڑ ادھ کھلے تھے اور میز پہ کتابوں کا انبار سا ہو گیا تھا جس پر گرد کی ایک موٹی تہہ جم چکی تھی میز پوش جو شاید کبھی رنگین رہا ہو اب صرف مٹیالا تھا اس کا ایک گوشہ زمین سے بالکل قریب لٹک رہا تھا۔ کارنس پر رکھے ہوئے مجسموں کا رنگ اُڑ گیا تھا اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویریں جو کبھی ضرور سامان زینت تھیں مکھیوں کے بیٹھنے کی وجہ سے ایک مکروہ منظر پیش کر رہی تھیں۔

دن بھر کے ذہنی انتشار بلکہ ایک عرصہ کے مسلسل خلجان سے وہ ہر وقت ایک تکان سی محسوس کرتا۔ آج وہ خلاف معمول شام تک سوتا رہا اُٹھنے کے بعد اس نے ہاتھ منھ دھویا اور اسے فوراً یاد آگیا کہ اسے چھ بجے تقریر سُننے جانا ہے جلدی جلدی کپڑے بدل اور ہلکا ناشتہ کرکے وہ روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بہت سے خیالات گھوم رہے تھے اور اس کے دل میں ایک نیا عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا اسے اپنے اندر ایک باغی روح سرایت کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ "یہ غیر عادلانہ سیاسی نظام، یہ سماجی ڈھانچہ سب جبر وظلم کی مختلف صورتیں ہیں اسکے وجود پر ایک زبردست انتقامی جذبہ طاری ہو گیا۔ اب وہ اپنا اگلا طلب وجستجو کا طریقہ یکسر بدل رہا تھا، اسے اس نظام کی ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی جہاں مداری کے شعبدے ہیں، مانگنے والوں کی بہتات ہے، فاقہ کشوں کی فراوانی ہے، اونچ نیچ ہے، آدمی آدمی کا ساتھی نہیں ایک دوسرے پر حکمرانی کے طریقے سوچتا ہے۔ .." اسکے ذہن میں یہ اور اس قسم کے بہت سے خیالات یک بیک آگئے تھے۔ جیسے اس کے انتظار اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری باتیں آج ہی سوچ ڈالے گا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل بھی اس جذب و خود فراموشی کے عالم میں وہ میدان میں پہنچ چکا تھا جہاں ابھی ابھی تقریر ہونے والی تھی۔ اس عظیم رہنما کی باتوں کی روشنی میں وہ اپنا اگلا پروگرام مرتب کرنے والا تھا جس کا ایک موہوم خاکہ اس کے ذہن میں تیار ہو گیا تھا۔ آج وہ اپنے میں غیر معمولی جوش و قوت محسوس کر رہا تھا۔

جے کاروں کے فلک شگاف شور سے عظیم رہنما کا استقبال کیا گیا۔ انقلاب زندہ باد اور دوسرے پُر کشش نعروں سے مجمع پر ایک جوش وخروش کا عالم طاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سپاس نامے اور مدحیہ نظمیں پڑھی گئیں۔

"انقلاب زندہ باد"

"کامریڈ کی جے ہو"

اور تالیوں کی گونج میں لیڈر کی تقریر شروع ہو گیا۔ حکام کی بداعمالی اور عوام کی زبوں حالی کی داستان سُنائی گئی۔ اور ایک ایک کرکے عوام کی ساری تکالیف گنائی گئیں یہ سب کے

دل کی آواز تھی دلوں میں بیٹھ گئی اور مجمع مسحور ہو گیا خصوصاً لیڈر کی تقریر جو ایک دریا کے بہاؤ کی طرح تھی۔ موجودہ سیاسی نظام کے بخیوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا اور ساری مصلحت آمیز پالیسیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا گیا۔ اس کا طرز بیان پر اثر ہونے کے ساتھ ہی انتہائی مذاحیہ بھی تھا۔ حکام کی غلطی کا پردہ اس طرح فاش کیا کہ ایک دفعہ لاکھوں روپیہ صرف کر کے مچھلیوں کی تجارت کو فروغ دینے کے لئے اسکیم بنائی گئی۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تجربہ کی جانے والی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں نے کھا لیا اور اس طرح لاکھوں روپیہ مچھلیوں کی خوراک ہو گئے اور بس۔ ایک مثال یوں بیان کی کہ حکومت وقت اپنے عوام کی زندگیوں سے یوں کھیلتی ہے کہ دیہاتی اسپتالوں میں صرف دو یا تین رنگ کی دوائیں ہوتی ہیں جو سر کے درد سے لے کر مہلک سے مہلک امراض کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

سارے مجمع پر جیسے سحر ہو گیا ہو اور ایک عجیب خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ لیڈر تھوڑی دیر کے لئے رُکا۔ جمال کا سینہ ایک موہوم خوشی سے پھول گیا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ بیکاری اور غریبی کا حل ابھی پیش کیا جانے والا ہے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

لیڈر نے تمام سیاسی جماعتوں کے مقاصد کا جائزہ لیا۔ اور سب کی بنیادیں ہلا دیں۔

"مزدور ایکتا زندہ باد"

"جنتا کا راج ہو کے رہے گا"

نعروں کی گھن گرج میں لیڈر کی آواز کافی بلند ہو چکی تھی اور وہ ساری قوت صرف کر کے چیخ رہا تھا۔

"عوام کی بھلائی — عوام کی بہبودی اور صحیح معنوں میں جنتا کے راج کے لئے۔۔۔۔ جو تمام دکھوں کا واحد علاج ہے — آگامی (آنے والے) چناؤ میں جنتا کی پارٹی کو ووٹ دیجئے۔ کامیاب بنائیے۔ پھر۔ پھر — دیکھئے۔

اس جملہ پر اس کی تقریر ختم ہو چکی تھی دوسرے ساتھی مختلف پروگراموں کا اعلان کر رہے تھے۔

جمال کے دل میں ایک عجیب خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کی تمام آرزؤں پر اوس سی پڑ رہی تھی۔ وہ ضرور ووٹ دیگا۔ لیکن اس کے سامنے مسائل تھے۔۔۔ اپنے اور پھر دوسروں کے بھی —

اس سڑے ہوئے نظام سے اسے پھر نفرت ہوئی۔ اور اس کے ذہن میں بہت سے عظیم سیاسی رہنماؤں کے چہرے اُبھر آئے سب ہی سحر بیان ہیں، اُن کی آواز میں جادو ہے، انکی ذات میں کشش یا اور کچھ ہے جبھی تو اتنے بڑے بڑے اژدہام ہوتے ہیں، انسانوں کا سیلاب سا اُمنڈ پڑتا ہے۔ لیکن سب کے پاس ایک ہی مطالبہ ہے۔

آج اسکی سمجھ میں اس مداری کی پوری شخصیت آ گئی۔ جو شعبدے دکھاتا ہے اور شعبدوں کا وعدہ کرتا ہے۔ پیسے طلب کرتا ہے اور اسپر وہ مجبور ہے۔

اس کا ذہن تھک چکا تھا اور اس کی ساری اُمنگیں جیسے سرد پڑ گئی ہوں اور اس کی باغی روح جیسے نکل گئی ہو

"اُف یہ سماج — شعبدے اور پیسوں کی طلب۔ تقریریں اور ووٹ کی بھیک — سب مداری ہیں۔

چند غیر ارادی جملے کہتے ہوئے وہ خلا میں گھور رہا تھا۔

اقبال احمد انصاری

اپنی کہانی

مجھے کہانی لکھتے کئی سال ہو گئے ہیں۔ اسٹوڈنٹ، کلرک، طوائف، کسان، بیروزگار، عیاش سیٹھ، قلی . . . اور اپنے سماج کے سیکڑوں کرداروں کی کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ آئینۂ تحریر میں ان کو اپنی تصویریں دکھلائی ہیں۔ ان پر تنقید کے نشتر چلائے ہیں۔ مرہم رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ مایوسوں کو آس کی کرن دکھلانے کی کوشش کی ہے . . . یہ سب لکھ کر جب مجھے خوشی بھی ہوئی ہے کہ شاید کسی نے میرے نشتر کی ہمدردی کو محسوس کرتے ہوئے میرے مرہم کو قبول کر لیا ہو۔ شاید کسی نے مایوسیوں کی تاریکی میں آس کی کرن سے راہ پائی ہو۔ کبھی اسی خوشی نے کوئی نئی کہانی لکھا دی۔ کبھی کسی معمولی سے واقعہ نے اور کبھی کسی بڑے حادثے نے آمادہ کیا کہ کہانی لکھو یا پھر کسی کی فرمائش نے مجبور کیا۔

بہرحال پورے چھ سات سال میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ مجھے کہانی لکھنے کو مل ہی گیا ہے۔ اور اب تک مجھے ادبی رسائل کے کثیر التعداد قارئین ایک مخصوص طرز اور مزاج رکھنے والے "کہانی گو" کی حیثیت سے جان چکے ہوں . . . یعنی کہ میں کہانی لکھنے کا مطلب اپنے قریبی ماحول و سماج کے کسی کردار کی ہمدردانہ مگر تیز تنقید کرنا سمجھتا ہوں اسی تیزی کو لوگ نشتر لگانے سے منسوب کرتے ہیں لیکن میں اپنے خیال میں اندمالِ زخم کے لئے مرہم بھی بانٹتا رہتا ہوں۔ گویا کردار کی تنقیح میری آرزو ہے۔ اسی آرزو نے مجھ سے میرے آفس کے بڑے بابو، میری سوتیلی ماں، میرے دوست، میرے محلے کی لڑکیاں، میرے خاندان کے بھائی بہن . . . . اور ایسے ہی کتنے لوگوں پر کہانیاں لکھائیں۔ البتہ ان میں آپ بیتی جگ بیتی کے روپ میں پیش کی گئی۔

میں کبھی کسی نوجوان کو ایک ہی راہ سے اکثر آتے جاتے دیکھتا ہوں اور اسے گاہ مغموم گاہ بشاش پاتا ہوں۔ پھر اسے اتفاقاً سینما ہال میں کسی حسین دوشیزہ کے ہمراہ دیکھ پاتا ہوں۔ اور کچھ دنوں بعد کسی دوست سے [illegible] یا اخبار سے سن پاتا ہوں کہ ایک نوجوان جوشِ رقابت میں قتل کر دیا گیا یا اس کا گلا گھونٹ دیا گیا یا اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی تو میرے اندر جو کہانی گو ہے وہ ان تمام باتوں میں ایک غیر مرئی ربط پاتا ہے جسے عام لوگ محسوس نہ کر سکیں۔ لیکن وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور میں ایک نئی کہانی لکھتا ہوں۔

میں جیسے اس طوائف کے ہاں جاتا ہوں۔ جو میری نوجوانی میں تقریباً جوانی کی سرحد پار کر چکی تھی اور وہ مجھے اپنی نوعمر بچی کی نتھ اتارنے کی تقریب میں شرکت کے لئے دعوتی کارڈ دیتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کارڈ کو بار بار پڑھتا ہوں جس کی سنہری تحریر سے کارڈ پر اس لڑکی کی تصویریں بننے لگتی ہیں۔ تو میں کارڈ رکھ کر سوچنے لگتا ہوں اور سوچتے سوچتے ایک کہانی تیار ہو جاتی ہے۔ جو رسائل میں شائع ہو جاتی ہے۔ اور جسے میں اس طوائف اور اس کی بیٹی کو بھی پڑھنے کو پیش کر دیتا ہوں۔

اور اس وقت بھی مجھے ایک یا کئی کہانیوں کے لئے وافر مواد مل جاتا ہے جب میں اپنے قریبی ماحول میں کسی کمسنہ کو دوسری باشعور ہم صنفوں سے اختلاط بڑھاتے ہوئے اس سے کھلے چھپے شوق کی کیفیت کے ساتھ بار بار ہمکنار ہوتے اور بہت سی طویل دوپہر ایک ساتھ گزارتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ پھر جلد ہی اس کمسنہ کے سینہ پر آثارِ بلوغت غیر معمولی طریقہ سے نمایاں ہونے لگتے ہیں ——— مجھے پسِ پردہ ایک کھیل نظر آتا ہے جو ربط و ترتیب پا کر کہانی بن جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میری مشہور کہانی 'دھوبن' اس طرح تیار ہوئی تھی کہ میرے کپڑے دھونے والی دھوبن جوان تو نہ تھی لیکن اپنی اچھی صحت کی وجہ سے جوان ہی معلوم ہوتی تھی بالکل تنہا رہتی تھی۔ اس کا مکان یہاں نہ تھا۔ وہ یہاں آ کر بس گئی تھی اور لوگوں سے خود کو بیوہ بتلاتی تھی۔ اپنے محلے کے علاقہ میں وہ بدنام بہت تھی۔ میرے ہاں تو وہ کبھی کپڑے لینے، کبھی دینے، کبھی دھلائی لینے اور کبھی ویسے ہی آیا کرتی۔ ایک بار میں بیمار پڑ گیا تو اس نے اپنی حد تک تیمارداری بھی کافی کی۔ ایک بار میں نے تفریحاً اس سے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ

تو میں تم سے شادی کرلوں۔ میں اس کی بدنامی سے واقف تھا سمجھتا تھا کہ اتنی شہ پاکر وہ کھل جائے گی لیکن اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کہنے لگی کہ آپ تو سنا ہے کہانیاں لکھتے ہیں۔ کہئے تو ایک کہانی میں بھی سنادوں۔ جسے یہاں دوسرا کوئی نہیں جانتا تب اس نے اپنی گزشتہ زندگی کی وہ آپ بیتی سنائی وہ کسی کریم کا اس پر عاشق ہوجانا۔ دونوں کا ملنا جلنا۔ کریم کا اسے لے بھاگنا۔ بعد میں اسے مسلمان بنا کر اپنے گھر میں رکھنا۔ اس کا اپنی برادری سے ہمیشہ کے لئے خارج کردیا جانا۔ پھر دو ہی سال گزرنے پر کریم کا اسے کہیں چھوڑ کر رفوچکر ہوجانا۔۔۔ یہی سب باتیں تو تھیں جو میری کہانی "دھوبن" کی اجزاء ترکیبی بنیں۔

یہ تو دو چار کا ذکر ہے ورنہ اس نگارخانۂ عالم میں ایسی باتوں کی کمی نہیں چشم بینا چاہئے۔ تماشے بہت ہیں۔ ہر زندگی جو دوسرے میدانوں میں حقیر و غیر اہم نظر آتی ہے اس کا ہر واقعہ کسی کہانی کا موضوع بن سکتا ہے لیکن میں نے اپنی افسانہ نگاری کی زندگی میں مشاہدات پر اکتفا نہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ ذاتی تجربات میں گہرائی، سچائی اور واقعیت و تاثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ۔

چنانچہ میری دلہن میرے مکان اکثر آتی رہی۔ میں رات کے میٹھے سپنے ساحل پہ گذارتا رہا۔ جمپا مالی اور دوسروں کی نوعمر لڑکیوں کی نتھ اتارنے کی تقریب میں شامل ہوتا رہا۔ اپنے رشتہ کی بہنوں سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔۔۔۔ اور میرے نشتر و مرہم کا عمل جاری رہا یعنی کہانیاں بنتی رہیں رسائل میں شائع ہوتی رہیں اور مجھے دادِ تحسین بھی ملتی رہی

لیکن زندگی کے اسی سلسلۂ واقعات میں ایک اہم واقعہ ایسا بھی ہے جس کی کوئی کہانی نہ لکھی جاسکی اس کے لئے میں قلم نہ اٹھا سکا۔۔۔ وہ عارفی کی ایک پرسکون شام تھی۔ گاہے گاہے میں "ہوٹل دی پیرس" میں جایا کرتا تھا۔ اس شام بھی وہیں پہنچ گیا تھا۔ تنہا ہی تھا۔ ایک طرف پردہ گرا کر بیٹھ گیا۔ کافی پی رہا تھا اور کچھ سوچتا جاتا تھا کہ بغل کے پردے کے عقب سے کئی ملی جلی نسائی آوازیں آنے لگیں میں کچھ زیادہ متوجہ ہوگیا۔۔۔ کسی موضوع پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ میں نے ذرا کرسی کا رخ اس طرح کرلیا کہ باتیں زیادہ صاف سنی جاسکیں ———

نسرین بھی تھی اور ریحانہ بھی اور دو چار دوسری۔ بات عارفی کے افسانوں پر ہو رہی تھی۔ دوسروں کا کیا ذکر نسرین تک کو میرے قلمی نام سے جاننے پر مجھے کچھ حیرت ہو رہی تھی۔ اپنے افسانوں پر تبصرہ زیادہ توجہ سے سننے لگا ——— کوئی لڑکی کہہ رہی تھی "میں عارفی کو حقیقت نگار سمجھتی ہوں۔ وہ مکروریا سے کام نہیں لیتا بلکہ سماج کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ سماج جیسا کچھ ہے بعینہٖ اپنے آئینۂ تحریر میں اسے ظاہر کردیتا ہے۔ اس کا کیا دوش اگر سماج میں ہی تعفن اور گندگی ہے۔۔۔ میں تو اسے بالواسطہ مصلح سماج سمجھتی ہوں۔ وہ مریضوں کو ان کے مرض پر چونکاتا ہے۔ گندگی کا نقشہ کھینچ کر گندگی سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔"

درمیان میں دوسری بولی "لیکن ضروری، غیر ضروری ہر بات کو کھول کر بیان کرتا ہے جس میں مرض اور گندگی سے نفرت کم اور رغبت و لذت کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔" پہلی لڑکی نے جواباً کہا "یہی تو حقیقت نگاری ہے۔ وہ پردہ پوشی نہیں کرتا۔ زخم کو ریشمی کپڑے سے ڈھک کر زخم کے وجود سے انکار کرنا نہیں سکھاتا۔"

پھر دوسری لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا "اچھا تو تم ہی بتاؤ کہ ہم میں سے کسی نے اس کے افسانے پڑھ کر اس کی گندگی سے نفرت کی ہے۔ کیا ہم سب ہی محظوظ ہونے، لذت لینے اور سب سے بڑھ کر صنفی میدان میں نئی باتوں کے انکشاف کی خواہش کے تحت اس کے افسانے نہیں پڑھتے؟ میں پوچھتی ہوں ہماری اپنی قریبی سوسائٹی میں عورتوں کی ہم جنسی تعلیت
کے پرچار ہونے میں عارفی کا اہم حصہ تمہیں تسلیم ہے یا نہیں؟ مثالیں کیا پیش کروں تم خود ہی جانتی ہو۔ کیا یاد نہیں کہ تم نے میرے ہی ساتھ جب اس کا افسانہ "چادر" پڑھا تھا تو تم چونک گئی تھیں۔۔۔ اور جو تمہارے اندر ہر بات کا تجربہ کرنے کا خبط ہے۔ اسی خبط نے تمہیں کہاں پہونچا دیا۔۔ ان تلخ حقائق کو تم جن پردوں میں چاہو چھپاؤ۔۔۔ حقیقت پسندی کہو۔ سماج کی غیر جانبدارانہ عکاسی کہو۔ یا۔۔" ریحانہ سے چپکے بیٹھا نہ رہا گیا۔ اس نے بھی دوسری لڑکی کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، میرے ایک دور کے بھائی ہیں وہ بھی عارفی کے بڑے مداح ہیں اور ہر روز کچھ نہ کچھ ایجادات کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے عشق کے میدان میں" پہلی لڑکی نے اس بار کچھ جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا "تم لوگوں کا زاویۂ نظر اور طرز فکر بالکل دقیانوسی ہے۔ جو کچھ کہو میں عارفی کو حقیقت پسند، سماج کا عکاس سمجھتی ہوں۔۔۔ اور ادب اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہوسکتا"

اخیر میں نسرین کی باری آئی۔ اس نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ کہا "تم سب کیوں بحث کرتی ہو۔ میں ادب میں لذتیت کی قائل ہوں۔ چاہے وہ سماج کی عریاں عکاسی کے ذریعہ ہو یا رومانی تخیلیت سے۔ میں عارفی کے افسانے پسند کرتی ہوں تو اسی لئے کہ اس میں تلذذ کے لئے وافر سامان ہوتا ہے۔ چاہے تم لوگ اسے سماج کی عکاسی یا اصلاح یا خدا معلوم کیا کیا کہو۔۔۔" گفتگو بہت طویل ہوچکی تھی اور تقریباً سب ہی اپنا اپنا خیال ظاہر کرچکی تھیں اس لئے جلد اختتام پذیر ہوئی۔ میں محویت کے عالم میں اپنے بارے میں سب کی رائیں سنتا رہا۔ یہ سب کچھ انکشافات کا درجہ رکھتے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ان باتوں سے پہلے سے واقف تھا لیکن خود فریبی کیلئے ان کی پردہ پوشی کر رکھی تھی۔

اور اب ان لڑکیوں نے اس پردہ کو اٹھا کر بلکہ تڑی بری طرح قہقہے مار کر نوچ کھسوٹ ڈالا۔

ٹھنڈی کافی کے آخری بچے ہوئے گھونٹ حلق سے اتار کر لینے پلٹے قدموں سے ساحل کی طرف چل پڑا۔ ساری فضا بھیدی ماٹل سیاہی میں ملفوف ہو رہی تھی۔ پُرسکون نم ہوا چل رہی تھی۔ میں ساحل کے کنارے ریت پر لیٹ گیا۔ رات گئے منسر چیچ بھی دیکھا تھا۔ اس سے مل کر پہلے کی طرح خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ دیکھ کر جھنجھلاہٹ بڑھ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے کیا کہتا۔

رخصت ہوتے وقت اس نے جو کچھ کہا جیسے زہر میں بجھے ہوئے تیر مار گئی "شہاب اپنا ملاح کرا دو ورنہ شاید آئندہ میں تم سے مل سکوں"۔

جب اپنے کمرے میں پہنچا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ میز پر لیمپ کے پاس ہی میرے ایک بے تکلف ایڈیٹر دوست کا خط رکھا تھا۔ مختصر سے خط میں خیر خیریت کے بعد لکھا تھا "سالنامہ کے لئے اپنی کہانی بھیجو" ۔ ۔ ۔ یعنی اپنی زندگی کی کہانی، میری آپ بیتی یا "اپنی کہانی" عام حالت میں اس جملہ کا سادہ مفہوم سمجھنا دشوار نہیں لیکن اس وقت میں اس جملہ پر چونک گیا۔ وہ جملہ یا خود میرا ذہن ایک دوسرا مفہوم پیدا کر رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

"میری اپنی کہانی"!

کیا میں بھی سماج کا ایک کردار ہوں جس کی تنقیح کی ضرورت ہے؟

تعاون کی راہیں

۱۔ علم دوست اور ذی استعداد اصحاب کو "معیار" سے متعارف کرائیے۔
۲۔ اپنے یہاں کے اسکول، لائبریریوں، اور دیانت دار نیوز ایجنٹوں کے پتے ارسال فرمائیے۔
۳۔ ایسی فرموں کے پتے ارسال کیجئے جنھیں ہم اشتہار دینے کیلئے آمادہ کر سکیں۔
۴۔ اہلِ قلم حضرات دفتر کے تقاضوں کا انتظار کئے بغیر اپنی نگارشات ارسال فرمائیں۔
۵۔ اپنے مفید مشوروں سے بلا تامل مستفیض فرمائیں۔
۶۔ "معیار" کا نمائندہ جب آپ کے شہر یا قصبہ میں پہنچے تو اپنے وقت کا ایثار کرکے توسیعِ اشاعت کی کوششوں میں زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹائیں۔

ناظم ــــــ ادارہ
ماہنامہ "معیار" میرٹھ

خطوط ونکات

طیب عثمانی

"معیار" ادھر کچھ دنوں سے باقاعدہ دیکھ رہا ہوں، بڑی مسرت ہے کہ پابندیٔ وقت کے ساتھ آپ اسے شائع کر رہے ہیں عرصہ سے خیال تھا کہ "معیار" کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کروں لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کا موقع نہ مل سکا۔ الحمد للہ یہ دلی خواہش آج شرمندۂ تکمیل ہو رہی ہے ــــ جن نامساعد حالات میں آپ "معیار" نکال رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ "نئی نسلیں" کے سلسلہ میں مجھے اس کا خوب اندازہ ہے کہ اس دور میں کسی بامقصد، سنجیدہ، اور تعمیری رسالہ کا جاری رکھنا "جوئے شیر لانے" سے کسی طرح کم نہیں، خدا کرے معیار جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔

"معیار" کی سب سے اہم خوبی میرے خیال میں اس کا تنوع ہے اور اسے باقی رہنا چاہئے ہاں "نقش اول" کے سلسلہ میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ادھر چند اشاعتوں سے مسلسل یہ دیکھ رہا ہوں کہ "نقش اول" میں مختلف موضوعات پر فلسفیانہ انداز کی چیزیں آ رہی ہیں جو کچھ زیادہ مفید نہیں، اسلئے کہ فلسفیانہ اور فکری مباحث میں تفصیل وطوالت کی ضرورت ہوتی ہے، تب بات واضح ہوتی ہے۔ نقش اول کے دو صفحے ان موضوعات کے لئے کافی نہیں ہیں میرے خیال میں تو نقش اول کو ہمیشہ کسی خالص ادبی مباحث کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے، دو صفحے میں اپنے مختلف ادبی مسائل کو آپ ہر مہینے اچھی طرح پیش کر سکیں گے اور اس طرح اپنا ادبی نقطۂ نظر اور اپنے یہاں پیدا ہونے والے مختلف ادبی مباحث آتے رہیں گے جو ہمارے لئے ہر حیثیت سے مفید ہیں گے جیسا کہ ستمبر کے پرچہ میں "ڈرامہ" کے سلسلے میں آپ نے اظہار خیال کیا ہے ــــ ادھر معیار کے مسلسل مطالعہ کے بعد اس بات کا ہمیں اندازہ ہوا کہ آج کل آپ فلسفہ کے مطالعہ میں زیادہ مشغول ہیں اور اس مرتبہ آپ کا "تخلیقی تفکر" مجھے پسند بھی آیا، اسی طرح اگر آپ اپنے فلسفیانہ مطالعہ کو ایک مستقل مقالہ کی صورت میں دیا کریں تو میرے خیال میں یہ زیادہ مفید ہوگا بہ نسبت اس کے کہ آپ اسے "نقش اول" میں لکھیں۔

افسانوں کے سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اگر افسانوں میں خیال کی ندرت نہ ہو تو پھر افسانہ میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ ہمارے بعض افسانہ نگار ایک ہی موضوع اور خیال کو بار بار مختلف انداز سے دہراتے رہتے ہیں اس مرتبہ "ہڑتال نہیں ہوگی" بھی اسی قسم کا افسانہ ہے۔ حالانکہ ہمارے افسانہ نگاروں کے لئے ہماری سماجی زندگی کے کتنے ہی ایسے گوشے ابھی باقی ہیں جنہیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مرتبہ اسعد گیلانی کا "مامون حسین علی" ابن فرید کا ترجمہ "قرار" اچھا ہے۔
غزلوں میں ابوالبیان حماد اور انور صدیقی کا تغزل کامیاب ہے خدا کرے "معیار" ہمیشہ معیاری ادب پیش کرتا رہے۔ اور اس کے ذریعہ ہمارے فن کار دین وادب کی صحیح اور سچی خدمت کر سکیں۔

محمود شاہد

ستمبر کا شمارہ ملا۔ سرسری نظر ڈال کر رکھدیا تاکہ فرصت میں کچھ دیر معیار کی صحبت میں دلچسپی سے گذرے ــ سبحان اللہ معیار کی معنوی خوبیوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں جامعہ ملیہ میں کتنے ہی رسائل مختلف خیالات کے آتے ہیں۔ مگر یہاں کی بات ہے کہ جو چیزیں ہمیں معیار میں ملتی ہیں وہ کسی اور رسالہ میں اتنی خوبصورتی اور سنجیدگی کے ساتھ کم نظر آتی ہیں۔

حفیظ صاحب کی زبانی "معیار" کی مشکلات کا تذکرہ سُن کر بے اختیار دل بھر آیا ۔۔۔ اس بار نظموں میں زاہد صاحب کی نظم "رات" سہیل زیدی کی "بے عمل" اچھی چیز ہے ۔ البتہ زاہد صاحب نے رات کی تیرگی میں جو رویّہ اختیار کیا وہ زندگی بخش احساس سے میل نہیں کھاتا ۔ بیماری کی موجودگی اور نسخہ کی تجویز تو سمجھ میں آتی ہے مگر دوا حلقوم میں ڈالتے وقت یہ سرد مہری قابل توجہ ہے ۔

بیٹھے بیٹھے میں یوں ہی سوچا کیا سوچا کیا
رات کا رنگ اور گہرا اور گہرا ہو گیا زاہد

اُمید ڈبائیوی کا حوصلہ اور ان کا تازہ عزم مستحق مبارکباد ہے ۔

غزلوں میں حماد صاحب ۔ نیاز صاحب کامیاب ہیں بالخصوص نیاز کی غزل میں شعریت نے جان ڈال دی ہے ۔ عشق و محبت کی رمزوں سے زندگی کی صالح قدروں کو اجاگر کرنے اور دل میں اُتارنے کا یہ انداز بڑا پُر اثر اور پیارا ہے ۔ انور صدیقی کی غزل اس لحاظ سے بڑی اچھی ہے کہ اس میں انسان کی عظمت کا احساس ملتا ہے ۔ اس کی بے پناہ قوت اور تسخیر آمادہ طاقت کا اعتراف نظر آتا ہے ۔

شعاعِ مہر و نسیم سحر سے فروغِ بزمِ انجم ہے
کہا یہ کس نے اپنے حال سے کچھ نہیں ہوتا

جیئے جانے اور زندہ رہنے میں کمال نہیں بلکہ دوسروں کو اسی ولولہ سے اور بھرپور زندگی سے فیضیاب کرنا بڑی انسانیت کی بات ہے ہماری ادبی تحریک کے لئے یہ پہلو زیادہ لائق توجہ ہے ۔

ہمیں اس انداز پر نہیں سوچنا چاہئے کہ موجودہ عہد کی خرابیاں انسان کی عقلی ترقی کا نتیجہ ہیں ۔ بلکہ ان ترقیوں کا ساتھ دے کر ان ہاتھوں کے نقائص کو واضح کرنا چاہئے ۔ اس عہد کی ترقیوں میں اونچا مقام پیدا کرنا کسی تحریک کی زندگی کا ثبوت ہے ۔ حیات و کائنات کی عظمت زندگی کی برگزیدگی کو اس کا مقام دلانا اور اسے شعر و ادب میں عام کر کے انسان کے مستقبل کو درخشاں کرنا تعمیری ادب کی بنیادی اساس ہونا چاہئے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شعر و ادب کو خشک فلسفہ میں بدل دینے کے قائل ہیں ۔ بلکہ زندگی اگر فلسفہ ہے جس کا مجھے اعتراف ہے تو اس فلسفہ کو پیکر جمیل عطا کرنا اور اسے شاعری کے نقش و نگار سے حُسن آرا کرنا سماج اور شاعری کی بڑی خدمت ہے ۔ بغیر مستقبل کا بڑا کام بھی ۔

خیال اپنا اپنا

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور

(۱) منّی کتاب :- قیمت - چار آنے

(۲) موتیوں کا ہار :- حصّہ اول ۳ ؍ حصہ دوئم ۳ ؍ حصہ سوئم ۵ ؍

یہ سب کتابیں درسی کتابیں ہیں۔ جن کو جناب افضل حسین ایم اے ایل ٹی نے ایک عظیم تعلیمی تجربہ کے پیش نظر مرتب کیا ہے۔

موصوف اب تک ماہرانہ صلاحیتوں کا اظہار بہت سی درسی کتب کی ترتیب کر کے دے چکے ہیں۔ مندرجہ بالا کتابیں بھی ان کی اعلیٰ تعلیمی کوششوں کی آئینہ دار ہیں۔

پہلی کتاب میں قوت مشاہدہ کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ حروف تہجی کی تعلیم دینے کے لئے جدید ترین طرز پر ایک قاعدہ پیش کیا گیا ہے۔ جو نہ صرف ایک اسلامی درس گاہ کی خدمت ہے بلکہ اُردو کی اہم خدمت بھی ہے۔

"موتیوں کا ہار" کے نام سے جو تین چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں ان میں سبق آموزی اور دینی و اخلاقی تربیت کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے مواد پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں دلچسپ ہیں۔ جو عام مطالعہ کی کتب کی حیثیت سے معمولی استعداد کی خواتین میں کافی مقبول ہو سکتی ہیں۔

ہم ان سب کوششوں کو سراہتے ہوئے مؤلف کو اس مفید اور عظیم خدمت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور عام حلقوں سے ان کتابوں کی ترویج کی سفارش کرتے ہیں۔

انتخاب کلام راز یزدانی

مرتبہ :- عابد رضا بیدار رامپوری

ملنے کا پتہ :- میکڈانل ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

جناب بیدار نے راز یزدانی صاحب کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ راز صاحب کے یہاں بعض بعض نہایت اچھے شعر ہیں۔ لیکن بقیہ کلام اوسط درجہ کا ہے۔ البتہ گھٹیا درجے کے اشعار سے یہ مجموعہ پاک ہے۔ راز صاحب اچھی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔

مرتب نے دیباچہ میں ایک بڑی جرأت آمیز بات کہدی ہے کہ الہامی نظاموں کی طرح اگر زندگی کے لئے کوئی معین نظام بنایا جائے تو وہ غزل ہی کا نظام ہوگا۔ اچھا ہوتا اگر وہ غزل کے حدود کا واضح طور سے تجزیہ کر کے کسی نظام کا بنیادی خاکہ بھی پیش کر دیتے۔

جینے کیلئے

مصنف :- ستیہ پال آنند

پبلشر - ساہتیہ سنگم لدھیانہ۔

ستیہ پال آنند صاحب کے افسانوں کا یہ مجموعہ انکی عمدہ تخلیقی اور فنی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کے ادبی نظریہ سے اختلاف ہے پھر بھی ہم ان کے بعض افسانوں کو بہت اچھا سمجھتے ہیں لیکن "بھوک" جیسے افسانے ہمارے نظریہ کے لحاظ سے کسی صحتمند مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہی نہیں اُلٹا مضر ہیں۔ "فسادات" پر جو افسانہ آنند صاحب نے لکھا ہے توازن

سے کہیں کہیں خالی ہو جاتا ہے۔ "کون موئن" آنند صاحب کی ایک اچھی تخلیق کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ یہ کردار تنیا فیڈ ورووا کے ناول "دی فیملی" کے ایک کردار پروفیسر کرنوف سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے لیکن انہیں کرنوف کا تجریدی فکر نہیں ہے اور نہ ہمیں اس کردار پر غیر ملکی رنگ کی چھاپ ملتی ہے۔ اسکے بجائے آنند صاحب کے کردار پر ہندوستانی رنگ چھایا ہوا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ "کون موئن" نقل نہیں بڑی حد تک انکی اپنی تخلیق ہے۔

آنند صاحب نے دیباچہ میں واضح طور سے اپنے نظریہ کو مارکسی بتایا ہے۔ بعض افسانوں کی حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اکثر افسانوں میں وہ پکّے مارکسی کم ہی نظر آتے ہیں۔ شاید ان میں انفرادیت کے کچھ عناصر ابھی دا نک ہیں۔

خاتون نمبر

ماہنامہ "سوداگر" سرائے روڈ۔ کراچی

مرتبین :۔ سلطان احمد۔ جمیل الرحمٰن

قیمت خاتون نمبر

ماہنامہ "سوداگر" کو ہم نے شروع ہی سے ایک اچھے مقصد کا حامل پایا ہے۔ "خاتون نمبر" نکال کر کا کراان "سوداگر" نے نہ صرف اپنی ترتیبی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ دور جدید کے ایک اہم موضوع پر کچھ مفید اور بیش قیمت مواد فراہم کرکے اپنے تعمیری رجحان کا واضح ثبوت بھی پیش کیا ہے۔

"خاتون نمبر" جدیدیت کے فتنے سے خواتین کو آگاہ کرنے اور ان کو ان کا صحیح مقام بتانے کے لئے نکالا گیا ہے۔ یہ کام مقالوں ہی سے نہیں افسانوں، اور نظموں سے بھی لیا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ عام حلقوں میں یہ بھرپور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا ہم ادارہ "سوداگر" کو اس پیشکش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور توقع کرتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ کسی اہم ترین موضوع پر کوئی نمبر پیش کرکے سماج اور ادب دونوں کی خدمت کا عظیم فرض ادا کرینگے۔

سندھی ماہنامہ "نشانِ راہ" والس روڈ

مرتّب :۔ مہر عظیم مہر۔ محمد علی پٹو

سالانہ قیمت۔ پانچ روپیہ۔ فی پرچہ آٹھ آنے

یہ ماہنامہ سندھی زبان کا ماہنامہ ہے جس کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ بظاہر ایک اُردو رسالہ میں اس کا تعارف عجیب بات ہوگی۔ لیکن نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا تعارف اپنے اندر بڑی افادیت رکھتا ہے۔

اسلامی افکار کو فروغ دینے کی جو ہمہ گیر تحریک اُٹھ چکی ہے اور جس کا دائرۂ عمل روز بروز بڑھ رہا ہے اس کے نفوذ کا اندازہ کرنے کے لئے اس رسالہ کا تعارف مفید ہو سکتا ہے۔

یہ رسالہ سندھی زبان میں "اسلامی طرز فکر و عمل جو داعی" یعنی اسلامی طرز فکر و عمل کا داعی کی حیثیت سے نکلا ہے۔ مضامین میں "مذہب اور سیاست"، "لئے توحید"، "اسلام برسر عمل"، "اشتراکیت یا امن عالم"۔ سیرت ہشام، قابل قدر ہیں۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا ایک حصّہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ حصۂ ادب میں ادارہ نے "اسلامی ادب" کے عنوان سے ایک مختصر تنقیدی مضمون میں اسلامی ادب کا تعارف کرایا ہے۔ اسکے علاوہ ایک افسانہ اور چار نظمیں شاملِ اشاعت ہیں ظاہر ہے کہ ان سب کا مرکزی فکر اسلام کا نظریۂ ادب ہے۔

اسلامی ادب کی جو تحریک اُردو میں شروع ہوئی تھی اب وہ آہستہ آہستہ دوسری زبانوں میں بھی پھیل رہی ہے۔ یہ بات اسلامی ادب کے مستقبل سے بڑی اُمیدیں بندھاتی ہے۔ ہم اپنے ان قارئین سے جو سندھی ادب کے حلقوں سے روابط رکھتے ہیں یہ درخواست کرینگے کہ اس نئے رسالہ کے فروغ کی کوشش کرکے اسلامی ادب کی ترویج میں حصّہ لیں۔

مدیر ماہنامہ "برھان" دہلی کا تبصرہ :۔

معیار کا "تنقید نمبر" — "برھان" کی نظر میں

... مضامین بڑے سنجیدہ، مدلل اور بصیرت افروز ہیں۔ اس نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے متعدد مقالات "تعمیر پسند ادب" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترقی پسند ادب پر کڑی تنقید کرکے اس کی خامیوں اور بے راہ رویوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور اسلام کے نظریۂ حیات کی روشنی میں ادبی قدروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح کی کوشش ہمارے ادب کو صحیح ڈگر پر بھی ڈال دے گی اور اس کو ایک خاص قسم کی توانائی اور صحت بھی بخشے گی۔ ہمارے نوجوان ادیبوں میں اس جدید طرز فکر کا نشو ونما ادب کیلئے بھی نیک فال ہے اور اسلام کیلئے بھی۔

ارباب ذوق کو اس نمبر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے :۔

(مدیر ماہنامہ "برھان" دہلی)

نظریاتی اور عملی تنقید پر ٹھوس مقالات رکھنے والی پونے دوسو صفحات کی یہ بیش قیمت پیش کش سائز ۸/۳۰×۲۰ پر صرف **ایک روپیہ** میں حاصل کیجئے۔

ملنے کا پتہ :۔ **مکتبۂ معیار میرٹھ**

قلمی دوستی کے شائقین!

پچیس مختلف ممالک کے ۱۲۵ مرد و خواتین سے جو گوناگوں مشاغل (مثلاً ٹکٹ، سکے، تصاویر جمع کرنا وغیرہ) رکھتے ہیں صرف ایک روپیہ چار آنہ کا منی آرڈر بھیج کر حاصل کریں۔

یونیورسل ہابی ہوم

بجنور (یو۔پی)

جب کبھی آپ دلی آئیں

ہر قسم کے بہترین کھانے، چائے، لسی، سوڈا لیمن، وغیرہ سے لطف اندوز ہونے کیلئے

نیشنل ریسٹورنٹ

بازار سرکیوالان

نزد کوچہ پنڈت

میں تشریف لائیں :۔

خادم — محمد حنیف

مینیجر

(دیر نظر جیلہ محمد جمیل خاں نے کمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار صدر اسٹریٹ میرٹھ سے شائع کیا)

Only Title Printed at Pilot Press Delhi.


معیار
Meyar
Monthly

صحت مند اور تعمیری ادب کا علمبردار

ماہنامہ

معیار

جلد ۔۔۔۔ ۵

شمارہ ۔۔۔۔ ۱۰

نومبر ۱۹۵۵ء

ترتیب دینے والے

نجم الاسلام

بدر فاروقی۔ ایم۔ اے

دفتر ماہنامہ معیار شاہ پیر گیٹ میرٹھ

ترسیل زر کا پاکستانی پتہ

احمد نور صاحب فیملی لائن جیکب آباد

زر تعاون

سالانہ پانچ روپے

ششماہی تین روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

نظمیں

مقالے

غزلیں

افسانے

فیچر

شرح

خطوط و نکات

نقش اوّل

تعمیری ادب اور تنقید کے سلسلے میں ہم اب تک چند باتوں پر بطور خاص زور دیتے رہے ہیں مثلاً تنقیدی فیصلہ کی تکمیل کیلئے طے شدہ اخلاقی قدروں پر مبنی زاویۂ نگاہ ضروری ہے اور صرف طے شدہ اخلاقی قدروں پر مبنی زاویۂ نگاہ ہی نہیں بلکہ وہ نقطۂ نظر بھی جو مسائل حیات کو اسلامی افکار و خیالات کی روشنی میں اجاگر کرتا ہے۔ اسی کو چاہے آپ مروّجہ لفظوں میں مذہبی نقطۂ نظر کہئے۔ یا لفظ "مذہب" محدودیت سے بچنے کیلئے کوئی دوسری اصطلاح استعمال کیجئے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس خیال سے ہم بالکل متفق ہیں کہ "ادب کی عظمت تنہا ادبی معیاروں سے متعین نہیں کی جا سکتی اگرچہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ کسی تخلیق کے بارے میں یہ فیصلہ کہ وہ ادب ہے یا نہیں صرف ادبی معیاروں کو سامنے رکھکر ہی کیا جا سکتا ہے"۔؎

ہر وہ بات جو ضبط تحریر میں آگئی ہو ادب نہیں ہو سکتی۔ ادب کے دائرے میں آنے کیلئے اسے کچھ تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ ادب کے معیار پر پورا اترنا ہوگا۔ اگر وہ پوری نہیں اترتی تو چاہے اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تاریخ ہو چاہے سید رحمٰن کا کوئی مربوط و مسلسل تھیسس ہو چاہے ابو الاعلیٰ کے سماجی اور سیاسی مضامین ہوں ادب کا درجہ انہیں نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ کسی ایسی تحریر کی عظمت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے جو ادبیت رکھتی ہو صرف یہی کافی نہیں کہ وہ ادبی معیار پر پوری اترتی ہے۔ تب یقیناً مورخانہ نقطۂ نگاہ کو بھی دیکھا جائے گا۔ سائنٹیفک طرز استدلال کو بھی نظر میں رکھیں گے۔ صاحب تحریر سے سماجی اور سیاسی وقت نظر کا مطالبہ بھی کریں گے۔ سب کچھ ہوگا کیونکہ یہ معاملہ ادب کی عظمت کا ہے۔ خالی ادبیت کا نہیں۔ اس معاملے کو طے کرنے کیلئے اخلاقی نقطۂ نظر بھی سامنے رکھا جائے گا۔ اسلامی نقطۂ نظر بھی سامنے رکھا جائے گا۔ اسلام زندگی کی عظمت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کو جانچنے کا ایک پیمانہ دیتا ہے۔ پھر اس معیار سے کیوں ادب کی عظمت کو متعین کیا جائے۔ کیوں نہ اس پیمانے سے ادب کی قدر و قیمت کو جانچا جائے۔

ظاہر ہے ہم جس تحریر کو جانچیں گے وہ ایسی تحریر ہی ہوگی جو ادب کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ اس لئے تعمیری تنقید کو اس وجہ سے برا نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مذہبی نقطۂ نگاہ کا احترام کرتی ہے۔ ادب کو صرف بہ حیثیت فن نہیں دیکھتی۔

مذہبی لٹریچر اور اس لٹریچر میں جو مذہبی قدروں کا احترام رکھتا ہو فرق ہے۔ مذہبی لٹریچر سے مراد وہ لٹریچر ہے جو الہامی کتب اور ان کی تشریحات پر مبنی ہو اور اسے ادب کا قالب صرف اس لئے دیا گیا ہو کہ لوگوں کیلئے آسان یا دلچسپ ہو جائے۔ اس کے ذیل میں اردو کے ابتدائی اور وسطی دور کی بہت سی مثنویاں پیش کی جا سکتی ہیں جنہیں روزمرہ کے مسائل، اور دینی فرائض دینی کی بجا آوری کے احکامات کو نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک باب توحید پر ہے ایک باب میں اسلام کے پانچ ارکان بیان کئے گئے ہیں ایک باب میں غسل اور وضو کے مسائل وغیرہ وغیرہ۔ یا پھر کلام پاک کے منظوم ترجمے۔

ضروری نہیں کہ ان چیزوں پر ادب کا اطلاق ہو۔ ادب کا ایک لازمی عنصر تخئیل ہے۔ جس کی گنجائش ان چیزوں کے باب میں نہیں نکل سکتی۔ اسلئے یہ لٹریچر ان معنوں میں لٹریچر نہیں کہلایا جا سکتا جن کے تحت اس میں افسانہ، ناول، غزل، اور نظمیں آتی ہیں۔

اسلامی ادب یا تعمیری ادب، مذہبی ادب نہیں بلکہ اس میں اسلامی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ یہاں ادبیت بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک نظریہ بھی۔ تخئیل بھی اور اس کے ساتھ ساتھ واقعیت بھی شعریت بھی اور فلسفہ بھی۔ اور درحقیقت یہی اچھے ادب کی خصوصیت ہونی بھی چاہئے۔

ان سطور میں ہم نے صرف اتنی بات کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی ادب محدود معنوں میں مذہبی لٹریچر نہیں ہے۔ اس کی تصریح کی ضرورت اس لئے ہے کہ آج کے دور میں جبکہ بقول ایلیٹ ادب کو   کرنے کا عمل جاری ہے۔ ہمیں مذہب اور ادب کے صحیح تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت اور اہمیت سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

؎ 'RELIGION AND LITERATURE' (SELECTED ESSAYS BY TS ELLIOT)

دو باتیں ہمیں اور کہنی ہیں۔ دونوں سے اغماض یقیناً ہماری کوتاہی ہوگی۔ پچھلے دنوں اُردو شاعری کا ایک کہن سال خادم ہم سے جدا ہوگیا۔ ہماری مراد حضرت بیخود دہلوی سے ہے۔ ان کی آواز کو ہم نے اور بہتوں نے آخری بار ریڈیو پر اس وقت سنا جبکہ کچھ عرصہ ہوا آل انڈیا ریڈیو دہلی پر اُردو کے کہن سال شعراء کا ایک خصوصی پروگرام پیش کیا گیا تھا۔ عمر ۹۰ برس اور آواز میں وہ کڑک جو آج جوانوں پر بھی بھاری رہے۔

ان کا رنگِ کلام آج کے مذاق کے مطابق نہیں تھا، مطابق ہوتا بھی کیسے جس شخص کی پختگیٔ مزاج ایک صدی کے لگ بھگ پرانی ہو اس کا بدلنا آسان نہیں تھا۔ اور صدی بھی کیسی کہ قدیم و جدید مغرب اور مشرق، الحاد اور دین، اخلاق اور زمانہ سازی، سرمایہ اور محنت سب کی کش مکش اسی صدی میں پلی اور بڑھی ہے۔ بیخود کی زبان نہایت عمدہ ہوتی تھی۔ اُردو کے ایک خادم کی حیثیت سے ان کا نام روشن رہے گا۔ بیخود مرحوم کے چند اشعار جو اس تحریر کے وقت ذہن میں موجود ہیں درج کئے جاتے ہیں ؎

کس حسن کا ہے حسن، ادا کس ادا کی ہے — ایسا بنا دیا تمھیں قدرت خدا کی ہے
تصویر کیوں دکھائیں تمہیں نام کیوں بتائیں — لائے ہیں ہم کہیں سے، کسی بے وفا کی ہے
چھپتا ہے خون بھی کہیں مٹھی تو کھولئے — رنگت یہی حنا کی یہی بو حنا کی ہے؟
دیکھو تو جا کے حضرتِ بیخود رہے ہوں کہیں — دعوت شراب خانے میں ایک پارسا کی ہے

دوسری بات اُردو اور ہندوستان میں اس کے مستقبل کے بارے میں ہے۔ فضل علی لسانی حد بندی کمیشن کی رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ جزوی ترمیمات کے بعد اس کے بڑے حصہ کو منظور کر لیا جائے گا۔ دستورِ ہند میں جن زبانوں کا تذکرہ ہے ان میں سے تقریباً سب ہی زبانیں اپنا مقام پا چکی ہیں۔ ایک اُردو ہی ایسی ہے جسے شاید مسلمانوں کی زبان سمجھ کر ہر جگہ نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یو۔ پی اور اس کے مسائل پر اس رپورٹ میں خاصی طویل طویل بحثیں ہیں لیکن اُردو کی طرف کہیں ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ جیسے اس صوبہ کا یہ مسئلہ ہی نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صدرِ جمہوریہ کی خدمت میں کئی لاکھ انسانوں کی ایک متفقہ عرضداشت کبھی کی پیش کی جا چکی ہے۔ اس پر بھی وہ سکوت فرمائے ہوئے ہیں۔ یہ سکوت کوئی معمولی سکوت نہیں ہے۔ اس طرح ان جیسی ذمہ دار ہستی ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے لئے ایک نظیر بنا رہی ہے کہ دستور کی روح کو حیلوں، بہانوں یا معنی خیز سکوت کے ذریعہ کچلا جا سکتا ہے۔ شاید ہماری حکومت کو اس پر اور اس کے نتائج پر سنجیدگی سے غور کرنے کی مہلت ابھی نہیں ملی ہے۔

اب حال یہ ہے کہ حکومت تو اُردو کے معاملے میں اغماض برت رہی ہے اور حامیانِ اُردو نے اپنی سہل پسندی اور غفلت کے سبب اس عظیم مسئلے کو ایک ایسی انجمن کے سپرد کر دیا ہے جو سراسر حکومت کی مالی امداد پر چل رہی ہے اور اس کی دست نگر کی حیثیت سے زندگی گزار رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے ذمہ داران انفرادی آزادانہ رائے رکھتے ہوں لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی اجتماعی پالیسی پر حکومت کی وہ سرد مہری اپنا اثر کیوں نہ دکھائے گی۔ جو مالی امداد کے ساتھ ساتھ قدرتی طور سے انجمن پر اپنا اثر جما رہی ہے۔

یوں بھی اس مسئلے کو اب عمومی سطح پر سوچنے اور حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اگر تمام اُردو نواز حلقوں کا ایک کنونشن کیا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ سیاسی مصالح سے بالاتر ہو کر کوئی حل سوچا جا سکتا ہے۔ اور ہم ان سیاسی رہنماؤں کے پھندے سے نکل سکتے ہیں جو زبان کے مسئلہ کو اپنی سیاسی اغراض پر بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

فضا ابن فیضی

کائنات

تخلیق سے پہلے :

روش روش پہ خموشی تھی، جوئبار خموش
غمِ سکوت میں ڈوبا تھا لحنِ ساز ابھی
افق سے دور کہیں آفتاب سوتا تھا
نہ ربطِ خاص تھا کچھ برگِ گل کو شبنم سے
کرن سے سینۂ شبنم میں ارتعاش نہ تھا
تھا جن کا ایک تبسم بہارِ خلدِ بریں
نگاہ فیضِ تجلی سے تھی ابھی محروم
لہو ہنوز نہ دوڑا تھا نبضِ امکاں میں

نسیم و نکہت و نزہت کے آبشار خموش
کہ پُرفشاں نہ تھی روحِ نیاز و ناز ابھی
اداس چاند مقدر کو اپنے روتا تھا
یہ زخمِ دل ابھی نا آشنا تھے مرہم سے
صدف پہ اپنے گہر کا مقام فاش نہ تھا
ہنوز وہ گل و لالہ نہاں تھے زیرِ زمیں
کلی کو رازِ شگفتن ابھی نہ تھا معلوم
کوئی سحر نہ تھی بیدار خاورستاں میں

نہ ایسا فرقِ مراتب دن اور رات میں تھا
بس ایک چاکِ گریبانِ کائنات میں تھا

تخلیق کے بعد :

فضائے ارض و سما جلوہ آفریں اتنی
ذرا سی بھی جو ستاروں نے آنکھ جھپکائی
ہر ایک ڈوبی ہوئی نبض میں لہو آیا
خود اپنے زخموں کا منہ چومنے لگے مرہم
یہ آب و گل کے جھلکتے ہوئے صنم خانے
چمن میں قافلۂ سبزہ و نسیم آئے
سرور و کیفیت و رنگ و بو کے میخانے
ارم طراز ہے دشت و جبل کی ویرانی

یہ کائنات تو پہلے نہ تھی حسیں اتنی
خمِ افق سے نبیذِ سحر چھلک آئی
زمیں پہ نیّرِ اعظم نے نور برسایا
کرن کی لَو سے دھڑکنے لگا دلِ شبنم
چلی ہے موجِ ہوا نکہتوں کو بہلانے
فروغِ نور سے نابود ہو گئے سائے
چھلک پڑے ہیں دماغ و نظر کے پیمانے
نوا فروش ہے خاموشیوں کی طغیانی

ضمیرِ کوکب و مہتاب تیرہ ناک نہیں
کہ آب و گل کے گریباں میں کوئی چاک نہیں

انسان عہدِ رفتہ میں :۔

وہ رُوحِ حکمت و رنگِ جمالِ یکتائی — حریمِ قدس میں جس کی ہوئی پذیرائی
گمان اس کی جلو میں یقین تک آئے — کہ جبرئیل امیں بھی زمین تک آئے
اسی کی فکر سے ٹوٹا فسونِ تیرہ شبی — بجھا اسی کے نفس سے چراغِ بُو لہبی
رہی متاعِ امانت جو سرسبد اس کی — تپِ جنوں سے ہمکتی رہی خرد اس کی
فرشتہ صید رہا یہ بغیر ناوک و تیر — ہیں اس کے زلہ ربا جبرئیلِ پاک ضمیر

کہاں یہ اور کہاں شیوۂ زبونِ حیات — اسی نے عام کیا سوزِ اندرونِ حیات
خرد پہ رازِ دو عالم ہے آشکار اس سے — جنوں ہے جوشِ تپیدن سے ہمکنار اس سے
یقین و علم سے عقبا کو روشناس کیا — ترے وجود سے دنیا کو روشناس کیا

ہر اک نظر تھی گہر سنج و کامراں اس کی
بہار چہرے پہ ملتی رہی خزاں اس کی

انسان عہدِ حاضر میں :۔

سحر گزر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر — پلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر
سیاہ راتوں سے سورج ہیں مطمئن کتنے — سیاہیوں کی طرف مڑ گئے ہیں دن کتنے
خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے — ہوائے تند سے لڑ کر چراغ ٹوٹ گئے
غریقِ زہرِ ہلاہل ہوئے سفینۂ نوش — خضر کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش
وہ جس کا سینۂ روشن تھا مایۂ دارِ علوم — وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم

دلوں کے گنج میں کینے کا سانپ بستا ہے — وہ آدمی ہی ہے جو آدمی کو ڈستا ہے
یہ فکرِ عیش یہ تہذیب و کفر کے ناسور — یہ بے نگاہ کلیم اور یہ خرابۂ طور
زمیں کے دوش پہ فکر و نظر کے یہ تابوت — یہ مقبرہ ہے الٰہی! کہ عالمِ ناسوت

تمام سعیِ کرم رائیگاں ہوئی تیری
متاعِ سود سپردِ زیاں ہوئی تیری

شمس الآفاق

صدائے بازگشت

روز آتے ہیں سسکتے ہوئے پیغام ابھی
ہیں محبت کے علاوہ بھی بہت کام ابھی
میری دنیائے خیالات ہے میخانہ بدوش
ہر طرف بکھرے ہیں مینا و سبو و جام ابھی
زلف و کاکل کا تصوّر رخ و عارض کا خیال
ہے وہی صبح ابھی اور وہی شام ابھی
ہائے یہ وسعتِ افلاک یہ آزاد فضا
پھڑپھڑاتی ہے مری روح تہِ دام ابھی

عشق ہے قیدِ ہوس میں اسے کردوں آزاد
تا کجے رنج بتاں تا کجے آہ و فریاد

کتنی دلکش ہے یہ تہذیب نوی کی زنجیر
آج جمہوریت غرب کا آدم ہے اسیر
بندگانِ ہوس و آز کی شاطر چالیں
مات کھائے ہوئے انسانوں کا یہ جم غفیر
چور آزاد ہیں جیبوں کو کترنے کے لئے
سسکیاں لیتا ہے بازاروں میں انساں کا ضمیر
آج ہر سانس کے ہمراہ ہے شورِ ماتم
سازِ ہستی کا ہر اک تار ہے آنسو کی لکیر

قلبِ جمہور سے آہوں کی گھٹا اٹھتی ہے
لبِ فریاد سے خاموش صدا اٹھتی ہے

کہیں چنگیز ہے خنداں کہیں نادر رقصاں
آدمیت کہیں نالاں کہیں مذہب لرزاں
ناوکِ نازِ ستمگر سے عجب عالم ہے
نیم بسمل ہے کوئی اور ہے کوئی بے جاں
درد و غم، رنج و محن، قحط و مصائب آلام
قلبِ انساں میں ہیں پیوست ہزاروں پیکاں
زندگی آج سلگتی سی نظر آتی ہے
سینۂ مادرِ گیتی سے نکلتا ہے دھواں

کوئی امید کی ہلکی سی کرن بھی تو نہیں
آدمیت کیلئے دل میں لگن بھی تو نہیں

ہے کوئی آج کہ انسان کو بھر دے آواز — ہے کوئی آج کہ پھر چھیڑے نئے ڈھنگ سے ساز
ہے ابھی تارِ نفس شورشِ طوفاں بکنار — بربطِ رُوح ابھی تک ہے شکستہ آواز
آدمی کو کوئی انسان بنا دے اے کاش — ہے ابھی قلبِ بشر منتظرِ سوز و گداز
رُوحِ آدم کی بھٹکتی ہے خلاؤں میں ابھی — مختلف ازموں کی لاشوں پہ جھکے ہیں شہباز

ہر طرف موت کے سامان نظر آتے ہیں
رقص کرتے ہوئے شیطان نظر آتے ہیں

کچھ نئے جال بچھائے ہیں پھنسانے کے لئے — کچھ نئے سوانگ بنائے ہیں لبھانے کے لئے
آرٹ کے نام کا پردہ ہے ہوس کے آگے — کچھ حسیں نام تراشے ہیں بہانے کے لئے
چھائے ہیں چار طرف جنگ کے گہرے بادل — ہے ہوس ناک میں دُنیا کو مٹانے کے لئے
نت نئے بم بھی ہیں، بارُود بھی ہے گیس بھی ہے — آگ ہی آگ ہے زندوں کو جلانے کے لئے

اہلِ تزویر لگے ہیں نئی تدبیروں میں
رُوحِ آدم ہے دہکتی ہوئی زنجیروں میں

ہاں مگر دورِ افق پر یہ چمک کیسی ہے — شبِ تاریک میں شعلے کی لپک کیسی ہے
دوست سُننا تو یہ آواز کہاں سے آئی — ان گھٹاؤں میں یہ بجلی کی کڑک کیسی ہے
رُوح مانوس سی اس لَے سے نظر آتی ہے — دل کے گوشوں میں اترتی یہ لچک کیسی ہے
پھر یہ باطل کے مٹانے کو اُٹھی ہے شاید — اِک نیا درد ہے آج اس میں کسک کیسی ہے

ظلمتیں شب کی پریشان ہوئی جاتی ہیں
آندھیاں ظلم کی بے جان ہوئی جاتی ہیں

یہ صدا یاد دلاتی ہے وہ دورِ مسعود — جس نے بخشا تھا ایازی کو مقامِ محمودؔ
جس نے فرہاد کو خودداریِ دارا بخشی — جس نے ٹھکرا دیئے انساں کے تراشے معبود
ایک ہی رشتہ میں انساں کو پرو دیا جس نے — جس سے عالم میں ہوئی شانِ اخوت کی نمود
جس نے انسان کی عظمت کا ابھارا احساس — رنگ یا نسل کی جس میں نہ کوئی ہست نہ بود

شمسؔ! لہرائے گا ظلمت کا پھریرا کب تک
جب کرن پھوٹ رہی ہے تو اندھیرا کب تک

خاور آفریدی

ایک کہانی تین آوازیں

پہلی آواز :- ماضی

عہدِ رفتہ کی یاد آئی ہے
کتنی دلکش تھیں میری تقدیریں
اِک مصوّر کے ذہن میں جیسے
رقص کرتی رہی ہوں تصویریں

دوسری آواز :- حال

جو حقیقت نہ بن سکے اب تک
ایسے کچھ خواب دیکھتا ہوں میں
کوششیں تھک گئی ہیں۔ یا اے دوست
کوششیں کر کے تھک گیا ہوں میں

تیسری آواز :- مستقبل

زندگی ہے! تو زندگی کے لئے
چاہئے، اِک جہاں بناتا چلوں
جس میں آلام کا گذر تو کجا۔
نامِ آلام بھی مٹاتا چلوں

انجیل

آصف عارفی

علاجِ کشمکشِ زندگی صحیفۂ پاک
سمجھ سکے نہ تجھے تیرے صاحبِ ادراک

نگاہِ حکمتِ لادیں میں اِک کتاب ہے تُو
مگر مرے لئے تعلیمِ احتساب ہے تُو

ترے جلو میں اوامر بھی ہیں نواہی بھی
کمالِ جہد بھی اندازِ خانقاہی بھی

جب آدمی کو غمِ زندگی نے گھیرا تھا
فضائے دہر پہ چھایا ہوا اندھیرا تھا

تری پکار نے مُردوں کو زندگی بخشی
مثالِ مہر زمانے کو روشنی بخشی

مگر یہ ظلم کہ محرومِ اقتدار ہے تُو
خود اپنے ماننے والوں پہ آج بار ہے تُو

بچاؤ کی کوئی صورت نہ جب نظر آئی
تو خواجگی تری تعریف پر اُتر آئی

نیازمند نہیں تیرے تابعِ مصلوب
یہ امتیازِ کلیسا و سلطنت کیا خوب

یہ تیرے ماننے والے یہ فکرِ نَو کے امام
یہ مادّہ کے پجاری یہ ارتقا کے غلام

یہ تیرے نام پہ انساں کو لُوٹنے والے
یہ باغباں یہ گلستاں کو لوٹنے والے

یہ رہزنانِ جہاں راہبر کی صورت میں
یہ بھیڑیئے، یہ درندے بشر کی صورت میں

خیالِ خاص سے یہ عام کر رہے ہیں تجھے
نگاہِ شوق میں بدنام کر رہے ہیں تجھے

ادیب گورکھپوری

بھکارن

محو تھا پڑھنے میں مَیں پرچہ نیا معیار کا
ذہن میں اُمڈا ہوا تھا سیل سا افکار کا

لے رہا تھا لطف زاہد کی اچھوتی نظم کا
تھا تصوّر اُن کے تعمیری و شعری عزم کا

یک بیک آئی کہیں سے اک بھکارن خستہ حال
چیتھڑے سے تن پہ رُخ پر گردِ اندوہ و ملال

آج کے بھارت کی جیتی جاگتی تصویر تھی
یا کتابِ زندگی کی اِک نئی تفسیر تھی

دھجیوں میں بھی نمایاں تھی شرافت اِس طرح
پتھروں کے ڈھیر میں رخشاں ہو ہیرا جس طرح

دیکھ کر یہ منظرِ بربادیِ حُسنِ جواں
اشکِ غم آنکھوں سے میری ہوگئے از خود رواں

غم سے بوجھل کانپتی آواز میں گویا ہوئی
آگ و خوں کے کھیل میں دِلّی میں، مَیں بیوہ ہوئی

لکھپتی تاجر کی بیوی تھی اَبھاگن آج ہوں
کھیلتی تھی سیم و زر سے کل، بھکارن آج ہوں

دیکھتے ہیں لالچی نظروں سے غُنڈے اِس طرح
گھورتے ہوں صید کو بھوکے درندے جس طرح

گیت فلمی گائے جاتے ہیں پھنسانے کے لئے
جیب اپنی کھنکھناتے ہیں لُبھانے کے لئے

آدمی سے کس قدر ہے پست کرداری عیاں
ہر طرف چھائی ہوئی ہیں حرص کی تاریکیاں

کیوں نہ ہو انسانیت مفقود ایسے دیس میں
بھیڑیئے بستے ہوں جس میں آدمی کے بھیس میں

ہے مسلط گلشنِ اخلاق پر اب بھی خزاں
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں

تین مچھیرے

مترجم: ـــــ احسان ادیبی

(مشہور انگریزی نظم THREE FISHERMEN کا منظوم ترجمہ)

تھک کے سورج سو گیا تھا شام کے آغوش میں
ظلمتِ شب دھیرے دھیرے آ رہی تھی ہوش میں

سر جھکائے سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پیڑ بھی
دیکھکر فاقہ کشوں کی میتوں میں تیرگی

ہر طرف چھائی ہوئی تھیں موت کی خاموشیاں
سرد جھونکے لے رہے تھے سہمے سہمے سسکیاں

یوں دکھائی دے رہے تھے دور ظلمت میں چراغ
جیسے اک بیوہ کے دل پر ان گنت صدموں کے داغ

دور ساحل سے نکل کر جا رہی تھیں کشتیاں
مفلسی کے غم میں موجیں لے رہی تھیں ہچکیاں

چپوؤں کے ساز پر گاتے ہوئے وہ ماہی گیر
جا رہے تھے چیرتے موجوں کا سینہ مثلِ تیر

تک رہی تھیں بھیگی آنکھیں شوہروں کی زندگی
توبہ توبہ زندگی کی زندگی سے بے رخی

وقتِ رخصت تیرگی میں ہاتھ ہلتے ہی رہے
داغ سینوں کے مگر گل بن کے کھلتے ہی رہے

جانے والے دفعتاً نظروں سے اوجھل ہو گئے
رفتہ رفتہ گیت بھی موجوں میں جیسے کھو گئے

سینکڑوں ارمان لے کر جا رہے تھے ماہی گیر
کب مگر انساں مٹا سکتا ہے ماتھے کی لکیر

جا کے پہنچے بھی نہ تھے وہ منزلِ مقصود پر
آ گئے گھنگھور بادل لے کے طوفاں کی خبر

تند موجوں سے فضا میں شور بڑھتا ہی گیا
آسماں پر بادلوں کا زور بڑھتا ہی گیا

دیکھکر طوفان کو ساحل انھیں یاد آ گیا
بیوی بچوں کا تصوّر زندگی پر چھا گیا

تھے پریشاں حال وہ آفت زدہ منجدھار کے
موت کو اپنا رہے تھے زندگی کو ہار کے

تند موجیں سہتے سہتے ہو گئے آخر نڈھال
گر گئے دریا میں چپو بہہ گئے ہاتھوں کے جال

ہو گئیں آخر شکستہ بیکسوں کی کشتیاں
زندگی تھی قیدِ گردابِ فنا کے درمیاں

بن گئی تھی دور تک ساری فضا ظلمت نشاں
کالے کالے بادلوں میں ہنس رہی تھیں بجلیاں

پیٹ کے مارے ڈٹے کرتے رہے طوفاں سے جنگ
وقت کے قارون کھا جائے تری دولت کو زنگ

صبحدم پائے گئے ساحل پہ طوفاں کے شکار
عورتیں لاشوں سے تھیں لپٹی ہوئی دیوانہ وار

دیکھکر احساں یہ مرگِ گراں خاموش تھا
یہ زمیں خاموش تھی اور آسماں خاموش تھا

بزمی بنارسی

عقل و عشق اور جوش ملیح آبادی

"آج کل" فروری ۱۹۵۳ء میں حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک نظم بعنوان "عقل و عشق" شائع ہوئی تھی اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اپنی اس نظم میں جوش نے عقل اور عشق کی حقیقتیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے نظم کا بغور مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عقل اور عشق پر جس زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے وہ اس زاویۂ نظر سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہے جسے علامہ اقبال نے پیش کیا ہے۔

عقل اور عشق علامہ اقبال کے اہم ترین موضوعات میں سے ہیں اور انہوں نے مختلف اندازِ بیان کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔ جوش نے علامہ اقبال کے نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا ہے بلکہ اپنے مخصوص انداز میں اقبال پر طنز بھی کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

پہن کر مغربی داناؤں کے سر سے بڑی ٹوپی
نیا مُلّا سُناتا ہے پُرانی داستاں ساقی

"نیا مُلّا" کی پھبتی جس ہستی پر کسی گئی ہے وہ اگر واضح نہیں ہے تو مندرجہ ذیل شعر پر غور کیجئے ؎

قیامت ہے خودی کا دیوتا بھی یہ نہیں کہتا
کہ اے انسان تو خود ہے خدائے این و آں ساقی

جو لوگ اقبال کے فلسفۂ خودی سے پوری طرح واقف ہیں انہیں اس "خودی کے دیوتا" کا معبود ذہنی متعین کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی۔

اقبال نے عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس کے برعکس حضرت جوش تحریر فرماتے ہیں ؎

خوشی سے آتشِ نمرود میں جو عشق کودا تھا
اُسے حاصل بھی علم و عقل کی تاب و تواں ساقی

عقل اور عشق کا موازنہ کرتے ہوئے جوش نے اپنی اس نظم میں عقل کو ترجیح دینے کی کوشش کی ہے ان کی اس کوشش کو مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ؎

کسے سمجھاؤں کن الفاظ میں اور کس توقع پر
کہ نورِ عقل سے روشن ہے یہ سارا جہاں ساقی
کہ دانش صرف دانش ہے لباسِ مردمِ کامل
کہ حکمت صرف حکمت ہے کلاہِ مقبلاں ساقی
دیارِ عشق آزاد ایک منڈی ہے شراروں کی
فرازِ عقل پر ہے ماہ و پروین کی دوکاں ساقی

نہیں لیتا ہے پیرِ عقل سے جب اذنِ جولانی
تو بن جاتا ہے طفلِ عشق سیلِ بے اماں ساقی

اس کے برعکس علامہ اقبال نے ہر جگہ اوّلیت اور فضیلت عشق ہی کو عطا کی ہے چنانچہ ان کے "عقل و دل" کے مکالمے میں جب عقل کہتی ہے ؎

میں زمیں پر ہوں گزر فلک پہ مرا — دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دُنیا میں رہبری ہے مرا — مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
میں ہوں مفسرِ کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

تو اس کے جواب میں ؎

دل نے سُن کر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں

اقبال نے عقل اور عشق کا فرق ایک دوسری جگہ اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیرِ کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

لیکن جوشؔ کی تحقیق یہ ہے ؎

بہت کم لوگ واقف ہیں کہ عشقِ پختہ و بالغ
بہالِ عقل کی ہے ایک شاخِ بے ثمر ساقی

اور اپنی اس تحقیق کی روشنی میں وہ اقبال کے نظریۂ تضاد اور نظریۂ فضیلتِ عشق پر اس طرح برس پڑتے ہیں ؎

قیامت ہے کہ اب بھی اس خراباتِ مسائل میں
نئی دھج سے پرانا عشق ہے پیرِ مغاں ساقی
وہی عشقِ سُبک سر عقل کی جو جیرے سند ہے
جسے مطلق نہیں اندازۂ سود و زیاں ساقی
وہی عشقِ فریب انگیز جس کے دام میں آکر
دُم اتر دریکڑ لیتا ہے طفلِ ناتواں ساقی
وہی ناآشنائے آگہی عشقِ جنوں پرور
لئے پھرتا ہے اِک مدّت سے جو تیر و کماں ساقی
وہی عشقِ جنوں جس کی بدولت دیر و مستی میں
سجاتی ہے تمنا گھنٹیوں پر گھنٹیاں ساقی
وہی عشقِ غلط اندیش جس کے اِک اشارے پر
خوشی سے زہر کھا لیتے ہیں لاکھوں نوجواں ساقی

"خوشی سے زہر کھا لیتے ہیں لاکھوں نوجواں ساقی" تک آتے آتے جوشؔ کے مطالعہ کی سطحیت بالکل عریاں ہو جاتی ہے۔ ان اشعار میں "جنسِ عشق" کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ وہ "مثنوی زہرِ عشق" والا عشق تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن اُسے اقبالؔ کا عشق تصوّر کرنا اقبالؔ کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اقبالؔ نے اپنے تصورِ عشق کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جس کی موجودگی میں مذکورہ بالا تصورِ عشق کو ان کی طرف منسوب کرنا مغالطہ انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں ؎

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد
عاشق آنست کہ بر کف دو جہانے دارد
عاشق آنست کہ تعمیر کند عالمِ خویش
در نسازد بجہانے کہ کرانے دارد

ضربِ کلیم میں علم و عشق کے عنوان کے ماتحت علامہ اقبالؔ نے تحریر فرمایا ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب

علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

مندرجۂ بالا اشعار سے اقبال کے تصورِ عشق کا ایک اجمالی مگر واضح خاکہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اس خاکے کو جوشؔ کے مذکورہ بالا اشعار سے کوئی نسبت نہیں اور اس لئے ان کی تنقید کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

جوشؔ کو اس کمزوری کا احساس خود بھی پریشان کرتا ہے اور یہی وجہ ہے جو انہوں نے اکثر مقامات پر سنجیدگی کو خیرباد کہہ کر طنز و تشنیع سے کام لیا ہے۔ "نیا ملاّ" کی پھبتی آپ سن ہی چکے ہیں اب اِسی نوعیت کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چڑھے بیٹھے ہیں کب سے آسمانوں پر جہاں والے
زمیں پر لے رہا ہے کروٹیں رازِ جہاں ساقی
چراغِ خانۂ بقراط ہے وہ قافلہ جس نے
قلندر کو بنایا ہے امیرِ کارواں ساقی
بنائے عشق میں یزداں عبائے عقل میں شیطاں
متاعِ اہلِ ایماں ہیں یہ کفر اندیشیاں ساقی

مگر اندازِ بیان کی یہ تلخی بھی انہیں آسودگی بہم پہنچانے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ حریف کی عظمت و بلندی کے سامنے اپنی ناکامی کا احساس انہیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے ؎

خرد کے یاور و انصار ڈھونڈھے سے نہیں ملتے
جنوں کی پشت پر ہے لشکرِ لاانتہا یاں ساقی

یہ غیر شعوری طور پر اعترافِ شکست اور احساسِ کمتری کا اظہار قابلِ عبرت ہے اور "خرد" کا آج تک یاور و انصار سے محروم رہنا اس کی ناکامی اور جنوں کے مقابلہ میں اس کی نااہلیت کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

اب تک ہم نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ عقل و عشق کے متعلق اقبالؔ و جوشؔ کے نظریات یکساں نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ اوّل الذکر

نے عقل کے مقابلہ میں عشق کو ترجیح دی ہے جبکہ موخر الذکر کی کوششیں اس کے برعکس ہیں لیکن اس مسئلہ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ عقل اور عشق کا واضح تصور کیا ہے وہ کیا شے ہے جسے "عقل" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ مفہوم کیا ہے جسے "عشق" بول کر مراد لیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک شارح اقبال کی حسب ذیل عبارت قابلِ غور ہے۔ جس میں عقل اور عشق کے مفہومات کو آسان طریقہ پر سمجھایا گیا ہے۔

"۔۔۔ دنیا میں اشیا کا ادراک کرنے کے دو طریقے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے انسان دو راہ یعنی دو وسیلوں سے کام لیتا ہے ایک طریقہ وہ ہے جسے حواس خمسہ کے مشاہدہ پر مبنی کر دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں کسی شے کا یا کسی حقیقت کا ادراک ہمیں حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے منطق کا فلسفہ کا طریقہ یہی ہے تمام علوم و فنون اسی طریقۂ کار کو استعمال کرتے ہیں طبیعیات سے لے کر مابعد الطبیعیات تک یہی طریقہ کام میں لایا جاتا ہے۔ ہم چکھتے ہیں۔ سونگھتے ہیں۔ سنتے ہیں۔ دیکھتے ہیں اور چھوتے ہیں اور اس طرح اشیاء کا اور اس طرح عقل کے ذریعہ حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو خبر بھی کہتے ہیں منطق بھی کہتے ہیں اور عقل بھی کہتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں حقائق دریافت کرنے کا ایک اور بھی طریقہ ہے اس میں حواس خمسہ ظاہری سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ حواس خمسۂ باطنی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اس دنیا میں کسی چیز کی حقیقت مشاہدے سے نہیں مکاشفے سے کوشش ہوتی ہے۔ اس طریقہ کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے انقا بھی اسے کہتے ہیں کشف بھی اسی کا نام ہے۔ شہود کہہ کر اسی کو پکارتے ہیں۔ وحی اور الہام بھی اسی کے دو نام ہیں۔ بصیرت بھی اسی کو کہتے ہیں اسے طریق نظر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ پہلے طریقہ کی ضد ہے۔ پہلا طریقہ عقل اور بصارت کا ہے۔ دوسرا کشف اور بصیرت کا اسی طریقہ کو اقبال عشق کہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آئیے اب عقل و عشق کی اس تشریح کے بعد جوش کی زیر بحث نظم کا جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ عشق کے بالمقابل عقل کو ترجیح دینے میں انہوں نے کس حد تک "معقولیت پسندی" کا ثبوت دیا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت جوش ایک پیامبر شاعر ہیں۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی کہ وہ نرے شاعر ہی ہیں تو اس میں کلام کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن "پیامبر شاعر" قرار دینے کے لئے ہمیں کسی شاعر کے کلام میں جو کم از کم مطلوبہ خصوصیات تلاش کرنی پڑتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ اس کے سامنے کوئی متعین مقصد ہو اور اپنے اس مقصد پر اُسے پورا پورا یقین بھی ہو۔

۲۔ وہ ژولیدہ فکری اور تضاد بیانی سے پاک ہو اور جو کچھ کہنا چاہتا ہو دلنشین انداز میں صاف صاف اور واضح طور پر کہے۔

۳۔ اس کا مطالعہ بھی سطحی قسم کا نہ ہو۔

بدقسمتی سے جوش میں یہ تینوں خصوصیات موجود نہیں ہیں جس کی شہادت ہمیں ان کی اس زیر بحث نظم سے بھی مل رہی ہے۔

ان کی شاعری نے فنی اعتبار سے جس قدر ترقی کی ہے اسی قدر ان کی ژولیدہ فکری میں اضافہ ہوتا گیا ہے ——— فکر کی یہ ژولیدگی اس وقت سے اور عریاں ہو گئی ہے جب سے وہ "ترقی پسند ادب" کے ہنگاموں سے مرعوب ہوئے ہیں۔ یہاں اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ لفظ "ترقی پسند" سے ہم وہی مفہوم مراد لے رہے ہیں جو اصطلاحی طور پر اس لفظ کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔

اس ترقی پسند ادب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف "محسوسات" ہی پر ایمان رکھتا ہے یعنی اس کے نزدیک "حقیقت" نام ہے صرف اس چیز کا جو محض حواس خمسۂ ظاہرہ سے ہی محسوس کی جا سکے اور ہر وہ حقیقت جو دائرۂ احساسات سے خارج ہو وہ اس کے نزدیک محض ایک "واہمہ" ہے۔

ترقی پسندانہ تجابات کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُسے "ماضی" سے سخت نفرت ہے۔ اگرچہ اب اس رجحان کی غلطی خود ترقی پسندوں کو بھی محسوس ہو چکی ہے لیکن کچھ دنوں تک ترقی پسندی کا مفہوم یہی رہ گیا تھا کہ ماضی کی ہر نیک و بد چیز سے بغاوت کی جائے۔

تیسری نمایاں چیز جو ترقی پسند ادب کا اب بھی طرۂ امتیاز ہے وہ خدائی تصور "مذہب" مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کا مضحکہ اڑانا ہے۔

جوش کی موجودہ نظم میں آپ کو یہ تمام باتیں پوری طرح ملیں گی۔

مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الٰہ و اہرمن، مرغ و سلیماں آدم و حوّا
مقدس واہموں کی دیکھ تو خلاقیاں ساقی
تصور ہو لتا ہے ایک جسم نازنیں بن کر
معاذ اللہ فریب نفس کی پرچھائیاں ساقی
روایات کہن کی آستیں تنگ چھننے کو
رخ افکار پر ڈالی گئی ہیں جھرّیاں ساقی

"الٰہ واہرمن، مرغ وسلیماں، آدم و حوّا" حضرت جوشؔ کے نزدیک یہ ساری چیزیں "مقدس واہموں" کی تخلیقات ہیں۔ "فریب نفس کی پرچھائیاں" ہیں۔ "روایات کہن" ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ماضی کی پیداوار ہیں۔ اور بس اس لئے غلط ہیں

چونکہ نظم زیر بحث میں شاعر نے "عقل و معقولیت" کو عشق و مجذوبیت پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے اس لئے ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان "روایات" کو سرے سے پیر تک واہمہ قرار دینے کے لئے کوئی عقلی بنیاد بھی موجود ہے یا نہیں؟ لیکن نظم ایسی عقلی بنیادوں سے بالکل تہی دامن ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ خود شاعر کا ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کرتا اس لئے اس نے انہیں غلط اور "واہمہ" قرار دے دیا ہے۔ لیکن کسی حقیقت کا اپنی فہم اور اپنے دائرۂ فکر میں نہ سمانا کیا اس بات کی دلیل ہو سکتا ہے کہ سرے سے اس حقیقت کا وجود ہی نہیں ہے؟ حقائق کا اس طرز استدلال کی بنا پر انکار کرنا "روشن خیالی" تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن "غور و فکر" کا نتیجہ نہیں ہو سکتا اور معقولیت ہی سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یہ مانا سخت پیاسا ہوں مگر آنکھیں نہیں پھوٹیں
کہوں کیونکر سراب مردہ کو آب رواں ساقی

اس شعر کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ "فریب نفس کی پرچھائیوں" اور "مقدس واہموں کی خلاقیوں" سے دامن چھڑا لینے کے بعد بھی شاعر کی تشنہ لبی ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس "سخت پیاسا ہوں" سے شدت تشنگی ہی کا اظہار ہو رہا ہے۔ حالانکہ "ان مصیبتوں" سے نجات حاصل کر لینے کے بعد تو اس سخت پیاس کا خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا۔ علامہ اقبال نے غالباً کسی ایسے ہی موقع کو ذہن میں رکھتے ہوئے عقل و دل کے مکالمے میں دل کی زبان سے یہ شعر کہلایا تھا کہ

علم کی انتہا ہے بیتابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

"سخت پیاس" کی حالت میں قدرتاً انسان کی بے چینی بسا اوقات اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس کا دماغی توازن برقرار نہیں رہتا اور وہ جھنجھلا اٹھتا ہے۔ ہمیں جوشؔ کے اس شعر میں ان کی اسی فطری جھنجھلاہٹ کا عکس نظر آتا ہے۔

حالت تشنگی میں شاعر کو "آب رواں" کی یقیناً ضرورت تھی مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ "الٰہ و اہرمن" کو مقدس واہموں کی تخلیق قرار دیتے دیتے خود اس کا واہمہ اتنا تیز ہو گیا ہے کہ "آب رواں" بھی اسے "سراب مردہ" ہی نظر آتا ہے۔

"آب رواں" کو "سراب مردہ" کہنے کے لئے کسی "عقلی" دلیل کے بجائے صرف جذبات ہی سے کام لیا گیا ہے "مگر آنکھیں نہیں پھوٹیں" یہ ٹکڑا جہاں زور کلام اور جذباتی شدت کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے وہیں اس نے شاعر کی جھنجھلاہٹ کو بھی صاف طور پر نمایاں کر دیا ہے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ عقل و عشق اور فکر و وجدان میں شاعر نے عقل و فکر کو ترجیح دی ہے۔

کسے سمجھاؤں کن الفاظ میں اور کس توقع پہ
کہ نور عقل سے روشن ہے یہ سارا جہاں ساقی
کہ دانش صرف دانش ہے لباس مردم کامل
کہ حکمت صرف حکمت ہے کلاہ مقبلاں ساقی
دیار عشق آزاد ایک منڈی ہے شراروں کی
فراز عقل پر ہے ماہ و پروین کی دوکاں ساقی

اس کے برعکس اہل عشق و وجدان پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

تھکے جب غور کرنے سے تو شاخ فکر سے کٹ کر
بنایا قبۂ وجدانیت پر آشیاں ساقی
کبھی تو نگے ستاروں سے نہ یوں سرگوشیاں کرتے
سمجھ سکتے اگر احباب ذرّوں کی زباں ساقی

ان اشعار سے ہمیں شاعر کا ایک متعین مقصد معلوم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے نزدیک کاروبار عالم کے لئے صرف عقل و فکر کی ضرورت ہے اور عشق و وجدان نام ہے "عدم تفکر" نادانی اور حماقت کا۔ اگر شاعر نے اسی پر اکتفا کی ہوتی تو کم از کم تضاد بیانی اور ژولیدگی فکر سے آپ ضرور نجات مل جاتی لیکن مندرجۂ ذیل اشعار نے آپ سے ان چیزوں سے محفوظ نہیں رہنے دیا۔

بہت کم لوگ واقف ہیں کہ عشقِ پختہ و بالغ
نہالِ عقل کی ہے ایک شاخِ مے چکاں ساقی
خوشی سے آتشِ نمرود میں جو عشق کودا تھا
اُسے حاصل تھی علم و عقل کی تاب و تواں ساقی

یہاں عشق کی تعریف بھی کردی گئی جو بہر حال نظم کے مرکزی خیال سے تضاد رکھتی ہے۔ "نہالِ عقل کی ہے ایک شاخِ مے چکاں ساقی" حیرت ہوتی ہے کہ عقل کس طرح قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی جا رہی ہے۔ جہاں تک اصلی عشق کا تعلق ہے وہ وہی ہے جسے شاعر نے "عشقِ پختہ و بالغ" کہہ کر اسے عقل کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ اگر عشقِ پختہ و بالغ "فی الحقیقت نہالِ عقل کی "ایک شاخ" ہی ہے تو پھر ان دونوں میں دوئی کہاں؟۔ اور اتنی کاوشیں کس لئے؟ اس کے علاوہ عشق کو شاخ ہی نہیں بلکہ "شاخِ مے چکاں" کہہ کر شاعر نے نادانستہ طور پر عقل کی تمام قسموں پر اس کو ترجیح دیدی ہے۔ معمولی عقل کا فتویٰ بھی یہی ہو سکتا ہے کہ کسی درخت (نہال) کا بہترین اور سب سے زیادہ قابلِ قدر حصہ اس کی وہی شاخ ہے جس سے "مے چکانی" ہو رہی ہو۔ لہذا اگر عقل اور عشق میں وہی نسبت ہے جو کسی درخت اور اس کی شاخِ مے چکاں میں ہوتی ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل کے مقابلہ میں عشق کو اتنی ہی فضیلت حاصل ہے جتنی درخت کے مقابلہ میں شاخِ مے چکاں کو،

شاعر کی ژولیدگیٔ فکر کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا سلسلہ ابھی اور چلتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

قیامت ہے کہ اب بھی اس خراباتِ مسائل میں
نئی دھج سے پرانا عشق ہے پیرِ مغاں ساقی

"پرانا عشق" جسے حضرت اقبال نے اپنایا ہے وہ تو وہی عشقِ پختہ و بالغ ہے جو خوشی سے "آتشِ نمرود میں" کود پڑا تھا لہذا شاعر کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ اس خراباتِ مسائل میں وہی پیرِ مغاں بنا ہوا ہے لیکن بجائے خوش ہونے کے وہ پرانے عشق پر اس طرح برستا ہے۔

وہی عشقِ سبک سر عقل کی جو جیرے ضد ہے
جسے مطلق نہیں اندازِ سود و زیاں ساقی

اتنی صاف تضاد بیانی جوشؔ عقل ہی کا تقاضا ہو سکتی ہے۔
علامہ اقبال نے آتشِ نمرود میں کودنے والے عشق ہی کو اپنا پیرِ مغاں بنایا ہے جس کا کام اندازِ گلستاں پیدا کرنا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اور جوشؔ کے نزدیک بھی اسی عشق کو "علم و عقل کی تاب و تواں" حاصل تھی اور نہالِ عقل کی شاخِ مے چکاں بھی وہی ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آتشِ نمرود میں کودنے والا عشق نہ صرف یہ کہ "پرانا" ہی ہے بلکہ یہ وہی ہے جس نے "گونگے ستاروں سے باتیں کی تھیں" اور "تبۂ وجدانیت" پر بھی اپنا آشیاں بنایا تھا یہی وہ عشق تھا "جس کے ایک اشارے پر" ایک نوجوان نے اپنی گردن خود پیش کردی تھی لہذا اگر اس عشق کا یہ کام غلط تھا تو پھر وہ بھی مندرجہ ذیل شعر کا موصوف بن جاتا ہے۔ یعنی ؎

وہی عشقِ غلط انگیز جس کے اِک اشارے پر
خوشی سے زہر کھا لیتے ہیں لاکھوں نوجواں ساقی

اگر آتشِ نمرود میں کودنے والا عشق جوشؔ کے نزدیک پسندیدہ ہے تو انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس عشق کی پشت پر "لشکرِ لاہوتیاں" بھی تھا اور اس کا دامن "الٰہ و اہرمن" اور "آدم و حوا" کی روایات سے بھی آلودہ تھا۔ اب یا تو انتہائی بیباکی اور پندارِ ہمہ دانی کے ساتھ آتشِ نمرود میں کودنے والے عشق کی ان خصوصیات ہی سے انکار کر دیا جائے یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ شاعر تضاد بیانی کا شکار ہو گیا ہے اور "عقل" کی زبان سے غیر شعوری طور پر ایک انتہائی "غیر معقول" بات نکل گئی ہے۔

خوشی سے آتشِ نمرود میں جو عشق کودا تھا
اُسے حاصل تھی علم و عقل کی تاب و تواں ساقی

مطلب یہ ہوا کہ آتشِ نمرود میں کودنے والے عشق کو اس فعل پر ابھارنے والی طاقت علم و عقل کی پیدا کردہ تھی یعنی آگ میں کودنے کا فتویٰ "عشق" نے نہیں بلکہ "عقل" نے دیا تھا لیکن کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر اگر عقل سے استصواب کیا گیا ہوگا تو اس نے صرف دو ہی جواب دیئے ہونگے۔

۱۔ یہ کہ آگ میں کود جاؤ اور جل جاؤ یا
۲۔ کود جاؤ جلو گے نہیں

لیکن یہ دونوں باتیں عقل کے خلاف ہیں اور اگر ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ آتشِ نمرود میں کودنے والے عشق کو تاب و تواں عطا کرنے والی عقل اتنی غیر معقول ہو جائے کہ خود اپنے خلاف غلط فیصلہ صادر کرنے لگے۔

تضاد بیانی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

اہلِ وجدان پر طنز کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ؎

کبھی گونگے ستاروں سے نہ یوں سرگوشیاں کرتے
سمجھ سکتے اگر احباب ذرّوں کی زباں ساقی

یعنی احباب (اہلِ وجدان) سخت احمق اور ناسمجھ ہیں کہ ذرّوں کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اور وہ ان ستاروں سے سرگوشیاں کرتے چلے جاتے ہیں جو "گونگے" ہیں۔

لیکن عقل کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہونے لگتا ہے کہ ؎

دیارِ عشق آزاد ایک منڈی ہے شراروں کی
فرازِ عقل پر ہے ماہ و پروین کی دوکاں ساقی

اگر یہ صحیح ہے کہ "شراروں" کے مقابل میں "ماہ و پروین" کی خریداری ہی دانشمندانہ فعل ہے تو پھر مذکورہ بالا احباب یہی تو کر رہے ہیں۔ اگر وہ ستاروں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں تو کیا "پروین" ستاروں سے الگ کوئی چیز ہے؟

پھر ارشاد ہوتا ہے ؎

چڑھے بیٹھے ہیں کب سے آسمانوں پر جہاں والے
زمیں پر لے رہا ہے کروٹیں رازِ جہاں ساقی

اگر "جہاں والوں" کا یہ کام غلط ہے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ بغیر "آسمان پر چڑھے ہوئے" "ماہ و پروین" کی دوکان تک پہنچنے کی آخر کیا صورت ہو سکتی ہے؟

جہاں تک مطالعۂ اشیاء کی سطحیت کا تعلق ہے وہ تو بری طرح اس نظم میں نمایاں ہیں۔ ساتھ ہی اس "معقولیت پسندی" کے ادعا کے باوجود شاعر سے غیر شعوری طور پر جس غیر معقولیت کا اظہار ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

حدیثِ عقل کی آواز کانوں تک نہیں آتی
وہ شورش ہے درونِ حلقۂ روحانیاں ساقی
یہ چرچے ہیں وہاں عرشِ بریں سے نور اترتا ہے
تھرکتے ہیں ڈھولک پر جہاں درویشیاں ساقی
انھیں کیا غم جو اک جست میں جاتے ہیں مولا تک
کہ صد ہا سال میں کھلتا ہے اک سرِّ نہاں ساقی

ان اشعار میں بظاہر تو اہلِ مذاہب پر زیادہ تر سے لفظوں میں

اہلِ وجدان و عشق کی ناپسندیدہ حرکات اور ان کے غیر معقول طرزِ عمل پر تنقید کی گئی ہے جو کسی حد تک صحیح ہے لیکن یہ بالکل ایک سطحی اور غیر معقول بات ہوگی کہ اہلِ مذاہب کی ناپسندیدہ حرکات کی بنا پر خود مذاہب ہی کو کوسنا اور گردن زدنی قرار دینا شروع کر دیا جائے۔

مذاہب کے ساتھ ترقی پسند ادب کی اس غیر معقول روش میں حضرت جوشؔ بھی برابر کے شریک ہیں۔

نہ جانے بربطِ حکمت پہ کب مضراب دوڑے گی
ابھی تو حکمراں ہے شورِ ناقوس و اذاں ساقی

"حلقۂ روحانیاں" کی "شورش" اور "ڈھولک پر درویشیوں کا تھرکنا" بیشک غیر پسندیدہ اور قابلِ مذمت کام ہے جسے جتنا بھی برا کہا جائے کم ہے اور اس حد تک شاعر سے ہمارا بھی اتفاق ہے لیکن ان مظاہر کو دیکھ کر "ناقوس و اذاں" ہی سے بیزاری کا اظہار کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کھیتوں کو سیراب کرنے والے کسی چشمے کو محض اس بنا پر خشک کر دینا چاہے کہ اس چشمے سے کھیتوں کو نقصان پہنچانے والے اور خود چشمے کو گدلا کر دینے والے جانور بھی سیراب ہوتے ہیں۔

وہاں اک جرم ہے انفاسِ حکمت کی گہرباری
جہاں گونجا ہوا ہے حرفِ ایماں کا دھواں ساقی
قبائے عشق میں پردہ ہائے عقل میں شیطاں
متاعِ اہلِ ایماں ہیں یہ کفر اندیشیاں ساقی

ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون سا "ایماں" ہے جو "انفاسِ حکمت کی گہرباری" کو جرم قرار دیتا ہے۔ اگر پس منظر میں شاعر کے سامنے تاریخِ مغرب کا وہ دور ہے جس میں مذہبی ٹھیکہ داروں نے محض اس بنا پر علم و حکمت اور سائنس کے خلاف محاذ قائم کیا تھا کہ ان کا ذاتی اقتدار برقرار رہے تو مطالعہ تاریخ کا یہ غلط نتیجہ ہے۔ اس دور میں مذہبی گروہ نے جو زیادتیاں کی تھیں ان کا مذہب اور مذہبی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر شاعر فی الحقیقت "غور و فکر" کا عادی ہے تو اسے دقتِ نظر سے کام لے کر یہ معلوم کرنا چاہیے تھا کہ ان اہالیانِ مذاہب کا طرزِ عمل تعلیماتِ مذہب کے مطابق تھا یا مخالف؟ — اگر مذہبی تعلیم ہی ایسی تھی تب تو اس کا استنتاج صحیح ہو سکتا ہے لیکن اگر واقعہ اس کے برعکس ہوا اور نام نہاد مذہبی گروہ کا رویہ مذہب کے بالکل خلاف نظر آئے تو پھر اس میں مذہب کا کیا قصور ہے

جو اُسے دوش دیا جائے۔

وہاں اِک جرم ہے انفاسِ حکمت کی گہر باری
جہاں گونجا ہوا ہے حرفِ ایماں کا دھواں ساقی
یہ کیسی تیرہ بختی ہے کہ بے خوف و خطر اب بھی
یقیں کے شیشۂ دم مرمر پہ رقصاں ہے گماں ساقی

اِن دونوں اشعار پر غور کیجئے تو ایک عظیم الشان تضاد نظر کے سامنے آجائے گا۔ پہلے شعر میں شاعر کا دعویٰ ہے کہ "انفاسِ حکمت کی گہر باری" اس مقام پر جرم ہے جہاں "حرفِ ایماں کا دھواں گونجا ہوا ہے"۔ یعنی جس مقام پر "ایمان" ہوتا ہے وہاں "علم و حکمت" نہیں ہوتے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ایک "صاحبِ ایمان" آدمی "صاحبِ علم و حکمت" نہیں ہو سکتا۔ اور اسی طرح ایک عالم اور حکیم انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحبِ ایمان نہ ہو

پھر دوسرے شعر میں اس امر کی شکایات کی جاتی ہیں کہ "یقین" کے "شیشۂ دم مرمر" پہ گماں "رقص کر رہا ہے" یعنی یہ حد درجہ قابلِ افسوس بات ہے کہ ابھی تک "یقین" کے ساتھ ساتھ "گماں" بھی موجود ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ابھی تک اہلِ یقین وہم و گماں کے چکر میں مبتلا ہیں۔

اگر ان اشعار میں ہر لفظ اسی مفہوم کے ساتھ استعمال ہوا ہے جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہے تو "ایمان" اور "یقین" بالکل قریب المفہوم الفاظ ہوں گے اور پھر تضاد بیانی پوری طرح نمایاں ہو جائے گی۔ اگر "اہلِ ایمان" پر انفاسِ حکمت کی گہر باری کو جرم قرار دینے کا الزام درست ہے تو پھر "اہلِ یقین" کا مبتلائے گماں ہونا قابلِ افسوس نہ ہونا چاہئے کیونکہ قربِ مفہوم کی بنا پر ایمان و یقین میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ کسی شے پر ایمان لانے کا مطلب یہی تو ہے کہ ہمیں اس شے کا یقین ہے اس لئے جو "اہلِ ایمان" ہو گا لازمی طور پر اسی کو "اہلِ یقین" بھی کہا جائے گا ایسی صورت میں "اہلِ ایمان" کو مجرم اور "اہلِ یقین" کو مظلوم قرار دینا ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔

اس تضاد کو اسی وقت دُور کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسرے شعر میں "گمان" کو اس مفہوم میں استعمال کیا جائے جس مفہوم میں پہلے شعر کے اندر "ایمان" کا استعمال ہوا ہے۔ لیکن "ایمان" کو "یقین" کے بجائے "گمان" کے مفہوم میں استعمال کرنا جہاں ایک طرف معنوی تحریف ہے وہیں اس سے شاعر کے لاشعور کی وہ فطری کمزوری بھی ظاہر ہو جاتی ہے جو خالقانہ جذبے کے ماتحت الزام تراشی کی دُھن میں جائز و ناجائز کے حدود سے تجاوز ہو جاتی ہے۔

بہرحال اگر اس دوسری شکل کو اختیار کیا بھی جائے تو پھر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں "ایمان" کے برعکس جس "یقین" کا تصور موجود ہے اُسے واضح نہیں کیا گیا ہے۔ آخر اس "یقین" کی وہ بنیادیں کیا ہیں جو اُسے "ایمان" سے ممتاز و مختلف کر دیتی ہیں؟ — شاعر اگر ایمانیات کے حلقے سے نکل جانا ہی پسند کرتا ہے تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں مگر اس سوال کا حق تو ہر ایک کو باقی رہتا ہے کہ آخر شاعر نے وہ کون سے "یقینیات" پائے ہیں۔ جن کی بنا پر اس کے نزدیک "حریفِ ایمان" محض "رقصِ گمان" بن کر رہ گیا ہے اور پھر خود اس کے پاس بھی وہ کون سے دلائل ہیں جن کی بنا پر اسکے "تعقلیات" کو بھی "محض وہم و گمان" قرار نہیں دیا جا سکتا؟

کبھی گونگے ستاروں سے یوں سرگوشیاں کرتے
سمجھ سکتے اگر احباب ذرّوں کی زباں ساقی

اس شعر میں اہلِ عشق و وجدان پر جس دلیل کے سہارے طنز کیا گیا ہے اس کی بنیاد خود مضحکہ انگیز ہے آخر یہ کس طرح فرض کر لیا جائے کہ ذرے تو صاحبِ زبان ہوتے ہیں مگر ستاروں کی زبانیں نہیں ہوتیں۔ اگر شاعر کو اپنے احباب سے یہ شکایت ہے کہ وہ صاحبِ زبان (ناطق) ذروں کی زبان نہیں سمجھتے اور گونگے ستاروں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں تو اُسے ستاروں کے گونگے (غیر ناطق) ہونے اور ذرّوں کے ناطق ہونے کی دلیل بھی پیش کرنی چاہئے۔ ورنہ جس طرح اس کے نزدیک ذرّوں میں نطق پایا جاتا ہے ——

—— اسی طرح

ہو سکتا ہے کہ احباب کے نزدیک ستاروں میں بھی نطق موجود ہو۔ اور پھر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جس طرح حضرت جوش کے احباب "ذرّوں کی زبان" نہیں سمجھ سکے اسی طرح یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حضرت جوش نے ستاروں کی زبان نہ سمجھنے ہی کی بنا پر انہیں گونگا قرار دے دیا ہو۔

اور اگر ستاروں کی طرح ذرّے بھی غیر ناطق ہی ہیں تو وہ بھی گونگے ہی ہوئے پھر دونوں میں مابہ الامتیاز کونسی چیز ہے کہ ایک گونگے کی زبان سمجھنے کی ہدایت کی جا رہی ہے اور دوسرے گونگے سے سرگوشی پر ملامت۔

شاید حضرت جوش کا منشا یہ ہے کہ کائنات ارضی کی مادی اشیاء سے ہی آشنا ہونا چاہئے اور فلکیات سے اعراض کرنا چاہئے۔ تو گزارش ہے کہ یہ صورت حال عقل کے لئے سخت توہین کا باعث ہو گی۔

پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی غرض ستاروں اور ذرّوں سے عالم لاہوت اور عالم ناسوت ہو اور یہ بتانا ہو کہ عالم ناسوت جس سے ہمارا جسمانی لگاؤ ہے

ہم کو اسی کا ہو کے رہنا چاہئے یہی عقل کا تقاضا ہے تو یہ عقل کی درماندگی کی بدترین شکل ہوگی اور اگر یہ بتانا مقصود ہے کہ عالم لاہوت کوئی چیز نہیں ہے تو پھر اس کے درپے کیوں ہوا جائے۔

دیارِ عشقِ آزاد ایک منڈی ہے شراروں کی
فرازِ عقل پر ہے ماہ و پروین کی دوکاں ساقی

"عشقِ آزاد" بتا رہا ہے کہ کوئی عشقِ مقید بھی ہے جس کی "منڈی" ان دونوں مذکورہ "منڈیوں" سے الگ ہونی چاہئے۔ اس کی تفصیلات بہرحال شاعر ہی بتا سکتا ہے اور اس کے نتائج سے بھی اسی وقت بحث ممکن ہے اور اگر عشقِ آزاد عام عشق کا لقب ہے تو شاعر کے ممدوح عشق کا کیا حال ہوگا اس کو بھی شراروں ہی کی منڈی کہا جائے گا یا کچھ اور؟ یہ بھی امکان ہے کہ "شراروں" سے ضرر و نقصان اور "ماہ و پروین" سے نفع و بہتری مراد ہو لیکن اس سے بھی تضاد دور نہیں ہوتا۔

غریب شہر ہوں گوش و زباں سے کام لوں کیونکر
نہ کوئی دیدہ ور ساقی نہ کوئی نکتہ داں ساقی

اس شعر میں اگر لف و نشر مرتب تسلیم کی جائے تو "گوش" کیلئے "دیدہ ور" اور "زبان" کے لئے "نکتہ داں" کی ترتیب بنتی ہے۔ اس طرح زبان سے کام لینے کے لئے "نکتہ داں" کی ضرورت تو سمجھ میں آتی ہے لیکن "گوش" سے کام لینے کے لئے "دیدہ ور" کی ضرورت کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

وہاں اک حرم ہے انفاسِ حکمت کی گہر باری
جہاں گونجا ہوا ہے حرفِ ایماں کا دھواں ساقی

"دھواں گونجنا" ایک عجیب بات ہے، دھواں پھیلنا بھرتا اور چھاتا تو سنا ہے مگر گونجتا نہیں۔

کہ دانش صرف دانش ہے لباسِ مردمِ کامل
کہ حکمت صرف حکمت ہے کلاہِ مقبلاں ساقی

"دانش صرف" میں تمام حشو ہونے کے علاوہ "ہی" کی عدم موجودگی ایک قادرالکلام شاعر کے لئے نا پسندیدہ ہے۔ "مردمِ کامل" کی ترکیب بھی ترقی پسندانہ ہی ہے۔

روایات کہن کی آستینیں تنگ جیسے کہ
رخِ افکار پر ڈالی گئی ہیں جھریاں ساقی

"جھریوں" کی مناسبت سے "رخ" کے بجائے چہرے کا استعمال بہتر تھا۔

اس کے علاوہ "جھریاں ڈالنا" غلط محاورہ ہے۔ جھریاں ڈالی نہیں جاتیں بلکہ پڑ جاتی ہیں۔

وہی ما آستانے آگہی عشقِ جنوں پرور
لئے پھرتا ہے اک مدت سے جو تیر و کماں ساقی
وہی عشق و جنوں جس کی بدولت و پرستی میں
بجاتی ہے تمنا گھنٹیوں پر گھنٹیاں ساقی

پہلے شعر میں "عشقِ جنوں پرور" کا ٹکڑا استعمال ہوا ہے جس میں عشق موصوف اور "جنوں پرور" اس کی صفت ہے لیکن دوسرے شعر میں "عشق و جنوں" حرفِ عطف کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں اگر اس جگہ یہ دونوں مستقل بالذات ہیں تو پھر "جس کی بدولت" کے بجائے "جن کی بدولت" ہونا چاہئے اور اگر حرفِ عطف کو کتابت کی غلطی تسلیم کر لیا جائے تو "عشق و جنوں" کا ٹکڑا "عشقِ جنوں" ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلا اعتراض تو دور ہو جاتا ہے۔ مگر سیاق و سباق کی کے لحاظ سے ترکیب سمجھ میں نہیں آتی ہے

لباسِ عشق میں وہ ضبط ہے یہ کون سمجھے گا
نہیں جس عشق کی دستِ فراست میں عناں ساقی

یہ شعر نہیں بلکہ چیستاں ہے جس میں صلہ و موصول کو تلاش کرتے رہئے۔

تھکے جب غور کرنے سے تو شاخِ فکر سے کٹ کر
بنایا قبۂ وجدانیت پر آشیاں ساقی

"وجدانیت" کے بجائے صرف وجدان کافی تھا۔ یہ غلط ہے کہ اہلِ عشق غور و فکر سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے تو ان اعلیٰ مدارج کو طے کیا ہے کہ آج بھی دنیا ان کی تقلید کو فخر تصور کرتی ہے۔ البتہ اس ترقی پسندانہ اور لاطائل غور و فکر سے وہ ضرور "محروم" تھے جو وجدان و ضمیر کی رہنمائی کے خلاف ہوتا تھا کیونکہ ان کا وجدان روشن اور ان کا ضمیر زندہ تھا اور وہ ترقی معکوس کو عین ترقی قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے

یہ ہند و پاک کیا کل ایشیا اک خواب آبا ہے
یہ تیرا جوشِ بیداری کو لے جائے کہاں ساقی

"پاک کیا کل" جو "پاک کا کل" ہو گیا ہے بری طرح تنافرِ صوتی کا شکار ہے اس کے علاوہ معنوی اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو بقول شاعر صرف ایشیا ہی وہ مقام ہے جو "خواب آبا" بنا ہوا ہے لہٰذا اگر اس "خواب آبا" میں "بیداری جوش" کو کوئی مقام نہیں حاصل ہو رہا ہے تو اس پر افسوس اور ساقی سے شکایت کی ضرورت نہیں ہے۔ یورپ، امریکہ اور افریقہ وغیرہ میں

قسمت آزمائی کرنی چاہئے ممکن ہے کہ ان بیدار ممالک میں شاعر کی بیداری کی قدر ہونے لگے۔

لیکن یہ منطق ناقابلِ فہم ہے کہ چونکہ سارے کا سارا ایشیا خواب آبا میں مبتلا ہے اس لئے شاعر کو اپنی بیداری کا مصرف ہی نہیں مل رہا ہے حالانکہ بیداری کی ضرورت دراصل سب سے زیادہ وہیں ہے جہاں خواب آبا نے قیصر جبار کھا ہو۔ جو خود بیدار ہیں انہیں پیغام بیداری دینا ایک کارِ عبث ہے اور اسی طرح جو "خواب" میں مبتلا ہیں انہیں اسی حال میں چھوڑ کر بیداری کا دوسرا مصرف تلاش کرنا "فراریت" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ چراغ کی روشنی تو رات کی تاریکی ہی کے لئے ہوتی ہے نہ کہ دن کی روشنی کے لئے۔ جو شخص اپنے چراغ کی روشنی سے رات کی تاریکی کا علاج نہیں کرتا بلکہ تاریکی پہ غضبناک ہو کر اپنے چراغ کو دن کی روشنی میں روشن کرنا چاہتا ہے اس کا دماغی توازن اور اس کے طرزِ عمل کی جدت یقیناً قابلِ داد ہوگی۔ کیا واقعتاً کسی صاحبِ عقل" اور "بیدار" انسان کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے؟ اور کیا "ماہ و پروین" کی بلندی پر رہنے والی "اونچی دوکان" والی "عقل" ایسے ہی "صاحبانِ عقل" کو جنم دیتی اور ایسے ہی پھیکے پکوان پیش کرتی ہے۔

بہرحال نظم کا جوش و خروش، روانی و تسلسل، الفاظ کا دروبست اور تلمیحات کا استعمال وغیرہ بعض ایسی خصوصیات ہیں۔ جنہوں نے معنوی عیوب پر بہت حد تک پردہ ڈال رکھا ہے۔ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے نظم کا درجہ اتنا ہی بلند ہے جتنا حقیقت پسندانہ اعتبار سے مضحکہ انگیز۔

اقبال کو میدان سے ہٹا کر سالارِ قافلہ بننے کی امکانی کوشش تو ضرور کی گئی ہے۔ مگر اقبال اتنا بلند ہو چکا ہے کہ ہر کس و ناکس کا اس تک پہنچ جانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

جمہوریت اور پاکستان

اگر یہاں (پاکستان میں) کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگان ملک کی نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں "جمہوریت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے۔ اس پر عام لوگوں کا مطمئن رہنا بہرحال ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے سب یا اکثر باشندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔ ایسے نظام سے اگر دلچسپی ہو سکتی ہے تو اس طبقے کو ہو سکتی ہے جس کی مرضی اس میں غالب ہو۔ اور ایک محدود طبقے کی دلچسپی نہ صرف یہ کہ کسی ملک کی فلاح و بہبود کی ضامن نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عام لوگوں کی دلچسپی کی ضد ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ تضاد ایک کشمکش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اس نقصان دہ صورت حال میں مبتلا ہونے سے ملک کو بچانا ضروری ہے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں پہلے جمہوریت کے اصول کو صدق دل سے قبول کر لیں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں جس میں یہ اصول ٹھیک ٹھیک کارفرما ہو۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جبکہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو۔ ذہنی انتشار موجود ہو۔ اخلاق کمزور ہوں۔ اور ایسے عناصر کارفرما ہوں جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں۔ لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عظیم ترین حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مگر تجربات کی درس گاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آ جائے کہ اب اپنے بھلے برے کی ذمہ دار وہ خود ہے اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلہ پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی لیکن صحیح طریقہ پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے۔ اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور پیدا کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لئے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی مضرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو۔ خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹر شپ، یا اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں۔ اور جب ان حالات کے ردّ و بدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی رائے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے سوا اور جتنے

بھی نقائص ہوں۔ انہیں اس نقصانِ عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے۔

پچھلے چند سال میں پاکستان میں جو حالات پیش آئے ہیں انہیں اس بات کی دلیل ٹھیرایا جاتا ہے کہ یہاں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ اور مختلف قسم کی متبادل صورتیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ یہاں جمہوریت تو ضرور ہونی چاہئے مگر اسے قابو میں رکھنے والی ایک بالاتر طاقت بھی ضروری ہے جو اس کو بگڑتے دیکھ کر درست کر دیا کرے اور کوئی یہ پردہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا اور صاف کہتا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی جمہوریت سے ایک خیر اندیش اور مستعد آمریت بدرجہا بہتر ہے لیکن اگر ٹھنڈے دل سے اُن تمام حالات پر غور کیا جائے جو اب تک یہاں پیش آئے ہیں تو کسی صاحبِ بصیرت کے لئے یہ بات سمجھنی مشکل نہ ہو گی کہ یہاں جو چیز ناکام ثابت ہوئی ہے وہ جمہوریت تھی ہی نہیں جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی و ملکی معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ سیکھ کر اپنی غلطیوں کی خود تلافی کرتے چلے جائیں۔ یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہو اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آ جائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلّم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ یہاں تو جو چیز قایم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمرت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اب اگر اس کے بُرے نتائج سامنے آ گئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے۔ اور اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اُسے کسی نقاب پوش یا بے نقاب آمریت کے حق میں دلیل ٹھیرایا جائے۔

یہ تھی استدلال کی غلطی اب رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں۔ تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پُرامن طریقے ہی سے قائم ہو بہرحال پُرامن طریقے سے دفع نہیں ہو سکتی۔ اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداءً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو جمہوری نمایندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہ آیا وہ آمریت کے اُن نتائج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جو بہرحال اس کے فطری نتائج ہیں؟ آمریت خواہ کتنی ہی خیر اندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے، اس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں۔ اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردّ و بدل کسی کھلے کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے۔ جنہیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر متصرف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت دلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لئے حرکت میں آ سکے۔ اس کا آغاز چاہے کتنی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔ مگر خلاصی کے جتنے پُرامن راستے ہوتے ہیں وہ انہیں چن چن کر بند کر دیتی ہے۔ اور مجبوراً ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزلِ خیر پر پہنچے دیتے ہیں۔

اِن نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی کسی نوع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دے گا۔ خواہ آمریت کا وہ مقام خود اسی کو کیوں نہ حاصل ہو رہا ہو۔

اب اگر شرح صدر کے ساتھ یہ طے کیا جائے کہ ہمارے ملک کا نظام جمہوری ہی ہونا ہے تو اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ہم جمہوریت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ اختیار کریں اور اس میں آمریت کے لوازم و خصائص کی آمیزش نہ کریں کیونکہ اس کے بغیر جمہوریت صحیح طریقے پر کام نہیں

کرسکتی۔ ۔ وہ نتائج دکھا سکتی ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ اس غرض کے لئے ہمیں جمہوریت کے ساتھ پانچ مزید اصولوں پر بھی اتفاق کرنا ہوگا۔

اوّل تقسیم اختیارات کا اصول۔ یعنی ریاست کے تین شعبوں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے دائرۂ اختیار کا واضح طور پر الگ ہونا۔

دوم۔ شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی ضمانت۔ اور عدلیہ کا ان کے تحفظ پر قادر ہونا۔

سوم۔ انتخابات کی آزادی اور اس کی حفاظت کے لئے ایسی قانونی و انتظامی تدابیر جن سے یہ اطمینان ہو سکے کہ انتخابات کے نتائج فی الحقیقت رائے عام کے مطابق نکل سکیں گے۔

چہارم۔ قانون کی حکمرانی۔ یعنی یہ امر کہ راعی و رعایا کے لئے ایک ہی قانون ہو۔ اور سب اس کے پابند ہوں۔ اور عدالتوں کو یہ حق ہو کہ سب پر بے لاگ طریقے سے وہ اس کو نافذ کر سکیں۔

پنجم۔ ملازمین حکومت کا خواہ وہ سول سروس سے تعلق رکھتے ہوں یا فوج سے، سیاست میں دخیل نہ ہونا اور ہر اس حیثیت حاکمہ کی اطاعت قبول کرنا جسے باشندوں کی اکثریت آئینی طریقے پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔

یہ پانچوں اصول ایک جمہوری نظام کے ایسے لوازم ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے۔ یا ساقط نہ بھی ناقص ہی کر دیا جائے۔ تو جمہوریت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور پھر وہی خرابیاں ظاہر ہو کر رہتی ہیں جو کسی نہ کسی نوع کی بے نقاب یا نقاب پوش آمریت سے رونما ہوا کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ملک کے انتظامی فرماں رواؤں کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ وہ کسی وقت جمہور کے نمایندوں کو رخصت کر کے خود ہی حکومت بھی کرنے لگیں اور خود ہی اپنی مرضی کے قوانین بھی بنا لیں۔ تو اس میں اور کھلی بادشاہی و آمریت میں آخر کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اور اس طرح جمہوریت کے نام سے فریب کاری کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ یا اگر انتظامی فرماں رواؤں کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ وہ عدالتوں کے ضمیر اور ان کی قدرتِ انصاف پر اثرانداز ہو سکیں تو اس حالت میں اور مطلق العنان جباری میں آخر کیا وجہ امتیاز ہے؟ ایک جابرانہ انتظام میں بھی تو یہی قباحت ہوتی ہے کہ وہاں طاقتور کے مقابلے میں کمزور کا حق دلوانا عدالت کے بس میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر ایک جمہوری نظام میں حکمرانوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں لوگوں کی آزادی ذات، آزادی تحریر و تقریر، آزادی اجتماع اور آزادی نقل و حرکت سلب کر لیں بغیر اس کے کہ ان کا جرم کسی عدالت میں ثابت کیا گیا ہو، اور بغیر اس کے کہ کوئی عدالت ان کے معاملے میں تحقیق کرنے کی مجاز ہو کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں۔ تو ایسے نظام کا آغاز خواہ کیسے ہی جمہوری طریقے پر ہو اس کا انجام لازماً جمہوریت کی موت پر ہوگا کیونکہ جمہوریت کبھی ایسے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتی جہاں حکومت پر تنقید کرنا دشوار، اور حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا دشوار تر ہو جائے۔ ایسی جگہ تو جو ایک دفعہ برسراقتدار آجائے گا وہ پھر زبردستی اقتدار پر قابض رہے گا۔ اور اس کا نام بہرحال جمہوریت نہیں ہے۔

ایسا ہی معاملہ انتخابات کی آزادی کا بھی ہے۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے جس کو چاہیں حکمرانی کے لئے منتخب کریں اور جب چاہیں اپنی آزاد مرضی سے ان کو تبدیل کر دیں۔ یہ چیز کیسے وجود میں آ سکتی ہے اور کس طرح باقی رہ سکتی ہے اگر دباؤ اور لالچ اور فریب اور حیلوں سے انتخابات کے نتائج اصلی رائے عام کے بالکل برعکس برآمد کئے جا سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں تو لوگوں کو رائے اور انتخاب کا حق دینا اور نہ دینا دونوں برابر ہیں۔

اسی کے قریب اہمیت اس چیز کی بھی ہے کہ ملک میں آئین و قانون اور ضابطہ سب کے لئے یکساں ہو سب پر غالب ہو اور کوئی اس کی خلاف ورزی کرنے کا مجاز نہ ہو۔ یہ ان بنیادی خصوصیات میں سے ہے جو ایک جمہوری نظام کو ایک شخصی استبداد اور ایک مطلق العنان آمریت سے ممیز کرتی ہیں۔ جہاں راعی کے لئے قانون کچھ اور ہو اور رعایا کے لئے کچھ اور، یا جہاں قانون کی ساری پابندیاں صرف کمزوروں کے لئے ہوں اور طاقت والے ہر وقت آئین و قانون کو بالائے طاق رکھ کر اپنی من مانی کر سکتے ہوں۔ اور جہاں عدل و انصاف کی طاقت زورآوروں کے مقابلہ میں قانون کو نافذ کرنے سے عاجز ہو۔ وہاں جمہوریت کبھی قائم نہیں ہو سکتی اور قائم ہو جائے تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ جمہوریت تو سب لوگوں کی برابری کا نام ہے اور برابری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ضابطہ سب کے لئے ایک ہو اور سب پر یکساں نافذ ہو۔

پھر جمہوریت کی زندگی اور کامیابی کے لئے یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ حکومت کے کاربردار اور محافظ سچے دل سے جمہوریت کے اصول کو

تسلیم کریں۔ یعنی وہ اس بات کو مان لیں کہ ملک باشندوں کا ہے۔ اور باشندوں کو یہ حق ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو چاہیں اپنے ملک کا کارفرما بنائیں اور مملکت کے کارپردازوں کا جو حقیقت میں باشندوں ہی کے ملازم ہیں یہ فرض ہے کہ جن لوگوں کو بھی باشندوں نے کارفرما بنایا ہو اُن کے تحت امرہ کر کام کریں۔ یہ بات اگر ایمانداری کے ساتھ قبول نہ کی جائے۔ اور ملازمین حکومت جتھہ بندی کر کے خود یہ طے کرنے لگیں کہ کون کارفرما ہو اور کون نہ ہو۔ یا کارفرمائی کی باگیں خود اپنے ہاتھ میں لے لینے پر تل جائیں۔ تو صرف یہی نہیں کہ جمہوریت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی بلکہ درحقیقت اخلاقی حیثیت سے یہ ایک بہت بڑی خیانت اور نتائج کے اعتبار سے پورے ملک کے لئے ایک نہایت خطرناک چیز ہے۔ ایک شخص کے ملازم اگر جتھہ بندی کر کے خود اسی شخص کو مغلوب کر لیں اور اس کے گھربار کے مالک بن بیٹھیں تو اس کا نام غداری و خیانت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ پھر جہاں پبلک کے ملازم پبلک کے ساتھ یہ معاملہ کریں وہاں اس حرکت کو اور کیا نام دیا جائے گا؟ رہے اس کے نتائج تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ جہاں ایک مرتبہ ملازمین کو یہ چسکا لگ گیا وہاں ایک جتھہ نہیں۔ بہت سے حوصلہ مند جتھے وجود میں آئیں گے۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں اقتدار کے لئے کشمکش شروع کریں گے۔ نیچے سے اوپر تک سب سازشوں اور جوڑ توڑ میں لگ جائیں گے۔ اور یہ ساری اکھیڑ پچھاڑ جمہوری انتخابات کے کھلے میدان میں نہیں بلکہ پس پردہ دفتروں اور درباروں میں ہو گی۔ اس صورت حال میں نظم و نسق کا تباہ ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ اس وقت پاکستان کو بہت سے مسائل درپیش ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ لوگوں کی اخلاقی دینی حالت درست کرنی ہے۔ معاشی بدحالی کا علاج کرنا ہے۔ عام جہالت کو دور کرنا ہے۔ نظام تعلیم کی اصلاح کرنی ہے۔ اور ایسے ہی بہت سے مسائل ہیں لیکن ان سب سے مقدم یہ ہے کہ ہم اپنے نظام زندگی کی بنیادوں پر اتفاق کر لیں۔ اور یہ اتفاق صحیح بنیادوں پر ہو۔ کیونکہ جب تک یہ نہ ہو گا۔ ہم اپنے اِن مسائل کو حل کرنے کے لئے نہ تو کوئی لائحہ عمل بنا سکیں گے۔ اور نہ یہی ممکن ہو گا کہ کسی لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے ہماری قومی زندگی کے تمام عناصر اور وسائل مجتمع ہو کر کام کر سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ آئینِ مملکت کی جن تفصیلات پر اس وقت ساری توجہات صرف کی جا رہی ہیں اُن کی بھی کوئی صورت مفید نتیجہ نہ پیدا کر سکے گی۔ جب تک کہ وہ اُمور صحیح طریقے سے طے نہ ہو جائیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس ملک کے لئے حقیقی اہمیت ان تفصیلات کی نہیں ہے کہ مغربی پاکستان کا ایک یونٹ ہو یا کئی یونٹ ہوں۔ اور ملک کے دونوں حصّوں کو خود مختاری دے کر مرکز کو کمزور کیا جائے یا طاقتور مرکز رکھ کر دونوں کو اس کا تابع رکھا جائے۔ بلکہ حقیقی اہمیت اس چیز کی ہے کہ ہم ایک صحیح اسلامی و جمہوری نظام قائم کریں جو سب کو متحد اور مطمئن رکھ سکے۔ یہ چیز اگر قائم ہو جائے تو ان تفصیلات کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی۔ انشاءاللہ کامیاب ہو گی۔ ورنہ ہر شکل آخر کار نت نئی خرابیوں کی موجب ہو گی۔

(بشکریہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور)

منظر اعظمی

حالی کا غزلیاتی آہنگ

غزل کی ہئیت کا ہیولا جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے ان میں غزل کی بحر۔ اس کا آہنگ اور ترنم ۔ الفاظ ۔ ان کی نغمگی اور غنائی کیفیت ۔ علامات، اشارات اور ان کی رمزیت SYMBOLISM قوافی اور ردیف اور ان کا جمالیاتی دروبست، اور ان سب کی ایک متوازن آمیزش اور متناسب ہم آہنگی سب شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کی شکل ایک مخصوص مطلع اور مقطع والی شکل ہے۔ مگر حالات اور عہد بہ عہد کی ارتقائی کیفیت مواد میں گوناگونی پیدا کر دیتی ہے ۔ اور پھر اس کا اثر اس کی ہیئت اور آہنگ پر پڑنا لازمی ہے ۔ حالات اور تغیرات کے ساتھ ساتھ موضوع اور مواد کی تبدیلی کے زیر اثر غزل کے جمالیاتی تقاضے نیا روپ اختیار کرتے رہتے ہیں ۔ اس سے انکار کرنا حقائق سے آنکھیں بند کرنا ہے ۔ حالی سے پہلے غزل نے بہت سے چولے بدلے۔ پہلے داخلیت اور خارجیت ایک عجیب تناسب آمیزش سے عشقیہ آہنگ بن کر غزل کے دروبست پر چھا جاتی ہے ۔ مگر بعد کے دور میں لکھنؤ اسکول محض خارجی بن کر رہ جاتا ہے ۔ غزل صرف زلف و رخسار ۔ انگیہ ۔ کاجل ۔ مسّی ۔ سرمہ ۔ چوٹی اور اسی قسم کے دوسرے ظاہری حسن میں الجھ کر رہ جاتی ہے ۔ اس سے انسانی زندگی کی نفسیاتی گرہوں کی عقدہ کشائی کہیں بھی ہوتی نظر نہیں آتی ۔ اردو شاعری کے تیسرے دور میں جسے ہم عہد غالب کہہ سکتے ہیں غزل میں داخلیت آجاتی ہے اور اس میں ایک رچا بسا نفسیاتی انداز سنبھلا سنبھلا نظر آتا ہے ۔ پھر بھی غزل کو نیا آہنگ نہ مل سکا ۔ اردو شاعر یا تو بادشاہوں کی نور نظر رہی یا فقیروں اور عزلت نشینوں کی مرکز توجہ ۔ اسی وجہ سے اس میں یا تو بادشاہیت کی عیش پسندیاں گھل گئیں یا ترک دنیا اور ماورائی فلسفوں کی افیونی کیفیت ۔ مگر اسے میتھو آرنلڈ کی زبان میں "تنقید حیات" بنانا کسی کے بس میں نہ تھا ۔ یہ وہ حالی ہی ہیں جنہوں نے پرانی روش پر نہ صرف تنقید کی بلکہ یہ سب کچھ ان کو "شعر و قصائد کا ناپاک دفتر" نظر آیا جو عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر تھا ۔ اور ایک الگ ڈگر قائم کر کے مستانہ وار نشانِ انقلاب بن جانا ان کو زیادہ راس آیا بہ نسبت اس کے کہ اسی سنڈاس میں رہ کر وہ بھی کچھ بڑبڑا جاتے یا زیادہ سے زیادہ کچھ تھوڑا بہت سنجیدگی اور متانت کا عطر مل کر دیتے ۔ حالی یہ چاہتے تھے کہ بقول ایمرسن ۔

"روح عصر" spirit of the age غزل کا جمالیاتی آہنگ بن جائے ۔ اس کی رگ و پے میں یہ "زہر غم" اگر سرایت کر جائے تو پھر ادب زندگی کی تنقید ہو سکتا ہے ۔ اس کے فاسد مادوں پر نشتر زنی کر کے اسے سنوارا جا سکتا ہے۔ اور ارتقائی راہ پر لگایا جا سکتا ہے ۔ اور اسی وقت تخلیقی تنقید کی داغ بیل بھی پڑ سکتی ہے ۔ حالی نے اپنی انتھک کوششوں سے یہ احسان بھی کیا جس سے اردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس طرح حالی ایک نئے دور کے موجد ۔ ایک عہد نو کے بانی ہوئے اور ان کی غزلوں کا ایک نیا آہنگ نکھر کر سامنے آیا ۔ مجنوں گورکھپوری نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے ۔ حالی کے کلام کا مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے جس بات کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا شعر حال سے خالی نہیں ہوتا ۔ حالی کے یہاں نہ کہیں زبردستی کی پرواز تخیل ہے نہ خواہ مخواہ کی تشبیہات و استعارات ۔ جو بات ہے "دو اور دو چار" کی طرح سیدھی مگر عالمگیر حقیقت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات کو ہر شخص اپنے دل کی بات کی طرح مانوس پاتا ہے ۔ ۔ ۔

اس سلسلے میں چند اشعار سے ان کے انوکھے غزلیاتی آہنگ کا اندازہ ہو جائے گا۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
گھٹ گئیں کچھ تلخیاں ایام کی — بڑھ گئی ہے یا شکیبائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو — راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اِک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زبان ہے اب
وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا — چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں — مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلا — نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے

کیا ہے اس نے، کہتے ہیں سخن ترک — مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

رنجش و التفات و ناز و نیاز — ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
کر دیا خوگرِ جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دلسوز ہو تو کیجے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

دلِ ہجر دیدہ سے حسن لذتِ وصل — نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم، حاصلِ عشق — ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ

حالی نے ایک جگہ کہا ہے کہ وہ شاگرد مرزا غالب کے تھے۔ تقلید میر کی کر رہے تھے اور مستفیض شیفتہ سے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں یہ تینوں اثرات نہایت خوبصورت انداز میں گھلے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھنے سے یک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ اشعار کی خستگی اور گھلاوٹ، سوز و گداز کی ایک جداگانہ غزلیاتی آہنگ کا اثر ہے۔ ظرف اور تمکنت، ایک خاص انداز کا رکھ رکھاؤ اور شعری وقار یہ ساری خوبیاں غالب کے فیضِ صحبت نے بخشی ہیں۔ اور عمومیت، سادگی اور جذب برجستگی شیفتہ کی ودیعت کردہ ہیں۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ غالب کے ایک شاگرد کو ان کی پیچیدہ خیالی اور مشکل گوئی سے جس چیز نے بچایا ہوگا وہ یقیناً شیفتہ کی صحبت کا فیض ہوگا۔ مجنوں نے حالی کے غزلیاتی آہنگ کی مطابقت انگریزی کے دو شاعر گرے (GRAY) اور کالنس (COLLINS) کے شعری آہنگ سے کی ہے جنہوں نے انگریزی ادب میں رومانی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ وہ کہتے ہیں "جب ہم حالی کی غزلیات پڑھتے ہیں تو ہم کو وہ کالنس سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ اپنے وقت کی غزل گوئی کے رسوم و قیود سے بغیر کسی قسم کی بغاوت کئے ہوئے غزل کو حالی نے گویا از سر نو پیدا کیا ہے۔ اور اُن میں نئی کیفیتیں بھر دی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں جو مخلصانہ سادگی نرمی اور سنبھلی ہوئی غمگینی پائی جاتی ہے وہ بھی کالنس ہی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ گرے کی خصوصیت حالی میں یہ ہے کہ وہ اپنے راز کو کبھی اچھی طرح افشا نہیں کرتے۔ بس زیر لب کچھ کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ گرے کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی کوئی بات کھل کر نہیں کہتا" ——— میرا خیال ہے کہ اسلوب کی بے ساختگی اور دل و زبان کی یک رنگی حالی کو ورڈسورتھ کی یاد دلاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں جو عارفانہ اداسی اور مفکرانہ گداز کی سی کیفیت پائی جاتی ہے وہ حالی میں نہیں لیکن انہوں نے اردو شاعری کو خاص طور سے غزلوں کو وہی پُرخلوص سادگی۔ وہی پُرتاثیر بے رنگی اور وہی دھیمی دھیمی موسیقیت دی جو ورڈسورتھ نے انگریزی شاعری کو دی۔

حالی نے جدید اسلوب اور اصلاحِ شعر سازی کی جو تحریک شروع کی وہ اتنی جیسی انگریزی شاعری میں WORDSWORTH اور کولرج COLRIDGE سے بھی شروع ہوئی۔ اس انداز سے بھی ان دو شاعروں سے حالی کی مماثلت بہت مناسب ہے۔

حالی کے یہاں دو چیزیں خاص ہیں ایک ان کی واقعیت پسندی (Realism) اور دوسری عقلیت (Rationalism) اسی سے حالی کے کلام میں وہ ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوا جو کسی اور دوسرے شاعر میں نہیں ملتا۔ بقول مجنوں "لیکن یہی معقولیت پسندی اور واقعہ کے ساتھ بڑھتی ہوئی موانست بھی جس نے حالی کو اس طبیعت بیدار سے محروم رکھا جس کو شیلی

HARMONIUS MADNESS ———

کہتا ہے۔ اور جو دنیا کے مشہور ترین شاعروں اور ادیبوں کی فطرت رہی ہے۔ حالی کی یہی خصوصیت اُن کو آدھا کرتی ہے اور ہم کو یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ حالی ہی

کے شعر سے زندگی سازی کا کام لینے کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ اور فی الاصل حالی ہی اس عہد آفریں تحریک کے بانی مبانی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ "غالب کے بعد تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر اصلاح کی جو تحریک حالی کے ہاتھوں شروع ہوئی اس نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا۔ حالی خود اس معاملے میں پیش پیش رہے۔ حالی سے قبل لکھنؤ میں غزل کی ہیئت کو خارجیت کے زیر اثر بہت سی بنیادی خصوصیات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ خارجی حالات کی ترجمانی کے نتیجے میں وہ محض الفاظ کی بازیگری رہ گئی تھی۔ حالی نے بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر غزل کی ہیئت کی اس زبوں حالی کو محسوس کیا۔ اور اصلاح غزل کی ایک باقاعدہ تحریک چلا کر اس کو اس قعر مذلت سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریک سے غزل کی ہیئت کو زیادہ سے زیادہ جمالیاتی اقدار کا حامل بنانے کی ایک فضا قائم ہوئی حالی نے اس سلسلہ میں جن تجربات کو پیش نظر رکھا ان میں روایت سے چشم پوشی نہیں تھی۔ بلکہ صحت مند روایات کو خاطر خواہ برتنے کا خیال تھا۔ انہوں نے تو ان مذمومات کے خلاف بغاوت کی تھی جن کو لکھنوی ماحول نے ان دنوں غزل کی ہیئت کا جزو بنا دیا تھا۔ حالی نے غزل میں مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی پر زور دیکر اس حقیقت کی وضاحت کی کہ موضوع اور مواد میں جب تک وقار اور رکھ رکھاؤ نہیں پیدا ہوتا اس وقت تک اس کی ہیئت بھی ان خصوصیات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔ جیسا انہوں نے یہ کہا تھا کہ غزل کو با اعتبار مضامین وسعت دیا چاہئے تو ان کا یہی مقصد تھا کہ ایسا کئے بغیر غزل کی ہیئت میں بھی وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ گویا حالی نے غالب کے بعد غزل کی ہیئت میں وسعت پیدا کرنے کا صحیح شعور پیدا کیا چنانچہ غزل میں نئے استعارے آئے۔ نئی ایمائیت نے جگہ بنائی، نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبوں کا دور دورہ ہوا۔ اور ان سب کے نتیجے میں ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ وجود میں آیا حالی کی غزلیں خود اس صورت حال کی بڑی اچھی ترجمان ہیں کہیں کہیں تجربے کی انتہا پسندی نے ان کے یہاں غزل کی ہیئت کو ٹھیس ضرور لگائی ہے۔ لیکن ہر اصلاح پسند کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ویسے مجموعی طور پر ان کی غزلوں کے مختلف اشعار میں ہیئت کی یہ جدت قدم قدم پر اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے چند اشعار مثالاً پیش فرمائے ہیں جو نفس موضوع پر واقعی دلالت کرتے ہیں ؂

میخانے کی خرابی جی دیکھکر بھر آیا
مدت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضا را

گل دلنشیں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے
ہمارا بھی کبھی لگتا تھا جی سیر گلستاں میں

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

اس طرح حالی نے حسن و عشق کی اس فرسودہ اور قدیم ڈگر کو چھوڑ کر پُر تاثیر غزلوں کی ایک نئی راہ نکالی، جس کا آہنگ، جس کا انداز، اور تیور قدماء کے راستوں سے یکسر جدا تھے۔ آگے چل کر انہیں راستوں پر متاخرین نے غزل کے آہنگ اور اس کی ہیئت میں مختلف النوع تجربات کئے جن میں اکثر کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئے۔ یہ حالی ہی کی جدت تھی جس نے غزلوں میں فکر کو سمونے والا اقبال ایسا شاعر عہد پرداز پیدا کیا۔ اگر حالی نے غزلوں کے قدیم نظام سے بغاوت نہ کی ہوتی اور اپنی آزاد مگر پُر از خیال ڈگر کا سنگ بنیاد نہ رکھا ہوتا تو بعد کے آنے والوں کیلئے یقیناً یہ کوہ کنی بڑی گراں ثابت ہوتی مگر حالی نے غزل کا نیا آہنگ پیدا کر کے اپنے پیچھے آنے والوں کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی۔

محسن نیازی

○

اگرچہ اہرمن کا رُعب داب دیکھتا ہُوں میں
مگر بصد ہزار پیچ و تاب دیکھتا ہُوں میں

ہُنر وروِ خرد کے ہر سوالِ پیچ پیچ کے
جُنوں کے پاس سینکڑوں جواب دیکھتا ہُوں میں

جبھی تو ہر غریب کی رگوں میں ہے فسردگی
ترے سبُو میں سُرخ سی شراب دیکھتا ہوں میں

بنامِ صلح و آشتی ، برنگِ امن دوستی!
خرد کو مستِ کارِ ناصواب دیکھتا ہُوں میں

یہی ہے زندگی تو پھر عجیب ہے یہ زندگی
سمجھ میں جو نہ آئے وہ کتاب دیکھتا ہُوں میں

روش روش پہ آہِ بے پناہ کی صدائیں ہیں
قدم قدم پہ دیدۂ پُر آب دیکھتا ہُوں میں

تمام کائنات میں بپا ہے رقصِ تیرگی
کہیں کہیں طلوعِ آفتاب دیکھتا ہُوں میں

شاکر تسلیم

ہر طرح کر چکی اہتمامِ سکوں
زندگی ہے مگر پھر بھی خوار و زبوں
اے غمِ دوست ان آنسوؤں کے عوض
مسکراتے ہوئے چاند تارے نہ لوں
آپ ہی حق شناسِ زمانہ سہی
کہیئے طوق و سلاسل کو آواز دوں
سینکڑوں اہلِ دل جیتے جی مر گئے
کچھ بفیضِ خرد، کچھ بفیضِ جنوں
پھر ستاروں سے آگے بھی ہو گی نظر
پہلے ذرّوں کی تابندگی دیکھ لوں
آپ کو میری کیوں فکر درپیش ہے
ننگِ محفل ہوں، جانِ محفل ہوں
دیکھئے کس کی عظمت کا پرچم جھکے
تیرگی بھی فزوں، روشنی بھی فزوں

انور صدیقی

بڑا ہو لطف اگر بیقرار ہو کے رہیں
غمِ حیات ترا اعتبار ہو کے رہیں
گراں ہے دل پہ خزاں کا طلسمِ نیم شبی
چلو تبسمِ صبحِ بہار ہو کے رہیں
سکوتِ جوئے روانِ چمن ہے اب تک
خروشِ ابرِ سرِ کوہسار ہو کے رہیں!
تمام عمر رہیں برقِ ارتقاء کا خرام
رہِ طلب میں سراپا غبار ہو کے رہیں
کسی کی یاد نہ بھٹکے بڑا اندھیرا ہے
فروغِ شمعِ سرِ رہگذار ہو کے رہیں
یہ روز و شب گلۂ روزگار کیا معنی
حریفِ کشمکشِ روزگار ہو کے رہیں
خموشِ محفلِ چنگ و رباب ہے انور
خرابِ نغمۂ سوز و ساز ہو کے رہیں

اسحاق اطہر صدیقی

○

جنوں کہوں کہ سکوں اتنا اختیار نہیں
بہت دنوں سے محبّت بھی خوشگوار نہیں
قدم قدم پہ بہانے تراشنے والو
تمھارے وعدۂ فردا کا اعتبار نہیں
اس ایک دل کو ابھی تک تری تمنّا ہے
وہ ایک دل کہ جو تیرا گلہ گزار نہیں
ہر نفس نئے طوفاں تلاش کرتا ہوں
غمِ حیات سے بچنا مرا شعار نہیں
ابھی تو ذہن ہے آسودۂ قفس اطہر
ابھی فضائے چمن مجھکو سازگار نہیں

رحمان خاور

○

شعلے سے اٹھ رہے ہیں گل و یاسمن سے کیا
اب فاصلہ ہے دورِ خزاں کا چمن سے کیا
سلجھائیں گے ہمیں کہ عروسِ حیاتِ نو
دنیا کو تیری زلفِ شکن در شکن سے کیا
الجھا ہے جہلِ شیخ کے ہاتھوں جو مسئلہ
حل ہو سکے گا اب وہ کسی برہمن سے کیا
تنہائیاں بھی لطف سے خالی نہیں رہیں
وابستہ ہو گیا ہوں تری انجمن سے کیا
خاور لبِ غزل پہ حقیقت نوائیاں
تم انقلاب لاؤ گے شعر و سخن سے کیا

احقر کاشی پوری

حسین شاموں، جواں نظاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی
ہوا زمانہ مگر بہاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

نہ رنجشیں ہیں نہ نکہتیں ہی، اس اپنی تقدیر کو کروں کیا
مگر محبت کے لالہ زاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

سیاہ کاروں نے جن کی لاشوں پہ عیش کی محفلیں جمائیں
انھیں جواں سال حسن یاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

تمھاری خاطر جو زخم کھائے تھے سب کے سب آج بھی ہرے ہیں
اسی ضمن میں ستم شعاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

حیات کی مانگ غم کو کوئی مسرت نہ چھو سکی ہے
چمن میں آکر بھی خارزاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

ہزار دم توڑتی مرادوں کا خیر مقدم کیا ہے میں نے
مگر یہ دل ہی تو ہے، سہاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

دکھا رہے تھے جو خواب پُر لطف و کیف انگیز زندگی کے
اب اُن کنایوں، اب اُن اشاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

جہاں کے دستِ کرم نے احقر وفا کا نام و نشاں نہ چھوڑا
یہی غنیمت ہے غمگساروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

منظر حسین

یہ دفتر ہے

(دوسری قسط)

کینٹین پہنچکر آپ دیکھیں گے ایک طرف "گل و بلبل"۔ "زلف و عارض" کا ذکر ہو رہا ہے۔ دوسری طرف "سیاسیات حاضرہ" پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے تیسری طرف "کاروبار خاص" پر نوک جھونک چل رہی ہے چوتھی طرف "تکے بازی" کی مشق ہو رہی ہے۔ پانچویں طرف کسی "چاک گریباں" کی پگڑی اُچھل رہی ہے۔ آپ کا رشتہ دار، دوست یا دوست کا دوست آپ کا تعارف کینٹین کے منیجر سے کرائے گا۔ اور اپنی یا کسی اور کی ضمانت پر آپ کا اکاؤنٹ کھلوائے گا۔ آپ اس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھکر کہیں گے "بوائے" ــ اور بوائے کی جگہ ایک پھٹے پرانے کپڑے میں ملبوس عمر رسیدہ ملازم آپ کے سامنے آکر پوچھے گا۔ "کیا مانگتا؟" آپ اسے سر سے پیر تک دیکھیں گے اور پھر کہیں گے "چائے لاؤ"۔ وہ بولے گا "چالو مانگتا یا بڑے"۔ آپ کہیں گے۔ "ابے ٹرے لا۔ دیکھتا نہیں ہم بابو لوگ ہیں"۔ وہ ہنسکر کہے گا "بابو لوگ ہی تو چالو پیتا ہے۔ ٹرے تو وہ لوگ مانگتا"۔ وہ ہاتھ سے "پبلک" کی طرف اشارہ کرے گا۔ آپ کہیں گے۔ "اچھا بھئی۔ تم دو کپ کی ٹرے لاؤ۔ اور زیادہ بکواس مت کرو"۔ وہ کہے گا "بکواس تم خود کرتا۔ ہم تو پوچھتا چالو پیئے گا۔ یا ..... " آپ کہیں گے۔ "بابا۔ جاؤ چائے لاؤ۔ میرا مغز مت کھاؤ۔ ایسا ہوا ملک بولو"۔ اور جب وہ چلا جائے گا۔ تو آپ اپنے ساتھی سے کہیں گے یہاں کے ملازم تو بڑے بدتمیز ہیں" ساتھی کہے گا "بھئی یہی غنیمت ہے کہ چائے مل جاتی ہے ورنہ اگر وہ نہ لائے تو آپ کیا کرلیں گے"۔ آپ کہیں گے "اور وہ ــ یہ بات ہے"۔ وہ کہے گا "بات یہی صرف نہیں ہے۔ ذرا سنئے گا۔ وہ منیجر کیا کہتا ہے"۔ آپ کان کھڑے کرکے سنیں گے۔ منیجر کہہ رہا ہوگا "یہ سالے ایک تو اُدھار کرتے ہیں دوسرے رعب جماتے ہیں۔ ان کی "" آپ ماں بہن کی گالیاں سنیں گے اور آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کا ساتھی مسکرا کر کہے گا "کوئی بات نہیں۔ یہ تو یہاں کا روزانہ کا دستور ہے۔ ابھی اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور وہ خوشامد شروع کر دے گا کیونکہ اگر ہم لوگ اُدھار

کردیں تو پھر کینٹین چلے گی کیسے"؟ آپ کہیں گے ہاں اگر اس کی یہ روش یہی رہی تو ایک دن کینٹین بند ہو جائے گی"۔ وہ کہے گا "کینٹین کبھی نہیں بند ہوگی کیونکہ یہاں بڑے بڑے معاملات طے ہوتے ہیں۔ منیجر کو بھی کچھ مل جاتا ہے لیکن اس غریب کو کبھی کبھی جبر کے بھی کھانے پڑتے ہیں۔ وہ یوں کہ کچھ لوگ کھا پی کر فرار ہو جاتے ہیں اور ان کی رقم اسے پھر دوسرے طریقوں سے وصول کرنی پڑتی ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "دوسرے طریقے کیا ہیں؟" وہ جواب دے گا "یہی کہ دو پیسے کی روٹی ایک آنے میں تین آنے کی ٹرے پانچ آنے میں، آٹھ آنے کا حلوہ بارہ آنے میں اور ....." آپ کہیں گے۔ "میں سمجھ گیا"۔ وہ کہے گا "مہینہ میں چند دن وہ یونہی کرتا ہے چاہے کوئی فرار ہوا ہو یا نہ ہو۔ گویا وہ اگلے فرار ہونے والے آدمی کا چندہ ہم لوگوں سے پہلے ہی وصول کرلیتا ہے۔ اور ایک بات اور ہے وہ یہ کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو کینٹین کا چلنا مشکل ہو جائے کیونکہ اُدھار رقم میں سے ہمیشہ آدھی رقم پھنسی رہتی ہے پھر کینٹین صرف دفتر کے اوقات میں چلتی ہے اور چھٹیوں کے دن بند رہتی ہے اور .. .." آپ کہیں گے "یہ سب ٹھیک ہے لیکن وہ بڈھا ابھی تک چائے نہیں لایا"۔ وہ آواز دے گا "ٹرے میاں۔ جلدی چائے لاؤ"۔ اور پھر کہے گا "مہینہ کی یہی تاریخ کو منیجر کا بھائی بابو لوگوں کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے اور بابو لوگ اس سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے گھر کی طرف دوڑتے ہیں بہرحال ایک عجیب تماشہ رہتا ہے جسے دیکھکر آپ محظوظ ہوں گے"۔ اتنے میں ہوٹل کا ملازم ٹرے لاکر رکھے گا۔ آپ ٹرے پر ایک نظر ڈالیں گے اور آپ کے دماغ کا پارہ ایک دم چڑھ جائے گا "کیسی گندی ٹرے ہے یہ۔ اور پھر چھپا کدھر ہے"۔ ہوٹل کا ملازم کہے گا "بابو۔ چھنا جالی نہیں"۔ آپ کہیں گے "ابے چمچہ بھی تو نہیں ہے"۔ وہ کہے گا "چمچہ ابھی لایا"۔ پھر جب چمچہ آجائے گا تو آپ کو پتہ چلے گا کہ دودھ کم ہے۔ اور جب دودھ دوبارہ آئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چینی بھی ناکافی ہے۔ اور جب چینی دوبارہ آئے گی تو آپ کو چائے کا رنگ پھیکا نظر آئے گا۔ اور جب آپ چائے کی پتی مزید منگوا کر ڈالیں گے تو آپ کو شکایت ہوگی کہ کمبخت پانی بھی کم ہے۔ غرضکہ ان تمام مراحل سے گذرنے

کے بعد جب آپ اپنے اور اپنے ساتھی کے لئے چائے بنائیں گے اور بنا کر ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتاریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا جیسے آپ نے ٹھنڈا میٹھا شربت پی لیا ہے۔ کیونکہ چائے کا ٹمپریچر آپ کے دماغ کے ٹمپریچر سے بہر حال کم ہی ہوگا۔ آپ "درمی خور" کے اصول پر چائے زہر مار کرلیں گے اور زہر مار کرکے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کردیں گے۔ ابھی آپ جائزہ لے رہے ہوں گے کہ آپ کا ساتھی کہے گا۔ "آیئے آپ کا ان لوگوں سے تعارف کرا دوں" ــــ اور آپ "گل و بلبل" گروپ کے قریب پہنچیں گے۔ آپ کا ساتھی کہے گا "رند صاحب۔ ذرا آپ سے ملئے۔ آپ کرار کی جگہ آئے ہیں۔" رند صاحب فرمائیں گے "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بیٹھئے چائے منگواؤں" آپ انکار کریں گے وہ اصرار۔ آخر کار آپ چائے پینے پر راضی ہو جائیں گے ــــ

اور جب تک چائے آئے دیگر حضرات سے بھی آپ کا مکمل تعارف ہو جائے گا" اور چائے آنے پر تند صاحب۔ قمر صاحب۔ سحر صاحب۔ آسمان صاحب۔ زمین صاحب سب کی ایک ایک غزل سنکر آپ داد دینے پر مجبور ہوں گے ــــ اور پھر دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے آپ "سیاست" گروپ کی طرف جائیں گے۔ آپ کا ساتھی کہے گا "الیاس مارکسی سے ملئے" آپ اس سے ملیں گے۔ وہ کہے گا "مولانا فخر الدین سے ملئے" آپ ان سے ملیں گے۔ وہ کہے گا۔ "مسٹر زبیر امریکی سے ملئے" غرضکہ مختلف سیاسی رجحانات کے نمایندے آپ کو اس گروپ میں ملیں گے اور ہر نمایندہ آپ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرے گا۔ اور آپ کے خیالات معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہوگا لیکن آپ کی خاموشی سے وہ مجبور ہو جائیں گے کہ اپنی پچھلی گفتگو کو جاری رکھیں۔ اور آپ کے سامنے ایک "سیاسی دنگل" شروع ہو جائے گا جسے آپ کچھ دیر دیکھکر "کاروبار خاص" گروپ کی طرف بھیجیں گے۔ آپ کے بیٹھتے ہی کاروبار سرد ہو جائے گا اور آپ کا ساتھی کہے گا "آپ کرار کی جگہ کام کر رہے ہیں" اس اعلان سے اس گروپ میں ہلچل پیدا ہو جائے گی اور ہر شخص آپ سے بڑے تپاک سے ملے گا۔ اور ہر شخص آپ کو چائے۔ کیک۔ پیسٹری وغیرہ OFFER کریگا آپ لاکھ انکار کریں گے لیکن آپ کے دیکھتے دیکھتے یہ چیزیں آجائیں گی اور آپ کا ہاتھ بغیر کسی ارادہ کے ایک ایک چیز اٹھا کر منہ میں ڈالتا جائے گا اور آپ کے کان ہر شخص کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے جائیں گے ــــ یہاں تک کہ ان میں سے ایک آپ سے "عرض خاص" کی درخواست کرے گا۔ آپ اپنے ساتھی کی طرف دیکھیں گے۔ وہ سر ہلا کر "ہاں" کہنے کا اشارہ کرے گا۔ اور پھر آپ دونوں کے ساتھ "عرض خاص" سننے کیلئے دوسری خالی ٹیبل پر چلے جائیں گے۔ "عرض خاص" سنکر اور اپنی جیب میں پچاس روپے ڈال کر آپ اپنے ساتھی کے ساتھ بقیہ لوگوں سے ملے بغیر کینٹین سے باہر نکل آئیں گے۔ باہر نکل کر آپ کا ساتھی کہے گا "میرا حصہ عنایت فرمایئے۔" آپ پوچھیں گے ــــ

"آپ کا حصہ کتنا ہے؟" وہ بولے گا "دس روپے" آپ اسے دس روپے نکال کر دیدیں گے۔ وہ پھر کہے گا "دس روپے ESTAB کلرک کو دیدیجئے گا" آپ کہیں گے۔ "بہت بہتر" وہ پھر کہے گا "پندرہ روپے ہیڈ کلرک کو دیدیجئے گا" آپ کہیں گے "بہت بہتر" وہ پھر کہے گا "باقی پندرہ آپ کا حق ہے" اور یہ کہکر مسکرانے لگے گا اور مسکراتے کہے گا۔ "اس طرح آپ اپنے ڈیڑھ سو روپئے آسانی سے وصول کر سکتے ہیں" آپ خوش ہو کر کہیں گے "ٹھیک۔ مگر میں نے اور بھی خرچ کیا ہے" وہ کہے گا "پروا نہیں سب کچھ وصول ہو جائے گا۔ مگر ہمارا خیال رکھے گا" آپ کہیں گے "ضرور آپ کا نہیں تو پھر کس کا خیال رکھوں گا۔ آپ ہی کی کوشش سے تو آج میں . . ." وہ کہے گا "میرا کچھ بھی حصہ نہیں۔ کام تو آپ کے روپئے نے کیا۔ آپ کہیں گے "واللہ۔ آپ نیکی کرکے دریا میں ڈال رہے ہیں" وہ کہے گا "خیر۔ ان باتوں کو چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ میڈیکل ہو گیا یا نہیں؟" آپ کہیں گے "ارے۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا" وہ کہے گا "کل آپ میرے ساتھ اسپتال چلئے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک کرا دوں گا"۔ آپ کہیں گے "شکریہ"

اور دوسرے دن آپ اپنے رشتہ دار، دوست یا دوست کے دوست سے اسپتال چلنے کے لئے کہیں گے۔ وہ کہے گا "آپ چلئے۔ میں ابھی آتا ہوں" آپ تقرر کے خط کو لئے ہوئے اسپتال میں داخل ہوں گے۔ جس کی ایک نقل میڈیکل آفیسر کے پاس پہلے ہی پہونچ چکی ہوگی۔ اسپتال میں پہونچکر آپ کسی سے دریافت کریں گے۔ "بھائی۔ کلرکوں کا میڈیکل کہاں ہوتا ہے؟" وہ کہے گا "میں کیا جانوں۔ یہاں ہر جگہ میڈیکل ہوتا ہے" آپ کسی دوسرے سے پوچھیں گے "بھیا تمہیں معلوم ہے۔ بابو لوگوں کا میڈیکل اگزامنیشن کہاں ہوتا ہے؟" وہ کہے گا "میڈیکل ان سپکشن تو ادھر ہوتے ہے" آپ کسی تیسرے سے پوچھیں گے۔ "جناب۔ نے بھرتی ہونے والے کلرکوں کا طبی معائنہ کہاں ہوتا ہے؟ وہ جواب دیگا "میرا خیال ہے اس کمرہ میں" آپ اس کمرہ میں پہنچیں گے تو آپ کو بتایا جائے گا کہ "اس" کمرہ میں آپ "اس" کمرہ میں پہنچیں گے تو آپ کو بتایا جائے گا کہ "اس" کمرہ میں غرضکہ آپ "اس کمرہ" سے "اس کمرہ" تک چکر کاٹیں گے اور آخر کار چکر لگاتے لگاتے سر منزل مقصود پر پہنچ ہی جائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ ایک بڑے ہال میں کھڑے ہوئے ہیں۔ جس کے اندر بہت سے لوگ "سینہ کھولے" قطار میں ہیں۔ آپ بھی اپنی قمیص اتار کر کندھے پر رکھ لیں گے اور رکھکر "قطار" ہو جائیں گے۔ آپ "قطار" رہیں گے اور اس کا انتظار کریں گے کہ ڈاکٹر آپ کا معائنہ کرے لیکن ڈاکٹر آپ سے کچھ فاصلہ پر کرسی پر بیٹھا ہوا ایک نرس سے محو گفتگو ہوگا۔ اور اس کی گفتگو ظاہر ہے کہ طویل ہوگی۔ اتنی طویل کہ آپ اس کی طوالت منٹوں کے بعد گھنٹوں میں ناپنا شروع کر دیں گے۔ آپ کی ٹانگیں کھڑے کھڑے درد کرنے لگیں گی اور آپ ڈاکٹر اور اس کی "نرس" کو

ہزار گالیاں دینے کے بعد ایک بنچ پر بیٹھ جائیں گے۔ اچانک ڈاکٹر چلائے گا۔ "قمیصیں اُتار دیں تم لوگوں نے؟" لوگ کہیں گے "ہاں صاحب"۔ وہ کہے گا "اچھا تو پتلونیں بھی اتار دو"۔ آپ سوچیں گے "میں تو پاجامہ پہنے ہوئے ہوں۔ اور ڈاکٹر کا حکم پتلونوں کے لئے ہے"۔ اس لئے آپ اپنے پاجامہ کو اپنی ٹانگوں پر قائم رکھیں گے۔ ڈاکٹر پھر گفتگو کے "سمندر" میں غوطہ لگائے گا اور بڑی دیر بعد سطح پر ابھر کر پوچھے گا: "پتلونیں اُتار دیں؟" لوگ کہیں گے "صاحب پتلون کیسے اتار دیں؟" وہ چلا کر کہے گا۔ "IDIOT" کہیں کے۔ انڈر ویر پہنے رہو۔ پتلون اتار دو"۔ لوگ کہیں گے۔ "صاحب۔ انڈر ویر تو نہیں ہے"۔ وہ بگڑ کر کہے گا "تو جاؤ۔ کل انڈر ویر پہنکر آؤ۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ پتلون کے نیچے انڈر ویر ہوتا ہے"۔ لوگ کہیں گے۔ "صاحب پتلون ہی میں دیوالہ نکل جاتا ہے تو انڈر ویر کہاں سے لائیں"؟ وہ اٹھ کے کھڑے ہو کر چلائے گا۔ "میں نے کہہ دیا نا کہ انڈر ویر کے بغیر تمہارا انسپکشن نہیں ہوسکتا" لوگ چلے جائیں گے لیکن آپ اور چند اور پاجامے والے کھڑے رہ جائیں گے۔ وہ "غوطہ" لگا کر جب دوبارہ اُبھرے گا تو دریافت کرے گا۔ "تم لوگ یہاں کس لئے کھڑے ہوئے ہو؟" آپ آگے بڑھ کر کہیں گے۔ "سرکار عالی۔ میڈیکل انسپکشن کے لئے۔" وہ منہ بنا کر کہے گا "تم نے میرا حکم نہیں سنا؟" آپ کہیں گے "سن لیا جناب"۔ وہ کہے گا "اس کے باوجود تم کھڑے ہوئے ہو۔ گٹ آؤٹ"۔ آپ اور آگے بڑھ کر کہیں گے "جناب۔ آپ کا حکم پاجاموں پر APPLY نہیں ہوتا۔" وہ کہے گا "کیا مطلب؟" آپ کہیں گے "آپ نے پتلون والوں کو انڈر ویر پہنکر آنے کا حکم دیا ہے۔ اور آپ کا حکم بالکل درست ہے کیونکہ پتلون بغیر انڈر ویر کے نہیں پہنا جاتا لیکن پاجامہ تو دراصل بے انڈر ویر کے بغیر ہی پہنا جاتا ہے اور ہم لوگ پاجامہ پہنے ہوئے ہیں"۔ وہ آپ کی اس منطق پر چیں بجبیں ہو کر کہے گا۔ "ہم کچھ نہیں جانتے۔ تم بھی انڈر ویر پہنکر کل آؤ"۔ آپ کہیں گے۔ "صاحب ہمارے پاس انڈر ویر نہیں ہے البتہ لنگوٹ ہے — اور لنگوٹ تو اس وقت بھی بندھا ہوا ہے۔" ڈاکٹر مطمئن ہو جائے گا اور پھر اپنی نرس سے کچھ گفتگو کرنے کے بعد تعداد گنے گا ایک دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات — کُل سات آدمی ہیں —— اچھا۔ ایک لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔ میں تم لوگوں کا سینہ دیکھوں گا" —— اور پھر غوطہ سے نکلنے کے بعد وہ اپنے اسسٹنٹ کو آواز دے گا۔ "مبارک ذرا ان لوگوں کی آنکھیں ٹسٹ کرو۔ اس کے بعد میں سینہ دیکھوں گا"۔ اسسٹنٹ یا کمپاؤنڈر آپ کو ایک کمرہ میں لے جائے گا۔ اور کہے گا "آپ لوگ یہاں بیٹھ جایئے"۔ آپ اس کمرہ میں آدھے گھنٹے مقید رہیں گے اور اسسٹنٹ کہیں غائب رہے گا۔ آدھ گھنٹہ بعد وہ آ کر کہے گا۔ "چلئے میرے ساتھ"۔ آپ پھر ڈاکٹر کے سامنے ہوں گے۔

وہ پوچھے گا۔ "تم نے ان کی آنکھیں ٹسٹ کرلیں؟" اسسٹنٹ کہے گا "جی صاحب"۔ وہ پوچھے گا "سب ٹھیک ہیں؟" اسسٹنٹ کہے گا "بالکل ٹھیک صاحب"۔ وہ کہے گا "اچھا تو ان لوگوں کے چیچک اور ٹائیفائیڈ کا ٹیکہ بھی لگا دو۔ اور کل آنے کو کہو — کل میں ان لوگوں کا سینہ دیکھوں گا"۔ آپ کو ایک بار پھر اسی کمرہ میں جانا پڑے گا۔ جہاں آپ کی آنکھیں ٹسٹ ہوئی تھیں — اور اسسٹنٹ ہر ایک کے صرف چیچک کا ٹیکہ لگا کر کہے گا۔ "جایئے۔ کل پھر اسی وقت آیئے گا"۔ آپ ٹیکہ لگوا کر دفتر واپس ہوں گے تو آپ کا رشتہ دار، دوست یا دوست کا دوست کہے گا۔ "معاف کرنا بھئی۔ میں ایک بڑے ضروری کام میں مشغول تھا"۔ آپ کہیں گے "کوئی بات نہیں۔ کل چلے چلئے گا"۔ وہ کہے گا "ضرور ضرور" —— اور کل جب آئے گا تو اسے پھر کوئی ضروری کام ہو جائے گا اور آپ اس کے بغیر ہی اسپتال روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں پہنچکر آپ پھر کل جیسی بھیڑ دیکھیں گے لیکن آپ اسسٹنٹ کو پکڑیں گے اور آپ کے ہمراہ کل والے ساتھی بھی ہوں گے۔ وہ کہے گا۔ "آپ لوگ اس کونے میں بیٹھ جایئے۔ میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں"۔ ایک دو گھنٹے بعد آپ کی ہستی ڈاکٹر کے سامنے ہوگی۔ وہ کہے گا "مبارک تم نے ان کے ٹیکہ لگا دیا؟" اسسٹنٹ کہے گا "ہاں صاحب"۔ وہ کہے گا۔ "اچھا تو ان کا یورن (قارورہ) بھی ٹسٹ کرو۔ اس کے بعد میں سینہ دیکھوں گا"۔ اور آپ پھر اسسٹنٹ کے ہمراہ اسی کمرہ میں بھیجے گے۔ جہاں آپ کے ٹیکہ لگا تھا۔ وہ کہے گا۔ "جایئے۔ کل پھر اسی وقت آیئے گا"۔ آپ کہیں گے۔ "یورن" وہ کہے گا۔ "جایئے۔ کل میں رپورٹ سب ٹھیک کردوں گا"۔ اور آپ دفتر واپس لوٹ آئیں گے۔ اور آپ کا رشتہ دار، دوست کا دوست کل پھر چلنے کا وعدہ کریگا لیکن نہ جاسکے گا۔ اور آپ تنہا ہی اسپتال پہنچیں گے۔ اسسٹنٹ کئی گھنٹہ کی "مشقت" کے بعد ڈاکٹر کے دربار میں آپ کو معہ ساتھیوں کے پیش کرنے کا فخر حاصل کرے گا۔ ڈاکٹر دریافت کرے گا۔ "ان کا یورن ٹسٹ ہو گیا؟" اسسٹنٹ کہے گا "ہاں صاحب"۔ وہ پوچھے گا۔ "سب ٹھیک ہے؟" اسسٹنٹ کہے گا "بالکل ٹھیک صاحب"۔ اب ڈاکٹر دل پر جبر کرکے اپنا آلہ لیکر اٹھے گا اور ایک طرف سے دیکھنا شروع کرے گا۔ آخر آپ کی باری آئے گی وہ آپ کے سینہ کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھے گا۔ بڑے غور سے دیکھے گا۔ بار بار دیکھے گا۔ اپنے آلہ کو گھما پھرا کر دیکھے گا پھر جھکا اپنے کمال کا وہ پورا پورا مظاہرہ کرے گا اور پھر ایک دم چلائے گا "مسٹر تم UNFIT ہو"۔ آپ کہیں گے "بے شک جناب" وہ کہے گا۔ "تمہیں دل کا عارضہ ہے"۔ آپ کہیں گے "بے شک جناب"۔ وہ کہے گا "تمہیں بچپن میں یوینک فیور ہو گیا تھا"۔ آپ کہیں گے "بے شک جناب"۔ وہ کہے گا "اس فیور میں تمہارا ہارٹ خراب ہو گیا"۔ آپ کہیں گے "بیشک جناب"۔ وہ کہے گا۔ "اب تم جا سکتے ہو"۔ آپ کہیں گے "بے شک — جناب"۔ وہ کہے گا "اچھا۔ تم ٹھہرو۔ میں تمہارا پھر سے معائنہ

گردں گا" آپ کہیں گے۔ "بے شک آپ کر سکتے ہیں"۔ اور پھر وہ آپ کو ایک کمرے میں لے جا کر کہے گا۔ "اس کوچ پر لیٹ جاؤ"۔ آپ لیٹ جائیں گے۔ وہ کہے گا "سانس لو" آپ سانس لیں گے۔ وہ کہے گا "سانس نکالو"۔ آپ سانس نکالیں گے۔ اور اس عرصہ میں وہ آپ کا پھر سے معائنہ کر کے کہے گا۔ "I am sure you are unfit" "آپ کہیں گے "Are you really sure" وہ کہے گا "Dead sure"

آپ دس یا دس کے دو نوٹ نکال کر کہیں گے "کیا میں واقعی اَن فٹ ہوں؟" ڈاکٹر کہے گا "یہ کیا ہے؟" آپ کہیں گے "آپ کی فیس"۔ وہ کہے گا "فیس؟" آپ کہیں گے "بے شک" وہ اپنی فیس لیکر کہے گا "میرا خیال ہے کہ تمہارا مرض CLERICAL WORK میں حائل نہیں ہو سکتا"۔ آپ کہیں گے "تو میں فٹ ہوں ڈاکٹر؟" وہ کہے گا "بے شک" آپ کہیں گے۔ "میں اب جا سکتا ہوں؟" وہ کہے گا "بے شک"۔ آپ کہیں گے "میری رپورٹ ابھی مل سکتی ہے؟" وہ کہے گا "بے شک" آپ کہیں گے "یہ والو لرکیا ہے ڈاکٹر؟" وہ کہے گا "———— یہ سینہ کا ایک مرض ہے"۔ آپ کہیں گے "مہلک تو نہیں" "یہ فیور کی ایک قسم ہے"۔ آپ کہیں گے "مہلک؟" وہ کہے گا "ہرگز نہیں" ————

اور پھر آپ کمرے سے باہر نکل آئیں گے اور فوراً ہی آپ کو میڈیکل رپورٹ مل جائے گی۔ جسے لے کر آپ دفتر پہنچیں گے۔ اور پہنچتے ہی اکاؤنٹنٹ کے حوالے کریں گے تاکہ تنخواہ کے بل میں اسے منسلک کر دیا جائے۔

میڈیکل رپورٹ کی طرف سے مطمئن ہو کر آپ کمرہ میں داخل ہوں گے۔ جہاں آپ کو ایک ایسا سین نظر آئے گا جس سے تھوڑی دیر کے لئے آپ کی آنکھیں چندھیا جائیں گی ——— آپ دیکھیں گے کہ ہیڈ کلرک "بہادر" کے سامنے چند موٹے موٹے سیٹھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ایک سیدھے سادے مسلمان قسم کے کلرک پر برس رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ وقت پر آتا ہے اور وقت پر جاتا ہے بلکہ سب سے زیادہ کام بھی کرتا ہے اور کبھی کبھی "اوور ٹائم" بھی جس کے پیسے اسے بہرحال نہیں ملتے —

ہیڈ کلرک کہہ رہا ہو گا "تمہیں کام کرنا نہیں آئے گا کبھی"۔ کلرک کہے گا "آپ بجا فرماتے ہیں" وہ کہے گا "آخر تمہارے پاس اتنا کام کیوں پینڈنگ رہتا ہے؟" کلرک کہے گا۔ "آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں"۔ وہ کہے گا "تم کام چور ہو"۔ کلرک کہے گا "خدا بہتر جانتا ہے کون چور ہے کون نہیں" وہ چلا کر کہے گا "تم بے ایمان ہو"۔ کلرک کہے گا۔ "اس کا فیصلہ بھی خدا ہی کرے گا"۔ وہ اور زور سے چیخے گا "تم حرام خور ہو"۔ کلرک کہے گا "یہ بھی وہی جانتا ہے"۔ وہ کرسی پر اچھل کر کہے گا "تم خدا کے نام سے کھیلنے والے مردود ہو"۔ کلرک کہے گا "اچھا جناب" وہ جوش میں کھڑے ہو کر کہے گا "تم مسلمان نہیں ہو"۔ کلرک کہے گا "اچھا جناب"۔ وہ آگے بڑھ کر کلرک کو جھنجھوڑ کر کہے گا "تم اس قابل ہو کہ تمہاری گردن تلوار کے ایک ہی وار سے اڑا دی جائے"۔ کلرک کہے گا۔ "اچھا جناب"۔ وہ کلرک کو پیچھے دھکیل کر کہے گا "تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں ......" اور بیچارہ کلرک جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جائیگا جب وہ بیٹھ جائے گا تو ایک دوسرا کلرک اٹھے گا اور پانی کا ایک گلاس لے کر ہیڈ کلرک کے ہونٹوں سے لگا دیگا۔ ہیڈ کلرک پانی پی کر اپنی کرسی پر بیٹھ جائے گا۔ پھر یہ کلرک کینٹین سے خود چائے لا کر ہیڈ کلرک کو پلائے گا ہیڈ کلرک چائے پی کر موڈ میں آ جائے گا۔ پھر یہ کلرک ڈبہ سے پان، اور بٹوہ سے چھالیہ نکال کر ہیڈ کلرک کو دیگا۔ ہیڈ کلرک پان کھا کر خوش ہو جائے گا۔ پھر یہ کلرک ہیڈ کلرک کو گولڈ فلیک کا ایک سگریٹ دیگا۔ ہیڈ کلرک سگریٹ کا کش لگا کر سیٹھ لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہے گا۔

ہمارے دفتر میں صرف یہی ایک کام کرنے والا ہے ——— جو کام میں اس کے سپرد کرتا ہوں اسے بڑی ایمانداری سے کرتا ہے ——— "حشمت"۔ وہ اس کلرک کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہے گا۔ "تمہارے پاس کام بہت زیادہ ہے"۔ حشمت کہے گا۔ "بہت زیادہ"۔ وہ کہے گا "کون کون سے cases ہیں"۔ حشمت ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کرے گا۔ وہ پوچھے گا۔ "ان میں سے MOST ACTIVE CASES کون کون سے ہیں" یعنی "ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں"۔ ... حشمت پوچھے گا۔ "کہاں؟" وہ اس غریب کلرک کی طرف اشارہ کرے گا جس پر وہ ابھی ابھی برس رہا تھا۔ حشمت اس حکم کی تعمیل میں لگ جائے گا۔ اور ہیڈ کلرک اچانک آپ کو بلا کر کہے گا "بھئی یہ لوگ (سیٹھ لوگ) آپ کا انتظار کر رہے تھے"۔ اور آپ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھے گا۔ آپ کہیں گے "میں خدمت کے لئے حاضر ہوں"۔ وہ سیٹھ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہے گا۔ "انہیں آئے ہوئے اگرچہ چند ہی دن ہوئے ہیں۔ لیکن کرار سے اچھا کام کرتے ہیں۔ مجھے ان پر فخر ہے"۔ آپ کہیں گے "میں آپ کے ان نیک جذبات کا مشکور ہوں"۔ وہ کہے گا "ان سے زیادہ ایماندار، محنتی، اور لائق کلرک میرے دفتر میں نہیں"۔ آپ ایکبار پھر شکریہ ادا کرینگے۔ وہ کہے گا "اگر یہ اسی طرح کام کرتے رہے تو بہت جلد ترقی مل جائے گی"۔ آپ کہیں گے۔ "آپ کی نظر عنایت چاہیئے"۔ وہ کہے گا۔ "مجھے توقع ہے کہ جلد ہی میں O.S بن جاؤں گا"۔ آپ کہیں گے "آپ افسری کے قابل ہیں"۔ وہ کہے گا۔ "میں انہیں ہیڈ کلرک بنوانے کی کوشش کروں گا"۔ آپ کہیں گے۔ "آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ بندہ پروری ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم"۔ وہ کہے گا "اچھا اب آپ لوگ ان سے باتیں کر لیجئے"۔ اور آپ سیٹھ لوگوں کو لیکر کسی گوشۂ تنہائی میں جا رہے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئے گی۔

"آپ کو ہیڈ کلرک صاحب بلا رہے ہیں"۔ آپ جیسے ہی ہیڈ کلرک کے قریب

پہونچیں گے۔ وہ آپ کے کان میں کہے گا۔ "ذرا سنبھل کر گفتگو کرنا یہ لوگ میرے دوست ہیں۔" آپ کہیں گے "بہت اچھا" وہ کہے گا الہ آباد کے ہیں۔ میرے کلاس فیلو تھے آپ کہیں گے اچھا؟ وہ کہے گا۔ ان میں سے ایک میرا رشتہ دار بھی ہے۔" آپ پوچھیں گے کون؟ وہ کہے گا یہ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ رشتہ بہت ہی نازک سا ہے۔" آپ کہیں گے "نازک؟" وہ کہے گا میرا مطلب ہے اس کی بیوی .... آپ کہیں گے۔ اچھا میں سمجھ گیا وہ ہنس کر کہے گا "مگر اب بھی اس سے تعلقات ہیں اور وہ مجھے بے حد چاہتی ہے۔ اس نے مجھے ہیرے کی ایک انگوٹھی دی ہے جس کی قیمت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے یہ انگوٹھی اس نے ایک ایسے موقع پر دی تھی جب کہ .... معاً گھنٹی (Call bell) بجے گی۔ اور وہ ایسا سر کھجاتا ہوا اندر چلا جائے گا۔ اور آپ اپنی مہم پر۔

جب آپ مہم سر کر کے لوٹ رہے ہوں گے تو راستہ میں آپ کو الیاس مارکسی ملے گا۔ وہ کہے گا "آج کل آپ خوب چمک رہے ہیں۔" آپ کہیں گے "کیا مطلب؟" وہ کہے گا "بڑے کاروباری بنے ہوئے ہیں۔" آپ پھر کہیں گے "میں کچھ نہیں سمجھا۔" وہ کہے گا "سیٹھ لوگوں سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔" آپ کہیں گے "تو؟" وہ کہے گا۔ تو پھر میرا حصہ دیجئے۔" آپ کہیں گے "حصہ کیسا؟" وہ کہے گا "مال غنیمت کا۔" آپ کہیں گے "مال غنیمت کیسا؟" وہ کھل کر کہے گا "رشوت"۔ آپ کہیں گے "رشوت کیسی؟" وہ چڑ کر کہے گا "تو آپ دینا نہیں چاہتے۔ آپ کہیں گے "میاں حصہ اس سے مانگو جو رشوت لیتا ہو" وہ کہے گا اور یہ سیٹھ لوگوں سے تنہائی میں کیا گفتگو ہوتی ہے؟ آپ کہیں گے۔ "PLEASE MIND YOUR BUSINESS" وہ کہے گا۔ اچھا جائیے۔ لیکن آئندہ ہوشیار رہئے گا۔" آپ دل میں ڈرتے ہوئے ہیڈ کلرک کے پاس پہونچیں گے۔ ہیڈ کلرک اشارہ سے پوچھے گا۔ کام ہو گیا؟ آپ سر کی جنبش سے کہیں گے "ہو گیا" اور پھر موقع محل دیکھ کر الیاس کا ذکر کریں گے ہیڈ کلرک غصہ سے نیم پاگل ہو جائے گا۔ جب وہ اپنے پاگل پن پر قابو پائے گا تو کہے گا "آپ جانتے ہیں وہ کس کا آدمی ہے؟" آپ کہیں گے "نہیں" وہ کہیگا "بڑے صاحب کے ہیڈ کلرک کا آدمی ہے" آپ کہیں گے "تو یہ" وہ کہے گا۔ بڑے صاحب کا ہیڈ کلرک میرا دشمن ہے۔ RIVAL ہے۔" آپ کہیں گے "اچھا۔ یہ بات ہے" وہ کہے گا "میری اسکی دشمنی پرانی ہے" آپ کہیں گے "اچھا" وہ کہے گا۔ وہ بہائی بھی ہے" آپ کہیں گے "اچھا۔" وہ کہے گا "بڑا صاحب بھی بہائی ہے" آپ کہیں گے "اچھا" وہ کہے گا "ان لوگوں نے میری بڑی حق تلفی کی ہے" آپ کہیں گے "اچھا" وہ کہے گا "پہلے ہم سب مل کر کام کرتے تھے" آپ کہیں گے "نہیں" وہ کہے گا "لیکن جب میں نے دیکھا، یہ لوگ بے ایمان ہیں تو میں نے اپنا الگ گروپ بنا لیا" آپ کہیں گے "ہوں" وہ کہے گا "جب ہی سے وہ ہمارے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ہم ان کے۔" آپ کہیں گے "ہوں" وہ کہے گا۔ "چھوٹے صاحب بہت جلد بڑے صاحب بننے والے ہیں۔" آپ کہیں گے "ہوں" وہ کہے گا "جب چھوٹے صاحب بڑے صاحب بن جائیں گے تو میں بد معاشوں کی اس ٹولی کا خاتمہ کرا دوں گا۔" آپ کہیں گے "ہوں" وہ کہے گا "آپ فکر نہ کریں۔ الیاس کو میں گرفتار کرا دوں گا" آپ کہیں گے "کیسے؟" وہ کہے گا "آپ دیکھتے رہئے۔"

اور دو تین دن بعد آپ دیکھیں گے کہ الیاس مارکسی صاحب چھوٹے صاحب کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ اسلئے دیکھیں گے کہ آپ بطور گواہ بیٹھے ہوں گے چھوٹے صاحب گرج کر کہیں گے۔ "تم نے رشوت لینا کب سے شروع کیا؟" الیاس کہیگا "حضور بھول ہو گئی۔ ایسی غلطی ہو گئی" وہ کہیں گے "تم جھوٹے ہو تم نے اس سے پہلے بھی رشوت لی ہے۔" الیاس کہے گا "نہیں صاحب" وہ آپ کی طرف دیکھ کر کہیں گے "تم نے اسے کبھی رشوت لیتے دیکھا تھا؟" آپ کہیں گے "رشوت لیتے تو نہیں البتہ سیٹھ یعقوب بھائی سے کچھ لیتے ضرور دیکھا تھا" وہ کہیں گے "THIS AMOUNTS TO BRIBERY" الیاس کہے گا "نہیں صاحب۔ میں نے سیٹھ یعقوب بھائی سے کچھ بھی نہیں لیا۔ میں تو پھنس جاتا کبھی نہیں" وہ چلا کر کہیں گے "چپ رہو جب تم نے اس بار رشوت لی ہے۔ تو اس سے پہلے بھی لی ہوگی" الیاس کہے گا "نہیں صاحب" وہ میز پر مکہ مار کر کہیں گے "گیٹ آؤٹ" اور پھر ہیڈ کلرک کی طرف مخاطب ہو کر کہیں گے۔ "یہ نوٹ جس پر میرے دستخط ہیں حفاظت سے رکھو۔ میں کیس بڑے صاحب کو REFER کر رہا ہوں" اور ہیڈ کلرک نوٹ لے کر اس کے ساتھ باہر آ کر مسکرانے لگے گا۔ آپ دونوں مسکرائیں گے اور الیاس دانت پیس کر کہے گا "میں اس کا انتقام لوں گا" آپ دونوں ہنستے نکلیں گے اور الیاس تپ سے باہر ہو کر کہے گا "تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟ کیس بڑے صاحب کے پاس جانے دو۔ پلک جھپکتے ختم ہو جائے تو کہنا۔" اور جب کیس بڑے صاحب کے پاس پہونچے گا تو وہ واقعی دب جائے گا۔ اور ایسا دبے گا کہ پھر کبھی نہیں ابھرے گا۔ کیونکہ الیاس مارکسی — ایک کٹا کمیونسٹ۔ فوراً بہائی بن جائے گا اور نہ صرف یہ کہ قولاً بن جائے گا بلکہ عملاً بہائیوں کے معاملات مقدسہ کی سیر بھی کرنے لگے گا۔

اس واقعہ کے بعد آپ ہیڈ کلرک کے بہت قریب ہو جائیں گے اور آپکی پوزیشن اس کے لفٹننٹ کی سی ہو جائے گی۔ اب آپ کو دیکھ کر لوگ جلیں گے

کچھ لوگ کڑھیں گے۔ اور کچھ لوگ مدد مانگیں گے۔ ان مدد مانگنے والوں میں ایک ٹائپسٹ لڑکی سب سے پیش پیش ہوگی۔ یہ لڑکی بھاری بھرکم جسم کے ساتھ ساتھ بدصورتی کی بھی حامل ہوگی۔ وہ آپ کے پاس آکر کہے گی ۔ "میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں"۔ آپ کہیں گے۔ "اچھا آپ کے دو بچے بھی ہیں"۔ وہ کہے گی۔ "مجھے صرف نوّے روپے ملتے ہیں"۔ آپ کہیں گے "مجھے معلوم ہے کہ آپ L.D.C ہیں"۔ وہ کہے گی "نوّے روپے میں ان دو بچوں کے ساتھ گزارا نہیں ہوتا"۔ آپ کہیں گے "نہیں ہوتا ہوگا"۔ وہ کہے گی "اللہ نے آپکو بہت دیا ہے۔ میری کچھ مدد کریں"۔ آپ کہیں گے۔ "آپکی امداد یہ ہے کہ آپ کو صحیح مشورہ دیا جائے"۔ وہ کہے گی۔ "مشورہ"؟ آپ کہیں گے "ہاں۔ شادی کا مشورہ"۔ وہ آہ بھر کر کہے گی۔ "مجھ سے شادی کون کرے گا؟ ... ایک بدصورت بیوہ سے شادی کون کرے گا۔ جس کے دو بچے بھی ہیں"۔ آپ کہیں گے "آپنے کوشش بھی کی ہے"؟ وہ سر جھکا کر کہے گی "بہتیری"۔ آپ پوچھیں گے۔ "آپ کے شوہر کا انتقال کب ہوا"؟ وہ کہے گی۔ "دو سال قبل"۔ آپ کہیں گے۔ "جب سے آپ بیوہ ہیں"؟ وہ گردن ہلا کر کہے گی "ہاں"۔ آپ کہیں گے "آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں"؟ وہ کہے گی "ہیں تو۔ مگر انہیں میری فکر نہیں"۔ آپ کہیں گے۔ "کوئی قریبی دوست نہیں"؟ وہ کہے گی "میں بہت سی عورتوں کو جانتی ہوں۔ مگر مصیبت میں کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ آپ کہیں گے۔ "اچھا۔ آپ مجھ سے کس قسم کی امداد کی توقع رکھتی ہیں"۔ وہ آپکی طرف یوں دیکھے گی گویا ابھی تنخواہ دی کا مطالبہ پیش کر دے گی۔ بس پھر اُسے اسی حالت کا احساس ہوگا۔ اور وہ کہیگی۔ "اتنی مدد کر دیجئے کہ میں اسا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکوں"۔ آپ پوچھیں گے۔ "آپ کے بجٹ میں کتنی کمی رہی ہے"۔ وہ سوچ کر جواب دے گی "تیس روپے کی"۔ آپ کہیں گے۔ "صرف تیس روپے کی"؟ وہ کہیگی "میں نے کم سے کم بتایا ہے"۔ آپ پوچھیں گے۔ "زیادہ سے زیادہ کیا ہے"؟ وہ کہے گی "پچاس روپے۔ اس میں بچوں کی بیماری وغیرہ کا باقاعدہ علاج وغیرہ شامل ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "اچھا آپ کو پچاس روپے ہر ماہ مل جایا کریں گے"۔ وہ خوشی کے مارے بیہوش ہو جائے گی۔ اور جب ہوش میں آئے گی تو اپنے دوپٹہ کے ایک سرے میں بندھے ہوئے دس دس کے پانچ نوٹ پائے گی۔ وہ آپ کو حیرت سے دیکھ کر کہے گی "کیا اسی ماہ سے"؟ آپ کہیں گے "اسی ماہ سے"۔ وہ کہے گی "میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں"؟ آپ کہیں گے "اپنی زبان پر تالا لگا کر"۔ .... لیکن وہ زبان پر تالا نہیں لگا سکے گی۔ اور اس کا ذکر دوسری ٹائپسٹ لڑکیوں سے کرے گی۔ اب آپ کے پاس ہر لڑکی آئے گی۔ اور اپنی صحیح، غلط مشکلات بیان کر کے روپیہ اینٹھنے کی کوشش کرے گی۔ آپ کو اس صورت حال پر غصہ آجائے گا۔ اور آپ ایک خوبصورت سی ٹائپسٹ لڑکی پر برس پڑیں گے "تمہیں مجھ سے روپیہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؛ تم جو روز چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کے گھر جایا کرتی ہو، تمہارے پاس روپے کی کمی ہو سکتی ہے؟ ایسی ہی کمی ہے تو جاؤ کسی سیٹھ کو پھانس کر بیاہ کر لو۔ یہاں کیا رکھا ہے؟" اور وہ آپ کی دشمن بن جائے گی۔ ... ..

اور آپ کی ان حرکتوں کی خبر جب ہیڈ کلرک کو ہوگی تو وہ آپ کو بلا کر پوچھے گا "بھئی یہ سخاوت کیسی"؟ آپ کہیں گے "ایک بیوہ اور اس کے بچوں کی مدد سخاوت تو نہیں"۔ وہ کہے گا۔ "کام تو نیک ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "اس میں بھی کوئی شک ہے کہ بیوہ خوبصورت بھی نہیں"۔ وہ کہے گا۔ "مگر اس میں بدنامی کا خطرہ ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "مجھے پرواہ نہیں"۔ وہ کہے گا "مجھے تو ہے"۔ آپ کہیں گے۔ "اوہ۔ اس ریعیت کی بدنامی"۔ وہ کہے گا "اور کس ریعیت کی؟" آپ کہیں گے "میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنی تنخواہ سے روپیہ دیتا ہوں۔ یہ کہ میں تنہا ہوں اور D C تنہا ہوں"۔ وہ کہے گا "دشمنوں کی زبان آپ روک نہیں سکتے"۔ آپ کہیں گے۔ "پھر کیا کریں"؟ وہ کہے گا۔ "بُرا بھلا نام بُرا آپ کام کیجئے۔ مگر بدنامی مول نہ لیجئے"۔ آپ کہیں گے "کیسے"؟ وہ کہے گا "کہ آپ بیوہ کو ڈانٹ دیجئے کہ آئندہ مجھ سے روپیہ مت مانگنا"۔ آپ کہیں گے۔ "یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا"۔ وہ کہے گا۔ "سُنئے تو۔ وہ ڈانٹ کر آپ جتنا ہو جائے ——— اور ہر ماہ روپیہ مجھے دیجئے۔ میں ایک فرضی انجمن کی طرف سے اُسے بھجوا دیا کروں گا۔ گھر پر ——— دفتر میں نہیں"۔ آپ کہیں گے۔ "تجویز تو معقول ہے"۔ وہ کہے گا۔ "اور احسان کرنے والے ہاتھ کا پتہ بھی نہ معلوم ہوگا۔ جس سے احسان واقعی احسان ہو جائے گا"۔ آپ کہیں گے۔ "مجھے منظور ہے"۔ وہ کہے گا۔ "تو پھر آج ہی" ... ... آپ کہیں گے "ہاں آج ہی میں دل پر پتھر رکھ کر بیوہ کو ایسا ڈانٹوں گا کہ بس بس"۔ وہ کہے گا "مجھے آپ کی یہ ادا بہت پسند آئی"۔ آپ کہیں گے "زندگی میں یہی تو ایک نیک کام کیا ہے میں نے"۔ وہ طنزیہ کہے گا۔ "اور دست غیب"؟ آپ شرما کر کہیں گے "کبھی کبھی طوائفوں کے پیسے سے مسجدیں، سرائے وغیرہ تعمیر ہو جاتی ہیں"۔ وہ کہے گا "ہاں سیفٹی ایکٹ کا استعمال بھی کبھی کبھی جائز ہو جاتا ہے"۔ آپ کہیں گے "خیر اب آپ زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ یہ میری خوبی سہی یا کمزوری۔ بہرحال یہ چیز مجھ میں موجود ہے"۔ وہ کہے گا "بری تو نہیں"۔ آپ کہیں گے "اچھا ایک بات اور ہے ——— یہ حسن بانو (خوبصورت ٹائپسٹ لڑکی) ہے۔ اس نے مجھ سے "............ وہ مسکرا کر کہے گا "مجھے سب معلوم ہے مگر مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے آپکی شکایت چھوٹے صاحب سے کی تھی

اور چھوٹے صاحب نے مجھے بلا کر تفتیش کے لئے کہا تھا۔" آپ گھبرا کر کہیں گے تو نوبت یہاں تک پہونچی .... حرامزادی کہیں کی"۔ وہ کہے گا "لیکن میں نے صاحب سے عرض کیا کہ حسن بانو کا خیال غلط ہے"۔ آپ کہیں گے "اس حرامزادی کا خیال کیا تھا؟" وہ کہے گا۔ "یہی کہ آپ نے بیوہ کی عصمت کی قیمت .... آپ غصہ سے ہونٹ چبانے لگیں گے۔ وہ کہیگا۔ "میں نے صاحب سے کہا کہ بیوہ آپ کی خالہ زاد بہن ہے۔ اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور پھر " وہ آپ کے کان میں کہے گا۔ "یہ کہ حسن بانو آپ سے اس لئے جلتی ہے کہ آپ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے"۔ آپ کہیں گے "BRAVO" وہ کہے گا "صاحب کے دماغ میں یہ بات اسی بیٹھی کہ اب وہ حسن بانو سے ناراض ہیں۔ اور حسن بانو کو کچھ معلوم نہیں"۔ آپ کہیں گے "میرا جی چاہتا ہے کہ اس حرافہ کو CRUSH کر دوں مسل کر رکھ دوں"۔ وہ کہے گا "خود سے مسلی ہوئی ہو اُسے آپ مسل کر کیا کرینگے"۔ آپ کہیں گے "میں اسے اس کے ٹھکانے پہونچا دوں گا۔ وہ کہے گا "وہ اپنے ٹھکانے پر ہی ہے"۔ آپ کہیں گے "چکلے اور دفتر میں کچھ فرق نہیں"۔ وہ کہے گا "کچھ نہیں۔ ان لڑکیوں کو آپ WAC [I] دیکھائی سمجھ لیجئے جن کا کام ہی مردوں کا دل بہلانا ہے"۔ آپ کہیں گے "ہماری سرکار ہماری ضرورتوں کا کتنا خیال رکھتی ہے"۔ وہ کہے گا۔ "بے شک ہماری سرکار بڑی مہربان ہے"۔ آپ کچھ سوچکر کہیں گے "میری ایک خواہش ہے" وہ کہے گا "کیا؟" آپ کہیں گے "مجھے کچھ دنوں کے لئے ٹائپسٹ کا انچارج بنا دیجئے"۔ وہ کہے گا "کیوں؟" آپ کہیں گے "بس یونہی میرا جی چاہ رہا ہے"۔ وہ کہے گا۔ "اور جو کام آپ کر رہے ہیں؟" آپ کہیں گے "میں اسے بھی کرتا رہوں گا"۔ وہ کہے گا "اچھا آج ہی آرڈر نکلوا دیتا ہوں۔ لیکن کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا"۔ آپ کہیں گے کہ "مطمئن رہئے۔ کوئی بات گرفت میں نہ آئے گی"۔ ۔ ۔ اور دوسرے دن آپ حسن بانو کے سر پر سوار ہوں گے۔ "فلاں لیٹر ٹائپ ہو گیا" وہ کہیگی "ابھی نہیں"۔ آپ پوچھیں گے "فلاں نوٹ ٹائپ ہو گیا؟" وہ کہے گی "نہیں" ۔ آپ کہیں گے "ہر لڑکی کو روزانہ اتنے ہی پیپر ٹائپ کرنے پڑیں گے جتنے کہ مرد ٹائپسٹ کرتے ہیں"۔ لڑکیاں شور مچانے لگیں گی "ہم سے اتنا کام نہیں ہو سکتا"۔ آپ پوچھیں گے "کیوں نہیں ہو سکتا؟" وہ کہیں گی "ہم لڑکیاں ہیں"۔ آپ کہیں گے "پیسے تو آپ اتنے ہی لیتی ہیں جتنے کہ مرد ٹائپسٹ لیتے ہیں"۔ وہ کہیں گی "ہمارا ان کا مقابلہ کیا؟" آپ کہیں گے "کیوں؟ مقابلہ کیوں نہیں۔ آپ کا تقرر بالکل انھیں شرائط پر ہوتا ہے جن پر مردوں کا"۔ وہ کہیں گی "ہماری ان کی برابری کا سوال نہیں پیدا ہوتا"۔ آپ کہیں گے "آپ ہر میدان میں مردوں کی برابری کا دعویٰ کرتی ہیں

تو اس میدان میں کیوں پیچھے ہٹ رہی ہیں؟ ـــــ اچھا ـــ کام کیجئے میرا منہ نہ تکئے۔ میں کسی سے رعایت نہیں کروں گا۔ میں عورت مرد کو ایک ہی نظر سے دیکھوں گا۔ خواہ کسی کو اچھا لگے یا بُرا" ...... اور پھر آپ سوچیں گے مہینے میں آٹھ دس دن تو ان کا دماغی توازن درست نہیں رہتا۔ اور جن دنوں درست رہتا ہے انھیں اپنی محبت کی فکر رہتی ہے۔ بچوں کی فکر رہتی ہے۔ گھر کی فکر رہتی ہے۔ یہ کیا خاک کام کریںگی ۔ اور اچانک آپ دیکھیں گے یا محسوس کرینگے کسی لڑکی کا چہرہ فق ہوا جا رہا ہے کسی لڑکی کی کمر دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ کسی لڑکی کی انگلیاں درد کر رہی ہیں۔ کسی لڑکی پر غشی طاری ہو رہی ہے۔ کسی لڑکی کا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور جب یہ کیفیت دیکھیں گے تو آپ کو افسوس ہونے لگے گا۔ اور آپ بیوہ کے کان میں کہیں گے۔ "آپ جا سکتی ہیں آپکے چنو منو آپ کو بُلا رہے ہونگے"۔ وہ آپ کا شکریہ ادا کر کے گھر بھاگ جائیگی پھر آپ ایک دوسری لڑکی سے کہیں گے۔ "آپ آرام کر لیجئے۔ تھک گئی ہوں گی" وہ کہیگی۔ "تھینک یو"۔ پھر آپ ایک تیسری لڑکی سے کہیں گے۔ "آج آپ نے بہت کام کیا اب بس کیجئے"۔ اور اس کے بعد آپ حسن بانو سے کہیں گے "کیا حال ہے؟" اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہونگی۔ آپ پھر دریافت کرینگے۔ "بیگم صاحب کیا حال ہے؟" وہ کوئی جواب نہ دیگی آپ پھر کہیں گے "مس حسن بانو کیا حال ہے"۔ وہ یکبارگی ٹائپ کرنا بند کر دے گی۔ اور رونا شروع کر دیگی۔ اور چلائیگی "آپ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔ ایک غریب لڑکی پر ظلم کر رہے ہیں میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے ۔ آپ ۔ آپ۔" اس پر اچانک ہسٹریا کا دورہ پڑیگا اور آپ گھبرا جائینگے۔ دوسری لڑکیوں کی مدد سے حسن بانو ہوش میں آئے گی۔ تو آپ کہیں گے "گھر جایئے آپ تھک گئی ہیں کل سے آپ (اس کے کان میں) میرے دل میں کام کیجئے گا"۔ حسن بانو خوش ہو جائے گی۔ آپ پھر اس کے کان میں کہیں گے "مگر اس کی شکایت کسی سے نہ کیجئے گا"۔ وہ مُسکرا جائے گی۔ آپ کہیں گے "چلئے میں آپ کو گیٹ تک پہنچا آؤں" اور آپ گیٹ پر اس کے ہاتھ میں پانچ کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہیں گے۔ "یہ وکٹوریا کا کرایہ ہے"۔ وہ دفعتًا کہیگی "آج شام کو آپ مجھ سے کہیں مل سکتے ہیں؟" آپ کہیں گے "کیوں نہیں" وہ کہے گی۔ "گرینڈ ہوٹل کیسا رہیگا"۔ آپ کہیں گے۔ "بہت ہی FINE ـــ GRAND" اور پھر آپ کسی نہ کسی ٹائپسٹ لڑکی کے ساتھ روزانہ گرینڈ ہوٹل کا چکر لگائیں گے۔ اور آپ کی جیب روز کے روز خالی ہو جایا کریگی۔ لیکن آپ بیوہ کے حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرینگے۔ اس کے حصہ کی رقم کا کر ہیڈ کلرک کے پاس جمع کرا دیا کرینگے۔ اور یہی نہیں آپ اُسے روزانہ آدھے دن کی چھٹی بھی دے دیا کرینگے۔ تاکہ وہ اپنے بچوں کی ٹھیک طرح دیکھ بھال کر سکے اور آپ یہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے کہ "یہ لڑکی اس منسٹری میں فٹ نہیں ہوتی"۔

اور پھر آپ ایک نہ ایک دن ان ٹائپسٹ لڑکیوں سے اکتا جائیں گے اور ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ اور آپ کوشش کریں گے کہ آپ کی بیماری ختم ہو جائے۔ مگر جو زہر آپ نے اپنی خوشی سے اپنے گلے میں ڈالا وہ کیسے آسانی سے اتر سکتی ہے؟ آپ بدستور ان کے خارج ٹائپسٹ ہی رہیں گے۔ لیکن ادھر کا رُخ بہت کم کریں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ کام اب نہیں چلتا تو آپ دفتر ہی سے گول ہونے لگیں گے۔ اور آپ کے متعلق مشہور ہو جائے گا کہ آپ OUT DOOR DUTY انجام دے رہے ہیں جب آپکی غیر حاضری پر زیادہ چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی تو پھر آپ OFFICIALLY یعنی کچھ کچھ غائب ہونے لگیں گے۔ اور جب اس سے بھی کام نہیں چلے گا تو پھر آپ گھر میں بیماری کی درخواستیں بھیجنا شروع کر دیں گے۔ اور آپ کی چھٹیاں دو ہفتے فی ماہ کی رفتار سے اڑنے لگیں گی اور جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی تو ایک دن ESTABLISHMENT کلرک آ کر آپ سے کہے گا "میاں تم یہ کیا کر رہے ہو؟" آپ کہیں گے "کیا؟" وہ کہے گا "چھٹیاں کیوں ضائع کر رہے ہو؟" آپ کہیں گے "کیا کروں طبیعت ہی ایسی پر محسوس ہوں"۔ وہ پوچھے گا "ایسی کیا مجبوری ہے؟" آپ کہیں گے "ذرا اپنی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ یہی کوڑنے میں ... رہتا ہے"۔ وہ کہے گا "دوست معاملہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے"۔ آپ کہیں گے "ممکن ہے تمہیں نظر آتا ہو"۔ وہ کہے گا "خیر تمکو اگر چھٹیاں ہی لینی ہیں تو پھر تم فرنچ لیو کیوں نہیں لیتے؟" آپ کہیں گے "فرنچ لیو کیا بلا ہے؟" وہ کہے گا "چھٹیاں لو اور حاضری کے رجسٹر پر دستخط کر دو"۔ آپ کہیں گے "چھٹیوں سے پہلے ہی؟" وہ کہے گا "بعد میں مناسب ہوگا"۔ آپ کہیں گے "اس پر اعتراض تو نہ ہوگا؟" وہ کہے گا "اعتراض کرنے والا کون ہے مگر آپ کے ہیڈ کلرک، اور S.O."۔ آپ کہیں گے "یہ اسکیم تو بہت اچھی ہے"۔ وہ کہے گا "جہاں تک ہیڈ کلرک کا تعلق ہے وہ آپ پر کبھی اعتراض کرنے کا نہیں، لیکن S.O. کا معاملہ ذرا کچھ ٹیڑھا ہے، تو اس کی ترکیب یہ ہے کہ تم درخواست لکھو، اور جب یہ درخواست منظور ہو کر لوٹ آئے تو ہیڈ کلرک سے کہہ کر اسے دبا لے، اور پھر جب تم چھٹی سے واپس آؤ تو حاضری کے رجسٹر پر دستخط کر دو۔ اور درخواست لے کر پھاڑ دو"۔ آپ کہیں گے "S.O. اگر یہ کہے گا کہ یہ شخص غیر حاضر تھا اسکی دستخط کیسی؟" وہ کہے گا "ارے یار S.O. کو اگر اتنا ہی یاد رہے تو پھر اس کا دفتر ہی کون مانے"۔ آپ کہیں گے "دوست تم واقعی پکے دوست ہو"۔ وہ مسکرا کر کہے گا "بھائی دوستوں کو دوست نہیں جتاتے"۔ چنانچہ تم نے تمہاری چھٹی کی درخواستیں اپنی میز کی دراز میں بند کر دی ہیں، صرف کہنے کے لئے ایک LEAVE REGISTER پر چڑھا دی ہیں۔ آپ خوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہیں گے "WELL DONE" وہ کہے گا "میں نے تم سے کوئی سارٹیفکٹ نہیں مانگا اب تک۔ جانتے ہو کیوں؟" آپ کہیں گے "نہیں"۔

وہ کہے گا "اس لئے کہ میں نے تمہاری مصروفیات دیکھ کر خود ہی تمہارا کیرکٹر سارٹیفکٹ حاصل کر کے تمہاری فائل میں لگا دیا ہے"۔ آپ اچھل کر کہیں گے "واقعی؟" وہ کہے گا "چلو دیکھ لو"۔ اور آپ جا کر فائل دیکھیں گے تو اس میں ایک فرسٹ کلاس گزیٹیڈ آفیسر (S.O.) کا دیا ہوا حسب ذیل سارٹیفکٹ نظر آئے گا۔

"میں تصدیق کرتا ہوں کہ میں مسٹر ۔ ۔ ۔ ۔ کو عرصہ پانچ سال سے جانتا ہوں وہ بہترین نیک اطوار اور عادات کا مالک ہے۔ اور اس کی ایمانداری اور فرض شناسی شبہ سے بالاتر ہے"۔ آپ اس سارٹیفکٹ کو دیکھ کر اپنے دوست کا شکریہ اس طرح ادا کریں گے کہ آپ تھسٹ کر کینٹین لے جائیں گے اور اسکے سامنے کیک، مٹھائی وغیرہ کا انبار لگا کر کہیں گے "بھئی تم نے مجھے ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ میں اس سارٹیفکٹ کے لئے جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا۔ کیونکہ فرسٹ کلاس تو کجا کسی تھرڈ کلاس (S.O.) کو بھی نہیں جانتا۔" وہ کہے گا۔ "A friend in need is a friend indeed"۔ آپ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دبائیں گے اور کہیں گے۔ "That is absolutely true" اور پھر آپ دوستی کے اس ٹھوس ثبوت سے ایسے متاثر ہوں گے کہ آپ اپنی موجودہ مشکلات کا تذکرہ اس سے کر ڈالیں گے وہ سب کچھ سن کر کہے گا "یار تم بھی پاگل ہو معلوم ہوتے ہو۔ لڑکیوں سے چھپنے کی ضرورت کیا ہے؟ انھیں میلے کپڑوں کی طرح اتار کر پھینک دو۔ جیسے دوسرے لوگ کرتے ہیں"۔ آپ کہیں گے "میں ان سے آنکھیں نہیں چار کر سکتا، کیونکہ میرا ضمیر" ۔ وہ کہے گا "ضمیر کی ایسی تیسی اس معاملہ میں ضمیر کا کیا کام؟" آپ کہیں گے "پھر بھی ایک حیثیت ہی ۔ ۔ ۔" وہ کہے گا "اس کا علاج یہ ہے کہ تم کچھ دنوں کے لئے ٹور پر چلے جاؤ۔ اور جب وہاں سے لوٹو گے تو سب کچھ بھول چکے ہو گے"۔ آپ کہیں گے "ٹور؟" وہ کہے گا "ہاں۔ اگر تم جانے پر تیار ہو تو میں اس کا بندوبست کر سکتا ہوں"۔ آپ سوچ کر کہیں گے "اچھا میں تیار ہوں مگر ہیڈ کلرک ۔ ۔ ؟" وہ کہے گا "وہ کیا کرے گا، میں تمہیں ایڈمنسٹریٹو آفیسر (A.O.) کے ساتھ ATTACH کر دوں گا جو کل ایک لمبے ٹور پر جانے والا ہے اسے ایک سو سہارا کلرک کی ضرورت ہے"۔ آپ کہیں گے "اچھا تو میں تیاری کروں؟" وہ کہے گا "چلو میں تمہیں اس سے ملا دوں۔ اگر وہ راضی ہو گیا۔ تو آج ہی آرڈر کرا دوں گا۔" A.O. سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گے۔ اور وہ بھی آپ کو دیکھ کر اپنے ساتھ لے جانے کی حامی بھرنے گا۔ بس دوسرے دن آپ ٹور پر ہوں گے

(باقی آئندہ)

م۔ نسیم

لطائفِ شیخ چلّی

لطیفہ
شیخ چلی اور ایک گانے والی کا۔

شیخ چلی ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے والدین ضعیفی میں داغ مفارقت دے کر چل بسے۔ باپ کے بعد شیخ چلی نے اپنا بار ماں پر ڈالا۔ بے چاری ماں کی پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن کب تک۔ باپ کے معاملہ میں وہ کمزور بھی تھی۔ اور غریب بھی۔ اس لئے کام زیادہ دنوں تک چل نہیں سکا شیخ چلی کی ماں نے تنگ آکر آخر شیخ چلی کی شادی کردی۔ چونکہ بہو کافی دولت ساتھ لائی تھی اس لئے بہت دنوں بعد اللہ نے ماں بیٹے کے دن پھیرے شیخ چلی نے اس خوشی میں اپنے سارے دوستوں کی دعوت کی۔ جو ایک اور دعوت کے وعدے پر ختم ہوئی۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا مگر دوستوں کا ان دعوتوں میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ شیخ چلی نے سبب پوچھا تو دوست بولے بھائی یہ دعوتیں بہت روکھی پھیکی ہیں کچھ رنگ جمے تو آئیں۔ مجبوراً شیخ چلی نے گانے بجانے کا رنگ جما دیا۔ اب تو ان کے سب دوست بلکہ ان دوستوں کے بھی سب دوست دعوتوں میں آنے لگے۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ گانے کی محفل میں ایک دوست اور شیخ چلی میں انعام دینے پر مقابلہ ہوا۔ جس میں اس بے حیا دوست نے شیخ چلی کو ہرا دیا۔ معلوم نہیں وہ اتنی دولت کہاں سے لے آیا تھا۔ شائد حرام کی کمائی تھی۔ کچھ بھی ہو۔ مگر دونوں میں تیز تیز تا تاری ہوگئی۔ بڑھتے بڑھتے نوبت ہاتھا پائی تک پہونچی۔ شیخ چلی نے اپنے بزرگوں کی روایت کے مطابق چاقو نکال لیا۔ اب تو چاروں طرف بھاگڑ مچ گئی۔ اس ہڑبونگ میں خدا کی قدرت، کہ گانے والی کا آخری وقت آن پہنچا۔ آئی گھڑی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔ شیخ چلی نے مجبوراً چاقو اس کے بھونک دیا۔ وہ گر کر تڑپنے لگی۔ مگر آخر وہ کہاں تک تڑپتی۔ وقت تو آہی گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ٹھنڈی ہو گئی۔ اب جس نے بڑھ کر اُسے چھوا اس کے ہوش اڑگئے۔ شیخ چلی دل کے نرم تھے یہ دیکھ کر اُن کو رحم آیا۔ اُنھوں نے سب کی ڈھارس بندھائی اور دلا دیا اور بولے اس رونے سے کیا فائدہ اللہ تم سب کو صبر دے اور مرحومہ کو غریق رحمت کرے۔ اس کے بعد انھوں نے سب سے پہلے کمرے کی صفائی شروع کرنے کو کہا تاکہ اگلی محفل تک سب خیر قرینے سے لگ جائے لاش سے کمرہ بہت گندہ لگ رہا تھا۔ شیخ چلی اس جھنجھٹ سے نجات پانے کے لئے اسے ایک بوری میں بند کر کے گھر کے اندر کنویں میں ڈال آئے۔ ماں نے لال لال بوری دیکھی تو بلائیں لیں پھر دعائیں دیں۔ پھر پوچھا بیٹا کیا ہے۔ شیخ چلی بولے ماں نوشا سیم ایک دوا ہوتی ہے۔ کنواں صاف کرنے کی۔ وہی ڈال رہا ہوں۔ ماں بلائیں لے کر دعائیں دینے لگی۔ شیخ چلی باہر آکر دوستوں سے بولے کون کون مصیبت میں پھنسنا چاہتا ہے۔ سب چپکے بیٹھے رہے۔ پھر شیخ چلی نے کہا۔ اچھا کون کون اپنا بھلا چاہتا ہے سب نے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ شیخ چلی نے کہا تو یاد رکھو یہ بات اگر کسی نے خواب میں بھی منہ سے نکالی تو میرا کنواں بہت بڑا ہے اور میرے پاس بوریاں بہت ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سب نے یکا وعدہ کیا اور منہ بند کر کے باہر نکلے۔ پھر جدھر جس کا منہ اٹھا ادھر وہ چل دیا اور اس طرح سب اپنے اپنے ٹھکانے پہونچ گئے۔

اِدھر تو یہ ہوا۔ اب ادھر گانے والی کے رشتے داروں کا حال سنو۔ جب انھوں نے اسے غائب پایا تو جا کر پولیس میں رپورٹ لکھا آئے۔ مگر (اس سے کیا ہوتا ہے) کچھ دن انتظار کے بعد وہ پھر تھانے گئے اور پھر رپورٹ لکھوا آئے۔ مگر اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ آخر اُن کو خدا نے سمجھ دی اور ان میں سے ایک بولا کہ بھائیو بھلا کبھی کوئی رپورٹ لکھانے کی جگہ ہے۔ یہ رپورٹ تو تھانے دار صاحب کو ہی جا کر دینی چاہئے۔ دوسرے دن وہ سب تھانیدار صاحب کے گھر پہونچے اس بات میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ تھانیدار صاحب نے دوسرے ہی دن سے دوڑ دھوپ شروع کردی آخر سراغ لگاتے لگاتے وہ شیخ چلی کے محلے میں پہونچ ہی گئے۔ وہاں ان کے ایک دوست نے جسے اپنے بھلے برے کی پہچان نہ تھی تھانیدار صاحب سے کہا۔ آپ شیخ چلی کے ہاں

جائیے وہاں آپ کو ایک کنواں ملے گا۔ اس کے چاروں طرف شیخ جی کا گھر بنا ہوگا اور کنارے پر اس کی ماں ہوگی۔ اتنا پتہ پاتے ہی تھانے دار صاحب باغ باغ ہوگئے۔ اور سیدھے شیخ چلی کے گھر جا پہونچے۔

شیخ چلی گھر میں بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے۔ ایک لفافہ اُن کو ایسا نظر آیا کہ وہ اُسے دیکھ کر اُچھل پڑے۔ یہ دیکھ کر ماں دوڑی ہوئی آئی بلائیں لیں، [illegible] دعائیں دیں پھر بولی۔ بیٹا کیا بات ہے شیخ چلی بولے، ماں بس پوچھو نہیں۔ آج ہمارے گھر میں روپوں کی بارش ہونے والی ہے ماں نے کہا کون کرے گا۔ شیخ چلی بولے اب کوئی دم میں کوئی آکر کرے گا۔ اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی ماں نے دعائیں دے کر کہا۔ لو بیٹا اللہ کا نام لیکر باہر سدھارو۔ روپے برسانے والے آگئے۔ شیخ چلی باہر نکلے تو دیکھا تھانے دار صاحب کھڑے مونچھیں [illegible] کر رہے ہیں، وہ جھک کر آداب بجا لائے اور گھر میں سے ایک کرسی اور ایک آئینہ لائے کرسی پر تھانیدار صاحب کو بٹھا کر آئینہ ہاتھ میں دیا [illegible] بولے۔ اب کہیے غریب پرور کیسے رحمت کی۔ اتنے میں شیخ چلی کی ماں نے جو مارے اشتیاق کے دروازے تک آگئی تھی پردے کے پیچھے سے [illegible] ارے بیٹا رحمت کہاں ہے۔ [illegible] روپیے برسائیں۔ یہ سنکر تھانیدار صاحب کے دونوں کان [illegible] کھڑے ہوگئے۔ اُن کا غصہ رفع ہوگیا اور نرم لہجہ میں انہوں نے پوچھا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ شیخ چلی نے دبے لہجہ میں عرض کی۔ حضور کچھ نہیں آپکے [illegible] معمے کا پہلا انعام نکلتے ہی [illegible] تھانیدار صاحب کرسی سے اٹھے تپاک سے ہاتھ ملایا [illegible] گانے والی کے رشتہ داروں کو [illegible] جنھوں نے اللہ کے ایسے نیک بندے کو تنگ کرنے کے لئے [illegible] شیخ چلی [illegible] پانی پانی ہوگئے۔ وہ بولے حضور [illegible] نے آپ کو یہاں [illegible] صاحب نے ان کے دوست کا پتہ دیا شیخ جی رات میں [illegible] اگر اسے آپ کے ہاتھوں گزند [illegible] شیخ چلی نام ہے۔ تھانے دار صاحب نے جوش میں سپاہیوں سے کہا [illegible] اور جب تک اگلے سال [illegible] نہ کھولو سپاہی خوش خوش چلے گئے۔ تھانے دار صاحب نے شیخ چلی کی ماں کو اطمینان دلایا کہ بس روپیے آنے ہی والے ہوں گے۔ یہ سُن کر اس نے تھانے صاحب کی بڑی خاطر مدارات

کی اس سے فارغ ہوکر تھانے دار صاحب نے جیب سے معموں کے کچھ کوپن نکالے اور شیخ چلی سے بہت دیر تک راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے چلتے ہوئے انہوں نے کہا اگر کوئی کام میرے لائق ہو تو ضرور بتائیے گا۔ تھانے کو اپنا گھر سمجھئے جب جی چاہے شوق سے آئیے۔ شیخ جی نے شکریہ ادا کرکے ان کو پُرنم آنکھوں کے ساتھ رخصت کیا۔ رات کو ایک دوسرا لفافہ آیا۔ کہ معمے کا حل دراصل کچھ اور ہے اور انعام اب کبھی نہیں مل سکے گا۔ شیخ چلی نے یہ پڑھکر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر دعا مانگی کہ اس صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت دے تاکہ وہ اگلے معمے کا حل سوچ سکیں وہ اللہ کی رحمت سے ابھی تک مایوس نہیں ہوئے تھے۔

لطیفہ
شیخ چلی اور بڑھیا کے گھر چوری کا

کچھ دن بعد شیخ چلی پھلوں اور مٹھائی کی دو ٹوکریاں لے کر تھانے پہونچے تھانے دار صاحب تپاک سے ملے اور بیٹھنے کو کہا شیخ چلی بولے پہلے یہ ٹوکریاں بچوں کو بھجوا دیجئے پھر بیٹھوں گا۔ مجبوراً تھانیدار صاحب نے ایسا ہی کیا۔ تب شیخ چلی بولے حضور میں حیران ہوں کہ جنھوں نے آپ کو جھوٹی رپورٹ لکھا کر اتنا پریشان کیا ان کو آپ نے یونہی چھوڑ دیا۔ آخر وہ لوگ کیا سوچیں گے کہ آپ کیا ہیں؟ یہ سُن کر تھانیدار صاحب کو یاد آیا کہ وہ کیا ہیں انھوں نے شیخ چلی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا آج تم نے میری آنکھیں کھول دیں اس کا بدلہ یہ ہے کہ جیسی بھی تمہاری رائے ہوگی ویسا ہی کیا جائے گا۔ شیخ چلی بولے حضور میں کیا اور میری ناچیز رائے کیا مگر سنیئے یہ کہکر انھوں نے تھانے دار صاحب کو اپنی ناچیز رائے سے آگاہ کردیا۔ تھانے دار صاحب سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے ہاتھ ملا کر ویسا ہی کرنے کا وعدہ کرلیا۔

رات کو شیخ چلی اور تھانیدار صاحب تین چار سپاہیوں کے ساتھ اُس گانے والی کے رشتہ داروں کے ہاں پہنچے کوٹھے پر پہونچتے ہی وہ سب ان کو دیکھ کر سرو قد کھڑے ہوگئے۔ مگر تھانیدار صاحب کو ان کا یہ انداز ذرا نہ بھایا۔ انھوں نے سپاہیوں سے کہا باندھ لو انہیں اور خوب پیٹو۔ یہ سُنکر وہ سب اُن کے قدموں میں گر پڑے۔ مگر [illegible] کم تھی۔ کچھ لوگ گرنے سے رہ گئے۔ یہ دیکھ کر تھانیدار صاحب کا پارہ بہت

اونچائی تک چڑھ گیا۔ اور انہوں نے گرج کر جھوٹی رپورٹ لکھانے کے جرم میں اُن کا کم از کم قیمہ بنا ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تب شیخ چلی اُن سب کو ایک طرف لے گئے۔ اور بیٹ بد سمجھاتے رہے۔ بارے خدا خدا کرکے وہ سمجھے اور واپس آکر بولے۔ حضور۔ ہمارا قیمہ نہ بنائیے ہم کھنڈی مار کے بہترین کباب بھی حاضر کرتے ہیں اور ساتھ ہی پینے کا شغل کرنے کے لئے بھی۔ یہ سُنکر تھانے دار صاحب ٹھنڈے پڑے اور انھوں نے رحم دلی کے ساتھ اُن کا قصور معاف کرتے ہوئے گانے کی محفل شروع کرنے کا آرڈر دیا۔ وہاں کس بات کی دیر تھی۔ پیالے چھلکنے لگے۔ ناچ گانا شروع ہوئے۔ پھر سالن بھی آگیا۔ اور تھانے دار صاحب نے اُن کے اگلے پچھلے سب قصور معاف کر دئیے۔

جب اس طرح آدھی رات گزر گئی۔ اور سارا عالم سو گیا تو سب خوب مدہوش ہوگئے۔ شیخ چلی اٹھ کر صحن میں آئے دیکھا اُن سب کی ماں، ایک بوڑھی عورت منہ کھولے سو رہی ہے۔ شیخ چلی کو اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ کہ حیف یہ غریب یوں پیاسی پڑی رہے۔ اور میں گلچھرے اڑاؤں۔ ترس کھا کر وہ ایک بوتل اندر سے لائے۔ اور اس کے منہ میں انڈیل دی اسکو خواب میں بھی ایک دم کبھی ایسی نعمت اس طرح ملنے کا خیال نہ تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور چیخنے لگی۔ مگر شیخ چلی جانتے تھے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ بڑبڑاتے گئے شور سُنکر سب اٹھ بیٹھے۔ اور شیخ چلی کو آکر ہٹانے لگے مگر وہ ایسی باتوں میں کب آسکتے تھے۔ انھوں نے نہ بڑی بی کو چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ اب پھر اللہ کی قدرت دیکھو۔ کہ کوتوال شہر، جو اب کپتان پولیس کہلاتے تھے، چند سپاہیوں کے ساتھ گشت کو نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ شور سُنا تو اوپر چڑھ آئے۔ اُن کو دیکھ کر کوئی کہے پولیس آگئی۔ یہ سُنکر سب کے نشے ہرن ہوگئے۔ کوئی پاخانے چلا گیا کوئی نہانے کے غسل خانے میں گھس گیا۔ کوئی پلنگ کے نیچے سونے کے لئے جا لیٹا۔ کسی نے جگہ نہ پائی تو کھڑکی سے کود کر دوسرے گھر میں چلا گیا۔ شیخ چلی کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ چھت پر کوئی بلی سے تنگ کر چھپ گئے۔ کپتان صاحب نے آکر دیکھا تو بڑھیا بے حال تھی۔ بڑی کوشش کرنے پر جب وہ ہوش میں آئی تو اسے یاد آیا کہ ابھی پوری بوتل تو ختم ہی نہیں ہوئی تھی۔ آدھی بوتل اُس کے حصے کی باقی تھی۔ یہ خیال کرکے وہ چیخنے لگی۔ جب اس کی نظر اوپر گئی تو دیکھا شیخ چلی بوتل لئے لٹکے ہیں۔ بس وہ مچل گئی اور اُن کی طرف اشارہ کرکے غل مچانے لگی۔ کپتان صاحب نے مجبوراً سپاہیوں کو اوپر چڑھا کر اُن کو پکڑوایا۔ جب شیخ چلی بوتل کے ساتھ نیچے لائے گئے، تو کپتان صاحب نے اُن کو پہلے خوب پٹوایا۔ پھر گالیاں دیں پھر پٹوایا پھر گالیاں دیں آخر تھک کر بولے کم بخت تو جانتا نہیں یہ بمبئی ہے۔ یہاں شراب پینا بیچنا بنانا خریدنا سب منع ہے۔ پھر بھی اس فیاضی سے اس بڑھیا کو پلا رہا تھا۔ شیخ چلی روتے ہوئے بولے۔ حضور میں تو خود بھی پی رہا تھا۔ کپتان صاحب نے سپاہیوں سے کہا کہ بڑھیا اور اسے دونوں کو پکڑ لو شیخ چلی بولے حضور ایسا نہ کیجئے۔ میرے باقی ساتھی میرے بغیر کیسے رہیں گے کپتان صاحب نے ان کا پتہ پوچھا شیخ چلی نے سب پتے لکھوا دئیے کپتان صاحب نے غسل خانے سے پاخانے سے۔ چارپائی کے نیچے سے باہر کے گھر سے سب کو سپاہیوں سے ملوا لیا۔ اب شیخ چلی کو کچھ تسکین ہوئی کپتان صاحب شیخ چلی کو الگ لے گئے۔ اور اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر بولے۔ یہ تجھے کہاں سے مل گئی۔ شیخ چلی نے کہا حضور ایک خاص جگہ سے بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر لاتا ہوں مگر ایسی چیز شہر بھر میں نہیں مل سکتی۔ کپتان صاحب ذرا جھک کر بولے اچھا تو تھوڑا کر سکتا ہے اچھا سُن اگر دو بوتل ایسی ہی ہمارے چکھنے کے لئے حاضر کرے تو ہم تجھے وعدہ معاف گواہ بنا کر چھوڑ دیں گے۔ شیخ چلی مارے خوشی کے اُن کے قدموں پر لوٹنے لگے۔ اور بوتلیں لانا بسر و چشم قبول کی۔ دو دن بعد انہوں نے سچ مچ دو بوتلیں پھلوں کی ٹوکریاں میں رکھ کر کپتان صاحب کے بنگلے پر حاضر کر دیں۔ اس طرح خدا کے فضل سے ان کے دشمنوں کا منہ کالا ہوا مگر اُن کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

لطیفہ

شیخ چلی اور چار بیتوں کا

شیخ چلی اپنی دو بیویوں کے سے اتنا کچھ لے چکے تھے۔ کہ جب اس کے بعد انھوں نے اور کچھ لیا تو بیوی کے پاس زیوروں کے سوا اور کچھ نہ بچا۔ یہ دیکھ کر اس نیک بخت کی آنکھیں کھلیں اور اس نے فکر عاقبت شروع کر دی۔ بس ایک دن سب سامان لے کر شیخ چلی کو سوتا چھوڑ کر وہ اس دنیائے فانی سے عالم پاکستان کو سدھاری۔ شیخ چلی کو جب صبح اس جانکاہ حادثے کا علم ہوا تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُس عالم سے کون لوٹا ہے۔ جو وہ لوٹ سکتی۔ کچھ دن بعد جس مکان میں وہ اب رہتے تھے۔ اس پر کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا کیونکہ وہ بیوی کے نام کا تھا۔ جو وہ جہیز میں ساتھ لائی تھی۔ شیخ چلی نے کسی طرح منت سماجت کرکے کرایہ دار

کی طرح ہی رہنا منظور کرالیا۔ مگر اس طرح کب تک کام چلتا۔ باپ دادا کی عزت کو برابر بٹہ لگ رہا تھا۔ اور اِدھر ہر مہینے کرایے کا ہوّا الگ جان سکھائے دیتا تھا نتیجہ یہ کہ شیخ چلی پیسے پیسے کو ترسنے لگے۔ اور اُن کو نانی یاد آگئی۔ شیخ چلی کی ماں کو پتہ لگا تو پہلے وہ اپنی ماں کا زمانہ یاد کر کے بہت روئی پھر بولی بیٹا نانی کو کیا یاد کرتا ہے اللہ کو یاد کر۔ اور اب تو تو خدا کے فضل سے کھانے کمانے کے قابل ہو گیا ہے۔ بس اب کھیل کود بند کر دے۔ ان کو اٹھا کر طاق پر رکھو۔ اور باہر نکل کر دنیا کا رنگ دیکھو لو یہ ادھر اُدھر سے جمع کئے ہوئے چار پیسے دیتی ہوں۔ ضرور اللہ ان سے کوئی راہ نکالے گا۔ یہ سنکر شیخ چلی اپنے کھیل کود خوشگوار یادوں کو یاد کر کے بہت غمگین ہوئے، مگر دل پر پتھر رکھ کر آخر دنیا کے جھمیلوں میں پھنسنے کیلئے تیار ہو گئے

دوسرے دن خدا کا نام لے کر شیخ چلی گھر سے نکلے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے دشت و صحرا کی خاک چھانتے ایک دفتر پہونچے تھک کر چور ہو گئے تھے۔ چپراسی کے پاس بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے۔ چپراسی دیکھ کر سمجھ گیا۔ کہ کسی بھلے گھر کا بچہ ہے بُرا وقت پڑ گیا ہے تب ہی یوں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ اس نے ازراہ مہربانی حال پوچھا۔ شیخ چلی تو اس کے منتظر ہی تھے۔ شروع سے آخر تک اپنی کتھا سنانی شروع کی۔ وہ تھوڑی دیر تو صبر سے سنتا رہا پھر بات کاٹ کر بولا۔ تم اب یہاں کس لئے آئے ہو۔ شیخ چلی نے جیب سے پیسے نکالے۔ اور زور سے بولے کیا بتاؤں ان چاروں کی تلاش میں ہوں۔ چاہے ایک ملے چاہے سب مل جائیں سوچتا ہوں پہلے کس کو پکڑوں۔ یہ کہکر چاروں نام سُنا دیئے۔

اب مقدر کی بات دیکھو کہ اُسی کمرے میں اندر جو افسر بیٹھا تھا اس کا نام بھی ان چار میں سے ایک نام سے ملتا تھا وہ گھبرا کر سوچنے لگا۔ کہ آخر پولیس کو کیسے معلوم ہو گیا۔ کہ میں نے کل ایک نذرانہ لیا ہے۔ یہ پکڑنے کیسے آگیا کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ پولیس کی تیزی پر خوش بھی ہوتا۔ مگر یہ تو خود اس کا سوال تھا۔ وہ پولیس کو لعنت و ملامت کرتا اٹھا۔ اور باہر آکر بڑے تپاک سے شیخ چلی کو اندر لے گیا۔ پھر بولا آپ صاحب یہ ہمارے کسی دشمن کی کارروائی ہے۔ ورنہ ہمارا نام آپ کی فہرست میں کیسے آ سکتا ہے۔ شیخ چلی بولے۔ صاحب نام کسی طرح غلط نہیں ہو سکتا۔ تب وہ افسر گھبرا کر بولا۔ اچھا۔ مگر مہربانی کر کے معاملے کو کسی طرح ٹالئے۔ شیخ چلی کو خدا نے اس وقت اتنی سمجھ دیدی کہ وہ معاملہ فوراً بھانپ گیا۔ بولے اچھی بات ہے میں نام کاٹ دوں گا۔ مگر آپ کچھ ہمارا خیال بھی تو کیجئے۔ یہ سُن کر وہ افسر باغ باغ ہو گیا۔ اور جھٹ ایک کاغذ دیتے ہوئے بولا۔ یہ لیجئے اسٹیشن سپلائی کرنے کا یا کچھ ارکا ٹھیکہ ہے۔ آپ کے نام لکھے دیتا ہوں۔ بیس پچیس ٹنڈر آچکے ہیں۔ مگر ہم نے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے روک رکھا تھا۔ آپ لے جایئے۔ کسی اینٹوں والے سے مل کر معاملہ کر لیجئے۔ دو ہزار کی کمائی تو کہیں گئی نہیں۔ شیخ چلی نے حیران ہو کر کہا۔ تو پھر یہ آپ خود ہی کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ بولے ہم کوئی ایسے احمق ہیں ہمیں یہاں بیٹھے بیٹھے نذرانوں ہی سے اس سے زیادہ مل جاتا ہے مگر یہ ٹھیکہ بھی بس جادو کی چھڑی سمجھئے یہ سُن کر شیخ چلی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کاغذ لے کر روانہ ہو گئے۔

شامت کی مار، راستے میں ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوئی شیخ چلی کو خوش دیکھ کر اس نے حال پوچھا۔ شیخ چلی نے اسے احمق جان کر سارا حال بتا دیا وہ دوست اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ چائے پلائی اور موقع پا کر ٹھیکے والا کاغذ اڑا لیا اور اسکی جگہ ایک دوسرا کاغذ رکھ دیا۔ شیخ چلی نے گلستاں بوستاں کے سوا انگریزی کب پڑھی تھی۔ ان کو پتہ بھی نہ لگا وہ گھر چلے آئے۔ دوسرے دن وہ ایک ٹھیکہ دار کے پاس گئے تو وہ کاغذ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ بولا کیا تمہاری شامت آئی ہے یہ تو الیکشن کا فارم ہے۔ شیخ چلی اپنا منہ لٹکا کر چلے آئے دوسرے دن وہ پھر ہمت کر کے اسی افسر کے پاس پہنچے اور کہا جناب آپ کا نام نہیں کٹ سکا۔ ٹھیکہ دار بے ایمان نکلا۔

افسر نے دلاسہ دیا۔ چلو کوئی بات نہیں اپنا بھائی بندی تو ہے پھر ایک دوسرا کاغذ دے کر کہا اچھا یہ لیجئے یہ فرنیچر سپلائی کرنے کا ٹھیکہ ہے۔ پانچ سو سے کم اس میں بھی نہیں ملیں گے۔ یہ میں نے اپنے دوسرے بھائی کے لئے روک رکھا تھا شیخ جی اُسے لے کر دُم دبا کر چلے آئے۔

راستے میں وہی دوست ملا اور حال سُن کر پھر انہیں اپنے گھر لے گیا۔ وہاں پھر چائے پلاتے ہوئے وہ کاغذ اڑا لیا اور دوسرا کاغذ رکھ دیا شیخ چلی دوسرے دن جب ایک لکڑی کے تاجر کے ہاں گئے تو وہ

کاغذ دیکھ کر لال پیلا ہو کر بولا۔ کیا مجھے اُلّو سمجھتے ہو۔ شیخ چلی بولے
بس بس میں سمجھ گیا۔ اب تم یہ کاغذ پھاڑ ڈالو۔ پھر وہ روتے بسورتے
چلے آئے۔ راستے میں ان کو اپنے چائے والے دوست کا خیال آ گیا اس
بار تقدیر کی خوبی کہ سارا معاملہ شیخ چلی کے سمجھ میں آ گیا۔ وہ صبح کو پھر
اسی افسر کے پاس پہونچے اور صاف صاف ساری بات کہہ سنائی۔
آخر میں بولے اب آپ خود ہی انصاف سے کہیں میں آپ کا کام
کیسے کاٹ سکتا ہوں۔ افسر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دوست
تم سے بھی کچھ قدم آگے ہے۔ پھر ایک کاغذ دے کر کہا، یہ آخری ٹھیک
ہے۔ دفتروں کی صفائی کے لئے فنائل کے ٹن سپلائی کرنے کا۔ روپیے والے
ٹن آسانی سے تین روپیے پر سپلائی ہو جائیں گے۔ اگر محنت اور ایمانداری
سے کام کیا جائے تو ہر مہینے سو، سو سو پیدا کر لینا معمولی بات ہے یہ
میرے رشتے کے چچا کے لئے رکھا تھا۔ اسے آپ لے جایئے۔ شیخ چلی نے

پہلے کی طرح اس بار بھی شکریہ ادا کیا۔ اور کاغذ لے کر چلے آئے
پھر انہوں نے کہیں سے ادھار لے کر، اور جان جوکھوں
میں ڈال کر دو بوتلوں کا انتظام کیا۔ اور کپتان صاحب کے پاس
سلام کرنے حاضر ہوئے وہ بوتلیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے
اور کہا مانگ کیا مانگتا ہے؟
شیخ چلی ہاتھ جوڑ کر بولے صرف ایک عزیز دوست کی گرفتاری
کپتان صاحب بولے بس اتنی سی بات اس کا پتہ لکھ کر یہاں رکھ
دے کر دیکھ کیا ہوتا ہے۔ شیخ چلی نے کہا حضور کسی بڑے جرم میں بند کیجئے
گا تاکہ کافی دن بند رہے۔ کپتان صاحب پہلے ہنسے پھر بولے ابے احمق کہیں گرفتار
کرنے کیلئے بھی کسی جرم کی ضرورت ہے۔ تو نے پولیس والوں کو گدھا سمجھا ہے سال دو سال
تین سال خدا کے بند کرا دوں۔ شیخ چلی اپنی جان مال کو دعائیں دیتا چلا آیا۔ دوسرے
دن شیخ چلی کا وہ باحلف دوست پکڑا گیا۔ اور یوں شیخ چلی کو خدا نے چین دیا۔

کھوٹی چونّی

ابنِ فضل

"ارے اوہ!"

میں نے بے صبری سے اپنی چھوٹی سی صندوقچی الٹ پلیٹ کی۔ اس کے ایک خانہ کو دیکھا بھالا ایک ایک کا غذ علیحدہ کیا۔ مگر کیا مجال جو اس کم بخت کے سوا کچھ نکلا ہو۔ یہ تھی ایک کھوٹی چونی خالص رانگ کی جس پر چاندی کی چونی کا ٹھپہ لگا تھا۔ یہ میرے پاس بہت دنوں سے تھی۔ یہ بھی یاد نہیں کہ کہاں سے آئی تھی اور کب آئی تھی، اتنی بات ضرور یاد ہے کہ جب میرا اس سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا تو میرے منہ سے بہت زور سے ارے نکلا تھا۔ بات در اصل یہ تھی۔ کہ میں نے ایک ہندو کی دکان سے مٹھائی خریدی تھی اور جب میں نے مٹھائی پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ تو شیر دانی کے بٹن کھول کر صدری کے اندر والی جیب سے میں نے اس کو یہ چونی دی تھی۔ لہذا اس نے یہ کہہ کر واپس کر دی تھی۔

"میاں صاحب دوسری دے دو۔ یہ کھوٹی ہے۔"

ابھی اس نے کھوٹی کی 'ی' کو پوری طرح ادا بھی نہیں کیا تھا۔ کہ میرے منہ سے بے ساختہ ارے نکلا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اور یہ تعارف بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا۔ میں اس کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھا۔ اور اسی روز مجھے محسوس ہوا کہ چھوت چھات نے کس قدر انسانیت کو نقصان پہنچایا ہے کیونکہ حلوائی۔ مٹھائی لینے پر آمادہ تھا۔ اور یہ اس غریب کھوٹی چونی کو قبول کرنے پر تیار تھا جس پر جارج پنجم کی تصویر رحم طلب نگاہوں سے اپنی ہی جیسی دوسری چونیوں کو حسرت و افسوس سے دیکھ رہی تھی۔ حلوائی نے بھرے بازار میں مجھے رسوا کر دیا اور میں دل ہی دل میں اس حادثہ پر کڑھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ یہ قصور حلوائی کا ہے یا میرا یا چونی بنانے والے کا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ہاتھ حلوائی کے موٹے موٹے بھدے اور میلے ہاتھوں سے زیادہ صاف بھی ہیں۔ اور خوبصورت بھی۔ لیکن معلوم نہیں میرے ہاتھوں میں کس قسم کی غیر مرئی نجاست تھی کہ جلیبیوں کا پتا میرے ہاتھوں میں آنے ہی گندہ ہو گیا حالانکہ ابھی میں نے ان جلیبیوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ ہاتھ میں اگر گندگی تھی تو پتا گندہ ہو جاتا جلیبیوں کا کیا قصور کہ وہ بھی کشمکش میں پھنس گئیں۔ نہ حلوائی کی پرات میں واپس جا سکیں۔ اور نہ میرے پیٹ میں۔ حالانکہ میرا پیٹ ان کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اور انتہائی مشتاق تھا کہ ان کے وصل سے شاد کام ہو کر قدرے سکون حاصل کرے۔ لیکن صاحب وہ حلوائی رہا پکا سوشاستری اس نے نہ تو مجھے جانے کی اجازت دی اور نہ چونی کو داخل ہونے کی۔ اس وقت پہلی بار مجھے خیال ہوا۔ کہ اس میں قصور صرف میرا ہے۔ کہ میں نے اب تک اس حلوائی کو پاکی اور ناپاکی کی حقیقت سے کیوں آشنا نہیں کیا۔ بہرحال یہ تو اس چونی سے پہلا تعارف تھا۔ بڑا شاندار تعارف۔ مجھے خوب یاد ہے کہ پوری کانگریس یعنی ہندو مسلمان اور سکھ اس پُر لطف واقعہ سے مفت ہی لذت اندوز ہو رہے تھے۔

لیکن اس روز تو خیر ایک صاحب نے مشکل آسان کر دی تھی۔ مگر آج مسئلہ بہت پیچیدہ تھا کیونکہ صبح کو دھوبی کے یہاں سے کپڑے لینے تھے اور اگر کپڑے نہ لوں تو ان میلے کپڑوں سے سفر کیسے کروں۔ اور آج مجھے فقط چونی بنانے والے پر غصہ آ رہا تھا۔ خدا کی پناہ کس قدر دھوکا ہے کیا جعل ہے۔ اور میں نے جھلا کر زور سے اس چونی کو پٹک دیا اور وہ بغیر جھنجھناہٹ کے ایک طرف کو لڑھک گئی۔ مگر اس سے میری تسکین نہ ہوئی۔ اپنی عزت کا غصہ اس چونی پر اُتارنے لگا۔ میں نے جلدی سے اس چونی کو اٹھایا اور توڑ مروڑ

کر قصہ ہی پاک کرنے کی کوشش کی۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ چونی میں سے ایک جانی پہچانی آواز آ رہی ہے۔ مانوس اور دلاویز۔

"ارے ارے آپ مجھے بالکل قتل کر ڈالیں گے۔ ٹھہریئے ٹھہریئے۔ تھوڑا صبر نہیں شانتی، اہنسا۔ اچھا صبر پہلے میری رام کہانی تو سن لیجئے"۔

میں نے ہاتھ کے گھاؤ اور انقباض کو کم کر دیا۔ اب صاف سنائی دے رہا تھا

چونی کہہ رہی تھی: "صاحب میرا قصور۔ آپ کا غصہ بجا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں وقت پر آپ کے کام نہ آ سکی۔ لیکن جناب تنہا میرا ہی کھوٹ ایسا ہے کہ جس کی سزا قتل، یا ضرب شدید ہو یا ہر کھوٹ کی یہی سزا ہے؟ اچھا اگر تنہا میرے ساتھ ہی یہ معاملہ نہیں۔ اور میری ذات تک خاص نہیں تو پھر آپ نے اس کھوٹ کا کیا علاج کیا جو خاص آپ کی برادری میں پایا جاتا ہے"۔

"میری برادری میں؟"

"جی ہاں آپ کی برادری میں"۔

"نہیں میں تو شریف اور اونچی برادری سے تعلق رکھتا ہوں میری ذات میں کوئی کھوٹ نہیں"۔

"میرے جواب پر چونی تلملا گئی اس کے چہرے سے نقوش اجاگر سے ہونے لگے۔ گویا غصہ میں اس کے چہرہ کی رگیں پھول گئیں لیکن اس نے بڑے متین انداز میں کہا

"اس سے بڑھکر اور کیا کھوٹ ہوگا۔ کہ تم نے انسانوں کے ٹکڑے کر دیئے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کو تم نے تقسیم کر دیا۔ ان میں غرور و تفاخر کے زہریلے اور ناپاک جذبات کو برانگیختہ کر کے۔ ان میں گھناؤنا امتیاز پیدا کر دیا"۔

میں سوچنے لگا بات تو ٹھیک ہے لیکن میں اس قدر جلدی اپنی شکست کا اعتراف کرنے والا نہیں تھا

"میں نے کہا یہ کیا کھوٹ ہے۔ یہ تو واقعہ ہے کہ ہم شریف ہیں اور اونچے ہیں اور دوسرے ذلیل اور نیچے ہیں"۔

"چونی نے بے ساختہ کہا۔ یہ دوسرا کھوٹ ہے۔ کہ تم کو اپنا کھوٹ بھی معلوم نہیں۔ کم از کم مجھ کو دیکھو کہ چونکہ میں کھوٹی ہوں، اس لئے خاموش ہوں۔ کوئی ہزار مجھ سے آواز نکلوانی چاہے۔ انگوٹھے سے اشارے کرے یا پتھر پر بجائے لیکن میری احتیاط دیکھئے خاموش ہوں۔ مجال کیا جو ذرا بھی آواز نکلے۔ اور ایک تم ہو کہ ہزار کھوٹ کی بو لئے پھرتے ہو اور سمجھتے ہو اپنے آپ کو شریف"۔

میں غصہ سے بے تاب ہو کر کہنے لگا کم بخت بے اصل رانگ کی ہو کر ہمارے منہ لگتی ہے۔

چونی بے ساختہ بولی۔ "دیکھئے اپنے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت نہ کیجئے پہلے میری بات سن لیجئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بے شک میں کھوٹی ہوں مجھے اپنے کھوٹ کا احساس ہے۔ میرا کھوٹ کیا ہے صرف اتنا کہ چاندی کا ٹھپہ رانگ پر لگا دیا۔ میں نے اپنی اصلیت ضائع نہیں کی۔ پھر یہ میرے ارادے سے نہیں ہوا میری مرضی اور مشورہ کو اس میں دخل نہیں ایک تمہارا جیسا شریف آیا اور اس نے اپنی شرافت کا یہ ثبوت دیا کہ مجھ رانگ کے ٹکڑے کو چاندی کی چونی کا لباس پہنا دیا لیکن اس کے باوجود میری بد آواز سے۔ میرے نقوش مرجھا گئے میری آواز بند ہو گئی محض اس وجہ سے کہ کوئی میری تر و تازہ صورت سے اصلی کا دھوکہ کھا کر ... کوئی فریب میں مبتلا نہ ہو۔ مگر آپ شریف لوگ ہر قسم کے مصنوعی ٹھپے چسپاں کرتے ہیں، اور پھر بھی کھوٹ ... کے ...

میں نے کہا۔ "آج تیری خیر نہیں۔ اپنی حیثیت تو دیکھ۔ میری ملکیت اور ماتحت ہو کر یہ بڑھ بڑھ کر باتیں"۔

چونی نے زہر خند کیساتھ مسکراتے ہوئے کہا "ماتحتی کی بھی ایک ہی کہی۔ تم سمجھتے رہو کہ ہم ماتحت ہیں اور مملوک ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ میں تمہاری اور تمہاری تمام انسانی برادری کی حاکم ہوں۔ میں تابع برائے نام ہوں ورنہ دراصل تمہاری سرتاج ہوں"۔ "ہونہہ" میں نے غصہ سے کہا۔ اور چونی کہنے لگی "ہاں تم میرے تابع ہو۔ میری محبت میں دیوانے ہو۔ میرے اشاروں پر ناچتے ہو مجھے حاصل کرنے کے لئے اپنا ضمیر و ایمان تک فروخت کر دیتے ہو وہ کون سا ذلیل کام ہے جسے تم نے میرے لئے گوارا نہ کیا۔ تم نے خون کی ندیاں بہائیں تم نے اپنے بھائیوں کے گلے کاٹے۔ بستیاں کی بستیاں خاکستر کر دیں۔ تم نے اپنے غریب بھائیوں کا آخری قطرہ خون تک چوس لیا محض اس لئے کہ میرے نقش و نگار نے تمہارے دلوں اور دماغوں کو مسخر کر رکھا ہے۔ میری چمک دمک نے تمہاری

آنکھوں کو خیرہ اور ہوش و حواس کو رخصت کر دیا ہے۔ اب بھی تم مجھے اپنی ملکیت کا طعنہ دیتے ہو۔ تم مجسّم کھوٹ ہو۔ تم سراسر بے اصل اور ذلیل ہو"

اب میرے غصہ کا پارا اپنی انتہا کو پہونچ چکا تھا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کمبخت کا قصّہ جلد پاک کر دیا جائے۔ کہ اس نے اب کی مرتبہ جھلّا کر کہا۔

"تم نے اپنی اصلیت ضائع کر دی۔ اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا اور چند خوشنما اور جھوٹے ٹھپے لگا لئے۔ تاکہ کوئی تمہاری اصلیت سے واقف نہ ہو سکے۔ یہ مسلمانی کے ٹھپے یہ یہودی اور مسیحیت کے ٹھپے آخر کس لئے کیا ان میں تقوی کی روح دوڑ رہی ہے بس حلوائی کی برات سے آپ کا منہ میٹھا نہیں کر سکتی۔ ایسے ہی آپ دنیا کے دسترخوان سے لذّت حیات حاصل نہیں کر سکتے۔ دنیا کی منڈی تو آپ کو کھوٹا سکہ سمجھتی ہے۔ اور شاید آخرت میں۔ ہاں آخرت کی خبر خدا جانے۔"

میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور ایک عجیب سی سنسناہٹ اور کپکپی سی بدن پر طاری ہونے لگی۔ ایک حقیقت مجھ پر منکشف ہو رہی تھی۔ اور یہ لرزہ اسی کے نتیجہ میں تھا۔ مجھے ہر سمت کھوٹے سکے نظر آ رہے تھے جن پر بڑے خوبصورت پاکیزہ ٹھپے تھے۔ ان پر اسلام تقویٰ۔ طہارت علم و زہد۔ رہبری و سربراہ کاری انسانیت و خدمت خلق۔ شفقت و محبت خیر خواہی درد داری وغیرہ کے صدہا دیدہ زیب ٹھپے لگے ہوئے تھے۔ یہ کھوٹے سکے زندگی کے ہر میدان میں بکھرے ہوئے تھے لیکن ان کا وزن کچھ نہیں تھا۔ میں نے افسوس کے ساتھ اس چونی کو نیچے گرا دیا۔ ایک کھنک دار آواز سے وہ نیچے گر گئی۔ میں اس خلاف توقع جھنکار سے چونکا اور اس کو اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ تو ایک دم آنکھ کھل گئی اسٹول پر رکھی ہوئی دوات سوتے میں ہاتھ لگنے کی وجہ سے نیچے گر کر ٹوٹ چکی تھی۔ اور فرش پر نیلے رنگ کے چھینٹے اور آڑی ترچھی لکیریں دور تک پھیل گئی تھیں۔

جے شنکر پرشاد کی ہندی کہانی ریڈیائی فیچر کے انداز میں

عیسیٰ الرحمانی

انعام

"کوشل اور مگدھ دو ریاستوں کے نام ہیں۔ کوشل کی یہ تقریب بہت مشہور اور پرانی تھی۔ ایک دن کے لئے کوشل کے راجہ کو کسان بننا پڑتا تھا۔ اس روز بڑی دھوم دھام ہوتی تھی اور پڑوس کے راجاؤں اور راجکماروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا حتیٰ کہ کوشل کی پرانی دشمن ریاست مگدھ کو بھی دعوت دی جاتی تھی اور وہ خوشی سے اس تقریب میں شریک ہوا کرتی تھی۔ اس تقریب میں مگدھ کا راجکمار (ارون) شریک تھا اور یہی اس فیچر کا ہیرو ہے۔"

میرے خیال میں اسقدر وضاحت فیچر کے لئے کافی ہے اور قارئین کے ذہن میں کہانی کا مقصد اچھی طرح آجائے گا۔ عیسیٰ الرحمانی

کردار

مہاراج .... کوشل کا راجہ
وزیر .... مہاراج کا وزیر
سپہ سالار .... مہاراج کا سپہ سالار
مدھولیکا - کوسل کے ایک سپاہی کی بیٹی
ارون .... مگدھ کا راجکمار

وغیرہ وغیرہ

مدھولیکا ۔ مہاراج! یہ میرے باپ دادا کی زمین ہے۔ اسے بیچا میں پاپ سمجھتی ہوں۔ اسلئے اس کی قیمت نہیں لے سکتی۔

وزیر ۔ نادان! یہ کیا بک رہی ہے؟ تیری زمین سے چوگنا دام ہے۔ آج سے تو شاہی محافظت پانے کی حقدار ہوگئی۔ اس قیمت سے اپنے کو خوشحال بنا۔

مدھولیکا ۔ شاہی محافظت پانے کی حقدار تو ساری رعایا ہے وزیر اعظم۔ مہاراج کو زمین دینے میں مجھے نہ تو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہے۔ لیکن اس کی قیمت لینا ناممکن ہے۔

وزیر ۔ (مہاراج کے اشارے پر) مہاراج! مشہور تیر انداز سنگھ مترکی یہ اکلوتی بیٹی ہے، مدھولیکا۔

مہاراج ۔ (حیرت سے) سنگھ متر کی بیٹی.. ؟ جس نے مگدھ کے سورماؤں کو میدان جنگ میں ٹھہرنے کی کبھی مہلت نہ دی اور ہمیشہ کوشل کی لاج رکھی اسی بہادر کی بیٹی ہے یہ؟

وزیر ۔ جی ہاں مہاراج۔

مہاراج ۔ (توقف سے) اس "رواج" کے کیا قاعدے ہیں وزیر اعظم؟

وزیر ۔ مہاراج! قاعدے تو بہت آسان ہیں۔ کسی بھی اچھی زمین کو مہاراج کی کھیتی کے لئے منتخب کر کے اسکی قیمت انعام کی صورت میں زمین کے مالک کو دیدی جاتی ہے۔ اور ایک سال تک وہی شخص اس کھیت کی نگرانی کرتا ہے۔ وہ راجہ کا کھیت کہلاتا ہے۔ راجہ اپنے ہاتھ سے اس کھیت کو جوتتے بوتے ہیں۔ یہ تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے اور پڑوس کی ریاستوں کے راجاؤں اور راجکماروں کو بھی شرکت کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔

(مہاراج کا اجلاس برخاست ہو جاتا ہے)

(مدھولیکا اپنے پرانے کھیت پر موجود رہتی ہے کل ہی کھیت کوشل کے راجہ نے اپنی کھیتی کے لئے لیا ہے)

ارون ۔ کل کی تقریب میں تم ہی تھیں نا؟

مدھولیکا ۔ آپ کو کل کا خواب ستا رہا ہے کیا؟ مجھے اس حالت میں بھی آپ مطمئن نہ رہنے دیں گے؟

ارون ۔ (ہچکچا کے) میرا دل تم نے...

مدھولیکا ۔ آہ! مرد کتنا سنگدل ہوتا ہے۔ ابھی راہی راجاؤں کی راہ "

اردون :۔ حسین دوشیزہ! مگدھ کا راجکمار تمہاری وفاؤں کا طالب ہے۔

مدھولیکا :۔ راجکمار! میں کسان کی بیٹی ہوں اور آپ راجکمار ہیں۔ میں زمین پر محنت کرنے والی ۔ ۔ ۔ میری پیاری زمین مجھ سے چھین لی گئی ہے۔ میں اسی غم میں چُور ہوں۔ میری بے عزتی مت کرو۔

اردون :۔ کوشل کے راجہ سے میں تمہاری زمین تم کو واپس دلا سکتا ہوں۔

مدھولیکا :۔ نہیں، یہ کوشل کی بہت پرانی رسم ہے۔ میں اسے توڑنا نہیں چاہتی

اردون :۔ تب تمہارا مقصد کیا ہے؟ میں اس راز کو سمجھ نہیں سکتا، دوشیزہ۔

مدھولیکا :۔ (زوردار لہجہ میں) میں بھی اس بھید کو نہیں سمجھ سکتی کہ مگدھ کے راجکمار کا دل کسی راجہ کی حسین اور دولت مند لڑکی کی طرف مائل نہ ہو کر ایک گنوار اور غریب لڑکی پر کیوں آ گیا ہے؟

(اردون چلا جاتا ہے۔ ٹاپوں کی آواز بتدریج مدھم ہو کر مٹ جاتی ہے)

تین سال بعد ——————

(سردی کی ایک رات، بادلوں کی گرج، بجلیوں کی کڑک اور موسلا دھار بارش۔ اسی کھیت پر ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں مدھولیکا بیٹھی کانپ —— رہی ہے)

آواز :۔ کوئی ہے؟ مسافر کو پناہ چاہیئے۔

مدھولیکا :۔ (جھونپڑی کے دروازے پر آ کر) کون؟ راجکمار اردون؟

اردون :۔ ہاں، مدھولیکا۔ کتنا سمجھایا میں نے لیکن۔ ۔

مدھولیکا :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) اور آج آپ یہ کس حالت میں ہیں؟

اردون :۔ مگدھ کا باغی جلا وطن ہو کر کوشل میں اپنی معاش کی تلاش میں آیا ہے۔

مدھولیکا :۔ مگدھ کے باغی راجکمار کو پناہ دے، ایک بے بس، لاچار لڑکی؟ انہونی ہی تو ہے۔ اچھا، آئیے۔

(مختصر وقفہ)

جب تم اس حالت میں ہو تو پھر اپنے ساتھ اتنے سپاہیوں کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

اردون :۔ یہ ہمارے ساتھی ہیں مدھولیکا! میں انہیں کیسے چھوڑ دیتا؟

مدھولیکا :۔ کیوں؟ ۔ ۔ ہم لوگ محنت کر کے کھاتے ہیں اب تو تم ۔ ۔

اردون :۔ (بات کاٹ کر) تمہارا خیال غلط ہے مدھولیکا، میں اپنی طاقت پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ نئے راج کی بنیاد رکھ سکتا ہوں۔ ناامید کیوں ہو جاؤں؟

مدھولیکا :۔ نئے راج کی بنیاد؟ اوہو، تمہاری ہمت تو کم نہیں ہے۔ بھلا کیسے؟ کوئی صورت بتاؤ تو میں بھی تمہاری طرح تصور سے لطف اُٹھاؤں۔

اردون :۔ تصور ہی نہیں مدھولیکا۔ میں سچ کہتا ہوں، تمہیں رانی بنا کر تخت پر بٹھلا دوں گا۔ اپنے چھنے ہوئے کھیت کی خدمت کرو۔ کوشل کے راجہ تمہاری کوئی گذارش نامنظور نہیں کریں گے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کوشل کے سپہ سالار بہت بڑی فوج لیکر دشمنوں کی سرکوبی کے لئے بہت دُور چلے گئے ہیں۔ ۔ ۔

(مدھولیکا خاموش رہتی ہے)

تم بولتی نہیں ہو مدھولیکا۔

مدھولیکا :۔ (مسحور ہو کر) جو کہو گے وہی کروں گی، اردون۔

سرگوشیاں

مہاراج :۔ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے، لڑکی!

مدھولیکا :۔ تین سال ہوئے مہاراج! میری زمین کو آپ نے کھیتی کے لئے لیا تھا۔

مہاراج :۔ اوہ —— تو تم اس کا معاوضہ لینے آئی ہو، اچھا۔ ملے گا۔

مدھولیکا :۔ نہیں مہاراج۔ میں اس کا معاوضہ لینے نہیں آئی ہوں۔

مہاراج :۔ پھر، تم کس لئے آئی ہو؟

مدھولیکا :۔ مہاراج! اتنی ہی زمین قلعہ کے جنوبی نالے کے پاس مجھے دیدی جائے۔

مہاراج :۔ وہ بہت ہی ناہموار اور پتھریلی زمین ہے۔

مدھولیکا :۔ مہاراج! اس زمین میں میں مزدوروں کو لگا کے قابل زراعت کرا لوں گی۔

مہاراج :۔ قلعہ کے قریب ہونے کے سبب وہ زمین ایک خاص فوجی اہمیت رکھتی ہے۔ سنگھ متر کی بیٹی! میں کیسے دیدوں؟

مدھولیکا :۔ تو کیا میں ناامید لوٹ جاؤں؟ مہاراج!

مہاراج :۔ (چند لمحات سوچنے کے بعد) اچھا جاؤ، وہ زمین تم کو دیتا ہوں۔

مدھولیکا۔ مہاراج کی جے ہو۔

(چلی جاتی ہے)

ارون۔ چار پہر اور صبر کرو۔ صبح کوشل کی راجدھانی میں تمہارا بیاہ ہوگا۔ اور میں یہاں کا آزاد راجہ بنوں گا پیاری مدھولیکا۔

مدھولیکا۔ بہت خطرناک ــــ صرف سو سپاہیوں سے تم۔

ارون۔ (بات کاٹ کر فخر کے ساتھ) کل سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہمارا جھنڈا کوشل کے قلعہ پر۔

مدھولیکا۔ ارون! تمہاری ہمت دیکھ کر سخت تعجب ہے۔ تم کو اس فتح کا یقین ہے؟

ارون۔ بیشک۔۔ یہ رات تم اپنی جھونپڑی میں کاٹو۔ صبح راج محل میں تم رانی بنو گی۔

(مدھولیکا اپنی جھونپڑی کی طرف جاتی ہے)

مدھولیکا۔ (راہ میں آپ ہی آپ) نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کوشل کا قدیم دشمن کامیاب کیوں؟؟؟ سنگھ متر کی بیٹی آج یہ کیا کرنے جا رہی ہے؟ چھی، تھو ــــ سنگھ متر نے مرتے دم تک کوشل کی لاج رکھی، میں اس لاج کو لوٹ نہیں سکتی۔ ایک بدیسی کے ہاتھ میں کوشل کا قلعہ کیوں چلا جائے؟ میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گی، کبھی نہیں۔ (پھر دفعتاً) لیکن ارون اگر کامیاب نہ ہوا تو؟؟؟

(سسکیاں لینے لگتی ہے)

آواز۔ کون ہے؟

(مدھولیکا خاموش رہتی ہے)

کون ہے تو؟

مدھولیکا۔ ایک مجرم ہوں سپہ سالار! مجھے باندھ لو، مجھے مار ڈالو۔ مہاراج کے پاس لے چلو مجھے۔

سپہ سالار۔ پگلی ہے۔

مدھولیکا۔ نہیں سپہ سالار میں پاگل نہیں ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ ہمارا قلعہ ایک پہر میں دشمنوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ جنوبی نالے کے پاس حملہ ہوگا۔ جلدی کرو۔ سپہ سالار! بہت جلدی۔

سپہ سالار:۔ (سپاہیوں سے) باندھ لو اس عورت کو اور میرے ساتھ آؤ۔ سب قلعہ کی طرف جاتے ہیں)

(ایک فوجی سردار سے) قلعہ میں اس وقت جتنے سپاہی ہیں۔ سب کو ابھی تیار ہو جانے کا حکم دو، آواز اور روشنی نہ ہو اور دو سو سواروں کو قلعہ کے جنوبی نالے کے پاس مقرر کر دو۔ میں راج محل سے ابھی آیا۔

(مدھولیکا کو ساتھ لیکر سپہ سالار راج محل کی طرف جاتا ہے)

مہاراج۔ سپہ سالار۔ تم اسی زمین کے بارے میں کچھ کہنے آئے ہو؟

سپہ سالار:۔ نہیں مہاراج! اس عورت نے راہ میں یہ خبر دی ہے کہ دشمنوں نے خفیہ طور پر آج رات کو قلعہ پر قبضہ کر لینے کا انتظام کر لیا ہے۔

مہاراج۔ (چونک کر) تم فوراً قلعہ میں جاؤ اور فوج کو تیار کر کے مورچے پر ڈٹا دو، میں بھی آتا ہوں۔

(سپہ سالار جاتا ہے)

(مدھولیکا سے) سنگھ متر کی بہادر بیٹی! آج تم نے کوشل کی لاج رکھ لی۔ اچھا تم یہیں ٹھہرو۔ قلعہ سے لوٹ کر میں تمہیں انعام دوں گا۔

(مہاراج قلعے میں جاتے ہیں)

(دفعہ، زنجیروں کی آوازیں آتی ہیں)

آوازیں۔ دشمنوں کے سر کاٹ لئے جائیں۔

مہاراج۔ میرا بھی یہی حکم ہے کہ ارون اور اس کے تمام سپاہیوں کو مقتل میں لیجا کر قتل کر دو۔

(مدھولیکا سے) سنگھ متر کی بیٹی! میں تم کو اپنی ساری کھیتیاں انعام دیتا ہوں

مدھولیکا۔ (گھبراہٹ میں) مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے مہاراج۔

(ارون ہنستا ہے)

مہاراج۔ (قدرے رعب سے) نہیں، مدھولیکا۔ میں تجھے ضرور دوں گا۔ مانگ لے۔ (چند سکنڈ تک خاموشی)

مدھولیکا۔ (پیار سے ارون کا کندھا پکڑ کر) مہاراج! تو مجھے بھی سزائے موت دی جائے۔

(گہری اور طویل خاموشی چھا جاتی ہے)

(پروفیسر) منظور احسن عباسی

مُرادِ غالبؔ
یعنی
دیوانِ غالبؔ کی شرح

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادہ سرِ منزلِ تقویٰ نہ ہوا

نفس استعارہ از حیات۔ یعنی میرے نزدیک زندگی کا منزل تقویٰ کی راہ پر گام زن ہونا اور دل کا مے و ساغر کے خیال میں پڑا رہنا برابر ہے۔ (بے نیازی از کردہ‌ہا)۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گُلبانگِ تسلی نہ ہوا

یعنی تیرے وعدۂ وصل نہ کرنے میں بھی خوش ہوں کہ کانوں پر تیری تسلی آمیز باتوں کا احسان نہ ہوا۔ (بیانِ عشقِ غیور)

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

یعنی مر جانے کی آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ اس پر معشوق کا شکوہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ موت اُس کے اختیار میں نہیں۔ یہ تو قسمت ہی بُری ہے اسکی شکایت کس سے ہو۔ (بیانِ حرماں نصیبی)

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

یعنی میری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ دمِ عیسیٰ کی سہار بھی نہ رہی۔ جنبشِ لبِ عیسیٰ کے صدمہ سے مر گیا۔ مطلب یہ کہ میرے حق میں تدبیرِ حیات بھی سامانِ موت بن جاتی ہے (مبالغۂ فنا آمادگی)

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

مطلب یہ کہ جس نے بیخودیٔ عشق کا مزہ پالیا وہ باغِ رضواں کو بھول گیا۔ (لذتِ بیخودیٔ عشق)

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

یعنی پلکوں نے کیا غضب کیا کہ قطرہ ہائے اشکِ خوں کو کہ اُن میں سے ہر ایک قدر و قیمت میں تسبیحِ مرجاں کا دانہ ہے بکھیر کر رکھ دیا۔ (اشکباری)

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دانتوں میں تنکا لینا "خس بدنداں گرفتن" کا ترجمہ بمعنی اظہارِ عجز و ناتوانی کرنا۔ ریشۂ نیستاں بمعنی بنسری۔ یعنی قاتل کے رعب سے مجھے ترکِ گریہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن جوشِ گریہ کا یہ عالم ہے کہ اپنی عاجزی کے اظہار کو جو تنکا دانتوں میں لیا تو اُس نے بنسری کا کام دیا۔ مطلب یہ کہ جس قدر اسبابِ ضبط سے کام لیتا ہوں اُتنا ہی رونا چلا آتا ہے۔ (بے اختیاریٔ گریہ)

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

سروِ چراغاں بمعنی چراغوں کا بنا ہوا درخت۔ یعنی میرے دل میں جو داغ ہیں۔ اُن کا تماشہ کچھ عرصہ کے بعد قابلِ دید ہوگا کہ ہر داغ گویا سروِ چراغاں کا ایک بیج ہے کہ ہر داغ سے ایک سروِ چراغاں پیدا ہوگا۔ مطلب یہ کہ ابھی ابتدائے عشق ہے اور یہ داغ تازہ ہیں۔ آگے چل کر ایک ایک کے

سینکڑوں داغ بن جائیں گے۔ (روز افزونیٔ غمِ عشق)

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

یعنی تیرے جلوے کی تاب نہ لاکر آئینہ اس طرح پگھل گیا جیسے خورشید سے شبنم۔ اور آئینہ خانہ کا وہ حال ہے جو شبنمستاں (چمن) کا (مبالغۂ تاثیرِ جلوہ)

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ہیولیٰ بمعنی مادہ۔ خونِ گرم کنایہ از محنت۔ میری تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے یعنی میری تعمیر نہ ہوتی تو خرابی کی کوئی صورت ہی نہ تھی گویا ہر چیز جو وجود میں آئی فنا پذیر ہے چنانچہ مثلاً جب کسان کی محنت و مشقت کا نتیجہ "خرمن" تیار ہوتا ہے تبھی "برقِ خرمن" بھی ہوتی ہے۔ خرمن ہی نہ ہو تو برقِ خرمن کہاں؟ (تلازمِ حدوث و فنا)

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

یعنی میرے گھر کی ویرانی قابلِ دید ہے کہ تمام گھر میں گھاس اُگی ہے اور درباں کا کام صرف گھاس کھودنا رہ گیا ہے (مبالغۂ حالِ ویرانی)

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

یعنی میری خاموشی نے لاکھوں تمناؤں کو دبائے رکھا۔ اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ میری مثال اُس بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہے۔ جو غریبوں کی قبر پر ہو۔ کہ اُسے روشن کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ (حسرت اندازیٔ عاشق)

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

یعنی ہر چند کہ دل بجھ گیا ہے تاہم اُس میں خیالِ محبوب کا ایک عکس باقی ہے۔ گویا یہ بجھا ہوا دل زنداں کی کوٹھری ہے جس میں خیالِ محبوب حضرتِ یوسف کی طرح جلوہ افروز ہے۔ (حسن تصور)

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

یعنی تمہارا میرے خواب میں آکر چھپ چھپ کے مسکراتے نظر آنا ظاہر کرتا ہے کہ تم کسی کی بغل میں رہے ہو (بدگمانیٔ رشک)

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا

یعنی تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر جانے کتنے عشاق نے اپنی جان کھو دی ہوگی۔ مطلب یہ کہ معشوق کا غم نہیں دیکھا جاتا۔ (جاں نثاری عشاق)

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اجزائے پریشاں استعارہ از موجودات (مجموعہ) یعنی اس سے قطع نظر ممکن نہیں کہ جس قدر بھی موجودات ہیں اُن سب کو راہِ فنا کی پگڈنڈی پر پہنچنا ہے اور ہر چیز اس سے وابستہ ہے گویا یہ ایک اجزائے منتشرہ کی کتاب شیرازۂ فنا سے بندھی ہوئی ہے۔ (کل من علیہا فان)

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یک بیاباں ماندگی یعنی تھکن کی زیادتی۔ یعنی مجھے صحرانوردی کا اسقدر شوق ہے کہ جنگل بھر کی تھکن سے (بہت زیادہ تکان سے) بھی کم نہ ہوگا یہ میرے نقشِ قدم گویا موجِ رفتار کے بلبلے ہیں کہ یوں ہی بنتے رہتے ہیں (دوامِ وحشت)

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

یعنی کہاں تو یہ چمن کا عاشق تھا۔ اور اب افسردگی کا یہ عالم ہے کہ بوئے گل مجھے [illegible] کر دی ہے (افسردگیٔ خاطر)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یعنی [illegible] ستائش کرے تو ایسا ہے جیسے بجلی کا پجاری ہو کر کھلیان کی [illegible] اور اس کے تلف ہونے پر افسوس کرے (جانکاہیٔ ناگزیرِ عشق)

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

یعنی میری پیاس بھی میرے حوصلۂ بلند کے مطابق ہے۔ چنانچہ اگر ساقی دریائے شراب ہے تو میں ساحل کی انگڑائی ہوں کہ گویا تمام دریا کو منہ میں لینے کے باوجود تشنہ لب ہوں۔ (بے پایاں شوق)

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی ماسوا جسے اسرارِ حق کا پردہ کہا جاتا ہے۔ یہ پردہ پردۂ ساز ہے۔ جو اسرارِ حق کے نغمات سے معمور ہے۔ البتہ کوئی سمجھنے والا نہیں۔ بقول چاندنی پھیلی ہے معلوم قمر ہو کہ نہو۔ (جہاں آرائیِ جمالِ محبوب)

رنگ پریدہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

چہرۂ عاشق کی اُڑی ہوئی رنگت گویا بہارِ نظارہ کی صبح ہے یعنی جمالِ محبوب کو دیکھ کر کمالِ حسرت کے باعث چہرہ کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور جب عاشق اس حال میں ہو تو محبوب کے لئے ناز و ادا کے گُل کھلانے کا یہی وقت ہے۔ (ناز آفرینیِ شاہدِ مشہود)

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

نظرہائے تیز تیز بمعنی گھور گھور کر دیکھنا۔ یعنی تیری لمبی لمبی پلکوں کے غم عشق میں مبتلا تو میں ہوں۔ اور تو ہے کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں بلکہ رقیبوں کی طرف شوق سے دیکھتا ہے۔ (شکوۂ محبت رشکِ رقیب)

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

صرفہ بمعنی نصرت یعنی مجھے ضبطِ آہ مرداہوئے ورنہ ایک ہی آہ جاں گداز میں کام ختم ہو جاتا تھا۔ (جاں گدازیِ آہ)

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا

شیشہ باز بمعنی سر پر بوتل رکھ کر رقص کرنے کا کرتب دکھانے والا۔ یعنی شراب اسی شدت سے جوش میں ہے کہ بوتلیں بھی اُچھلنے لگیں اور فرش بساط کا ہر گوشہ شیشہ باز کا سر بن گیا۔ (مبالغہ جوشِ بادہ)

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

کاوش بمعنی سعی گُستاخِ عقدہ۔ یعنی ناخن پر ہے جس کا کام دل کی گرہ کھولنا ہے۔ اب تک میرے دل کی گرہ نہیں کھولی۔ اس لئے دل تقاضی ہے کہ اس گرہِ نیم باز (دل) کو کھول دے (التجائے دلکشائی)

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

یعنی بزمِ شاہنشاہ میں پھر مشاعرہ شروع ہوا ہے۔ دُعا ہے کہ جاری رہے (دُعائے رونقِ بزمِ سخن)

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اِس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

یعنی بوقتِ شب پھر انجمِ رخشندہ کی مانند شعور محفل میں نظر آنے لگے۔ اِس خوبی کے ساتھ کہ گویا مندر کا دروازہ کھُل گیا۔ جہاں آرتی کے دیوے روشن ہوتے ہیں۔ (تعریف بزمِ سخن)

گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

یعنی دوست کا بے تکلف ہونا ہی غنیمت ہے گو پسِ پردہ اس کا باعث کچھ اور ہی ہو۔ (قرب حولستن)

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

یعنی اُس کا تصور (فراق میں) اتنا حسین ہے جیسے قبر میں بہشت کا دروازہ کھُل جائے گویا حُسنِ معشوق کے خیال میں وہی کیفیت ہے جو حُسنِ عمل کے تصور میں خیال کی ہوتی ہے (لذتِ تصورِ محبوب)

مُنہ نہ کھُلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنہ پر کھلا

کھُلا بمعنی ثابت ہوا۔ یعنی وہ خود سا حسین ہوگا۔ جس کے چہرے کا نقاب زلف سے زیادہ دل کش ہے۔ گویا اُس کا حُسن حجاب کے پردوں میں بھی بے مثال ہے بلکہ اُس کا حجاب خود ایک حُسن ہے۔ (فراوانیِ حُسنِ محبوبِ حقیقی)

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

یعنی شبِ غم اتنی خوفناک ہے کہ سارے ڈر کے باعث آنکھ نہ جھپکائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ستارے غروب نہ ہوں گے اور شبِ غم ختم نہ ہوگی۔ (درازی و ہولناکیِ شبِ ہجراں)

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

کھُلے ہوئے خطوط بالعموم ناخوشگوار حالات کے مضمون پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی وطن سے بُری خبروں کے خطوط آتے رہتے ہیں۔ تو سفر میں کیا

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا
یعنی شبِ معراج میں (کفایت نبی مرسل صلی اللہ علیہ وسلم)

شب کو برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
یعنی رات کو جبکہ میری آتشِ فراق بھڑک رہی تھی۔ اور ابر و گرداب اُس سے بجھے جا رہے تھے۔

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
اُس نے بعذرِ بارش کرم قدوم نہ فرمایا اور میں روتا رہا کہ تکیہ تر بتر ہو گیا۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ عشق میں تارِ نگہ نایاب تھا
خود آرائی استعمال صفت بجائے موصوف عشق یعنی شوق وہ مصروفِ خود آرائی رہا اور میری آنکھیں انتظار میں پتھرا گئیں۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یعنی اُدھر سامانِ عیش و طرب اور اِدھر اسبابِ حزن و الم

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
دیوار جو یعنی سر پھوڑنے کو تیار۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
یعنی میں بیخودئ عشق میں آہِ سوزاں کھینچتا تھا اور وہاں پھولوں کے فرش بچھ رہے تھے۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
طوفانِ موجِ رنگ، یعنی رنگ رلیوں کا زور شور، سوختن کا باب یعنی جلنا بھلنا یعنی وہ رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اور ہم جل بھن رہے تھے۔

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا
یعنی یکایک دل جو خلش کی لذت سے آشنا تھا۔ اس طرح پر خون ٹپکانے لگا۔ خون ٹپکانے سے مراد شعر کہنا ہے یعنی یہ غزل میں نے کہی

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
بے تاب یعنی افسردہ یعنی میرے دل کی فریاد نے معشوق پر کچھ اثر نہ کیا۔ وہ میرے ہاں تو آیا نہیں بلکہ بزمِ رقیب میں چلا گیا چنانچہ رشک کے باعث میرا افسردہ دل سپند کی طرح گھٹ کر رہ گیا۔ (آتشِ رشک)

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
یعنی طوفانِ گریہ سے دل کو ایک ایسا سرور حاصل ہوتا ہے کہ گویا گھر میں جل ترنگ بج رہا ہو۔ (ذوقِ گریہ)

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں؟
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
یعنی خاک نشینی پر مجھے اتنا ناز تھا کہ خود کو ریشمیں بستروں میں محسوس کرتا رہا (ملکِ قناعت)

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
جنوں یعنی پردہ عقل یعنی دیوانگی سے کچھ معرفت حاصل نہ کی ورنہ تمام حقائق آفتاب کی طرح روشن تھا (ظہورِ تجلی)

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
اپنے اسیروں کی یعنی میری بجائے اور بلفظ جمع (شکوۂ بے اعتنائی و بدگمانی)۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
دیدۂ بے خواب یعنی "وا" یعنی ایک دن وہ تھا کہ تجھے دلربائی کا بےحد شوق تھا۔ مطلب یہ کہ اب نہیں ہے۔ (بے توجہی حسن)

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ سے گردوں کفِ سیلاب تھا
یعنی بہتر ہے کہ نہ روئے ورنہ جب روتا ہے تو طوفان برپا کر دیتا ہے (قوتِ ضبطِ شاعر)

(باقی آئندہ)

خطوط و نکات

شمس فاروقی ایم۔ اے (بلیا)

ستمبر کے شمارے میں آپ نے ڈرامہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر اگر میں کچھ عرض کرنا چاہوں تو شاید کئی صفحے درکار ہوں لیکن چند باتیں ضرور لکھوں گا۔

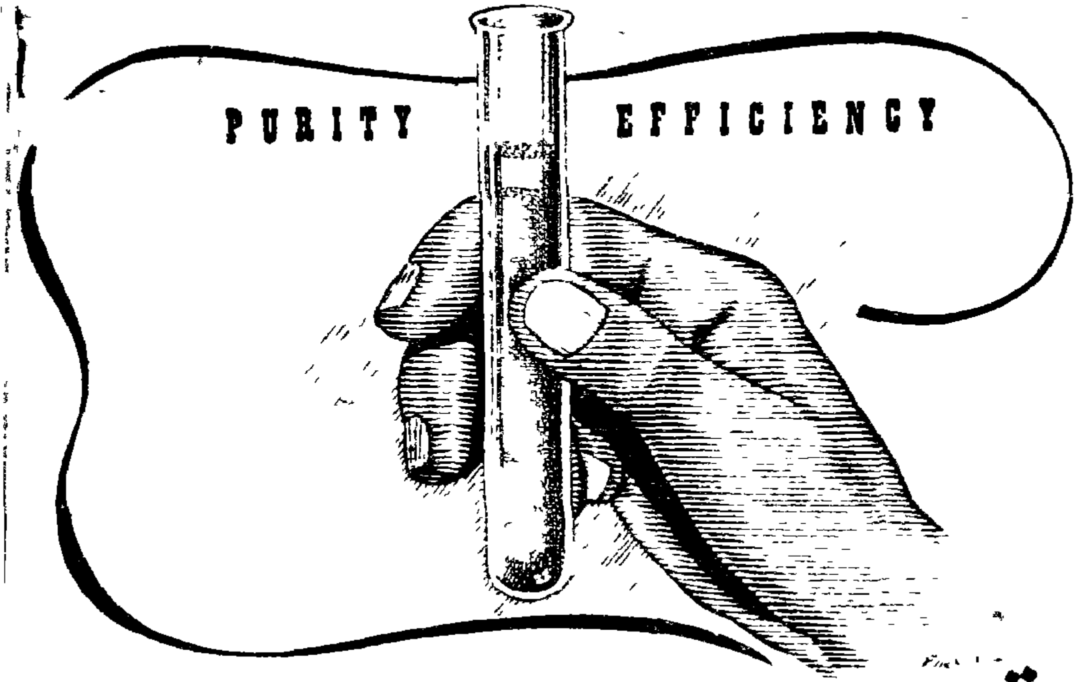
شاید بہتر ڈرامے Stage کے لئے لکھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے اسٹیج کے لئے تمام تر ہدایات چھپی ہوئی کتابوں میں برقرار رکھیں اور بعد میں بہت لمبے لمبے دیباچے جوڑے۔ لیکن وہ لکھے گئے تھے اسٹیج ہی کے لئے اور سب کے سب بہت کامیاب ہیں۔ صرف چند ڈرامے مثلاً جن میں سب سے مشہور Back to Methuselah ہے اس نے اسٹیج کے لئے نہیں لکھے تھے۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سارے ڈرامے ایک ہی صنف ادا کی۔ جو ذہن کے اسٹیج کے لئے ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی حد تک یہ ہے کہ ہارڈی نے اپنے مشہور ڈرامے ''دی ڈائی نیسٹس'' میں کہا کہ یہ ڈرامے سے زیادہ ایک نظم ہے۔ اور پھر بھی صرف اس لئے اسٹیج کرنے کے لائق نہیں ہے کہ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی رائے میں اس کی نمائندہ فلم بن سکتی ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس کے علاوہ ہارڈی کی یہ کوئی اختراع نہیں تھی۔ ہارڈی سے بہت پہلے شیلی نے شاید ۱۸۲۱ء میں اپنا مشہور ڈرامہ Prometheus Unbound اس طرح لکھا تھا۔ لیکن یہ سب شیکسپیئر اور ملٹن کے ڈراموں کی طرح ڈرامائی نظمیں نہیں ہیں بلکہ منظوم ڈرامے ہیں۔ ان کا فرق واضح ہے۔ بہرحال ڈرامے کے لئے اسٹیج اتنا ہی ضروری ہے جتنا اس کے کردار۔ یہ فرض کرنا ایک بہت بڑی بھول ہے کہ ڈرامہ ذہن کے اسٹیج کے لئے بھی لکھا جا سکتا ہے۔ لکھا جا سکتا ہے لیکن وہ ڈرامہ نہ ہوگا کچھ اور ہوگا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ بغیر اسٹیج پر دیکھے ہوئے کسی ڈرامے کی کامیابی کا اندازہ ممکن ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر رومیو اور جولیٹ شیکسپیئر کا ایک کمزور ڈرامہ ہے لیکن اسٹیج پر اس کا زور ہر اک کو محسوس ہوتا ہے۔ اگر آپ اردو میں ایسے ڈراموں کی ہمت افزائی کریں گے جو اسٹیج کرنے کے قابل نہ ہوں تو آپ ادب کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے۔ ڈرامے اسٹیج ہو پائیں یا نہ ہو پائیں لیکن ان کو اسٹیج کرنے کے قابل ہونا چاہئے۔

ڈرامے کی اسٹیج ہو سکنے کی خوبی، اور اس کے مکالموں کی ادائیگی خود ہی بہت متعلق کچھ اہم مسئلے ہیں اور ان پر مفصل اظہار خیال کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے انشاء اللہ بشرط فرصت ڈرامہ کی تھیوری پر ایک کتاب اردو میں لکھوں گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی چیز جو اچانک تحیر خیز وغیرہ ہو وہ ڈرامائی کہلا سکتی ہے۔ دراصل آپ نے یہ کہہ کر ڈرامائی اصطلاح کو بہت صحافیانہ اور ڈھیلے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ دراصل اچانک، عجیب اور تحیر خیز واقعات "ڈرامہ" نہیں بلکہ کچھ اور ہوتے ہیں۔ انکو میلو ڈرامہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ایسے واقعات ڈرامہ میں آتے ہی نہیں۔ آتے ہیں اور ضرور آتے ہیں اسلئے کہ ڈرامہ زندگی کا عکس ہوتا ہے (ایک حد تک) اور زندگی میں میلو ڈرامہ بھی ہوتا ہے لیکن ڈرامہ صرف اسکا نام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہیملٹ میں پالونیس کے قتل کے علاوہ اور کون سے ایسے واقعات ہیں جن کو آپ صحیح معنوں میں اچانک اور تحیر خیز کہہ سکیں۔ ہیملٹ کے باپ کا بھوت ہمارے لئے باعث تحیر خیز ہو تو ہو لیکن ۱۶۰۳ء کے انگلستان کیلئے وہ اتنا ہی معمولی تھا جیسے ہمارے آپ کیلئے ایک لوٹا برتن۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ ڈرامہ صرف ایک حد تک زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ میرا عقیدہ ہے کہ ڈرامہ اور شعر خاص طور پر اور ادب عام طور پر زندگی کا عکس ہوتا ہے اور تنقید۔ بلکہ ادبی نقطۂ نگاہ سے ادب زندگی کا اشتداد یعنی Intensification اور exaggeration ہوتا ہے۔ یعنی زندگی کو شدید طور پر پیش کرنے کا نام ادب ہے۔ مثلاً ہم نے آپ نے اپنی زندگی میں کتنے ہیملٹ یا میکبتھ یا اوتھیلو دیکھے ہیں؟ ایک بھی نہیں لیکن ہم سب ایسے ہیں جن میں تھوڑا بہت ہیملٹ بھی ہے میکبتھ بھی اور اوتھیلو بھی۔ اگر ادب میں زندگی کا اشتداد نہ ہو تو ادب مشینی ہو جائے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ایک فوٹوگراف دو روپے کو خرید لیتے ہیں لیکن ایک قلمی تصویر کے دام دو سو سے لیکر بیس ہزار روپیہ تک ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ فوٹوگراف زیادہ سچا ہوتا ہے لیکن اس میں وہ Vision نہیں ہوتا جو مصور اپنی تصویر کو بخشتا ہے اور یہی Vision اس قلمی تصویر کو اشتداد عطا کرتا ہے۔

(پرنٹر، پبلیشر محمد جمیل خاں نے کمالی پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ معیار ستاؤ گیر گنج میرٹھ سے شائع کیا)



صافی بہترین ہے!

ہمدرد دواخانہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ یہاں ادویات جدیدترین سائنٹیفک طریقہ سے تیار کی جاتی ہیں اور ان کی تیاری میں پاکیزگی اور افادیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ صافی اس لئے بھی بہترین ہے۔ کہ یہ جدیدترین اصولوں کے ماتحت تیار کی جاتی ہے۔ معدہ میں داخل ہوتے ہی یہ تیزی سے فاسد ماد [illegible] کرنا شروع کر دیتی ہے۔ نظام عصبی میں توازن پیدا کرتی ہے۔ اور شفاف خون پیدا کر کے جسم میں چستی اور پھرتیلاپن پیدا کرتی ہے

صافی

خون صاف کرنے کی بہترین دوا۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی



Hamdard DAWAKHANA (TRUST) DELHI.

Only Title Printed at [illegible]